اُردو

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑہ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھہ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیے —

المشتہر: انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

نرخ نامۂ اجرت اشتہارات اردو و سائنس

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۸ روپے سکۂ انگریزی	۳۰ روپے سکۂ انگریزی
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ روپے سکۂ انگریزی	۱۵ روپے سکۂ انگریزی
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۴ آنے سکۂ انگریزی	۸ روپے سکۂ انگریزی

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اُن کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے —

المشتہر منیجر انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

انجمن اردو پریس، اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا

اردو

حصہ ۶۵	جنوری سنہ ۱۹۳۷ ع	جلد ۱۷

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت جنوری سنہ ۱۹۳۷ ع

نذر عقیدت بہ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ

(بتقریب جوبلی)

از

(حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانسن کالج آگرہ)

(۱)

وہ کان علوم ہیں، وہی جان علوم　　ہے شان رفیع ان کی، شایان علوم
عثمانیہ یونیورسٹی خود ہے گواہ　　زیبا ہے کہیں جو ان کو "سلطان علوم"

(۲)

شائع جتنے علوم اسلام ہوے　　قرآں کے سبب جہاں میں عام ہوے
کیونکر نہ ہو جامع علوم ان کی ذات　　جب جامع قرآں کے وہ ہم نام ہوے

(۳)

اللہ جو بندوں پہ کیا کرتا ہے انعام　　ہوتی ہے اس انعام کی کچھہ اصل و بنا بھی
ہے ایک علی، ایک ولی نام میں موجود　　حاصل نہ ہو کیوں ان کو ولایت بھی فنا بھی

(۴)

(فارسی)

ہر کہ بروے کند انعام خداے برتر　　ذی حشم باشد و ذی عزت و ذیشان باشد
نام 'عثمان علی' مسلک او راست دلیل　　کہ ستی خلفا پیرو ایشان باشد

(۵)

'عثمان' اور 'علی' سے مرکب جو نام ہے   ظل خدا ہے اس پہ' وہ ظل خدا بھی ہے
دونوں کا اجتماع ہے اس امر کا ثبوت   جو صاحب غنا ہے وہ مشکل کشا بھی ہے

(۶)

ہوں کیوں نہ وہ خود حیا مجسم   ہمنام حیا مآب (رضہ) بھی ہیں
ہو کیوں نہ پسند انہیں تواضع   ہمنام ابو تراب (رضہ) بھی ہیں

(۷)

کسی سلطنت میں دکن کے سوا   مکمل نظر آئے گا کم نظام
نظام دکن کی ہو توصیف کیا   نظام دکن ہیں مجسم نظام
نظام سلطنت دکن   ذات اعلیٰ حضرت

(۸)

سخن باغ' وہ باغبان سخن   نہ کیوں ہو پر از رنگ و بو گل کلام
انہیں پر ہے صادق یہ 'حامد' مثل   کلام الملوک ملوک الکلام

پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں

از

اڈیٹر

آسمانی صحیفوں کے ترجمے کی مخالفت تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں کی گئی ہے ۔ اور یہ مخالفت ہمیشہ علمائے دین کی طرف سے ہوئی ۔ وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں ۔ عام ہوئیں تو لوگ ایک حدتک ان بزرگوں سے بے نیاز ہوجائیں گے اور اس سے ان کی بڑائی اور فضیلت میں فرق آجائے گا ۔ بعض اوقات مخالفت اس لیے بھی کی گئی کہ ترجمے اور تفسیریں ان کے منشا کے خلاف تھیں اور ایسے مترجمین اور مفسرین کو تکلیفیں اور عقوبتیں پہنچائی گئیں ۔ یہ روش کسی خاص ملک یا قوم سے مخصوص نہ تھی بلکہ ہر جگہ پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ زمانۂ وسطیٰ میں یورپ میں انجیل و توریت کے مترجمین کو طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں اور علما کی مجلس نے ان صحیفوں کے ترجموں کے متعلق امتناعی احکام جاری کیے ۔ ریمس (علاقۂ فرانس) کے ایک نان بائی ایشارۃ نامی کو بعض عقائد کی بنا پر جن کی وہ تلقین کرتا تھا علما کی مجلس نے مردود ٹھہرایا ، کفر کا فتویٰ صادر کیا اور

زندہ جلا دیا - اور اس کے ساتھ مجلس نے فرانسیسی زبان میں بائبل کے ترجمے کی ممانعت کردی * - ترجمہ کرنا تو در کنار کسی کے پاس دیسی زبان میں ترجمے کا پایا جانا بھی جرم تھا - آکسفورڈ میں آرچ بشپ ارنڈل کی زیر سرپرستی سنه ۱۴۰۸ ع میں ایک مجلس منعقد ہوئی اور اس میں یہ احکام صادر کیے گئے کہ " کوئی شخص اپنے اختیار سے بائبل کے کسی نسخے کا ترجمہ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کتاب یا کتابچے یا رسالے کی صورت میں کرنے کا مجاز نہیں ہے - نیز کوئی شخص ایسی کتاب یا کتابچے یا رسالے کا نجی طور پر یا عام طور پر پڑھنے کا مجاز نہیں جو جان وکلف یا اس کے بعد یا اب لکھا گیا ہو ' خواہ وہ ترجمہ کلاً ہو یا جزوً - ورنہ اس کی خلاف ورزی میں وہ کفر و معصیت کا حامی تصور کیا جاکر قابل سزا سمجھا جائے گا " † - اس زمانے میں انگریزی بائبل کے بعض ترجمے ہوئے لیکن کسی مطبع کو اُن کے چھاپنے کی جرأت نہ ہوئی - مثلاً ولیم ٹنڈیل نے ایک ترجمہ کیا اور جب اس نے دیکھا کہ یہاں اس کا چھپنا ممکن نہیں تو بھاگ کر ھیمبرگ میں پناہ لی اور کولون میں اپنا ترجمہ چھپوانا شروع کیا - ابھی کتاب زیر طبع تھی کہ فرینکفورٹ کے ڈین کو اُس کی سن گن معلوم ہوئی اس نے نہ صرف کولون کی سینٹ کے ذریعے اس کی طباعت روک دی بلکہ هنری هشتم اور ولزی کو لکھا کہ انگلستان کی بندرگاہوں میں خاص طور پر نگرانی رکھی جائے کہ اس ترجمے کا کوئی نسخہ وہاں داخل نہ ہونے پائے - ٹنڈیل نے یہ رنگ دیکھا تو (Worms) بھاگ گیا اور جس قدر چھپے ہوئے فرمے ہاتھ لگے ساتھ لیتا

---

* مڈل ایول کلچر مؤلفۂ هیسکنس صفحہ ۲۳۸ —

† انسائکلو پیڈیا برٹینکا جلد ۳ صفحہ ۸۹۷ —

گیا - وہاں یہ ترجمہ طبع ہوا - سنہ ۱۵۲۶ ع میں اس کے نسخے انگلستان پہنچے - لیکن ان کے برباد اور تلف کرنے میں اس قدر سعی اور جد و جہد کی گئی کہ سوائے چند ناقص اجزا کے جو برٹش میوزیم میں موجود ہیں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا - اس کی عمر زیادہ تر جلا وطنی میں گزری - پادری اور حکومت اس کے درپے تھے - آخر سنہ ۱۵۳۵ میں گرفتار ہوا - سنہ ۱۸۳۶ ع میں پھانسی دی گئی اور لاش دھکتی ہوئی آگ میں جھونک دی گئی - انگریزی بائبل کا کوئی حصہ سنہ ۱۵۲۵ ع سے قبل طبع نہ ہوا اور پوری بائبل سنہ ۱۵۳۸ ع سے پہلے شایع نہ ہوئی —

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ (رح) نے سب سے پہلے سنہ ۱۱۵۰ ھ میں قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا - مولف حیات ولی نے شاہ صاحب کے ایک فاضل ہم عصر کی زبانی بیان کیا ہے کہ جب " اس کی اشاعت ہوئی تو ایک تہلکۂ عظیم کٹ ملانوں کے گروہ میں برپا ہوگیا " اور علاوہ کفر کے فتوے دینے کے وہ شاہ صاحب کے جانی دشمن ہوگئے اور ان کے قتل کی فکر میں رہنے لگے - یہ ترجمہ شایع کرنے کا ذکر ہے ' زبانی ترجمہ پڑھانے کے بھی ہمارے ملا اور علما شدید مخالف تھے - میرے ایک دوست جن کے خاندان میں زمانۂ دراز سے علم و فضل کا چرچا چلا آرہا ہے ' فرماتے تھے کہ ان کے جدامجد علاوہ دوسرے علوم کے درس کے قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھایا کرتے تھے - جب شہر کے علما کو یہ معلوم ہوا تو وہ سخت برہم ہوے اور ان کے گھر پر چڑھ آے اور زدو کوب پر اُتر آے - فورٹ ولیم کالج میں جب بعض مولویوں کو قرآن شریف کے ترجمے کے لیے متعین کیا گیا تو اسی قسم کا ہنگامہ برپا ہوا —

ابھی حال کا ذکر ہے کہ جب مسٹر پکتھال نے قرآن کا ترجمہ انگریزی

زبان میں کہا اور وہ علماے مصر سے مشورہ کرنے کے لیے مصر تشریف لے گئے تو علماے مصر نے ترجمے کے لفظ پر سخت اعتراض وارد کیا اور اس بحث نے اس قدر طول کھینچا کہ آخر مسٹر پکتھال کو مجبور ہوکر ترجمے کے لفظ سے احتراز کرنا پڑا اور اس کا نام Meanings of the Koran یعنی "معانیء قرآن" رکھنا پڑا - بات یہ ہے کہ پرانی ریت مشکل سے جاتی ہے —

خیر یہ تو ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں کی کوتہ اندیشی ہے ' لیکن ایک مشکل اور بڑی ہے - وہ یہ کہ ان صحیفوں کا ترجمہ آسان کام نہیں - سب سے پہلی بات یہ ہے کہ زبان پر کامل قدرت ہونی چاہیے - عقائد اور احکام کا دار مدار الفاظ کے مفہوم پر ہے - الفاظ کا مفہوم مرور زمانہ سے بدل جاتا ہے ' اس لیے مترجم کے لیے لازم ہے کہ وہ جانتا ہو کہ جس زمانے میں یہ کتاب نازل ہوئی اُس وقت ان الفاظ کے کیا معنی تھے اور قائل کا ان سے کیا مقصود ہے - کبھی کبھی ذو معنی اور پہلو دار لفظ بھی آجاتے ہیں - ایک جماعت اس کا مفہوم کچھہ لیتی ہے اور دوسری جماعت کچھہ اور - ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک لفظ کے معنی یا نحوی ترکیب کی وجہ سے عقائد میں اختلاف پیدا ہوگیا اور دو فرقے بن گئے- ترجمے میں ایسے لفظ استعمال کرنا کہ ان میں بھی دونوں پہلو قائم رہیں بہت دشوار بلکہ اکثر اوقات ناممکن ہوتا ہے - ان تمام احتیاطوں کے باوجود ترجمے میں اصل کی سی فصاحت اور قوت بیان اور اثر قائم رکھنا سب سے بڑا دشوار کام ہے- ایک طرف علما کی مخالفت دوسری طرف یہ دشواریاں مترجم کی ہمت پست کرنے کے لیے کافی ہیں- باوجود اِن مخالفتوں اور دشواریوں کے آخر ایک مدت کے بعد اِن صحیفوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوکر رہے - ترجمے نہ ہوتے تو ان کے مطالب

تک اُن لوگوں کی رسائی کیوں کر ہوتی جو غیر زبانوں سے ناآشنا تھے —

اُردو میں عام طور پر قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا رفیع الدین کا اور دوسرا شاہ عبدالقادر کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ترجمے تیرھویں صدی کے آغاز میں ہوے۔ لیکن اس کی بہت کم لوگوں کو خبر ہے کہ اُسی زمانے میں اور نیز اس سے قبل ہندوستان کے مختلف مقامات میں متعدد ترجمے اور تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ اس قسم کی جتنی کتابیں ہمیں دستیاب ہوئیں یا ہماری نظر سے گزریں' ان کی مختصر کیفیت یہاں لکھی جاتی ہے' ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی ہوں جن کا ہمیں علم نہیں۔ ان میں زیادہ تر تفسیریں ہیں' لیکن یہ براے نام تفسیریں ہیں' درحقیقت قرآن کے لفظی ترجمے ہیں' کہیں کہیں ایک آدہ لفظ یا ایک آدہ سطر صراحت کے لیے بڑھا دی ہے۔ ایک مشکل یہ آپڑی ہے کہ بعض میں مولف کا نام اور سنہ تالیف ندارد ہے یا بعض اول و آخر سے ناقص ہیں اس لیے یہ معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ لکھنے والے کون تھے اور کب لکھی گئیں۔ البتہ زبان سے زمانۂ تالیف کا تھوڑا بہت قیاس ہوسکتا ہے۔ بعض صرف ایک آدہ سورۃ یا چند سورتوں کے اور بعض پورے قرآن کے ترجمے یا تفسیریں ہیں۔ بہر حال اس سے یہ اندازہ ضرور ہوجاے گا کہ اس قسم کی کوشش مختلف زمانوں اور ملک کے مختلف حصوں میں برابر ہوتی رہی ہے —

اس قسم کی سب سے پرانی کتاب جو مجھے دستیاب ہوئی ہے وہ پرانی گجراتی اردو زبان میں ہے۔ افسوس کہ یہ اول و آخر سے ناقص ہے اس لیے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتا چلانا غیر ممکن ہے۔ البتہ زبان کے ڈھنگ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دسویں صدی کے اواخر یا گیارھویں

صدی کے اوائل کی تالیف ہے کیوں کہ اس کی زبان امین کی یوسف زلیخا کی زبان سے کہ وہ بھی گجراتی اُردو میں ہے، بہت پرانی ہے۔ امین کی یوسف زلیخا سنہ ۱۰۹۱ ھ میں لکھی گئی اور یہ یقیناً اس سے پہلے کی ہے۔ یہ سورۂ یوسف کی تفسیر ہے۔ امین کی کتاب نظم میں ہے اور یہ نثر میں۔ ظاہر ہے کہ نظم کی زبان زیادہ مشکل ہوتی ہے اور اس میں پرانے لفظ زیادہ آتے ہیں اور نثر اس کے مقابلے میں سہل ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر سادہ زبان میں لکھی گئی ہے اور بالکل بول چال کی زبان ہے تاہم اس میں پرانے لفظ اور پرانی ترکیبیں نسبتاً بہت زیادہ ہیں یہاں میں اس کی عبارت کے ایک دو نمونے پیش کرتا ہوں —

" قال رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ و الا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن " —

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے

" یوسف نے کہیا کہ اے بار خدا ہوں (۱) بھاکسی (۲) کوں دوس (۳) دھرتا ہوں اس کام تھیں کہ جے کام منجھے اے فرماتی ہے انے (۴) اگر توں ماجھے انہوں کی مکرون تھیں پناہ ملے (۵) نراکھے تو ہوں ڈرتا ہوں کہ ہوں بھی انہوں کی بات اوپر خاطر کروں، انی سکلے (۶) گلہ گاروں ملے ہوؤں"۔

" اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یات بصیرا و اتونی باھلکم اجمعین " —

اس کا ترجمہ یوں کیا ہے —

" یوسف نے کہا لے جاؤ میری پیرھنی انے (۷) باپ کے مُنہ پر چھوڑو

---

(۱) میں۔ (۲) قید خانہ۔ (۳) درست۔ (۴) اور۔
(۵) میں۔ (۶) تمام۔ (۷) اور۔

تو دیکھتے ہو ویں گے 'نے پیچھیں سکلے (۱) اپس کے کُتم کوں لیو انے (۲) میرے نزیک (۳) آنو (۴)" —

تفسیر کی عبارت کا نمونہ یہ ہے —

"پیچھیں بہاکسی کے عہدہ دار نے کہیا کہ وے دائم نماز گزارتا ہے انے روزے راکھتا ہے انے تسبی (۵) کرتا ہے انے ملولوں (۶) کوں پوچھتا ہے انے درویشوں کو کہان (۷) دیتا ہے - انے جے (۸) کچھو (۹) اُس پاس آوتا ہے سو محتاجوں کوں بانٹ دیتا ہے انے اپیں نہیں کھاتا - انے کدھیں اُس تیں کوئی رنجیدا نہیں ہوا - انیں پیچھیں جب اے صفتاں ملکیں سنیاں تب کہیا کہ اے باتاں نہوویں کسی ملے مگر پیغامبروں ملے ہوویں یا پیغامبروں کے بلکروں (۱۰) ملے ہو ویں - انے دوجیا یہ پوچھیا کہ یوسف کی تدبیر بہاکسی ملے کون کرتا ہے' انے اُس پاس کسی پاس تیں کچھہ آوتا ہے - پچھیں انہوں نے کہیا کہ عزیز کی بیر (۱۱) چھیا کرنے بھیجتی و لیکن وے قبول نہیں کرتا - انے وے پانچ بہراں دوجیاں کوئی ہیں وے بہی بھیجتیاں ہیں انہوں کا بہی کچھو قبول نہیں کرتا - انے انہوں کا بول بہی نہیں سنتا" —

اس تفسیر میں جگہہ جگہہ گجراتی لفظ آے ہیں' اس پر سے یہ قیاس کرنا بالکل بجا ہے کہ یہ گجراتی اردو میں ہے اور اس کا مولف گجرات کا رہنے والا تھا - اس نوع کی اور بہی کتابیں پائی جاتی ہیں جن کے مولف گجرات کے باشندے ہیں - یہاں اس تفسیر کے چند گجراتی لفظ معنوں کے ساتھہ مثال کے طور پر لکھے جاتے ہیں انے (اور)' بتی (سے' میں)' تلیک (تھوڑا)' ہبیں (اب) ہوں (میں)' ڈوسی (بڑھیا)' جمدا

(۱) تمام - (۲) اور - (۳) نزدیک (۴) لاؤ - (۵) تسبیح - (۶) غم زدوں - (۷) کھانا - (۸) جو - (۹) کچھہ - (۱۰) اولاد - (۱۱) عورت —

(دایاں)، بھر (صورت)، وغیرہ —

دکنی ترجمے کا ایک نسخہ ایسا ملا ہے جو اول و آخر سے ناقص ہے۔ اس میں قرآن شریف کے آخری پارے کی سورتوں کا ترجمہ ٹھیٹ دکنی میں کیا گیا ہے۔ زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ بہت قدیم ہے اور دسویں صدی کے اوائل کا ہے۔ اس میں ترجمے کے ساتھ کہیں کہیں مختصر تفسیر سی بھی ہے۔ نمونے کے طور پر سورۃ البینہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے —

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لم یکن الذین کفروا من اہل الکتاب والمشرکین منفکین حتیٰ تاتیہم البینہ۔ رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمہ۔ وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاءتہم البینہ۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ و یوءتوا الزکوٰۃ ذالک دین القیمہ۔ ان الذین کفروا من اہل الکتاب والمشرکین فی نار جہنم خالدین فیہا اولئک ہم شر البریہ۔ ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات اولئک ہم خیر البریہ۔ جزاؤہم عند ربہم جنات عدن تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ابداً رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ذالک لمن خشی ربہ۔

(ترجمہ)

" انکھی وولوکاں جو کفر کیے کتاب کے لوکاں تے ہور شرک کرنہاریاں تے کنارے ہونہارے نتھے کفر تے تو لگ جو آئی اونوں کوں روشن حجۃ۔ سو حجب (۱) ہے خدا تے پڑتا ہے صحیفیاں کوں جو پاک ہیں جھوٹ تے۔ اوس میں لکھی تھی نہٹ بات (۲)۔ ہور نہیں تفرقا ہوے وولوکاں جنوں کو دیے گیا تھا کتاب مگر روشن حجۃ کے آئے پچھیں تے۔ ہور اونو کوں تونیں حکم کی کیا تھا مگر یو کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کوں نچھل عبادت

(۱) غالباً " حاجب " ہے۔ (۲) سیدھا رستہ (صراط مستقیم)۔

اوسیچ کوں کرنہارے - کفر کا دین چھوڑ اسلام کے دین میں آکہ ہور یوکہ کھڑی کریں فرض نماز کوں اس کے وخت (۱) میں ہور یوکہ دیویں مال کے فرض زکوۃ کوں ہور وو دین نہت (۲) ہے - تحقیق وو لوکاں جو کفر کیے کتاب کے لوکاں تے ہور شرک کرنہاریاں تے (اوس کی عبادت میں) جہنم کی آگ میں اچھیں گے (۳) قیامت کے دیس (۴) ہمیشہ اچھیں گے اوس جہنم میں وو لوکاں اونوچ (۵) بہوتیچ (۶) بورے (۷) لوکاں ہیں ساری پیدائش میں - ہور نیک عمل کے خالص خدا کے واسطے (۸) وو لوکاں انوچ بہوتیچ خوب لوکاں ہیں ساری پیدائش میں - جزا انوں کی أنو کے پالنہارے کنیں ہے ' باغاں دائم کی بہتے ہیں انوں کے تلے (۹) تے کالوے (۱۰) ' دائم اچھینگے اوس باغاں میں ہمیشہ اچھناں جے نہایت نیں - خشال (۱۱) ہور اللہ تعالیٰ اونوں تے ہور اونوں خشال ہوے اوس تے - وو خشالی اوسیچ کوں (۱۲) ہے جو ڈرتا ہے اپنے پالنہارے کے عذاب کوں - عبادت کر کر "—

اس کتاب کی قدامت اس کی زبان سے ثابت ہے - بہت سے الفاظ اور محاورے ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو بعد کے زمانے کی کتابوں میں نہیں پائے جاتے اور اسلوب بیان بھی قدیم ہے - مثلاً " کالفراش مبثوث" کا ترجمہ کیا ہے " پتنگ سری کی جھیلی کے " - یہ ٹھیٹ پرانی زبان ہے - جھیل یا جھیلی ہجوم اور قطار کو کہتے ہیں - اسی طرح " فمن یعمل مثقال ذرۃ " کا ترجمہ کیا ہے " پس جکوئی کہ عمل کرے گا ذرے کے بھار یعنے لال

(۱) وقت - (۲) مستقیم - (۳) رہینگے - (۴) دن - (۵) وہ - (۶) بہت ہی -
(۷) برے - (۸) واسطے - (۹) نیچے - (۱۰) نہر ' ندی - (۱۱) خوش حال -
(۱۲) اسی کو —

چمتی کے بھاریا ذرہ ذہلارے کا" - "ذھلرا" کے معنے گرد و غبار کے ھیں -
الفاظ بھی ایسے استعمال کیے ھیں جو اس وقت بہت غریب معلوم ھوتے
ھیں اور بعد کی دکنی کتابوں میں نہیں آتے - مثلاً "بلگی" بمعنی مصیبت
یا آفت - "کدن" بمعنے طرف - تلا یا "تلاری" تلے یا نیچے کے معنوں میں -
ایک لفظ جو اس کتاب میں جگہہ جگہہ استعمال ہوا ہے وہ "بجان" ہے -
مثلاً "بجاں بولیا" یا "بجان پوچھیا" - بہت غور کے بعد سمجھہ میں آیا
کہ یہ "بزاں" کی خرابی ہے جو اکثر پرانی دکھنی کتابوں میں آیا ہے
اور "بزاں" بگاڑ ہے "بعد ازاں" کا —

الفاظ کا ہجا بھی عجیب ہے - یعنے جیسے اس وقت بولتے تھے بجنسہ
ویسے ھی لکھہ دیے ھیں - مثلاً خشال (خوش حال)، بادزاں (بعد ازاں)، شات
(شہد)؛ ملا (ملمع)، بازے (بعضے)، جما (جمع)، ھوض (حوض) وغیرہ وغیرہ -

دکنی میں سورۂ یوسف، پارۂ عم اور سورۂ الرحمن کے متعدد ترجمے
اور تفسیریں پائی جاتی ھیں - مجھے سورۂ رحمن کا ایک مقفیٰ ترجمہ بھی
ملا ہے - ترجمے کا نمونہ یہ ہے —

الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان -

(ترجمہ) اے لوگوں تم کرو بکھان جس کا میٹھا نام رحمان، جن سکھایا
ہے قرآن، جن سرجا ہے انسان —

الشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان

(ترجمہ) سکھایا تمکو سبھی بیان، چاند سورج سوں حساب پچھان، جھاڑ
پھر بھی نمیں* سبحان، سجدا کریں ھیں اوس کوں مان —

والسماء رفعہا و وضع المیزان الاتطغوا فی المیزان

* جھکنا -

(ترجمہ)   اونچا کیتا اُن اسمان ' راکھے ھیکی اُن میزان ' اپے دل سوں حق پچھان ' کم زیادہ مئہ کر جان —

واقیموا الوزن بالقسط ولاتخسروا المیزان

(ترجمہ) جو تولو سو پورا تول ' جو مول لو سو پورا مول ' ڈنڈی داب ندیکھو جھول ' دغل نہ کیجو قول ابول —

والارض وضعها للانام فیها فاکهة والنخل ذات الاکمام والحب ذوالعصف والریحان

(ترجمہ) لوگوں کا جیں • زمیں بچھائے ' میوہ خرما جھاڑ اگائے ' دادہ† پیدا کو بیکھلائے ' اوس میں اگل‡ ریحان کھلائے —

فبای الآء ربکما تکذبان

تم پرب کا انناں مان کس نعمت تم ہوے اجان —

تفسیر حسینی کا ترجمہ بھی کسی صاحب نے پرانی دکنی میں کیا ہے - یہ تفسیر بہت مقبول ہے اور اس کے متعدد ترجمے دکنی زبان میں ہوے ہیں - میرے سامنے اس وقت پارۂ عم کی تفسیر کا ترجمہ موجود ہے ' اس کی زبان پرانی ہے - آخر میں کاتب نے دن ' وقت اور تاریخ (روز جمعہ بوقت عصر دوماہ جمادی الآخر) تو لکھی ہے لیکن سنہ نہیں لکھا - چند آیتوں کا ترجمہ یہاں لکھا جاتا ہے - ترجمے کے ساتھ ساتھ تفسیری جملے بھی ہیں —

(عم یتساءلون) کس چیز تے پوچھتے ہیں او کافراں یعنے مکی کافراں یعنے بعث تے پوچھتے ہیں آپس میں آے یا رسول کوں ہور مومناں کوں - (عن النباء العظیم) بزرگ خبر تے (الذی هو فیه مختلفون) ایسی خبر کہ

• لیے - † کاتب کی غلطی ہے' دانا ہونا چاہیے - ‡ اعلی درجے کے -

اونو اس میں اختلاف کرنہارے ہیں۔ (کلا سیعلمون) یوں نہیں یونچھتا ہے کہ انکار کریں ترت ہے کہ سمجھیں گے اونو کوں یو قرانے کا وعدہ ہے (ثم کلا سیعلمون) پچھیں یوں نہیں پونچتا ہے ترت ہے کہ سمجھینگے اونو دوبار لیایا ایسے تاکید کے واسطے ہور "ثم" سوں اھانا سمجھا کردیتا ہے یو کہ دوسرا وعدا بہوت سخت ہے ہور بعضے بولے پہلا (۱) سو جیو کا پڑتے وقت ہور دوسرا سو جزا کے وقت۔ (الم نجعل الارض مہادا) آیا نہیں کیے ہمیں زمین گہوارا (۲) جوں نہلوادان (۳) کا ہے۔ یو ذکر کرتا ہے نہرزیاں باتاں کوں جو دیکھتے ہیں او خدا کے عجائب صنعت تے یو اونو کوں سمجانے کے واسطے اس کی کمال قدرت پر دلیل پکڑیں اس سے بعث کے درست ہونے پر۔ (والجبال اوتادا) بولتا اللہ تعالیٰ آیا نہیں کیے ہمیں ڈونگراں (۴) کوں میخاں زمیں کیاں یوں نا ہوتے تو ہلتی۔ (وخلقنا کم ازواجا) ہور کیا نہیں پیدا کیے ہمیں تملا جوڑی جوڑی مرد عورت (وجعلنا نومکم سباتا) ہور کیا نہیں پیدا کیے ہمیں تمارے سونے کوں تورنا دیکھلے تے ہور ہللے تے تملا راحت ہور آسودہ ہونے کے واسطے۔ (وجعلنا اللیل لباسا) ہور کیا نہیں کیے ہمیں رات کوں پہلنا (۵)۔ اوہاں (۶)۔ یعنی ہے اپے اندھارے سوں جونکہ کپڑا ڈھانکتا ہے اپے آنگ کوں۔ (وجعلنا النہار معاشا) ہور کیا نہیں کیے ہمیں دیس (۷) کوں زندگانی (۸) بدل (۹) تاطلب کریں تمیں زندگانی سہانکو جونکہ کھانا پیدا کیرا۔ (وبنینا فوقکم سبعاً شدادا) ہور کیا نہیں بنا کیا کیے ہمیں تمارے اوپر سات اسماناں گھٹ (۱۰) کہ نہیں پورانہاں ہوتہاں لئی (۱۱) زمانے جالے سوں" —

(۱) پہلا۔ (۲) گہوارہ۔ (۳) بچھونا۔ (۴) پہاڑوں۔ (۵) پہننا۔ (۶) وہاں۔ (۷) دن۔ (۸) معاش۔ (۹) واسطے۔ (۱۰) مستحکم۔ (۱۱) بہت —

تفسیر تنزیل کے نام سے قرآن پاک کی ایک تفسیر سید بابا قادری نے سنہ ۱۱۴۷ ھ میں لکھی - کتاب کے اختتام پر مولف نے خود اس کی تصریح کردی ہے - وہ عبارت یہ ہے —

" خدائے تعالیٰ نے جیسا کہ اس سورے (ناس) کے تئیں پانچ ناس پر تمام کیا اسی طرح اس تفسیر تنزیل کو بھی پانچ شخصوں پر تمام کیا - اول یہ تفسیر یعنے مصنف سید بابا قادری دوم حاجی میاں محمد علی سوم محمد عبدالغفور خاں یہ دونوں اس امر میں بہت کوشش رکھتے تھے - چہارم محمد مسافر جوان صالح اور لائق خوش مزاج اور خوش نویس اور پنجم محمد واجد علی کہ یہ دو شخص تصنیف کے لکھنے والے تھے کہ خدائے تعالیٰ ان دو شخصوں کے لکھنے سے تفسیر تمام کروایا —

خدائے تعالیٰ قرآن شریف کے تئیں حرف بے سے شروع کیا اور ختم قرآن کا حرف سین پر ہوا - اِن دو حرفوں کے تئیں مرکب کرو تو لفظ بس کا حاصل ہوتا ہے یعنے ان دونو حرفوں کے بیچ میں جو تمام قرآن ہے بس کرتا ہے تیرے تئیں —

(فرد) اول و آخر قرآن زچه با آمد و سین یعنے اندر رہ دین رہبر تو قرآن بس

اور تصنیف بھی تفسیر کی پانچ سال میں تمام ہوئی کس واسطے کہ سن چالیس میں شروع ہوئی ' اور سن سینتالیس میں تمام ہوئی ' دو سال کامل ناغہ ہوے- تمام شد تفسیر تنزیل بتاریخ بیست و پنجم شہر ذی قعدہ در سن یک ہزار یک صد و چہل و ہفت ہجرالنبوی " —

اس کتاب کی زبان صاف ہے اور بارھویں صدی کے وسط کی زبان کا بہت اچھا نمونہ ہے - زبان سے بظاہر یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ مصنف کس مقام کا ہے- چونکہ ایک آدھ لفظ کہیں کہیں دکنی کا آگیا ہے اس لیے یہ خیال

ہوتا ہے کہ دکن کا باشندہ ہے۔ تھوڑا سا ترجمے کا نمونہ یہاں دیا جاتا ہے —

(فتحنا علیھم ابواب کل شے) کھول دیا ہم نے ان کے اوپر دروازا ہر شے کا یعنی جو ارن کوں چاہا سو ملا۔ (حتی اذا فرحوا بما اوتوا) تب تیں کہ وو خوش ہووے اوس چیز سیں کہ دی گئی۔ (اخذنا ہم بغتۃ) پکڑے ہم نے اون کوں یکایک۔ (فاذا ہم مبلسون) پس یکایک وو پشیمان اور نااُمید ہو رے۔ (فقطع دابر القوم الذی ظلموا) پس کاٹا گیا آخر اوس جماعت کا جنوں نے ظلم کیا تھا۔ (والحمد للہ رب العالمین) اور حمد خدا کوں ہے جو پروردگار عالم کا ہے۔ (قل ارایتم ان اخذ اللہ سمعکم و ابصارکم و ختم علی قلوبکم من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بہ) کہو کہ دیکھتے ہو تم کہ اگر لیویں خدا تمہارے سننے کوں یعنی بہرہ کرے اور لیوے تمہاری آنکھوں کوں کہ اندھا کرے اور بہرا* کرے اوپر تمہارے دلوں کے کہ بے شعور کرے تو کون سا خدا ہے بغیر اوس کے کہ وو دیوے تم کوں یہ جو دیا ہے۔ (انظر کیف نصرف الآیات) دیکھو تم کہ کیسا پھیرتے ہیں ہم آیتوں کوں اون کے سمجھانے کے واسطے۔ (ثم ہم یصدفون) پیچھے نہیں مانتے ہیں اور موں پھیرتے ہیں (قل ارایتکم إن اتاکم عذاب اللہ بغتۃ او جہرۃ) تو کہ کیا دیکھتے ہو تم کو آوے تمہارے پاس عذاب خدا کا یکایک یا ظاہر ہووے اوس کی علامت۔ (ھل یہلک القوم الظالمون) نہ ہلاک کیے جائیں گے اوس وقت مگر قوم ظالموں کا (وما نرسل المرسلین) اور نہیں بھیجتے ہم نے پیغمبروں کوں (الا مبشرین و منذرین) مگر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے —

اس عبارت میں صرف "مگر" کا لفظ ایسا آیا جو دکنی ہے ورنہ باقی ساری عبارت ایسی ہے جس میں شمال و جنوب کی زبان کا مطلق کوئی فرق

---

* غالباً کاتب کی غلطی ہے "مہر کرے" ہونا چاہیے۔

نہیں پایا جاتا۔ پوری تفسیر اسی زبان میں ہے —

پارۂ عم کی ایک تفسیر اور ہے۔ اس کا نام "خدا کی نعمت" معروف "مرادیہ" ہے۔ اس کے مصنف شاہ مراد اللہ سنبھلی ہیں۔ اور سنہ تصنیف ۱۱۸۴ ہجری ہے۔ چنانچہ خاتمۂ کتاب میں مصنف نے اِن سب امور کی خود ہی تصریح کردی ہے —

" حمد اور شکر کا سجدہ لایق ہے سزاوار ہے پاک پروردگار کے تئیں جس خاوند نے اپنے فضل و کرم سے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے عم سپارے کی تفسیر ہندی زبان میں تمام کروا دی اور اس عاصی گنہگار مراد اللہ انصاری سنبھلی قادری نقشبندی حنفی کو یہ خدمت فرما کر توفیق بخش کر ..... یہ خیر کا کام پورا کردیا اور پھر اس تفسیر کا نام خدا کی نعمت مقرر کروایا۔ یہ تفسیر محرم کے مہینے کی چوبیس تاریخ جمعے کے دن اٹھارہ سو چوراسی برس ہجری تمام ہوکر پچاسی شروع ہوا تھا جو تمام ہوئی" —

یہ بڑی تقطیع کے ۳۰۲ صفحوں پر ہے اور شہر ربیع الاول سنہ ۱۲۶۰ ہجری میں نستعلیق ٹائپ میں طبع ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس سے قبل چھپی تھی۔ چنانچہ ناشر کتاب نے خاتمۂ طبع میں یہ عبارت لکھی ہے: —

" خاکسار سید عبداللہ ولد سید بہادر علی عفا اللہ عنہما نے صرف بہ نیت اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت کی جزا دیوے اور شاہ مراد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی روح مجھہ سے خوش ہوجاوے اِس کتاب کی تصحیح کرکے چھپوایا اور غلطیوں کو دور کیا جس کو باور نہ ہو تو اگلے چھاپے کی کتاب سے مقابلہ کرکے دیکھے اور انصاف کرے" —

تفسیر کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے - متروک الفاظ خال خال ہیں اور وہ بھی بہت معمولی - مثلاً یے (بجاے یہ)' وے (بجاے وہ)' اوپر (بجاے پر) ہووے (بجاے ہو) اندھیاری (بجاے اندھیرا)' اُن نے (بجاے اُس نے) اور یہ اور اسی قسم کے اور لفظ ہیں جو اب بھی بعض مقامات پر بول چال میں آتے ہیں - جملوں کی ساخت البتہ کسی قدر پرانی ہے - اس سے قبل جن کتابوں کا ذکر آیا ہے وہ براے نام تفسیریں ہیں' در حقیقت ترجمے ہیں' تفسیر کی غرض سے کہیں کہیں ایک آدہ جملہ بڑھا دیا گیا ہے - لیکن اس کتاب میں تفسیر شرح و بسط کے ساتھہ لکھی ہے - اس کتاب کی زبان بارھویں صدی کے اواخر کی زبان کا اچھا نمونہ ہے - اُس کی ایک عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے اُس کی زبان اور جملوں کی ساخت وغیرہ کا اندازہ ہوگا —

(ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ) اور مقرر شتاب عطا کریگا دیویگا بخشیگا تجکو یا محمد پاک پروردگار تیرا پھر راضی ہوویگا تو وے وے نعمتیں خوبیاں بخشیگا تجکو یا محمد پیدا کرنے والا تیرا آخرت میں جو تو خوش ہوجاویگا' سب طرح کی فکریں جاتی رہیں گی تمام عالم کی شفاعت کا درجہ' مقام محمود' تمام امت کی شفاعت کا حکم' بہشت کی بڑی بڑی نعمتیں بے حد بے نہایت' ہمیشہ کا دیدار' ایسی بڑی خوبیاں تیرے واسطے رکھی ہیں - خاطر کو خوش رکھہ' اُن کافروں مشرکوں کے طعنے مارنے میں غمگین ناخوش مت ہو - کوئی دن میں یے سبب باتیں جاتی رہیں گی - تم کو خوشی ہمیشہ رہے گی - روایت ہے جب یہ آیت نازل ہوئی حضرت رسول (ع م) خوش ہوئے اور فرمایا میں ایک آدمی کی بھی میری امت کے دوزخ میں رہنے کا راضی نہیں ہونے کا' یہ بات امت کے واسطے بڑی

خوش خبری ہے - تھوڑے سے بہتایت ہے ' پہلے حال سے آخر ۲ حال بہتر ہے '
دنیا سے آخرت بہتر ہے " —

ہندوستان کے نامور محدث اور عالم شاہ ولی اللہ (رح) دہلوی اور اُن کے خاندان نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ' ان کا فیض سارے ملک کو پہنچا ہے - شاہ ولی اللہ (رح) نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں سنہ ۱۱۵۰ ھ میں کیا جو بڑی خوبیوں کا ہے - ان کے فرزندوں میں سے مولانا شاہ رفیع الدین (متوفی سنہ ۱۲۳۹ ھ) اور مولانا شاہ عبدالقادر (متوفی سنہ ۱۲۴۲ ھ) نے اردو زبان میں ترجمے کیے - شاہ عبدالقادر کا ترجمہ بہت مقبول اور مشہور ہوا اور اب تک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے - یہ ترجمہ ٹھیٹ اردو میں ہے - اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لیے ہندی یا اردو کے ایسے برجستہ اور برمحل الفاظ ڈھونڈھ کے نکالے ہیں کہ اُن سے بہتر ملنا ممکن نہیں - ترجمے کی زبان کے متعلق خود شاہ صاحب نے اپنے دیباچے میں صراحت فرمادی ہے :—

" اب کئی باتیں معلوم رکھیے - اول یہ کہ اس جگہہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے - اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنے مفہوم نہوں - دوسرے یہ کہ اس زبان میں ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو " —

شاہ صاحب نے یہاں ریختے اور ہندی متعارف میں جو فرق کیا ہے وہ قابل غور ہے - ہندی متعارف سے وہی زبان مراد ہے جسے آج کل ہندوستانی سے تعبیر کیا جاتا ہے - اس ترجمے کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں —

یہ ترجمہ سنہ ۱۲۰۵ ھ (مطابق سنہ ۱۷۹۱ ع) میں ہوا۔ یہ سنہ بھی خود شاہ صاحب ہی کا بتایا ہوا ہے۔ وہ دیباچے میں فرماتے ہیں "اس کتاب کا نام موضح القرآن ہے اور یہی اس کی صنعت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے" —

شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے کا سنہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے اپنی کتابوں میں اس ترجمے کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی نے بھی اس کا سنہ نہیں لکھا۔ مولوی عبدالجلیل صاحب نعمانی نے اس ترجمے کے ایسے الفاظ کی ایک فرہنگ شایع کی تھی جو آج کل استعمال میں نہیں آتے۔ اس کے دیباچے میں وہ اس ترجمے کا سنہ ۱۲۲۲ ھ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ سنہ انہوں نے کہاں سے تحقیق کیا۔ ایسی صورت میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سنہ درست ہے۔ عام طور پر مصنفین نے اس خیال سے کہ یہ شاہ عبدالقادر سے عمر میں بڑے تھے ان کے ترجمے کو زمانے کے لحاظ سے مقدم رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی محض قیاس ہے اور جب تک کوئی قطعی ثبوت نہ ملے اس کی صحت مشتبہ ہے۔ البتہ ایک بات ایسی ہے جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بعد کا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمے کے دیباچے میں اپنے والد شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے کا ذکر تو کیا ہے لیکن اپنے بھائی کے ترجمے کا کہیں اشارہ نہیں کیا اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اُس وقت تک انہوں نے کوئی ترجمہ نہیں کیا تھا۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ پہلی بار کلکتہ کے اسلام پریس میں دو جلدوں میں شایع ہوا۔ پہلی جلد سنہ ۱۲۵۴ھ میں اور دوسری جلد اس کے دو برس بعد شایع ہوئی۔ اس اڈیشن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ متن قرآن کے نیچے اردو ترجمہ نستعلیق

ٹائپ میں ہے —

یوں تو دونوں ترجمے لفظی ہیں لیکن شاہ رفیع الدین نے ترجمے میں عربی جملے کی ترکیب اور ساخت کی بہت زیادہ پابندی کی ہے۔ ایک حرف اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے پایا۔ ہر عربی لفظ بلکہ ہر حرف کا ترجمہ خواہ اردو زبان کے محاورے میں کھپے یا نہ کھپے انہیں کرنا ضرور ہے۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں اس قدر لفظی پابندی نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور اصل لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روز مرے اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری خوبی ان کے ترجمے میں ایجاز کی ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مد نظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں پورا مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہوجائے —

ان دونوں ترجموں کا فرق ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا —

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاہ رفیع الدین ۔ شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے ۔

شاہ عبدالقادر ۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ۔

اگرچہ شاہ عبدالقادر نے جملے میں فعل نہیں لکھا کیونکہ اصل عربی میں بھی نہیں اور شاہ رفیع الدین نے فعل ترجمے کی خاطر داخل کیا ہے تاہم شاہ عبدالقادر کا ترجمہ زیادہ سلیس اور صاف اور فصیح ہے اور اصل عربی الفاظ کے زیادہ قریب ہے —

اب پارۂ الم کی ابتدائی آیتوں کے ترجمے دونوں ترجموں سے بالمقابل نقل کیے جاتے ہیں :—

شاہ رفیع الدین

یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے - راہ دکھلاتی ہے واسطے پرہیزگاروں کے وہ لوگ کہ ایمان لاتے ساتھ غیب کے یعنی بن دیکھے اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور اُس چیز سے کہ دیا ہے ہم نے ان کو خرچ کرتے ہیں - اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ساتھ اُس چیز کے جو اتاری گئی ہے طرف تیری اور جو اتاری گئی ہے پہلے تجھہ سے - اور ساتھہ آخرت کے وے یقین رکھتے ہیں - یہ لوگ اوپر ہدایت کے ہیں پروردگار اپنے سے اور یہ لوگ وہی ہیں چھٹکارا پانے والے - تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوے برابر ہے اوپر اون کے کیا ڈرایا تو نے اُن کو یا نہ ڈرایا تونے اُن کو نہ ایمان لاویں گے - مہر کی ہے اللہ نے اوپر دلوں اُن کے کے اور اوپر کانوں اُن کے کے اور اوپر آنکھوں اُن کی کے پردہ ہے اور واسطے اُن کے عذاب ہے بڑا -

شاہ عبدالقادر

اس کتاب میں کچھہ شک نہیں - راہ بتاتی ہے ڈروالوں کو، جو یقین کرتے ہیں بن دیکھا اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھہ خرچ کرتے ہیں - اور جو یقین کرتے جو کچھہ اوترا تجھہ پر اور جو اوترا تجھہ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں - انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی مراد کو پہنچے - وہ جو منکر ہوے برابر ہے ان کو تو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے - مہر کر دی اللہ نے اون کے دل پر اور اون کے کان پر اور اُون کی آنکھوں پر ہے پردہ اور اون کو بڑی مار ہے —

دونوں ترجموں کے مقابلے سے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کی فوقیت ظاہر ہے - اول تو اس میں ایجاز ہے یعنی بلاوجہ کوئی لفظ اپنی طرف سے داخل نہیں کیا - دوسرے اردو روز مرہ اور جملوں کی ساخت

کا خیال رکھا ہے - تیسرے (جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا ہے) ترجمہ ریختے میں نہیں بلکہ "ہندی متعارف" یعنی ہندوستانی میں کیا ہے - ان وجوہ سے ترجمہ زیادہ سلیس اور صحیح ہے - مثلاً متقین کا ترجمہ بجاے پرہیزگاروں کے "ڈر والوں" کیا ہے - یقیمون الصلوۃ کا ترجمہ "درست کرتے ہیں نماز" کیا ہے - مفلحون کا ترجمہ "وہی مراد کو پہنچے" کیا کیا ہے - شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ "چھٹکارا پانے والے" کیا ہے اگرچہ یہ لفظ ہندی ہے لیکن شاہ عبدالقادر کا ترجمہ زیادہ صحیح اور اصل سے قریب تر ہے اور اس سے اصل مفہوم بہتر طور پر سمجھ میں آتا ہے - وہی جملوں کی ترکیب سو دونوں ترجمے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے اس کا زیادہ خیال رکھا ہے - شاہ عبدالقادر کا ترجمہ دوسرے ترجمے کے مقابلے میں اس قدر بہتر اور افضل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ہوتے چند سال بعد دوسرے ترجمے کی ضرورت کیوں سمجھی گئی —

اسی زمانے (۱۲۰۶ ھ) میں ایک تفسیر مع ترجمہ لکھی گئی جس کا نام تفسیر قرآنی موسومہ حقانی ہے - اس کا ذکر جناب احسن صاحب مارہروی نے اپنی تاریخ نثر اردو میں کیا ہے - اس کے مولف سید شاہ حقانی نبیرہ شاہ برکت اللہ مارہروی ہیں - ترجمے کے ساتھ مختصر تفسیر بھی ہے - یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے —

نمونۂ ترجمہ آیت آخر سورۂ بقر پارہ ۳

رنج میں نہ ڈالے گا خداے تعالیٰ کسی کو مگر موافق طاقت اس کی کے - اُس کو ہے جو عمل کیا اور اوپر اُس کے جو گناہ کیا - اے پروردگار میرے عذاب مت پکڑ تو مجھ پر، جو بھول جاؤں میں یا خطا کروں

میں - اے پروردگار میرے ' اور بوجھہ مت دے تو اوپر میرے بوجھہ بھاری ' جیسے بوجھہ رکھا تونے اوپر اُس گروہ کے کہ پہلے تھے مجھہ سے - اے پروردگار میرے اور مت رکھہ اوپر سر میرے کے بوجھہ جو کہ نہ اُٹھا سکوں میں اور درگزر کر خطاؤں میری سے اور بخش تو گناھوں میرے کو اور رحم کر تو اوپر میرے - تو ھے خاوند میرا ' پھر غالب کر تو مجھکو اوپر قوم کافروں کے * —

شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں قرآن پاک کے کئی ترجمے ہوے - شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمے بھی اُسی زمانے کے ھیں - ایک اور ترجمہ جو بادشاہ کے ایما سے ھوا وہ دلی کے نامور طبیب حکیم محمد شریف خاں مرحوم کا کیا ہوا ھے - یہ ترجمہ (قلمی) ھے اس وقت حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانے میں موجود ھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے ھمیں اس کی زیارت نصیب ہوئی - فاضل مترجم نے ترجمے کے آخر میں جو عبارت تحریر کی ھے اُس سے اس ترجمہ کی کیفیت معلوم ہوگی - وہ عبارت یہ ھے —

" للہ الحمد والمنة کہ این تفسیر سلست تحریر حسب الامر ارفع اشرف اعلیٰ بادشاہ جمجاہ دین پناہ .... السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان ابن الخاقا خان اسدالمعارک والمغازی جلال الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ ذرۂ خاکسار بے مقدار حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم محمد اکمل خاں مرحوم شروع در تسوید و تحریر آں نمودہ بود' بمساعدت توفیق الٰہی و معاضدت اقبال شاھنشاھی در نیکو ترین ازمنہ و بہترین

* تاریخ نثر اردو صفحہ ۸۲ —

ادنہ زیب و زینت اختتام پذیرفت .... الحمد للہ الذی بتوفیقہ تمت هذا التفسیر یوم الجمعہ فی التاسع من ذی القعدہ بید الحقیر محمد بدرالدین مفوض اللہ بن فیض اللہ .... " —

کیا افسوس ہے کہ اختتام تفسیر کا دن اور تاریخ موجود ہے لیکن سنہ ندارد۔

حکیم صاحب کا انتقال جیسا کہ حکیم محمد احمد خاں صاحب کی زبانی معلوم ہوا سنہ ۱۲۱۹ ھ (سنہ ۱۸۰۴ ؁) میں ہوا، اس سے ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ اس سے قبل کا ہوگا —

حکیم صاحب اسے تفسیر کہتے ہیں لیکن در حقیقت ترجمہ ہے، البتہ موقع سے کہیں کہیں ایک آدھ لفظ ترجمے کی صراحت کے لیے بڑھا دیا گیا ہے جیسا کہ نمونے سے معلوم ہوگا —

اس کی زبان شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحب کی طرح ہندی میں نہیں بلکہ ریختے میں ترجمہ کیا ہے —

(الم کی ابتدائی آیات کا ترجمہ)

میں ہوں اللہ بہت جاننے والا۔ وہ کتاب کہ اگلی کتابوں میں وعدہ اتارنے کا تھا یہ کتاب کامل ہے یعنی قرآن کہ کچھ شبہ نہیں ہے بیچ اوس کے اللہ کی طرف سے آنے میں۔ راہ دیکھانے والی ہے پرہیزگاروں کو شرک سے اور گناهوں سے۔ وہ پرہیزگار کہ ایمان لاتے هیں بغیر دیکھے کہ اللہ موجود ہے یا ساتھ وحی کے اور قیامت کے یا قضا و قدر کے اور قائم رکھتے هیں نماز پانچ وقت کی کو ساتھ شرطوں اور ادب کے اور جس چیز سے کہ روزی دی ہے ہم نے اون کو خرچ کرتے هیں اوپر عیال کے اور فقیروں کے "۔

(اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پناہ پکڑتا ہوں میں اور اچھا کرتا ہوں میں ساتھ اللہ کے بدی شیطان وسواس ڈالنے والے کی سے کہ دور رحمت سے ہے اور نکالا گیا بہشت سے- (بسم اللہ الرحمن الرحیم)- شروع کرتا ہوں میں قرآن کو ساتھ نام اللہ لایق بندگی کے بہت بخشنے والا اوپر خلق کے وجود دینے سے دنیاں میں' مہربان ہے اوپر اون کے آخرت میں—

(ترجمۂ سورۂ فاتحہ)

جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے لایق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کو' بخشنے والا وجود کا آخرت میں' مہربان داخل کرنے بہشت کے سے- مالک دن قیامت کے کا' تصرف کرنے والا اوس دن جو چاہے گا کرے گا- خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں اوپر بندگی تیری کے- دیکھا تو ہم کو راہ سیدھی بیچ قول کے اور فعل کے اور اخلاق کے' راہ اون آدمیوں کی ...... * اور نہ راہ گمراہوں کی—

(سورۂ یونس کی چند ابتدائی آیات کا ترجمہ)

میں ہوں اللہ کہ دیکھتا ہوں سب چیز کو- یہ آیتیں قرآن با حکمت کی ہیں یا محکم ہیں متشابہ نہیں- آیا ہے واسطے آدمیوں کے تعجب یہ کہ وحی کی ہم نے طرف ایک مرد کے اونہیں کی جنس سے یہ کہ ڈرا تو آدمیوں کو عذاب اللہ کے سے اور خوش خبری دے تو اون لوگوں کو کہ ایمان لاے ہیں یہ کہ واسطے اون کے ہے آگے آنا یا رضا (خوشی) خدا کی—

* اس مقام سے چند لفظ سہو ہو گئے ہیں—

شاہ عالم بادشاہ ہی کے عہد میں ایک اور ترجمہ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی سرپرستی میں ہوا- بعض وجوہ سے یہ ترجمہ چھپکر شایع نہیں ہونے پایا- اس کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے —

"ترجمۂ قرآن شریف بزبان ہندی

اس کے شروع کی تاریخ موافق سن ہجری کے تمام اس مصرع سے نکلتی ہے-

صراط المستقیم الحق ہے بالکل (۱۲۱۸)

ترجمہ قرآن شریف کا ہند کے اہل اسلام کی خاطر سلطنت میں ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ اور حکومت میں زبدۂ نو آئینان عظیم الشان مشہر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کے' حسب الحکم صاحب والا قدر عالیشان مدرس تفریق .... جان گلکرسٹ صاحب دام حشمتہ' کے کہا اور ابتدا سے انتہا تک جو جو احوال گذرا ہے خاتمے میں لکھا' اس کے مطالعہ کرنے سے تمام حقیقت معلوم ہوگی" —

جہاں تک اردو زبان کی ساخت اور ترکیب کا تعلق ہے یہ ترجمہ پہلے کے تمام ترجموں کے مقابلے میں زیادہ بامحاورہ اور سلیس ہے- اگرچہ الفاظ کی رعایت مد نظر رکھی ہے کیونکہ ایسے صحیفوں کے ترجمے میں اس کے بغیر چارہ نہیں' تاہم حتی الامکان اردو کے روزمرہ کو ہاتھہ سے جانے نہیں دیا اور جملے کی ترکیب عربی کے نہج پر نہیں بلکہ اردو کے ڈھنگ پر ہے- یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ بغیر کسی دقت کے صاف صاف سمجھہ میں آتا ہے —

کاظم علی جواں جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے اور جن کی تصنیف سے کئی کتابیں ہیں' اس ترجمے کی زبان کی اصلاح و درستی پر مامور

تھے - انہوں نے آخر میں ایک خاتمہ لکھا ہے جس سے اس ترجمے کے آغاز و انجام اور اهتمام کی پوری کیفیت معلوم ہوگی - خاتمے کی عبارت بجنسہ یہاں نقل کی جاتی ہے —

"الحمد للہ والمنۃ کہ ماہ مبارک رمضان کی نویں تاریخ سنہ ۱۲۱۹ بارہ سے اُنیس هجری میں پنجشنبے کے روز ظہر کے اول وقت قرآن شریف کا ترجمہ زبان ریختہ میں تمام ہوا - شروع اس کی حسب الحکم صاحب عالیشان جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ کے ذالحجہ میں کہ سن بارہ سے سترہ تھے ہوئی تھی - مولوی امانت اللہ صاحب اور میر بہادر علی صاحب میر منشی اور احقر ترجمے اور محاورے کے لیے مقرر تھے اور چندے مولوی فضل اللہ کو بھی ارشاد حضور ہوا تم بھی شریک ہو کہ بدون دو مولویوں کے یہ امر عظیم ترجمے کا بخوبی سرانجام نہ ہوسکے گا - چنانچہ نام ان کا شروع میں مندرج ہے - پانچ سیپارے جب ترجمہ ہوے، ایسی کچھہ نزاع لفظی ان دونوں صاحبوں کے درمیان آئی کہ ان میں سے مولوی فضل اللہ صاحب رہے اور دوسرے صاحب کے عوض حافظ غوث علی صاحب مقرر ہوے- یہ دونوں بدستور ترجمہ کرتے تھے - جب صاحب ممدوح ذیقعدہ کی دسویں تاریخ سن بارہ سے اُنیس (۲۲ فروری سنہ ۱۸۰۴ ع) میں ولایت کو تشریف لے گئے اور اصالتاً مدرسی کپتان مویٹ صاحب دام حشمۃ کو حضور پرنور سے مقرر ہوئی، اُسی طور سے موافق اُن کے ارشاد کے کام ترجمے کا جاری رہا - چنانچہ اس عرصے میں اکیس سیپارے ہوے تھے کہ صاحب عالیشان نے بندے کو فرمایا مولویوں میں سے ایک مولوی ترجمہ کرے اور تو ہی محاورے کی درستی میں رہ، قبول کر کے مولوی فضل اللہ صاحب ترجمہ کرتے رہے اور بندہ محاورہ کرتا رہا - اور اب حق سبحانہ و تعالیٰ کے تفضلات سے وہ کام

سرانجام کو پہنچایا مگر نظر ثانی باقی ہے' جس طرح سے ارشاد ہوگا کرنے میں آوے گی - لیکن وے لوگ جو ہمیشہ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرتے ہیں' اُن کی خدمت میں التماس یہ ہے کہ مہربانی سے نگاہ کریں - قرآن شریف کہ کلام الٰہی ہے اور فصاحت و بلاغت ایسی کہ چشم و گوش فلک نے بھی نہ دیکھی نہ سنی اور جس عصر میں کہ اس کا نزول ہوا ہے کیسے کیسے اہل فصاحت و بلاغت عربستان میں تھے' اس کی عبارت جو سراسر صنعتوں سے بھری ہوئی ہے اور تمام مسجع اور مقفا ہے' نگاہ کرکے حیران تھے - بشر کا کیا مقدور ہے کہ اس کے ایک حرف کی خوبی بیان کرے اور ایک زبان تو کیا ہے اگر تمام رونٹیں بدن کے زبان گویا ہوں دونوں جہاں کی جنّلی خلقت ہے تو بھی ذرے کے برابر مدح و ثنا نہ کرسکے - الحق کہ کہاں کلام خالق کا اور کہاں زبان مخلوق کی - پس جو جو صنائع و بدائع اس میں ہیں من وعن اس کا ترجمہ کس سے ہوسکتا ہے مگر فارسی ترجمے اور تفسیروں سے جس لفظ کے جو معنے مترجموں اور مفسروں نے لکھے ہیں' زبان ریختہ میں اُن کے موافق لکھنے میں آیا ہے - تفسیر بیضاوی اور مدارک و جلالین تین عربی تفسیریں' بحر مواج اور تفسیر حسینی کہ یے دو فارسی ہیں اُن سے ترجمہ کیا ہے - جہاں کہیں جو کچھ اختلاف سمجھے اُن پانچوں تفسیروں میں دیکھ لے' ایک نہ ایک میں موافقت پائی جاے گی - اور کہیں کہیں جو الفاظ ماضی و حال و استقبال کے ہیں اور مفسروں نے ماضی کو حال اور حال کو استقبال کیا ہے' یہاں بھی اسی طریق کی پیروی ہوئی ہے - مگر جہاں کہیں زمانے کی مطابقت سے ہندی عبارت کے مطالب میں اختلاف نظر آیا' چار و ناچار بطور محاورے کے رہنے دیا اور اگرچہ لفظ کے ترجمے کی رعایت سراسر رکھی ہے پر کہیں کہیں

اصل مطلب لیا ہے کیوں کہ لفظ کی متابعت سے معنوں کا فوت ہونا قباحت عظیم ہے ' اِس بات کو ترجیح دی - بہر نوع مطلب نہیں چھوٹا ' اس لیے محاورے کو چنداں دخل نہیں دیا کہ کتابی عبارت کا داب روز مرے کی بول چال سے اور ہے —

جزو مقطعات کا ترجمہ جو بالاتفاق نہ پایا نہ کیا - اور مفعول مطلق ہندی میں شاذ و نادر ہے کہیں جو رہ سکا تو رکھا و الا نہ یا چھوڑ دیا یا لفظ تاکید زیادہ کیا کہ اس سے تاکید غرض ہے - اور عربی میں التفات بہت سا ہے اور ہندی میں کم ' لیکن وہ قاعدہ رعلے دیا کہ بہت بتکرار ہے - واؤ عاطفہ اور حرف ف اور وہ الفاظ کہ معنے میں تحقیق کے آتے ہیں قرآن شریف میں بہت ہیں اور زبان عربی میں بہت فصاحت رکھتے ہیں - ہندی میں گوکہ ان کی کثرت محاورے کی رو سے اس قدر نہیں لیکن ترک کرنا ان کا جائز نہ دیکھا ' اس سبب سے جس جملے میں جس قدر آے ترجمہ کیا - اور تمام کلام اللہ قلیل العبارت و کثیرالمعنی ہے جتنے اہل اسلام کے فرقے ہیں سب کے دین و ایمان کی بنا اسی سے ہے' اجتہاد کرکے ہر ایک اپنا اصل اصول یہیں سے راست کرتا ہے - اور شان نزول ہر ایک آیت کی ہے اگر لکھنے میں آتی تو عبارت بہت طویل ہو جاتی ' اگرچہ بعض جگہ چاہا تھا کہ کچھ بیان کیجے - پہلے جس صاحب ممدوح کی فرمائش تھی انہوں نے ارشاد کیا کہ یہ ترجمہ کلام اللہ کا اگرچہ ہندی زبان میں ہے ہند کے لوگ بخوبی سمجھیں گے تاہم جب تک معلومات بوجہ احسن نہ ہوگی ' کیوں کر مطلب کو پہنچیں گے - ہر ایک غبی کو کب یہ استعداد ہے کہ کتاب کی عبارت کا بیان گوکہ اس کی زبان میں ہو کر سکے - یے اہل فہم و ذکا کے لیے ہے کہ اگر آپ کماحقہ نہ سمجھ سکے کسی صاحب استعداد سے دریافت کرے - یقین ہے

کہ سچ کتابیں کہ اس عصر میں عربی و فارسی سے ہندی ہوئی ہیں اور اُن کے مطلب جس طرح چاہیے ہر ایک بیان نہیں کر سکتا ' یہ تو کلام اللہ کا ترجمہ ہے اس کو ہر ایک اس طرح کیونکر سمجھے کہ محتاج کسی اُستاد کے پوچھنے کا نہ ہوگا - جہاں کہیں کہ عالم و فاضل جس عبارت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جنہوں کو کم استعداد ہے وے اس کی دریافت میں عاجز ہیں ' اُن کی آسانی کے لیے بطور حاشیہ ایک خط فرضی کرکے مطلب کو بڑھا دیا ہے تا اُس نشان سے معلوم ہو کہ یہ ترجمے سے جو زیادہ ہے ہندی زبان کے ربط کے لیے بڑھا دیا ہے - پھر یہ اپنی طرف سے تصرف نہیں کیا ' تفسیروں کے روسے ہے - اور شروع ترجمے میں خلقت نے اس بات میں بہت سی شورش کی تھی کہ بڈا اس ترجمے کی ہوتی ہے نہایت دین و آئین سے بر خلاف ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ ہندی زبان میں ہوتا ہے - آخرش جو اہل فہم اور فراست تھے انہوں نے جواب دیا کہ اگر فارسی میں ترجمہ ہوا ہے تو ہندی میں کیا کفر ہے - غرض کہ فضل الٰہی سے وہ آغاز انجام کو پہنچا - حق تعالیٰ انہیں اس کا بڑا اجر دے جنہوں نے اس کی ابتدا کی اور جنہوں نے انتہا کو پہنچایا - اہل اسلام پر ان کا بڑا احسان ہے کہ جب تک کوئی صرف و نحو اور منطق و معقولات اور بہت سے علوم حاصل نہ کرتا ہرگز کلام اللہ کی عبارت کے معنے دریافت نہ کر سکتا - مگر ترجمے جو فارسی اور فارسی تفسیریں ہیں ان سے معنے سمجھتا تو بھی وقت پر یاد نہ رہتے ' یہ اُن کا تفضلات ہے کہ برائے خود ایک ایسی کتاب ترتیب دی کہ جس سورت میں جس آیت کا ترجمہ چاہے پڑھ لے - اور پہلے اس کی صلاح و مشورت بہت سی ہوئی کہ ہر ایک صفحے پر کلام اللہ لکھا جائے اور اس کے مقابل دوسرے صفحے پر

ترجمہ مثبت ہو - لیکن صحت اعراب کے لیے یہ امر موقوف رکھا کہ ہر کاہ کتابت میں باوجود ہزاروں مقابلوں کے غلطی اعراب کی رہتی ہے ' اس کا تو منظور چھاپا ہے کیونکر غلطی نہ رہے گی اور جب کہ غلطی رہی یک زیر و زبر و پیش میں یا ساکن کرنے میں معنے لفظ کے اور ہو جائیں گے ' ترجمے کی مطابقت میں خلل عظیم واقع ہوگا - ہاں جس کو یہ غرض ہوگی کہ قرآن کے جملے اور آیت و مطلق ترجمہ سے مقابلہ کرے قرآن شریف بکثرت ہیں مقابلہ کرے گا ' چنداں دقت نہیں —

اللہ تعالی اس سرکار دولت مدار کو قائم رکھے کہ ان کی بدولت دین و دنیا کے امور بخوبی سرانجام پاتے ہیں ' قیامت تلک نام نیک ان کا صفحۂ روزگار پر رہے گا —

کاظم علی جوان نے یہ خاتمہ موافق ارشاد صاحب ممدوح کے لکھا ہے اور جو کچھہ آغاز سے انجام تلک حقیقت گزری ہے وہ سب اس میں مندرج کی ہے —

یہ التماس ہے خدمت میں سب کے شام و سحر
امید وار دعا ہے یہ بندۂ مضطر "

ذیل میں بطور نمونے کے دو ایک سورتوں کا ترجمہ لکھا جاتا ہے :—

سورۂ فاتحہ کا ترجمہ

خدا کے نام سے جو بڑا بخشنے والا نعمت دینے ہارا ہے - ہر ایک حمد خدا کے لیے ہے کہ وہ مالک سب کا بخشنے ہارا ' روزی دینے والا ' خداوند روز قیامت کا ہے - ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں - دکھا ہم کو سیدھی راہ ' ان کی راہ کہ جن کو تو نے نعمت دی نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی —

الم کی چند ابتدائی آیتوں کا ترجمہ

یہ وہ کتاب ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں - راہ دکھانے والی اُن پرہیزگاروں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز کیا کرتے ہیں اور جو کچھ کہ ہم نے روزی اُن کو دی اُس میں سے خیرات کرتے ہیں اور جو کہ ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو تجھ پر بھیجی گئی اور اُس پر جو تجھ سے آگے نازل کی گئی اور قیامت پر وے ہی یقین لاتے ہیں - وے اپنے پروردگار کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں اور وے ہی مطلب کو پہنچیں گے - تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوئے انہیں برابر ہے خواہ تو اُن کو ڈراوے یا نہ ڈراوے ایمان نہ لاویں گے - خدا نے اُن کے دلوں اور ن کے کانوں پر مہر کی ہے اور پردے اُن کی آنکھوں پر ہیں - انہیں کے لیے بڑا عذاب ہے " —

مد شاہ عالم ہی کی یادگار " تفسیر چراغ ابدی " بھی ہے - اس کے صنف عزیزاللہ ہمرنگ اورنگ آباد دکن کے باشندے ہیں - سنہ تالیف ۱۲۲۱ ہے - یہ صرف آخری پارے کی تفسیر ہے - مولف نے دیباچے میں تفسیر ی ضرورت ، زبان کی نوعیت ، سنہ تالیف کی کیفیت وغیرہ کا ذکر ضاحت سے کردیا ہے - یہاں اس کی نقل کردی جاتی ہے تاکہ ان تمام مور پر آگاہی ہوجائے —

" امابعد ، عرض کرتا ہے دوستداروں سے ، آشنایوں سے غمگساروں سے ، اویہ نشین کوچۂ گمنامی و بے استعدادی ، طالب منصب وارستگی و زادی فقیر عزیزاللہ ابن میر عالم الحسینی القادری النقشبندی اورنگ بادی المتخلص بہمرنگ عفااللہ عنہ ومن والدیہ و احسن الیہما والیہ کہ سب دیکھا میں اکثر تفسیریں کلام اللہ کی زبان عربی اور فارسی میں واقع

ہیں اور کم علمی بعض اہل ہند کی دریافت سے معنے ان کے مانع۔ اگرچہ بعض عزیزوں نے زبان دکھنی ہندی آمیز میں تفسیر جز آخر کی لکھی ہے لیکن بہ سبب الفاظ دکھنی لطف زبان ہندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا واسطے مطالعہ اوس کے رغبت کم لاتا۔ اس واسطے خاطر قاصر میں اس فقیر کی آیا کہ تفسیر جز آخیر کی زبان ہندی میں کہ بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہے لکھے اور بعض فوائد کہ دوسری تفسیروں میں نہیں ہیں کتب معتبرہ سے جمع کرکے اس میں داخل کرے کہ عوام اس سے باوجود قلت بضاعت کے فائدہ تمام اٹھاویں اور اس حقیر کی دعاے مغفرت سے یاد دلاویں —

تا اسے ہو وسیلۂ عقبیٰ اور سب کو مفید روز جزا

بعد تقدیم استغفارے کے اور استعانت حضرت باری کے ہر سورۃ کی فضیلت اور نفع اور تفسیر اور خاصیت اور خاتم اور تعبیر کو بعضی سورۃ کی فضیلت اور خاصیت کہ مخصوص نماز کے اندر پڑھنے میں یا مخصوص آیت یا آیتوں میں تھی، تمام قید قلم لاکر اول تعوذ اور تسمیہ اور سورۂ فاتحہ سے کہ سبب یمن اور برکت کا ہے، مناسب بوج کر شروع کیا اور واسطے نشانی کے اول حرف ایک سرخی سے علاحدہ لکھا اور اشارہ ان حرفوں کا اس قطعے میں کیا —

قطعہ :—

ف فضیلت کی نشانی میں سے ہے منفعت اور صلوۃ و ختم کی ہیگی علامت صاد میم
خاصیت تعبیر کا ہیگا اشارا خ و ت ہےامید ہمرنگ کو حق سے سدا لطف عمیم

اور نام اس تفسیر کا "چراغ ابدی" (سنہ ۱۲۲۱) کہ سال تاریخ کا اُس کے اسی کلمے سے نکلتا ہے، رکھا۔ توقع علماے روزگار اور بلغاے ہر

دیار سے اور تمنا فضلائے اعصار اور فصحائے امصار سے وہ ہے کہ اگر اس میں سہو یا خطا کہ مقتضی بشریت کا ہے، پاویں تو قلم الطاف رقم سے اصلاح دیویں اور راہ اعتراض اور اغماض کی نہ لیویں۔

قطعہ :۔

کاملوں سے توقع ہے ہمرنگ   کہ توجہ سے ان کے ہوے فلاح
پاویں گر بیچ اُس کے سہو و خطا   لطف اپنے ستی کریں اصلاح

ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے جس سے تفسیر کا سنہ تالیف معلوم ہوتا ہے۔ قطعہ :۔

محنت اور کوشش بسیار ستی اے ہمرنگ   جب یہ تفسیر تمام ہوئی بعون صمدی
نام میں چاہا رکھوں ایسا کہ نکلے تاریخ   فکر کر دل نے اٹھا بول "چراغ ابدی"

اس میں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ مولف نے اورنگ آباد کی زبان کی علحدہ حیثیت قرار دی ہے جس کا دکھنی زبان سے تعلق نہیں ہے۔ اور ہے بھی یہی کہ ابتدا سے اور خصوصاً شاہجہاں اور اورنگ زیب کی صوبہ داری میں اس کا تعلق زیادہ تر شمالی ہند کی زبان سے رہا اور وہاں کے اہل زبان اور شعرا نے جو زبان لکھی ہے وہ حیدرآباد، بیجاپور اور علاقۂ مدراس کی زبان سے بالکل الگ ہے۔ وہ زیادہ تر شمالی ہند کی زبان کی تقلید کرتے تھے۔

نمونۂ تفسیر

(عم یتساءلون) کس چیز سے پوچھتے ہیں کافراں (عن النباء العظیم) پوچھتے خبر بڑی سے یعنے قرآن اور نبوت اور قیامت سے (الذی ہم) ایسی وو خبر کہ یہ کافراں (فیہ) بیچ اوس خبر کے (مختلفون) اختلاف کرنے والے ہیں۔ یعنے قرآن کو جادو اور شعر اور کہانت سے نسبت دیتے ہیں

ور نو پیدا اور کہانی بولتے ہیں اور پیغمبر علیہ الصلوات اللہ الاکبر کو کہتے ہیں کہ وو پیغمبر ہے یا نہیں، یا ساحر ہے یا شاعر یا مجنون اور دن قیامت کا بعضے کہتے تھے کہ ہویگا اور بتاں ہماری شفاعت کریں گے اور بعضے کہتے تھے کہ دن قیامت کا ہرگز نہ ہویگا اور سوائے زندگی دنیا کی پھر اور زندگی نہیں ہے - اور بعضے شک میں تھے کہ ہوگی یا نہیں، حق سبحانہ تعالیٰ شانہ فرمایا (کلا سیعلمون) حقا کہ شتابی ہے کہ جانیں گے کافراں دن قیامت کا نزدیک جان کندن کے اور مرنے کے، وو دن حق ہے واسطے ظاہر ہونے نشانیاں اوس دن کی بیچ اوس وقت کے - (ثم کلا سیعلمون) پیچھے تحقیق شتابی ہے کہ جانیں گے دن قیامت کے جھوٹی باتیں اور اعتقاد پلید اپنے - (الم نجعل الارض) آیا نہیں ہم نے کیا زمین کے تئیں (مہادا) فرش ایک بچھا ہوا کہ مکان رہنے کا تمہارے ہوے —

بوجا چاہیے کہ اندر کرۂ آب کے زمین مانند کیند کے پڑی ہے ایسے کہ آدھی سے زیادہ پانی میں غرق ہے اور آدھی سے کم باہر ہے اور جو کہ باہر ہے وو دو قسم پر ہے - ایک قسم تو محض ویران ہے کہ نشانی معموری کی بیچ اوس کے اصلا نہیں دوسری قسم معمور ہے کہ اُسے ربع مسکون کہتے ہیں اور اس میں دریائیں، پہاڑیں اور میدانیں اور جنگلوں اور شہریں واقع ہیں اور مساحت اوس کی ایک سو بیس برس کی راہ ہے - اوس میں سے نود برس کی راہ تو یاجوج اور ماجوج جو فرزندوں سے یافث بن نوح علیہ السلام کے ہیں اور بارا برس کی راہ حبشہ بستے ہیں اور آٹھ برس کی روم اور تین برس کی راہ عرب رہتے ہیں اور سات برس کی راہ تمام لوگ دوسرے ساکن ہیں - امام احمد قسطلانی رحمۃ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح میں اس طرح کی تفصیل بعضی

کتابوں سے نقل فرمائی ہے اور یہی شرح مذکور میں لائے ہیں کہ زمین میں مخلوقات بہوت ہے ' اتنی کہ بہ نسبت فرشتوں کے اور شیاطین کے اور جن اور بنی آدم کے ہزار میں کا ایک حصہ ہے —

فائدہ - تفسیر بقائی میں لائے ہیں کہ زمین پانی پر ہے اور پانی مچھی پر اور مچھی تختے پر اور تختہ فرشتے کے سر پر اور فرشتہ بیل کے سر پر اور بیل مچھر پر اور مچھر کف پر دریا کے اور دریا تیری پر اور تیری دوزخ کے سر پر اور دوزخ اندھارے پر اور اندھارے کے نیچے سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی جانتا نہیں ہے کہ کیا ہے - واللہ اعلم و احکم (الجبال) اور نہیں کیا ہم نے پہاڑوں کے تئیں (اوتاداً) میخیں زمین کی تا بسبب اون کے زمین مضبوط رہے - (و خلقناکم) اور پیدا کیا ہم نے تم کو (ازواجاً) ہر طرح کے جوڑے نر اور مادہ تاکہ نسل تمہاری باقی رہے یا پیدا کیا ہم نے تمہیں طرح طرح کی کالی اور گوری دراز اور کوتہ خوب اور ناخوب - (وجعلنا) اور کیا ہم نے (نومکم) نیند کو تمہاری (سباتاً) راحت بدن کی تمہاری کہ نیند حس اور حرکت کو موقوف کرے تا قوت حیوانی آرام پکڑے اور ماندگی تمہاری زائل ہووے " —

اسی عہد کی ایک اور تفسیر ہے - یہ بھی پارۂ عم کی ہے ' لیکن منظوم ہے - اس کے مصنف مولانا شاہ غلام مرتضیٰ تخلص جنوں ہیں - مصنف کے نام کی نسبت سے کتاب کا نام بھی " تفسیر مرتضوی " ہے - میرے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ ہے اور ایک مطبوعہ نسخہ جو سنہ ۱۲۶۹ ہجری میں نسخ ٹائپ میں چھپا - مطبع کا نام مطبع علوی ہے جو مولوی عبدالماجد بن حکیم مولوی عبدالمجید کا تھا - لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مقام کا نام نہیں لکھا اور اس لیے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ یہ مطبع کہاں تھا - تصحیح اس کی

"حافظ محمد صدیق صاحب اور مولوی محمد وجیہ صاحب مدرس مدرسہ کمپنی بہادر" نے کی' اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کلکتے میں ہوا۔ قلمی نسخے میں منظوم دیباچہ بھی ہے جو مطبوعہ نسخے میں نہیں۔ اس دیباچے سے مصنف کا اتا پتا اور سنہ تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ اپنا نام کئی جگہہ لکھا ہے :—

سن غلام مرتضیٰ میرا ہے نام
ٹک سمجھہ لیجو کہ ہوں کس کا غلام

مصحفی نے تذکرہ ریاض الفصحا میں ان کا ذکر ہے لیکن سوائے نام اور تخلص کے اور کچھہ نہیں لکھا۔ اپنے مرشد کی تعریف میں بھی کچھہ شعر لکھے ہیں —

حضرت سید محمد تو ہے پیر
دونو عالم میں مرا ہے دستگیر

اپنے والد کا بھی ذکر کیا ہے اور چند شعر ان کی خدمت میں عرض کیے ہیں —

بیگماں اے شاہ تیمور ولی علم ہے عالم میں تیرا منجلی
چاھیے ہو باپ کا بیٹا شبیہ کیونکہ ہے الولد سر لابیہ

استاد کی بھی مدح کی ہے جن کا نام مولوی محمد برکت اللہ تھا —

ہے مرا استاد فخر عالماں
مولوی برکت محیط بیکراں

اس کے بعد بادشاہ وقت شاہ عالم بادشاہ کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کی ہے —

وارث تیمور و زیب تاج و تخت شاہ عالم بادشاہ نیک بخت

کشور ہندوستاں کا شاہ ہے حامئی دین رسول اللہ ہے

بادشاہ کے بعد وزیرالممالک نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح ہے :—

آصف الدولہ وزیر مملکت حامیٔ دیں ہے و شہر سلطنت
آصف وقت و سلیمان زماں ہے سکندر بخت و دارائے جہاں

سبب تصنیف کتاب میں سنہ تالیف بھی بتا دیا ہے :—

سن تھا ہجری ان دنوں میں جان لے
یک ہزار و ایک سو چورانوے

تفسیر کا انداز ذیل کے نمونے سے ہوگا :—

عم یتساءلون

اصل میں تھا عم عما اے پسر نون کیتئیں کر میم پھر ادغام کر
کر الف کو حذف سن معنے بجاں پوچھے ہیں کس چیز سے یہ کافراں

عن النباء العظیم الذی فیہ مختلفون

اس خبر سے کہ بڑی ہے بے خلاف کرتے ہیں سب جس میں باہم اختلاف
یا کتاب اللہ ہے نبا عظیم قول شاعر جس کو کہتے ہیں لئیم
یا کہیں ہیں سحر یا ہے مفترا نزد بعضے ہے کلام کبریا
یا محمد ہے کہ جمع مومنیں اس کیتئیں کہتے ہیں ختم المرسلیں
یا کہ ہے اس نبا سے محشر مراد اس سے نہ آگاہ جز رب العباد

ہولاء شفعاؤنا عنداللہ

حشر کو کہتے ہیں حق ہے مشرکاں ہم کو بخشاویں گے یہ حق بتاں

ان ہی الا حیوتنا الدنیا

منکران حشر کہتے ہیں ہنوز نہ مگر یہ زندگی ہے چند روز

بل ہم فی شک منہا

رکتے ہیں شک میں زاں نبا عظیم   کیونکہ ہوں گے زندہ یہ عظم رمیم
کہ رد ہوجاے قول نا صواب   یہ دیا کفار کو حق نے جواب

الم نجعل الارض مہادا

آیا یہ ہم نے کیا ہے خاک سے   فرش گسترد ہ تمہارے واسطے
اے بچھای ہم نے پانی پر زمیں   مردہ اور زندوں کے رہنے کیتئیں

والجبال اوتادا

اور کیا کوہوں کو میخیں استوار   تانہ کانپے اور زمیں پکڑے قرار

و خلقنا کم ازواجا

اور تمہیں پیدا کیا ہے ہم نے جفت   اے نر و مادہ کو بے گفت و شنفت
یعنے زن اور مرد کو پیدا کیا   ایک کا دل ایک پر شیدا کیا
تاکہ ان دونوں سے پیدا ہو پسر   جیسے آب و خاک سے کشت و ثمر
بامراد ازواج سے ہے قسم قسم   مختلف در صورت و الوان و جسم

زبان صاف سیدھی ہے - لیکن ایسی چیزوں کا ترجمہ اور وہ بھی نظم
ں سراسر بے لطف ہوجاتا ہے -

ایک صاحب سید بابا القادری متوطن حیدرآباد نے بھی ایک تفسیر
ی ہے جس کا نام " فوائد البدیہیہ " ہے - اصل میں یہ قرآن شریف کا
جمہ ہے تفسیر براے نام ہے' کہیں ایک آدہ جملہ یا لفظ بطور تفسیر کے
جاتا ہے خود مولف نے بھی اسے ترجمے ہی سے موسوم کیا ہے جیسا کہ
لدہ سطور سے معلوم ہوگا - یہ بھی شاہ عبدالقادر کی طرح اپنی زبان کو
ی سے تعبیر کرتے ہیں - سنہ تصلیف ۱۲۲۰ ھجری ہے - اس کا ایک نسخہ
ب خانۂ آصفیہ سرکار عالی میں موجود ہے - آخری حصہ نہیں ہے - اس
خطبے (دیباچے) میں اس کے مولف' سبب تالیف اور سنہ تالیف کی

صراحت موجود ہے - خطبے کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے —

اما بعد فیقول الفقیر الحقیر بلا بضاعت سید بابا القادری الحیدر آبادی بن سیدی و مرشدی و علامة العصر الجامع بین العلوم الظاہر والباطن و صاحب التصانیف فی المعقول والمنقول والتصوف سید شاہ محمد یوسف القادری بن سید شاہ محمد اسکنہم اللہ المحبوبة جنانہ انی قد اخذة الخرقة من اخی العینی حضرت شاہ عبداللہ القادری المتعارف بہ قطبی صاحب نفعنا اللہ بہ و عمرہ الی کبر الاکبر روزے چند بتدریس و وعظ اشتغال داشت کہ بعضے از دوستان صمیمی سید لعل شاہ و سید قلندر بخش متوطن سرہند از اولاد حضرت بندگی اسمعیل قدس سرہ خصوصاً مرزا محمد بیگ بن مرزا حاجی بیگ خاں و میاں محمد علی باعث کہ شدن (؟) علماء پیشین علی قداهیم تفاسیر عربی و فارسی تالیف فرمودہ اند - الا کہ ہم مایان مغلوب التصور از ادراک آں قاصر، باید کہ تفسیر بعنوان ترجمۂ کلام مجید بزبان ہندی در تحریر آید کہ فائدہ وغیرہ از قصص مرتب الاحوال گردد - لہذا نظر وفور اشتیاق ایشاں نمودہ خواست کہ انچہ در فہم ناقص آید بزبان ہندی ترجمۂ کلام ربانی و بعضے کلام شان نزول مفید بہ قلم آرد - لہذا مستدعی از ناظران عالی فطرت آنست ہر جاکہ خطا و سہو واقع شود قلم اصلاح بران جاری دارند و از طعن معاف فرمایند - پس شروع کردم این کتاب فی شہر ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۰* اربعین و مائتین بعد الالف الہجریة المبارکة - در عہد نواب مستطاب سکندر نژاد فریدوں عصر نواب سکندر جاہ بہادر ادام اللہ ملکہ و متع المسلمین بطول بقائہ ... ... و نام نہادم تفسیر را " فوائد البدیعیہ " —

---

* کاتب نے اصل کتاب میں غلطی سے سنہ ۱۲۰۴ ھ لکھ دیا ہے —

ترجمے کا نمونہ یہ ہے —

(ذالک الکتاب) یہ کتاب یعنے قرآن شریف - (لا ریب فیہ) نہیں شک ہے بیچ اس کتاب کے ' اس کتاب کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ مالک ابن ضیف یہودی تھا - مسلمانوں کے دل میں شک ڈالتا تھا کہ یہ کلام اللہ وہ کتاب نہیں ہے کہ جس کے نازل کرنے کا وعدہ خدائے تعالیٰ نے توریت میں کیا تھا - (ھدی للمتقین الذین) ھدایت کرنے ھارا ہے - یہ کلام اللہ واسطے پرھیزگاروں کے ایسے پرھیزگار (یومنون بالغیب) ایمان لاتے ھیں وہ لوگ ساتھ غیب کے یعنے جو چیز کہ نہیں دیکھی - جیسا کہ جنت اور دوزخ اور سوائے اس کے - (یقیمون الصلوٰۃ) اور قائم کرتے ھیں نماز کے تئیں - (و مما رزقنٰھم ینفقون) اور اس چیز سے کہ رزق دیے ھم نے ان لوگوں کے تئیں خرچ کرتے ھیں وہ لوگ خدا کی راہ میں —

(والذین یومنون بما انزل الیک) اور ایمان لاتے ھیں اس چیز سے کہ نازل کیا گیا اول تمہارے یعنے توریت اور انجیل اور زبور'' —

پارۂ عم کی ایک تفسیر سید شجاع الدین کی لکھی ہوئی ہے - خاتمے پر یہ عبارت ثبت ہے —

" بعون عنایت الٰہی این تفسیر تصریح کہ سید شجاع الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بزبان میسلت ترجمان بیان فرمودند بتاریخ یازدھم روز جمعہ شہر محرم الحرام ۱۲۶۸ ھجری مقدسہ اختتام یافت " —

اگرچہ یہ سنہ کتابت ہے لیکن تالیف کا سنہ بھی یہی یا اسی کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے - ترجمہ و تفسیر کا نمونہ یہ ہے - (عم یتساءلون) کس چیز سے آپس میں ایک کو ایک پوچھتے ھیں کافر - پھر آپ ھی فرمایا (عن النباء العظیم) خبر بڑی سے کہ وہ قرآن ہے - (الذی ھم فیہ) ایسا

قرآن کہ وہ کفار اوس میں (مختلفون) اختلاف کرنے والے ہیں کوئی کچھہ کہتا ہے اور کوئی کچھہ - (کلا سیعلمون) تحقیق جلدی جانیں گے جب قیامت آے گی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے اور قرآن خدا کا کلام تھا - (ثم کلا سیعلمون) پھر تحقیق جلدی جانیں گے کہ برا کیا ہم نے جو ایمان نہ لاے - (الم نجعل الارض مہادا) آیا نہیں کیے ہم زمین کو بچھونا کہ اوس پر سب ٹھہریں - (والجبال اوتادا) اور پہاڑوں کو میخیں - جب زمین کو پیدا کیا تو وہ پانی پر ہلتی تھی پھر پہاڑوں کی میخیں اوس پر رکھا تب زمین ٹھہری - (وخلقنا کم ازواجا) اور پیدا کیے ہم تمہیں جوڑے جوڑے کہ تم سے اولاد ہوے بھانت بھانت کی جیسے کالی گوری اونچی نیچی اچھی بری - (وجعلنا نومکم سباتا) اور کیے ہم نیند کو تمہاری کہ بدن کو آرام پہونچے اور ماندگی دور ہوے - (وجعلنا اللیل لباسا) اور کیے ہم رات کو لباس کہ سب کو اندھارے سے ڈھانپے - (وجعلنا النہار معاشا) اور کیے ہم دن کو وقت زندگی کا کہ اوس میں روزی پیدا کرو اور پھرو چلو پکاؤ کھاؤ' —

سورۂ فاتحہ کی ایک تفسیر اکرام الدین نے سنہ ۱۲۴۲ ھ میں لکھی ہے - یہ نثر میں ہے - ختم مضمون پر سورۂ فاتحہ کی فضیلت کا بیان ہے - دیباچے کی ابتدائی سطریں نقل کی جاتی ہیں جن میں مصنف نے تفسیر کے متعلق چند ضروری باتیں لکھی ہیں :—

" بندۂ ضعیف حقیر کمترین اکرام الدین کہ اکثر مسلمان بھائی خصوصاً میر حسین علی نے رغبت دلائی اِس بات پر کہ اگر سورۂ فاتحہ کا زبان ہندی میں بیان ہوجاوے تو سب مسلمانوں کو اچھے ایمان کا دھیان ہوجاوے کیونکہ اس سورہ کا نام ام الکتاب ہے - آخر رسالے میں اس

ام الکتاب کی فضیلت کا بیان ہے اور اس مختصر کا نام تحفۃ الاسلام ہے -
بارے الحمد للہ کہ یہ رسالہ سن بارہ سو بیالیس ہجری عشرۂ محرم
الحرام میں تمام ہوا " —

پارۂ عم کی ایک اور تفسیر بھی مجھے ملی جس کا سنہ کتابت سنہ
۱۲۶۴ ہے - یہ بھی ترجمہ ہے ' کہیں کہیں بطور تشریح کے کچھ کچھ جملے
اضافہ کردیے گئے ہیں - بطور نمونے کے شروع کی چند آیتوں کا ترجمہ
لکھا جاتا ہے —

" کس چیز سے سوال کرتے ہیں وہ کافر آپس میں پھر آپ فرماے -
سوال کرتے ہیں وہ خبرتے کہ بڑی ہے یعنی قرآن شریف اور نبوت اور
قیامت سے - ایسی خبر عظیم کہ وہ کافر بیچ اس کے اختلاف کرنے والے
ہیں ' کوئی کچھہ کہتا ہے اور کوئی کچھہ - حق تعالیٰ نے فرمایا - حق ہے
کہ قریب جانیں گے وہ جب قیامت آے گی کہ پیغمبر سچے تھے اور قرآن
حق تعالیٰ کا کلام تھا - پھر حق ہے کہ قریب جانیں گے وہ دن قیامت میں
کہ برا کیا ہم نے جو ایمان نہ لاے - کیا نہیں کیے ہم نے زمین کے تئیں بچھونا
تاکہ رہو تم اور پہاڑوں کے تئیں میخیں اور پیدا کیے ہم نے تمھارے تئیں
جوڑے کہ تم سے اولاد ہوے - اور کیے ہم نے نیند کے تئیں تمھاری آرام
بدن کا تاماندگی دن کی دور ہو " —

اس کی زبان جیسا کہ اوپر کے نمونے سے معلوم ہوگا دکنی ہے —

ایک صاحب نے بعض سورتوں اور آیتوں کی تفسیر لکھی ہے - تفسیر
براے نام ہے زیادہ ترجمہ ہے اور ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے -
اس کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۶۴ ھ ہے -

ایک اور تفسیر سورۂ یوسف سے سورۂ حم تک دستیاب ہوئی ہے -

شروع کے دو چار ورق غائب ہیں - آخر میں نہ سنہ تالیف و کتابت ہے اور نہ مولف کا نام - زبان کسی قدر پرانی ہے مگر سلیس ہے - ایسی سلیس اور صاف کہ اگر دو چار ایسے لفظ جیسے لانڈا (یعنی بھوریا) ' اپرال (بمعنی اوپر) کیلی ، بمعنی کلنجی) کہیں کہیں نہ آجائیں تو زمانے کے لحاظ سے اس کی شناخت مشکل ہوجائے کہ مصنف شمالی ہند کا ہے یا جنوبی ہند کا ۔ ترجمے میں معروف عربی فارسی الفاظ بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں - دو تین آیتوں کے ترجمہ اور تفسیر کی نقل کی جاتی ہے -

(قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم) کہا یوسف نے کہ میرے تئیں کر حکم کرنے والا زمین کے خزانوں کا ' یعنی کاروبار ممالک مصر کا مجھے سونپ - کہ تحقیق میں محافظت کرنے والا ہوں تیرے مالکوں اور خبردار ہوں امور ممالک میں - (وکذلک مکنا لیوسف فی الارض) جیسا کہ بادشاہ کوں مہربان کیا میں نے یوسف پر ویسا ہی مرتبہ دیا یوسف کوں زمین مصر میں - یعنی مقبول خلائق کیا بادشاہ کیاں - لائے ہیں کہ یوسف علیہ السلام ستر اور دو زبان جانتے تھے - بھی تفاسیر معتبر مذکور ہے کہ بادشاہ نے تخت زر سرخ مرصع سیں اور بھانت بھانت کے جواہر لگے ہوئے واسطے یوسف علیہ السلام کے مقرر کیا ' تاج مکلل اوپر سر اوس کے رکھ کر کیلیاں خزانے کیاں سونپ کر اختیار ملک کا بھی ہات اُس کے دیا اور عزیز کے تئیں تغیر کیا اور جو کام اُس عزیز کے تھے عہدہ یوسف کے کیا - تھوڑے زمانے میں عزیز مرگیا اور بادشاہ التماس تمام سیں زلیخا کوں بھی عقد یوسف کے دیا اور حق سبحانہ تعالی نے یوسف کے تئیں دو بیٹے دیا - (یتبوء منہا) کہ تا جگا پکڑے زمین سنے ' یعنی زمین ملک مصر کے بھی چالیس فرسخ کی عرض رکھتی تھی (حیث یشاء) جہاں چاہے زمین

مصر میں سے (نصیب برحمتنا من نشاء) پہونچاتے ہیں ہم رحمت میں جس کو چاہتے ہیں (ولا نضیع اجرالمحسنین) اور ہم ضایع نہیں کرتے اجر نیکو کاروں کا" —

بظاہر یہ تفسیر فارسی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے - جیسا کہ جملوں کی ترکیب سے ظاہر ہے لیکن ابتدا میں عام طور پر اُردو زبان کا اور خاص کر ترجمے میں عبارت کا یہی تعلق تھا چنانچہ جگہہ جگہہ " لاے ہیں" لکھا ہے جو " آوردہ اند" کا لفظی ترجمہ ہے —

ایک تفسیر سورۂ یوسف نظم میں حکیم محمد اشرف متوطن قصبۂ کاندھلہ نے لکھی ہے - اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۱۸ ھ ہے - طریقہ یہ رکھا کہ عنوان میں قرآن کی آیت ہے اور نیچے اُس کا اردو ترجمہ نثر میں اُس کے بعد نظم میں اس کی تفسیر بعض بعض مقامات کی تفصیل بہت طویل ہے - نظم رواں اور صاف ہے مگر فصیح نہیں - نمونہ ملاحظہ ہو -

(وترکنا یوسف عند متاعنا فاکلہُ الذئب وما انت بمومن لنا ولو کنا صادقین) اور چھوڑا یوسف کو اپنے اسباب پاس پھر اوس کو کھا گیا بھیڑیا اور تو باور نکرے گا ہمارا کہنا اگرچہ ہم سچے ہوں —

بٹھا ہم نے یوسف کو کپڑوں کے پاس — گئے دوڑتے سب کے سب بے ہراس
کہ اتنے میں بھیڑ' اُسے کھا گیا — یقیں ہوگا تجھہ کو کب اس بات کا
اگرچہ ہم آپس میں ہیں راست گو — ولے اس کو کب راست جانے ہے تو
یہ آیت کے معنے ہوے ہیں بیاں — اب آگے سنو اس کی ہے داستاں
سنا جب کہ یعقوب نے یہ کلام — ہوا کام گویا کہ اس کا تمام
گرا کھاکے غش اور گیا دل دھڑک — غشی میں رہا شام سے صبح تک
لگی رونے اولاد اس کی تمام — کہا سب نے بیجا ہوا ہم سے کام

کیا قتل بھائی کو اور باپ کو گنہگار ہم نے کیا آپ کو
قیامت کو کیا دیں گے اس کا جواب خدا جب کہ لیوے گا ہم سے حساب
یہ کہہ کر کے روتے تھے چھوٹے بڑے اور آگے تھے یعقوب ان کے پڑے
جو دیکھے تھے جنبش نہ ہلتے تھے وہ کسی طرح سے نا سنبھلتے تھے وہ
کہا بعض نے ایک بارہ سے کم ہوا اس کا بیٹا یہ دیکھو ہو تم
عجب اس کی حالت ہے مرتا ہے یہ نہ بولے ہے نے سانس بھرتا ہے یہ
وہ جس کی فقط ایک اولاد ہو وہ مرجا تو پھر کیوں نہ برباد ہو

اس کے بعد ایک حکایت اسی مضمون کی بیان کی ہے —

"تفسیر وہابی" پورے قرآن کی تفسیر ہے - مصنف نے تفسیر کے خطبے میں سبب تصنیف اور وجہ تسمیہ وغیرہ کا اظہار کر دیا ہے - خطبے کے اس حصے کی نقل یہاں درج کی جاتی ہے —

" بعد حمد اور نعت کے کہتا ہوں کہ اس تفسیر کا نام تفسیر وہابی رکھا ہوں - اور اس تفسیر کے بنانے ہارے کا نام عبدالصمد بیٹا نواب شکوہ الملک نصیرالدولہ عبدالوہاب خاں بہادر نصرت جنگ کا فرزند* ضعیف کے خاطر میں آیا کہ بہوت تفسیراں عربی اور فارسی ہیں لیکن دکنی تفسیر شاید کہ کم ہیں بلکہ نہیں ہیں - اس واسطے سب مرداں اور عورتوں کو قرآن مجید کے معانی معلوم ہوکر عالم کو فائدہ ہونے کے واسطے دکنی زبان سے بنایا ہوں - اگر کوئی عالم اور فاضل اس تفسیر کو پڑے تو کرم کی رہ سیں اس کے مطلب کی کمی اور زیادتی کو دریافت کر کر درست کریں اور مغفرت چاہیں - اور یہی التماس سب پڑھنے ہاروں کی خدمت میں ہے ' چاہیے کہ اس تفسیر کے پڑھنے ہارے میری التماس قبول کر

* یہاں "فرزند" کا لفظ کاتب نے غلطی سے بڑھا دیا ہے —

کو مہربانی کریں " —

آخر میں سنہ اور تاریخ ان الفاظ میں لکھی ہے —

" فی شہر جمادی الثانی یوم السبت من عشرین ھذا شہر سنہ ثمانین و سبع بعد الالف من ھجرۃ النبویہ صلی اللہ علیہ و سلم " —

سنہ ۱۰۸۷ ھ جو اس میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا —

تزک والا جاہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب شکوہ الملک نصیرالدولہ بہادر نصرت جنگ ' امیرالہند والا جاہ کے برادر حقیقی تھے - امیرالہند والا جاہ کی ولادت سنہ ۱۲۳۵ ھ میں واقع ہوئی - اس لحاظ سے یہ سنہ صریحاً غلط ہے - غالباً سنہ ۱۲۸۷ ہوگا - زبان بھی اس کی پرانی نہیں معلوم ہوتی بلکہ صاف ہے اور تقریباً ویسی ہی زبان ہے جیسی آج کل جنوبی ہند میں مروج ہے - نمونے کے لیے " سورۃ قارعہ " کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے -

(القارعۃ ماالقارعۃ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قارعہ قیامت کے روز کو کہتے ہیں اور اس روز لوگاں ہول سے کہیں گے کہ قارعہ کیا ہے - (وماادراک ماالقارعہ) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بندگان تم قارعہ کو کیا جانتے ہیں - (یوم یکون الناس کالفراش المبثوث و تکون الجبال کالعہن المنفوش) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک روز حشر کا ہے کہ اس روز تمام آدمیاں پتنگے کے مانند بکھرے جائیں گے یعنے پریشان ہوئیں گے اور پہاڑاں روئی کے مانند پنچے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے (فاما من ثقلت موازینہ فہو فی عیشۃ الراضیہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس کی نیکی کا وزن زیادہ ہوں گا او شخص نیک زندگی سے بہشت میں جاے گا - (واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس کے نیک عمل کا بوجھا ہلکا ہوگا اسے اللہ تعالیٰ ھاویہ میں ڈالے

۲ - اور هاویه بهی ایک دوزخ کا نام هے - (وما ادراک ماهیه) اور الله تعالی فرماتا هے که هاویه کیا چیز هے کر کے تم جانتے هیں - (نار حامیه) الله تعالی فرماتا هے که وہ گرم آگ هے یا جلانے هاری آگ هے —

ایک قلمی تفسیر سورۂ کهف سے سورۂ عنکبوت تک هے - یه بهی دراصل ترجمه هے البته کهیں کهیں تصریح کے لیے چند جملے اضافه کردیے گئے هیں - زبان دکهنی هے لیکن قدیم نهیں - نمونے کے طور پر سورۂ قصص سے چند آیتوں کا ترجمه درج کیا جاتا هے —

(آیات الکتاب المبین) آیتاں هیں کتاب ظاهر کی که ظاهر کرنے هارا هے راہ راست کے تئیں (نتلوا) تلاوت کرتے هیں هم (علیک) اوپر تمهارے اے محمد صلی الله علیه وسلم (من نباء موسی و فرعون) خبر سے موسی اور فرعون کی (بالحق) سات راستی کے (لقوم یومنون) واسطے قوم جو ایمان لاتے هیں (ان فرعون) تحقیق فرعون (علا فی الارض) تکبر کیا بیچ زمین مصر کے (وجعل) اور گردانا فرعون (اهلها) لوگوں کے تئیں اوس مصر کے (شیعاً) گروہ گروہ اور هر گروہ کے تئیں ایک کام مقرر کیا - (یستضعف) اور ضعیف کرتا تها یعنے مقهور کیا (طایفة منهم) ایک گروہ کے تئیں اون بنی اسرائیل میں سے (یذبح ابناء هم) ذبح کرتا تها فرعون فرزندوں کے تئیں اون بنی اسرائیل کے (ویستحی نساء هم) اور زندہ رکهتا تها عورتوں کے تئیں اون کی واسطے خدمت قبطیوں کے ۔ (انه کان) تحقیق وہ فرعون تها (من المفسدین) فساد کرنے هاروں سے —

ایک تفسیر جو میاں شاہ مخدوم حسینی کی تالیف هے مجهے دستیاب هوئی لیکن آخر سے ناقص هے اس لیے یه کهنا مشکل هے که انهوں نے پورے قرآن کی تفسیر لکهی تهی یا صرف چند پاروں کی - مولف کا حال بهی

کہیں نہیں ملا - زبان سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ بھی تیرھویں صدی کی ہے - ترجمے کے ساتھہ کہیں کہیں تصریح کے لیے کچھہ کچھہ عبارت اضافہ کر دی گئی ہے - ابتدا الم سے ہوتی ہے - اس کی ابتدائی چند آیتوں کا ترجمہ مع تفسیر نقل کیا جاتا ہے —

(ذالک) یہ وہ کتاب ہے کہ خداوند عالیشان دو کتابیں آگے کے ساتھہ اتارنے اس کتاب کے وعدہ دیا تھا - (الکتاب) یہ کتاب کامل ہے یعنے قرآن مجید - (لاریب) کچھہ شک اور شبہ نہیں ہے - (فیہ) بیچ اس کتاب کے یعنے ظاہر ہونے سے حجت کے اور واضح ہونے سے دلیلوں کے یہ کتاب سات اس مانند کے ہے کہ جو کوئی کہ بیچ اس کتاب کے ادنا فکر اپنی متوجہ کرے از شک خود کوڑے رہ جاوے اور جانے کہ شبہ کھٹنیں بیچ اس کتاب کے طاقت اپنی کی نہیں ہے - (ھدی) دلالت کرنے والی اور راہ بتانے والی (للمتقین) خاص پرھیزگاروں کے تئیں - کیونکہ یہ پرھیزگاراں سات اوس کتاب کے فائدہ پاے ہوے ہیں (الذین) وہ لوگ کہ سانچے پے اعتقاد اپنے سے (یومنون) خواہش کرتے ہیں (بالغیب) سات نہیں دیکھی ہوئی چیز کے - وہ کون ہے یعنے حق تعالی اور وہ کون یعنے فرشتے اور وہ کون ہے یعنے قیامت کا دن سات علاقہ والے اُس قیامت کے یا چھپا ہوا وحی ہے - اور کہے ہیں مراد غیب سے قضا و قدر ہے کہ مسلمانوں نے سات اُن چیزوں غیب کے ایمان لاتے ہیں (و یقیمون) اور قائم رکھتے ہیں اور ادا کرتے ہیں (الصلوۃ) نماز پانچ وقت کے تئیں سات شرطیں اور ادبیں اُس نماز کے یعنے واجبات اور مستحبات نماز کے ادا بخوبی کرتے ہیں - (ومما رزقناھم) اور اُس چیز سے سات ان متقیوں کے بخشش کیے ہم (ینفقون) نفقہ کرتے ہیں یعنے دیتے ہیں اوپر اہل

اور عیال اور قرابتی اور ہمسایہ والے صاحب حق داروں کے —

یہ تفسیر بھی بعد کے زمانے کی ہے اس میں قدیم الفاظ کہیں نہیں آتے لیکن زبان دکنی ہے - مثلاً چھلنا چھوٹنے کی جگہ استعمال کیا ہے ۔ اور اسما کی جمع 'ان' سے بنائی گئی ہے مثلاً لوکاں' مایاں وغیرہ - عبارت اکثر ناقص اور بے ربط ہے —

یہ ترجمے اور تفسیریں جن کا ذکر اس مقالے میں کیا گیا ہے تیرھویں صدی کے آخر تک کی ہیں - موجودہ صدی کے ترجموں اور تفسیروں سے بحث نہیں کی گئی - ہر ایک کے ساتھ ترجمے یا تفسیر کا نمونہ بھی دے دیا گیا ہے تاکہ زبان کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت معلوم ہوتی رہے - پانچ کے سوا باقی سب قلمی ہیں —

ہنگامۂ دل آشوب

("قاطع برہان" کے جواب اور جواب در جواب میں متعدد نظمیں اور نثریں لکھی گئی تھیں جو بعد میں دو رسالوں (یعنی "ہنگامۂ دل آشوب" حصۂ اول اور حصۂ دوم) کی صورت میں شایع ہوئیں اور اب بالکل نایاب ہیں۔ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم۔اے نے بڑی تلاش اور کوشش سے دونوں رسالے بہم پہنچائے جو انہوں نے ہمیں اشاعت کے لیے عنایت فرمائے ہیں جس کے لیے ہم صاحب موصوف کے بہت شکرگزار ہیں۔ یہ دونوں رسالے سید صاحب کے مقدمہ دیباچے کے ساتھ شایع کیے جاتے ہیں)۔

غدر کے زمانے میں حضرت غالب کو اپنے مکان میں بند ہو جانا پڑا اور آمد و رفت اور دوستوں کی ملاقات ان کے لیے محال ہوگئی۔ اس زمانے میں ان کے پاس دو کتابیں دساتیر اور برہان قاطع تھیں جن کو دیکھ کر وہ دل بہلایا کرتے تھے۔ برہان قاطع کے مطالعے میں انہیں جہاں جہاں غلطیاں نظر آئیں ان کو بطور یادداشت کے قلمبند کرتے گئے اور ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دے کر اور "قاطع برہان" نام رکھ کر سنہ ۱۲۷۶ ھ میں شایع کیا۔ ہرچند کہ اس کتاب کے دیباچے میں اس کی اشاعت کی غایت کا اظہار صاف صاف کر دیا تھا —

"چوں آں سفینہ (برہان قاطع) گفتار ہائے نادرست داشت و مردم را از راہ می برد و من آئین آموزگاری داشتم بر پیروان خودم دل سوخت جادۂ نمایاں ساختم تا بیراہہ نروند"۔

اس پر بھی اس کتاب کا شایع ہونا تھا کہ ہر چار طرف سے مخالفت

کا طوفان برپا ہوگیا اور برسوں یہ ہنگامہ جاری رہا۔ قاطع برہان کے رد میں کتابیں لکھی گئیں اور شایع کی گئیں - قاطع قاطع، محرق قاطع، ساطع قاطع، وغیرہ - حضرت غالب نے بعض کا جواب لکھا اور بعض کی جانب بالکل توجہہ نہیں کی - آخر میں کلکتے کے مولوی احمد علی صاحب احمد تخلص نے قاطع برہان کے رد میں ایک کتاب موسوم بہ 'موید البرہان' شایع کی - مولوی احمد علی صاحب مرحوم اصفہانی الاصل تھے ان کے اجداد میں ایک بزرگ نے ڈھاکے میں سکونت اختیار کی تھی - مولوی صاحب کا مولد ڈھاکہ تھا لیکن اپنے مشاغل کے باعث کلکتے میں سکونت پذیر ہوئے - نہایت ذی وجاہت شخص تھے اور کلکتے کے نہایت ممتاز لوگوں میں ان کا شمار تھا - مرزا قتیل کے پیرو تھے اور فارسی لغات اور اصطلاحات شعرا میں ' برہان قاطع ' کو اور لالہ ٹیک چند بہار کی ' بہار عجم ' کو نہایت مستند خیال کرتے تھے - مویدالبرہان لکھہ کر کلکتہ اور نواح کے بہت سے فارسی خواں دوستوں سے تقریظیں اور قطعات تاریخ لکھوائے اور اس کے ساتھہ ان سب کو بھی شایع کیا - حضرت غالب کی نظر سے جب یہ کتاب گزری انہوں نے جواب میں 'تیغ تیز' لکھی اور اس کے ساتھہ ایک فارسی قصیدہ بھی لکھا جس کے ابتدا کے چند اشعار یہ ہیں :-

مولوی احمد علی، احمد تخلص، نسخۂ　　در خصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است
کیچ و مکراں راکہ درسند است و از ایراں جدا　　شامل اقلیم ایراں بے محابا کردہ است
قوم بلوچ را بہ ایرانی نژاداں دادہ خلط　　ترک ترکان سمرقند و بخارا کردہ است
ہندیاں را در زباں دانی مسلم داشتہ　　تا چہ اندر خاطر والاے او جا کردہ است
ہر کہ بھلی با زباں مولد خود آشنا است　　ساز نطق مولد اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودن آبا چہ سود　　خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

باتکیل و جامع برهان ولاله ٹیک چند لا به و سرگوری و لطف و مدا را کردہ است

' تیغ تیز ' کا تو کوئی جواب شاید نہیں دیا گیا اور اس قصیدے کا جواب بھی مولوی احمد علی صاحب نے خود نہیں دیا بلکہ ان کی ایما سے ڈھاکے کے رہنے والے ان کے ایک شاگرد مولوی عبدالصمد متخلص بہ فدا نے ایک قطعہ لکھا اور شایع کیا جس کے ابتدا کے تین اشعار یہ ہیں :-

فرق حق و باطل اے صاحب نظر بشنو زمن گرترا جو یائے حق ایزد تعالیٰ کردہ است

دید چوں 'غالب' موید آں کتاب لا جواب کش بصد تحقیق املا هادی ءاکردہ است

قطعۂ در پوزش کردا ر خود ترتیب داد گاہ در روے فخر و گہہ لطف و مدارا کردہ است

مولوی عبدالصمد ' فدا ' کے اس قطعے کے جواب میں ایک قطعہ حضرت باقر نے اور ایک قطعہ مولوی خواجہ سید فخرالدین حسین ' سخن ' دهلوی نے لکھا اور ان دونوں قطعوں کو حضرت غالب اور مولوی عبدالصمد فدا کے قطعات کے ساتھ ایک رسالے کی شکل میں ہنگامۂ دل آشوب کے نام سے آرہ میں منشی سمت پرشاد کے مطبع میں ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۳ ھ (۱۸۶۷ ع) میں طبع کرایا - اس کے شایع ہوتے ہی منشی جواهر سنگھ جوہر لکھنوی نے (جو مرزا ناطق مکرانی کے شاگرد تھے) ایک قطعہ حضرت غالب کے خلاف اور مولوی احمد علی کی تائید میں لکھا اور مولوی عبدالصمد فدا نے حضرت باقر کے قطعے کے جواب میں ایک قطعہ شایع کیا اور اسی قطعے میں حضرت سخن کے قطعے کا بھی جواب دیا - ان دونوں قطعات کے جواب میں ایک ایک قطعہ حضرت باقر نے اور ایک ایک قطعہ حضرت سخن نے لکھا - ان کے علاوہ لکھنؤ کے ایک شاعر منشی امیر احمد المتخلص بہ امیر لکھنوی نے اردو میں ایک قطعہ حضرت غالب کی تائید میں لکھ کر اودھ اخبار میں شایع کیا - ان سب کے علاوہ لکھنؤ کے ایک شاعر

مہر آغا علی متخلص بہ شمس (شاگرد قاضی محمد صادق خان بہادر 'اختر' ولد قاضی محمد لعل باشندہ ہوگلی شاگرد مرزا قتیل) نے اردو نثر میں لکھ کر اودھ اخبار نمبر ۴۹ مورخہ ۲۵ جون سنہ ۱۸۶۷ ع میں شائع کیا جس میں قاطع برہان پر اعتراض کے سلسلے میں حضرت غالب اور اُن کی اردو شاعری پر نہایت رکیک اعتراضات کیے - یہ مضمون چونکہ نثر میں تھا اس لیے اس کا جواب حضرت سخن نے اردو نثر میں اور حضرت باقر نے فارسی نثر میں لکھا اور ان جملہ قطعات اور ان دونوں نثر مضامین کو ترتیب وار جمع کرکے خواجہ سید فخرالدین حسین صاحب نے آرہ کے اسی مطبع میں بنام 'ھنگامۂ دل آشوب حصہ دوم' جمادی الاول سنہ ۱۲۸۴ ھ (۱۸۶۷) میں شایع کیا - حضرت غالب کی رحلت ۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ ھ کو واقع ہوی - یہ رسالہ ان کی رحلت سے تقریباً ڈیڑہ سال قبل طبع ہوا اور غالباً قاطع برہان کے جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ اسی پر ختم ہوا —

سید عطا حسین

ماشاء الله

دوتا قطعه بجواب قطعهٔ مولوی عبدالصمد صاحب
'فدا' تخلص شاگرد مولوی احمد علی صاحب -

موسوم به

هنگامهٔ دل آشوب

از نتائج افکار جناب مولوی سید محمد باقر علی صاحب تخلص باقر و جناب خواجه سید فخرالدین حسین صاحب دهلوی ' سخن تخلص' تلامذهٔ حضرت جناب نجم الدوله دبیرالملک نواب اسدالله خان بهادر نظام جنگ ' غالب تخلص' مدظلال جلاله - حسب فرمائش صاحبان ممدوح الصدر -

بقصبه آره

در مطبع منشی ست پرشاد باهتمام منشی جیگوبند سهاے طبع گردید

سنه ۱۸۶۷ ع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یارب این چه ہنگامۂ دل آشوب و این چه دلخراش خروش است که بنگالی نژاداں به پیکار حضرت غالب نامور کمر بسته اند - و به دراز دستیء بیجا دلہاے عالمیان شکسته - ازین گرمی ہنگامه نفسم در تاب ست - و از آتش این غم جگرم کباب - مولوی احمد علی احمد تخلص که به گفتار ناروا تائید 'برہان' کرد زخمے بر جگر جہانیان زد و عبدالصمد کوچک ابدالش که بہنجار طبعی کار سوتہاں نمود ہم برآں زخم جگرنمک سود - اکنوں جوابیکه بپاسخ عبدالصمد فدا برلفت طبع وقاد جناب مولوی سید باقر علی صاحب وہم بفکر این ہیچمدان سید فخرالدین حسین 'سخن' قلم برداشته نگاشته آمد مع ہر دو قطعه بحضرات فرزانگان سخن سراے و سخن سرایان سخنور ستاے ارمغان است تاداد سخن دہند و سوگیری مدعی یکسو نہند —

نخستین قطعه

ریخته خامۂ جادو بیان حضرت فلک مرتبت کیوان منزلت وحید عصر علامۂ دہر فرمان فرماے ملک معانی شہنشاہ اقلیم سخندانی جناب مستطاب معلی القاب جدنا الامجد اوستاذنا و مولانا نجم الدوله دبیرالملک

تخلص - اعلی الله تعالی درجاتهٔ و مد ظلهٔ ن جلاله که بخدمت مولوی احمد علی صاحب فرستاده آمد —

مولوی احمد علی - احمد تخلص نسخهٔ
درخصوص گفتگوئے پارس انشا کرده است

کچھ مکراں را که درسند است وازایران جدا
شامل اقلیم ایران بے محابا کرده است

قوم براہیچ را به ایرانی نژادان داده خاط
ترک ترکان سمرقند و بخارا کرده است

در جہاں توام بود روئے و پے و پشت قتیل
پیشوائے خویش هندو زادهٔ را کرده است

هندیاں را درزباں دانی مسلم داشته
تاچه اندر خاطر والائے او جا کرده است

هرکه بهلی با زبان مولد خود آشنا است
سازنطق مولد اجداد بیجا کرده است

خواجه را از اصفهانی بودن آبا چه سود
خلقش در کشور بنگاله پیدا کرده است

با قتیل و جامع برهان و لاله ٹیک چند
لابه رسوگیری و لطف و مدارا کرده است

داوری کاهے بنا فرمود و در روے هرسه را
منصف وصدر امین وصدر اعلی کرده است

گرچنین با هندیاں دارد تولا در سخن
من هم از هندم چرا ازمن تبرا کرده است

کرده است از خوبی گفتار من قطع نظر
ظلم زین قطع نظر هر چشم بینا کرده است

مثل او با هرکسے از هند و حیفش خاص من
حیف و میلے با دوعالم شور و غوغا کرده است

مطلب از بدگفتن من چیست گوئی نیک مرد
مزد این کار از حق آمرزش تمنا کرده است

ورچنین نبود - چناں باشدکه درعرض کمال
تا برآرد نام این هنگامه برپا کرده است

صاحب علم وادب - و آنکه زافراط غضب
چوں سفیهاں دفترنفرین و دشنام واکرده است

درجدل دشنام کارسوقیان باشد - بلے
ننگ دارد علم ازکاریکه آغا کرده است

انتقام جامع 'برهان قاطع' می کشد
آنچه ماکردیم با او- خواجه با ما کرده است

من سپاهی زاده ام - گفتار من باید درشت
وا بروے گر بتقاید من ایلها کرده است

درشت گفتم لیک داد بذله سنجی داده ام
شوخی طبعے که دارم این تقاضا کرده است

میکند تائید برهان لیک برهان ناپدید	نیست جز تسلیم قولش هرچه انشا کرده است
مستعیره طرز خرام خامهٔ برهان نگار	یا نمی دانست یا دانسته اخفا کرده است
بهر من توهین و بهر خویش تحسین جا بجا	هم مراهم خویش را در دهر رسوا کرده است
آید و بیند همه اندر کتاب مولوی	هرچه از هنگامه گیران کس تماشا کرده است
لغو و حشو و ادعائے محض و اطناب مخل	مار و موش و سوسمار و گربه یکجا کرده است
بگذر از معنی همین الفاظ برهم بسته بین	بادهٔ نبود شیشهٔ و ساغر مهیا کرده است
یافتم از دیدن تاریخهائے آن کتاب	خود بدم گفت و باحباب خود ایما کرده است
غازیان همراه خود آورد از بهر جهاد	تا نه پنداری که این پیکار تنها کرده است
جوش زد از غایت قهر و غضب خون دلش	تا زبانش را بدین کلهکره گویا کرده است
آتش خشمے که سوزد صاحب خود را نخست	در دلش همچون شرر در سنگ ماوا کرده است

چون نباشد باعث تشنیع جز رشک و حسد
یاد غالب خسته ترگر خسته پروا کرده است

دومین قطعه

که مولوی احمد علی صاحب بجواب قطعهٔ حضرت غالب نگاشته
از نام عبدالصمد فدا شاگرد
خود شهرت داد

فرق حق و باطل اے صاحب نظر بشنو ز من	گر ترا جویاے حق ایزد تعالی کرده است
دید چون غالب سوید آن کتاب لا جواب	کش بصد تحقیق املا هادیء ما کرده است
قطعهٔ در پوزش کردار خود ترتیب داد	گاه در وے فخر و گہه لطف و مدارکرده است
گفتگو بالائے طاق از اصل مضمون کتاب	هرزه گوئی هر چه دارد بے محابا کرده است
گه میگوید ز فخر و کبر و عجز و انکسار	"هم مراهم خویش را در دهر رسوا کرده است"

گه فرماید همیں از غایت رشک و حسد "مار وموش و سوسمار وگربه یکجا کرده است"
تا نپندارند ساکت گشت غالب از جواب در زمین قطعه ساز شور و غوغا کرده است
حیف مرزا شد چرا زیں سان سراسر بوالفضول کبر و زعمش عیب او را آشکارا کرده است
من کیم عبد الصمد - در شعر نام من فدا شهر سلهٹ مولدم ایزد تعالیٰ کرده است
یا من یکے از کمترین خدام آغا احمدم چوں بدیدم معترض ایں شکوه بیجا کرده است
پاسخ اقوال بیجایش نوشتم بیدرنگ کرده ام تبطیل هر یک ارچه ایماء کرده است
من نخست ابله فریبیهائے او ظاهر کنم نام اکثر کرد اخفا بعض را وا کرده است
از سروری و قوسی و فرهنگ هائے معتبر هرچه هست ازو ادله جمله اخفا کرده است
هادیم قول بهار آورد چوں در بعض جا می نویسد احمد اورا صدر اعلیٰ کرده است
اوستادے ماهر فن گر حکم شد تبع چه هست چوں نگارش را باطل پارس عمدا کرده است
وائے بروے شد چناں بیهوش از جام غرور داد جور از گروه داد گر وا کرده است
باز می گوید که احمد سستی برهان نگار یا نمی دانست یا دانسته اخفا کرده است
گر بدے اخفائے حق منظور اورا پس چرا سهو برهاں چند جا نیکو هویدا کرده است
بسمل و ایثار بخش اوندی و دیگر لغات کن تماشا گر خدایت چشم بینا کرده است
ور کسے پند کتابش درج گوید بالیقیں در و لعل و عسجد و یاقوت یکجا کرده است
حبذا اعجاز خوش درکار برده اوستاد هم لغت هم صرف و نحو و شعر انشا کرده است
هم دراں قطعه دگر ره گوید آقائے مرا ننگ دارد علم از کار یکه آغا کرده است
لوک اے یاراں بگوش هوش خود هاں چاره هید هرچه از تحقیق املا خامهٔ ما کرده است
فاضلان و شاعران کشور ایران و تور بر زباں دارند ایں مطلع که سروا کرده است
ننگ دارد علم از کاریکه مرزا کرده است ننگ دارد علم از کاریکه آغا کرده است
هم باحمد می نگارد مهرزائے سالخورد " ساز نطق موطن اجداد بیجا کرده است "
ایں اگر بیجا بود اے ناظران باخرد غالب هندی چرا در فرس انشا کرده است

نیک میداند دانایان تحقیق آشنا
کز مجیب و معترض که کار بیجا کرده است

میرزا را از بخارا بودن آبا چه سود
خالق اورا چون بملک هند پیدا کرده است

زشت گوئی را چو کار ستم داند پس چسان
نامیان هند را دشنام بیجا کرده است

هند رید گفتن بود اورا سپاهی زادگی
خوش جوابے از سپاهی زاده پیدا کرده است

جد آقا بد سپه سالار فوج نادری
خواجه غافل زان سبب این سست دعوی کرده است

مصرع دیگر طراز و غالب زیبا بیان
" تا بر آرد نام این هنگامه برپا کرده است "

اوستادم بهر نام این کار خود نگرفته پیش
مرده را جان داد - حقا کار عیسی کرده است

بشنوید اے دوستان آخر خدا را بشنوید
حضرت غالب باحمد این چه ایما کرده است

"میکند تالیف برهان لیکن برهان ناپدید"
وز برائے خویشتن توصیف جاها کرده است

داد زین ناراستی- فریاد زین ناراستی
هر که دیده نسخه را کے باور اینها کرده است

هر یک از اقوال احمد با سندها میشنید
اوستادم خود ستائی همچو او نا کرده است

هر کلام هرزه و اقوال پوچ و بے نشان
وائے غالب خویشتن را خوار و رسوا کرده است

شوخ را دانم که علم و فضل او بهره نکرد
نخوت و کبریکه دارد این تقاضا کرده است

چون نظر انداخت بر تقریظ هائے آن کتاب
دوستان احمدی را وه چه ایما کرده است

' غازیان همراه خود آورد از بهر جهاد
تا نه پنداری که این پیکار تنها کرده است

دوستان احمدی غازی و پیکارش جهاد
حق بدست کیست ظاهر در معما کرده است

جنگ غازی را که باشد در جهان داند خلق
حیف خود را از زبان خویش رسوا کرده است

چیست جز این موجب خورسندیء توائے فدا
اوستادت خواجه را تعلیم جاجا کرده است

گر بظاهر او کند انکار لیکن خفیتاً
لامحاله ورد جانش هر سخن را کرده است

قطعه

بجواب قطعه عبدالصمد فدا رشحهٔ کلک گهر بار جناب مولوی
باقر علی صاحب - باقر تخلص
تلمیذ حضرت غالب مدظله العالی

هان تماشائے سخندانان معنی آشنا / الکنے با افصحے هنگامه برپا کرده است
ماجرائے طرفه باشد - قصهٔ باشد عجیب / زاغ پوچش بلبلے سر شور و غوغا کرده است
صعوه با شهباز گرم رزم شد نے نے غلط / روبہے با شیر جنگ فتنه آرا کرده است
هان کجا احمد علی و حضرت غالب کجا / ذرهٔ خود را باوج مهر همتا کرده است
غالب آمد غالب هر شاعران نکته سنج / گلشن معنی ز نیِ کلکش مطرا کرده است
در فن معنی هر آنکس با فلک سر بر کشید / سجدهٔ خاک در او زیب سیما کرده است
رستم میدان معنی حضرت غالب بود / رحم بر شوخی که با وے جنگ برپا کرده است
گفت در رد کتاب حضرت غالب کتاب / این مگس را بین که با شهباز پروا کرده است
گرچه زاید باشد از حیثیتش نام خدا / لائق تحسین بود کارے که آغا کرده است
ار چه جهلش گشت ثابت با دلیل قاطعی / دعوی تردید قاطع گر نه بیجا کرده است
هم بغور و فکر بسیارے ز تحریر جواب / سرسری هر آنچه کلک غالب انشا کرده است
خود چو قاصر گشت آغا - کوچک ابدالش چرا / خویش را با اوستاد خویش رسوا کرده است
آن فدائے بے خرد بے چاره بنگالی نژاد / من فدائے او چه خوش تقریر زیبا کرده است
چون نداند شیوهٔ گفتار را - نادان چرا / ریشخند خلق خود را بے محابا کرده است
شوخی طبعش نیارم آن که در عرض کمال / پردهٔ شرم و حیا از روے خود وا کرده است
در گمان خویش شد پشت و پناه اوستاد / عیب پنهانش حقیقت آشکارا کرده است
سستیٔ طرز کلامش گر نویسم سر بسر / دفترے باشد بشرح آن که انشا کرده است
لیک ظاهر می کند زان جمله عیب چیدهٔ / تا به بیند هر که حقش چشم بینا کرده است

با فصاحتہا کہ دارد ہمچنیں* ارشاد کرد
"بر زباں دارند ایں مطلع کہ سروا کردہ است"

سر نمودن و از مطلع پرفریب است و عجیب
لیک نتواں گفت کیں بیہودہ املا کردہ است

سر بر ہلہ بودن است از عادت بنگالیاں
انچہ خود میکرد شعرش نیز گویا کردہ است

باز میسازد بدیگر جا چنیں تقریر خوش
"کز عجیب و معترض کہ کار بیجا کردہ است"

نیک میداند اہل را از کایں اشباع کاف
از فصاحت مصرع را بیشک معرا کردہ است

گر بگفتے زیں نمط بودے فصیح و خو بتر
کز عجیب و معترض آخرکہ بیجا کردہ است

شد ترنم آشنا جائے بآہنگ دگر
"نامیان ہند را دشنام بیجا کردہ است"

کردن دشنام کے باشد روا نزد فصیح
بے خبر از کوچۂ دانش چہ آیا کردہ است

غیر ازیں از سستیٔ ترکیب و لغو وحشو و نغز
پختہ مغزی ہائے او ہرچہ تقاضا کردہ است

ہمچو روز روشن است و نیک روشن گشتہ است
بر سخندان جہاں ہرکس تماشا کردہ است

باہمہ فقدان استعداد ایں شور و شغب
بود کے جایز مگر از راہ سودا کردہ است

بیخرد شاگردیٔ 'احمد' کہ کردہ است آشکار
تاچہ طرفے بست زیں کاریکہ پیدا کردہ است

ہاں بیا- ناداں بیا- با اوستاد خود بیا
'غالب' استاد جہانش حق تعالیٰ کردہ است

سر بخاک آستانش نہ پئے عذر گناہ
حق پرستیہا اگر در دل ترا جا کردہ است

سر مکتوم معانی بوالہوس اینجا بجوے
گر دلت رمز معانی را تمنا کردہ است

باقر از شکرانۂ ایں کے تواں آمد بروں
کہ مرا تلمیذ 'غالب' حق تعالیٰ کردہ است

قطعۂ دوم

بجواب قطعۂ عبدالصمد فدا از نتائج افکار سید فخرالدین حسین دہلوی سخن تخلص - تلمیذ و نبیرۂ حضرت جناب نواب اسداللہ خاں غالب ممدوح الصدر تعالی اللہ شانہ و مد ظلال جلالہ —

* ن: ایں چنیں - † ن: شعر -

مولوی 'احمد علی' آں واقف هر علم و فن　　در سخن با جد من پیکار بیجا کرده است
دیگرے 'عبدالصمد' شاگرد آں زیبا بیاں　　همدریں جنگ و جدل تنبیه 'آغا' کرده است
آں یکے هرزه درا مغرور بر گفتار خویش　　ویں دگر خودبیں که ایں هنگامه برپا کرده است
آں یکے عاقل که میخواهد نمائے خویشتن　　ویں دگر الکن که با افصح سخنها کرده است
آں یکے حاسد که می دارد سر پیکارها　　ویں دگر ناداں که خود رانیز رسوا کرده است
می تراود خوں ز چشم من چو می بینم جواب　　آنکه از رشک و حسد در نظم انشا کرده است
دسترس باشد اگر بر مدعی من آں کنم　　آنچه در پیکار اسکندر به دارا کرده است
هاں بیا اے ساکن بنگاله با من در ستیز　　خالق کونین دهلی مولد ما کرده است
در سخن سنجی سخن دارم تخلص آشکار　　با تامل بیں که کلک من چه انشا کرده است
حضرت 'غالب' که یک عالم بود تلمیذ او　　وائے بر 'آغا' که باوے جنگ برپا کرده است
آں سخن سنجے که در روز ازل پیش از ظهور　　از رضائے حق تعالیٰ مشق املا کرده است
آں معانی آفریں کز حکم رب ذوالمنن　　هرچه پنهاں در عدم بود آشکارا کرده است
عرفیؔ و قدسی بگویم گر بمطلب وا رسد　　خامۂ جادو طرازش آنچه انشا کرده است
با چنیں کس در سخن پیکار 'آغا' ناسزا　　خویشتن را بیگماں در دهر رسوا کرده است
وه چه خوش گفتار دارد در زبان پارسی　　از تفاخر ایں چنیں تقریر زیبا کرده است
"من کیم 'عبدالصمد' در شعر نام من 'فدا'　　شهر 'سلهت' مولدم ایزد تعالیٰ کرده است"
من فدائے شوخیٔ تحریر آں جاده بیاں　　نام خود را با فصاحت آشکارا کرده است
جائے دیگر بے ادب از غایت رشک و حسد　　بهر 'غالب' ایں چنیں تحریر بیجا کرده است
"دوستان 'احمدی' غازی و پیکارش جهاد　　حق بدست کیست ظاهر در معما کرده است"
اے 'فدا' چوں از مذاق شاعراں آگه نۂ　　توچه دانی حضرت غالب چه انشا کرده است
گر همان مفهوم تو شد از جهاد و غازیاں　　ورهمیں مضمون کفر اندر دلت جا کرده است
بشنو از من بے خبر ایں پاسخ دنداں شکن　　همت مردانۂ من ایں تقاضا کرده است

فارسیان دارند با 'غالب' قولا در سخن — کافراں باشد که از 'غالب' تبرا کرده است

اینکه 'غالب' هست در دین سخن پیغمبرے — انچه کرد 'آغا' باو - شخصے بموسیٰ کرده است

متفق هستند بر این جمله ارباب خرد — لائق نفرین بود کاریکه 'آغا' کرده است

حاشا لله من نخست اورا نگفتم نا سزا — پاسخ اقوال او دادم که انشا کرده است

اے سخندانان با انصاف آخر بشنوید — در جواب 'قاطع برهان' که بیجا کرده است

تاچه اندیشید 'آغا' کاندرین عرض جواب — از ره تهذیب گمرہ خویشتن را کرده است

بوالعجبها مانده ام کاین صاحب علم و ادب — با چنین فهم و فراست این چه آیا کرده است

من عزیز 'غالب' ام - هم در سخن تلمیذ او — عرض میدارم باو کاین جنگ برپا کرده است

گفتگو داری چو در موجز کتاب لا جواب — آنکه در تردید 'برهان' 'غالب' انشا کرده است

گفتگو با من بفرما - پاسخش بشنو زمن — در حضور حضرت 'غالب' چه انشا کرده است

شرط آں باشد و لیکن در جواب و اعتراض — آنچناں نبود که در اخبار املا کرده است

محترز شید از تحریر الفاظ درشت — تا نگوید غیر کاین بیهوده املا کرده است

لیکن آں دانم که از آغا نباشد احتیاط — حق زبانش را چو بادشنام گویا کرده است

اے سخن بریک سخن اکنوں سخن کوته کنم — خواجه از رشک و حسد این شور و غوغا کرده است

او ستاده من شده از بهر آں مقصود خلق

بر همه غالب چو اورا حق تعالیٰ کرده است

تمت

الحمدلله والمنة که نسخهٔ هنگامهٔ دل آشوب در مطبع منشی سنت پرشاد باهتمام فرخنده رائے منشی جگوبند سهائے بمقام آره ضلع شاه آباد بتاریخ ۵ شهر ذی الحجهٔ سنه ۱۲۸۳ ھ بقالب طبع آمد —

برائے سند این معنی که کتاب هذا مطبوعهٔ منشی سنت پرشاد است مهر و دستخط مهتمم افزوده شد العبد (جگوبند سهائے) مهتمم —

ما شاء الله

نخستین دوتا قطعه بجواب قطعه منشی جواهر سنگه صاحب جوهر تخلص شاگرد مرزا
ناطق مکرانی و دومین دوتا قطعه بجواب عبدالصمد
فدا تخلص شاگرد مولوی احمد علی صاحب موسوم به

حصه دوم

هنگامهٔ دل آشوب

از نتائج افکار جناب مولوی سید محمد باقر علی صاحب باقر تخلص و جناب خواجه سید فخرالدین حسین صاحب دهلوی سخن تلامذهٔ حضرت جناب نجم الدوله دبیرالملک نواب اسدالله خان بهادر نظام جنگ غالب تخلص اعلی الله تعالی درجاته و مد ظلال جلاله و در آخر نثر اردو بجواب نثر میر آغا علی صاحب لکهنوی شمس تخلص از نتائج افکار جناب خواجه سید فخرالدین حسین صاحب موصوف -

قصبهٔ آره

در مطبع منشی سنت پرشاد باهتمام منشی جیگو بند سهائے طبع شد
قیمت فی جلد ۲ آنے بار اول ۱۰۰ جلد
سنه ۱۸۶۰ ع
حسب فرمائش مصنفین ممدوحین طبع شد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برناظرین باتمکین مخفی نماناد که زین پیش قطعاتے چند در جواب قطعهٔ عبدالصمد فدا سلہٹی بنگالوی شاگرد مولوی آغا احمد علی جہانگیر نگری که در جواب قطعهٔ حضرت غالب مدظله العالی در حیز نگارش در آورده بود ترتیب یافته و به هنگامهٔ دل آشوب مسمی گردیده در مطبع آره زیور انطباع پوشیده بود حالیا بعد چند ماه آن 'فدا' عالی مقام باز سر بشورش برداشت و آن آتش فتنه که به آب افشانی جوابات شافیه آشنا بجمود گردیده بود باز چون اخگر زیر خاکستر نرم نرم سر بهالا کشیده زبانها برآورد یعنی 'فدا' که دل و جانم فدائے او باد رد جواب نگاشت ورائے جواهر سلکه 'جوهر' تخلص که کاسه لیس سفرهٔ مکرانیان است به کمک آن سرمایهٔ دانش بحکم الجنس یمیل الی الجنس کمر همت برمیان جان بست و از بہر اشتعال آن نائرهٔ نزاع دامن بجنبش در آورده بگفتار نادرست که خموشی هزار بار ازان بهتر تواند بود پردهٔ خفا از عارض مخدرهٔ استعداد خود برکشید و شاهد جهل خود را از حجلهٔ کتمان بمنصهٔ ظهور موکشان در آورد - ناگزیر از بہر انطفائی این جدوهٔ سر بفلک کشیدهٔ فساد سحاب کلک گوهر سلک را مرةً بعد اولی آشفاے ترشح کرده آمد تا اخگرے بل اثرے ازان باقی نماند - بوکه این جوابہاے دندان شکن و تقریر هاے سرمه در گلوریز باعث نزهت خاطر تماشائیان وقرة عین نظارگیان گردد و بالله التوفیق —

نخستین قطعہ منشی جوہر سنگہ جوہر تخلص شاگرد مرزا ناطق مکرانی

جوہر امروزے باخبار این تماشا کردہ است شاعرے با شاعرے هنگامہ برپا کردہ است
اکبر آبادی خدائے نظم با خود غالب ست احمد بنگالہ هم پیغمبریها کردہ است
اندرین شک نیست غالب اوستاد پارسیست لیک پیکار از سوہی زاد گمها کردہ است
زانکہ زیبد تازہ گوئی شاعران کہنہ را میتوان خاموش ماند از فعل بیجا کردہ است
قاطع برهان بطور خود اگر ترتیب داد هان چو قطع مروت در سخنها کردہ است
بحث من در معنی باریک و لفظ نازک است نے بدشنامیکہ 'غالب' کرد و 'آغا' کردہ است
بگذرید از گفتن بد یکدگر را بگذرید نیست از تہذیب هرکس کین سخنها کردہ است
نیست بحث شیعہ و سنی میان شاعری جہل از دندان گویا اجر پیدا کردہ است
نیز در هر فن کہ از علم و تعلم ممکن است طعن بر فخر زاد و بوم از خوشدلیها کردہ است
علم و فضل اے دوستان بر نطفۂ شیرازنیست کس بہ صاحب ورحم کے آخر سخنها کردہ است
نیک یا بد تربیت هم صحبت صاحب کمال میشود شاعر کسے کینها مہیا کردہ است
۱ آفرین بر مولوی ''احمد علی'' بنگالوی آنکہ از بزم خموشان گفتگوها کردہ است
در چنین ملک بعید از دهلی و پایان هند زندہ دارد شاعری کار مسیحا کردہ است
۱ دور از دهلی بعید از لکھنو خوش باد کو پارسی با لہجۂ اردو مہیا کردہ است
آنکہ 'غالب' طعنہ بر مکرنیان هم میزند آگرہ شاید بجائے خود بخارا کردہ است
میکنم تسلیم هان پیر بخارا 'غالب' است احمد درانی آن احمد کہ بیجا کردہ است
ترکیم خود را تمام اے دوستان زیلنجا کنید هند را فخر جہان آن رب اعلیٰ کردہ است
میتوانم گفت تا صد هر کہ از ایران بہند لفظ رنگین شوخ مضمون کے بہ یکجا کردہ است
خسرو و فیضی بہ بین نازش بہندوستان کنند چون علی و چون غنی معنی کہ پیدا کردہ است
نیز این بیجاست از تحقیر در حق قتیل مقتدائے خویش هند و زادۂ را کردہ است
برهمن وارستہ و مخلص ظہوری و بہار صد چو اینجا معجز اندر پارسیها کردہ است

چون سخن از علم و تعلیم است می نازم بهند　　خامهٔ ما را به بین اعجاز این جا کرده است
اصل ما از دهلی است و مولد ما لکهنو است　　نازشے دارم که هند و خالق ما کرده است
نیستی یارا تو از ایران و توران و دمشق　　دور گرد ونت مسلمان بلکه از ما کرده است
کس چرا خود را کند منسوب ایران حیرت است　　مرد هندی جد خود چون از بخارا کرده است
هم قتیل و صاحب برهان اگر هیچ است و هیچ　　عاملے تسلیم آخر بهکر از ما کرده است
مدعی بر دیگران از خورده گیری بگذری　　تازه تصنیفے بخوان گر طبع پیدا کرده است
خنده می آید مرا بر پیروان هر دو کس　　می توانم گفت یک یک کار بیجا کرده است
هر یکے شد معترض بر دیگر و خود هم غلط　　خود غلط بر خود غلط اصلاح گویا کرده است
لیک در این نظم با استاد کس را راه نیست　　جانب مطبع روان خود بے محابا کرده است
می کند کج مج زبان را کاف بنگالی بلے　　'کز متجیب و معترض که کار بیجا کرده است'
طعنه زد شاگرد غالب بار خود موزون نمود　　'که مرا تلمیذ غالب حق تعالیٰ کرده است'
او اگر سروا غلط گفت این ز مصرع عین خود　　'از فصاحت مصرع را بے شک معرا کرده است'
از برائے آنکه گردد جنگ یاران برطرف　　خامهٔ ما صورت انصاف پیدا کرده است
بلکرم در غالب و احمد بود گر دار و گیر　　این فدا و مولوی باقر چه بیجا کرده است
نیز اندر کاملان آن دار و گیر بحث عام　　نے بدشنامی که ریش و فیش یکجا کرده است
در جهان یک کرد روئے احمد و پشت قتیل　　اجتناب اهل خرد زین گفتگو ها کرده است
راست گویم بعد ازین گر هر دو گیرندم حکم　　کین غلط کرده است یا آن شو بیجا کرده است
ختم کن اے جوهر هندی سخن از وعظ و پند　　چق چقی ما را چه گر ملا به ملا کرده است

نیست اے جوهر سروکارے مرا با هر دو کس
بگذرید از شوخیء گر خامهٔ ما کرده است

قطعه بجواب قطعهٔ منشی جواهر سنگه جوهر تخلص از نتایج افکار
جناب مولوی سید محمد باقر علی صاحب باقر تخلص شاگرد
رشید ملک الشعرای ایران و هند حضرت جناب معلی القاب
نجم الدوله دبیر الملک نواب اسد الله خان بهادر نظام جنگ
غالب تخلص اعلی الله تعالی درجاتهٔ و شانهٔ

جوهر دانش پڑھے نکته ساتھے نغمه گو آنکه در ملک معانی داوریها کرده است
برد گوے سبقت از استاد خود صد مرحبا سحر کاریها عجب در نظم پیدا کرده است
حبذا انداز و خوش طرز خرام خامه اش زنده جان استاد خود را زین اداها کرده است
می برد دل در سخن هے چه انداز هست این من سرش گردم چه طرز نطق پیدا کرده است
هوشم از سر برد و صبر از دل ز معشوقانه وضع طرفه سحرے بین که هندو زاده ما کرده است
رشک امثال است در شیوا زبانیها بلے نطق او انداز ناطق را هویدا کرده است
هاں مگر کیج میج زبانیها زوجهه کم سنی است آفرین بادش که حق زین گونه گویا کرده است
خامهٔ شیرین نوا در پرده تا کے نغمه ها آشکارا گو چه کلک گوهر انشا کرده است
هاں کشیدن می توان شمشیر بران زبان انقلاع کفر واجب حق تعالیٰ کرده است
آں جواهر بین که جوهر کرد نام خویشتن طرفه تخفیفے بنام خویش پیدا کرده است
حرف علت چون گران آمد و را اندر میان از درون ساقط چنین آسا الف را کرده است
دعوے شاگردیء مکرانیش آنکه چنین در زبان سوقیان این شور و غوغا کرده است
هیچ در نگرفت فیض استادش وا عجب قول سعدی صادق آمد انچه ایما کرده است
عمر خود برباد داد آخر چرا در مشق شعر چون همین سرمایهٔ دانش مهیا کرده است
ریخت این هند و به بیداد آبروے پارسی طرفه کج وا کیج پریشان گفتگوها کرده است
نیست از مسند خبر باشد اگر مسند الیه هست ترکیب از غلط هرگز نه پروا کرده است
۱ لفظ اگر باشد غلط باشد همانا عضو اوست لغو و حشو و مهمل و موضوع یکجا کرده است

زعفراں زارش بخوانم نے ز مہن شعراو　　خندہ آمد کسے را کایں تماشا کردہ است
کرد بسم اللہ غلط ناداں چوگفتا ایں چنیں　　" جوہر امروزے باخبار ایں تماشا کردہ است
یائے " امروزے " چہ باشد گر نباشد لغو و حشو　　الحذر زیں سہو کایں بیچارہ ایلچا کردہ است
" اکبرآبادی خدائے نظم باخود غالب است "　　مصرعے زیلساں بدیگر شعر انشا کردہ است
کاشکہ دانستمے باخود چہ معنی داشتہ است　　شاعر شہر یں زبان ما چہ املا کردہ است
" مستحکم تسلیم ہاں پیر بخارا غالب است "　　ایں کلامش ہیں کہ شوخیش تقاضا کردہ است
خود بود ناداں مگر مغلوب طفل لکھنؤ　　غالبم را کلکش از پیر بخارا کردہ است
می سراید مصرعۂ در شان آں احمد علی　　" احمد درانی آں احمد کہ ہیجا کردہ است
مستعدی ترکیب ایں مصرع ہمی باشد عیاں　　ما سبق راہیچ ربطے ہم نہ پیدا کردہ است
" می توانم گفت نا مد ہرکہ از ایراں بہند "　　مصرع اش باشد کہ املا نظم ایلچاکردہ است
خندہ می آید مرا بر دانش بر عقل او　　کایں خرددشمن چہ ایں بیہودہ دعویٰ کردہ است
صد ہزار از شاعراں نغز گو باشد بلے　　آنکہ سوئے ہند نے روئے تماشا کردہ است
من بقربان فصاحت ہائے ایں مصرع کہ خواند　　" لفظ رنگیں شوخ مضموں کے بہ کجا کردہ است "
" علم وفضل اے دوستاں برنطفۂ شیراز نیست "　　مصرعۂ باصد فصاحت کلکش املا کردہ است
معنی او منحصر بر نطفۂ شیراز نیست　　لیکن از بطن خود ایں محذوف پیدا کردہ است
بہ خرد شوق حکم گشتن ہمی دارد بسر　　از کلیم اندازہ بیروں بوالہوس پا کردہ است
خود حکم کے می تواں شد بوالحکم باشد بلے　　باہمہ جہلے کہ دارد طرفہ دعویٰ کردہ است
آہ زیں نادانیش فریاد زیں نادانیش　　کز جہالت اعتراض پوچ برما کردہ است
" کاف، ماؤ کاف ، بنگالی تہہ یک حکم راند　　صدر و اوسط را بزعم خویش یکتا کردہ است
فرق میداند کسے کورا بود ذوق صحیح　　چوں نداند او چرا ہنگامہ برپا کردہ است
اعتراض ثانیش ناشی ز سہو کاتب است　　لفظ مصرع او بجائے شعر املا کردہ است
خامۂ معجز نگار سحر پرواز صفیر　　کو بالہام معانی خسرو یہا کردہ است

خوب تقریر لطیف و نیک تحقیق انیق در جواب اعتراض جوهر انشا کرده است
میتوان نگریستن آن جمله را بغور و فکر گر دلت تفصیل و شرحش را تمنا کرده است
آن فدا زین پیشتر با قدر دل ما برده بود جوهر ما حالیا این فتنه برپا کرده است
آن فدا خوش منظر آمد- جوهر آمد خوش مزاج وه چه شوخیها بصد ناز و ادا ها کرده است
آن اگر نور نظر بود این سرور سینه شد زنده باشد خرمی دل غمدیدهٔ ما کرده است

باشدش هر لحظه از ما صد نیاز و اشتیاق
کو چو جان اندر حریم دل مرا جا کرده است

قطعهٔ دوم بجواب قطعهٔ جوهر از خواجه سید فخرالدین حسین صاحب دهلوی سخن تخلص - تلمیذ و نبیرهٔ حضرت غالب ممدوح الصدر مد ظلال جلاله -

ای سخن فی الحال چون در لکهنؤ وارد شد دیدم اخبارے که شخصے باز غوغا کرده است
شاعرے هندی زبان منشی جواهر سنگه نام در قصیده یا سه قطعات انشا کرده است
میرزا ناطق که شاعر بود مکرانی نژاد خویش را تلمیذ او در نظم انشا کرده است
در جهان جوهر چو او باشد منم جوهر شناس اوچرا با شاعران این جنگ برپا کرده است
شد حکم در زعم خود جوهر درین جنگ و جدال این حکم را بین که با غالب چه ایما کرده است
از ره انصاف برگردید و سوگیری نمود جابجا ترهین غالب مدح آغا کرده است
گفتگوئے زشت را بد گفت و خود هم گفت زشت میشود ناصح ولے خود کار بیجا کرده است
مدعی غالب زیبا بیان شد در سخن از پے مکرانیان این جنگ برپا کرده است
صد قتیل و جامع برهان اگر یکجا شوند پاسخش ناید هر آنچه غالب انشا کرده است
طعنه زد بر غالب از رشک و حسد آن بیخرد نسبت استاد با پیر بخارا کرده است
از تفاخر بعد ازین اظهار اصل خود نمود گفتگو در اصل خود بے سود و بیجا کرده است
لکهنؤ شد مولدش بالفرض لیکن فخر چیست خالقش چون مسکنش پیر بخارا* کرده است

* پیر بخارا محله ایست در لکهنؤ

آنکه گوید پارسی موقوف بر شیراز نیست من بگویم مدعی این سست دعوی کرده است
از عجم در هند تخم پارسی آمد بلے خالقش در هند از شیراز پیدا کرده است
خنده می آید مرا هم بر ذکا و فهم او در جواب مولوی باقر چه انشا کرده است
اول مصراع با این کاف ناجائز که گفت شاید از استاد خودگوش این سخنها کرده است
ناطق مرحوم رشک بلبل شیراز بود عالمے او ستادیش تسلیم هر جا کرده است
می توانم گفتنش اکنوں بقول او ستاد یا نمی دانست یا دانسته اخفا کرده است

اے سخن با جوهر هندی نمیداریم جنگ
این جواب نظم او گفتم که انشا کرده است

در مدح قطعه مولوی عبدالصمد - فدا تخلص - بنگالوی بجواب قطعهٔ
مولوی سید باقر علی صاحب و خواجه فخر الدین حسین صاحب سخن دهلوی -

مولوی باقر علی باقر تخلص قطعهٔ در جواب قطعهٔ این بنده انشا کرده است
همچنین نظم دگر بنوشت فخرالدین حسین کو تخلص در سخن سنجی سخن را کرده است
من جواب هر دو قطعه می نویسم یک بیک کلک من در حق و باطل فرق پیدا کرده است
باقرا اندر لغت 'دشنام کردن' آمده است زاهل فن خواجه حسن در شعر املا کرده است
اے که میگوئی که سروا کردن آمد پر فریب پر فریب است انچه اندر خاطرت جا کرده است
لفظ وا 'کردن' بود با 'باز کردن' متحد در لغت بیں گر ترا در دل شکے جا کرده است
نیز وصف جبهه و پیشانی و مانند آں صایب استاد سخن وا کرده املا کرده است
میکنم تحسین کنوں بر قطعهٔ باقر که او دفتر از جرح فصاحتهاے خود وا کرده است
زاں فصاحتهاے او رانم سخن در چند شعر میتواں فهمید ازیں دیگر چه انشا کرده است
هاں سخندانان خورش اضراب وترقی بنگرید اندریں شعر یکه کلک باقر املا کرده است
" صعوه با شهباز گرم رزم شد نے نے غلط روبهے با شیر جنگ فتنه برپا کرده است

نغزتر باشد ازیں هم آں دو شعر دیگرش کز بلندی جائے بر اوج ثریا کردہ است
"گرچه زاید باشد از حیثیتش نام خدا تا نتی تحسین بود کاریکه آنها کردہ است"
"هم بغور و فکر بسیارے ز تحریر جواب سرسری گرانچه ملک ماب ابها کردہ است"
لفظ 'حیثیت' بجاے 'علم' میخواهد سند زاهل پارس آنرا بدیں معنی که املا کردہ است
خوش مضاف آوردہ در شعر دوم لفظ 'جواب' دوستاں بیلند کایں عاندی تماشا کردہ است
'ریشخندہ خلق' خوش بسته است در شعر دگر ضحکهٔ خلق از زبان خلق خود را کردہ است
جاے دیگر باز میگوید که ایں اشباع کاف "از فصاحت مصرع را بیشک معرا کردہ است
خنده می آید مرا بر خردہ گیری هاے او خود بد و آنکه بطعن غیر لب وا کردہ است
'عین' مصرع را فگند و خون شعر خود بریخت خون ایں برگردن ظلم آشکارا کردہ است
'عین' را افگندن ارکوری نباشد چیست ایں آرے آرے فرط جهلش کور اورا کردہ است
پاسخ اشباع 'کاف' از قول او روشن بود کاندریں دو شعر نغز خود چه املا کردہ است
"غیر ازیں از سستی ترکیب و لغو و حشو و نغز پخته مغز یهاے او هرچه تقاضا کردہ است"
" بالو از شکرانهٔ ایں کے تواں آمد بروں که مرا تلمیذ غالب حق تعالی کردہ است"
'چه' و 'که' چوں هر دو با اشباع آوردہ خودش هر جوابے کو کند آں پاسخ ما کردہ است
هم نشست لفظ 'شکرانه' تماشا کردنی است شکر و شکرانه مراد ف آشکارا کردہ است
سرسری نتواں ازیں شعر تواے با قرگذشت بسکه لطف و خوبیش محو تماشا کردہ است
"همچو روز روشن است و نیک روشن گشته است بر سخندانان جهاں هرکس تماشا کردہ است"
ما وراے خبط ایں لفظ 'سخندان جهاں' طرفه حسن و خوبیء شعر آشکارا کردہ است
لفظ واحد را بجاے جمع آوردن چرا ایں چنیں جاها چه لفظے را تقاضا کردہ است
آفریں خاتم کنوں بر حسن گفتار سخن کو ز شاگردی غالب فخر و دعوی کردہ است
قطعهٔ خود را مزین کرد باعنوان نثر تا نپنداری که مشق نظم تنها کردہ است
چیست معنیء تعالی الله شانه اے نحویاں ایں عجب ترکیب در روے قابل املا کردہ است

همچنین باهای مدغم آن دگر فقره به بین
رفع جای کسر ای نحوی چه بیجا کرده است

بلکه گوید ای شاعران بکره که شاگرد رشید
شعر خوش در مدح او ستاد خود انشا کرده است

"عرفی و نقش بگویم گر بمطلب وارسد"
خامهٔ جادو طرازش آنچه انشا کرده است

فاعل فعل 'رسد' یا ظاهر آمد پس کدام
فعل را حذف یا بحذف فاعل املا کرده است

باز ربط هر دو مصرع از ره ترکیب چیست
حیرتی دارم که آیا این ز سودا کرده است

بوالعجب‌ها مانده ام با لفظ 'ها' باشد عجیب
جمع و واحد اندرین یک فقره یکجا کرده است

در عجب‌ها مانده ام یا بوالعجب ماندم همین
جای آن فقره چرا قایل نه انشا کرده است

لفظ 'حاشا' با الف بنوشت و خوانده بی الف
گر نمیخواند الف را از چه املا کرده است

بشنو و فرما خطاب و فعل غایب کرده است
جمع این هر دو بیک شعر از چه آیا کرده است

باز در تقریر معنی کلام اوستاد
هان تماشائی سخن طرفه تماشا کرده است

دید چون غالب تقاریظ کتاب لاجواب
خوشتر این شعری بمدح احمد انشا کرده است

'غازیان همراه خود آورد از بهر جهاد
تا نه پنداری که این پیکار تنها کرده است

یاد خواهد بود یاران پیش ازین در پاسخش
کلک حق گوئی من این دو شعر املا کرده است

دوستان دو احمدی غازی و پیکار و جهاد
حق بدست کیست ظاهر در معما کرده است

'جنگ غازی با که باشد در جهان دانند خلق
حیف خود را از زبان خویش رسوا کرده است

لیک شرح این سخن شاگرد او گوید چنین
غازی آن باشد که از غالب تولا کرده است

نیک سنجید ای سخن سنجان معنی آشنا
گفتهٔ غالب چه معنی را تقاضا کرده است

هرزه گوئی این چنین کرد است و آنکه نام آن
پاسخ دندان شکن یا رب چه زیبا کرده است

در حقیقت پاسخش دندان او را خود شکست
پاسخ دندان شکن نامش ازینجا کرده است

بر سخن ایراد تا کی ای فدا آخر ترا
این نه بس باشد که موزون شعر انشا کرده است

قطعه بجواب قطعهٔ 'فدا' از فکر والای جناب سید محمد باقر علی صاحب تلمیذ حضرت غالب مدظله -

مولوی عبدالصمد یعنی فدای نکته سنج   در جواب قطعهٔ ما قطعه انشا کرده است
وه چه خوش قطعه که قطعات جواهر هانثار   آسمان بر نظمش از عقد ثریا کرده است
مرحبا صد مرحبا خیزد ز قبر انوری   آفرین صد آفرین روح شنیعا کرده است
بسکه از حرف حرفش میچکد آب حیات   ناظرین را غیرت خضر و مسیحا کرده است
کشور بنگاله زونا زد بخود نام فدا   باب علم و فضل بر روی جهان وا کرده است
بلبل شیراز باشد شاعر بنگالوی   کار سندل "بهلد" را خاک مصلا کرده است
جوهر علم و ادب را بهر شهرت داده عرض   از گروه شاعران باشد تهنا کرده است
آفرین بر دقت طبع رسایش آفرین   وه چها ایراد بر اشعار املا کرده است
داد از هر اعتراضی داد خوش فهمی چه خوش   گنج مخفیء معانی آشکارا کرده است
می سراید نغمهٔ دل کش بآهنگ عجیب   می رباید دل ز کف کار کاها کرده است
میکند تردید قول ما با یراد سخیف   اتباع رسم استاد خود آغا کرده است
او ز نافهمی جواب حضرت غالب نوشت   یعنی از هذیان تراوید آنچه انشا کرده است
کرد رد قاطع برهان بزعمش گوئیا   کعبه را بشکسته تعمیر کلیسا کرده است
وین بعزم جنگ ما اینک میان جان به بست   سر ز هر سو خنجر و تیغ و سنانها کرده است
لنگ لنگان جلوه گر شد بر سر میدان رزم   غیرت طبعم که دارد این تقاضا کرده است
شرح پردازم جواب اعتراضش حالیا   کز ره فکر رسا در خاطرش جا کرده است
این نوای خارج آهنگش بگوش دل شنو   که بتقریر عجیب ایراد بیجا کرده است
"هان سخندانان خوش اضراب و ترقی بنگرید   اندرین شعریکه کلک 'باقر' املا کرده است"
نسبت روبه بشیر از نسبت اول قوی   در ضعیفی نسبت ظاهر شک چه اینجا کرده است
لفظ 'دهشت' چرا باشد مرادف 'علم' را   معترض بین طرفه استلزام پیدا کرده است

بخورد مفہوم 'حیثیت' بود اسلوب و وضع   زاید از اسلوب خود یعنی کہ اغنا کردہ است
میتواں دانست باشد زاں نمط لفظ جواب   کہ اضافت را لزوماً تقاضا کردہ است
گاہ مذکور است وگہ محذوف جزو ثانیش   نیک داند ہرکہ رسم قوم احصا کردہ است
مولوی جامی * کہ بادا رحمت حقش نثار   اندریں مصراع حذف جزو اُخریٰ کردہ است
چیست دانی مطلبش یعنی جواب صد سلام   اقتضا شان محل تقدیر آنرا کردہ است
ہمچناں مفہوم شعر ماست از لفظ 'جواب'   حذف لفظ قطعہ را اینجا تقاضا کردہ است
مصرع ثانی بود تفسیر آں تقدیر و بس   وائے نافہمی عجب ایراد بیجا کردہ است
خلد خلداں آنکہ می‌آید بسوے 'ریشخند'   تا چہ شکے در دل واہی او جا کردہ است
چوں بتقریر جوابش خامہ بکشاید زباں   معترض منشاے شک خود چو اخفا کردہ است
ہاں تردد باشدش در ہاے زاید غالباً   آنکہ کلک کاتبش از سہو املا کردہ است
در جواب قطعۂ 'جوہر' جواب ہیں را   خامۂ معنی نگارم آشکارا کردہ است
وانکہ کافم را نظیر کاف باشہاے خود   از رہ جہل و کمال سادگیہا کردہ است
'کاف' صدر و 'کاف' اوسط مختلف باشد بحکم   بیں دوا ریں گر خدایت چشم بینا کردہ است
دیدۂ عبرت کشا و بنگر ایں اشعار را   کز پئے جمع دل تو کلکم املا کردہ است
گر کنم قطع نظر زیں 'کاف' لفظ 'کار' تو   آنکہ بعد 'کاف' در شعر تو ماوا کردہ است
ہاں بفرمائی خدا را کز براے کار چیست   گر تنہا فرا نہ در شعر تو پیدا کردہ است
دعویٔ نحوئیش وانکہ بہ بیں 'تہطمل' را   در نخستیں قطعۂ خود آنکہ املا کردہ است

---

* "جامی علیہ الرحمۃ" بہر سلام مکن رنجہ در جواب آں لب   کہ صد سلام ز ما بس یکے جواب از تو
† "حزیں" :- دارم از غالیہ سایان صبا چشم حزیں   کہ غبارے بمن از خاک مصلا بفرستد
"حزیں" :- کاسۂ آز بود چشم لیئمان جہاں   کہ ز خاکش نتواں باہمہ تنگی پر کرد
ظہوری :- نکتہ داں شاہ عادل ابراہیم   کہ بحرفش لب از خطا مصئون
حافظ :- خوش خبر باش اے نسیم شمال   کہ بما میرسد زمان وصال
عرفی :- خواب راشب ہمہ شب دیدہ بپا می بردم   کہ برہیم در ایں واقعہ را ساختہ باز

ہاں بگو تبطیل کے اندر لغت باشد صحیح   جاے ابطالش رقم کلکش چه بیجا کرده است
وآنکه بر 'شکرانه' * دارد از سر جہل اعتراض   فکر در قول سخن سنجاں مگر ناکرده است
گر بلفظ 'شکر' داخل گشت حرف نسبتی   قبح در معانی بگو نادان چه پیدا کرده است
ہیں کلام حضرت حافظ که چوں فرموده است   اندریں شعریکه اندر حاشیه جا کرده است
ہست اے ناداں بداں لفظ 'سخنداں' اسم جنس   کاقتضاے واحد و جمع و مثنی کرده است
چوں سوے لفظ جہان و خواه عالم شد مضاف   معنی در حکم استغراق پیدا کرده است
'وانمودن' راچه خوش گفتا جواب با صواب   یعنی غیراز ترجمه دیگر چه انشا کرده است
فاعل فعل 'رسد' گم کرده در قول 'سخن'   جستجو ہر چند ہرجانب چو اعمی کرده است
فاعل فعل 'رسد' باشد ضمیر حرف سین   آنکه وہما قبل کلک شاعر املا کرده است
وآنکه 'ہا' خوانده است بعد 'بوالعجب' در جاے 'ما'   بیخرد او را مگر ہیجان سودا کرده است
اعتراضے میکند ناداں بضم و کسرهٔ   آخر از دست خودش قایل نه املا کرده است
با حشیشے می درآویزد غریق جاں بلب   آرے آرے فرط جہلش خوار و رسوا کرده است
می سراید طرفه شعرے دلفریبے کاں چہا   دقت طبع روانش آشکارا کرده است
"بشنو و فرما خطاب فعل غایب کرده است   جمع ایں ہردو بیک شعر از چه آیا کرده است"
لفظ 'غایب' یا خبر باشد ز لفظ فعل تو   پس چه فعل است آں که غائب قایل آنرا کرده است
یا صفت باشد برایش پس چه باشد معنیش   گفتگوے طرفه با رمز معما کرده است
حالیا بشنو جواب اعتراض خویشتن   کز جہالت خطره اندر خاطرت جا کرده است
فاعل اندر مصرع ثانی بود آقاے تو   ہم ضمیر یا سخنش راجع بآقا کرده است
در خطاب 'بشنو و فرما' مخاطب شد 'فدا'   خامهٔ ما کرد تسکین تو یا نا کرده است
ہست ایرادت بفعلش ہاں عجب فعل شنیع   حق بدست تست یا تو خواجهٔ ما کرده است
می سراید مصرعے با صد فصاحت معترض   "دوستاں بینند کایں ہندی تماشا کرده است

* مثال شکرانه - حافظ :- شکر ایزد که میان من و او صلح فتاد   حوریاں رقص کناں ساغر شکرانه زدند

هند یم از طعن فرمود و بجا فرموده است　　هاں مگر خود راحریفم اصفهاں زا کرده است
کرده زیں قطع نظر لفظ ' تماشا ' بنگرید　　کاندریں مصراع او معنی چه پید اکرده است
دیدن و رفتن باستعمال فرس و تازی است　　تا ازیں هر دو چه معنی درویش جاکرده است
لیک در مصرع نمی باشد یکے هم منطبق　　از برائے قافیه شاید که املا کرده است
شاعر شیریں زبان ما بفرماید چنیں　　"ایں نه بس باشد که موزوں شعر انشا کرده است"
من بلا گردان موزونی طبع ناز کش　　شعر را موزوں صفت کرده چه آیا کرده است
ایں نمی داند که موزوں داخل جدول است　　از حقیقت وصف آں کرد، چه بیجا کرده است
سرمهٔ بینش کشم در دیدهٔ عبدالصمد　　ایں دل شیدائے ما باقر تمنا کرده است
لیک روشن کے تواں شد دیدهٔ اعمائے ے　　چوں خدایش کور مادرزاد پیدا کرده است
نرم کردن مثل آهن به آهن فی المثل　　خامهٔ ماهم باندازوے املا کرده است

سخت گوئی را نباشد پیشدستی زیں طرف
او چو بد گفت است آخر خود هم اصغا کرده است

قطعه دوم بجواب قطعهٔ عبدالصمد فدا از نتائج افکار جناب سید فخرالدین حسین دهلوی سخن تخلص تلمیذ و نبیرهٔ حضرت جناب نجم الدوله دبیرالملک نواب اسدالله خان بهادر نظام جنگ غالب تخلص اعلی الله تعالی درجاته ما دامت السموات والارضین

مولوی عبدالصمد شاگرد آغا قطعهٔ　　در جواب قطعهٔ ماباز انشا کرده است
از جهالت بر کلامم معترض شد جا بجا　　جا و بیجا لفظ نا دانسته املا کرده است
مصرعه اول زفیر و ثانیش باشد شهیق　　نا مشخص چوں سفیهاں شور وغوغا کرده است
من جواب اعتراضش مینویسم سربسر　　بیخرد از راه نادانی چه ایما کرده است
معترض گردید و علم نحو خود هم صرف کرد　　خورده گیری ایں چنیں از راه سودا کرده است

کاتوش کرجائے اعلی الله تعالی'له نوشت   معترض بیصرفه این ایراد برپا کرده است
مدعی آنرا بعنوان نصیحت بنگرد   تاچسان این جمله را کلک من انشا کرده است
پیش ازین در قطعهٔ اول بمدح اوستاد   کلک حق اندیش من این شعرا املا کرده است
عرفی و نقش بگویم گر بمطلب وارسد   خامهٔ جادو طرازش آنچه انشا کرده است
حبذا طبع رسائے شاعر معجز بیاں   اعتراضش جهل او را آشکارا کرده است
مطلب شعرم بفهم او نه آمد مطلقاً   میکند تحریر کاین از راه سودا کرده است
چوں ندارد قوت فهم سخن از فرط جهل   با سخندانان چرا این جنگ برپا کرده است
میکنم تفریح آں اکنوں شنیدن بایدش   لطف آں را خامهٔ من آشکارا کرده است
بر مطالب وارسیدن فعل باشد بالیقین   فاعل آں فعل اینجا مرکسے را کرده است
'بوالعجب ماندهٔ ام' اول نگارش کرده ام   شاید آنرا کاتبش از سهو انشا کرده است
'بشنو و فرما' ز تو وز کرده شد اغا مراد   فعل غایب بهر آں کلک من انشا کرد است
مدعی در قطعهٔ اول چو از رشک و حسد   بهر اوستاد من این تحریر بیجا کرده است
"دوستان احمدی غازی و پیکارش جهاد   حق بدست کیست ظاهر در معما کرده ست"
یاد باد آں رمز اے یاران معنی آشنا   خامهٔ من پاسخش اینگونه املا کرده است
'اے فدا چوں از مذاق شاعراں آگه نهٔ   توچه دانی حضرت غالب چه انشا کرده است
گر همان مفهوم تو شد از جهاد و غازیان   درهمین مضمون کفراندر دلت جا کرده است
بشنو از من بیخبر این پاسخ دنداں شکن   همت مردانهٔ من این تقاضا کرده ست
'غازیاں دارند با غالب تولا در سخن   کافر آں باشد که از غالب تبرا کرده است
پاسخ دنداں شکن دندان اورا چوں شکست   در جواب پاسخم این شعر املا کرده است
"هرزه گوئی این چنین کرده است وآنکه نام آں   پاسخ دنداں شکن یارب چه زیبا کرده است"
خوش جواب پاسخ من داد از فرط غضب   جهل نادانی خود نیکو هویدا کرده است
مولوی باقر علی علامهٔ عهد خود است   وائے بروے کو با ولب در سخن وا کرده است

معترض شد بر کلام آں معانی آفریں   کو بسے شاگرد مثل او و آغا کردہ است

با چه خوش ترکیب نظم دلکشا و شعر نغز   کلک آں والا حشم زیں پیش انشا کردہ است

"صعوہ با شہباز گرم رزم شد نے نے غلط   رو بہے با شیر جنگ فتنہ آرا کردہ است"

صعوہ اول گفت و روبه باز آغا را نوشت   ایں ترقی بہر استاد توزیبا کردہ است

لفظ 'حیثیت' برائے وضع و اسلوب آمدہ   نے بجائے علم مخدوم من املا کردہ است

چوں سروکارے تعلیم آغا ندارد زیں سبب   لفظ حیثیت' بجائے 'علم' املا کردہ است

پاسخ اشباع کاف صدر میدارد سند   بیں دواویں گرترا در دل شکے جاکردہ است

لیک ایں اشباع از تو نیز میخواهد سند   "کز عجیب و معترض که کاربیجا کردہ است"

ماورائے 'کاف' ایں بیکار 'لفظ کار' تو   دقت طبع رسائے تو هویدا کردہ است

چوں مضاف آمد 'سخنداں' 'باجہاں' پس قیم چیست   کو دراں معنی استغراق پیدا کردہ است

اے فدا چشم ظاهر بیں اگر باشد چه سود   کور باطن چوں ترا ایزد تعالیٰ کردہ است

با وفور شوق میخواهم کنوں مدحش که او   پارسی بالهجۂ بنگاله انشا کردہ است

شعر اول در کلام او تماشا کردنی هست   من فدائے او چساں تقریر زیبا کردہ است

"مولوی باقر علی باقر تخلص قطعۂ   در جواب قطعۂ ایں بندہ انشا کردہ است

لفظ "ایں بندہ" چه خوش بسته است در شعر خودش   لهجۂ بنگاله را نیکو هویدا کردہ است

لفظ 'بن بندہ' بضم 'با' چو دارد بر زباں   همچناں در نظم زیبائے خود املا کردہ است

بیخرد اندر لغت دشنام کردن نامدہ   کیست آں خواجه حسن کو جایز آنرا کردہ است

معنیٔ سروا نمودن 'بهر مطلع گفت خوش   پاسخ آں باز کردن وہ چه انشا کردہ است

در جواب خود مع التکرار لفظ با نوشت   در خطاب مولوی باقر چه ایما کردہ است

"زاں' فصاحتہائے اوراقم سخن در چند شعر"   ایں چنیں جائے دگر در قطعه املا کردہ است

لفظ 'زاں' در مصرعش بیکار و مهمل اوفتاد   از فصاحتہا چرا اینجا نه انشا کردہ است

باز گوید ایں کلم تحسین بر باقر که او   "دفترا ز جوش فصاحتہائے خود وا کردہ است"

اندریں فک اضافت ' ز چہ آیا کردہ است دفتر از جوش فصاحت وانمودن پر فریب
دفتر جوش فصاحت ہائے خود را کردہ است گر بگنجے ایں چنیں پس شعر او بودے فصیح
با فصاحت از رہ ایراد املا کردہ است معترض در نظم زیبائے خرد ایں یک شعر نغز
ایں چنیں جا ہا چہ نقطے را تقاضا کردہ است لفظ واحد را بجائے جمع آوردن چرا
بہر جا ہا لفظ واحد را چہ املا کردہ است در کلام مدعی ایں جا تباین بنگرید
آں دگر فقرہ کہ ایں ہندی تماشا کردہ است یک بیک تبطیل و موزوں شعر و لفظ کو کند
مدعی ہر آنچہ در نظم خود انشا کردہ است غیر ازیں ہم اے سخن سنجاں تماشا کردنی ست
آنکہ در اقلیم معنی داوریہا کردہ است خامۂ جادو طراز شاعر یکتا 'امیر'
در ثنائے ساکن بنگالہ انشا کردہ است از رہ انصاف با الفاظ نیکو قطعۂ

پاسخ ایراد من اکنوں نباشد از فدا
اے سخن ہر آنچہ بروے خامۂ ما کردہ است

قطعۂ من نتائج طبع دبیر بے نظیر منشی محمد امیر صاحب
متخلص بہ 'امیر' رئیس لکھنؤ سلمہ اللہ تعالی
و ارتقاہ علی مدارج الاعلی کہ ز اودھ اخبار نقل نمودہ شد

بلا تعلی مضموں لکھے ہیں چند اشعار یہاں مبالغۂ شاعری نہیں درکار
عجب وقائع حیرت فزائے عالم ہے سنیں پسند کریں مالک اودھ اخبار
ہوا ہے مستعد جنگ نظم بنگالی ہوتی ہے غالب و مغلوب میں عجب پیکار
جواب ان کا لکھا پارسی قیامت کی کہاں یہ سنگ رخام و کہاں در شہوار
یہ کھانے والے ہیں دن رات سکتی مچھلی کے عفونت ان کی زباں سے نہیں گئی زنہار
خرابی ان سے ہوئی اردوئے معلی کی چلم کو کہتے ہیں یہ کولکی خدا کی مار
سیاہ قلب کا مضموں سپر ہے سلہٹ کی پناہ دے نہ اسے تیغ حیدر کرار

سپاهی زادہ کا اوس نے جواب خوب لکھا کہ میرا دادا تھا نادر کی فوج کا سالار
کسی کے جد کو بتائے جو کوئی اپنا جد کبھی دروغ کو ہوتا نہیں فروغ اے یار
وہ اپنے جد کا بتائیں خطاب سرداری میاں گلچنہ تھے کون نادری اسوار
بغیر نام و نشاں کس طرح یقین آوے خلاف محض یہ جد جدید کا اظہار
یہ اون کے اب جد فاسد کی بگڑی ہے ابجد بتائیں وہ کوئی نام اس مقام پر زردار
اسی طرح سے کلام ان کا سب ہے مصنوعی دروغ نظم سے کہیں کر نہ ہو جہاں بیزار
رقم کیا ہے جو ہر جا کی جا یہ اب جا جا یہ جا جا کون مرض کی دوا ہے اے بیمار
صحیح فارسی میں ہم نے مارا ہے جا جا فصاحت اوس کی تکلم میں ہے بہت دشوار
زباں بریدہ بکانچے نشستہ صم و بکم خموش رہنا ہے اون کے لیے بہ از گفتار
خدا گواہ کہ اب عافیت اسی میں ہے وگر نہ اون کے لیے ہوگا مضحکہ بسیار
امیر نے رہ گم کردہ کو ہدایت کی اونہیں یہ چاہیے اس بات کے ہوں شکرگزار
سنو بیاں اسداللہ خاں غالب کا زمانہ اون کے حسب اور نسب سے واقف کار
خطاب یافتہ ہیں وہ رئیس دہلی کے زمیں سے تا بہ فلک حسن خاندان اظہار
وہ اپنے عصر کے خاقانی و ظہوری ہیں نظیر اون کا جہاں میں کہیں نہیں زنہار
سخن کی داد ملے زندہ ہو جو فردوسی کلام اون کا وہ نام خدا ہے باغ و بہار
وہ نظم حضرت غالب جہاں میں غالب ہے انہیں کے قول پر آفاق کا ہے دار و مدار
اساتذہ میں یہاں ناسخ جہاں منسوخ انہیں سے طالب اصلاح شاعران دیار
زمانہ ہم کو بھی کہتا ہے مصحف الدولہ فہیم شعر ہیں البتہ شاعری دشوار
لکھا ہے ہم نے بھی ایک مختصر جہاں آشوب کہے ہیں اوس میں مسلسلہ ہفت صد اشعار

جو سرگذشت کہیں کی نئی سنی لکھی
لکھا امیر نے یہ واقعہ بھی آخر کار

تمام شد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جواب تحریر میر آغا علی صاحب شمس لکھنوی مطبوعہ اودھ اخبار مورخہ ۲۵ ماہ جون سنہ ۱۸۲۷ عیسوی معہ جواب اعتراض از نتائج طبع بلند آسماں پیوند شاعر بے نظیر دبیر جادو تحریر جناب سید فخرالدین دہلوی سخن تخلص تلمیذ و بہیرۂ حضرت شہاشاہ اقلیم معانی مہر سپہر سخندانی جناب نجم الدولہ دبیرالملک نواب اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب تخلص اعلی اللہ تعالیٰ درجاتہ -

الحمدللہ الذی نور قلوبنا بنورالایمان - والصلوٰۃ والسلام علیٰ افضل رسل محمد نزل علیہ القرآن و علیٰ آلہ المطہرۃ و اصحابہ البررۃ الاتقیاء معدن الجود والاحسان -

اما بعد ارباب فضل پر مخفی نہ رہے کہ انسان کو براہ تعلی بے ضرورت اظہار اپنے حسب و نسب کا اپنی زبان سے زیبا نہیں تحریر میں اپنی علمیت کا اعلان اور براہ تعصب کسی کے مذہب پر طعن ہرگز روا نہیں - بقول شخصے "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید" - مگر چونکہ پہلے میاں شمس کی جانب سے ہدایت ہوئی اس لیے اس کے جواب کی مجھ کو بھی توفیق اور ہدایت ہوئی - ان کو اگر اہل دہلی پر اعتراض اور اپنی ہمہ دانی کا غرور ہے تو ادھر بھی جواب شافی دے کر آگاہ کرنا ضرور ہے —

سنیے جناب آغا علی صاحب کہ نام میرا سید فخرالدین حسین تخلص

میرا سخن - دہلی میرا مولد - لکھنؤ میرا مسکن - حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہوں اہل سنت و جماعت ' چشتیہ ' طریقہ 'سلسلہ' قادریہ میں بیعت مذہب حنفی حضرت غالب مدظلہ العالی کا نواسا اور شاگرد ہوں - شمس اور قمر میرے بھی دو تلمیذ رشید ہیں ان کا اوستاد ہوں اگر آپ نے علم صرف و نحو اور فارسی کا قاضی محمد صادق خاں اختر سے پڑھا تو میں نے بھی علم عربی کا حافظ عبدالرحمن مغفور اور مولوی محمد علی صاحب دہلوی سے حاصل کیا - اگر آپ شاعر اور منشی ہیں تو میں بھی اس فن میں کامل اور خوش بیان ہوں - آپ نے چند غزلیں کہی ہوں گی میں صاحب دیوان ہوں اگر آپ کو ریاضی اور تاریخ گوئی میں دخل ہے تو میں بھی جانتا ہوں آپ کو کب مانتا ہوں آپ کو انھیں چند علوم میں وقوف حاصل ہے مجھہ کو آپ سے زیادہ علم فقہ اور تفسیر اور حدیث میں استعداد کامل ہے آپ اگر بے نظیر ہیں تو میں بےعدیل ہوں - آپ اگر لکھنؤ میں خوش باش ہیں تو میں وکیل ہوں آپ کو اگر اپنی زبان دانی کا دعویٰ ہے تو ایسی زبان دہلی کے عوام‌الناس بولتے ہیں لکھنؤ کے فصیحوں کا دم بند کرتے ہیں وہاں کے شعرا پر ازراہ اعتراض زبان کھولتے ہیں ' لکھنؤ ' کے افصح الفصحا مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور تخلص نے کتاب فسانۂ عجائب تالیف کی میں نے سروش سخن ان کے جواب میں تصنیف کی وہ بمطبع ممدوح جہاں شفیق و مکرم مخدوم و معظم جناب منشی نولکشور صاحب کے چھپ گئی بغور تامل ملاحظہ کیجیے انصاف کو ہاتھہ سے نہ دیجیے - ' آپ ' نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا کہ میرے اجداد امجاد حضرت سید شاہ خواجہ حسین اور خواجہ حسن اور شاہ قطب اعظم قدس اسرار ہم نے حسب

خواہش و اصرار نواب آصف الدولہ مرحوم لکھنؤ میں سکونت اختیار فرمائی باوجودیکہ اختلاف مذہب تھا اور روز مرہ کی ملاقات تھی مگر مذہب کی گفتگو کبھی کسی کے زبان پر نہ آئی - 'دہلی میں تو آپ کے مذہب کے لوگ خال خال تھے مگر لکھنؤ میں اکثر فارغ البال تھے رستم نگر محمود نگر فرنگی محل یہ دو تین محلے لکھنؤ کے اہل سنت و جماعت سے آباد تھے زمانۂ سلطنت میں بھی کوئی ہم لوگوں سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا سب مطیع و معتقد تھے اب کہ سرکار دولت مدار ملکہ معظمہ دام اقبالہا کی عملداری ہے قانون تعزیرات ہند جاری ہے باوجود اس کے آپ نے بڑی جرأت کو کام فرمایا کہ آپ نے اپنی تحریر میں اہل سنت و جماعت پر مذہبی طعن کیا دفعہ تعزیرات ہند کا مطلق خیال نہ آیا ابھی جو کوئی بر سر پر خاش آئے تو حضرت قافیہ تنگ ہوجائے - طرفہ تر یہ کہ صاحب صحیفہ اکمل الاخبار کے جواب میں آپ نے بہت زور شور کی تحریر سے اس بیچارے پر ایک جرم قائم کیا اور یہ نہ سمجھے کہ اس تحریر سے وہ جرم آپ پر عاید ہوا - 'یعنی' پہلے تو آپ نے حضرت محل مادر برجیس قدر کی سرداری سے انکار کیا پھر علی الرغم صاحب صحیفہ اکمل الاخبار بتکرار اس کی اورنگ نشینی سے اقرار کیا اور حکومت اس باغیہ کی مثل حکومت سرکار ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے سمجھی - 'دوسری تقریر کا آپ کے خلاصہ یہ ہے کہ شاہ دہلی کے جو خارج ہونے کا خیال ہے اس کا سخت ملال ہے - اس سے ثابت ہوا کہ آپ کو بھی بیگم باغیہ کے خارج ہونے کا بہت الم ہے 'انتہا' کا غم ہے - کہ آپ کے نواب کسی زمانے میں جس کے نمک خوار تھے اس کو اپنے مقابلے میں حضرت ملکہ پھوس بنایا صاحب اخبار کو جہلا کے یہ فقرہ سنایا تھا 'آپ کی' طرز تحریر سے آپ

کے دل کا مطلب خوب سمجھے مگر ہم اس کے اظہار کو اس مقام میں
معیوب سمجھے - 'آپ کے' اوستاد قاضی محمد صادق خاں اختر کو اور
تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر اتنا کہوں گا کہ وہ اہل زبان نہیں
کلام ان کا مشہور جہاں نہیں 'شیخ' مہدی علی خاں ذکی اور دوسرے
لالہ جی اشکی جن کو آپ نے ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز فرما کے اپنا
اوستاد قرار دیا ہے ان کو تو سوائے آپ کے اور کوئی بھی نہیں جانتا
وہ ہیں تو کیا ہیں جنہیں کوئی نہیں پہچانتا - اور 'کیوں صاحب وہیں
کے کہلاتے ہو دہلی اور ساکنان دہلی پر منہ آتے ہو پھر دہلی کے نہیں
تو لکھنؤ کے ہو ٹانڈہ کے ہو یا مئو کے ہو - 'اگر لکھنؤ' کی تمہارے پاس
سند ہے تو سنو لکھنؤ اور کوفہ متحد ہے کوفی لایوفی مثل مشہور ہے لکھنؤ
کا اپنے تئیں کہو تو یہ تمہاری دانشمندی سے دور ہے - 'خیر تم' کہیں کے
کے ہو اس سے کچھ مطلب نہیں مگر ہم تو رہنے والے شاہجہاں آباد کے
ہیں اور شاگرد ایسے استاد کے ہیں جن کا تم کلمہ پڑھتے ہو جن کے
کہلاتے ہو شرم نہیں آتی اسداللہ خاں غالب سے لڑتے ہو ان پر منہ آتے
ہو - 'خدا کی' قدرت شاہجہاں آباد اور تمہاری تیر جفا کا نشانہ موزوں
ہونے کا دعوی اور اس قدر تجاہل عارفانہ 'اب' اگر چھپوا ہے تو ابتدا
سے چلیے - 'دہلی' میں اردو زبان کی بنیاد ہوئی وہیں سے یہ ایجاد ہوئی
'دہلی میں صدہا اولیائے کرام اور بزرگان دین مدفون ہیں جن کے اب
تک تعرف ہو جاتے ہیں - 'لکھنؤ' میں سوائے شاہ مینا صاحب کے اور بھی
کوئی حضرت نظر آتے ہیں - 'دہلی' میں علما ایسے ہوئے کہ جن پر آپ
کے مجتہدوں نے خار کھایا ہندوستان میں ثانی ان کا نظر نہ آیا -
'دہلی' میں ایسا زبردست شاعر ہوا جس کو آپ کے ناسخ وغیرہ سب

مانتے تھے اپنا استاد جانتے تھے اس میں اهل لکھنؤ تو کس طرح گنجائش تقریر نہیں کیونکہ خود کہہ گیا ہے ع —

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اور میرے استاد جنکا هندوستان سے ایران تک نظیر نہیں ان کو تو بھلا کب مانوگے زیادہ کہوں گا تو دشمن جانوگے سچ کہتا ہوں جو تمہاری تحریر دیکھتا ہے لاحول پڑھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یاررو ع —

مینڈکی کو بھی لو زکام ہوا

یہ جو مثل مشہور ہے وہ اس جگہ صادق آئی قدرت حق کا ظہور ہے جن کا هند میں آج تک کوئی نہ مقابل ہوا آپ کا کلام میاں شمس کے اعتراض کے قابل ہوا اور وہ بھی کون میاں شمس کون زہرہ اور مشتری دو رنڈیوں کے اُستاد - جن کا کلام سوائے ایک غزل کے کسی نے سنا نہیں فارسی کیسی اردو کا دیوان بھی کسی نے دیکھا نہیں پس اگر شاعری کا دعویٰ ہے تو کوئی کلیات فارسی کوئی دیوان اردو تین ہی جزو کا چھپواؤ ذرا ہم کو دکھاؤ پھر مناظرہ کا مزہ دیکھو اور اگر یوں ہیں اندھا دھند نہتے لڑوگے تو منہ کے بل گر پڑوگے زک اٹھاؤگے جاهلوں میں شمار کیے جاؤگے - سکنائے دهلی کی وضع پر هنستے ہو پھبتیاں کہتے ہو آوازے کستے ہو معلوم ہوا کسی بانکے جوان والے نے تمہارے کان کا میل نکالا جو اهل دهلی کو کان میلیا بنایا سلائی ذرا گہری چبھوئی جو ایسا کلمہ زبان پر آیا - دوسروں کی پگڑی کیا تکتے ہو پہلے اپنی ٹوپی تو سنبھالو تم پہلے کہہ چکے تو اب ہم سے سنو کہ لکھنؤ کے خواص و عوام وضیع و شریف ادنی اور اعلی هندو مسلمان شیخ سید مغل پٹھان اکثر ڈاڑھی منڈواتے ہیں یقین جانو زنانی ادرک معلوم ہوتے ہیں سب امرد نظر آتے ہیں کہتے

ہو کہ دلی والوں کو پکڑنے کی عادت ہے میں کہتا ہوں لکھنو والوں میں یہ علت ہے یاد رکھو جو گومتی میں نہایا اوسنے ماہوں کا لقب ضرور پایا اب تم ہی انصاف سے کہو کہ گومتی کہاں ہے ہم تو جمنا جانتے ہیں دھلی میں یہی دریا رواں ہے —

سخندان جواب است این نہ جنگ است   کلوخ انداز را پاداش سنگ است

اور یوسف مرزا صاحب دھلوی نے جو چوپتھا کے لفظ پر اعتراض کیا تمہارا جواب یہ ہے کہ چورتھا کی دلیل سے چوپتھا کہنا درست ہے میں کہتا ہوں کہ محلہ کے نام کے لیے یہ کلیہ آپ کا محض غلط اور یہ تقریر نہایت سست ہے - دو گلوان محلہ جو لکھنو میں واقع ہے اس کو بحذف نون دو گلوا کیوں نہیں کہتے پانچ بہونکا دوسرا محلہ جو ہے اسے پانچ بہا کیوں نہیں بولتے - علاوہ اس کے چورتھا علم نہیں ایک چیز کی صفت ہے اور الف اس کے آخر میں فاعل کی علامت ہے معنی اس کے یہ ہیں کہ بات چار رتیوں والا جیسے لکھنوی میں حرف یا علامت فاعل کی ہے یعنی لکھنو کا رہنے والا - گویا گانے والا - طبلچی طبلہ بجانے والا - بخلاف اس کے چوپتھاں کہ نام ایک محلہ کا ہے اس میں نون کا حذف سراسر ناروا ہے آپ لکھتے ہیں کہ تغلی قلصی اور پکھرو کو پہکر مطبجن کو مطرنجن نہ جاؤ کو مت جاؤ یہ سب الفاظ مستعمل سکنائے دھلی ہیں غلط - ان ملہ زوریوں کا میرے پاس کچھہ علاج نہیں واللہ ایسا مہمل اعتراض کیا ہے کہ مطلق جواب کا محتاج نہیں یعنی اول تو یہ بات محض غلط ہے اور اگر بالفرض تسلیم بھی کی جاے تو پہلے میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ محاورہ اور روز مرہ کی سند شاعروں کے کلام سے ہوتی ہے یا اس کی گرفت صرف بول چال سے عوام کے ہوتی ہے اگر یہی

ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ لکھنو کے لوگ تخت کو تخت اور سخت کو سخت اور کمبخت کو کمبخت بضم خاے معجمہ اور سبز کو سبز اور سرخ کو سرخ بفتح ثانی اور حاضر صیغہ فاعل کو حاضر بفتح ضاد اور دروازہ کو درزہ بتشدید زاء معجمہ اور بازار اچھا ہے کو بازار اچھی ہے اور فکر کو مذکر کیوں بولتے ہیں اگر بولتے ہیں تو دوسروں پر کیوں لب کھولتے ہیں اپنے تیلنت کو چھپانا اور دوسروں کی بولی چلکی آنکھ میں پھلی بتانا یہ از راہ حد نہیں ہے تو کیا ہے اس کو اعتراض نہیں کہتے اس کا نام سودا ہے - مومن مرحوم کا مصرع —

وہ شوخ گرم گرم ہو آکر چلا گیا

اس پر آپ نے از راہ ظرافت اعتراض کیا اور حسن معنی سے اُس کے اغماض کیا اگر چلا گیا ہے تو گھبرائے کیوں - میرے اوستاد کے کلام کو سمجھ نہ سکے - غالب مدظلہ '

نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مصرعہ آخر پر دو اعتراض مہمل کیے ایک یہ کاغذی پیرہن محاورہ فارسی کا ہے اردو میں اس کا لانا ناروا ہے اس کے جواب میں دو شعر آپ کے اوستاد قاضی محمد صادق خاں اختر کے لکھے جاتے ہیں غور کیجیے معہ شرح معرض تحریر میں آتے ہیں - اختر —

وائے بیرحمی کہ تو برزدہ دامن گذرا　　اُس دشت کہ جہاں عاشق کا تھرے مسکن تھا

اختر —

ہے بزم میں کس کے رخ پر نور کا جلوہ　　جو شمع کا انگشت تحیر بدہاں ہے

اب فرمائیے کہ برزدہ دامن اور انگشت تحیر بدہان محاورہ فارسی کا ہے یا اردو کا اگر فارسی محاورہ اردو میں ناجائز تھا تو کیوں لکھا - دوسرا

اعتراض آپ یہ فرماتے ہیں کہ ہر کا لفظ تعمیم کے ساتھہ یہاں نادرست ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تقریر بھی آپ کی سست ہے۔ تصویر کا اطلاق علی العموم کاغذی تصاویر پر ہے نہ سنگی اور گلی بتیوں پر۔ تصویر کھینچنا سب شاعروں نے باندھا ہے تصویر بنانا کسی نے نہیں لکھا ہے۔ علاوہ اس کے لفظ نقش اور تحریر کا صاف اس بات پر دال ہے کہ پیکر تصویر کاغذی استاد کا مقصود ہی مآل ہے۔ ماشاءاللہ ابھی تک آپ سے بے اعراب الفاظ صحیح نہیں پڑھے جاتے۔ ارقام بالفتح کو ارقام بالکسر پڑھتے ہو لفظ کے معنی بھی سمجھہ میں نہیں آتے۔ سنو صاحب ارقام بفتح اول جمع رقم کی ہے جیسے اضمام جمع ضم کی ہے سبحان علی خان لکھنوی نے اپنی مکتوبات میں اس لفظ کو کئی جگہہ لکھا ہے اس کو چاہو بالفتح پڑھو یا بالکسر یہ اختیار تمہارا ہے۔ مادہ کے لفظ پر کس قدر نازاں ہو سارا دیوان دشمنی کی نظر سے چھان ڈالا بڑی جستجو سے یہ ایک لفظ نکالا معلوم ہوا عربی میں استعداد کم ہے جو الفاظ صحیح پر اس قدر ستم ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ مادہ بروزن موکل صحیح ہے فقط۔ اعتراض کرنے پر جان دیتے ہیں مگر کسی استاد کا اردو یا فارسی شعر نہیں لکھتے نہ کسی لغت کا نشان دیتے ہیں دعوے بے دلیل اور بیجا بحث پر ناحق اس قدر کد ہے آپ ناواقف ہیں تو ہم سے سنیے کہ مادہ بروزن جارہ صحیح ہے اور اصل اس کی مد ہے بفتح اول بمعنی کشش آب و آب سیل و افزونی آب و کشیدن و در گمراہی فرو گذاشتن و دراز شدن چیزے و مہلت دادن و انداختن نظر بسوے چیزے و اصل چیزے 'اس' روسے مادہ مد امداد مدید مدد و مواد ان سب کا ماخذ وہی مد ہوا آپ کا اعتراض رد ہوا مادہ صیغہ مبالغہ کا ہے اور مصدر بھی ہوسکتا ہے اور مادہ بفتح دوم نہیں آیا

ہے اور نہ کسی شاعر نے لکھا ہے - میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو صراح ملاحظہ کیجیے خاطر عاطر کو تسکین دیجیے - اور اسعد کا مصرع ناف زمین ہے یہ نہ کہ ناف غزال ہے اس میں تو صریح کاتب کی غلطی ہے کیونکہ نہ اور یہ تجنیس خطی ہے ایک کو اوس نے لکھا دوسرے کو بھول گیا پھر کہتے ہو کہ میں نے حضرت غالب کی غزل پر غزل لکھی طبع آزمائی کی واللہ غضب کرتے ہو کہ ایسے مہمل اشعار کی داد طلب کرتے ہو معلوم ہوا طبیعت دار ہو ذہن کے چالاک ہوشیار ہو چند روز میں سعدی علیہ الرحمہ کی گلستان کا جواب کہوگے اور اگر کچھ جی میں آے گا تو تھوڑی عبارت عربی کی لکھ کے قرآن شریف کے آخر میں لگادوگے - اللہ بخشے جناب مولوی سید محمد صاحب مجتہدالعصر لکھنوی نے انتقال فرمایا مجھ کو نہایت عجب ہے کہ آپ کے مذہب کے علما نے آپ کو اپنا مجتہد کیوں نہ بنایا پھر اگر آپ کو غزل پر غزل کہنے کا شوق ہے تو میں اپنی دو غزلیں اس کے ذیل میں لکھتا ہوں آپ ان غزلوں کے جواب میں دو غزلیں تحریر فرما کے میرے پاس بھیج دیجیے مجھ کو ممنون منت کیجیے ناظرین ان غزلوں کے مشتاق رہیں گے اگر جواب نہ لکھیے گا تو خدا جانے کیا کیا کہیں گے :—

غزل سخن دہلوی

یار بھی کرتا ہے تقریر سحاب و آئینہ
اے خوشا اقبال و توقیر سحاب و آئینہ

قطرہ افشاں کاکل مشکیں رخ پر نور پر
صاف دکھلاتی ہے تصویر سحاب و آئینہ

اک نظر دیکھو جو دونوں کی طرف اے شاہ حسن
معجزے دکھلاے تنویر سحاب و آئینہ

میں ہوں عاشق زلف و رخ کا میں ہوں نظارات دن
میرے آگے کیجے تقریر سحاب و آئینہ

آنا مجھ عاشق کی اور تیری نگاہ بے پناہ
اے پری پیکر یہ ہیں تیرے سحاب و آئینہ

میوا رونا ان کی حیرت میر کا ہے یہ مقام
دیکھ لو اک جا ہے تصویر سحاب و آئینہ

ہیں اسیر زلف وگیسو اور رخسار صنم　　برق اور جوہر ہیں زنجیر سحاب و آئینہ

دل میں ہے ہر دم خیال اوس زلف و رخ کا اے سخن
ایک جا کھینچی ہے تصویر سحاب و آئینہ

وله

نکلا ہے خط یار برنگ پر طاؤس　　ہے مملکت حسن بچنگ پر طاؤس

داغوں سے جو یہ غیرت گلزار بنا ہے　　رکھتا ہے مرا دل سر چنگ پر طاؤس

وہ مرہم زنگار ہے اس زخم جگر پر　　اور جائے جسے دیکھ کے رنگ پر طاؤس

ہے عشق حسینوں کا ہر ایک بات حسیں ہو　　ہو داغ بھی دل پر تو برنگ پر طاؤس

وہ زخمی و مجبور ہیں کھل جاتا ہے اکثر　　ہے پاس بھی رہتا میرے تنگ پر طاؤس

یاد آتا ہے جب مجھکو خط سبز پری رو
لگتا ہے سخن دل میں خدنگ پر طاؤس

ناظرین پر واضح ہو کہ ضمیمہ اودھ اخبار نمبر ۲۹ مورخہ ۲۵ ماہ سنہ ۱۸۷۹ عیسوی ۱۰ اگست سنہ مذکور کو میرے ملاحظہ میں در آیا - میر آغا علی صاحب شمس کی تحریر دیکھی دل بھر آیا جیسا لکھا تھا ویسا جواب پایا تکلموا الناس علی قدر عقولہم کی رعایت کی گئی زبان اردو میں تحریر عبارت کی گئی اب صاحبان مالک کل اخبار خصوصاً صاحب صحیفہ اکمل الاخبار کی خدمت شریف میں عرض ہے کہ براہ مہربانی اس تحریر کو درج اخبار فرماویں مجھکو ممنون منت کریں اور اپنے احسان سے زیر بار فرماویں الغرض بس باقی ہوس —

راقم فقیر مذنب

مہر

سخن دہلوی سنہ ۱۲۸۴
سید فخرالدین حسن

قطعہ تاریخ ولادت فرزند سعادت مند نور چشم عزیز دلہا برادرم میرزا محمد عسکری اعطاءاللہ عمرہ وزاد قدرہ ولد حضرت عمو صاحب مدظلہ چکیدہ خامۂ عجز طراز کمترین سید فخرالدین حسین دہلوی سخن تخلص کہ از ہر مصرع قطعہ مادۂ تاریخ مختلف سنین یعنی سنہ ہجری وفصلی وعیسوی برمی آید وہم بصنعت توشیح از ہر مصرع اگر اعداد حروف جمع نمایند سنہ ہجری پیدا شود - خدائے توانا مولود مسعود را پیش ابوین بعمر طبعی رساند بجاہ محمد وآلہ الامجد وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین —

قطعۂ تاریخ

ح	حضرت عمو بگرامی حسب	ی	یافت چو فرزند وقرب صمد
۸	سنہ ۱۸۹۷ عیسوی	۱۰	سنہ ۱۲۸۴ ہجری
ش	شکر خدا آنکہ بگوید بدل	ن	نعمت کونین بحق در رسد
۳۰	سنہ ۱۲۷۴ فصلی	۵۰	سنہ ۱۲۷۴ فصلی
ا	آنکہ شدہ شاد بلا تقنطوا	ب	پیش خدا برہمہ اعلا بود
۱	سنہ ۱۲۸۴ ہجری	۲	سنہ ۱۲۹۴ ہجری
م	مژدہ بفرخ چو بجاں وا رسید	م	مثل ہوائے کہ زگلشن رسد
۴۰	سنہ ۱۲۸۴ ہجری	۴۰	سنہ ۱۲۸۴ ہجری
د	دست بفرقاں زدم از بہر فال	د	دست نظامی زکلام احد
۴	سنہ ۱۲۷۴ فصلی	۴	سنہ ۱۸۹۷ عیسوی
ف	فال زہے بود نکو بافلی	ی	یعنی بدنیا وجہاں برخورد
۸۰	سنہ ۱۲۸۴ ہجری	۱۰	سنہ ۱۲۸۴ ہجری
ب	باعث نور بصری آں صبی	ف	فخر جہاں باد برب حمید
۲	سنہ ۱۲۸۴ ہجری	۸۰	سنہ ۱۲۸۴ ہجری

غ　خامۂ معجز رقم ای سخن　　م　مصرع تاریخ عیاں میکند
۱۰۰۰　　　　　　　　　　　　۴۰　سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

ب　بندۂ تو پیش بدر یا رؤف　　ی　یکصد و دس سال بعشرت زید
۲　سنہ ۱۲۸۴ ہجری　　　　۱۰　سنہ ۱۲۸۴ ہجری

سنہ ۱۲۸۴ ہجری

واضح ہو کہ مادۂ تاریخ میں اگر ایک عدد کی کمی یا بیشی ہو تو استادوں نے اس کو جائز رکھا ہے مگر اس سے زیادہ ہونا نازیبا ہے —

بسم الله الرحمن الرحیم

جواب تحریر اردو مہر آغا علی صاحب - شمس تخلص - از نتائج افکار افصح الفصحا و ابلغ البلغا جناب مولوی سید محمد باقر علی صاحب - باقر تخلص - تلمیذ حضرت ملک الشعرائے ایران، و هند جناب نواب اسدالله خان بهادر نظام جنگ - غالب تخلص - مدظلال جلاله —

هر نکته سنجان معنی رس و دقیقه شناسان پاک نفس مخفی و محتجب مباد ودرین جزو زمان که از علم و فضل عموماً رسمی واز فن معنی و بلاغت خصوصاً نشانی نمانده است الا ماشاءالله - چنانکه اعلم علمای بلاغت و معنی سعدالدین تفتازانی طاب ثراه و جعل الجنته مثواه در عنوان مختصر ارشاد فرماید آن هذا الفن قدنضب الیوم ماءه فصار جدالا بلا اثر و ذهب رواؤه فعاد خلافا بلا ثمر حتی طارت بقیة آثارالسلف ادراج الریاح و سالت باعناق المطایا تلک الاحادیث البطاح - پس این زمان که علی مرالدهور والاعصار از آن زمان خلعت وجود در برکشیده در کساد سلعة الفضل والکمال الدق واز بد خواهد بود اکثر کم مایگان قلیل البضاعت راشعار ودثارخیال گردیده که برا کابرواعیان که علم و کمال شان مسلم الثبوت زمان و زمانیان و فضل و بلاغت آنان مشهور نزدیک و دور جهانیان باشد لب اعتراض کشایند و کمال حدت فهم و حذاقت ذهن خود شان را روبروئے عوام کالانعام وانمایند و موردتحسین و آفرین شوند صدائے احسنت

و مرحبا از زبان سوتهان شنوند و حال آنکه دامن عصمت و جلال و پیرایهٔ علم و کمال آن حضرت از آلودگی فهم و نقصان منزه و مبرا است و گلشن دانش و حدیقهٔ فضیلت آن عالی منزلت خالی از خار و خس شک و اعتراض بوده علی وجه الکمال سرسبز مطرا است و منشائی آن جز هوائی شهرت و بر آوردن نام ه رمهانهٔ جهلا و عوام دیگر نمی باشد مگر بحضور علما و خواص معامله بالعکس میشود که غیر از خجیت و کاهت و خذلان بحصول نمی انجامد۔

علامت بین که هر سنگی که جست از تیشهٔ فرهاد۔

هوا می گردد وهم بر سوے فرهاد می آید

فاعتبرو یا اولی الابصار —

تفصیل این اجمال و توضیح این مقال آنکه در اوده اخبار نمبر ۴۱ مورخه ۲۵ ماه جون سنه ۱۸۹۷ ع قصهٔ عبرت خیز و ماجرائے وحشت انگیز بمطالعه در آمد یعنی بے حقیقتی لفید الاستعداده ے همیچدانے کیج مج زبانے ژاژ خاے هرزه درائے خود نمائے بیهوده سرائے بیراهه خوام دیجور صفت شمس نام مصداق - بالعکس نهند نام زنگی کافور - زبان طعن و لب اعتراض بر اکمل شعراء ابلغ بلغا کشوده است و عمائد دهلی و بلگرام را که چشم فلک و گوش ملک دارالخلافه مثل آن در آفاق ندیده و شنیده زیر خنجر جرح وقدح کشید و از هذیانات مجنونانهٔ خود صفحهٔ قرطاس را برنگ روے و دل خود سیاه و تباه نموده است۔—

هر که را خواهد پرده درد

میلش اندر طعنهٔ پاکان بود

خصوصاً درشان حضرت اسدالله خان غالب که غلغلهٔ فصاحت و طنطنهٔ بلاغت شان از قاف تا قاف رسیده بل از کنگرهٔ عرش برین بالا کشید و

لایعلمہا چاویدہ داد خروج و قساوت دادہ است —

ہر بلند آں سخن بسوے خود است تف بسوے فلک بروے خود است

ہر چند بدیہی است کہ خواب پریشاں را تعبیرے مہملات مختل الحواس را تاویلے نیست مگر چوں ایں ذرۂ بے مقدار کہ باقر علی نام و باقر تخلص دارد از خوشہ چینان خرمن آں آفتاب عالمتاب سپہر سخنوری یعنی حضرت غالب مدظلہ العالی است مصلحت آں ندید کہ از جوابات شافیہ اعتراضات ایں سرمست بادۂ استکبار خاموش باشد در رگ گردن ایں ہذیاں سرا را کہ بدعوے معنی پروری بلند نمودہ است بہ نشتر تقریرات آبدار نخراشد ناگزیر بحکم ضرورت از جواب دیگر مطاعن و اعتراضات واہیہ ایں بے مغز خوفاً للاطناب قطع نظر نمودہ بجواب ایرادات کہ از راہ خوش فہمی بر حضرت غالب نمودہ بکمال اختصار پر داختہ آمد تا شاہد جہل او از منصۂ خفا علی رؤس الاشہاد جلوہ نماید و باللہ التوفیق وبعدہ از من التحقیق قولہ —

:— مطلع سر دیوان غالب ... ...

نقش فریادی ہے کس کی شوخئی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر خلاصہ سے خارج ہے حسن معنی کا حارج ہے اس واسطے کہ کاغذی پیرہن کا محاورہ فارسی میں جاری ہے (الی آخر ما قال) - 'ہر' کا لفظ تعمیم کے ساتھہ گلی و سنگی تصویروں کے واسطے واجب ہے - انتہی 'اقول' دریں شعر دو اعتراض کردہ اول ایں کہ پیراہن کاغذی محاورۂ فارسیست نہ اردو ناجائز و دیگر ایں کہ پیرہن کاغذی براے تصویر کاغذیست نہ براے سنگی و گلی وغیرہ حالانکہ لفظ 'ہر' براے تعمیم است - اعتراض

اول از کمال سخافت و رکاکت مضحک طفلان تواند بود چه ظاهر است که اهل اردو را در شاعری اتباع شعرائے فارسی ہےت و اقتباس مضامین از فارسی می کنند و از این جهت است که چنان که معشوق شعرائے فارسی ' ارمارد ونو خطانند معشوق اردو گویان نیز سبزان نو خط اند لهذا باتباع فارسی تعریف خط و خال می کنند پس چون اردو گویا نرادر انداز سخن تقلید فارسیانست البته محاورهٔ فارسی در اردو جائز خواهد بود ولا بالعکس و نظیره کثیر —

جواب اعتراض ثانی این که فهم کلام بلغارا ملاحظه قراین وسیاق و سباق کلام هم لازم است - ملاحظه باد در مصرعهٔ اول لفظ نقش و تصویر زیب رقم یافته پس به قرینهٔ سیاق کلام در مصرع ثانی مراد نه خواهد بود مگر تصویر کاغذی و لفظ 'هر' در مصرع ثانی برائے کل تصویر کاغذی دال برعام مخصوص است - شیخ علی حزین فرماید —

نصیحت گردمےگرمی شیلدے دلبرخودرا   چرا وقف خرابی کرد ظالم کشورخودرا

ظاهر است که اگر ملاحظه معنی لفظ دلبر کے در مصرعهٔ اولی واقعست نه کرده اید وقف خرابی کشور از کجا ثابت خواهد شد فافهم وتدبر —

قوله غالب :-   کعبه میرے پیچھے هے کلیسا میرے آگے

اس مصرع کا خلاصه سخنوران ظریف کے نزدیک یه خوب هے که نایل اس کا ایک پر غالب هے دوسرے کا مغلوب هے —

اقوال معترض کمال ظرافت وذکاوت رابکار برد و چنین مضمون لطیف واعتراض سخیف برآورده است فرحبا ثم مرحبا اگر لفظ 'آگے' و 'پیچھے' مستلزم همین معنی است خیالیت شعری معنی هذه الکریمة أن کان قمیصه قد من قبل فصدقت وهو من الکذبین - وان کان قمیصه قد

من دبر فکذبت وھو من الصدقین - بھلوا وتو جروا —

قولہ عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

اس مصرعہ کا مضمون مابوں کے نزدیک خوش اسلوب ہے سا کنان دھلی کو دل سے مرغوب ہے —

اقول مضمون ایں مصرع مگر معترض را ہم خوش آمد - اگر عمہں مضمون ازیں لفظ مفہوم خدام ذوی الاحترام بحسب الف و عادت گرویدہ پس لفظ 'گرفتن' را کہ مترادف لفظ معترض علیہ جناب در فارسی است در شعر 'قتیل' کہ اوستاد الاستاد جناب اند چہ محمل خواھد بود و نقصے از کشمکش قتیل و پیر دانش را بچہ رو رو خواھد داد وھوھذا- قتیل -
با داغ جلوں گر رہ ویرانہ نگیرم آرام زسوز دل دیوانہ نگیرم

شاید انچہ از ترجمہ 'لفظ' گرفتن مفہوم معترض است ھمان معلیٰ مطلوب اوستاد الاستادش ھم بودہ کہ ایں قدر از گرفتن ابا و انکار میکند وزار نالیھا می نماید --

قولہ غالب - ناف * زمیں ہے نہ کہ ناف غزال ہے

اعتراض اعلان نوں میکند —

اقول جواب ایں ظاھر است کہ لفظ 'یہ' کہ تجلوس لفظ 'نہ' است کاتبش مکرر فہمیدہ قلم انداز کرد ورنہ ھمچو غلط از مبتدی ممکن نیست چہ جا کہ رئیس المنتھین —

قولہ غالب - دے بدسکور صورت ارقام

تمام ھندوستان سے کہتا ھوں کہ ارقام رقم کے معنی میں غلط ونا روا الی اخرہ —

---

* غالب مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان ناف زمیں ہے یہ نہ کہ ناف غزال ہے

اقول اول معنی این فقرہ ارشاد شود کہ "تمام ہندوستان سے کہتا ہوں" چہ معنی دارد بعد ازاں گوش باید کرد کہ 'لفظ ارقام' از باب افعال فی الواقع نہ آمدہ مگر این لفظ برالسنۂ خاص و عام جاریست مجتہد ثانی لکھنوی در تصانیف خود یعنی در بارقۂ ضیغمیہ و مولوی سبحان علی خاں کنبوہ کہ معتقد علیہ معترض است در مذہب خود بقام نورالدین لفظ ارقام' را صد جا پیش آورد و در قدما ہم مستعمل - حکیم محمد ارزانی رحمۃ اللہ علیہ در قرابادین قادری در بعض جہات لفظ 'ارقام' طرح نگارش دادہ فلیس الغالب فہو مغلوبا واگر بفتح اول جمع رقم خواندہ شود ہم قبحے ندارد —

قولہ　　غالب - نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی منضبط

لفظ 'مادہ' حادہ وجادہ کے وزن پر لکھا یعنی میم کے بعد الف متحرک ہے اس کوسکون ساکن باندھا - الی آخر ما اتی بالتحقیقات الانیقہ -

اقول اعتقاد راقم آثم این کہ معترض بدین اعتراض بسیار برخود چیدہ از فرط شادمانی در پیرہن نگنجیدہ باشد - نبض شناسان مصحف الفاظ خدا را علاج خلل دماغ این مخبوط الحواس بفرمائید و بسر وقت این بیچارہ رسید کہ چپاہذیاں بر زبان می راند - عجب صد عجب کہ معترض در افتتاح کلام خود لوائے دعوی تمام علوم از صرف و نحو و منطق و حکمت و ہندسہ و نجوم و ریاضی و ادب و لغت وغیرہ بر افراشتہ و تمامی علمائے اعلام را کہ در علم خاص کوس لمن الملکی نواختہ اند در ہمان علم استاد خود از راہ فخر و مباہات قرار دادہ با این ہمہ بلند آہنگی از کوے تحقیق لغات مشہورہ نابلد محض افتادہ 'مادہ' را بر وزن 'مفسر' و 'موکل' صیغۂ مفعول کنند - واضح باد کہ لفظ 'مادہ' بمعنی اصل

هر چیز و سامان ترکیب و زیادت متصله بالف ساکن است نه مفتوح زیرا که جمع آن 'مواد' مشدد بوزن مفاعل می آید پس باید دانست که 'مواد' مواد در اصل مواد و بر وزن مفاعل است 'مواد' 'و موالید' جمع 'مادہ' بعلت بودن الف ساکن بعد میم صورت نمی بندد زیرا که قاعدۂ صرف این است که هرگاه الف قبل الف جمع مفاعل و مفاعیل افتد واو شود چنانکه ضوارب جمع ضارب و قواریره جمع قارورہ پس ظاهر است که اگر 'ماد' بفتح الف که آن در حقیقت همزہ است بودے جمع آن 'مئاد' بهمزہ قبل الف آمدے نه 'مواد' و متوهم نشود که درین صورت اجتماع ساکنین ناجائز لازم می آمد زیرا که قاعدہ اینست که هرگاه ساکن اول یاے تصغیر باید و ساکن ثانی مدغم و ریک کلمه باشد اجتماع ساکنین جایز باشد چنانکه در دابه و خاصه و خویصه واقع است فافهم و تدبر و لاتکن من الجاهلین واعجبا من هذا القابل که به همین مبلغ استعداد بر آسمان بلاغت حضرت اسد اللہ خاں غالب زبان اعتراض میکشاید —

بران صاحب سخن رحم است صائب که در خلش ملعنصر در دخل بیجا است

'تم الجواب - وههنا اشرع فی ببئین بعض هفواته تفریحا للقلوب و اظهارا لبعض العیوب بحیث ینشط خاطر الناظرین و یهیج اشواق السامعین - فاقول -

در جواب سهاح داستان سگ خارشی نقل فرمودہ وانتهات یافتن نی در سایه عاطفت آن قحبۂ بازاری و علو مرتبت آن زن بحسن عمل طعام دادن سگ خارشی مذکور نوک ریز خامه فصاحت بار نمودہ است - ما میگوییم که معترض هم مصداق همان سگ خارشی است که خود را این طرف و آن طرف از برائے علوفه انداخت و بهر شهر و دیار و کوچه بازار برائے وجه معاش رفت و کسے پارۂ نان بل مشتے استخوان پیشش نگذاشت

آخر ملجاے ماواے خود خانهٔ زهرهٔ مشتری زنان بازاری را ساخت و مصارف اوقات و وظیفه روزی خود زر مصلحانه این دولتیان شوم شد بی کار نمود و علم اوستادی و اتالیقی این نوجوان نطفی پوش معرکه بیحیائی بر افراشت نعوذ بالله من هذا الوقاحة آرے —

بے حیا باش هرچه خواهی کن

و در محاورهٔ ذوق ریختن انچه "از سه ح" و مصنف سند می خواهند و بقیاس اکتفا نمیکنند مخفی نماناد که مرزا قتیل جابجا در کلام خود محاورهٔ نو تراشیده و در جواب اعتراض تشبث بقیاس نموده چنانچه درین شعر —

شب ریخته خونها نگه یار و سحر هم　　بیرون نخرامیدهٔ ازان کوچه خبر هم

چون کسے اعتراض کرد که 'خرامیدن خبر' خلاف محاورهٔ اهل زبانست جواب داد که 'لطف' کجا گام دارد که حافظ گفته است —

هم مگر لطف شما پیش نهد گامے چند

پس طوریکه آن جایز خواهد بود این هم جایز خواهد بود

و بر اهل خبرت ظاهر است که قیاس در محاورهٔ پیش نمیرود و فما جواب القتیل فهو جواب السیاح و المصنف و در جواب فهم مصرعهٔ ثانی یعنی آنکه لفظ 'هم' بجاے خود نیست ارشاد فرمود که گاهے کار از تقدیر هم می برآید چنانکه درین شعر —

بهجوم عشق توام میکشند و غوغا نیست　　تو نیز بر سر بام آکه خوش تماشائیست

حالانکه درین شعر حاجت تقدیر نیست زیرا که لفظ غوغا دال بر هجوم و ازدحام خلایق موجود فیما بردن بعید - منقول است که

کسے این شعر مرزا قتیل پیش شخصے از اہل ایران خواند —

تیغ بگرفتی و بمن گفت کہ نازم اینست سرخرو کردم و گفتم کہ نیازم اینست

گفت کہ بوے ہندی می آید بے آنکہ نام مرزا قتیل بگوش خوردہ باشد علت آنکہ می گوید تیغ بہ گرفت حالانکہ می باید گفت تیغ سر کردہ الخ چنانکہ در فرہنگ ظہوراے تفرشی موجود است - حالا چند خطاے دیگر کہ در ابتداے کلام از مرزا قتیل سرزدہ براے عبرت معترض زیب رقم می یابد —

قتیل — صد پری قربان نازش دلستان کیست این
رفت آرام ازدلم آرام جان کیست این

بر ماہران فن ظاہر است کہ در جاے رفت ' 'برد' می بایست —

ولہ — سوخت چوں برق نگاہش آشیانم را تمام
زیر لب پر سید از من آشیاں کیست این

بدیہی است کہ بعد سوختہ شدن وجود آشیاں باقی ناندہ پس لفظ ' آشیاں کیست این ' بجاے خود نخواہد بود بلکہ آشیاں کہ بود می توان گفت —

ولہ — متہم کردش بعشق خویش ہر کس را کہ کشت
ہیچ نگردد زخم او تیر و کمان نیست این

ربط در مصرعین ہرگز پیدا نیست والمعنی فی بطن الشاعر —

ولہ — ناقہ کش مردے غلط کردہ است رہ بر خاک تو
چند خواب اے قیس بنگر ساربان کیست این

ناقد کہ استخوان بندی مصرعۂ اولی و فصاحت ترکیب ' ناقہ کش

مردے' را ملاحظه باید کرد و غالب که صاحبان ذوق سلیم هرگز پسند نه فرمایند اگر بدین ترکیب می گفت از ثقالت ترکیب اول گونه نجات میدید —

ره غلط کرده است برخاک تو مردے ناته کش

وله — یکجا می بروت غمزهٔ صید افگن تو

اے سرما همه قربان کمر بستن تو

بردن غمزه صاحب خود را خالی از ظرافتی نیست و این شعر تمام لفظ است که از معنی بوئے نه دارد بقول حضرت غالب مدظله العالی — بگذار از معنی همین الفاظ برهم بسته بین　　باده معبود شیشه و ساغر مهیا کرده است

وله —

گفتم به بزرگے که به بین شانهٔ خود را　　بهرچه قرار این همه در خانه نگیرد

چون کهنهٔ آن زلف سیه با دل من دید　　گفتا که دگر در کف خود شانه نگیرد

شانه بین را بزرگ گفتن اگر مسخرگی نیست دیگر چه باشد —

خاتمة الطبع

بر مدبر منشیان عالی گهر و سخن پردازان هنر پرور مخفی و مستتر نماند که این کتاب بالطافت و مستطاب یعنی هنگامهٔ دل آشوب دوبارا مناظره که هر حرفش سواد سرمهٔ چشم سیاه چشمان و بیاضش زیور بیاض گردن خوبان و هر نقطه اش مانند خال خوبرویان نقطهٔ انتخاب و هر دایره اش مثال دایرهٔ چهرهٔ شاهدان نایاب است تصنیفا لطیف مطلع قصیده سخنوری مقطع صحیفهٔ نکته پروری مجموعه سخندانی سرمایه معانی در علم عربی طاق و در زبان فارسی علی الاطلاق مجمع محامد کونین سید فخر الدین حسین دهلوی سخن تخلص و مولوی باقر علی صاحب باقر تخلص دام ظلهم و جلالهم در مطبع منشی سنت پرشاد بحسن اهتمام

متهدت پہراے جھکو بند سہاے واقع قصبہ آرہ محلہ مہادیوا ضلع شاہ آباد بتاریخ بست پنجم شہر جمادی الاول سنہ ۱۲۸۴ ہجری حلیہ طبع پوشید —

وجہہ مہر بر خاتمہ

برائے سند این معنی کہ این کتاب مطبوعہ مطبع منشی ست پرشاد است مہر مطبع و دستخط مہتمم افزودہ شد —

ترقیء اردو کا واحد ذریعہ رومن رسم خط ھے

از

محمد اجمل خاں صاحب ایم - اے محقق
اسلامیات، شانتی نکیتن (بنگال)

انجمن ترقی اردو کی تاریخ شاید ھے کہ یہ محض ایک علمی جماعت ھے جس کا نہ سیاست سے تعلق ھے، نہ کسی فرقہ وارانہ اصول پر " ترقیء اردو " کے خیال کو پرورش کی گئی ھے - لیکن بد قسمتی سے گذشتہ ۲۰، ۲۵ سال سے فرقہ پروری کی بیماری جنون کے حد تک پہنچ گئی ھے۔ اور اگر یہ کہا جاتا ھے کہ اس کی ابتدا قدامت پرست ھندوؤں کی طرف سے کی گئی تو قوم پرستی کا دعوی کرنے والے بھی چیں بجبیں نظر آتے ھیں -

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ھوتا ھے —

بنارس سے ایک مصنوعی غیر فطری اور تنگ خیالی کی گھٹا نے اٹھہ کر مذھب کے نام پر ھماری سوشل فضا کو تاریک کرنے کی جو کوشش شروع کی تھی وہ اب زیادہ زور پکڑ رھی ھے - اور وہ لوگ جو سیاسی اور سماجی حیثیت سے ھندوستان میں اتحاد کامل رکھنا چاھتے تھے، انھیں ان سیاسی مدبروں کی عقل پر حیرت ھوتی ھے جو یہ باین ادعائے حریت و روشن خیالی ! اس تحریک کے ساتھہ ھی نہیں، بلکہ اس کی رھبری کر رھے ھیں - شاید وہ یہ سمجھتے ھیں کہ اردو کسی دوسرے دیس کی

بولی ہے - یا صرف مسلمانوں ہی نے اس سے محبت ہے - اور مسلمانوں ہی نے ہندی کو اشد، کردیا ہے - لہذا اسے شدہ کرنے اور پھر اصلی پراچین دھرم کی اور لانے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ اس میں سے ہر ایک فارسی اور عربی لفظ کو جلا وطن کر دیا جائے اور اس کی جگہ سنسکرت کا شدہ شبد رکھہ دیا جائے - جو نتیجہ ہوتا ہے وہ اتنا خوش نما اور اکثر اتنا مضحک ہوتا ہے کہ شاید بڑے سے بڑا مزاح نگار بھی وہ کیفیت نہ پیدا کر سکے -

چونکہ ہم محض علمی حیثیت سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہتے ہیں لہذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہندی تحریک، یعنی وہ تحریک جو اردو کو مٹاکر سنسکرت نما بولی رائج کرنا چاہتی ہے، اس کی ایک وجہ ہے - وہ یہ کہ سیاسی مفکرین کی ایک جماعت کا (جن میں جرمن مذہب سیاست خاص طور پر قابل ذکر ہے) یہ خیال ہے کہ متحدہ قوم (People) بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت اس طرح منظم ہو کہ اس کا مذہب، رسم و رواج اور زبان ایک ہی ہو - اس کے بعد ملت (Nation) بننے کے لیے صرف حصول حکومت و سلطنت کی دیر رہتی ہے - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی کثیر آبادی ایسے افراد پر مشتمل ہے جو مذہباً ہندو کہی جاتی ہے اور اس حیثیت سے وہ اس رسم خط کو جو ویدوں کی تحریر کے لیے میکس ملر نے اتفاقاً رائج کردیا ہے اسے استعمال کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھے گی - اور چونکہ ہندی زبان بھی دیوناگری ہی میں لکھی جاتی ہے اس لیے ہندی اور ہندو دھرم کا گہرا سمبندھ ہونا لازم ہے - اس طرح اگر یہ ممکن نہ بھی ہوا کہ ہندوستان سے دیگر زبانوں کو قطعاً مٹا دیا جائے تو یہ تو ضرور امکان میں ہے کہ دھرم کے نام پر کام کرکے ہندی بولی اور دیوناگری لپی (رسم خط) کو ہندوستان

کے عام باشندوں کی بولی قرار دی جائے —

اس خیال کی بنا چند غلط فہمیوں پر ہے جو اگر دور ہو سکیں تو ہندوستان کی ایک بہت بڑی گتھی سلجھ سکتی ہے اور ہندوستان کی مختلف قوموں میں جو یکجہتی ہے وہ نہ صرف قائم رہ سکتی ہے بلکہ اس کی ترقی کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے —

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ مذہب کو بنائے ملیت (Nationalism) قرار دینا اور مذہب کے نام پر کسی ملک کی مختلف جماعتوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنا، عملی سیاست سے بہت دور اور کوتہ اندیشی اور قدامت پرستی کی روشن مثال ہے - پنجاب کے ہندو مسلمان سکھ عیسائی باوجود اختلاف مذاہب کے صرف پنجابی زبان کی بدولت ایک دوسرے کو محبت کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں - اس لیے کہ زبان کا وہ رشتہ ہے جو مذہب اور وقتی سیاسی لڑائیوں کی پروا نہیں کرتا - اس محبت کا عملی نظارہ پنجاب سے باہر دیکھیے - کلکتے یا بمبئی میں ایک سکھ اور مسلمان محض لسانی یک جہتی کی وجہ سے جس خلوص سے ملتے ہیں وہ ظاہر کرتا ہے کہ مسجد شہید گنج کے سے قضیے انسان کی قلبی گہرائیوں پر اتنا اثر نہیں ڈالتے جتنا زبان و وطن کا اثر ہوتا ہے - یہی حال بنگالی، سندھی گجراتی اور تلنگی بولنے والوں کا ہے - اسی لسانی یک جہتی کا اظہار وہ نوجوان طالب علم بھی کرتے ہیں جو مختلف فرقہ وارانہ کالجوں یا یونیورسٹیوں کے ہوسٹلوں میں رہتے ہیں - لیکن باوجود اتحاد مذہب کے آپ جب دیکھیں گے تو یہ نظر آئے گا کہ پنجابی طالب علم پنجابی کے ساتھ ہے اور بنگالی بنگالی کے گروہ سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے - اور اختلاف مذاہب کے باوجود ہر نوجوان طالب علم اور سن رسیدہ پروفیسر ایسے ہم جلسوں کی فطرتاً تلاش کرتا ہے

جو اس کی وطنی زبان سے دلچسپی رکھتا ہو۔ خواہ وہ زبان سندھی ہو یا جرمن ، جاپانی ہو یا ملایلم - غرض کہ جو قومی نیشنلزم کو مذہب کے نام پر آگے بڑھانا چاہتی ہے وہ یا تو ایک اندھی گلی کی طرف جان بوجھہ کے جارہی ہے یا اس نے اب تک صحیح اور سچی ملوت کو سمجھا نہیں - دونوں حالتوں پر سوائے افسوس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے -

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ کسی رسم خط کو اس لیے نہ اختیار کیا جائے کہ یہ مفید ہے ، آسان ہے اور یہ انسانوں کی کثیر تعداد کے علم میں اضافہ کرنے کا آسان ذریعہ ہے - بلکہ محض اس لیے اختیار کیا جائے کہ اس میں کسی مذہب کی ایسی مقدس کتاب و برگزیدہ سمجھی جاتی ہے کہ عوام نہ تو اُس کے مفہوم پر حاوی ہوسکتے ہیں اور نہ وہ زبان کسی ملک میں رائج ہوسکتی ہے - اس لیے کہ زبان نہ سہی رسم خط ہی سہی ، اس رسم خط سے مذہبی جماعت محبت کا دعویٰ کرتی ہے - اور اس امر کے بلا لحاظ اس امر کے کہ اس سے عامۃالناس کی علمی مشکلات میں کمی ہوگی یا نہوگی اس رسم خط کو انجان اور سادہ لوح افراد ملک پر زبردستی عاید کیا جاتا ہے - لیکن رسم خط کا کسی زبان سے اتنا گہرا تعلق ظاہر کرنا اور اُس میں اس حد تک مبالغہ کرنا کہ زبان یا رسم خط کو مقدس اور دیوتاؤں یا فرشتوں سے متعلق بتانا لاعلمی اور قدامت پرستی کی حیرت انگیز مثال ہے - خصوصاً جبکہ کوئی ایسا شخص اس کا دعوے کرے جو مذہب اور سیاست دونوں کا ماہر بننے کا ادعا کرتا ہو - ظاہر ہے کہ ایک ادنیٰ تعلیم یافتہ بھی یہ جانتا ہے کہ عربی کو اگر چینی رسم خط میں لکھیں تو وہ عربی ہی کہلائے گی چینی نہ کہی جائے گی - اسی طرح سندھ کے ہندو اگر سنسکرت یا سندھی کو فارسی حروف میں لکھتے ہیں تو

ان کو کوئی فارسی نہیں کہتا ۔ رسم خط محض آسانی کے لیے اختیار کیا
جاتا ہے نہ کہ مقدس کے خیال سے - اگر صرف مقدس ہی کا خیال ہوتا تو
قدیم برھمی رسم خط کو چھوڑ کے ہرگز دیوناگری خط ویدوں کے لیے نہ
استعمال کیا جاتا - رہ گیا یہ امر کہ مسلمان عربی رسم کو مقدس سمجھتے ہیں
اور اسی لیےکہ قرآن ان حروف میں لکھا جاتا ہے تو اس کے متعلق سوائے
اس کے کیا عرض کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذھبی مبادیات کو
غیر اقوام تک نہیں پہنچایا ورنہ ہر غیر مسلم یہ سمجھہ لیتا کہ عربی کا
کافروں کی زبان تھی - اسی زبان میں قرآن موجود ہے - اور اب بھی جو
الفاظ یا قرآنی خیالات سمجھہ میں نہیں آتے اُن کی تفسیر بڑے بڑے کافر
کے کلام سے کی جاتی ہے - ایسے کلام عرب سے جوجاھلیت میں اپنی قساوت
قلب اور عدم حلم کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے - اور اسلام نے تو ہر مہلک
و قوم میں نبیوں اور رسولوں کا ماننا فرض قرار دیا - اور یہ بھی بتایا
کہ ہر نبی کی زبان مقدس ہے بشرطیکہ اُس زبان میں بنی نوع انسان کے
فائدے اور ترقی کی باتیں ہوں - لہذا مسلمان کے لیے تو ایرانی و تورانی
ژند و عبرانی ' سنسکرت اور یونانی ہر ایک زبان اور رسم خط مقدس ہے -
فضیلت صرف پاکیزگی خیال کو ہے نہ رسم خط کو - لہذا مسلمان کے لیے یہ
نہایت آسان ہے کہ وہ کسی رسم خط کسی ملک کو اپنا رسم خط اپنی زبان
اور اپنا ملک سمجھنے لگے - یہی وجہ تھی کہ مسلمان کسی سمندر کو عبور کرنا
گناہ نہیں سمجھتے نہ کسی زبان یا رسم کو اپنا نے میں انہیں عذر ہے
اسی طرح ہندوستان میں کثیر تعداد ہندوؤں سکھوں ' اور پارسیوں
جو زبان اور رسم خط کو محض اتحاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں کہ کاروبار
کو مفید سمجھتے ہیں اور نکمی زبان کو اختیار کرنے اور ترقی دینے کو

برا نہیں سمجھتے - اگر وہ حضرات جو ہندوستان میں صرف دیوناگری رائج کرنا چاہتے ہیں یہ غور کریں کہ یہاں علاوہ اردو کے کم از کم سولہ قسم کی مختلف ہندوستانی رسم خط جاری ہیں اور دیوناگری کو ان تحریروں پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ عام اتحاد سے رومن خط نہ استعمال کریں اور دیوناگری کو تلگو یا برہمی رسم خط پر ترجیح نہ دیں- اس لیے کہ یہ ان خطوں سے نہ زیادہ خوبصورت ہے نہ آسان- نہ کل آوازوں پر حاوی ہے - نہ الفبائی —

تیسری غلط فہمی اور سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی ایک اچھی خاصی جماعت سخت قدامت پسند واقع ہوئی ہے - وہ اپنے زائل ہوتے ہوئے اقتدار کو ہر ممکن طریقے سے قائم رکھنا چاہتی ہے - اور اسی لیے کبھی مذہب کے نام پر' کبھی وطن کی محبت یاد دلا کر وہ یہ چاہتی ہے کہ ہم ترقی سے تنزل کی طرف' علم جہل کی جانب اور زندگی سے موت کی سمت قدم بڑھائیں- یہ جذبۂ قدامت پرستی کبھی تاریخی واقعات کو یک طرفہ بیان کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے' کبھی قدیم رسم و رواج کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی پرانی زبانوں کے زندہ کرنے اور لٹریچر میں ایسی غیر فطری چیز داخل کرنا چاہتا ہے جو وضع شیٔ علی غیر محلہ کی بہترین مثال ہو سکتی ہے - بدقسمت ہندوستان کی اس سے زیادہ کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ جب سے مختلف اقوام ہند کو الگ رکھنے کے لیے جداگانہ انتخابات کی بلا نازل کی گئی ہے - اس وقت سے جدائی اور نفاق کی مسموم ہوا نے ان دماغوں کو بھی پریشان کر دیا ہے جو بظاہر اب بھی قوم پروری اور اتحاد کا گیت گاتے ہیں - لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم

اپنی زبان کی نئی اصطلاحات بنانے میں کس زبان سے امداد لیں تو یہی قوم پرست دوگروہوں میں نظر آتے ہیں - ایک کہتا ہے کہ سنسکرت ہی "پوشک بھاشا" ہوسکتی ہے ' دوسرا عربی کو "امدادی زبان" بنانا چاہتا ہے - دونوں وزنی دلائل نہیں رکھتے ہیں - لیکن ان کے دلائل کا مرکزثقل ' زیادہ تر قدیم مذہب و تمدن کے زندہ کرنے کے خیال کی طرف رجوع ہوتا ہے - اور یہی وہ چیز ہے جسے میں بدترین غلط فہمی سے تعبیر کرتا ہوں - اور بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانیوں کو ان رجعتِ پسندی کی تحریکوں کو جلد از جلد ختم کردینا چاہیے - جہاں تک زبان و تمدن کا تعلق ہے دنیا کا کوئی ماہر لسانیات و تاریخ نہیں ہے جو نظریہ ارتقاے لسان و تمدن کا قائل نہ ہو - اسی لیے میں نے ہندستانی اکیڈیمی کی گذشتہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم فارسی کو "امدادی زبان" قرار دیں - اور عربی کو جو ایک غیر ایرین زبان ہے اور سنسکرت کو ایک مردہ زبان ہونے کی حیثیت سے ہرگز پوشک بھاشانہ بنائیں - فارسی اور سنسکرت ایک ہی منبع سے نکل کر دنیاے علم و ادب کو سیراب کررہی تھیں - سنسکرت کا گلا برہمنوں نے گھونٹ دیا اور ہندوستان میں سیکڑوں پراکرتیں اور ذاتیں اسی وجہ سے رائج ہوئیں کہ برہمنوں کی جماعت نہ صرف دولت طاقت اور مذہب کو اپنے اقتدار میں رکھنا چاہتی تھی بلکہ وہ علم و ادب کی مسرتوں سے بھی عوام کو محروم رکھہ کر سنسکرت کو "دیوبانی" قرار دے چکی تھی - ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فارسی اور سنسکرت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا - اور ایک زبان ترقی کرتے کرتے دنیا کی بہترین اور شیریں ترین زبان بن گئی - اور دوسری زبان اتنی محدود کی گئی کہ رفتہ رفتہ مردہ ہوگئی - اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ اکثر

سنسکرت کے الفاظ ایسے ہیں جو سمجھ سے باہر ہیں —

چوتھی غلطی یہ ہے کہ عربی یا سنسکرت کے نامانوس الفاظ کا کثرت سے استعمال کرنا اردو یا ہندی کو بہتر بنانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے - حتیٰ کہ ایسے الفاظ کے استعمال کو چھوڑ کر جو بالکل ہندوستانی ہو گئے ہیں نئے الفاظ کی ایسی بے تکی بھرمار کی جا رہی ہے کہ ہماری زبان خصوصیت سے "ہندی" عجب زبان ہو گئی ہے جو خود مصنفین کے گھروں میں بھی رائج نہیں ہے - مندرجہ ترجمہ ملاحظہ فرمائے —

اتوار	=	روی وار	دکھن	=	دکھش
پیر	=	سوموار	پچھم	=	پشچم
چیت	=	چیترا	پانی	=	جل
بیساکھ	=	ویشاکھ	پیڑ	=	ورکشا
جیٹھ	=	جیشٹھا	ہار	=	مالا
ساون	=	شروان	ہوا	=	وایو
بھادوں	=	بھادراپد	جگہ	=	استھان
کنوار	=	اسوج	وعدہ	=	پرتگیا
اگھن	=	مگھر	بیاہ	=	وواہ
پھاگن	=	پھالگن	بیوہ	=	ودھوا
اگر	=	یدی	پیار	=	پریم
بہن	=	بھگنی	شک	=	سندیہہ
بیٹھنا	=	پدھارنا	مہربانی	=	کرپا
نمائش	=	پرادرشانی	ریت	=	بالو
پاس	=	سمیت	ریچھ	=	بھالو
			بہت	=	ادھک

اور یہ بھی ملاحظہ فرمایے کہ کس طرح آسان الفاظ کو ناموس اور پوتر بناکر ترقی معکوس کی جارہی ہے - اس سے بھی زیادہ مضحکہ وہ ترجمے ہیں جو خالص ہندوستانی الفاظ کو تازی دیونانی بنادیتے ہیں مثلاً -

حالات کے لیے عوارض -

ترتیب ... ... اصطفات

مغالطۂ عوامہ ... مغالطۂ دلیل مرافعۃ الی لشافق العوام

مغالطۂ استناد ... مغالطۂ استناد الی تعظیم المستندین العظام

فوایہ ... دھوکہ

ورمال ... مکہۂ مارجن وستر کھنڈ

خزانچی ... کوشاد ھکش

بذریعۂ تار ... توت دوارا

اسٹیشن ماسٹر ... وشپ یان استھہ استھان پردھان

(یعنی بھاپ سے چلنے والی گاڑی کے ٹھیرنے کی جگہ کا افسر)

ان مثالوں سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ اس مغالطے میں ہیں کہ ثقیل الفاظ سے زبان خوش نما ہوجاتی ہیں وہ درحقیقت اپنی زبانی کو ایک ایسے راستے پر لے جارہے ہیں جو عامۃالناس کی دسترس سے باہر ہوکر صرف ایک محدود اور تنگ خیال طبقے کی مصنوعی زبان ہوجائے گی اور اس قسم کی غیر فطری کوششوں سے کبھی ہندی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے - نہ اردو کو - اگر ترقی ہوسکتی ہے تو واقعی اسی اسپرٹ میں ہوسکتی ہے جس نے امیر خسرو اور ملک محمد جائسی، کو ہندی لکھنے پر آمادہ کیا - اور نہ صرف مسلمان بادشاہوں اور امرا کی سرپرستی سے بلکہ ہندو مسلمانوں کی مکمل ہم آہنگی سے ایک ایسی

زبان تیار ہوئی جسے خود مسلمان ہندوی ریختہ اور اردو کہتے تھے - اور فارسی چھوڑکر ریختہ کی تعمیر میں اتنا منہمک تھے کہ ان ذھن میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس زبان کا کوئی تعلق اسلام یا ہندو مذاہب سے ہے۔ میں یہاں اس افتراقی اور تخریبی کوشش کا ذکر نہیں کروں گا کہ کس طرح تنگ خیال اور قدامت پرست افراد نے ملک و ملت کو مسلسل پریشان رکھنے کے لیے اس مسئلے کی ابتدائی - حتی کہ اب بعض نادان اور سادہ لوح ہندوستانی ہندی اردو کے مسئلے کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھ کر اپنی واحد زبان کو دو حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم زبان و وطن کی سچی خدمت کا فرض ادا کر رہے ہیں -

اگر ہم مندرجۂ بالا غلط فہمیوں کو رفع کرنے میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں خصوصیت سے اپنی توجہ اس مسئلے کی طرف مرکوز کرنی چاہیے۔ کہ ہندی اور اردو میں اختلاف ہے بھی' یا یوں ہی چند متعصب اور تنگ خیال لوگ یہ شور مچا رہے ہیں - جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ صرف نام کا ہیر پھیر ہے - اگر آپ کسی ہندی کے حامی سے پوچھئے کہ ہندی کسے کہتے ہیں تو وہ کوئی اقراری تعریف نہ کرسکے گا لفظ "ہندو" کی جس طرح انکاری یا منفی تعریف کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہندی کی بھی تعریف کرے گا - مثلاً ہندو کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کا باشندہ ہے جو کسی ہندوستان کے پیدا شدہ مذہب کا پیرو ہے یا ہندو وہ ہے جو مسلمان نہیں ہے - گویا کہ سکھ' جین' کبیر پنتھی' ولبھشنوی' بودھ' دادوپنتھی وغیرہ سب ہندو ہیں حتی کہ

پارسی بھی ہندو ہی سمجھے جاتے ہیں اور سکندر کے ساتھ جو ہندوستان میں رہ گئے تھے وہ بھی ہندو ہیں لیکن اگر ہندو نہیں ہے تو مسلمان نہیں ہے - کاش کہ اس چیز کو مذہب سے متعلق نہ بنایا جاتا اور جس طرح غیر ممالک کے لوگ ہم سب کو ہندی یا ہندو کہتے ہیں اسی طرح ہر ایک ہندوستان کا باشندہ بلا لحاظ مذہب کے ہندو کہا جاتا —

لیکن جس طرح ہندو ایک خاص جماعت سے متعلق سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس کا مفہوم متعین نہیں ہے ' اسی طرح لفظ ہندی بھی خود ہندی کے پرچاریوں میں متعین نہیں ہے - بندیلی ' قنوجی ' برج ' بانگرو ہندوستانی ' اودھی ' بگھیلی ' چھتیس گڈھی (یعنی اڑیہ اور مرھٹی) راجستھانی گجراتی ' پنجابی سب ہندی زبان کی قسمیں ہیں اور سب کو ہندی کہتے ہیں - لیکن اگر اس کی تعریف کی جاتی ہے تو کوئی کالی داس کی زبان کو ہندی کہتا ہے ' کوئی کبیر کی بولی کو ' کوئی ملک محمد جائسی کی زبان کو مستند بتاتا ہے کوئی برج نرائن چکبست کی زبان کو - اس افراتفری میں آخری تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ہندی اُسے کہتے ہیں جو اردو نہ ہو - کیا خوب - اردو والے تو خود یہی کہتے ہیں کہ اردو ہندی یا ہندوی ہے - اس کو کوئی ریختہ کہتا ہے کوئی اردو ' کوئی برج بھاشا سمجھتا ہے کوئی اودھی - لیکن درحقیقت جو لوگ جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے - اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بھی ایک مخصوص خطۂ ملک ہند تھا جسے ہندوستان کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں - حیدرآباد جاے تو - کہتے ہیں کہ آپ ہندوستان سے آے ہیں بنگال جاے تو وہ زبان سے پہچان جاتا ہے کہ یہ ہندوستانی ہے - یہی صورت بمبئی اور پنجاب والوں کے سامنے پیش آتی ہے کہ ہر

شخص آپ کو ہندوستانی تصور کرتا ہے ۔ گویا کہ یہ لوگ ہندوستان کے باہر بستے ہیں یا ہندوستان ایک مخصوص خطۂ ہند ہے جسے یہ سب جانتے ہیں اور اسی لیے ہند کے باقی حصوں سے اُس کو الگ کردیتے ہیں - واقعہ بھی یہی ہے کہ پہلے سرہند سے لے کر بہار کے ختم تک ہندوستان سمجھا جاتا اور یہاں جو زبان رائج تھی اور اب بھی رائج ہے وہ زبان ہندوستانی ہندی ' اردو یا ریختہ کہلاتی تھی - لہذا اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اردو یا ہندی ہندوستان کی مشترک زبان ہے عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اسی زبان میں ہمارے ادبیات کا بہترین سرمایہ ہے - جو لوگ اس ایک زبان کے دو مختلف اور متضاد ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں وہ یقیناً ہندوستان کی اس واحد اور مشترک زبان ہی کے دشمن نہیں بلکہ ہندوستانی یکجہتی اور وطن پرستی کے جذبات کے بھی دشمن ہیں - اس لیے ہمارا فرض ہے - کہ ہم نہ صرف کوئی تجویز منظور کرکے اس پر عملی جد و جہد شروع کریں بلکہ ان وطن دشمنوں کی پوری قلعی بھی کھول دیں - اور پنڈت جواہر لال صاحب صدر انڈین نیشنل کانگریس کی طرح صرف اس پر اکتفا نہ کریں کہ ڈاکٹر سید محمود کو کراچی کانگریس کا وہ رزولیوشن یاد دلائیں جس میں ہندوستانی زبان کو ملک اور کانگریس کی زبان تسلیم کیا گیا ہے ۔ (دیکھئے مکتوب پنڈت جواہر بنام ڈاکٹر سید محمود مشمولہ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ ع) بلکہ ہمیں چاہئے کہ ہر ممکن ذریعہ سے اپنی زبان کو غلط روی اور تخریب سے بچائیں - نہ اسے سنسکرت بنانے دیں نہ عربی بلکہ ایسی زبان کو رائج کریں جس کو ہندوستان کی ایک دیہاتی عورت بھی سمجھ سکے —

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ جب ہندی اور اردو ایک ہی زبان ہے تو

پھر یہ اختلاف کی آوازیں کیوں بلند ہو رہی ہیں - بقول غالب - کہ —

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود		پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

تو میں جواب میں یہ عرض کرونگا یہ جھگڑا رسم خط کا ہے - اور کراچی کانگرس نے بھی یہ شدید غلطی کی ہے کہ اگرچہ ہندی اور اردو کے لیے ایک نام ہندوستانی تجویز کیا لیکن بنائے مخاصمت یعنی دونوں رسوم خط کو قائم رکھا - یعنی باوجودیکہ ملک کی واحد زبان ہندوستانی تسلیم کی گئی لیکن ناگری اردو دونوں خطوں کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کرلیا - اور اسے ہندوستانیوں کے حقوق اساسی میں داخل کردیا —

رسم خط کی ایک ہڈی ہے جس پر ہندوستانی بولنے والے نادانوں کو چند افراد یا جماعتیں لڑ رہی ہیں - ظاہر ہے کہ ناگری اور اردو خطوں کے رواج سے اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو جائیگی اور زبان کی ترقی پر بہت برا اثر پڑے گا - اگر کسی طرح یہ ممکن ہوتا کہ ہم سب جو ایک ہی زبان بولتے ہیں ایک ہی رسم خط اختیار کرسکتے تو گویا ہم اپنی مشکلات پر پوری فتح حاصل کرلیتے - لہذا اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندی اردو کا اختلاف صرف لفظی اختلاف ہے - اور ہندوستانی زبانوں کا صحیح ذوق رکھنے والے حضرات اس سے پورے طور پر واقف ہیں کہ کوئی مصنوعی ہندی یا اردو ہمارے ملک میں رائج کرنا رجعت قہقری کرنا ہے میں چند ایسی تجویزیں پیش کرتا ہوں جو میری رائے میں نہ صرف اردو کی حفاظت کا باعث ہونگی بلکہ ان پر آسانی سے عمل بھی ہوسکتا ہے اور ان کے ذریعہ سے اردو کو دن دونی رات چوگنی ترقی بھی ہوگی —

ذرائع ترقیء اردو

ترقی اردو کے ذرائع پر غور کرنے سے پہلے ہمیں اردو کی ایک مختصر ور جامع تعریف کرنی چاہیے - میرے خیال میں اردو اس زبان کا نام ہے جو برج بھاشا میں فارسی اور عربی متعاروں کو اس طرح ملانے سے پیدا ہوئی ہے کہ اجنبی الفاظ بالکل ہندوستانی ہوگئے - اس زبان کی گرامر کی تشکیل برج بھاشا کی گرامر کی زمین پر ہوئی - اور اس میں فارسی گرامر کے مرکبات ' اصول معانی و بیان اور عرض کو داخل کرلیا گیا - عربی عروض کی وہ بحریں جو فارسی میں رائج نہیں ہیں وہ بھی ترک کردی گئیں اور برج بھاشا کی بھی اکثر بحریں کم استعمال کی گئیں - اور شاعری میں بخلاف برج بھاشا کے مرد عاشق قرار پایا - لیکن تشبیہ واستعارات اور نفسیاتی وفطری کیفیات کے اظہار کے لیے ہندوستان اور ایران دونوں ممالک کے اسالیب بیان کی پیروی کی گئی - اس طرح صدیوں کے عمل ورد عمل سے اس زبان کی ایک مستقل اور منجھی ہوئی صورت قائم ہوگئی جسے ہم اردو کہتے ہیں - یہ زبان نہیں ہے بلکہ قدیم ایرین اور جدید ایرانی تمدن کے اتحاد وامتزاج کا دوسرا نام ہے - یہ ہندوستان کی پیداوار ہے - اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ برج بھاشا کی ایک ایسی ترقی یافتہ اور مقبول صورت کا نام ہے جسے عام ہندوستانیوں کے متحدہ فیصلے نے ہندوستان کی عام زبان بنا دیا ہے —

اس زبان کے استعمال کرنے والوں کے دو بڑے گروہ ہیں - ایک گروہ ایسا ہے جو اردو بولتا ہے اور یہ اس کی مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے - اس گروہ کے بعض افراد اسے دیوناگری رسم خط میں لکھتے ہیں اور بعض اردو رسم خط میں - دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جس کی مادری

زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ اسے سمجھتا ہے یا تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سمجھہ سکتا ہے - ان دونوں گروہوں میں ترقیء اردو کے ذرائع بالکل مختلف اور طریقۂ کار قطعاً جدا گانہ ہوگا جو میں بالتفصیل عرض کرتا ہوں —

۱ - جس گروہ کی مادری زبان اردو ہے اس میں عام اور جبریہ تعلیم کو جاری کرنا سلطنت کا فرض ہے - ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اردو زبان میں ابتدائی تعلیم عام طور پر رائج ہو اور اس کا نصاب ایک ایسی جماعت سے متعلق ہو تو عوام کی ضروریات اور تعلیمی تجربہ کے ساتھہ ساتھہ آسان اردو زبان کی کامل مہارت رکھتی ہو - یعنی انجمن ترقی اردو کا منظور کردہ نصاب عام طور جاری کیا جائے اور جو صورت نصاب تعلیم کے مقرر کرنے کی آج کل جاری ہے وہ قطعاً بند کردی جائے - یعنی کئی کئی کورس نہ منظور کیے جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف صوبوں کے سرمایہ دار تجارتی فوائد کے اصولوں کو زیادہ پیش نظر رکھتے ہیں - اور مختلف مدارس کے ہیڈ ماسٹروں پر اس کا دارومدار ہوتا ہے کہ وہ کون سا کورس اپنے مدرسے کے پسند کریں - ظاہر ہے کہ ہر ایک ہیڈ ماسٹر یا ڈپٹی انسپکٹر لسانیات کا ماہر نہیں ہوتا اور مدارس میں محض پبلشر کی مروت یا ہیڈ ماسٹر کی عدم توجہی کی وجہ سے ناقص کتابیں رائج ہو جاتی ہے —

۲ - اس گروہ کے اکثر افراد متوسط الحال طبقے کی اس جماعت پر مشتمل ہوتے ہیں جو ادنیٰ طبقے سے قریب تر ہیں یعنی ان میں تعلیم بہت کم ہوتی - اور وہ صرف ایسی کتابوں کو پسند کرتے ہیں جنہیں اعلیٰ طبقے کے لوگ سوقیانہ اور عامیانہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں - ان کے لیے ہم ان کی

پسند کا، لیکن بہتر لٹریچر مہیا کر سکتے ہیں ۔ اور اگر ہم ٹولسٹائی، ہامسن ٹیگور، گورکی، شرر اور پریم چند کے افسانوں اور عام پسند لٹریچر کو دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا لٹریچر ابھی اردو میں بہت کم ہے ۔ اور ضرورت ہے کہ ہم اردو کو عام پسند بنانے کے لیے ایسے لٹریچر کو کثرت سے شائع کریں جو صرف خشک اور علمی مسائل ہی پر مشتمل نہ ہو ۔

اسی سلسلے میں نامناسب نہوگا اگر میں فلمی کہانی لکھنے والوں کی اردو کشی کی طرف آپ کو متوجہ کروں ۔ ہمیں ایک ایسے ماہرین زبان کے بورڈ کی سخت ضرورت ہے جو مختلف فلمی کہانیوں پر لسانی اور فنی نقطۂ نظر سے ایسی تنقید کریں جو عوام کی سمجھ سے باہر نہ ہو ۔ اور افسانہ نویسوں کو مجبور کریں کہ وہ رائے عامہ کا لحاظ کرکے بہتر زبان میں اپنے افسانے تیار کریں ۔ اور اگر ممکن ہو تو ہماری انجمن کے منظور شدہ افسانوں کی تصویریں دکھائیں ۔ غالباً یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ لاکھوں اردو بولنے یا سمجھنے والوں کی زبانیں موجودہ صنعت افسانہ سازی کی بدولت تباہ ہو رہی ہیں —

۳ عام طور پر اردو کا رواج دینے اور اس کی ترقی کے لیے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ایک مرکز قائم جائے جہاں طباعت و اشاعت کی عملی تعلیم کے ساتھ ساتھ انشا پردازی، صحافت و ترجمے کی اعلیٰ تعلیم دی جائے ۔ اور اسی مرکز سے ایسے اساتذہ بھی تیار کیے جائیں جو اردو کو مختلف صوبوں کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے وہاں اردو کی تعلیم ان کی زبان میں دے سکیں ۔ یعنی اردو کے معلمین کی ایک مخصوص جماعت کی تربیت اس طرح ہو کہ وہ غیر زبانوں کے جاننے والوں کو علمی اور سائنٹفک طریقے سے تعلیم دے سکے ۔ ایسا مرکز بنانا کام

نہ صرف ترویج اردو کے لیے مفید ہوگا بلکہ ہماری صحافت و انشاپردازی کا معیار بھی بلند ہو جائے گا - اور مستقل کالج کے قیام سے ہماری تحریک کو بھی استواری حاصل ہوگی —

۴ - بدقسمتی سے ہمارے ملک کے سیاسی اور علمی ادارے ایک ایسی جماعت سے قطعی بے خبر معلوم ہوتے ہیں جو نہایت بے تعصبی اور کامل رواداری کے ساتھ ہندوستان کی سوشل حالت کو بہتر بنانے کی خاموش مساعی میں عرصہ سے سرگرم عمل ہے - اس جماعت کی نظر میں ہندو مسلم سب یکساں ہیں - اور ان کی مجالس میں ہندی اردو فارسی سب کی قدر ہے - جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری مشترک زبان یعنی اردو کو اس جماعت کی وجہ سے کافی ترقی ہوتی ہے یہ جماعت صوفیہ مشائخ یا یوگیوں کی ہے - جو کام شیخ ملک دیوان نے سنہ ۷۵۰ ع میں ملابار میں شروع کیا تھا وہ سیدنا تھر ولی (۱۰۲۰ ع) نے ترچنا پلی میں پہنچایا - اسی کا اثر گلبرگہ پہنچا - اور خواجۂ اجمیری کے اثر سے حسینی کا نسخہ پیدا ہوگئے جو روزے بھی رکھتے ہیں اور مردوں کو دفن بھی کرتے ہیں باوجودیکہ اتھرون وید کا مطالعہ بھی جاری ہے - اسی طرح مولوی سید حسین کے شاگرد اور حضرت فرید کے مرید حاجی گرونانک نے ایک نیا مذہب مواخات قائم کردیا - کبیر پنتھی سنہ ۱۴۳۰ ع میں اور دادو پنتھی (جو در اصل داؤد نامی ایک صلح کل مسلمان تھے) سنہ ۱۵۷۲ ع میں راجپوتانہ میں ترقی کرنے لگے - اسی طرح ستنامیوں اور غریب داس پنتھیوں نے دہلی کے قرب و جوار میں بت پرستی ' رسوم پرستی ' تسبیح شماری ' تیرتھ جاترا اور ذات پات کے خلاف جہاد شروع کردیا - ان صوفیوں کے گروہ سے آجکل کے کام کرنے والوں کو سبق لینا چاہیے - اور

ں واقعہ سے شہرت حاصل کرنی چاہئے نہ مولوی کرامت علی جونپوری
، سوانح عمری تک بنگال میں ڈھونڈے نہیں ملتی باوجودیکہ یہ وہ ہستی
ی جس نے کمپنی کے زمانے میں آدھے بنگال کو اچھوتوں کی جماعت سے
ل کر انسان بنادیا - اور اُن کی کثیر جماعت میں اردو رسم خط
ر اردو سمجھنے کی استعداد کو اپنے رسائل مفتاح الجنہ و راہ نجات
، ذریعہ سے بڑھایا —

بہرکیف مدعا یہ ہے کہ ان بزرگوں کی رواداری نے ہندوستان کی
مختلف قوموں کو ایک مذہب مواخات میں جکڑ دیا تھا ان کے دوھوں'
چوپائیوں' رباعیوں اور ملفوظات نے مختلف ہندوستانی زبانوں کو ایک
یسے معیار کی طرف بڑھنے کی دعوت دی تھی جس سے ہمارے کلچر
تہذیب میں یکرنگی پیدا ہوگئی تھی اور اگر کچھہ نیرنگی بھی تھی
و وہ کیفیت جمال کو ترقی دینے کا باعث ہوتی تھی —

اس جماعت کو اب بھی منظم کیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ
ے اردو کو کافی ترقی دی جاسکتی ہے - اکثر عرسوں اور سالانہ اجتماعات
کے موقعوں پر بزرگوں کے حالات یا عام سوشل مسائل کے متعلق اردو
میں ایسا لٹریچر تقسیم کیا جاسکتا ہے جو ان بزرگوں سے سند جواز
؛ استحسان حاصل کرلے - معتقدین کی جماعت ایسی چیزوں کو اب بھی مقدس
سمجھہ کر ترقی کا باعث ہوسکتی ہے —

۵ - آخری تجویز یہ ہے - جو سب سے اہم ہونے کی حیثیت سے
پ کی توجہ اور ہمدردی کی محتاج ہے - اگر آپ غور فرمائیں گے تو
پ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے لوگ
باد ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں - اور ان میں کافی تعداد ایسے

اصحاب کی ہے جو آسان اردو سمجھہ لیتے ہیں- لیکن اپنے صوبوں کی ضروریات کے لحاظ سے مختلف قسم کے رسوم خط کا استعمال کرتے ہیں- مثلاً گجرات میں گجراتی اور بنگال میں بنگالی رسم خط رائج ہے- سی پی میں دیونا گری کا استعمال زیادہ ہے- لیکن ان سب میں کثیر تعداد ایسے افراد کی ہے جو انگریزی جانتی ہے اور رومن خط سے واقف ہے- ان لوگوں کو نہ اتنی فرصت ہے نہ ضرورت کہ وہ اردو رسم خط کو سیکھیں اور اس سے لطف اٹھانے کی کوشش کریں- لیکن اگر آپ اردو زبان کی کتابیں رومن خط میں شایع کریں تو اکثر غیر زبان بولنے والے آپ کی کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے حامی نظر آئیں گے--

اس جماعت کے علاوہ لاکھوں عیسائی اور فوجوں کے ملازم اب بھی رومن خط میں اردو پڑھتے ہیں- اگر آپ اردو کا معیار بلند کرنا اور زیادہ عیسائیوں اور فوجیوں کو اردو کا حامی بنانا چاہیں تو آپ کو لامحالہ وہی رسم خط اختیار کرنا پڑے گا جو وہ جانتے ہیں- اور اگر اُنھیں ضروری مفید اور دلچسپ لٹریچر مہیا کیا گیا تو وہ یقیناً اردو کے بہت بڑے معاون ثابت ہوں گے اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ رومن رسم خط کو اردو زبان کے رواج کے لیے لازمی قرار دیں اور اس رسم خط میں اگر آسانی نظر آئے تو اردو رسم خط کی جگہہ اس کو رائج کریں —

میں صرف ایک مثال پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل قطعہ مصور ویکلی ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۳۶ ع سے لیا گیا ہے- لیکن باوجودیکہ میں مرہٹی اور گجراتی زبان جانتا ہوں نہ رسم خط لیکن رومن خط کی وجہ سے نہ صرف ان دونوں زبانوں کو پڑھ لیتا ہوں بلکہ

یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ زبانیں اردو سے اتنی قریب ہیں کہ تھوڑی سی کوشش میں ان کی قلب ماہیت ہو سکتی ہے اور یہ خالص اردو بن سکتی ہیں :—

URDU

1. Ap apne gahakon ko naqd sauda ke waste kitni dasturi dete hain ? Agar ap dasturi barhaen to ap ko gahak ziyada milenge.
2. Yih arhatiya saudagar hain na ki thora saman bechnewale dukandar.
3. Wuh sarkar ke fauji mahakme ko sab qism ka zaruri saman muhaiya karte hain.
4. Un ki qimat inaqul hai is liya un ko is sal theka mila.
5. Is qism ka saman unhon ne Inglistan se barah e rast mangwaya hai
6. Is waqt bazar men yih saman chuk gaya hai.
7. Aj kall wuh log apna saman bahut mahnga bechte hain.
8. Yih ap ki galati hai. Kya ap ne kabhi un ki qimat ka dusron ki qimat se muqabla kiya hai ?
9. Ap chunki un ke purane gahak hain ap ko dusri jagah chizen mol nahin lena chahiyen.
10. Baz dafa shakr un ko asli dam par bechna parti hai.
11. Bagair munafe ke apna kar a bar kaise chala sakte hain ?

MARATHI

1. Rokhila tumhi girhaikana kai sut detan ? Tumhee jar sutiche praman wadhwal tar tumhala Jyast girhaik milel.
2. Te ghauk wyapari ahet. kirkolnahint.
3. Te Sarkari lashkari khatyala Je lagel te saman purwitat.
4. Tyanchya kimti nehami wajwi astat mahnun yanda tyana he kantrat milale.
5. Tyani hya tarhecha mal thet Englandhun magwila ahe.

6. Sadhyan bajarant ha mal milat nahin.
7. Aj-kal te far Jyast bhaawane mal wiktat.
8. He tumchi chu ahe; tumhee tyanche bhaw kadheen dusryanchya bha·wanshi tadun pahile ahet kai?
9. Tumhee tyanche June girhaik astlyamulen dusrikade mal wikat ghetan kaman nahin.
10. Kadhin-kadhin tyanan sakhar mool kimtine wikawi lagte.
11. Nafa milawilyashiwai tyancha dhanda kasa chalel ?

GUJRATHI

1. Rokad kharedi upar tamaran gharakone shoon watao apochho ? Jo watawno dar tamo wadhu karo to tamo wadhu gharako melavsho.
2. Teo Jatthabandh wepari chhe, chhutakna nathi.
3. Teo sarkari lashkari khatane Je Joitoon hoi te pooroo pade chhe.
4. Teona bhho mafaksar howathi aa warshe teone contract malyu chhe.
5. Aa prakarno mal teoe velathi mangavyo chhe.
6. Halman bajarman aa malno jattho nathi.
7. Aj-kal teo potano mal hud-bahar mogha bhawe wechechhe.
8. Aa toe tamari bhool chhe; tame koi diwas bija wepariona bhow sathe teoni sarkhami kidhi chee ?
9. Tame teona joona gharak hondthi bije thikanethi kharedi karwinahain joie.
10. Koi-koi wakhat khand muddal bhawe teo wechechhe.
11. Nafa wagar teo potano dhando kewi rite kari shakeh ?

اس تحریر کو پڑھنے کے بعد غالباً آپ مجھہ سے متفق ہوں گے کہ رومن خط نہ صرف ہندوستان کے لیے ضروری ہے بلکہ بیرون ہند، مثلاً چین، عراق حجاز، جنوبی افریقہ اور امریکہ میں جو ہندوستانی عارضی طور پر کام کرتے ہیں یا مستقل سکونت پذیر ہیں وہ بھی اردو زبان سے مستفیض

ہو سکتے ہیں اس لیے کہ وہ ہندوستان سے باہر رومن تحریر کے جاننے پر مجبور ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اُردو یا ہندوستان کا کوئی اور رسم خط جانتے ہوں - ان وجوہ سے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم رومن خط کو اختیار کر لیں —

گو تمہارے موجودہ اجتماع میں رجعت پسند عنصر نظر نہیں آتا اور اس کے کہنے کی ضرورت نہ تھی ' لیکن اگر میں آپ کی توجہ ایران ' ترکیہ اور جزائر شرق الہند کی طرف دلاؤں اور یہ عرض کروں کہ انہوں نے مجبوری سے نہیں بلکہ خوشی سے رومن رسم خط کو اختیار کر لیا ہے تو شاید نامناسب نہ ہوگا —

آکسفورڈ

از

فضل احمد کریم فضلی

۱ - سناتے ہیں اک آپ کو نظم ہم — بہلاتے ہیں اس طرح کچھ دل کا غم
۲ - یہاں کی جو ہیں خاص دلچسپیاں — وہ اس نظم میں کی گئی ہیں بیاں
۳ - مگر ابتدا میں ہیں اشعار کچھ — جو ممکن ہے خاطر پہ ہوں بار کچھ
۴ - کہ ہے اُن میں کچھ ایسی باتوں کا ذکر — جو اک گونہ ہیں قابل غور و فکر
۵ - یہ ہے سب سے پہلے گذارش مری — کہ سچ پر ہے بنیاد اس نظم کی
۶ - حقیقت نظر آئے گی بے نقاب — خلاف دیانت ہے بیجا حجاب
۷ - بجاتے ہیں جو پارسائی کا ڈھول — عموماً ہوا کرتی ہے اُس میں پول
۸ - جو کرتے ہیں ظاہر خیالات یوں — جو بے پوچھے خود کرتے ہیں بات یوں
۹ - " انہیں کچھ سنا تم نے وہ واقعہ — جو کل بن رہا تھا بڑا پارسا
۱۰ - وہ ساتھ ایک لڑکی کے آیا نظر — بہت سٹپٹایا مجھے دیکھ کر
۱۱ - خدا ہی کو معلوم ہے اصل حال — بظاہر پریشان تھے اس کے بال
۱۲ - ہنسی تو مجھے آئی بے انتہا — مگر ضبط سے کام میں نے لیا "
۱۳ - وہ حضرات یا تو گنہگار ہیں — نہیں تو گناہوں پہ تیار ہیں
۱۴ - سرے سے نہیں یا تو وہ پارسا — اگر ہیں تو تقدیر ہے نارسا

۱۵ - جو مل جائے موقع مناسب انھیں　　تو وہ بھی یقیناً سبھی کچھ کریں

۱۶ - تعجب نہیں گر ہے سب کا یہ حال　　نہ ہوتا گر ایسا تو تھا اک کمال

۱۷ - کہ جو کیفیت حسن اور عشق کی　　بروز ازل تھی وہ ہے آج بھی

۱۸ - نہ وہ حسن کی دل فریبی گئی　　نہ وہ عشق کی ناشکیبی گئی

۱۹ - جوانی کے خون میں وہی ہے تپش　　دل نوجوان میں وہی ہے خلش

۲۰ - اس سے ہے اصناف میں یہ کشش　　بھلا اس پہ کیا موقع سرزنش

۲۱ - دیا ہے بہت ہم نے اس پر جو زور　　نتیجہ یہ ہے جس کو دیکھو وہ چور

۲۲ - دلوں میں تمنا نظر میں ہراس　　زبان سے نکلتی ہے دل کی بھڑاس

۲۳ - یہ ہے اس کے کہنے سے مطلب مرا　　کہ اس نظم پر ہو نہ کوئی خفا

۲۴ - خفا ہونے والے سوچیں ذرا　　حقیقت چھپانے سے کیا فائدا

۲۵ - ہے اک اور بھی بات اس کے سوا　　ضروری ہے جس کا یہاں تذکرا

۲۶ - ہماری زبان میں وہ ہیجان ہے　　بپا آج کل ایک طوفان ہے

۲۷ - ہر اک اس میں خود ساختہ رہنما　　کوئی نا خدا ہے تو کوئی خدا

۲۸ - خدا وہ بھی جو مثل نمرود ہے　　نہ مانے اسے جو وہ مردود ہے

۲۹ - قواعد کے پھندوں میں جکڑا کوئی　　زبان کی لطافت پہ اکڑا کوئی

۳۰ - زبان کی لطافت بڑی چیز ہے　　مگر قابل غور یہ نیز ہے

۳۱ - کہ بس یہ ہے مقصود لطف زبان　　خیالات کا پر اثر ہو بیان

۳۲ - نہ یہ، ہم خیالات کو چھوڑ کر　　ذھین بس زبان کی لطافت پہ سر

۳۳ - زبان کا گلا گھونٹنے پر ادھر　　کوئی اپنی باندھے ہوئے ہے کمر

۳۴ - زبان کے جو ہیں ابتدائی اصول　　سمجھتا ہے ان کو بھی بالکل فضول

۳۵ - کمال اس کے نزدیک ہے بس یہی　　کہ مسجد بنا ڈالے ڈیڑھ اینٹ کی

۳۶ - کسی پر چڑھا قابلیت کا بھوت　　جو نا قابلیت کا خود ہے ثبوت

۳۷ - ترا کھیپ میں وہ تراش و خراش — فصاحت کا دل جس سے ہو پاش پاش
۳۸ - وہ بیرونی الفاظ کی ٹھونس ٹھاس — کہ جس سے زبان ہی کی رک جائے سانس
۳۹ - وہ ہے زعم میں اپنے مغرور اس قدر — کہ اس نکتہ کی بھی نہیں ہے خبر
۴۰ - یہ صنعت کا ہے انتہائی کمال — کہ صنعت کا گذرے نہ اس پر خیال
۴۱ - اسی پر سخن فہم حیران ہے — جسے لوگ سمجھیں کہ آسان ہے
۴۲ - نکالا کرے بال کی کوئی کھال — کہیں ہے یہی شاعری کا کمال
۴۳ - تصوف کہیں شعر کا مدعا — خرافات ہے اور اس کے سوا
۴۴ - یہ فتوی بزرگان دین متیں — متانت سے دیتے ہیں بیٹھے کہیں
۴۵ - کہ وہ شاعری کا اک ابلیس ہے — جو بے مقصد درس و تدریس ہے
۴۶ - سمجھتا نہیں کوئی طرز کلام — بھڑکتا ہے وہ سن کے بلبل کا نام
۴۷ - ملامت کے ہر سمت تیر و سناں — غرض ہے مصیبت میں شاعر کی جان
۴۸ - سلامت روی کا ہے جو راستا — چھپا ہے نگاہوں سے مثل خدا
۴۹ - کہ موجود ہے اور ملتا نہیں — نہ جب تک میسر ہو عین الیقین
۵۰ - دل شاعرانہ کہ ذوق سلیم — ضروری ہیں پھر رہ مستقیم
۵۱ - بہت چاہیے اس پہ مشق سخن — کہ اس راہ پر ہو کوئی گام زن
۵۲ - یہاں مشق کرنے کی فرصت کسے — کبھی * شعر دو اک یوں ہی ہوگئے
۵۳ - نہیں الغرض مجکو مشق سخن — نہ کچھ اپنی جانب مجھے حسن ظن
۵۴ - اگرچہ ہیں جذبات اُبلتے ہوئے — قلم لڑکھڑاتا ہے چلتے ہوئے
۵۵ - لہذا اگر لغزشیں ہوں کہیں — تو وہ مستحق ملامت نہیں
۵۶ - کہ فرمایا ہے شیخ سعدی نے بھی — اک اعجاز سی جن کی ہے شاعری
۵۷ - " قبا گر حریر ست وگر پرنیاں — بہ ناچار حشوش بود درمیاں

* یہ مبالغہ یا بالفاظ دیگر انکسار شاعرانہ ہے، میں نے چالیس پینتالیس غزلیں ضرور کہی ہیں۔

۵۸ - چوبگے پسند آیدیت از هزار بہروں کی دست از تعلت پدار"
۵۹ - یہ ہے جب کہ قادر کلاموں کا حال تو کہوں ہو مجھے لغزشوں کا خیال
۶۰ - مرے ہچکچانے کے یہ تھے سبب بہر حال کچھ عرض کرتا ہوں اب
۶۱ - یہاں آئے جب ہم وطن چھوڑ کر کہیں کیا کہ دل پر ہوا کیا اثر
۶۲ - یہاں کی خیالی جو تصویر تھی پہنچتے ہی وہ خاک میں مل گئی
۶۳ - جدھر دیکھیے کالے کالے مکان وہ عہد کہن کی کہن داستان
۶۴ - کوئی انھیں خوبی نہ آئی نظر کہ ویسے وطن میں بہت تھے کھنڈر
۶۵ - نہ کرتے تھے ہم جن کی جانب نظر جنھیں ہم سمجھتے تھے الو کا گھر
۶۶ - وہی نکلے یاں درسگاہ علوم کہیں جن کو اہل نظر جائے بوم
۶۷ - بہت دل کو تکلیف پہلے ہوئی کسی بات میں بھی نہ لگتا تھا جی
۶۸ - مگر جب یوں ہی کچھ زمانہ کٹا انھیں چیزوں سے انس پیدا ہوا
۶۹ - تو وحشت بھی تیزی سے گھٹنے لگی بڑے لطف کے ساتھ کٹنے لگی
۷۰ - پرانے وہ بوسیدہ دیوار و در وہی جن سے ہوتی تھی زخمی نظر
۷۱ - وہی اب تو کرنے لگے دل میں گھر انھیں سے محبت ہوئی اس قدر
۷۲ - کہ اب ہم کو لگتا ہے یہ بھی برا کہ کہوں ان کو کہتا ہے کوئی برا
۷۳ - عمارت سے الفت کا ہے جب یہ حال مناظر سے الفت کا پھر کیا سوال
۷۴ - کہ جنگلی عمارت بظاہر کثیف مناظر ہیں اتنے ہی یاں کے لطیف
۷۵ - زمیں کے وہ دلکش نشیب و فراز عروس حقیقت کے سربستہ راز
۷۶ - نمودار اس آن سے ہیں یہاں کوئی شوخ لے جیسے انگڑائیاں
۷۷ - جدھر دیکھیے کوچۂ * عاشقاں عیاں عشق کی کار فرمائیاں
۷۸ - ولو واک † اور پھر وہ گاڈسٹو جنھیں دیکھ کر گدگدی دل میں ہو

* Lovre horek کا ترجمہ ' اس لیے ایسا قابل معانی ہے —
† Godstow Willow Walk راستوں کے نام —

۸۱ - ولوواک لچکی ہوئی اس قدر　　کہ معشوق مشرق کی جیسے کمر

۸۲ - وہ پانی کی نہریں دو طرفہ رواں　　جہاں جن کی آغوش میں مچھلیاں

۸۳ - ولو کی گھنی وہ دورویہ قطار　　بنائے ہوئے راستہ سایہ دار

۸۴ - وہ منظر کہ مشکل ہے جس کا بیاں　　وہ ہوتا ہے اتوار کے دن یہاں

۸۵ - وہ ہوتی ہے کثرت پری چہروں کی　　کہ جیسے پرستان کی ہو گلی

۸۶ - چلی جا رہی ہیں وہ خوش ساتھ ساتھ　　لیے ہاتھ میں اپنے عاشق کا ہاتھ

۸۷ - کبھی کوئی سر گنگناتی ہوئی　　کبھی جوش میں آکے ڈتی ہوئی

۸۸ - کوئی یار دیرینہ دیکھا اگر　　تو وہ مسکرا دیتا منہ پھیر کر

۸۹ - کسی بات پر ہیں خفا اس سے گر　　تو دیکھا غضب کی نظر سے ادھر

۹۰ - اگر اس کے برعکس ہے ماجرا　　کہ ہے ساتھ اپنے کوئی دوسرا

۹۱ - تو بچنے کی کوشش اگر دور ہیں　　بہت پاس ہیں گر تو مجبور ہوں

۹۲ - چلے پھر تو چپ سر جھکائے ہوئے　　گنہگار سا منہ بنائے ہوئے

۹۳ - نہ اس وقت کچھ ہم سے کہتے ہے　　نہ اس حال میں ہم سے رہتے بنے

۹۴ - ہے بعد میں تو منانا انہیں　　ہزاروں بہانے بتانا انہیں

۹۵ - نہ مانیں تو ہم رخ بدلنے لگے　　اٹھے اور خفا ہوکے چلنے لگے

۹۶ - وہ پھر ان کا ہم کو منانا غضب　　وہ دامن پکڑ کر بٹھانا غضب

۹۷ - محبت کے آنسو رواں ہوگئے　　دکھے دل غرض شادماں ہوگئے

۹۸ - کہاں تھا ولوواک کا تذکرا　　کہاں ذکر دلچسپ یہ چھڑ گیا

۹۹ - چھڑے سلسلہ پھر اسی بات کا　　ہوا دن کا ذکر اب ہو کچھ رات کا

۱۰۰ - درختوں کے ہیں جھول کیا خوش نصیب　　چھپے جن میں ہیں عاشقان غریب

۱۰۱ - جہاں حسن و الفت کا یا راز ہے　　کہ ہر سمت کھس پھس کی آواز ہے

۱۰۲ - بہت گوشہ تار پر رمز ہے　　شب ماہ لیکن ہے کچھ اور شے

۱۰۳ - وہ عشاق سے کھیلنا چاند کا عجب ایک ہے طرفہ تر ماجرا
۱۰۴ - وہ پتوں میں چھپ تاکنا جھانکنا کہیں * کھولنا اور کہیں ڈھانکنا
۱۰۵ - کہیں روشنی اور سایہ کہیں وہ منظر بیاں کرتے بنتا نہیں
۱۰۶ - خصوصاً ہوا شوخ انداز سے جب اس کھیل میں چاند کا ساتھ دے
۱۰۷ - جب اس نور و سایے میں پڑ جائے جان ہر اک لحظہ جب حسن کی بدلے آن
۱۰۸ - جب اس طرح یکجا ہوں لیل و نہار کریں وہ بہم رقص جب ہمکنار
۱۰۹ - تو اس کیفیت کے بیان کے لیے سخن آفریں کی زباں چاہئے
۱۱۰ - لہذا یہ ذکر اب یہیں چھوڑ کر بیاں اور باتوں کا ہو مختصر
۱۱۱ - جہاں ختم ہوتا ہے یہ راستا وہاں پل ہے اک اونٹ کی پیٹھ سا
۱۱۲ - یہاں پڑھیں دو تین بجرے پڑے بہت جن کے مدین میں دل جلے
۱۱۳ - کہ جائے پناہ غریباں ہے یاں بہار + وصال جہاں ہے یہاں
۱۱۴ - بہت کم کو معلوم ہے یاں کی راہ پہنچتی نہیں یاں عدو کی نگاہ
۱۱۵ - ہوا اور پانی سے بھی ہے مفر غرض عشق والے ہیں یاں بے خطر
۱۱۶ - اگر ایک طرف ٹیمس ہے شاخ شاخ دل پورٹ میڈوز ‡ بھی ہے فراخ
۱۱۷ - جو ہوتا ہے یاں چاندنی کا اثر نہ بھولے گا ہم کو کبھی عمر بھر
۱۱۸ - یہاں وقت ہم نے گذارا بہت کہ لگتا تھا جی یہاں ہمارا بہت
۱۱۹ - جگہ یہ ہے کچھ اس بلا کی حسیں کہ بس جی میں آتا ہے بیٹھئے یہاں
۱۲۰ - لئے اپنے دل میں بڑے ولولے یہاں سے رہ کاڈستو پر چلے
۱۲۱ - لب ٹیمس جاتی ہے وہ اس طرح ٹکی بیل ساری پہ ہو جس طرح
۱۲۲ - اُدھر اک طرف پورٹ میڈوز ہے
کئی میل تک جلوہ افروز ہے

---

* کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا خواجہ میر اثر —.

† بہار وصال رفیقاں ہے آج ' میر حسن - ‡ Povt meadows ایک نہایت وسیع سبزہ زار کا نام -

۱۲۳ - وہ کرتی ہے یوں دل میں پیدا اُمنگ　　　کہ محسوس ہوتا ہے سینہ ہے تنگ

۱۲۴ - ادھر چرتے پھرتے ہیں گھوڑے بہت　　　ادھر ہلس کے بھی ہیں جوڑے بہت

۱۲۵ - جہاں جاکے رکتا ہے یہ راستا　　　نہایت حسیں واں یہ ہے اک سرا

۱۲۶ - جو رسم تراوت سے موسوم ہے　　　بجا طور پر جس کی یاں دھوم ہے

۱۲۷ - بہت خوشنما مختصر اک چمن　　　سرا سے ہے ملحق بطرز کہن

۱۲۸ - پرانے زمانے کے انداز سب　　　جو ہیں اس زمانے میں وجہ طرب

۱۲۹ - کہیں کچھ کبوتر ہیں کچھ مور ہیں　　　کہیں آبشاروں کے بھی شور ہیں

۱۳۰ - بہت آئے ہیں گھومنے ہم ادھر　　　کیے ہیں یہاں ہم نے گھنٹوں بسر

۱۳۱ - یہ سب یاد آئیں گے اکثر ہمیں　　　سفر یا حضر ہم جہاں بھی رہیں

۱۳۲ - اس طرح دلکش ہے تو پاتھ بھی　　　جگہ وہ بھی ہے ایک تفریح کی

۱۳۳ - چراگاہ چے-چے * کے اونچے درخت　　　جو مثل اپنے کالج کے ہیں سبز بخت

۱۳۴ - وہ لگتے ہیں اتنے بھلے دور سے　　　کہ ہم بھی ثنا پر ہیں مجبور سے

۱۳۵ - یہیں پر مناتے ہیں سب ایٹس ویک　　　ہر اک جس میں چھوٹا بڑا ہے شریک

۱۳۱ - وہ کالج کے بجروں کی لمبی قطار　　　نمودار وہ پرچموں کی بہار

---

* Christ Church آکسفورڈ کا مشہور کالج ہے ' وہاں میرے ایک عزیز دوست رہتے تھے ' کرائسٹ چرچ میرے کالج (New) کا مد مقابل سمجھا جاتا ہے اور دونوں میں پر لطف چشمک چلی آتی ہے ' ہم نے بھی اس روایت قدیم کو قائم رکھا ' کرائسٹ چرچ کا انگریزی میں مختلف :Ch : Ch ہے اپنے دوست کو چھیڑانے کے لیے ہم نے اسے "چے ' چے" کردیا تھا کرائسٹ چرچ کی میڈوز مشہور ہیں جس پر اس کالج کو بجا طور پر ناز ہے ' ہم نے اسی چشمک کی بنا پر اس کا بھی ترجمہ ' چراگاہ ' کردیا اور کرائسٹ چرچ میڈوز کا ' چراگاہ چے چے ' حریف کی تعریف کرنا اصول چشمک کے خلاف ہے شعر نمبر ۱۳۴ کی اہمیت اسی بنا پر ہے اور شعر نمبر ۱۳۳ کے دوسرے مصرع میں ' سبز بخت ' کا ٹکڑا جذبہ رقابت کے اظہار کے لیے ہے —

اس ہفتہ میں آکسفورڈ کے مختلف کالجوں میں کشتی کی دوڑ کا مقابلہ ہوتا ہے اس زمانے میں یہاں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے اور یہاں کی زندگی میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے —

- Eishts Week †

۱۳۸ - وہ جھرمٹ گل اندامون کا الامان ۔۔۔ جو سچ مچ مجسم ہیں اک گلستان
۱۳۹ - وہ گرمی کی پوشاک زیب بدن ۔۔۔ بلے ہیں وہ جس سے چمن در چمن
۱۴۰ - ہر اک سمت ہیں دو رویہ لگی ۔۔۔ نمایاں ہے انداز سے بے کلی
۱۴۱ - طرف دار جو ہیں برا ان کا حال ۔۔۔ حلق پھاڑ پھاڑ اور آنکھیں نکال
۱۴۲ - بک اپ چھنکتے غل مچاتے ہوئے ۔۔۔ دوان ہیں وہ گرتے گراتے ہوئے
۱۴۳ - بہت خوب ہیں گو یہ دلچسپیاں ۔۔۔ مگر چاردول کے مقابل کہاں
۱۴۴ - نہیں اس پہ دریا کا ہوتا گمان ۔۔۔ اسے ہم سمجھتے ہیں نہر جنان
۱۴۵ - نہ پتلی بہت اور نہ چوڑی بہت ۔۔۔ نہ چھچھلی بہت اور نہ گہری بہت
۱۴۶ - پھبتا پڑتا ہے حسن ہر چیز پر ۔۔۔ کدھر کوئی دیکھے نہ دیکھے کدھر
۱۴۷ - کھلے ہیں یہاں عشق کے پارے ترس ۔۔۔ مسلم ہے قدرت بہ نفس نفیس
۱۴۸ - اسی کا یہ ہے غیر محسوس اثر ۔۔۔ کہ جس سمت بھی ڈالیے اک نظر
۱۴۹ - یہی دیکھئے گا کہ ہر با مراد ۔۔۔ حیات دو روزہ کی دیتا ہے داد
۱۵۰ - وہ پنٹوں * میں باجوں کے بجنے کا شور ۔۔۔ مسرت کے دریا میں سب شور بور
۱۵۱ - کہیں قہقہے ہیں کہیں چہچہے ۔۔۔ کہیں چہچہے ہیں کہیں قہقہے
۱۵۲ - پر پچھروں کا ہر طرف وہ ہجوم ۔۔۔ جنہیں دیکھ کر بھول جائیں علوم
۱۵۳ - وہ بال ان کے سر پر اچھلتے ہوئے ۔۔۔ تبسم لبوں پر مچلتے ہوئے
۱۵۴ - وہ ہنستے ہوئے اور ہنساتے ہوئے ۔۔۔ بگڑتے ہوئے سلہ بناتے ہوئے
۱۵۵ - وہ پیتے ہوئے اور پلاتے ہوئے ۔۔۔ چلے آتے ہیں دل لبھاتے ہوئے
۱۵۶ - وہ پانی میں عکس ان کے بہتے ہوئے ۔۔۔ کہ بنتا نہیں کچھ بھی کہتے ہوئے
۱۵۷ - جہاں دیکھا اس طرح آتے ہوئے ۔۔۔ چلے ہم بھی کشتی بڑھاتے ہوئے
۱۵۸ - کبھی ہم کو سوجھی شرارت اگر ۔۔۔ تو کشتی لڑا دی ذرا پھیر کر

* punt پنٹ ایک قسم کی چھوٹی کشتی ہوتی ہے جسے pole (بانس) سے کھیلتے ہیں -

۱۵۹ - اناڑی پنے کا کیا اعتراف   خطا اس طرح سے کرائی معاف
۱۶۰ - جو تیور کو دیکھا بدلتے ہوئے   تو Sorry کہا اور چلتے ہوئے
۱۶۱ - سمجھہ دار قسمت سے نکلیں وہ گر   تو سمجھیں ہمیں جوتھامد نظر
۱۶۲ - ہلنسیں ہوگئیں خوب باتیں شروع   محبت کی دلچسپ گھاتیں شروع
۱۶۳ - طبیعت ملی آگے پیچھے چلے   کبھی پلنت سے پلنت باندھے چلے
۱۶۴ - چلے تو مگر دل دھڑکتا ہوا   چراغ سحر سا بھڑکتا ہوا
۱۶۵ - سبب اس مصیبت کا ہے اپنا رنگ   بہت جس سے رہتے ہیں ہم لوگ تنگ
۱۶۶ - وہ کالج کے لڑکوں پہ قیدیں ہیں یاں   کہے جس یہ تہذیب نوالا ماں
۱۶۷ - نہیں سہل کچھہ ان سے بچنا ہمیں   ہمارے لیے ہیں بڑی دقتیں
۱۶۸ - جو گورے ہیں تھوڑی ہے ان کو اماں   کہ رنگ اس طرح ہے سبھی کا یہاں
۱۶۹ - مگر جو نظر آئے کالے کہیں   ہوا اہل کالج کا ان پر یقیں
۱۷۰ - کسی طرح ان کو نہیں ہے مفر   پڑا کرتی ہے سب کی ان پر نظر
۱۷۱ - غرض ایسی ہیں ہم کو دشواریاں   بہت جن سے رہتی ہے مشکل میں جاں
۱۷۲ - کبھی * محتسب کی نگاہوں کا ڈر   "رقیب سیہ رو" کی آہوں کا ڈر
۱۷۳ - کبھی ہم نشیں کے مزوں کا ڈر   بہت یوں ہی اور چیزوں کا ڈر
۱۷۴ - انہیں سب ڈروں نے ستایا بہت   مگر لطف بھی ہم نے پایا بہت
۱۷۵ - کسی نے کہی ہے بہت سچ یہ بات   خطر ہی کے اندر ہے لطف حیات
۱۷۶ - سید سر جو دیکھا کسی جانفراز   تو جھٹ ہوگئے پلنت میں ہم دراز
۱۷۷ - لگے پڑھنے اس شان سے پھر کتاب   کہ جیسے نہیں ہے وہ رخ کی نقاب
۱۷۸ - بلا ٹل گئی کھل کھلا کر ہنسے   کبھی ہنستے ہنستے بڑے ہم پھنسے

---

* محتسب (proctor) جو یونیورسٹی کی طرف سے لڑکوں کی اخلاقی نگرانی کے لیے تعینات کیا جاتا ہے اور جسے سزا کے بڑے اختیارات ہوتے ہیں —

۱۷۹ - اسی طرح هم ڈرتے ڈرتے چلے — کبھی ڈوبتے کبھی ابھرتے چلے
۱۸۰ - اگرچه تماشا تھے هم آپ هی — تماشے مگر دیکھے اوروں کے بھی
۱۸۱ - چلانا اناڑی کا ڈر ڈر کے پلٹ — وه پلٹوں کا چلنا ادھر آنت سلنت
۱۸۲ - کسی کونے میں کوئی اٹکا هوا — کسی ڈال میں کوئی لٹکا هوا
۱۸۳ - کسی کا کهیں پول هی ره گیا — کوئی اٹھکے پلٹ اک طرف به گیا
۱۸۴ - کبھی کوئی پانی میں دھڑ سے گرا — پڑا دوستوں میں ادھر قهقها
۱۸۵ - کهیں پر نهاتے هیں یوں ماه رو — که زاهد کا هر لحظه ٹوٹے وضو
۱۸۶ - بدن ان کا قدرت کی جادوگری — که اک * شاخ گل بنگئی هے پری
۱۷۸ - کهیں دھوپ کا خشک اشنان هے — نرالی اس اشنان کی شان هے
۱۸۸ - نه اس پر نگاهیں جماتے بنے — نه اس سے نگاهیں هٹاتے بنے
۱۸۹ - کنارے په جاری کهیں ناچ رنگ — کهیں پر چھڑی هے محبت کی جنگ
۱۹۰ - اکٹھا کهیں عشق والے بهم — کسی بات کا کوئی کھٹکا نه غم
۱۹۱ - سکون و مسرت کی دولت لیے — شراب محبت به کثرت پیے
۱۹۲ - ادھر ان کی محفلت تھکانے لگی — طبیعت ادھر سنسنانے لگی
۱۹۳ - هوئی اپنی قسمت بھی گر سازگار — تو پھر هم هیں اور داد فصل بهار
۱۹۴ - کسی گوشهٔ عافیت میں کهیں — هوئے جا کے چپکے سے خلوت گزیں
۱۹۵ - کھلا سر په سایه ، بچھا فرش آب — وه * دویار زیرک ، وه دنیائے خواب
۱۹۶ - رگوں میں لهو یا شراب طهور — دلوں میں عجب طرح کا اک سرور
۱۹۷ - نشه † وه که زاهد کو بھی جو حلال — بدن پر کھڑے جس سے هو جائیں بال

* دو یار زیرک واز بادهٔ کهن دو منے ' (حافظ) —

† صحیح تلفظ نشه آسانی سے آسکتا تھا ' 'وه' پهلے کر دینے سے ' مگر چونکه هم اردو میں نشه نهیں کهتے بلکه نشه کهتے هیں اس لیے میں نے قصداً نشه هی رکھا ' یه دانسته تقصیر اگر قابل معافی هو تو معاف کی جائے —

۱۹۸ - رکھے دور جو سارے مہمل خیال　　زہے انفعال و خیال مآل!
۱۹۹ - کہاں کا عذاب اور کیسا ثواب　　شباب و شراب و شباب و شراب!
۲۰۰ - غضب اس پہ لطف مناظر غضب　　وہ قدرت کی ہر سمت بزم طرب
۲۰۱ - وہ شاخیں درختوں کی ساغر بدست　　کہ جیسے مجسم کف مے پرست
۲۰۲ - قیامت وہ چڑیوں کی مدہوشیاں　　وہ مدہوشیاں وہ طرب کوشیاں
۲۰۳ - پھدک کر کبھی آنا اس ڈال پر　　کبھی اُڑرہی ہیں ادھر سے اُدھر
۲۰۴ - چہکتی ہوئی چہچہاتی ہوئی　　دلوں کی امنگیں بڑھاتی ہوئی
۲۰۵ - فسون محبت پڑھاتی ہوئی　　تمنائیں دل میں جگاتی ہوئی
۲۰۶ - خیالوں کی تکذیب کرتی ہوئی　　عقیدوں کی تخریب کرتی ہوئی
۲۰۷ - کبھی چونچ پھولوں سے ملنے لگیں　　دل مضطرب کو مسلنے لگیں
۲۰۸ - کبھی خود بخود ہی جھگڑنے لگیں　　پروں اور چونچوں سے لڑنے لگیں
۲۰۹ - کبھی تھک کے آ بیٹھنا پاس پاس　　کسی بات کا غم نہ کوئی ہراس
۲۱۰ - وہ پھر ان کی آپس میں سرگوشیاں　　کہ جیسے حقیقت کی ہیں رازداں
۲۱۱ - وہ قدرت کا ہر سمت سے یہ پیام　　پئے عشق ہی ہے یہ سب اہتمام
۲۱۲ - درختوں کی شاخیں بھی ہیں پردہ پوش　　غفور ست * ایزد تو ساغر بنوش
۲۱۳ - غرض یوں ہی پیتے پلاتے چلے　　نیا لطف ہر جا اٹھاتے چلے
۲۱۴ - برا کیوں کہیں پینے والوں کو ہم　　کہیں گر تو انصاف پر ہے ستم
۲۱۵ - کسے پھر نہ پینے کی ہو آرزو　　جو خود دے کوئی ساغر مشکبو
۲۱۶ - خصوصاً مناظر ہوں جب دلفریب　　تو پھر صبر کیسا کہاں کا شکیب
۲۱۷ - جہاں ختم ہوتی ہے کشتی کی راہ　　† تقدس مآبوں کی ہے عیش گاہ

* میر حسن —

† Parson's Pleasure کا ترجمہ یہ جگہ مردوں کے لیے مخصوص ہے وہ یہاں برہنہ رہتے ہیں ' کبھی چشمۂ آفتاب میں غسل کرتے ہیں کبھی دریائے چار ول میں —

۲۱۸ - اسے کہتے ہیں ہم * عراق عرب
یہاں پر اترتے ہیں کشتی سے سب

۲۱۹ - کہ جن کو نہیں فخر سلف ذکور
خراماں خراماں چلیں تھوڑی دور

۲۲۰ - بھلا بی بی حوا کا واں کون کام
جہاں پر ہوں آدم علیہ السلام

۲۲۱ - اُدھر وہ گئیں اُن کے ساتھی اِدھر
چڑھاتے ہیں کشتی کو† رولرس پر

۲۲۲ - وہ پھر دو منٹ بعد باہم ملے
ملے اور بدستور آگے چلے

۲۲۳ - بڑی دور تک ہے یہی ماجرا
اسی لطف پیہم کا اک سلسلہ

۲۲۴ - مبارک ہوں یہ آپ کو لطف سب
وطن کو چلے ہم تو افسوس اب

۲۲۵ - وہاں چار ول کی سی باتیں کہاں
وہاں یاں کے دن یاں کی راتیں کہاں

۲۲۶ - یہ دریا کہاں یہ کنارے کہاں
یہاں کے سے واں 'چاند تارے' کہاں

۲۲۷ - نہیں یہ کہ واں 'چاند تارے' نہیں
بہت ہیں پہ ‡ 'ندیا کنارے' نہیں

۲۲۸ - یہ مانا کہ فضلی ہو تم خوش کلام
مگر سن چکے ہم بہت والسلام

---

* Mesopotamia کا ترجمہ ' یہی اس جگہ کا نام ہے —

† Rollers یہ ایک طرح کے گھومتے ہوئے تختوں کا زینہ ہے جس کے ذریعہ سے کشتی دریا کے مصنوعی بند کو کے پار کر Parson's Pleasure میں داخل ہوتی ہے —

‡ ' چندا ماموں آرے آؤ پارے آؤ ندیا کنارے آؤ ' —

خراب آباد

(ٹی - ایس - ایلیوٹ کی نظم The Waste Land کا اُردو نثر میں ترجمہ)

از

عزیز احمد صاحب بی - اے (عثمانیہ) یونیورسٹی کالج لندن -

(مسٹر ٹی - ایس - ایلیٹ ہی کے نام جن کی اجازت سے ان کی اس عظیم‌الشان نظم کا ترجمہ
میں اردو میں پیش کر رہا ہوں ، میں اس ترجمے کو معنون کرتا ہوں - عزیز احمد)

تمہید

جنگ عظیم کے بعد سے یورپ جس سیاسی اور معاشی کشمکش میں مبتلا ہے اس کا اثر یورپ کے ادب پر براہ راست پڑ رہا ہے - شاعری محض بے کاری کا مشغلہ نہیں رہی ، بلکہ ایک مجروح تمدن کی درد ناک داستان ہے - گذشتہ جنگ سے کہیں زیادہ ہولناک خطرہ آنے والی جنگ کا ہے ، فضا میں ہر طرف بے اطمینانی سی ہے اور یہی بے اطمینانی یورپ کی جدید شاعری میں بھی نظر آتی ہے -

انگلستان ، یورپ کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں کس قدر قدامت پسند ہے - جدید تحریکیں یہاں دیر میں پہنچتی ہیں ، لیکن اس میں کوئی شک

نہیں کہ جب یہ تحریکیں یہاں پہنچ جاتی ہیں تو انگریزی شاعری کے رنگ،
میں رنگ کر عجیب و دلکش شاہکاروں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں –

جنگ عظیم کے بعد سے مختلف شاعروں کے کلام میں بے چینی کے اثرات موجود تھے ' لیکن یہ زیادہ تر ذاتی تھے ' کوئی انقلاب انگیز تحریک ان کی تہ میں کام نہیں کررہی تھی ۔ جنگ عظیم کے بعد کے مشہور شعرا '' مسٹر جان مسفیلڈ ' ' رابرٹ برجس ' انگریزی شاعری کی کہنہ روایات کو برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے - جزائر برطانیہ کا سب سے بڑا شاعر ' ڈبلیو - بی - یٹیس ' ایک بالکل مختلف پیغام لے کر آیا تھا ' لیکن اس کا پیغام اپنی مادر وطن آئرستان کے لیے تھا - اس کے الفاظ اور خیالات سلجھے ہوئے تھے ' اس کی شاعری میں درد تھا ' جوش نہیں تھا —

نظم سے پہلے بے چینی کی لہر نثر میں دوڑ گئی - اور تین مشہور نثر نگاروں کے ناولوں میں یورپ کی دردانگیز داستان ۔ سرمایہ داری اور خونریزی کے خلاف ایک نیم مجنونانہ صدائے احتجاج بلند ہوئی - ' جس میں جائس ' ' آلڈوس ھکسلے ' اور ' ڈی - ایچ - لارنس ' کی کہانیوں اور ناولوں سے انگریزی ادب میں اس جدید تحریک کی نشو و نما ہوتی جو روس میں ' بخارن ' اور ' شلو خوف ' جرمنی میں ' طامس مان فرانس میں ' آندرے بریتوں ' ' لوئی ایراگون وغیرہ کی کوششوں سے ایک خاص شکل اختیار کر رہا تھا ۔ اور سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کے ہولناک انجام کے تصور کو پیش کر رہا تھا ' حال کے زخموں سے مستقبل کی موت کا اندازہ کر رہا تھا - اور کم و بیش کہیں کھلم کھلا اور کہیں در پردہ اشتراکیت کی تلقین کرنے لگا تھا —

انگریزی شاعری میں اس تحریک کو باقاعدہ پیش کرنے کا سہرا دو شاعروں کے سر ھے - ایک تو مسٹر ٹی - اس - ایلیٹ (T. S. Eliot) جن کے شاہکار

کا ترجمہ ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ' دوسرے ان کے دوست اور رفیق مسٹر ایذرا پونڈ (Ezra Pound) ان دونوں کی نظموں کے ساتھ جدید انگریزی شاعری کے جسم و روح میں تبدیلی ہونے لگی —

مسٹر ایلیٹ نے انگریزی شاعری میں اس تحریک کی ابتدا تو کی مگر وہ اس کے علم بردار نہیں رہے - بہت جلد وہ اس کشمکش سے تنگ آگئے - اور انھوں نے مذہب کے دامن میں پناہ لے لی - انگلستان کی نئی پود ان کی حال کی شاعری کو ردعمل اور پستی کی شاعری سمجھتی ہے مگر ان کی ابتدائی شاعری کی عظمت ان کی شہرت اور انگریزی ادب میں ان کی حیثیت قائم رکھنے کو کافی ہے - ان کی یہ نظم جس کا ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے ' ہر اعتبار سے انگریزی شاعری میں بیسویں صدی کی بہترین پیداوار کہی جاسکتی ہے - یہ اس غیر معمولی ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہے' جب وہ موجودہ دنیا کے ہنگامے کو اور تباہی کے منظر کو دیکھنے ' سمجھنے ' اور سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے ' اُن کے ذہن میں ایک کشمکش سی تھی کہ کس کا ساتھ دیں ' پرانی دنیا کے پرانے اُصولوں کو اختیار کریں یا اشتراکیت اور جدید تحریکوں کے ساتھ ہوجائیں - جس طرح انقلاب فرانس کے بعد ایک اسی قسم کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ملک الشعراے انگلستان " ولیم ورڈ سورتھ " نے ایک " فطری مذہب " میں پناہ لی ' اُسی طرح اس ہنگامے سے تھک کر ' اور جوش و اُمید کے فقدان کے باعث مسٹر ایلیٹ نے " عیسائی مذہب " میں پناہ لی ' " خراب آباد " The Waste Land اس اعتراف شکست ' سے پہلے کی نظم ہے - اور اُن کی غیر معمولی ذہنی کشمکش کا آئینہ ہے ' جس میں بیسویں صدی کی ذہنی کشمکش منعکس نظر آتی ہے —

ذیل میں ہم " مسٹر جان اسٹریچی " مشہور انگریز عالم معاشیات کا

تجزیہ پیش کرتے ہیں —

" اس میں کوئی شک نہیں کہ آخری چند سال کے عرصہ میں شاعروں کا ایک نیا گروہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے - یہ لوگ باوجود انگریزی ادبیات کی مکمل تحصیل و تاثر کے ایک بالکل نئی نوع سے ہیں، اور اب تک اِنگلستان میں جن جن انواع کی شاعری نے نشو و نما پائی ہیں اُن سب سے بے حد مختلف ہیں - وہ شاعری کے پرانے اصول کی پابندی ناممکن سمجھتے ہیں - شاعروں کے اس مکتب کی سب سے زیادہ اہم پیداوار مسٹر ٹی - اِس - ایلٹ کی نظم The Waste Land جو ایک حساس طبیعت پر اپنے پورے نظم معاشرت کے انحطاط کے رد عمل کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے نظر انداز نہیں کی جاسکتی - یہ سنہ ۱۹۲۲ ع میں شایع ہوی اور اُس زمانے میں لکھی گئی تھی، جب جنگ عظیم کے بعد یورپ کی سرمایہ داری ابتلا کے سخت ترین مراحل طے کر رہی تھی - " خراب آباد " The Waste Land دور جدید کی اہم ترین انگریزی نظم ہے - اس نظم میں ایک قدیم طرزِ معاشرت (جو کبھی بہت مضبوط تھا) کے مکمل و درد انگیز انتشار کی کیفیت انتہائی وضاحت سے ظاہر ہوتی ہے " —

اس قدر ابتدائی تمہید کے "اور نظم کا پس منظر سمجھلے" کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کی ہئیت کے متعلق کچھ لکھا جاے - اُردو کے ناظرین کے لیے یہ نظم بالکل اچنبھے کی چیز ہوگی - خود انگلستان کے لیے یہ اسلوب، اور یہ نفس مضمون بالکل نیا ہے - بکثرت تشریحیں اس نظم کی لکھی جاچکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں —

اس نظم کا اسلوب جدید یورپی شاعری کا اسلوب ہے - اس اسلوب کا سب سے بڑا گر یہ ہے کہ ادب اور زندگی، خیال اور حقیقت کے درمیان سے پردہ اُٹھا دیا جاے - زیادہ صاف الفاظ میں یہ کہ شاعر یا ادیب زندگی کی نقاشی بھی

کرتا جائے ' اور ساتھہ ھی ساتھہ بے تکلفی سے اُن خیالات کو بھی بیان کرتا جائے جو اُس کے دل میں پیدا ہوتے جاتے ھیں - کیونکہ زندگی کے مطالعے میں شاعر کی نظر کو بہت کچھہ اھمیت حاصل ھے - شاعر کی نظر زندگی کو ایک خاص رنگ میں دیکھتی ھے- شاعر محض دیکھتا ھی نہیں ھے محسوس بھی کرتا ھے- اب تک شاعری کا اصول یہ رھا تھا کہ نظر اور احساس کو دو مختلف شعبوں میں الگ الگ رکھا جائے - جدید شاعری اس اصول کے خلاف ھے - نظر اور احساس ایک دوسرے پر منحصر ھیں ' وہ زندگی کو مل کر دیکھتے ھیں اور مل کر محسوس کرتے ھیں - پس ضرورت اس امر کی ھے کہ نظر اور احساس کے درمیان جو پردہ تھا وہ گرا دیا جائے - شاعر جو دیکھے اور جو محسوس کرے ' بلا لحاظ ترتیب و تشریح بیان کرتا جائے --

یہ تو جدید یورپی شاعری کا عام اسلوب تھا جو بعض حلقوں میں مثلاً فرانس کے "بالائے حقیقت" (Surrealist) طبقے میں انتہا کو پہنچ گیا ھے ' مسٹر ایلیٹ کے ھاتھوں میں یہ اسلوب ایک خاص صورت اختیار کرلیتا ھے - ان کا تخئیل اکثر مثالیت (Symbolism) کے مراحل سے گذرتا ھے اور زندگی کو "مثالوں" میں دیکھتا ' سمجھتا ' اور پیش کرتا ھے - اس رجحان کا باعث بڑی حد تک اُن کا وسیع مطالعہ ھے - وہ کئی زبانوں کے ادب پر عبور کامل رکھتے ھیں ' اور مختلف مذاھب کا انہوں نے کافی مطالعہ کیا ھے - اُن کی نظم ایک مکمل "مثال" ھے ' جو کئی چھوٹی چھوٹی مثالوں سے تعمیر ھوی ھے —

قبل اس کے کہ ناظرین نظم کو پڑھیں ' نظم کے ڈھانچے کو ' اور اُن مثالوں کو جو وہ پیش کررھی ھے ' سمجھہ لینا ضروری ھے —

سب سے پہلے تو یہ کہ نظم کی "مثالیت" کا دارومدار مس ویسٹن (Miss Weston) کی کتاب (From Ritual to Romance) بڑی حد تک ھے -

دوسری کتاب جس کا اثر اس نظم کی تعمیر پر پڑا ہے ' سر جیمز فریزر ' (Sir James Frazer) کی کتاب Golden Bough ہے ان دونوں کتابوں میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ قدیم ترین زمانے میں قدیم لوگوں کے تخیل میں جاڑے میں آفتاب کی حرارت کے کم ہو جانے اور پھر گرمی میں حرارت اور آفتاب کی قوت کے فروغ کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے - قدیم علم الاصنام میں کئی قصوں کا دارومدار اسی تخیل پر ہے کہ سرما میں آفتاب کمزور ہو جاتا ہے اور زمین مردہ سی ہو جاتی ہے گرمی کے موسم میں پھر آفتاب میں گرمی آجاتی ہے اور دنیا میں نئے سرے سے زندگی شروع ہوتی ہے مس ویسٹن کا نظریہ یہ ہے کہ موت اور قیامت کا تخیل اسی قدیم تخیل پر مبنی ہے قدیم مصری لوگ آفتاب دیوتا کی موت ' اور نئی زندگی کا تہوار مناتے تھے - اس تہوار میں بہت سی جنسی نشانیاں بھی ہوتی تھیں - یہی تخیل عیسائی مذہب میں موت اور قیامت کے تصور کی شکل میں ظاہر ہوا - ہمارے ناظرین میں سے اکثر قیامت میں آفتاب کی حرارت کے تصور ' نئی زندگی ' اور برعلمہ (جنسی خیالات کا اثر) اٹھ کھڑے ہونے کے تخیل سے واقف ہیں - یہ تخیل ' قدیم صنم پرستوں میں پیدا ہوا اور یہودیت اور عیسائیت کے منازل سے ہوتا ہوا پہنچا ہے —

مسٹر ایلیٹ کی نظم اپریل میں (گرمی کے موسم کی ابتدا کے زمانے میں) شروع ہوتی ہے - جاڑے کا موسم (جنگ عظیم) ختم ہو چکا ہے ' اور دنیا قیامت کی منزل سے گزر رہی ہے - اپریل کا مہینہ تو ہے لیکن قیامت کی زندگی ' مردوں کی زندگی ہے - ہر طرف انحطاط اور زوال کا منظر پیش نظر ہے —

اس کے بعد نظم کے مختلف حصے جدید طرز معاشرت ' اور جدید تمدن کے مختلف بے کیف اور درد انگیز مناظر پیش کرتے ہیں - آخری حصے میں شاعر کا دل سکون تلاش کرلیتا ہے - جاڑے ختم ہو چکے ہیں ' اگرچہ کہ زندگی ہر طرف

مفلوج ہے لیکن اُمید کو " شانتی " کا سہارا مل جاتا ہے - یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ " شانتی " سے مصنف کا کیا مطلب ہے - بہت سے شارحین کہتے ہیں کہ شاعر زندگی کی اس ہولناک کیفیت سے پریشان ہوکر مذہب میں پناہ لے رہا ہے - اور آخرکار ہتھیار ڈال رہا ہے - بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ " شانتی " سے اُن کا مطلب محض ایک طرح کی موہوم سی اُمید ہے —

اب ہم نظم کے مختلف حصوں پر ایک مختصر سی سرسری نظر ڈالیں گے تاکہ پوری نظم کا سلسلہ سمجھ میں آجائے - ناظرین نظم کو پڑھنے سے پہلے اس تشریح کو ضرور ملاحظہ فرمائیں :—

۱ - نظم گرما کی آمد ' اور جاڑوں کے احساس سے شروع ہوتی ہے - اس کے بعد ایک اعلیٰ خاندان کی عورت جواب غالباً جنگ عظیم کے باعث تباہ ہوگئی اپنی زندگی کی بے لطف داستان سناتی ہے —

اُس کے بعد یورپ کی موجودہ تباہ حالت کی طرف اشارہ ہے - نقشہ قیامت کا ہے ' جس میں اگر آفتاب کی حرارت سے سایہ مل سکتا ہے تو صرف ایک سرخ چٹان کے نیچے - شاعر کی لے میں جوش و جنون کا سا اثر پیدا ہوتا جاتا ہے وہ راہبری کرنا چاہتا ہے اور نہیں کرسکتا یہاں تک کہ وہ ' واگنیر ' کا ایک گیت الاپنے لگتا ہے --

اُس کے بعد ' ہایا سنتھ ' والی لڑکی کا قصہ چھڑتا ہے ' اور ایک مفلوج احساس پر ختم ہوتا ہے پھر ایک فیشن ایبل عورت ' مادام سوسوسترس ' نظم کے پردے پر نمودار ہوتی ہے جو لوگوں کی قسمتوں کا حال بیان کرتی ہے - ان میں سے ایک شخص " فونیقی ملاح " نظم میں بار بار نظر آتا ہے - وہ فونیقی ملاح (زمانۂ حاضر کے تاجر) کی غرقابی کی پیشین گوئی کرتی ہے - یہی تاجر نظم کے حصۂ سوم میں مسٹر ' یوجے نی ڈس ' تاجر سمرنا کی شکل میں پھر نمودار

ہوتا ہے اور شاعر کو کھانے کی دعوت دیتا ہے - چوتھے حصے میں اسی تاجر " فلیباس فونیقی " کے غرقاب ہوجانے پر عبرت کی ہے ---

مادام سوسوسٹرس کی پیشن گوئیوں کے بعد شاعر للدن کے گھر میں ایک مجمع کا حال بیان کرتا ہے جہاں وہ اپنے ایک دوست سے ملتا ہے جس نے اپنے باغ میں ایک لاش بوئی تھی - شاعر اس سے پوچھتا ہے کہ لاش سے کوئی پودا پھوٹ نکلا یا ابھی نہیں - اس معمے کا حل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار نے مزدور کی لاش زمین میں بوئی ہے اور اس کا متوقع ہے کہ اس لاش سے درخت پھوٹ نکلے اور وہ اس درخت کا پھل کھائے - یہاں نظم کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے —

۲ - نظم کے دوسرے حصے کا عنوان " شطرنج کی بازی " ہے - یہ حصہ جدید معاشرت کے دو مختلف و متضاد مناظر پیش کرتا ہے پہلے حصے میں ایک امیر عورت اور اُس کے ساتھیوں کی داستان اُس شان و شوکت کو پیش نظر رکھ کے بیان کی گئی ہے جو شکسپیر نے کلیوپیٹرا کی کشتی کے بیان میں استعمال کی تھی - لیکن باوجود اِس تمول اور چمک دمک کے یہ زندگی بالکل مردوں کی زندگی ہے، کوئی لطف نہیں، کوئی جوش نہیں، کوئی خواہش نہیں-

دوسرا منظر ایک شراب خانہ ہے، جہاں معمولی مزدور پیشہ لوگ جمع ہیں- شراب خانے کے بند ہونے کا وقت آگیا ہے اور شراب خانے کا مالک بار بار چلا رہا ہے " جلدی کرو بھئی وقت ہوگیا ہے " - یہ جملہ بجائے خود بہت معنی خیز ہے - یہ دور جدید کی مصروفیت اور دور جدید کی تباہی کا بیک وقت آئینہ دار ہے - شراب خانے میں ایک عورت اپنی ہمسائی کا قصہ بیان کر رہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خوش نہیں رکھ سکتی - اس میں انتہائی صفائی سے اور چبھتے ہوئے الفاظ میں غریب عورتوں کے قبل از وقت

بڑھاپے کی تصویر کھینچی گئی ہے —

نظم کے اس دوسرے حصے میں شاعر براہ راست معاشرت کے ان دو طبقوں کا فرق دکھاتا ہے - غریب اور مزدور طبقے کی تباہی اور خستہ سامانی اور امیر طبقے کی بے لطف و بے کیف زندگی —

۳ - نظم کے تیسرے حصے کا نام شاعر نے "آتشیں وعظ" رکھا ہے - یہ عنوان گوتم بدھ کے مشہور "آتشیں وعظ" کو دیکھ کر سوجھا ہے۔ اس حصے کا منظر دریائے ٹیمز کا کنارہ ہے - نظم کی ابتدا خزاں کے موسم سے ہوتی ہے - بہار کے تفریح کرنے والے رخصت ہوچکے ہیں اور دریا کے کناروں کی ویرانی گویا انسانی تمدن کی ویرانی کا مرقع ہے - ایک خیال شاعر کو دوسرے خیال تک پہنچاتا ہے اور وہ جو کچھ سونچ رہا ہے ان لا تعداد کتابوں کی روشنی میں سونچ رہا ہے جو اس نے پڑھی ہیں - اس کے بعد شاعر کی ملاقات سمرنا کے تاجر 'مسٹر یوجے نی ڈس' سے ہوتی ہے - یہ وہی کردار ہے جس کا پہلے حصے میں 'مادام سو سو سترس' کی پیشین گوئی میں "غرقاب فونیقی ملاح" اور "یک چشم سوداگر" کے نام سے ذکر کیا گیا تھا - نظم کے چوتھے حصے میں 'مسٹر یوجے نی ڈس' مکمل طور پر غرقاب فونیقی ملاح کے کردار میں ضم ہو جاتا ہے - اس کے بعد شاعر نیم مرد اور نیم عورت 'ٹائرسیس' (جو مرد و عورت کا مجموعہ ہے) کی شکل میں ایک ٹائپسٹ لڑکی اور اس کے خود غرض عاشق کے معاشقے کا منظر بیان کرتا ہے اس کے بعد شاعر دختران ٹیمز کے گیت سنتا ہے - یہ گیت اصل میں شاعر کے تخیل کے مطابق تین عورتوں کی داستانیں ہیں جو کشتیوں میں دریا کی سیر کر رہی ہیں - شاعر عیش پرستی اور شہوت پرستی کی اس فضا سے پناہ مانگتا ہے —

چوتھے حصے میں 'یوجے نی ڈس' (یک چشم تاجر) یا فونیقی ملاح کی

ہوتا ہے اور شاعر کو کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ چوتھے حصے میں اسی تاجر "فلیباس فونیقی" کے غرقاب ہوجانے پر عبرت کی ہے —

مادام سوسوسٹرس کی پیشن گوئیوں کے بعد شاعر لندن کے گھر میں ایک مجمع کا حال بیان کرتا ہے جہاں وہ اپنے ایک دوست سے ملتا ہے جس نے اپنے باغ میں ایک لاش بوئی تھی۔ شاعر اس سے پوچھتا ہے کہ لاش سے کوئی پودا پھوٹ نکلا یا ابھی نہیں۔ اس معمے کا حل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار نے مزدور کی لاش زمین میں بوئی ہے اور اس کا متوقع ہے کہ اس لاش سے درخت پھوٹ نکلے اور وہ اس درخت کا پھل کھائے۔ یہاں نظم کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے —

۲ — نظم کے دوسرے حصے کا عنوان "شطرنج کی بازی" ہے۔ یہ حصہ جدید معاشرت کے دو مختلف و متضاد مناظر پیش کرتا ہے پہلے حصے میں ایک امیر عورت اور اُس کے ساتھیوں کی داستان اُس شان و شوکت کو پیش نظر رکھ کے بیان کی گئی ہے جو شکسپیر نے کلیوپیٹرا کی کشتی کے بیان میں استعمال کی تھی۔ لیکن باوجود اِس تمول اور چمک دمک کے یہ زندگی بالکل مردوں کی زندگی ہے، کوئی لطف نہیں، کوئی جوش نہیں، کوئی خواہش نہیں۔

دوسرا منظر ایک شراب خانہ ہے، جہاں معمولی مزدور پیشہ لوگ جمع ہیں۔ شراب خانے کے بند ہونے کا وقت آگیا ہے اور شراب خانے کا مالک بار بار چلا رہا ہے "جلدی کرو بھئی وقت ہوگیا ہے" - یہ جملہ بجائے خود بہت معنی خیز ہے۔ یہ دور جدید کی مصروفیت اور دور جدید کی تباہی کا بھی وقت آئینہ دار ہے۔ شراب خانے میں ایک عورت اپنی ہمسائی کا قصہ بیان کر رہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خوش نہیں رکھ سکتی۔ اس میں انتہائی صفائی سے اور چبھتے ہوئے الفاظ میں غریب عورتوں کے قبل از وقت

بوڑھاپے کی تصویر کھینچی گئی ہے —

نظم کے اس دوسرے حصے میں شاعر براہ راست معاشرت کے طبقوں کا فرق دکھاتا ہے - غریب اور مزدور طبقے کی تباہی اور خستہ اور امیر طبقے کی بے لطف و بے کیف زندگی —

۳ - نظم کے تیسرے حصے کا نام شاعر نے "آتشیں وعظ" رکھا عنوان گوتم بدھ کے مشہور "آتشیں وعظ" کو دیکھ کر سوجھا ۔ حصے کا منظر دریائے ٹیمز کا کنارہ ہے - نظم کی ابتدا خزاں کے موسم ہے - بہار کے تفریح کرنے والے رخصت ہوچکے ہیں اور دریا کے کنا ویرانی گویا انسانی تمدن کی ویرانی کا مرقع ہے - ایک خیال دوسرے خیال تک پہنچاتا ہے اور وہ جو کچھ سونچ رہا ہے ان لا تعدا کی روشنی میں سونچ رہا ہے جو اس نے پڑھی ہیں - اس کے بعد شاعر کی سمرنا کے تاجر ' مسٹر یوجے نی ڈس ' سے ہوتی ہے - یہ وہی کردار ہے جو حصے میں ' مادام سو سو سترس ' کی پیشین گوئی میں " غرقاب فونیقی اور " یک چشم سوداگر " کے نام سے ذکر کیا گیا تھا - نظم کے چوتھے حصے میں یوجے نی ڈس ' مکمل طور پر غرقاب فونیقی ملاح کے کردار میں ضم ہو . اس کے بعد شاعر نیم مرد اور نیم عورت ' ٹائرسیس ' (جو مرد و عورت کا ہے) ' کی شکل میں ایک ٹائپسٹ لڑکی اور اس کے خود غرض عاشق کے منظر بیان کرتا ہے اس کے بعد شاعر دختران ٹیمز کے گیت سنتا ہے - یہ گیت میں شاعر کے تخیل کے مطابق تین عورتوں کی داستانیں ہیں جو کشتیو دریا کی سیر کر رہی ہیں - شاعر عیش پرستی اور شہوت پرستی کی سے پناہ مانگتا ہے —

چوتھے حصے میں ' یوجے نی ڈس ' (یک چشم تاجر) یا فونیقی

وتا ہے اور شاعر کو کھانے کی دعوت دیتا ہے - چوتھے حصے میں اسی تاجر
فلیباس فونیقی " کے غرقاب ہوجانے پر عبرت کی ہے ---
مادام سو سو سٹرس کی پیشن گوئیوں کے بعد شاعر لندن کے گھر میں
یک مجمع کا حال بیان کرتا ہے جہاں وہ اپنے ایک دوست سے ملتا ہے جس نے
پے باغ میں ایک لاش بوئی تھی - شاعر اس سے پوچھتا ہے کہ لاش سے کوئی
دا پھوٹ نکلا یا ابھی نہیں - اس معمے کا حل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ
رمایہ دار نے مزدور کی لاش زمین میں بوئی ہے اور اس کا متوقع ہے کہ اس لاش سے
رخت پھوٹ نکلے اور وہ اس درخت کا پھل کھائے - یہاں نظم کا پہلا
سہ ختم ہوتا ہے —

۲ - نظم کے دوسرے حصے کا عنوان "شطرنج کی بازی" ہے - یہ حصہ
دید معاشرت کے دو مختلف و متضاد مناظر پیش کرتا ہے پہلے حصے میں ایک
ہر عورت اور اُس کے ساتھیوں کی داستان اُس شان و شوکت کو پیش نظر
ھ کے بیان کی گئی ہے جو شکسپیر نے کلیوپیٹرا کی کشتی کے بیان میں استعمال
، تھی - لیکن باوجود اِس تمول اور چمک دمک کے یہ زندگی بالکل
دوں کی زندگی ہے ' کوئی لطف نہیں ' کوئی جوش نہیں ' کوئی خواہش نہیں-
دوسرا منظر ایک شراب خانہ ہے ' جہاں معمولی مزدور پیشہ لوگ
ع ہیں - شراب خانے کے بند ہونے کا وقت آگیا ہے اور شراب خانے کا مالک
بار چلا رہا ہے " جلدی کرو بھئی وقت ہوگیا ہے " - یہ جملہ بجائے خود
ت معنی خیز ہے - یہ دور جدید کی مصروفیت اور دور جدید کی تباہی
یک وقت آئینہ دار ہے - شراب خانے میں ایک عورت اپنی ہمسائی
لصہ بیان کر رہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خوش نہیں رکھ سکتی - اس میں
ہائی صفائی سے اور چبھتے ہوئے الفاظ میں غریب عورتوں کے قبل از وقت

بوڑھاپے کی تصویر کھینچی گئی ہے —

نظم کے اس دوسرے حصے میں شاعر براہ راست معاشرت کے ان دو طبقوں کا فرق دکھاتا ہے - غریب اور مزدور طبقے کی تباہی اور خستہ سامانی اور امیر طبقے کی بے لطف و بے کیف زندگی —

۳ - نظم کے تیسرے حصے کا نام شاعر نے "آتشیں وعظ" رکھا ہے - یہ عنوان گوتم بدھ کے مشہور "آتشیں وعظ" کو دیکھ کر سوجھا ہے ۔ اس حصے کا منظر دریائے ٹیمز کا کنارہ ہے - نظم کی ابتدا خزاں کے موسم سے ہوتی ہے - بہار کے تفریح کرنے والے رخصت ہوچکے ہیں اور دریا کے کناروں کی ویرانی گویا انسانی تمدن کی ویرانی کا مرقع ہے - ایک خیال شاعر کو دوسرے خیال تک پہنچاتا ہے اور وہ جو کچھ سوچ رہا ہے ان لاتعداد کتابوں کی روشنی میں سوچ رہا ہے جو اس نے پڑھی ہیں - اس کے بعد شاعر کی ملاقات سمرنا کے تاجر 'مسٹر یوجے نی ڈس' سے ہوتی ہے - یہ وہی کردار ہے جس کا پہلے حصے میں 'مادام سو سو سٹرس' کی پیشین گوئی میں "غرقاب فونیقی ملاح" اور "یک چشم سوداگر" کے نام سے ذکر کیا گیا تھا - نظم کے چوتھے حصے میں 'مسٹر یوجے نی ڈس' مکمل طور پر غرقاب فونیقی ملاح کے کردار میں ضم ہو جاتا ہے - اس کے بعد شاعر نیم مرد اور نیم عورت 'ٹائرسیس' (جو مرد و عورت کا مجموعہ ہے) کی شکل میں ایک ٹائپسٹ لڑکی اور اس کے خود غرض عاشق کے معاشقے کا منظر بیان کرتا ہے اس کے بعد شاعر دختران ٹیمز کے گیت سنتا ہے - یہ گیت اصل میں شاعر کے تخیل کے مطابق تین عورتوں کی داستانیں ہیں جو کشتیوں میں دریا کی سیر کر رہی ہیں - شاعر عیش پرستی اور شہوت پرستی کی اس فضا سے پناہ مانگتا ہے —

چوتھے حصے میں 'یوجے نی ڈس' (یک چشم تاجر) یا فونیقی ملاح کی

غرقابی کا منظر بیان کیا گیا ہے - یہ غرقابی گویا جدید تمدن کی سرمایہ داری اور تجارت کی غرقابی ہے —

پانچویں حصے کی ابتدا تباہی اور بربادی کے منظر سے ہوتی ہے گویا قیامت آچکی ہے - شاعر ایسے مقام پر ہے جہاں " محض چٹان ہی چٹان ہے اور پانی نہیں" ہر طرف موت ہے کہیں زندگی کے حقیقی آثار نہیں - اس کے بعد ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں شاعر قطب شمال کی ایک سیاح جماعت کے ایک واقعے کو مستعار لیتا ہے کہ جب سردی کی شدت ، اور سفر کی زحمت سے مسافروں کی طاقت ختم ہوگئی اور حواس جواب دینے لگے تو ان کو اصل تعداد سے ایک آدمی زیادہ نظر آنے لگا - اور وہ حیران تھے کہ یہ اجنبی کون ہے - اس کے بعد مشرقی یورپ کی تباہی اور بربادی کے مختلف مناظر پیش کیے گئے ہیں - مشرقی یورپ کے ممالک کو گذشتہ جنگ عظیم نے بالکل تباہ کر دیا - اس کے بعد شاعر پھر پہاڑ (چٹان اور پانی) کی تلمیح کی طرف واپس پلٹتا ہے - بالآخر " کالے کالے بادل دور دراز هماونت پر چھا گئے " اور پانی برسنے لگا - یہ گویا قیامت کے بعد مردوں کا زندہ ہونا ہے - یا جدید سرمایہ دارانہ تمدن کی موت کے بعد ایک نئے تمدن کی ابتدا ہے پانی کے ساتھ گرج کی آواز سے تین سنسکرت الفاظ سنائی دیتے ہیں - " دت ، دیدھم ، دمیت " (دے ، ہمدردی کر ، قابو رکھہ) اور شاعر ان الفاظ کی تلمیحات میں تشریح کرتا ہے - ابھی تک شاعر کو اِس نئی زندگی پر اطمینان نہیں اور اس کے حواس پریشان ہیں لیکن مجبور ہوکر وہ اس نئی زندگی میں پناہ لیتا ہے —

یہ اس نظم کا ایک مختصر سا خاکہ تھا - یہ نظم جو یورپ کے ناظرین کے لیے بھی ایک نئی اور اپنی قسم کی بالکل انوکھی چیز ہوگی ہندوستانی ناظرین کو اور بھی زیادہ عجیب اور مشکل معلوم ہوگی - لیکن اس زمانے میں جب کہ

یورپ سے نئی نئی ادبی تحریکیں نکل رہی ہیں ہمارا فرض ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ان تحریکوں سے اپنے ادب کو روشناس کرائیں —

میں 'مسٹر ٹی - ایس - ایلیٹ کا نہایت درجہ مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا اور مجھہ پر اتنا اعتبار کیا کہ اپنے اس شاہکار کے ترجمے کی مجھے اجازت دی - میں اپنے دوستوں 'مسٹر مارٹن بلوم فلیڈ' اور 'مسٹر جے - ڈبلیو - پار' کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس نظم کے ترجمے کے سلسلے میں تلمیحات کی تلاش اور اطالوی' لاطینی' اور جرمن عبارتوں کے ترجمے میں میری بڑی مدد کی -

عزیز احمد

جنیوا - ۱۲ اگست سنہ ۱۹۳۶ ع

خراب آباد

از

مسٹر ٹی - ایس ۰ ایلیٹ

۱ - مردوں کی تدفین

* اپریل بڑا ظالم مہینہ ہے '
سرد ۃ زمین پر پھولوں کی پرورش کرتا ہے '
خواہش اور یاد کو یک جا کرتا ہے '
بے حس جڑوں کو بہار کے چھینٹوں سے جنبش دیتا ہے -
جاڑوں نے ہمیں گرم رکھا تھا '
زمین کو فراموش کن برف سے ڈھانپ دیا تھا '
اور سوکھی ہوئی جڑوں سے تھوڑی سی زندگی باقی رکھی تھی -
لیکن بہار نے † ' اشٹارن برگرزی ' پر سے بارش کے ایک جھونکے کے ساتھ
آکر ہمیں متحیر کر دیا —
ہم درختوں کی قطار کے سایے میں ٹھہر گئے '
پھر دھوپ میں نکل آئے اور ہوف گارٹن (باغیچے) میں
کافی پی اور گھنٹے بھر باتیں کرتے رہے -

---

* نظم ایک لیتھو نین عورت کی سرگذشت سے شروع ہوتی ہے جو جاڑوں سے پہلے اپنی زندگی کی دلچسپیوں کی سرگذشت بیان کرتی ہے -

† اشتارن برگرزی (Starnbergersee) بویریا (جرمنی) کی ایک جھیل -

* بین گار کائنه روسین ، شتام آوس لی تاو اِن ، اِشت دوائچ

[میں ' روس ' کی رہنے والی نہیں ' ' لیتھونیا ' سے آتی ہوں ، پکی

جرمن ہوں]

اور جب ہم چھوٹے تھے ، مہمان تھے آرچ ڈیوک کے یہاں ،

اپنے چچا زاد بھائی کے یہاں ، وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کے باہر لے گیا ،

مجھے (اُتار پر) ڈر معلوم ہونے لگا ، اُس نے کہا ، ' میری ' ' میری ،

مضبوط تھامے رہو - اور ہم نیچے اُترتے گئے ،

پہاڑوں میں جہاں آدمی اپنے کو آزاد محسوس کرتا ہے -

(اب میں بہت رات گئے تک پڑھتی ہوں اور جاڑوں میں جنوب کی طرف

جاتی ہوں)

† یہ کون سی جڑیں ہیں جو جکڑے ہوئے ہیں ،

کون سی شاخیں ہیں جو اِس پتھریلے کوڑے سے اُگ نکلی ہیں -

اِبن آدم ، تو نہیں بتا سکتا ، نہیں جان سکتا کیونکہ تو صرف

شکستہ اصنام کے ایک ڈھیر کو جانتا ہے ، جہاں آفتاب تیزی سے

چمکتا رہتا ہے -

‡ اور بے جان درخت اپنے سائے میں پناہ نہیں دیتا ، جھینگر کی آواز

سکون نہیں بخشتی ،

اور خشک پتھر سے پانی کی صدا نہیں آتی -

---

* Bin Crar keine Russin, stamm, aus Litauen, echtdeutsch-

† " پتھریلے کوڑے ' ' سے شاعر کا مطلب غالباً یورپ کی موجودہ پریشان زندگی ہے -

‡ " اور اُس نے مجھ سے کہا اِبن آدم اپنے قدموں پر کھڑا ہو جا اور میں تجھ سے بات کروں گا "

انجیل مقدس ایزیکئل - باب دوم -

اگر سایہ ہے تو صرف اِس سرخ چٹان کے نیچے
(اِس سرخ چٹان کے سایے میں آ جا)
تاکہ میں تجھے کوئی ایسی چیز دکھاؤں جو
تیرے صبح کے سایے سے جو تیرے پیچھے قدم اُٹھاتا آتا ہے، مختلف ہے
اور تیرے شام کے سایے سے بھی جو تجھ سے ملنے کو اُٹھتا ہے مختلف ہے -
میں تجھے مٹھی بھر خاک میں ہراس کا تماشا دکھاؤں -
* فرش ویت در ونت
در ہایمت تسو
مایں ایرش کنت
وو وائلسٹ دو ؟
[تازہ ہوا چل رہی ہے
گھر کی طرف
میرے آئرستانی لڑکے
تو کہاں رک گیا ہے]
† " ایک سال ہوا تم نے پہلی بار مجھے ' ہایا سنتھ ' کے پھول دیے تھے
لوگوں نے ہایا سنتھ کے پھولوں والی لڑکی میرا نام رکھا "
لیکن جب ہم بہت رات گئے ' ' ہایا سنتھ ' کے باغ سے واپس پلٹے

---

* انجیل مقدس (Eccleriastes 12) -

† یہ جرمن ٹکڑا ' واگنر ' کے اوپیرا Tristan und Isolde کے پہلے ایکٹ سے لیا گیا ہے مسٹر ایلیٹ نے اپنی نظم میں اس کو غالباً اس وجہ سے مستعار لیا ہے کہ یہ نظم کے اس حصے سے جو " یہ کرن سی جڑیں ہیں ...... " شروع ہوتا ہے اور جس کا رنگ بہت تلخ ہے ' اور اس کے بعد کے حصے کے درمیان ' جس میں " میری " کی محبت کے قصے کا سلسلہ پھر سے چھیڑا گیا ہے ' ایک کڑی کا کام دے -

Frisch weht der wind Der Heimat zu, Mein Irisch kind . We Weilest du ?

تو تمہارے ہاتھہ خالی نہیں تھے ' اور تمہارے بال بھیگے ہوے تھے

میں کچھہ نہ کہہ سکا ' میری آنکھیں پتھرا سی گئیں '

میں زندہ تھا نہ مردہ ' مجھے کسی بات کا ہوش نہ تھا -

میں روشنی کے دل کو دیکھہ رہا تھا ' خاموشی کو -

† اود اُنت لیر داس میر [خاموش اور ویران سمندر]

... ...

‡ "مادام سوسو سترس' مشہور روشن ضمیر کو

سخت زکام ہو گیا تھا ' پھر بھی

وہ یورپ کی سب سے عقلمند عورت سمجھی جاتی ہے -

اور اُس کے ہاتھہ میں خطرناک تاش کے پتے ہیں -

اُس نے کہا : - یہ دیکھو یہ تمہارا پتہ ہے " غرقاب فونیقی ملاح "

§ [یہ اُس کی آنکھیں ہیں جو' اب موتی بن گئی ہیں دیکھو !]

یہ پتہ " بیلا ڈونا " (حسینہ)] ہے' چٹانوں کی سلطانہ

موقعوں کی مالکہ

اور یہ " تین چوتوں والا آدمی " ہے ' اور یہ " چکر "

---

* ' میری ' کا قصہ پھر شروع ہوتا ہے - پہلا جملہ ' میری ' کا ہے - لیکن اُس کے بعد ہی شاعر کے مایوس اور پژمردہ خیالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ' جو ایک جرمن جملے پر ختم ہوتا ہے - قصہ مختصر یہ کہ زندگی ایک خاموش اور ویران سمندر ہے -

† Od' und leer das Meer

یہ مصرعہ واگنر کے اُسی آپیرا Tristan und Isolde سے لیا گیا ہے -

‡ مادام سو سو ستوس اور اُس کے تاش کے پتے ' انسانی حیات اور انفرادی زندگیوں کی تلمیحات ہیں - ان میں سے فونیقی ملاح کا ذکر پھر بار بار نظم میں آتا ہے - حصۂ سوم میں وہ مسٹر یوجے نی ڈس تاجر سمرنائی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ' اور حصۂ چہارم میں اُس کی غرقابی کا ذکر ہے - پانی اور سمندر کا اس نظم میں دہشت کا اثر پیدا کرنے میں بہت خاص حصہ ہے -

§ شکسپیر - Tempest ایک مشہور گیت کا ایک مصرعہ -

اور یہ " یک چشم سوداگر " اور یہ پتہ
جو بے تصویر ہے ایک ایسی چیز ہے جسے وہ اپنی پشت پر اُٹھائے لیے
پھرتا ہے '
اور جسے دیکھنے کی مجھے اجازت نہیں -
معلوم نہیں " پھانسی * پانے والا " کیا ہوا - پانی کی موت سے ڈرو -
مجھے آدمیوں کے غول کے غول ایک حلقہ بنائے ہوے چکر لگاتے دکھائی
دے رہے ہیں ؟
شکریہ - اگر تمہیں عزیزہ مسز اکوتیون سے ملنے کا اتفاق ہو
تو کہنا میں خود زائچہ نامہ لے کر آتی ہوں '
اس زمانے میں احتیاط بہت ضروری ہے -
... ...

بے اصل شہر †
جاڑوں کی ایک صبح کو بھورے کُہر کے تلے
ایک مجمع لندن کے پل پر بہتا چلا جارہا تھا ' اس قدر جم غفیر
‡ میں نہیں سمجھا تھا کہ موت نے اتنوں کا خاتمہ کردیا ہے -

---

* بعض نقادوں کا خیال ہے کہ " پھانسی پانے والے " سے شاعر کا اشارہ مسیح مصلوب کی طرف ہے -
† بودلیر (Baudelaire)

" Fourmillante cite, cite, Pleine de reves,
Ou le spectre eu plein jour raccroche le parrant. "

لبریز شہر ' شہر جو خوابوں سے بھرا ہوا ہے '
جہاں بھوت کی دن چڑھے بھی راستہ چلنے والوں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے -
‡ دانتے :- " جہنم " حصۂ سوم -

" si lunga tratta
di gente, chi'onon avrei mai creduto
che morte tauta n' avesse disfatta "

*مختصر اور معدود آہیں میں لوگ سانس لے رہے تھے'
اور ہر شخص کی نگاہ اپنے قدموں کے آگے جمی ہوئی تھی -
(یہ مجمع) پہاڑی پر چلا ' اور پھر کنگ ولیم اسٹریٹ میں
جہاں کلیسائے سینٹ میری وول ناتھ وقت کی پابندی کرتا ہے'
ایک مردہ آواز کے ساتھ ' نو بجے گھنٹے کی آخری آواز پر -
وہاں مجھے ایک شخص نظر آیا ' جسے میں جانتا تھا ' میں نے اُسے
روکا اور چلاکے کہا استیٹسن -
تم تو میلائے میں جہازوں پر میرے ساتھ تھے -
وہ لاش جو تم نے گذشتہ سال اپنے باغ میں بوئی تھی '
کیا اب اُس میں پتیاں پھوٹ نکلیں ؟ کیا وہ اس سال لہلہائے گی ؟
کہیں پالے نے تو دفعتاً اُس کا بستر درہم برہم نہیں کردیا ؟
† ارے کتے کو یہاں سے دور لیجاؤ - یہ آدمیوں کا دوست ہے -
کہیں یہ اپنے ناخونوں سے اس (لاش) کو کھود نہ نکالے-
‡ تم ! ایپو کریت لکٹور! موں سان بلابل — موں فریر
[تم ! میرے مکار ناظر ! — میرے ہم ذات— میرے بھائی]

---

* دانتے :- " جہنم " حصۂ چہارم -

"Quiri, secodo che per ascoltare,
non avea pianto, ma che di sospiri
che l'aura eterna faceuan tremare.

† Webster (عہد الزبتھ کے مشہور ڈراما نگار) کے ڈرامے " سفید بھوت " سے یہ مصرعہ کسی قدر ترمیم کے ساتھ مستعار لیا گیا ہے —

‡ بودلیر (Baudelaire) :- "hypocrite lecteur!—mon semblable, —mon fiere!"

۲ - شطرنج کی بازی

•کرسی جس پر وہ بیٹھی تھی، شفاف تخت کی طرح
مر مر پر چمک رہی تھی ' جہاں گلاس رکھا تھا
گلاس دان میں، جس پر خوشہ دار انگور کی بیل بنی ہوئی تھی
جس کی پتیوں سے ایک زرین کیوپڈ جھانک رہا تھا -
(دوسرا اپنے پر سے اپنی آنکھیں چھپائے ہوے تھا)
سات شاخوں والے فانوس کے شعلے دوھرے ھوگئے تھے
اور میز پر روشنی ڈال رہے تھے ' جہاں
اُس (عورت) کے جواھرات کی چمک روشنی سے بغلگیر ھونے کو اُٹھ رھی تھی'-
جواھرات ' جو اطلس کے ڈبوں سے اس کثرت کے ساتھ اُمنڈ نکلے تھے-
ھاتھی دانت اور رنگین گلاس کے کھلے ھوے پیالوں میں اس کی عجیب
مرکب خوشبوئیں
عطر، غازہ ' اور سیال خوشبوئیں حواس کو بے ترتیب و پریشان
اور نکہتوں میں غرق کر رھی تھیں -
کھڑکیوں سے آکے فرحت بخشنے والی ھوا سے جنبش پاکے
شمعوں کے اونچے شعلوں کو فربہ کر رھی تھیں -
شعلے جو اپنا دھواں اوپر مرصع چھت میں پھینک رہے تھے
اور مرصع چھت کی تصویر کو جنبش دے رہے تھے -
تصویر میں لکڑی کا ترشا ھوا سمندر تانبے سے مرصع

• نظم کی تمہیدی شان و شوکت میں شاعر نے شکسپیر کے ڈرامے Antonyand Cleopatna
کے اس منظر کا خاکہ اُڑایا ھے جس میں شکسپیر نے کلوپیٹرا کے تخت کی تعریف کی ھے -

سبز اور نارنجی رنگوں میں چمک رہا تھا جس کے گرد رنگوں پتھر کا حاشیہ تھا '

جس کی دھندلی سی روشنی میں ایک ترشی ہوئی مچھلی تیر رہی تھی-

کھلے آتشدان سے اوپر '

اس طرح جیسے کوئی کھڑکی کسی سر سبز منظر کی طرف کھلے

فلو میل' (عندلیب) [جس کو وحشی بادشاہ نے اس بری طرح خراب کیا]

کی شکل کی تبدیلی کا منظر منقش تھا *

پھر بھی سارا صحرا اس کی مقدس آواز سے گونج اٹھا -

پھر بھی وہ چلاتی رہی ' اور اب تک دنیا اس کا تعاقب کررہی ہے -

ذلیل کانوں کو "جگ - جگ " کی آواز سنائی دیتی ہے -

ماضی کے اور بہت سے افسردہ نشانات

دیواروں پر منقش تھے - گھورتی ہوئی شکلیں

جھکی ہوئی تھیں' جھک کے محصور کمرے کو خاموش کر رہی تھیں -

زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دی -

آگ کی روشنی میں ' برش کے نیچے ' اُس کے بال

آتشیں نقطوں میں پھیل گئے '

کبھی الفاظ بن کے چمکنے لگتے اور کبھی وحشی پن سے خاموش ہوجاتے -

† آج کی رات میرے حواس پریشان ہیں - ہاں پریشان - میرے پاس رہو -

مجھ سے باتیں کرو - مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتے - باتیں کرو -

کیا سوچ رہے ہو؟ کیا سوچتے ہو ؟ کیا ؟

---

* یونانی علم الاصنام میں فلومیل اور پراکنی دو بہنیں تھیں اور پراکنی کے شوہر نے زبردستی فلو میل کو خراب کیا - دیوتاؤں نے فلو میل کو بدل کے بلبل بنادیا اور وہ آج تک اپنی مصیبت کا نوحہ لوگوں کو سناتی ہے -

† اس ایک طرفہ مکالمے میں عورت سوال کرتی جاتی ہے' اور ان سوالات سے شاعر کے دل میں خیالات پیدا ہوتے جاتے ہیں -

مجھے کبھی معلوم نہیں ہوتے پاتا کیا سوچتے ہو - سوچو " -

* میں سوچ رہا ہوں کہ ہم لوگ چوہوں کے بل میں ہیں

جہاں مردوں کی ہڈیاں گم ہوگئیں -

" یہ شور کیسا ہے " ؟

دروازے کے نیچے ہوا -

" اب پھر یہ شور کیا ہے ؟ ہوا کیا کر رہی ہے "

کچھہ بھی نہیں ' پھر کچھہ بھی نہیں -

" کیا

تمہیں کچھہ بھی معلوم نہیں؟ کچھہ بھی نظر نہیں آتا؟ کچھہ بھی یاد نہیں آتا؟

کچھہ بھی نہیں " ؟

مجھے یاد ہے

† یہ اس کی آنکھیں ہیں جو اب موتی بن گئی ہیں -

" زندہ ہو کہ نہیں ؟ کیا تمہارا دماغ بالکل خالی ہے " -

او او او او وہی شکسپیر والی بات -

کتنی لطافت آمیز ہے -

کس قدر ذہانت سے لبریز

" اب میں کیا کروں ؟ میں کیا کروں ؟

میں اسی حالت میں بھاگ نکلوں گی اور سڑک پر چلوں گی '

میرے بال سراسیمہ ' لٹکتے ہوئے اسی طرح - کل ہمیں کیا کرنا ہے ؟

---

* ملاحظہ ہو اس نظم کا تیسرا حصہ جس سے یہ تلمیح مستعار لی گئی ہے -

† شکسپیر کے ڈرامے Tempest سے وہی حوالہ جو پہلے دیا گیا تھا - غرقابی کا تصور اس نظم کی نفسیاتی کیفیتمیں بہت اہمیت رکھتا ہے -

کبھی بھی ہمیں کیا کرنا ہے ؟ "

دس بجے گرم پانی

اگر بارش ہوئی تو چار بجے ایک بند موٹر

* اور ہم شطرنج کی ایک بازی کھیلیں گے —

† بے خواب آنکھیں بند کرتے ہوئے کسی کے دروازے کھٹکھٹانے کا انتظار کرتے ہوئے —

... ...

‡ جب لل کا شوہر (فوج کی) نوکری سے چھوٹ کر آنے لگا ' تو میں نے کہا-

میں نے کہنے میں مروت نہیں برتی - میں نے خود 'لل' سے کہا —

بھئی ذرا جلدی کرنا ' وقت ہوچکا ہے —

آلبرٹ آرہا ہے ' کچھ تو بناؤ سنگار کرکے اپنی حالت ٹھیک کرو —

وہ تم سے پوچھے گا کہ جو روپے اس نے تمہیں دیے تھے —

---

* " شطرنج کی بازی " جو اس حصۂ نظم کا عنوان بھی ہے ' بہت معنی خیز ہے - سترھویں صدی کے ایک مشہور انگریز ڈراما نگار Middleton کے ڈرامے Women Beware Women میں شطرنج کی بازی کا منظر ڈرامائی طنز کے لحاظ سے بے مثل ہے ' اور اسی سے ' ایلیٹ ' نے یہ تلمیح مستعار لی ہے - ڈرامے میں ایک دلالہ اپنے شہر کے نواب کا اشارہ پا کے شہر کے ایک شریف خاندان کی بیوہ اور اس کی بہو کو مدعو کرتی ہے - بیوہ کو وہ شطرنج کی بازی میں الجھائے رکھتی ہے اور نواب اس کی بہو کو موقع پاکر پھسلا لیتا ہے -

† دروازہ کھٹکھٹانے سے موت مراد ہے -

‡ یہ ٹکڑا نظم کے حصۂ دوم " شطرنج کی بازی " کا دوسرا ٹکڑا ہے - پہلے حصے میں سرمایہ داروں کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا تھا کہ باوجود تمول اور ظاہری جگمگاہٹ کے سکون و اطمینان نصیب نہیں - اس دوسرے حصے میں بالکل متضاد طبقہ یعنی مزدوروں اور پیشہ وروں کی زندگی کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے - منظر ایک شراب خانہ ہے - رات کے وقت جب کہ شراب خانے کے بند ہونے کا وقت آچکا ہے ایک عورت اپنے ساتھیوں کو ایک واقعہ سنا رہی ہے - بار بار شراب خانے کے چھوکرے کی آواز سنائی دیتی ہے - " بھئی ذرا جلدی کرو ' وقت ہوچکا ہے " - یہ نظم مزدور پیشہ طبقے کی خراب و خستہ حالت کا بڑا اچھا نقشہ ہے - شاعر نے اس سے پہلے کے ٹکڑے میں جو ادیبانہ فنی اسلوب اختیار کیا تھا ' اس کو ایک قلم تبدیل کرکے نہایت سادہ لہجے میں زندگی کے اس رخ کی تصویر کھینچی ہے -

کہ تم اپنے لیے بتیسی خریدو ... ۔ اس نے دیئے تھے ' میرے سامنے کی بات ہے ۔

تمہارے سب دانت جھڑ گئے ہیں ' لل ایک اچھی سی بتیسی خرید لو ۔

میں قسم کھانے کو تیار ہوں اس نے کہا تھا تمہیں دیکھا نہیں جاتا ۔

اور میں نے کہا تھا مجھہ سے بھی نہیں دیکھا جاتا ۔ ذرا بچارے البرٹ کا خیال کرو ۔

وہ چار سال فوج میں رہا ہے ' وہ چاہتا ہے کہ وقت ہنسی خوشی گذرے ' اور اگر تم اس کا دل نہیں بہلاؤ گی ' تو اور لوگ اس کا دل بہلانے کو موجود ہیں

"اچھا اور لوگ بھی موجود ہیں " ؟ وہ بولی ۔ میں نے کہا " ہاں ہیں تو سہی ' ۔

" تو پھر میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ کون لوگ ہیں جو مجھہ پر اتنی عنایت کریں گے کہ اس کا دل بہلائیں گے " یہ کہہ کر اس نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا ۔

بھئی ذرا جلدی کرنا وقت ہو چکا ہے ۔

میں بولی اگر تمہیں پسند نہیں تو صاف صاف کہہ دو ۔

اگر تمہیں چلنا اور پسند کرنا نہیں آتا تو دوسروں کو آتا ہے ۔

لیکن اگر البرٹ تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائے گا تو محض رغبت نہ ہونے کی وجہ سے ۔

تمہیں شرم آنی چاہیے کہ تم اتنی بوڑھی معلوم ہوتی ہو ۔ میں بولی ۔ (حالانکہ ابھی وہ صرف اکتیس سال کی ہے)

اس نے منہہ بنا کے جواب دیا ۔ میں کیا کروں ۔

کہنے لگی ۔ " یہ ان گولیوں کا اثر ہے جو میں نے پیٹ گرانے کے لیے کھائیں تھیں '

(اس کے پانچ بچے ہو چکے ہیں اور ننھے جارج کی بار تو بالکل مرتے مرتے بچی)
ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کوئی نقصان نہیں - مگر میں ابھی تک اچھی نہیں ہوسکی"
میں نے اس سے کہا "اگر 'آلبرٹ' تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتا تو پھر تم ہی بتاؤ
اگر تمہیں بچے نہیں چاہیے تھے تو شادی ہی کیوں کی ؟ "
بھئی ذرا جلدی کرنا وقت ہو چکا ہے -
خیر جب 'آلبرٹ' گھر پہنچا تو گرم گوشت تیار تھا
اور مجھے بھی انہوں نے دعوت دی کہ اس کا گرم گرم مزا چکھوں —
بھئی ذرا جلدی کرنا وقت ہو چکا ہے -
بھئی ذرا جلدی کرنا وقت ہو چکا ہے -
خدا حافظ 'بل' - خدا حافظ 'لو' - خدا حافظ 'لے' - خدا حافظ
تا - تا - خدا حافظ ' خدا حافظ
خدا حافظ خواتین - خدا حافظ پیاری خواتین - خدا حافظ خدا حافظ

۳ - *آتیش وعظ

دریا کا خیمہ ٹوٹ گیا - پتی کی آخری انگلیاں
بھیگے ہوئے کنارے کو پکڑ کر ڈوب گئیں -
ہوا بھوری زمین پر سے گذر رہی ہے - † پریاں رخصت ہو چکی ہیں -

---

* نظم کے اس تیسرے حصے کا منظر دریائے ٹیمز کا کنارہ ہے - اس حصے میں دریا کے کنارے کے اور دریا کے آس پاس کے بہت سے سین پیش کیے گئے ہیں - ابتدا تمہید سے ہوتی ہے کہ جاڑے کا موسم ہے اور موسم گرما کے تعطیلات منانے والے رخصت ہوچکے ہیں - اس کے بعد شاعر کی ملاقات سمرنا کے تاجر مسٹر یوجے نی ڈس سے ہوتی ہے ' جو نظم کے چوتھے حصے میں فونیقی ملاح کے کردار میں ضم ہو جاتا ہے اور دریا میں غرق ہوجاتا ہے - اس کے بعد شاعر نیم مرد اور نیم عورت 'ٹائر سیس' جو مرد و عورت (انسانیت) کا مجموعہ ہے کی شکل میں ایک ٹائپسٹ لڑکی کے عشق کا منظر دیکھتا ہے اور اس کے بعد دختران ٹیمز کے تین گیت ہیں -

† عورتیں -

* پیاری ٹیمز - آہستہ آہستہ بہہ کہ میں اپنا گیت ختم کرلوں
دریا میں اب خالی بوتلیں نظر نہیں آتیں ، اور نہ سینڈوچ کے کاغذ
نہ ریشمی دستیاں ، نہ دفتی کے ڈبے ، نہ سگریٹوں کے سرے
اور نہ گرما کی راتوں کی کوئی اور نشانیاں -
پریاں رخصت ہو چکی ہیں ، اور اُن کے دوست شہر کے ڈائرکٹروں کے
آوارہ گرد برخوردار صاحبزادگان
† بھی رخصت ہو چکے ہیں ، بلا اپنا نام و نشان چھوڑے ہوئے -
آب لیمان کے کنارے میں نے بیٹھ کے آنسو بہائے ... ...
پیاری ٹیمز آہستہ آہستہ بہہ کہ میں اپنا گیت ختم کرلوں
پیاری ٹیمز آہستہ آہستہ بہہ کہ نہ میری صدا بلند ہے اور نہ میرا گیت طویل -
لیکن اپنے پیچھے ہوا کے ایک سرد تھپیڑے میں -
میں ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن رہا ہوں اور ایک کھسیانی
ہنسی جو ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی ہوئی ہے -
کنارے پر ایک چوہا اپنے کیچڑ سے لت پت پیٹ کو گھسیٹتا ہوا
آہستہ سے سرک کر سبزی میں چلا گیا ،
میں اُس وقت گیس ہاوس کے پیچھے نہر میں مچھلیوں کا شکار کر رہا تھا-

---

* یہ مصرعہ عہد ملکۂ الزبتھ کے ملک الشعراء Spenser کی نظم Prothalamion سے مستعار لیا گیا ہے - یہ ' اسپنسر ' نے دو امیر لڑکیوں کی شادی کی تقریب میں لکھی تھی جب کہ ان کی بارات دریا کے کنارے گذر رہی تھی -

† اصلی جملہ توریت میں یوں ہے " آب بابل کے کنارے میں نے بیٹھ کے آنسو بہائے " ' لیک لیمان ' سوئٹزر لینڈ کی وہ خوبصورت جھیل ہے جس کے کنارے جینوا ' لوزان ' مونٹریو وغیرہ بہت سے خوبصورت شہر آباد ہیں -

جاڑے کی شام تھی - * میں اپنے بھائی بادشاہ کی تباہی
اور اُس سے پہلے اپنے بادشاہ کی موت پر غور کر رہا تھا -
پست نم زمین پر عریاں سفید اجسام -
اور ہڈیاں جو ایک چھوٹی پست نالی میں پھینک دی جاتی ہیں
سال بہ سال محض چوہے کی دوڑ اُن میں کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتی ہے -
لیکن اپنے پیچھے مجھے وقت بہ وقت
ہارن کی اور موٹروں کی آواز سنائی دیتی ہے ' جو (موٹریں)
بہار کے موسم میں † ' سویٹی کو مسز پورٹر سے ملانے لاتی ہیں -
چاند ' مسز پورٹر ' پر بڑی چمک دمک سے چمکتا ہے
اور اُس کی لڑکی پر '
‡ یہ لوگ سوڈا واٹر میں اپنے پاؤں دھوتے ہیں -
§ اے او سے ووآ داں فاں شانتاں داں لاکوپول
[اور گنبد میں گانے والے لڑکوں کی یہ آوازیں]
... ...
$ ٹووٹ ' ٹووٹ ' ٹووٹ
جگ جگ جگ جگ جگ
کس بری طرح زبردستی خراب کیا
تھریو

---

* یہ اشارہ پھر شکسپیر کے ڈرامے Tempest کی طرف ہے - شاعر اپنے آپ کو شہزادۂ ' فرڈی نند ' سے تعبیر کرتا ہے -

† ' سویٹی ' (sweeny) امریکہ والے آئرلینڈ کے خاص قسم کے لوگوں کو مذاقاً ' سویٹی ' کہتے ہیں -

‡ سرمایہ داری کا مضحکہ -

§ پال ورلین (Verlaine) : - Et O ces voix deufants, chantant daus la coupole

$ شاعر کو بلبل کی آواز اور اُس کے ساتھ ہی ' فلو میل ' کی سرگذشت یاد آجاتی ہے -

... ...

بے اصل شہر

جاڑوں کی ایک دوپہر کو بھورے کہر میں

* مسٹر 'یوجے نی ڈس ' سمرنا کا تاجر

ڈاڑھی بڑھی ہوی ' جیب کشمشوں سے بھری ہوی

لندن تک محصول اور کرایہ معاف - ہاتھہ میں کاروباری کاغذات

مجھہ سے عامیانہ فرانسیسی میں کہنے لگا

کہ اُس کے ساتھہ کینن ' اسٹریٹ ہوٹل ' میں کھانا کھاؤں

اور اُس کے بعد ہفتے کے ختم کی تعطیل میٹرو پول میں گذاروں -

... ...

شفق کے وقت جب آنکھیں ڈسک سے اُٹھتی ہیں

اور کمر سیدھی کرنے کا وقت ہوتا ہے

جب انسانی انجن انتظار کرتا ہے '

موٹر ٹیکسی کی طرح دھک دھک کرتا ہوا انتظار کرتا ہوا

† میں ' ٹائرسیس ' اگرچہ کہ زندہ ہوں اور دو زندگیوں کے درمیان

---

* 'یوجے نی ڈس ' آگے چل کر فونیقی ملاح کے کردارمیں ضم ہو جاتا ہے-

‡ ' ٹائرسیس (Tiresias) کا کردار اس نظم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے - ٹائرسیس نیم مرد ہے اور نیم عورت اور اس طرح دونوں انسانی جنسوں کا مجموعہ ہے - خود مسٹر ایلیٹ نے ' ٹائرسیس ' کے کردار کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :-

" ' ٹائرسیس ' اگرچہ کہ محض ' ناظر ' ہے اور اس نظم کا خاص کردار " نہیں پھر بھی وہ اس نظم میں بہت اہمیت رکھتا ہے ' کیونکہ اس میں سب کردار مل کر ایک ہوجاتے ہیں- جس طرح کشمشوں کا تاجر یک چشم سوداگر ' فونیقی ملاح میں تحلیل ہو جاتا ہے ' اور آخرالذکر فرڈیننڈ شہزادہ نیپلز میں مل جاتا ہے' اسی طرح (اس نظم کی) تمام عورتیں ایک عورت بن جاتی ہیں- اور دونوں جنسیں ' ٹائرسیس ' کے کردار میں مل جاتی ہیں- ٹائرسیس جو کچھہ دیکھتا ہے وہی اس نظم کا ماحصل ہے " —

دھڑک رہا ہوں -

بڈھا مرد ہوں اور ڈھلکے ہوئے زنانے پستان رکھتا ہوں '

* شفق کے وقت ' شام کے وقت کو دیکھ رہا ہوں جو ملاح کو سمندر سے گھر لاتا ہے -

اور ٹائپسٹ لڑکی کو چائے کے وقت گھر لاتا ہے' جو ناشتے کے برتن ہٹاتی ہے'

چولھا گرم کرتی ہے اور ٹین کے ڈبوں میں سے کھانے کی چیزیں نکالتی ہے -

کھڑکی کے باہر غیر محفوظ طور پر

اس کے خشک ہوتے ہوئے مرکب ملبوسات لٹک رہے ہیں جن کو آفتاب کی آخری شعاعیں مس کر رہی ہیں -

صوفے پر (جو رات کو اس کا بستر بن جاتا ہے)

پائتابوں ' سلیپروں اور ڈھ جاموں کا ڈھیر ہے -

میں مرجھائے ہوئے پستانوں والا بوڑھا مرد

اس منظر کو دیکھ کر باقی سب باتیں بھانپ گیا —

میں بھی آنے والے مہمان کا انتظار کرنے لگا -

وہ سرطان زدہ نوجوان آپہنچا

مکانوں کے ایک معمولی سے ٹھیکے دار کا محرر - نظر میں جرأت '

ان نیچی نظروں میں سے ایک نظر جس میں خود اعتمادی اس طرح متمکن ہے

جیسے ' بریڈ فورڈ ' کے کسی لکھ پتی کے سر پر ریشمی ٹوپی -

وہ صحیح طور پر بھانپ لیتا ہے کہ وقت بہت مناسب ہے -

---

* ' ٹائرسیس ' کا کردار اصل میں لاطینی شاعر Ovid کی نظم سے لیا گیا ہے - یونانی شاعرہ ' سافو ' کے شعر کا آزاد ترجمہ ہے ' اس شعر کو دہرانے کے بعد ' ٹائرسیس ' ٹائپسٹ لڑکی کا قصہ جو اس کی نظروں کے سامنے پیش آرہا ہے بیان کردینا شروع کردیتا ہے -

کھانا ختم ہوچکا ہے اور وہ تھکی ہوئی اور پریشان سی ہے
پہلے اسے آغوش میں لینے کی کوشش کرتا ہے '
اس کی مرضی نہ بھی سہی مگر وہ مخالفت تو نہیں کرتی
سرخ ہو کے اور مکمل ارادے کے ساتھہ وہ فوراً حملہ کرتا ہے ۔
کسی طرح کی مدافعت' متلاشی ہاتھوں کا مقابلہ نہیں کرتی ۔
نوجوان کی خود پرستی جواب کی پروا نہیں کرتی ۔
اور وہ اس بے توجہی کو نعمت سمجھہ لیتا ہے ۔
(اور میں وہ ' ٹائرسیس ' ہوں جو اس سے پہلے یہ سب بھگت چکا ہوں ۔
جو اب اس صوفے یا بستر پر پیش آرہا ہے ۔
میں وہ ہوں جو تھیبس کے پاس دیوار کے کنارے بیٹھا رہا کرتا تھا ۔
اور پست ترین مردوں کے درمیان پھرا کرتا تھا)
پھر وہ (نوجوان) ایک آخری بزرگانہ قسم کا بوسہ دیتا ہے ۔
اور اپنا راستہ ٹٹولتا ہوا باہر جاتا ہے ' زینوں پر روشنی نہیں پاتا ...
وہ پلٹ کر لمحہ بھر آئینہ دیکھتی ہے ۔
گویا اسے اپنے عاشق کی روانگی کی خبر بھی نہیں ۔
اس کا ذہن صرف ایک نامکمل خیال کو گذرنے کی اجازت دیتا ہے ۔
" خیر اب تو یہ ہوچکا - اچھا ہوا کسی طرح ہو تو چکا "
* جب حسین عورت گناہ کی طرف جھکتی ہے اور
اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر اکیلی ٹہلتی ہے
تو خود بخود اپنے ہاتوں سے اپنے بال ٹھیک کرتی ہے
اور گراموفون پر ایک ریکارڈ رکھہ دیتی ہے ۔

* ' گولڈ اسمتھ ' (Gold smith) کے ایک مشہور گیت کا ظریفانہ جواب ۔

اس راگ کی آواز میرے پاس سے ہوتی ہوئی لب آب تک پہنچی -
پھر 'اسٹرینڈ' سے ہوتی ہوئی 'کوئین وکٹوریا اسٹریٹ' تک -
اے شہر' شہر میں اکثر سنتا ہوں
لوور 'تھمز اسٹریٹ' میں ایک شراب خانے کے پاس
ایک باجے کی گنگناتی ہوئی دلپذیر آواز
اور (شراب خانے کے) اندر سے کھنکھناہٹ کی اور باتوں کی آواز
جہاں ماہی گیر دوپہر کو سستاتے ہیں -
جہاں کلیسائے 'میگنس مارٹر' کی دیواریں
کلیسائی سفید و زریں رنگ کی ناقابل بیان عظمتوں سے آراستہ ہیں ؛

... ...

* (دختران تیمز کے گیت)
دریا کو پسینہ آرہا ہے
تیل اور تارکول -
کشتیاں بہہ رہی ہیں '
پانی کی بدلتی ہوئی رفتار کے ساتھ
چوڑے
سرخ بادباں
زمین کی طرف وزنی مستول پر لٹک رہے ہیں -
کشتیاں دھو رہی ہیں
بہتے ہوئے شہتیروں کو

---

* یکے بعد دیگرے تین دختران تیمز تین گیت گاتی ہیں - " دختران تیمز " کا خیال ایلیٹ کو مشہور آپیرا Gotterdammerung میں تین " دختران راین " کے گیت پڑھ کر پیدا ہوا -

' گرین وچ ' تک پہنچ گئی ہیں
آئل آف ڈاگس ' کے پاس سے گذرتی ہوئی ۔
وے ئیالالا لے ئیا
والالا لے ئیالالا
* الزبتھ اور لسسٹر
کھیتے ہوے پتوار
عرشہ ایک سنہری سیپ
بن گیا ہے
سرخ اور زرین ۔
پانی کی تیز اُٹھان
دونوں کناروں سے جا ٹکرائی
جنوب و مغرب کی ہوا
پانی کی دھار پر بہا لائی
گھنٹیوں کی آواز کو ۔
سفید برج
وے ئیالالا ۔ لی آ
والالا لے ئیالالا
" ترام گاڑیاں اور غبار آلود درخت
† ' ھائی بری ' میں میں پیدا ہوی ۔ رچملنڈ اور کیو نے مجھے بگاڑا ۔

* ملکۂ الزبتھ اور لارڈ لسسٹر کے معاشقے کی طرف اشارہ ۔
† دانتے کے " اعراف " کو پیش نظر رکھ کے : ۔

' Ricorditi di me, che son la Pia;
' Siena mi Fe, disfecemi Maremma'.

رچمنڈ کے قریب ٹانگیں اُٹھا کے
ایک تنگ ناؤ کے فرشے پر میں چت لیٹ گئی'

" میرے قدم' مورگیٹ' میں ہیں اور
میرا دل میرے قدموں کے نیچے۔
اس واقعہ کے پیش آجانے کے بعد وہ رویا- اور نئے سرے سے زندگی بسر
کرنے کا وعدہ کیا-
میں نے کچھ نہیں کہا- میں کیوں نہیں نہیں کرتی ؟ "

" مارگیٹ " کی ریت پر
میں نہیں کا سلسلہ
نہیں سے ملا سکتی ہوں-
میلے ہاتھوں کے ٹوٹے ہوئے ناخن-
میرے گھر والے' غریب گھر والے
کسی چیز کے متوقع نہیں
لا لا

... ...

* پھر میں قرطاجنہ پہنچا
† جلن جان جلن جلن
پرماتما تو مجھے کھینچ کر باہر نکال رہا ہے
پرماتما تو کھینچ رہا ہے

---

* " از اعترافات سینٹ آگسٹین " :— " پھر میں قرطاجنہ پہنچا جہاں ناپاک عشق بازی کی دھکتی ہوئی کڑھائی سے مجھے اپنے چاروں طرف کانوں کی آواز سنائی دی " -

† یہ ٹکڑا مہاتما بدھ کے " آتشیں وعظ " کے ایک حصے سے لیا گیا ہے - شاعر نے امریکی مستشرق ہنری کلارک وارن (Henry Clarke Warren) کے انگریزی ترجمے سے مدد لی ہے —

جلن

۴ - * پانی کی موت

' فلیباس فونیقی ' جسے مر کے دو ہفتے ہوگئے
بگلوں کی آواز بھول گیا ' اور گہرے سمندر کا تموج
اور اپنا نفع نقصان -
سمندر کے اندر سے ایک دھار
اُس کی ہڈیوں کو سرگوشیوں میں چن لے گئی -
جب اس کا جسم بلند ہوتا اور پھر ڈوب جاتا
(توگویا) وہ اپنے بڑھاپے اور جوانی کی منزلوں سے پھر گزر رہا تھا '
گرداب میں داخل ہونے سے پہلے —
یہودی یا غیر یہودی
تم جو کشتی کی ناخدائی کرتے ہو اور ہوا کی طرف دیکھتے ہو —
فلیباس کے حال سے عبرت حاصل کرو جو کبھی تمہاری طرح وجیہ
اور بلند قامت تھا —

۵ - † گرج نے کیا کہا

پسینے سے شرابور چہروں پر سرخ مشعل کی روشنی کے بعد
باغوں میں سرد ' کپکپاتی ہوئی خاموشی کے بعد

---

* پانی کا خوف جو اس نظم کی نفسیاتی کیفیت میں خاص اہمیت رکھتا ہے اس سطر میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے - فلیباس فونیقی اور مسٹر یوجی نی ڈس اور شہزادۂ فرڈنینڈ سب ایک کردار ہی کر فلیباس فونیقی کی شکل میں غرقاب ہو جاتے ہیں - غرقابی اور پانی کی پوری " تمثیل " شاعر نے شکسپیر کے ڈرامے " طوفان " Tempest کو پیش نظر رکھ کر لی - پانی کی موت اس زمانے کی موت ہے - اس زمانے کی زندگی کی طرح بے کیف اور مہیب ہے -

† تشریح کے لیے دیباچہ ملاحظہ ہو -

پتھریلے مقامات میں تکلیف اٹھانے کے بعد
پکارنے اور چلانے
اور قید اور محل سرا اور
موسم بہار میں دور دراز پہاڑوں پر گرج کی صدائے باز گشت کے بعد
وہ جو زندہ تھا سو مرگیا
اور جو زندہ ہیں وہ اب مر رہے ہیں
کسی قدر صبر کے ساتھہ
یہاں پانی نہیں صرف چٹان ہی چٹان ہے
چٹان ہے اور پانی نہیں اور ریت کی سڑک ہے
سڑک جو پہاڑوں پر بل کھاتی ہوئی جاتی ہے
چٹانوں والے پہاڑوں پر جن میں پانی نہیں
اگر پانی ہوتا تو ہم رک جاتے اور پی لیتے
مگر چٹان پر کوئی رک نہیں سکتا اور سوچ نہیں سکتا
کاش چٹان میں کچھہ پانی ہوتا
چٹان جو مردہ پہاڑ کے دانتوں کا ہڈی والا جبڑا ہے جس سے وہ
تھوک نہیں سکتا
یہاں نہ کوئی کھڑا ہوسکتا ہے ' نہ لیٹ سکتا ہے ' نہ بیٹھہ سکتا ہے
پہاڑوں میں خاموشی تک نہیں
خشک اور بانجھہ گرج کی آواز آتی ہے اور پانی نہیں برستا
پہاڑوں میں تنہائی تک نہیں
مٹی کے شکستہ مکانوں کے دروازوں سے
خشمگیں چہرے ناک بھوں چڑھا رہے ہیں

کاش پانی ہوتا

اور چٹان نہ ہوتی
اور اگر چٹان تھی تو
پانی بھی ہوتا
پانی بھی
ایک سر چشمہ
چٹان میں ایک چشمہ ہوتا
کاش پانی کی آواز ہی ہوتی
ٹھیکری
یا سوکھی ہوئی گھانس کے گیت کے بجائے
چٹان پر پانی کی آواز ہوتی
جہاں 'ہرمٹ تھرش' * پائن کے درخت پر چہچہا رہی ہے
ڈرپ ڈراپ ڈرپ ڈراپ ڈراپ ڈراپ ڈراپ
لیکن کہیں پانی نہیں
† یہ تیسرا کون ہے جو تمہارے ساتھ چل رہا ہے
جب میں گنتا ہوں تو صرف میں اور تم ساتھ ہیں
لیکن جب نظر اُٹھا کے سفید سڑک کو دیکھتا ہوں
تو ایک اور شخص ہمیشہ تمہارے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے

---

* 'ہرمٹ تھرش' شمالی امریکہ کی ایک چڑیا جس کی آواز کو پانی برسنے کی صدا سے تعبیر کیا جاتا ہے—

† قطب شمالی کے ایک سفر میں جب مسافروں کی طاقت ختم ہوگئی اور حواس جواب دینے لگے تو انہیں مسافروں کی اصلی تعداد سے ایک شخص زیادہ نظر آتا ہے - بار بار گنتے تھے اور ایک شخص کو اصلی تعداد سے زیادہ پاتے تھے - اسی واقعے کی نفسیاتی کیفیت کو مسٹر ایلیٹ نے تلمیحاً مستعار لیا ہے -

ایک بھورا لبادہ پہنے ہوئے اور سر پر کچھہ اوڑھے ہوئے
معلوم نہیں مرد ہے کہ عورت
—— لیکن بتاؤ تو سہی وہ کون ہے تمھاری دوسری جانب؟
* ہوا میں یہ بلند آواز کیا ہے
مادرانہ گریہ و زاری کی آواز
یہ نقاب پوش مجمعے کون سے ہیں
جو ' نا پیدا کنار میدانوں میں جمع ہو رہے ہیں اور چٹخی ہوئی زمین
پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں
زمین پر جس کے گرد صرف اُفق محیط ہے
پہاڑوں پر یہ کون سا شہر ہے
جو شفق گوں ہوا میں چٹخ رہا ہے اور سنبھل رہا ہے اور پھٹ رہا ہے
گرتے ہوئے مینار
یروشلم اتھینہ اسکندریہ
وی آنا لندن
بے اصل

. . . .

ایک عورت نے اپنے لمبے لمبے کالے بالوں کو
ستار کے تاروں کی طرح کھینچ کر سرگوشی کے سر میں کچھہ بجایا
اور چمگادڑیں ' شفق کی روشنی میں معصوم صورت بنائے ہوئے

* مشرقی یورپ آسٹریا ریاست بلقان اور هنگری وغیرہ کی جنگ کے بعد کی تباهی کا تصور اس حصۂ نظم میں پیش کیا گیا ہے -

گنگنانے لگیں اور اپنے پر پھڑ پھڑا کے
سر کے بل کالی دیوار سے رینگ کے نیچے اُترنے لگیں
ہوا میں مینار اُلٹے کھڑے تھے
اور یاد دلانے والی گھنٹیاں بجا رہے تھے جن میں
وہی آوازیں پنہاں تھیں جو خالی صراحیوں اور تھکی ہوئی دیواروں سے
گانے گاتی ہیں'
پہاڑوں کے درمیان اس خراب و خستہ بل میں
چاند کی مدھم روشنی میں' خانقا کے قریب ——
ویران خانقاہ جو محض ہوا کا مسکن ہے —
پامال قبروں پر گھانس گانے گاتی ہے
خانقاہ میں کھڑکیاں نہیں' دروازہ ہلتا ہے
سوکھی ہوئی ہڈیاں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں -
صرف ایک مرغ چھت کے نیچے کھڑا ہوا
کوکوری کو کوکوری کو (ککڑوں کوں - ککڑوں کوں)
بجلی کی چمک میں بانگ دے رہا ہے - پھر ایک بھیگا ہوا جھونکا
پانی برساتا ہوا۔
... ...
* گنگا سوکھ گئی اور مرجھائی ہوئی پتیاں
پانی کا انتظار کرنے لگیں اور کالے کالے بادل
دور دراز 'هماونت' پر چھا گئے
جنگل سمٹ گیا اور جھنجھلا کے خاموش ہو گیا
تب گرج نے کہا

۱۵ †

دت ( ) ہم نے کیا دیا

میرے دوست ' خون جو میرے دل کو لرزا رہا ہے

لمحہ بھر کے لیے شکست کی خوفناک ہمت

عمر بھر کی احتیاط بھی جس کی تلافی نہیں کر سکتی

اس کی ' اور محض اس کی وجہ سے ہم زندہ رہے

یہ وہ چیز ہے جو ہماری موت کی دستاویز میں نہیں مل سکتی

‡ اور نہ اُن یادگاروں میں جن پر محسن مکڑی نے جالا تن دیا ہے

اور نہ اُن میں جن پر کی ثبت شدہ مہر دبلے پتلے وکیل نے توڑی ہے

ہمارے خالی کمروں میں

دا

دیدھم ( ) میں نے دروازے میں ایک بار

کنجی کے گھومنے کی آواز سنی ' صرف ایک بار گھومنے کی آواز

ہم کنجی کا تصور کر رہے ہیں ' ہم میں سے ہر ایک اپنے قید خانے میں

کنجی کا تصور کر رہا ہے - ہر شخص قید خانے کو تسلیم کر لیتا ہے

محض رات کے وقت ' صرف اُڑتی ہوئی فضائی خبریں

---

* و † ہندوستانی ناظرین اس حصے کو غالباً بہت دلچسپی سے پڑھیں کے جس میں شاعر مغرب کی تباہی
ز تباہی کے آثار سے پریشان ہوکر ہندی فلسفے میں پناہ لیتا ہے - اس حصے کے شروع میں وہ ایک پتھریلے پہاڑ
یں پیاسا بھٹک رہا تھا جہاں چٹانیں تھیں اور پانی نہیں تھا - آخرکار اُسے پانی برسانے والے گرج کی آواز اُپنشد
' یہ جملہ دہراتی ہوی سنائی دیتی ہے " دت ' دیدھم ' دمیتہ " (دے - ہمدردی کر - قابو رکھو) - اور
س گرج کے آواز کے درمیان میں اُس کے خیالات کی روانی برابر جاری رہتی ہے -

‡ یہ ٹکڑا Webster کے ڈرامے " سفید بھوت " کے اس جملے سے متاثر ہے - " وہ دوسری شادی
لیں گے قبل اس کے کیڑے تمہارے کفن کو کھاسکیں یا مکڑی تمہارے سنگ تربت پر جالا تن سکے "

* ایک لمحہ کے لیے شکستہ 'کیریولانس' کو زندہ کردیتی ہیں-

دا

دمیت (   ) کشتی نے شگفتگی سے (اثبات میں) جواب دیا-

اُن ہاتھوں کے لیے جو بادباں اور پتواروں کو سنبھالنے میں مشاق تھے

سمندر ساکن ہوگیا - تمہارا دل بھی جب اُسے دعوت دی جاتی

شگفتگی سے جواب دیتا

اور سنبھالتے ہوئے ہاتھوں میں

اِطاعت سے دھڑکنے لگتا -

... ...

میں کنارے پر بیٹھا

† مچھلیوں کا شکار کررہا تھا - میرے پیچھے بنجر میدان تھا

میں کم سے کم اپنی زمین کو تو درست کرلوں

‡ لندن کا پل گررہا ہے ' گررہا ہے '

§ پاے سسکوزے نل فوکو کے لی افی نا '

کواندو فیام چیوکیلی دون ——— $ اے سارس' سارس

[تب وہ اُس آگ میں غرق ہوگیا جو اُسے جلادے رہی تھی

---

* شکسپیر کے مشہور ڈرامے Coriolanus کاهیرو '

† مس ولسٹن کی کتاب From Ritual to Romance سے " ماہی گیر بادشاہ " کی تلمیح مستعار لی گئی ہے -

‡ دانتے :- بہشت

Poi s'ascose nel foco che gli affina

Quando flam ceu chelidon

§ انگریز شاعر Swinburne کی ایک نظم جس میں سارس سے خطاب ہے - اُس سے یہ الفاظ کسی قدر بے ربط طور پر مستعار لیے گئے ہیں -

میں سارس کب بن سکوں گا ؟		اے سارس ، سارس]

* لی پرانس دا کی تین آ لا ترر ابولی

[شہزادۂ اکی تین شکستہ مینار پر]

یہ ٹکڑے میں نے اپنے ویرانے کے پاس جمع کیے ہیں

کیوں اب تو میں تمہارے قابل ہوں - † ' هیرونے مو ' پھر پاگل ہوگیا

دت - دیدھم - دمیت -

شانتی شانتی شانتی

---

* Gerard de Nerval : -

Le Prince d,Aquitaine a la tour abolie

† هیرونےمو (Hieronymo) انگریز ڈراما نگار kyd کے ڈرامے Spanish tragedy کا ایک کردارجس کے لڑکے کو سازشیوں نے قتل کردیا تھا - صدمے سے اور انتقام کی دھن میں وہ پاگل ہوگیا -

ادبی معلومات

۱ - پنڈت نہرو اور ہندی پرچار ماخوذ از ہندی پرچار
۲ - پریم چند کے خطوط " از وشال بھارت کلکتہ
۳ - صوبۂ برما اور اردو از "ادارہ"

ادبی معلومات

از

پنڈت نہرو اور ہندی پرچار

گذشتہ ستمبر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے صوبۂ مدارس کا دورہ کیا تھا - مدراس میں انہوں نے ہندی پرچار سبھا کی نئی عمارت کا افتتاح کرتے ہوے حسب ذیل تقریر کی —

میں کچھہ عرصہ سے یہاں کی دکن بھارت ہندی پرچار سبھا اور اس کی کارگزاری کا چرچا سن رہا تھا - مجھے حیرت تھی کہ یہ انجمن اتنے تھوڑے سے آدمیوں کی مدد سے اتنا اچھا کام کیوں کر انجام دے رہی ہے - حکومت وقت کی مدد کے بغیر ایک نئی زبان سکھانے کا کام نہایت دقت طلب ہے - میری دانست میں آپ کی کامیابی کے دو خاص اسباب ہیں - ایک تو یہ کہ دکن کو ہندی کی بڑی چلت ہے اور پھر یہ کہ جنہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا وہ اپنی دھن کے پکے ہیں - آپ کی کامیابی سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں کے لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھہ گئی ہے کہ یہ ادارہ ان کے لیے مفید ہے - کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کے اس پہلو پر اپنی طرف سے زور دوں —

دکن میں ہندی پرچار کا سوال بہت اہم ہے - ہندی کے ذریعہ سے قومی تحریکوں کو بڑی تقویت پہنچ سکتی ہے - میں مختلف چیزوں کو

پسند کرتا ہوں لیکن اُن میں سے ہر ایک کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔ علیٰ ہذالقیاس میں ہندی کی بھی کوئی خدمت نہیں کر سکا - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ہندی پرچار کو ضروری نہیں سمجھتا - ایک زبان کے پھیلنے سے آگے چل کر ملک کا بھلا ہوگا - لسانیات سے مجھے خاص دلچسپی ہے - ہندی کے متعلق حال ہی میں اخباروں میں میرا جو خط شایع ہوا تھا وہ میرے دعویٰ کا ثبوت ہے —

زبان کا مسئلہ صرف دکن کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام ملک کے لیے اہمیت رکھتا ہے - ہماری بڑی بڑی دس بارہ زبانوں کو ہم دو خاندانوں میں بانٹ سکتے ہیں - ایک سنسکرت کی بیٹیاں - دوسری تامل تیلگو وغیرہ کی سہیلیاں - یہ دونوں خاندان ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی آپس میں گھل مل گئے ہیں - ہم یہ نہیں چاہتے کہ کسی بولی کو دبا کر اپنی زبان کو اُبھاریں - میرا عقیدہ ہے کہ ہر آدمی اپنی مادری زبان کے وسیلہ سے ہی ترقی کرسکتا ہے - ہمارا مقصد یہ ہے کہ پرانی زبانوں کی بنیادیں مضبوط کی جائیں اور انہیں کے ذریعہ تعلیم عام کی جائے - لیکن پورے ملک کا احاطہ کرنے اور مختلف علاقوں میں باہمی تعلق پیدا کرنے کے لیے ہندی کو رواج دینا چاہیے - میں انگریزی کا مخالف نہیں ہوں - بیرونی دنیا کو سمجھنے اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے بدیسی زبانوں کو سیکھنا اچھا ہے - لیکن سب لوگ یہ نہیں کرسکتے - اس کی مہلت بہت تھوڑے سے آدمیوں کو ملتی ہے —

ہندوستان کے دو تہائی حصے میں ہندی بولی اور سمجھی جاتی ہے - صرف ایک تہائی حصے میں اسے پھیلانا ہے - اس لیے اگر آپ ہندی

کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے سیکھ لیں تو یہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے پچھلی مرتبہ جب میں یورپ گیا تھا تو ہالینڈ میں ایک پروفیسر نے مجھ سے اس وجہ سے معافی مانگی کہ وہ صرف بارہ زبانوں کا ماہر تھا ! اس سے قیاس کرلیجیے کہ کئی زبانیں حاصل کرنا امر محال نہیں ہے اور مغرب میں عام طور پر کئی زبانوں کے جاننے والے ملتے ہیں - سویٹزرلینڈ میں سب کو تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں - لہذا کوئی نئی زبان پڑھنے سے گھبرانا نہ چاہیے —

پبلک جلسوں کی کاروائی ہندی میں ہی ہوتی ہے - کانگریس کے اجلاسوں میں دکن والے پیچھے رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ ہندی نہیں سمجھتے - یوں بھی آپ کا ہندی سیکھنا لازمی ہوجاتا ہے —

خاتمۂ کلام سے پہلے میں ہندی اور اردو کے قضیہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں - واقعتاً یہ دونوں زبانیں ایک ہیں اور " ہندوستانی " ان دونوں کا سنگم ہے - کانگریس کے دستور عمل میں بھی ' ہندوستانی ' کا ہی نام ہے - اب صرف رسم خط کا سوال رہ جاتا ہے - اسے فرقہ وارانہ رنگ نہ دینا چاہیے - ' ہندوستانی ' کی جنم بھوم ہندوستان ہے - میں گھر پر اور اپنے دوستوں سے اُردو میں بات چیت کرتا ہوں - لیکن میں اسے ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ یہ مسلمانوں کی جائداد * ہے —

آپ کے ادارے کا نام ہندی پرچار سبھا ہے - لیکن آپ کو ہندی کا

* معلوم نہیں کہ پنڈت جی اور ان کے بعض رفقا کو یہ خیال کہاں سے پیدا ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کا ایسا خیال ہوگیا ہے - آج تک اردو کے کسی ادیب نے ایسا خیال ظاہر نہیں کیا بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کیا اچھا ہوتا اگر پنڈت جی یہ بھی فرماتے کہ یہ رائے انہوں نے کیونکر قائم کی یا کن مسلمان ادیبوں کی تحریر یا تقریر سے انہیں یہ رائے قائم کرنے کا موقع ملا -

صحیح مفہوم بھی سمجھنا چاہیے - اردو سے اس کا کوئی بیر نہیں ہے - یہاں والے اس لفظ کو آسانی سے قبول کرلیتے ہیں کیونکہ وہ سنسکرت سے قریب ہیں - ناموں پر جھگڑنا یا ان سے ڈرنا بیکار ہے - زمانہ کا رنگ یہ ہے کہ لوگ ہر نیک کام کی تخریب کے درپے رہتے ہیں - انصاف تو یہ ہے کہ ترقی کا موقع سب کو ملنا چاہیے —

(ماخوذ از هندی پرچارک)

پریم چند کے خطوط

سارے دوست پنڈت بنارسی داس چترویدی نے اپنے رسالہ "وشال بھارت" میں پریم چند آنجہانی کے خطوط کے اقتباس شایع کیے ہیں جن سے اُن کی زندگی اور کردار کے کئی پہلو روشن ہوتے ہیں - نیچے ہم ان کا ترجمہ چھاپتے ہیں:

" میری تمنائیں بہت محدود ہیں - اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں - میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں - کھانے بھی کو مل ہی جاتا ہے - موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے - ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو - اپنے دونوں لڑکوں کے لیے بھی میں کوئی منصوبہ نہیں رکھتا - صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار مخلص اور مستقل مزاج ہوں - عیش پسند ، دولت پرست اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے - میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں - ادب اور وطن کی خدمت کا

مجھے ہمیشہ دھیان ہے - یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں - " (۳ جون سنہ ۱۹۳۰ ع) -

جو" آدمی سونے روپے سے لدا ہو، میں ہرگز باور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بھی حیثیت سے بڑا ہو سکتا ہے - دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس بلند بانگ بڑبولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں - مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قایم ہے - ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا پجاری ہو - بہت ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہے - بینک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا - لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا - اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے - " (فروری سنہ ۱۹۳۵ ع) —

" میں نے سنہ ۱۹۰۷ ع میں افسانہ نویسی شروع کی تھی - ایک سال بعد "سوز وطن" کے نام سے پانچ کہانیوں کا پہلا مجموعہ زمانے پریس نے شایع کیا - ہمیر پور کے کلکٹر نے اس کتاب کے کل نسخے یہ کہہ کر جلا دئے کہ ان میں بغاوت کی بو ہے - لیکن بعد ازآں یہ مقبول ہوئے اور ان کے تراجم مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں —

آپ کے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ میرے سب سے اچھے ۱۵ افسانے کون سے ہیں - اب تک دو سو سے زیادہ افسانے لکھہ چکا ہوں ان میں سے کہاں تک انتخاب کروں یاد داشت پر بھروسہ کرکے لکھتا

ہوں : (۱) بڑے گھر کی بیٹی - (۲) رانی سارندھا - (۳) نمک کا داروغہ - (۴) سوت - (۵) زیور - (۶) کفارہ - (۷) تمنا - (۸) مندر اور مسجد - (۹) گھاس والی - (۱۰) حج اکبر - (۱۱) ستیا گرہ - (۱۲) بدنامی - (۱۳) ستی - (۱۴) لیلی - (۱۵) منتر —

میں کسی مصنف کے طرز سے خاص طور پر متاثر نہیں ہوا - پنڈت رتن ناتھ سر شار کا زیادہ اور ٹیگور کا تھوڑا سا اثر مجھ پر ضرور ہے —

آمدنی کا حال نہ پوچھیے - پرانی کتابوں کا کاپی رایٹ ناشروں کو دے دیا - 'پریم پچیسی' 'سیوا سدن' (بازار حسن کا هندی نام) 'کنج عافیت' 'زاد راہ' وغیرہ کے لیے هندی پستک ایجنسی نے یک مشت تین ہزار روپے دیے تھے چوگان ہستی کے هندی ایڈیشن کے لیے ۱۸ سو مل گئے - باقی مجموعوں کے لیے سو دو سو سے زیادہ نہیں ملا - اپنی نئی کتابیں هندی میں میں نے خود شایع کیں لیکن ان سے بمشکل چھ سو روپے وصول ہوئے - متفرق مضامین سے ماہانہ بیس پچیس روپیے مل جاتے ہیں - اردو سے اب تک دو ہزار روپیے ملے ہوں گے - 'چوگان ہستی' اور کنج عافیت - دونوں آٹھ سو میں دے دئے تھے - کوئی ناشر ہی نہ ملتا تھا " —

صوبۂ برما اور اردو

برما کی سرکاری رپورٹوں کے مطابق وہاں هندوستانی بولنے والوں کی تعداد ۳۵۲۳۹۸ ہے حکومت کی نظر میں هندوستانی اردو کا دوسرا نام ہے لہذا ' سنہ ۱۹۲۰ ع میں ہی اردو بطور اختیاری مضمون درس

میں داخل کرلی گئی اور اس کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا۔ اس وقت تقریباً دو سو اسکول اردو سکھانے کے لیے موجود ھیں اور ان کی نگرانی تین ڈپٹی انسپکٹروں کے سپرد ھے —

ایک ھندی کے پرچارک کا بیان ھے کہ برما میں ھندی کی تحریک آریہ سماجیوں نے شروع کی - اب ھندی کے ۱۲ اسکول قائم ہوگئے ھیں اور اسے پھیلانے کی کوشش چند بودھ سادھو بھی کر رھے ھیں - اردو کا ایک ٹیچر ٹریننگ اسکول بھی کھل گیا ھے —

افکار و واقعات

اردو کے چند ادیبوں کی وفات

گزشتہ سال میں اردو کے بعض ایسے ادیب اس دنیا سے چل بسے جنھوں نے زبان کی قابل قدر خدمت کی تھی - پنڈت شیو نراین شمیم اردو کے پرانے انشا پرداز اور شاعر اور مولوی نورالحسن مولف نور' للغات کے انتقال پر اظہار افسوس کیا جا رہا تھا کہ اسی اثنا میں منشی پریم چند اور اس کے بعد اصغر گونڈوی کے انتقال کی خبر پہنچی —

منشی پریم چند اردو اور ہندی دونوں کے ادیب تھے اور دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے - اردو میں جدید طرز کی مختصر افسانہ نویسی کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی - ان کے بعض افسانے ایسے ہیں کہ جب تک اردو زبان ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور شوق سے پڑھے جائیں گے - علاوہ اس کے وہ اپنے پاکیزہ خیالات اور اعلیٰ سیرت کی وجہ سے ملک میں بہت مقبول تھے - وہ بڑے زندہ دل ملنسار منکسر' بے ریا اور مخلص تھے - سوائے خاص حالات کے وہ کبھی بحث و تکرار میں نہیں پڑتے تھے - بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسے میں جو ناگپور میں ہوا تھا وہ اگرچہ زیادہ تر خاموش رہے مگر اس کے فیصلے سے خوش نہیں تھے - پرشد نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا - رسالہ ہنس پرشد نے لے لیا تھا لیکن اڈیٹر بدستور منشی صاحب مرحوم ہی رہے صرف ان کے ساتھ مسٹر کنھیالال منشی کے نام کا اضافہ ہوگیا تھا - چھپتا بھی انہیں کے مطبع میں تھا -

بعد میں پرشاد نے یہ فیصلہ کیا کہ بجاے بنارس کے دہلی میں چھپا کرے - وجہ یہ بتائی کہ دہلی میں کسی قدر سستا چھپے گا - منشی جی بڑے غیور تھے انہیں یہ بات بہت ناگوار ہوی اور اس کا بہت صدمہ ہوا - مرنے سے قبل انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ وہ دلی سے ایک مختصر رسالہ خاص ہندوستانی زبان میں نکالنا چاہتے ہیں لیکن مصارف کی طرف سے متردد تھے - اس کا میں نے اطمینان دلایا تھا کہ خرچ کی فکر نہ کیجیے وہ مجھ پر چھوڑ دیجیے لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور ایک ایسا شخص ہم میں سے اٹھ گیا جس کا ہمیں مدت تک افسوس رہے گا —

اصغر گونڈوی بہت سلیم الطبع اور بلند خیال شخص تھے - یہی طبیعت کا رنگ ان کی شاعری میں بھی پایا جاتا تھا - اس سال ہندوستانی اکیڈیمی میں ان کی جگہ خالی دیکھ کر بہت قلق ہوا - ان کی شاعری اردو نظم میں خاص درجہ رکھتی ہے - وہ بہت شریف النفس ' مرنج و مرنجاں سچے دوست تھے —

گزشتہ دسمبر میں میرے عزیز اور قابل شاگرد اور مددگار شیخ چاند ایم - اے ' ال - ال - بی ' ری سرچ سکالر جامعۂ عثمانیہ کا انتقال ہوگیا - وہ بہت ہونہار نوجوان تھا اور اس کا شمار جامعۂ عثمانیہ کے قابل ترین طلبہ میں تھا - وہ بہت ہی اچھا ادبی ذوق رکھتا تھا اور بہت شستہ اور صاف نثر لکھتا تھا - محض اپنی محنت اور شوق سے اس نے اردو ادب کے متعلق وسیع معلومات حاصل کی تھیں - اس کی تحریروں کو ابھی سے مقبولیت حاصل ہوگئی تھی - اس کا تحقیقی مقالہ سوداؔ کے کلام وحیات پر اس کی ادبی تحقیق کی زندہ یادگار ہے - مقالہ چھپ چکا ہے لیکن افسوس کہ اس کی زندگی میں شایع نہ ہوسکا - وہ شروع

سے میرے ساتھ تھا اور آخر تک میرے ساتھ کام کرتا رہا- اس جوان مرگ کی موت کا مجھے بہت صدمہ ہے - اس سے بڑی بڑی توقعات تھیں لیکن اس کی بے وقت موت سے سب پر پانی پھر گیا- ابھی اس نے زندگی کی تین منزلیں کی تھیں کہ داغ مفارقت دے گیا اور افسوس کہ اردو کا ایک اور خادم کم ہوگیا —

انجمن کی شاخیں

انجمن ترقیء اردو کی اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑہ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اردو داں طبقہ اپنی زبان کی ترقی اور اشاعت کی طرف زیادہ مائل ہوچلا ہے- ہمارے پر جوش اور مستعد دوست محمد بہلول خاں دانا صاحب نے چومون (چےپور) میں انجمن ترقیء اردو کی بنیاد ڈال دی ہے -یہ اردو کے بڑے زبردست حامی اور بڑے مستعد کام کرنے والے ہیں- چنانچہ مہاتما گاندھی سے ان کی مراسلت اردو کے متعلق اخباروں میں شایع ہوچکی ہے - ہمیں قوی امید ہے کہ یہ انجمن راجپوتانہ میں مفید کام کرے گی —

ایک دوسری انجمن بالاپور (برار) میں الحاج خان بہادر سید محمود صاحب قادری جاگیردار اور مولوی سید شاہ امام صاحب نقشبندی جاگیردار کی سرپرستی میں قائم ہوی ہے اس کے صدر سید آل محی الدین صاحب ہادی نقشبندی جاگیردار اور ناظم غلام صوفی حیدری صاحب اور نائب ناظم حکیم محمد معصوم ارماں صاحب ہیں- انجمن کے معزز صدر ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور اپنے صوبے میں ہر دلعزیز اور محترم ہیں-اس انجمن کے بڑے بڑے منصوبے ہیں جن پر عملدرآمد

کی کوشش کی جارہی ہے —

دائرۂ ادبیہ پشاور نے بھی جس کے ناظم عبدالودود خاں صاحب قمر بی - اے ہیں' اپنا الحاق انجمن سے منظور کر لیا ہے - اور وہ ان مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے کوشش کررہے ہیں جو انجمن کی شاخوں کے لیے قرار دیے گئے ہیں —

بدایوں میں مولوی سید محفوظ علی صاحب بی - اے کی سعی سے انجمن کی ایک شاخ قائم ہوی ہے - اگرچہ اس وقت کونسل کے انتخابات کی وجہ سے فوراً کوئی عملی کارروائی شروع نہیں ہوی لیکن سید صاحب اور ان کے ہم خیال رفقا کے جوش اور مستعدی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کامیابی سے کام کرے گی —

میں ابھی ناگپور گیا تھا - وہاں بھی انجمن کی ایک شاخ قائم ہوئی ہے - یہ حکیم مولوی اسرار احمد صاحب کی سعی کا نتیجہ ہے - حکیم صاحب بہت ہی پر جوش اور مخلص کام کرنے والے ہیں - انجمن کے صدر ہمارے قدیم اور ممتاز دوست خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب بی - اے ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر اور سکرٹری عبدالجبار خاں صاحب سکرٹری مسلم صدر لائبریری ناگپور ہیں - ناگپور وہ مقام ہے جس نے ہمیں بیدار کیا ہے اس لیے وہاں ایک مستقل اور مضبوط انجمن کی ضرورت ہے اور مجھے انجمن کے قابل ارکان سے یہ توقع ہے کہ وہ اسے حقیقی انجمن ثابت کرنے کی کوشش کریں گے - ناگپور میں پہلے سے اردو کے تین کتب خانے موجود ہیں جو برائے نام نہیں بلکہ کام کر رہے ہیں اور روزانہ لوگ وہاں مطالعہ کے لیے آتے ہیں —

پھر وہی ہندی اردو کی بحث

گذشتہ دسمبر میں کاکا کالیکر صاحب لاہور تشریف لے گئے تھے - وہاں میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کے مکان پر ایک مختصر سی صحبت میں میاں صاحب، مولانا ظفر علی خاں اور کاکا کالیکر کے درمیان زبان کے مسئلہ پر بہت دلچسپ گفتگو رہی - اس کے چند آخری جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں —

مولانا - چوتھی جو قومیت کے لیے ضروری ہے وہ زبان ہے -

کاکاجی - اسی لیے تو ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کی قومی زبان ایک ہو جائے -

مولانا - تو آپ کے نزدیک وہ کون سی زبان ہے ؟

کاکاجی - یہی جو ہم آپ بولتے ہیں —

مولانا - میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا نام کیا ہے —

کاکاجی - ہندی -

مولانا - اور اس کا نام اردو کیوں نہیں —

کاکاجی - یہ ایک فرقے کی زبان کا نام بن چکا ہے اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے —

کاکاجی کا یہ فرمانا کہ اردو ایک فرقے کی زبان کا نام بن چکا ہے اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے صریحاً غلط ہے - جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں وہ اکثر اس غلطی میں پڑ جاتے ہیں - اردو خالص ہندستانی زبان ہے اور یہیں کی پیداوار ہے اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو تھے - ہم اس موقع پر اس مسئلے پر بحث کرنا نہیں چاہتے اور ناظرین کو صرف اس خط کے پڑھنے کی زحمت دینا چاہتے ہیں جو بابو سندر لال صاحب نے مہاتما گاندھی کو اس بارے میں لکھا تھا اور جو یہاں نقل کیا جاتا ہے -

بابو صاحب نے اس میں بڑی سچی سچی باتیں لکھی ہیں - اگر ہمارے ملک میں جلد ایسے انصاف پسند، بے لاگ اور شریف النفس شخص اور پیدا ہو جائیں تو زبان کا یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے چک جائے -

---

بابو سندر لال صاحب کا خط مہاتما گاندھی کے نام

پہلی اگست کے ہریجن سیوک میں میں نے آپ کا لیکھ (مضمون) غلط فہمیوں کی گتھی پڑھا تھا - اسی وقت آپ کو کچھ لکھنے کا مجھے خیال ہوا تب سے اب تک کئی بار یہ خیال ذہن میں آیا - لیکن کئی سببوں سے سنکوچ (جھجھک) کر کے رہ گیا - حال میں ایک دوست نے مجھے لاہور کے اردو روزانہ انقلاب کا ۳۰ مئی کا پرچہ لاکر دیا جس میں اکھل بھارتیہ ساھتیہ پرشد، کے ناگپور اجلاس کے بارے میں مولانا عبدالحق کا لمبا خط چھپا ہے، ظاہر ہے یہ خط آپ نے دیکھا ہے اور جن کترنوں کو سامنے رکھ کر آپ نے اپنا لیکھ (مضمون) لکھا ہے - ان میں یہ خط بھی رہا ہوگا - محض اپنا فرض سمجھ کر میں آج یہ لمبا خط لکھ رہا ہوں، آپ کے لیکھ (مضمون) کی نیچے لکھی ہوئی باتوں کی طرف میں آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں -

( ) "اردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا" یہ بات ٹھیک نہیں ہے - اردو زبان کی تاریخ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ نام اسی طرح خود بخود اس سے پہلے کی ہندی یا ہندوی کے ساتھ بہت سے ایسے عربی، فارسی، ترکی شبدوں (لفظوں) اور محاوروں کے میل سے بنی ہوئی زبان کے لیے رائج ہونے لگا جو لشکری لوگوں میں بولے جاتے تھے - یہ سلسلہ بالکل قدرتی تھا - کسی بھی خاص مطلب سے کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا - اس کے بعد عرصے تک اس نئی ملی جلی اور مروجہ زبان کے لیے ہندی اور

هندوی شبد (لفظ) بھی استعمال ہوتے رہے، یہ دونوں نام بھی مسلمانوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں مسلمانوں ہی نے پہلے پہل اس زبان کو جو ان سے پہلے هندوستان کی راجدھانی کے آس پاس بولی جاتی تھی، هند سے هندی یا هندوی کہنا شروع کیا - اسے اپنا یا اور اسے ترقی دی - بعد میں جب اس زبان میں فارسی، عربی، ترکی سے کچھہ شبد (لفظ) اور محاورے مل کر اس کا روپ (شکل) بدلا تو هندی نام کی جگہ صرف اردو نام کا استعمال ہونے لگنا بھی ایک قدرتی چیز تھی - آپ جانتے ہی ہیں فارسی میں (اردو) لشکر یا لشکر گاہ کو کہتے ہیں - اسی سے دلی میں اردو بازار تھا جہاں اس نئی زبان نے شکل اختیار کی - مشہور شاعر غالب نے سنہ ۵۷ ء کے بعد کی دلی کی بربادی کو بیان کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے - "دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے چلے جاتے ہیں واہ رے حسن اعتقاد ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاونی ہے" —

(۲) هندی اور اردو ان دونوں شبدوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور ان کے مصدری معنی کچھہ بھی ہوں، اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ آج یہ دونوں نام هندوستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لیے استعمال ہورہے ہیں - اور ان کے دو صاف الگ الگ مروجہ معنی ہیں - ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنانا چاہتے ہوں انہیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا - میں سمجھتا ہوں اس سچائی کو محسوس کر کے بھی آپ نے خود کچھہ سال پہلے " هندوستانی " (لفظ) کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا - پھر اب وہ حالت بدل گئی ـ

(۳) آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر " اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اردو والے) بھاشا (زبان) کا ویاکرن (قواعد) بھی بدل دیتے ہیں " مجھے اور بھی دکھ اور حیرانی ہوئی پچھلے پانچ سات سو برس کے اندر اندر کی ہندوستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اچھی کھوج (تحقیق) گذشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ہے شاید کسی دوسرے نے نہیں کی ۔ اس کے علاوہ اگر آپ اردو ہندی دونوں کے ودوان (عالم) منشی پریم چند سے دریافت کرلیتے تو آپ کو معلوم ہوجاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے - مجھے خود کم سے کم اٹھائیس سال سے آج کل کی اکثر ہندی (اس شبد (لفظ) کا استعمال میں مروجہ ہی معنے میں کررہا ہوں) مصنفوں سے اس معاملہ میں کافی شکایت ہے —

شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندی ہندوستان کے کسی بھی ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے - الہ آباد کے تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ پنڈت (کاشمیروں کو چھوڑ کر) جب اپنے گھروں میں بات چیت کرتے ہیں - " ہمرے دوارے اک مہرارو کھڑی با " (ہمارے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے) بنارس کے پنڈت تو اور بھی عجیب زبان بولتے ہیں - جس کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں - ان الہ آبادی اور بنارسی زبانوں کا ویاکرن (قواعد) ہندی یا اردو کے ویاکرن سے بالکل ایک مختلف چیز ہے - کشمیری بلاشبہ خالص ہندوستانی بولتے ہیں - لیکن اگر ان کی بول چال کی زبان کو اردو یا ہندی دونوں میں سے ایک نام دینا پڑے تو وہ اردو ہے ہندی نہیں - اگر آپ کسی ان پڑھ کشمیری بڑھیا کو پکڑ کر اُسے کسی اردو اخبار کا ایک کالم پڑھ کر سنائیں' اور پھر اسی طرح مضمون پر کسی ہندی سماچار پتر (اخبار)

کا ایک کالم سنائیں تو جتنا اردو اخبار سے اس کے پلے پڑ سکے گا اُتنا هندی سماچار پتر سے نہیں پڑے گا- برخلاف اس کے آج کل کی اردو بلاشبہ کچھہ مقاموں کی بول چال کی زبان ہے - لکھنؤ ' دلی ' میرٹھہ ' مراد آباد اور آس پاس کے کچھہ علاقوں میں بھی خالص اردو بولی جاتی ہے - دلی' میرٹھہ کی مہترانیاں بھی خالص اردو بولتی ہیں- لکھنؤ اور دلی کی زبانوں میں بھی فرق ہے- لیکن وہ اتنا باریک ہے کہ بڑے سے بڑے ودیشی یا دیگر صوبوں کے عالم بھی کبھی کبھی اُسے نہیں پکڑ پاتے —

آپ کی اجازت سے میں اپنے هی گھر کی مثال دینا چاهتا هوں- میری دادی مہابن کی رهنے والی تھیں جو برج کا مرکز ہے ' اور آن پڑھ تھیں - ماں دلی کی تھیں اور صرف ناگری حروف پڑھ سکتی تھیں - میرے گھر میں ٹھیک یہی زبان بولی جاتی تھی ' جس میں میں یہ خط لکھہ رھا ھوں - محض دو باتوں میں فرق تھا- ایک تو سنسکرت شبدوں کی جگہ اردو فارسی سے زیادہ عام فہم الفاظ تھے' اور دوسرے وہ زبان زیادہ بامحاورہ تھی ' میری زبان ادھر اُدھر گھومنے اور هر طرح کی چیزیں پڑھنے کی وجہ سے کھچڑی هوگئی ہے- میری ان پڑھ دادی رِن نہیں سمجھتی تھیں- قرضہ سمجھتی تھیں - بدھائی کی بجائے ان کی زبان پر مبارکباد زیادہ چڑھا هوا تھا اور ' منش ' جیو ' پرتھوی ' دشا وغیرہ کی جگہ ' آدمی ' زبان ' زمین ' اور حالت لفظوں کا استعمال کرتی تھیں - یہی زبان میری ماں کی زبان تھی —

اگر اردو اور هندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچی ہے کہ هندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ہے ' اُردو ہے - یہاں میرا مطلب کھڑ بولی هندی سے ہے- برج بھاشا یا اودھی تو ویاکرن (قواعد) کے خیال سے هندی اُردو سے بہت دور هیں - اسی لیے مولانا

عبدالحق نے ناگپور میں آپ سے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں ہیں - یہ بھی بالکل سچ ہے کہ آج کل کی ہندی زیادہ تر کتابی اور بناوٹی زبان ہے - کچھہ تو فرقہ وارانہ جذبہ اور زمانۂ قدیم کی طرف جانے کی خواہش، کچھہ ایک قومی زبان تعمیر کرنے کا خیال، اور کم سے کم شروع میں ایک حد درجہ تک حکام کے خود فرمانہ اشارے اور ان کی مدد، ان تمام چیزوں کے سہارے پچھلے تیس چالیس سال سے ملک میں رائج کی جارہی ہے - اس کے مقابلے میں اردو ایک زیادہ قدرتی اور زندہ زبان ہے - ہیں دونوں اس ملک کی پیدایش - رہا سوال ویا کرن (قواعد) کا - آج کل کی ہندی کو اپنا ویا کرن اور ڈھانچا ظاہر ہے، اردو ہی سے لینا پڑا - اودھی یا برج بھاشا ایک آٹھہ سو سال پہلے کی ہندی سے نہ تو اپنا ویا کرن لے سکتی ہے اور نہ وہ چل سکتا ہے، اس نے ایسا ہی کیا تھا - اس وقت اردو اور ہندی کا ویا کرن (قواعد) اور ڈھانچا ایک ہی ہے اور ایک ہی ہونا چاہیے اور اس سے کبھی آئندہ ایک ہندوستانی زبان کے جنم کی امید ہوسکتی ہے - لیکن ہندی کے کچھہ ایسے ودوان (عالم) جو گھروں میں الہ آبادی، بنارسی، اودھی وغیرہ بولتے ہیں، یعنی جن کی مادری زبان نہ ہندی ہے نہ اردو، کئی طرح سے ہماری اس ہندوستانی زبان کے بنے بنائے ویاکرن کو خراب کر رہے ہیں مثلاً تذکیر و تانیث میں یہ لوگ اکثر سنسکرت لغت سے شبدوں کے تذکیر و تانیث کا پتہ لگاکر ہندی میں اسی طرح رائج کرنے کی خلاف قدرت کوشش کرتے ہیں اور بھی کئی چیزیں ہیں - لیکن میں ان کی وضاحت میں آپ کا زیادہ وقت

نہیں لینا چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہماری زبان ایک اعلیٰ زندہ زبان ہے جو ہزاروں سال میں آہستہ آہستہ اس روپ تک آئی ہے اور آئندہ بھی بدلے گی۔ لیکن سنسکرت وہ نہیں ہے نہ اس کا ویاکرن سنسکرت ویاکرن ہے۔ سنسکرت میں تین وچن (صیغے) ہیں۔ ہندی میں دو سنسکرت میں ماتا اور پتا دونوں کے لیے ایک (کچھتی) سے کام چل جاتا ہے ہندی میں ہم دو علیحدہ علیحدہ فعل استعمال کرتے ہیں۔ وغیرہ —

ہاں کچھ مصنف ہر زبان کے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ویاکرن کے قاعدوں سے بندھنا نہیں چاہتے - ان میں کچھ اعلیٰ مرتبے کے ہوتے ہیں جنہیں ایسا کرنے کا اختیار بھی دیا جاسکتا ہے - مثلاً ہندی میں مرحوم بالکشن کرشن بھٹ - لیکن اگر یہ قصور ہے تو جہاں تک سمجھ معلوم ہوتا ہے ہندی یا اردو کا کوئی قدیم یا حال کا ادیب اس معاملے میں شاید اتنا قصور وار نہیں ہے جتنا مرحوم بھٹ جی -

اردو کے بہت سے ادیب اردو لفظوں کی فارسی عربی جمع کا استعمال ضرور کرتے ہیں - یہ رواج اتنا ہی غلط کہا جاسکتا ہے جتنا ہندی میں سمیک روپین لکھنا یا پاخانہ کی جگہ شوچالیہ لکھنا۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ اردو میں فی زمانہ کافی ادیب اس طرح کے ہیں جو اس رواج کی کھلی مخالفت کرتے ہیں لیکن پھر بھی وکیلوں کی جگہ وکلاء لکھنے سے ہمارا ویاکرن (قواعد) اتنا نہیں بدلتا جتنا وایو (ہوا) بہہ رہی ہے کی جگہ وایو بہہ رہا ہے کہنے سے اس لیے کیونکہ سنسکرت میں وایو مذکر ہے —

(۴) آپ نے لکھا ہے "مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی - ہندوستانی کے بجائے صرف ہندوستانی یا ہندی اردو کے پھر لوگ (استعمال) کا

پرستاؤ (لحاظ) رکھا تھا - مجھے تو ان دونوں میں کوئی اعتراض نہیں ہے - لیکن بھارتی ساہتیہ پریشد اپنے جنم (پیدایش) کو نہیں بھول سکتا... اسی لیے شبد (الفاظ) کا رکھنا ضرور ہوگیا —

اگر بھارتی ساہتیہ پریشد ہندی ساہتیہ سمیلن کا ایک بچہ ہے اور اسی طرح سے کام کرنا چاہیے تو آپ کی باقی بات تو ٹھیک ہے - پھر بھی غنیمت ہے کہ آپ کے اثر سے انہوں نے محض "ہندی" کی جگہ ہندی ہندوستانی رکھنا منظور کرلیا - اور اگر جس زبان میں وہ استعمال کریں وہ سچ ہندوستانیت کے کچھ نزدیک آوے تو خوش قسمتی کی بات ہوگی - لیکن مولانا عبدالحق کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمی اس بارے میں ہوگئی جو اردو ادیب وہاں آئے تھے وہ غلط امیدیں باندہ کر آئے تھے - میں بڑے سنکوچ (جھجھک) کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ شاید انہیں دعوت دینے میں بھی بے احتیاطی ضرور ہوئی - ملک کی بڑی بھی خوش قسمتی ہوتی اگر آپ کی رہنمائی میں کوئی ایسی ہندوستانی ساہتیہ پریشد قایم ہو سکتی جو اپنے رسالوں اور کتابوں میں ہندوستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتی اور جس کی چیزیں ناگری اور فارسی دونوں حروف نکل کر ہندی اور ارد دونوں کے پڑھنے والوں کو آہستہ آہستہ ہندوستانی زبان کی طرف لائیں —

باپو جی! میں نے عبدالحق صاحب کے خط اور آپ کے لیکھ (مضمون) دونوں کو ملا کر پڑھا - جو شکوک اس خط سے پیدا ہوتے ہیں - آپ کے لیکھ (مضمون) سے وہ رفع نہیں ہوتے - میں آپ سے پرارتھنا (التجا) کروں گا کہ آپ پھر ایک مرتبہ اس خط کو دیکھیں - اور اگر ہوسکے تو آپ بھی اس کے شبہوں کو رفع کریں - جس طرح سے انہوں نے واقعات

کو بیان کیا ہے اُس میں غلطی ہوسکتی ہے - ان کی رائے بھی کم سے کم میں تو ہر بات میں ماننے کو نہیں تیار ہوں - لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خط دکھے ہوئے دل سے اور نیک نیتی کے ساتھہ لکھا گیا ہے - ان کے شکوک رفع ہونے چاہئیں تھے - میں صرف ایک مثال دوں گا —

اس خط کے مطابق آپ نے کہا تھا - " اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے - قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے - اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا - مسلمان چاہیں تو اُسے رکھیں اور پھیلائیں " —

اگر رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو سمجھا گیا - مجھے معلوم ہے کہ گجرات کے مسلمان اُردو کو اپنی مذہبی زبان کہتے ہیں - میں یہ بھی اندازہ کرسکتا ہوں کہ جب سے اُردو ہندی کا یہ بدقسمت جھگڑا چلا دوسرے صوبوں میں اردو کے بہت سے مسلمان مبلغ اُردو کو اپنی مذہبی زبان کہہ کر اس کی تبلیغ کرتے ہوں گے - یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ خالص ادبی سوال فرقہ وارانہ سوال بن گیا - لیکن ان باتوں سے واقعات نہیں بدل سکتے - اُردو نہ نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے ، اور نہ کبھی تھی - وہ محض اس ملک کے لاکھوں رہنے والوں کے حق میں ہندو ، مسلمان ، عیسائی اور جین سب شامل ہیں - قدرتی اور مادری زبان ہے - اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا مسلمانوں نے اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اس پر ویسا ہی فخر ہے جیسا کہ مسلمان کو ہوسکتا ہے - ہندی میں تو رامائن بھی ہے جسے کم سے کم شمالی ہند کے لاکھوں ہندو اپنی ویسی ہی مذہبی کتاب مانتے ہیں جیسی کسی دوسری

کتاب کو - اردو میں تو مسلمانوں کی کوئی اس طرح کی کتاب بھی نہیں ہے - آپ کو شاید معلوم ہوکہ بہت سے کٹر مسلمان مولویوں کو قرآن کے اردو میں ترجمہ ہونے پر سخت اعتراض تھا اور کچھہ کو آج تک ہے - آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہوکہ شمالی ہند میں کم سے کم ہزاروں ہندو گھر ابھی تک ایسے ہیں جہاں دسہرے کے دن پوجا کے وقت پورب کا بردا اور پچھم کا گھوڑا ' اُتر کا تیر اور دکھن کا چھر ' یا ان سے ملتے جلتے الفاظ کاغذ پر اردو حرفوں میں لکھے جاتے ہیں - اب اگر اسی طرح کے لوگوں کو دھرم سے گرا ہوا کہہ کر علیحدہ کردیا جاے یا مہلک تنگ خیالی کے اثر میں ہم ان طریقوں کو بدلنے کی کوشش کریں تو دوسری بات ہے —

یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے . اگر ہم اردو کو قرآن کے حرفوں میں لکھنے کی کوشش بھی کریں تو معمولی حرفوں کی شکلیں تو کافی بدل ہی جاویں گی - ہمیں پڑوسی کو فروسی لکھنا پڑے گا - چاند کو جاند اور گاے کو کاے ' یا غاے ' کھانا کو کانا وغیرہ آج کل کے فارسی حروف جن میں ہندوستانی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کچھہ نئی علامتیں جوڑ کر اردو لکھی جاتی ہے عربی حروف (خط نسخ) سے صدیوں پہلے کی ایجاد ہیں - دونوں میں تو مشابہت بھی ہے - لیکن مشابہت تو گجراتی ' بنگلا اور ناگری حرفوں میں بھی کافی ہے - آوازیں تو بالکل وہی ہیں - اس کی بنا پر یہ کہنا تو شاید ٹھیک نہ ہوگا کہ گجراتی اور بنگالی رگ وید کے حرفوں میں لکھی جاتی ہیں —

یہ بات الگ ہی رہی کہ کسی خاص کتاب کے حروف میں لکھی

جانے کی وجہ سے بھی کوئی زبان کسی خاص جماعت کی زبان نہیں بن جاتی —

اوپر کے اقتباس کی باقی باتیں بھی اسی طرح حقیقت کے خلاف ہیں —

اردو ادب سے واقف اور اس کے پریمیوں میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تھوڑے بہت ہندو تک بھی ہیں جنھیں اس بات پر قدرتی دکھ ہوتا ہے کہ اس اردو ہندی کے سوکو بھی خالص فرقہ وارانہ شکل دی جاوے - آپ کی طاقت اس بارے میں بہت ہے اور میری عاجزانہ پرارتھنا (التجا) ہے کہ آپ اس غلط میلان کو ہوسکے تو روکیں —

اس کے علاوہ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ اردو کے مسلمان ادیبوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دل سے آپ کے مقصد کی قدر کرتے ہیں - اور اس کے مطابق عمل کرنے کرانے کی بھی کوشش کرتے رہے ہیں - بہت سے ایسے ہیں جو اگرچہ اپنی اخلاقی کمزوری کے وقت یا کسی دوسری وجہ سے سیاسی تحریک میں مناسب حصہ نہیں لے سکتے تاہم اپنے میدان میں قومی اتحاد کو قائم کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں جی جان سے کوشش کرتے رہے ہیں - اردو رسالوں میں ودوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھہ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں (لفظوں) کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے - ایک مسلم اردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا - آپ کو تعجب ہوگا - ودوان (ذی علم) اڈیٹر نے جواب دیا " میں حجازی اردو سے اپنے رسالے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا " اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھہ آج کل اردو رسالوں میں ہورہا ہے کسی ہندی رسالے میں نہیں

ہو رہا ہے - لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اردو نظم و نثر دونوں کے کچھ نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کے کانووکیشن اڈریس میں نقل کیے تھے چاہیں آپ اگر جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالہ میں شایع کرادیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ اُردو سے لیے گئے ہیں - یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں - مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جاسکتا جسے اگر جوں کا توں چھاپ دیں تو محض اردو پڑھ سکنے والا اُسے اردو پڑھ کر اردو ہی سمجھے - آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سندر (خوبصورت) ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا ' دونوں سمجھے تھے - لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے 'جامعہ' میں چھپی ہے وہ وہ چیز نہیں ہے —

مولانا سلمان ندوی جیسے ودوان (ذی علم) جنھوں نے اپنی یوم النبی کی چھپی ہوی تقریر میں بجاے حضرت محمد کے سوامی محمد لکھا ہے ' برسوں سے زوروں کے ساتھہ کھلے طور پر کوشش کررہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہئیے بلکہ اردو کی جگہ اسے ہندوستانی کہنا چاہیے - رسم الخط کا سوال علیحدہ ہے - ان قابل تعریف کوششوں کی کچھہ جھلک آپ کو عبدالحق صاحب کے خط میں بھی مل سکتی ہے - یہ سب کافی حد تک آپ ہی کے پریم (محبت) اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا - مگر ناگپور سے اب تک نہ جانے کیا ہوا بہت نے اس طرح کے سچے اور سلجھیدہ مسلمان کام کرنے والوں کے دل بھی شکوک اور مایوسی سے

ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جو اپنے دکھہ کو اپنی زبان تک بھی لانا نہیں چاہتے —

خط بند کرنے سے پہلے رسم الخط کی بابت بھی اپنا خیال آپ کے سامنے رکھدوں - بہت دنوں سے لوگ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں، مثلاً بابو راماننَد چٹرجی وغیرہ —

میں سنہ ۳۶ ع کے شروع تک اس کے خلاف رہا - لیکن اب کچھہ رائے بدلتی جارہی ہے - دلیلوں میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا —

آپ کا خادم

سندر لال

۶۲ چوک

الہ آباد

۲۴ — ۹ — ۳۶

ھندی کا پرزور پروپاگنڈا

گزشتہ ماہ اکتوبر میں غیر ھندی صوبوں میں ھندی زبان کی اشاعت کے لیے ایک بہت بڑا جلسہ یونیورسٹی کانوکیشن ھال ناگپور میں زیر صدارت سر ھری سنگھ گور وائس چانسلر ناگپور یونیورسٹی کیا گیا —

بابو راجندر پرشاد صدر آل انڈیا ھندی پرچار سبھا نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی —

" ۱۸ سال سے زائد ھوتے ھیں کہ ھندی ساھتیہ سمیلن نے اندور کے اجلاس میں زیر صدارت مہاتما گاندھی یہ قرارداد منظور کی تھی کہ غیر ھندی داں صوبوں میں ھندی زبان کی اشاعت کا کام کیا جائے - چنانچہ احاطۂ مدراس میں یہ کام شروع کیا گیا - ابتدا میں سمیلن نے اس کے تمام اخراجات کی کفالت کی اور اس کام کے لیے شمالی ھند سے بہت سے نوجوان جنوبی ھند میں بھیجے گئے - اس اثنا میں جنوبی ھند کے کچھ پر جوش صاحبوں نے ھندی سیکھ لی اور اس کام میں شریک ھوگئے —

کچھ عرصے بعد یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہ کام مقامی اصحاب ھی کے ھاتھوں میں چھوڑ دیا جائے - چنانچہ ایک مجلس دکشنا بھارت پرچار سبھا کے نام سے مدراس میں قائم کی گئی - اور اس کے مبلغوں نے تمام احاطۂ مدراس نیز اس کے علاوہ بھی ان علاقوں

کا دورہ کیا جہاں جنوب کی چاروں زبانوں یعنی تلنگی ' تامل '
کنڑی ' ملایا آلم میں سے کوئی بھی زبان بولی جاتی تھی - درسی کتابیں
لکھی گئیں اور شایع کی گئیں اور ہندی کے امتحانات مقرر کیے گئے -
ایک مطبع قائم کیا گیا جس میں ریڈریں ' صرف و نحو اور لغت کی
کتابیں ' اور ایک ماہانہ رسالہ ہندی سیکھنے والوں کے لئے شایع کیا جانے
لگا - یونیورسٹیوں ' مقامی اداروں اور افسران تعلیمات کو اس امر
کی ترغیب دینے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے اپنے نصابوں میں ہندی
کو داخل کریں * —

دکشنا بھارت ہندی پر چار سبھا کی اس سعی کا یہ نتیجہ ہوا کہ
وہ اس عرصے میں ۶ لاکھ اشخاص کو ہندی سکھانے میں کامیاب ہوئی
جن میں سے 55 ہزار نے امتحان میں بیٹھ کر قابلیت کا صداقت نامہ
حاصل کیا - اس سبھا نے گیارہ لاکھ سے زائد کتابیں چھاپیں اور فروخت کیں —

یہ بات بہت قابل مسرت ہے کہ مردوں سے زیادہ عورتوں کو ہندی
پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا ہے - اور صرف لڑکوں اور لڑکیوں ہی میں یہ
شوق پیدا نہیں ہوا بلکہ بڑی عمر کے مرد اور عورتیں بھی ہندی زبان
بڑے شوق اور انہماک سے سیکھ رہی ہیں - اس تمام عرصے میں سات لاکھ
روپیہ خرچ ہوا اس رقم کا ۱۵ فی صدی حصہ اسی صوبے (مدراس)
سے فراہم کیا گیا —

جب ایسے صوبوں میں جہاں ہندی اور مقامی زبانوں میں شدید
اختلاف ہے اور مشکلات کا سخت سامنا ہے ' یہ کامیابی دیکھی گئی تو

* اس کوشش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس گورمنٹ نے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے
امتحان میں ہندی زبان کو بھی داخل کرلیا (اڈیٹر) -

ساہتیہ سمیلن کے اجلاس ناگپور (اپریل سنہ ۱۹۳۶ ع) میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندی کی اشاعت کے کام کو دوسرے غیر ہندی داں صوبوں میں پھیلایا جائے - یہ علاقے مہاراشٹر ' گجرات ' سندھ ' بنگال ' آسام اور اُتکل ہیں - علاوہ ان کے ہندوستان کے اصلی باشندوں کی ایک بڑی آبادی ہے جو مختلف صوبوں میں پھیلی ہوی ہے اور زیادہ تر سنتھال پرگنہ اور چھوٹا ناگپور اور صوبۂ بہار میں ہے - یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر ان میں ہندی کا رائج کرنا ضروری ہے - اس غرض کے لیے سمیلن نے ایک خاص کمیٹی قائم کی ہے جس کا دفتر وردھا میں ہے اور وہ ان صوبوں میں اس مقصد کے لیے مجلسیں قائم کررہی ہے اور جہاں پہلے سے قائم ہیں انہیں مضبوط بنارہی ہے - مسٹر ستیا نرائن جو آندھرا دیس کے رہنے والے ہیں اور جنہیں دکشنا بھارت ہندی پرچار سبھا میں رہ کر اس کام کا خاص تجربہ حاصل ہے ' اس کے سکرٹری اور مسٹر شریمان نراین اگروال ایم-اے جائنٹ سکرٹری مقرر کیے گئے ہیں - اب گزشتہ تجربہ سے فائدہ اٹھاکر اس کام کی تنظیم جہاں تک ممکن ہوگا بڑی خوبی اور مستعدی سے کی جاے گی —

البتہ اس موقع پر دو ایک باتوں کا صاف کردینا ضروری ہے - ہندی پرچار کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہندی زبان کو مقامی زبانوں کی بجاے اختیار کیا جاے یا اُن زبانوں کے مقابلے میں اسے کھڑا کیا جاے یا مقامی زبانوں کو گھٹایا جاے - صوبجاتی زبانوں کو وراثت میں اپنا بڑا ادب پہنچا ہے اور ان کی لغات مالا مال ہیں - ہندی اُن کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ ہمارا یہ منشا ہے - ہندی پرچار کا مقصد یہ ہے کہ تمام صوبوں کے لیے باہمی کاروبار کے واسطے ایک زبان مہیا کی

جاے اور مختلف صوبوں کے باشندوں کے لیے یہ آسانی پیدا کردی جاے کہ وہ بغیر غیر ملکی زبان کی مدد کے باہم تبادلۂ خیالات کرسکیں —

یہ محسوس کیا گیا ہے کہ قومیت کے اُن رشتوں کو مضبوط کرکے اور باہم جوڑنے کے لیے جو اس ملک میں مختلف طریقوں سے بناے جارہے ہیں ایک ایسی مشترک زبان کا ہونا لازم ہے - ایک غیر زبان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی قوم کے عزیز خیالات و جذبات کو صحیح طور سے ادا کرسکے اور ہماری تہذیب اور تمدن کا یہ تقاضا ہے کہ ہماری ایک ایسی زبان ہو جو نہ صرف کسی فرقے یا کسی صوبہ کے لیے کارآمد ہو بلکہ بحیثیت مجموعی سارے ملک کے کام آے - اس غرض کے لیے هندی زبان سب سے زیادہ موزوں تسلیم کی گئی ہے - اس کے بولنے والوں کی تعداد (مقامی اختلافات کے ساتھہ جو ناقابل التفات ہیں) چودہ یا پندرہ کروڑ سے کم نہیں اور اس سے زیادہ تعداد سمجھنے والوں کی ہے - یہ بڑھتی ہوی زبان ہے اور سنسکرت عربی فارسی اور صوبجاتی زبانوں سے الفاظ کا ذخیرہ حاصل کرتی ہے —

اس زبان کا ملک میں پھیلانا زیادہ آسان ہے کیونکہ هندوستان کی کسی دوسری زبان کے مقابلے میں جو قومی زبان کے طور پر انتخاب کی جاے گی ' اس کے سیکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی - جس جوش اور مستعدی کے ساتھہ جنوبی هند والوں نے اسے بحیثیت قومی زبان کے قبول کیا ہے اُس سے امید بندھتی ہے کہ اگر دوسرے صوبوں میں بھی کوشش کی گئی تو ایسے ہی نتیجے ظہور میں آئیں گے —

هندی پرچار سبھا دوسرے صوبوں میں بھی شاخیں قائم کرنے والی اور هندی سکھانے کے لیے جماعتیں کھولنے والی ہے نیز دوسری ضروری

کارروائیاں بھی کرنے والی ہے - مثلاً کتب نصاب کا تیار کرنا ' ایسے شخصوں کو وظائف دینا جو ہندی سیکھنے کے بعد اس کی اشاعت کا کام کرنے وعدہ کریں وغیرہ وغیرہ —

اس کام کے لیے نہ صرف ایسے پر جوش کام کرنے والوں کی ضرورت ہے جو اپنے آپ کو بالکل اس کے لیے وقف کردیں بلکہ اس کے انجام دینے کے لیے روپیے کی بھی ضرورت ہوگی - لیکن سب سے بڑھ کر اُن لوگوں میں جن میں سمتی کام کررہی ہے اس امر کا پوری طرح ذہن نشین کرنا ہوگا کہ ہمارا قومی تعمیر کا کام اُس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کوئی ایسی زبان نہ ہوگی جو تمام ملک میں سمجھی جاے اور صوبوں کے معاملات اور اداروں کو چھوڑکر ہر قومی کام میں استعمال نہ کی جاے —

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب ہم ہندی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتے اور نہ ہندوستانی سے امتیاز کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں - اور ہندی اور ہندوستانی کے کسی فرضی یا حقیقی اختلاف کی بنا پر مخالفت پیدا کرنا غلطی ہوگی —

اس کی کامل توقع کی جاتی ہے کہ اب چونکہ "ہندی ہندستانی" عام طور پر ایک ایسی زبان تسلیم کرلی گئی ہے جو صرف وہی قومی زبان بن سکتی ہے تو لوگوں کو ایک مشترکہ قومی زبان کی آرزو کرنی چاہیے اور سمتی کی ہر طرح مدد کرنی چاہیے - پرجوش کام کرنے والوں کو اشاعت کا کام کرنا چاہیے اور دولتمند اور خوش حال لوگوں کو روپیہ مہیا کرنا چاہیے اور مردوں اور عورتوں اور بڈھوں اور

جوانوں کو اس کے سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے - ہمیں یہ پوری طرح سمجھ لینا چاہیے - اور ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہم غیر زبان میں آزادی کے ساتھ بحث نہیں کر سکتے اور ہندستان کی خودداری اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمارے ملک کے لیے اپنی قومی زبان ہو " —

اچاریا کاکا صاحب کالیلکر نے بہت تفصیل کے ساتھ ہندی کی اشاعت کی اہمیت اور افادہ پر گفتگو کی اور حاضرین کو بہت زور سے تاکید کی کہ اس تحریک کی ہر ممکن ذریعہ سے مدد کریں " (ہندستان ٹائمز)

ہندوستانی اکیڈیمی کا سالانہ جلسہ بابت سنہ ۱۹۳۶ ع بمقام لکھنو

اوائل سنہ ۳۶ ع میں صوبۂ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حکومت نے اپنے پایۂ تخت لکھنو میں ایک صنعتی و زرعی نمایش نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ تمام انتظامات کی تکمیل کے بعد گذشتہ ۳ دسمبر کو نمایش مذکور کا افتتاح عمل میں آیا جس میں محض اس خیال کے مدنظر کہ عوام زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں اُن کی دلچسپی کے لیے مختلف قسم کے سامان تفریح مہیا کیے گئے تھے اور غالباً امسال الہ آباد چھوڑ کر ہندستانی اکیڈیمی کی سالانہ کانفرنس لکھنو میں کرنے سے یہ مقصد تھا کہ نمائش کے بہانے مختلف مقامات کے علم دوست حضرات اس میں آسانی سے شریک ہو جائیں گے —

خیر سنہ ۱۹۳۷ ع کی آمد آمد کے ساتھ دعوت نامے جاری ہوگئے اور جیسا کہ خود اس علمی ادارہ کے نام نامی یعنی ہندستانی اکیڈیمی میں لفظ ہندستانی کے پہلو میں اکیڈیمی کی موجودگی سے عیاں ہے وہ سب بجائے ہندستانی کے انگریزی میں طبع کرائے گئے تھے —

کتنے افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ اس ادارہ کے محترم صدر و معتمد جو اول تو خود ہندستانی ہیں دوسرے جنہوں نے ہندوستان ہی کی آب و ہوا میں نشو نما پائی ہے تیسرے جو ہندستانی زبان سے بخوبی واقف ہیں اور اُس کو نہایت سلیقے سے استعمال کرسکتے ہیں اور چوتھے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جو ہندستان میں ایک واحد قومی زبان کی ترویج کے لیے بڑی بڑی کوششیں کررہے ہیں اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے واسطے تمام کاروائی کی انجام دہی کے لیے ایک غیر ملکی زبان کا منہ دیکھیں —

بہرکیف کانفرنس کا اجلاس جناب ڈاکٹر رائے راجیشوربلی صاحب کی صدارت میں ۲۱ جنوری بروز شنبہ ساڑے گیارہ بجے کانفرنس پنڈال میں جو نمائش گاہ کے گول دروازے والے باب الداخلہ کے بائیں جانب تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر تھا منعقد ہوا اور حاضرین کی تعداد باوجود اس امر کے کہ جلسہ کا انعقاد اُردو ادب کے ایک اہم مرکز کی نمایش گاہ میں ہورہا تھا و نیز داخلہ پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ تھی ۲۰۰ اصحاب سے زیادہ نہ تھی —

جلسہ کی کاروائی کا آغاز رائٹ انریبل سرتیج بہادر سپرو کی ایک مختصر فاضلانہ تقریر سے ہوا جس میں ابتدأ انہوں نے اس نقصان عظیم پر اپنے جذبات رنج و الم کا اظہار کیا جو اردو زبان و ادب کو اصغر جیسے نامور شاعر اور پریم چند جیسے ممتاز فسانہ نگار کے انتقال سے پہنچا ہے اور حاضرین نے بھی کھڑے ہوکر ان مشہور و ممتاز ہستیوں کے ورثاء اور پس ماندگاں کے ساتھہ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کیا - من بعد فاضل مقرر نے کانفرنس کے موجودہ اجلاس کے منتخب صدر ڈاکٹر

رائے راجیشور بلی صاحب کا حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے بتلایا کہ ہندوستانی اکیڈیمی کا قیام ڈاکٹر صاحب موصوف کے عہد وزارت میں ہوا تھا و نیز ڈاکٹر صاحب اس کے بانی مبانی تھے دوران تقریر میں سر سپرو نے یہ بتلاتے ہوئے کہ ادارۂ مذکور کو بعض ایسی کتابوں شائع کرنے کا فخر حاصل ہے جن سے اہل ملک کی علمی ضروریات پوری ہوئیں اس امر پر بھی نہایت زور دیا کہ ہندوستان کے مدارس میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیے اور اپنے اس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا یہ مدعا ہرگز نہیں کہ غیر ملکی زبانوں کی کامل مخالفت کی جائے بلکہ اس خیال کے پیش نظر کہ غیر زبان میں سوچنے اور اظہار خیال کا مادہ بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے نیز اس کے اکتساب میں ہزار کوششوں کے باوجود زبان پر کامل قدرت حاصل نہیں ہوسکتی ۔ کونٹ کیزرلنگ (Count keyserling) کی اس نصیحت کے مطابق "خواہ تم اپنی ہر ایک شے کو فراموش کردو مگر اپنی زبان کو ہرگز نہ بھولنا" جو انہوں نے جاپانی طلبہ کو دی تھی اس بیان سے محض اپنی زبان کے تحفظ اور بقا کی ضرورت اور اہمیت جتلانا مقصود ہے انہوں نے ملک کے لیے ایک واحد قومی زبان کی تشکیل کی بھی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے ان انشا پردازوں کی کوششوں کو جو اردو کو محض فارسی اور ہندی کو خالص سنسکرت بنانا چاہتے ہیں نا قابل تحسین قرار دیتے ہوئے بتلایا کہ جو نئی زبان خصوصاً پنجاب میں اردو کے نام سے فروغ پا رہی ہے اس کے ۶۷ فیصد الفاظ عام پڑھے لکھے مسلمان اور جو نئی زبان صوبۂ ممالک متحدہ میں ہندی کے پردے میں ترقی کے منازل طے کر رہی ہے اس کے ۸۹ فیصد الفاظ عام خواندہ ہندو سمجھنے سے قاصر ہیں ۔

دوران تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مولوی عبدالحق صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں ورنہ میں کچھہ کھل کے کہتا لیکن اس قدر ضرور کہتا ہوں کہ وہ اردو جو میں بچپن سے سنتا بولتا آیا ہوں وہ رسالۂ اردو کی ہے - آخر میں انہوں نے ڈاکٹر راجیشوربلی صاحب سے کرسی صدارت قبول فرمانے کی درخواست کی اور پنڈت سکھہ دیو بہاری مصرا وغیرہم کی تائید کے بعد ڈاکٹر صاحب تالیوں کی گونج میں کرسی صدارت پر متمکن ہوئے —

ٹھیک ۱۲ بجے دوپہر صاحب صدر نے اپنا خطبہ انگریزی میں ارشاد فرمایا - اس خطبے میں ہندستانی اکیڈیمی کی زندگی کے متعلق چند امور پر روشنی ڈالتے ہوے مثلاً یہ کہ ہندستانی اکیڈیمی کا قیام جس کا سنگ بنیاد سرولیم میرس گورنر صوبۂ ممالک متحدہ کے ہاتھہ سے ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء کو رکھا گیا تھا اور جس میں خود ان کی کوشش کا بھی حصہ تھا ادارے کے مقصد کی توضیح کرتے ہوئے کہ یہ کسی نئی زبان کی تشکیل کے لیے قایم نہیں کیا گیا بلکہ اس کی غایت اصلی ایک مشترک پلیٹ فارم سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی بالکل جداگانہ حیثیتوں سے حفاظت کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے زیادہ تر اس تنازع فیہ مسئلہ سے کہ ہندوستان کی ملکی اور قومی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایک واحد مشترک زبان جس کی اساس سادہ اور آسان پر رکھی گئی ہو بحث کی گی تھی چنانچہ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ اردو اور ہندی ہی دو ایسی زبانیں ہیں جن میں ہندوستان کی قومی زبان بننے کی دیگر تمام ملکی زبانوں سے کہیں زیادہ صلاحیت موجود ہے وہلز اس امر کا اعادہ کرتے ہوئے کہ ہر دو زبان اپنے سرمایۂ الفاظ اور قواعد زبان

کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں خطبہ میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے اور ان کے مشترک الفاظ کی ایک لغت ترتیب دینے نیز ان کو سادہ اور عام فہم عبارت میں تحریر کرنے سے یہ زبانیں روز بروز قریب سے قریب تر آکر ایک ایسی نئی زبان کی تشکیل کا موجب ہوں گی جو ہندوستان کی واحد قومی زبان کہلائے جانے کی مستحق ہوگی —

لیکن اکثر حضرات اس الجھے ہوئے بیان کو سمجھنے سے قاصر رہے کیونکہ اپنے خطبہ کی ابتدا میں نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر غالباً اس لیے کہ اردو اور ہندی دونوں کے حامیوں کی ہمدردی حاصل ہوجائے اس ادارہ کے قیام کا مقصد بیان کرتے ہوئے صاحب صدر نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ ادارہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی بالکل جداگانہ حیثیتوں سے نشو و نما میں کوشاں رہے گا اور اس کا مطمح نظر کسی نئی زبان کی تشکیل ہرگز نہیں لیکن وہی صاحب صدر جو صاف اور صریح الفاظ میں ان اصحاب کی عنان توجہ کو جو یہی سمجھ بیٹھے ہیں انجمن کے قواعد و ضوابط اور مختلف کتب کی طرف جو اس ادارہ میں شائع ہوئی ہیں منعطف کرکے اس غلط فہمی کے ازالہ میں مصروف تھے اپنے خطبہ کے آخری حصے میں ایک نئی زبان کی تشکیل پر آمادہ نظر آتے ہیں اور اپنے اس مقصد کو دبی زبان میں بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ببانگ دہل یہ اعلان فرماتے ہیں کہ ملک کو ایک مشترک قومی زبان کی شدید ضرورت ہے ظاہر ہے کہ صاحب موصوف کی یہ کوشش ایک پلیٹ فارم سے جو دونوں زبانوں کے تحفظ کا ضامن ہو کہاں تک واجب اور پھر ان تدبیروں سے جو اصول مدعا کے لیے سوچی گئی

میں پہلی تدبیر یعنی رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کی تجویز سے قطع نظر کرکے بقیہ دونوں تجاویز یعنی اردو اور ہندی کے مشترک الفاظ کی لغت تیار کرنے اور ان کے طرز تحریر میں سادگی کی پابندی کردینے سے کہاں تک بار آور ہوسکتی ہے کیونکہ طرز تحریر انسان کی فطرت کا آئینہ ہے اور ہم ہرگز کسی ادیب یا انشا پرداز کو محض سادہ عبارت لکھنے پر مجبور نہیں کرسکتے اور جب طرز تحریر پر کسی قسم کی پابندی عاید نہیں کی جاسکتی تو پھر اردو ہندی کے مشترک الفاظ کی لغت تیار کرنے سے بھی کچھہ فائدہ حاصل نہ ہوگا کیونکہ دونوں زبانوں کے اہل قلم اپنی اپنی زبانوں کے سر چشموں سے اپنی اپنی پسند کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنے کے لیے آزاد رہیں گے —

بہر حال خطبۂ زیر بحث کو اس پیچیدہ بیان سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس میں ان زبان کی ترقی کے لیے جن کی حمایت اکیڈیمی اپنا فرض سمجھتی ہے بعض نہایت عمدہ تجاویز درج ہیں مثلاً سب سے پہلے عوام کو کتابوں کے انتخاب میں مدد دینے کی غرض سے انگریزی کے مشہور سلسلۂ ادبیات (World Classics) کے اتباع میں مختلف زبانوں کے شاہکاروں کے تراجم کے سستے ایڈیشن نکالنا - دوسرے عوام کا مذاق اور کتابوں کا معیار بلند کرنے کے لیے اور اس لیے کہ وہ فضول اور لغو کتابیں خرید کر اپنا روپیہ اور وقت ضائع نہ کریں سال بہ سال اردو اور ہندی کی قابل لحاظ کتب کی ایک انتخابی فہرست شائع کرنا - تیسرے دیہی آبادی کے مطلب کی بعض کتب ایسی زبان میں جو وہ آسانی سے پڑھ اور سمجھہ سکیں طبع کرانا - چوتھے حکومت سے ایک ایسا قانون بنانے کی درخواست کرنا جس کی رو سے ہر مطبع کو ان کتابوں کی جو وہاں طبع ہوں ایک جلد اکیڈیمی کو بھیجنا لازمی کردیا جائے اور اس طرح کتب خانہ کو وسیع کرنا اور پانچویں اس

تمام کاموں کی جو انجمن نے اپنی دس سالہ زندگی میں انجام دیے ہیں مشتہر کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے رپورٹ مرتب کرکے طبع کرانا - چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر خود صاحب صدر نے انجمن کی دہ سالہ زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے خود بھی یہ بیان کردیا کہ اس ادارہ نے اب تک تقریباً پچاس کتابیں شائع کی ہیں اور اس کے دو رسالے بھی جو ہندستانی کے نام سے موسوم ہیں دونوں زبانوں میں برابر نکل رہے ہیں اس ادارے کے بہترین مضامین اور ادبی شاہکاروں کے لیے انعامات دینے کا بھی سلسلہ جاری کیا تھا مگر چونکہ اقتصادی مشکلات کی وجہ سے ترک کرنا پڑا اور اسی وجہ سے ادارۂ مذکور ایک نہایت ضروری کام انجام دینے یعنی صنعت و حرفت تجارت کی تمام اصطلاحات کو مرتب کرنے سے قاصر رہا —

تقریباً ساڑھے بارہ بجے صدر کا مذکورۂ بالا خطبہ ختم ہوا اور پنڈت شیام بہاری مصرا منتخب صدر شعبۂ ہندی کی عدم موجودگی میں ان کے چھوٹے بھائی پنڈت سکھہ دیو بہاری مصرا نے ان کے خطبے کو پڑھ کر سنانا اور اس فریضہ کو نہایت تیزی سے انجام دینا شروع کیا لیکن جب وہ حاضرین کے ایک دو مرتبہ اس طرف دھیان دلانے پر کچھہ دھیمے بھی پڑگئے تو بھی کچھہ تو اس وجہ سے کہ صاحب موصوف کی آواز آلۂ آواز رساں میں پھنس کر رہ جاتی تھی لیکن زیادہ تر اس باعث کہ خطبہ سنسکرت الفاظ سے اس قدر مملو تھا کہ تقریباً ۹۰ فیصد اصحاب اس کے سمجھنے سے قاصر رہے - چنانچہ تقریباً ۸۰ فیصد اصحاب تو پنڈال چھوڑ کر باہر چلے گئے اور باقی ماندہ اصحاب اونگھنے یا خوش گپیوں میں مصروف تھے - خیر خدا خدا کرکے یہ خطبہ اختتام کو پہنچا اور حاضرین کی عدم

موجودگی کا خود پنڈت جی کے دل پر گہرا اثر پڑا —

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی صدر منتخب شعبہ اردو ا بجے کے قریب اپنا خطبہ سنانے کے لیے کھڑے ہوئے جس کو اگر ہم لکھنؤ کی خدمات ادب اردو پر ایک مبسوط مضمون کہیں تو بیجا نہ ہوگا چنانچہ اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا نے اعتراف کیا کہ اردو نے جو پنجاب میں پیدا ہوئی، دکن میں نشو و نما پائی دہلی میں پروان چڑھی اور تعلیم و سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا - اس کے بعد 'انیس' 'دبیر' 'ناسخ' 'جلال' 'امیر' وغیرہ نے جو اردو زبان کی خدمات انجام دی ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے مولانا نے بتلایا کہ شاہی عہد میں لکھنؤ میں نہ صرف ایک دارالترجمہ قایم تھا جس میں 'زخمی' 'فلسفی' محمد اسمعیل لندنی اور محمد حسین لندنی نے وضع اصطلاحات کا بیشتر کام انجام دیا بلکہ ایک مطبع سلطانی تھا یورپین زبانوں کے ۵۲ رسالہ جات کے تراجم شایع کیے - اپنے خطبے کے تیسرے حصے میں اردو کی ترقی کے لیے چند تجاویز بھی پیش کی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ زبان مذکور کو سنسکرت اور عربی اثر سے بالکل آزاد کرکے اور تلفظ میں ہندستانی لہجے کا خیال کرتے ہوئے املے میں لہجۂ مذکور کا اتباع کرکے تحریر و تقریر میں ثقیل اور نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا جائے - مولانا نے اپنے خطبے کے بعض حصے مختلف مقامات سے پڑھ کر سنائے - طویل ہونے کی وجہ سے پورا نہ پڑھ سکے —

ڈیڑھ بجے ڈاکٹر تارا چند معتمد ادارۂ ہذا نے اپنا مضمون سنانا شروع کیا اور اگرچہ یہ عام خیال تھا کہ یہ مضمون غالباً ان تمام کاموں کی انجمن نے سال گذشتہ انجام دیے ہیں - ایک تفصیلی رپورٹ ہوگی مگر یہ خیال غلط ثابت

ہوا جب معتمد صاحب نے بڑی اپنے پیش رووں کی آواز میں آواز ملا کر وہی راگ الاپنا شروع کیا کہ ملک کے لیے ایک قوی زبان کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوے اردو اور ہندی کی آمیزش سے ایک نئی زبان بنائی جاے اور ان کا مضمون یقیناً اس ہندستانی کا جو ان کے پیش نظر تھی غالباً نہایت عمدہ نمونہ تھا چنانچہ قابل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس امر کا التزام کیا تھا کہ اگر ایک جملہ فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کا گراں بار احسان ہو تو سنسکرت کے سر چشمے سے سیراب کیا گیا ہو۔ عجب مضحکہ خیز منظر تھا چنانچہ جب معتمد صاحب کا مضمون ختم ہوجانے کے بعد جلسہ برخاست ہوا تو پنڈت کشن پرشاد کول اور دیگر حضرات ڈاکٹر تارا چند صاحب سے یہ دریافت کرتے ہوے سنے گئے کہ جناب والا آخر یہ مضمون کون سی زبان میں لکھا گیا تھا آیا ارا چندی میں یا گنگا جمنی میں اور اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب موصوف مسکرا کر خاموش ہوجاتے تھے —

۳ بجے سہ پہر کانفرنس پنڈال ہی میں جناب ڈاکٹر رائے راجیشور بلی صاحب کی زیر صدارت کانفرنس کے اردو اور ہندی شعبوں کا مشترک اجلاس شروع ہوا اس وقت حاضرین کی تعداد گھٹ کر تقریباً تین چوتھائی رہ گئی تھی —

کارروائی کے آغاز میں پنڈت سکھہ دیو بہاری مصرا نے جو صبح کے ناخوشگوار منظر سے ایک حد تک متاثر نظر آتے تھے ایک مختصر تقریر کی جو صبح کے لکھے ہوئے خطبہ کی صحیح معنوں میں ضد تھی یعنی اس تقریر میں فاضل مقرر نے سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہوئے ہر مذہب و ملت و مقامات دور و نزدیک کی تفریق و امتیاز کے بغیر ہر گروہ، ہر صوبہ، اور ہر طبقے کے حضرات کو ہندوستان میں ایک مشترک قوی

زبان کے لیے دوش بدوش کام کرنے اور اُس کی ترقی کے لیے تمام محنت اور دقتوں کو برداشت کرنے کے لیے زور دیتے ہوئے اس امر کی توضیح کی کہ اگر اُردو اور ہندی کو انہی راستوں پر گامزن ہونے دیا جائے گا جس پر وہ آج کل چل رہی ہیں تو بلا مبالغہ ایک ربع صدی میں ہندی بولنے والے حضرات اردو بولنے والوں کا مطلب اور اردو بولنے والے اصحاب ہندی بولنے والوں کا مدعا بالکل نہ سمجھ سکیں گے لیکن جیسا کہ ان کے صحیح کے کردار سے ظاہر تھا اس تقریر میں اخلاص کی بو بہت کم پائی جاتی تھی —

ناطق لکھنوی نے پنڈت جی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے زیادہ تر اس امر پر زور دیا کہ ہندی اور اردو کو ادبی حیثیتوں سے علیحدہ قرار دیتے ہوے باہمی محبت اور یکانگت کے ذریعے ایک مشترک بولی کی تشکیل کا خیال زیادہ قابل قبول ہے من بعد دو اصحاب نے اپنی تقریروں کے دوران میں اس مقصد کے حصول کے لیے ثانوی مدارس میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تعلیم کو لازمی قرار دینے اور رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کی تجویزیں پیش کیں —

مگر پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے جوان کے بعد ڈائس پر تشریف لائے اپنی ایک نہایت برجستہ تقریر میں یہ واضح کردیا کہ جب تک ہماری سعی میں اخلاص کامل کو دخل نہ ہوگا محض لسانی کے بل بوتے پر مقصد کا حصول ناممکن ہے - چنانچہ انہوں نے ظاہر و باطن کی باہمی مطابقت کی زندہ مثالیں یعنی ڈاکٹر بلی کے انگریزی خطبے ڈاکٹر تارا چند کی تارا چندی اور پنڈت شیام بہاری مصرا کی ہندی نما سنسکرت کو حاضرین کے سامنے پیش کرتے ہوے یہ بتلایا کہ آج کل اردو

اور هندی نے ایک مذهبی اور سیاسی مسئلہ کی شکل اختیار کرلی ھے اس لیے اس قسم کی تمام کوششیں محض بے سود هیں - ان کی راے وهی ھے جو پچھلے سال اپنے مضمون میں ظاهر کر چکے تھے کہ ان دونوں زبانوں کا ملنا ممکن نہیں دونوں کو اپنے اپنے رستے ملنے دینا چاهیے —

آخر کار بہت گرما گرم بحث کے بعد جس میں یہ خیال بھی ظاهر کیا گیا کہ نصاب تعلیم ویسے هی طالب علموں کے لیے بارگراں ثابت هو رها ھے اس لیے اس میں ایک اور مضمون کا اضافہ کہاں کی دانائی ھے ذیل کی تجویز حاضرین کے سامنے پیش کی گئی یہ کانفرنس اول تو اردو اور هندی کے اهل قلم حضرات سے درخواست کرتی ھے کہ جہاں تک ممکن هو اپنا کلام سادہ اور آسان عبارت میں لکھیں دوسرے اردو اور هندی کے لیے مشترک اصطلاحات کے وضع کرنے کی کوشش کی جاے اور تیسرے حکومت سے اس امر کی اپیل کرتی ھے کہ هائی اسکول تک کے طلبہ کے لیے اردو اور هندی کی تعلیم لازمی قرار دی جاے - الغرض ڈیڑھ گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد جس میں عصبیت کے چھینٹے برابر اڑتے رهے تجویز کا پہلا اور تیسرا اپنی اصلی شکل میں منظور هو گیا اور دوسرا حصہ بالکل حذف کر دیا گیا —

اس تجویز کے منظور هونے کے بعد مضمون نگار حضرات کی باری آئی چنانچہ جن صاحب نے سب سے پہلے اپنا مضمون سنانا شروع کیا ان کا مقصد حاضرین کو ایک هندی شاعر سے روشناس کرانا تھا - اس وقت تک حاضرین کی تعداد بالکل کم هوگئی تھی اور بقیہ اصحاب کو حیرت تھی کہ انھیں ایک ایسے شاعر کے کلام سے جسے تاریخی اور ادبی حیثیت سے کچھ اهمیت حاصل نہیں آخر مقصد کیا ھے - ایک مضمون هندستان میں دیہی ترقی سے بھی متعلق تھا اور در اصل ایک مضمون کے علاوہ دیگر تمام مضامین

کا معیار کچھ بلند نہ تھا - آخر تقریباً ۵ $\frac{1}{2}$ بجے شام مجلس برخاست کی —

دوسرے روز صبح ۹ $\frac{1}{2}$ بجے کانفرنس کے شعبۂ اردو کا اجلاس پنڈال کے سامنے کھلے میدان میں زیر صدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی شروع ہوا - سب سے پہلے مولوی مہیش پرشاد صاحب نے غالب کے متعلق ایک نہایت بصیرت افروز مضمون پڑھا اور ساتھ ہی ساتھ حاضرین کو جن کی تعداد کل ۱۷ تھی دیوان غالب کا ایک چھپا ہوا نسخہ دکھایا جو باعتبار زمانہ غالب مرحوم کے دیوان کے تمام دستیاب شدہ مطبوعہ نسخوں سے زیادہ قدیم تھا - من بعد مولوی سید مقبول احمد صمدانی نے مرزا جہانگیر کے متعلق اپنا مضمون پڑھ کر سنایا - ایک صاحب نے حضرت عاصی غازی پوری کی شاعری پر جن کے متعلق اُن کا خیال تھا وہ دبستان ناسخ کے پیرو ہیں اپنا مضمون پڑھ کر سنایا جو عام طور پر پسند کیا گیا - مولانا احمد مکرم صاحب اعظمی کا مضمون جس کا موضوع اُردو و ہندی کا بھائی چارا تھا نہایت کدو کاوش کے بعد غایت محققانہ انداز میں لکھا گیا تھا چنانچہ اس میں شک نہیں کہ اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے میں جہاں تک بالخصوص دونوں کے رسم الخط کا تعلق ہے اس سے عمدہ تجاویز شاید ہی کوئی پیش کرسکے - رومن رسم الخط کی حمایت میں بھی ایک مضمون پڑھا گیا لیکن اُس میں ایسی تجاویز سے بالکل بحث نہیں کی گئی تھی جنھیں تعمیری کہا جاسکے —

جب مضمون پڑھے جاچکے تو پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے اردو کے املے کی درستی کی جانب حاضرین کی توجہ کو مبذول کرتے ہوے یہ سوال کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے باعث اس مسئلہ پر جو

کچھ عرصے پہلے ہندستانی اکیڈیمی کے زیر غور تھا کنارہ کشی اختیار کر لی گئی اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے فرمایا کہ سنہ ۲۹ ع میں ایک کمیٹی میں انہوں نے بعض تجاویز اس مشکل کو حل کرنے کے لیے پیش کی تھیں اور ہندی کے حامیوں نے بھی ان تجاویز کو پسند کیا تھا مگر چونکہ ان تجاویز کو عمل میں لانے سے بعض نئے ٹائپ کے حروف بنوانے پڑتے لہذا مالی مشکلات کے پیش نظر اس خیال کو ترک کردیا گیا - اُنہوں نے اردو کے لیے رومن رسم الخط کے اختیار کرنے کے بھی خلاف راے دیتے کہا کہ اُس میں اُردو کے حروف علت کے باعث دقتیں پیش آئیں گی یہ دقتیں ترکی زبان کے رومن حروف میں لکھتے وقت اس لیے پیش نہیں آئیں کہ ترکی زبان میں Long Vowels نہیں ہیں پر اس امر پر زور دیا کہ ہندستان میں ذوق مطالعہ اور باہمی اخلاص کی کمی در اصل ان تمام مشکلات کا باعث ہیں اور اگر یہ خامیاں کسی طرح دور ہوجائیں‌گی تو پھر دقتوں پر کسی نہ کسی طرح عبور حاصل کرهی لیا جائیگا —

اس کے بعد چونکہ اور کوئی مسئلہ بحث کے لیے پیش نہیں کیا گیا اس لیے دوسرے روز کی کاروائی صدیقی صاحب کی اس تقریر کے بعد ختم ہوگئی —

تیسرے روز کی کاروائی کا آغاز کانفرنس پنڈال میں ٹھیک دس بجے مرزا محمد عسکری صاحب کے مضمون سے ہوا جو اُنہوں نے فسانۂ آزاد کے متعلق لکھا تھا اور جس میں وہ سرشار کی مے نوشی فسانۂ آزاد کی ضخامت ، پلاٹ کی بدمزگی اور بے ربطی لیکن زبان کے چٹخارے کی موجودگی کے باعث اُس پر مطلق کسی کی نظر نہ پڑنے کے متعلق اور بالخصوص وہ فوجی کے کردار

کی تعریف و توصیف میں رطب اللسانی سے کام لیتے ہوئے حضرت چک بست اور پنڈت بشن نراین در کے مضامین سے بھی چار ہاتھ آگے بڑھ گئے تھے - اس کے بعد مشیر احمد صاحب علوی نے حاضرین کو جن کی تعداد ۴۰ تک پہنچ گئی تھی لکھنؤ اور لکھنؤ کی شاعری پر اپنا مضمون پڑھ کر سنانا شروع کیا اور اس مضمون میں اُنہوں نے بیان کیا کہ انشا اور ذوق غیر فطری شاعر تھے اور کہ اس زمانے میں دھلی کے مقابلہ میں لکھنؤ میں زیادہ خوش فکر اور خوش گو شاعر جمع تھے جنھوں نے غزل کو معراج کمال پر پہنچا دیا تھا - علوی صاحب کے بعد مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی نے ایک مضمون جس کا عنوان ایک نئی آئین اکبری تھا اور جس کی نسبت یہ قیاس تھا کہ وہ کوئی تاریخی مضمون ہوگا لیکن در حقیقت اس میں اکبر الہ آبادی کے کمال کو نہایت شگفتہ زبان میں بے نقاب کیا گیا تھا پڑھ کر سنایا من بعد آغا مہدی حسن صاحب کی باری آئی اور چونکہ اُن کا مضمون جس میں اس مسئلہ سے بحث کی گئی تھی کہ انگریزوں نے جو عام طور پر تاریخ پر کتابیں لکھی ھیں اُن میں فرقہ وارانہ منافرت کو بھڑکانے کے لیے اکثر واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے بہت طویل تھا اس لیے صاحب صدر کو متعدد مرتبہ اُن سے اپنا مضمون جلد از جلد ختم کرنے کی درخواست کرنی پڑی اور چونکہ صاحب موصوف کے مضمون ختم ہو جانے کے بعد وقت بہت کم رہ گیا تھا اس لیے مولوی سعید انصاری صاحب اور مولانا اظہر علی آزاد صاحب کے مضامین جن کے عنوانات " اصغر و اقبال " کی شاعری اور " اُردو زبان کی ہمہ گیری " تھے پڑھ کر نہ سنائے جاسکے البتہ شوکت تھانوی صاحب کو جنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پیٹ کے دھندوں

سے مجبور ہوکر اُصولوں کی قربانی اور بالخصوص لکھنؤ کی تہذیب کے اُجڑ جانے پر پھبتیاں کسی تھیں اپنا مضمون سنانے کی اجازت دی گئی —

۱ ۱/۴ کے قریب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کانفرنس کا اجلاس برخاست کرتے ہوئے چند مختصر الوداعی کلمات میں اس خیال پر نہایت افسوس ظاہر کیا کہ اُن مضامین سے جو حاضرین کے سامنے پڑھے گئے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا مذاق اس قدر گرا ہوا ہے کہ اُن کے ادبی کارنامے محض لطائف و ظرائف پر مبنی ہیں اور بہت زیادہ کاوش سے کام لیا تو تاریخ نویسی تک ختم ہوجاتے ہیں اور زندگی کے حقایق سے مطلق بحث نہیں کی جاتی اور دعا کی کہ خدا کرے عوام کے مذاق کی یہ پستی جلد از جلد دور ہوجائے —

تبصرے

تبصرے

ادب

داغ

(مولفۂ نوراللہ محمد نوری صاحب - غلام دستگیر تاجر کتب ' حیدر آباد دکن مجلد قیمت ۵ روپے آٹھ آنے - چھوٹی تقطیع ' صفحات ۲۰۸)

اس کتاب میں فصیح الملک نواب مرزا داغ کے سوانح حیات میں اور کلام پر تبصرہ ہے - کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں مولف نے اس پر بحث کی ہے کہ اگر ادیب اور شاعر اپنے کلام کی وجہ سے قابل تعریف ہیں تو وہ بادشاہ اور امرا بھی اُن سے کم قابل تحسین نہیں جنھوں نے ان ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی اگر وہ سرپرستی اور قدر نہ کرتے تو ان ادیبوں اور شاعروں کو فروغ نہ ہوتا - اس بحث میں مولف نے بعض کام کی باتیں لکھی ہیں لیکن اس کو اتنا بڑھا

دیا ہے کہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے —

تقریباً نصف کتاب میں حالات ہیں جو انہوں نے بہت محنت سے اور مختلف کتابوں اور خصوصاً حضرت احسن مارہروی کی کتاب سے جمع کیے ہیں اور اس کے علاوہ داغ کے بعض شاگردوں اور اُن کے مقامی احباب سے بھی بہت سے باتیں دریافت کرکے لکھی ہیں کتاب کے باقی نصف حصے میں کلام پر تبصرہ ہے - داغ غزل کے بادشاہ ہیں' باقی اصناف سخن میں انہیں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہیں - ان کے کلام کی اصل خصوصیت جیسا کہ مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے یہ ہے کہ " داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی' روز مرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور تیکھا پن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے' مولف نے کھینچ تان کر بعض اور خصوصیات سے بھی بحث کی ہے جو زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں ایک باب کا عنوان " داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصہ " ہے - اس میں مولف نے زیادہ تر صرف و نحو سے بحث کی ہے اور غیر ضروری طول دیا ہے - اس میں داغ کی اصلاحوں کا ذکر ہے - آخر میں داغ کے ممتاز اور نامور شعرا کا مختصر ذکر اور اُن کے کلام کا نمونہ ہے —

مولف نے جس محنت اور شوق سے یہ کتاب لکھی ہے وہ قابل داد ہے اور جس قدر حالات وغیرہ اس میں جمع کردے ہیں وہ کسی دوسرے جگہ نہیں ملتے - داغ کے قدرداں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں - لکھائی اور چھپائی اور کاغذ بہت نفیس ہے

شعرا میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ اپنے ہر شعر کو انتخاب سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان بیکار اور بھرتی کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں۔ خواجہ صاحب نے خوب کیا جو اپنے کلام میں سے صرف سو شعر منتخب کرکے شایع کیے اور انتخاب بھی ایسے صاحب سے کرایا جو پختہ نظر اور صاحب ذوق شاعر ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور شعر میں کچھ نہ کچھ لطف پایا جاتا ہے —

دیوان باقر -

(مرتبہ مولوی حافظ سید عطا حسین صاحب ایم۔ اے،
سی - ای - ایم، آر - اے - اس، بی - قیمت دو روپے آٹھ آنے۔
مرتب سے (محلہ للکم پلی، حیدرآباد دکن) مل سکتا ہے)-

حضرت سید شاہ باقر علی مرحوم فارسی کے باکمال شاعر تھے، فارسی زبان سے خاص مناسبت تھی اور اس پر بڑی قدرت حاصل تھی - مرزا غالب کے شاگرد تھے - ان کا کلام بہت کچھ ضائع ہوگیا اور جو بچا وہ کبھی شایع نہ ہوا - خوشی کی بات ہے کہ مرحوم کے فرزند رشید مولوی عطا حسین صاحب نے جو خود صاحب علم و فضل ہیں، اُن کے کلام کو جہاں تک دستیاب ہوا، اب شایع کردیا ہے - کلام کے پڑھنے سے ان کا کمال معلوم ہوتا ہے - اس میں درد و تاثیر ہے، روانی و فصاحت ہے اور وہ خاص لطف و لذت موجود ہے جو صرف اہل اللہ کے کلام میں ہوتی ہے -۔ ان کا دیوان پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خاک ہند سے ایسے ایسے باکمال فارسی گو شاعر پیدا ہوے جو ایران کے بڑے بڑے اساتذہ سے مقابلہ کرتے ہیں —

حضرت باقر پور بگہ (بہار) میں سنہ ۱۸۲۱ ع میں پیدا ہوے اور چونکہ اُن کے بعض عزیز و اقارب کی سکونت آرہ میں تھی' اس لیے آرہ ہی میں مقیم ہوگئے - وہ صرف ایک صاحب ذوق شاعر ہی نہ تھے بلکہ انہیں مختلف علوم و فنون میں بھی کمال حاصل تھا —

کتاب کے شروع میں فاضل مرتب نے حضرت باقر اور اُن کے خاندان و اسلاف کے حالات اختصار اور جامعیت کے ساتھہ بیان کیے ہیں —

جن اصحاب کو فارسی شعر کا ذوق ہے وہ حضرت باقر کے کلام کا ضرور مطالعہ کریں - کوئی غزل ایسی نہیں جو لطف و اثر سے خالی ہو —

افسانہ -

از احمد صدیق صاحب مجنوں گورکھہ پوری -

صفحات ۱۳۲ - کتابت طباعت و کاغذ —— معمولی - قیمت

ایک روپیہ ۸ آنے ملنے کا پتہ —— ایوان اشاعت گورکھہ پور —

دو مقالوں کا مجموعہ ہے جو ادبی مجلسوں میں پڑھ کر سنائے گئے تھے - ایک کا عنوان ہے ' افسانہ اور اس کی غایت ' اور دوسرے کا ' اردو افسانہ ' —

پہلے مضمون میں افسانے کے عناصر اور مختلف پہلوؤں کا تفصیلی بیان ہے اور تشریح کے لیے جا بجا مغربی تصنیفوں کی مثالیں دی گئی ہیں - جو لوگ مغربی ادب سے زیادہ واقف نہیں ہیں انہیں اسے سمجھنے میں دقت ہوگی - مضمون بجائے خود لائق تحسین ہے اور اس کا مطالعہ مبتدیوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے زمانۂ حال میں تحلیل نفسی اور اشتراکیت

کے ادبی اسکولوں نے فن افسانہ نگاری میں جو انقلاب برپا کردیا ہے' مولف نے اس کا ذکر نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ بیان کچھہ پرانا اور ادھورا رہ گیا - طامس ہارڈی کی توصیف میں غلو سے کام لیا ہے اور اس کے ایک ناول Tess کو طالسطائی کے شاہکار " اینا کرینینا " پر فوقیت دے ڈالی ہے —

دوسرا مضمون اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ اس میں اردو کے حالیہ افسانہ نگاروں کے ذکر سے پہلو تہی کی ہے - بیسویں صدی کے فسانہ نگاروں میں پریم چند انجہانی کے علاوہ صرف تین چار حضرات کا ذکر کیا ہے - ان میں سے سجاد حیدر اور جلیل قدوائی کی حیثیت صرف مترجموں کی ہے - ان صاحبوں کو اردو کے سب سے اچھے مترجم کہنا صحیح نہ ہوگا - ناولوں اور افسانوں کے ترجمے میں مولوی عنایت اللہ دہلوی کا نام یقیناً سر فہرست آتا ہے —

سب نئے لکھنے والوں کو حقارت سے " تذی دل " کہہ کر چھوڑ دینا بھی بڑا ظلم ہے - بہر حال' اس موضوع پر اردو میں جو تھوڑی سی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ بھی غنیمت ہے - قیمت زیادہ ہے -

" ناخدا "

تمدن عتیق

(از ابوظفر اور عطاالرحمن صاحبان صفحات ۲۳۴ - کتابت طباعت و کاغذ - صاف - مجلد اور مصور قیمت - (صرف ریاست کے لیے) ۳ روپے - ملنے کا پتہ - بک ڈپو - سٹی کالج حیدرآباد)

اس تالیف میں آغاز کھیتی سے لے کر ظہور مسیح سے کچھہ عرصے

پہلے تک کا جستہ جستہ حال لکھا ہے - کتاب درسی ضروریات کو مد نظر رکھہ کر لکھی گئی ہے - اور طلباء کی ذہنی سطح کا خاص خیال رکھا ہے - بیان آسان اور سلجھا ہوا ہے البتہ بعض حصوں کو لکھتے ہوئے اسناد سے غفلت برتی گئی ہے - تصویروں اور نقشوں نے کتاب کو زیادہ مفید اور دلچسپ بنا دیا ہے - قیمت البتہ زیادہ ہے اور پھر یہ سمجھہ میں نہیں آیا کہ اس کے تعین میں ریاست کی تخصیص کیوں کی گئی ہے —

اخلاق و تصوف

۱ - سرور ہستی
۲ - نور ہستی

(مولفہ پنڈت نرمل چندر صاحب، پروفیسر دیال سنگھہ کالج لاہور - سکھہ گیان پبلشنگ سوسائٹی اوکاڑہ، پنجاب - قیمت ایک روپیہ و ایک روپیہ چار آنے)

پروفیسر نرمل چندر کی یہ دو کتابیں ہمیں سچا اخلاق اور دنیا میں رہ کر بے لوث اور پاک زندگی بسر کرنا سکھاتی ہیں - ان میں علم و حکمت کی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو فاضل مولف کے گہرے مطالعہ، مشاہدہ اور غور و فکر پر مبنی ہیں اور ہر مسئلہ کو انہوں نے ایسی خوبی اور سلاست سے بیان کیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ دونوں لطف حاصل کر سکتے ہیں - اور ہر مذہب و ملت کا آدمی یکساں مستفید ہو سکتا ہے - ان کا مشرب صوفیانہ ہے اور صوفیانہ خیالات کو سائنس کے ساتھہ سمو کر ایک نیا لطف اور نئی قوت پیدا

کردی ہے - ان دونوں کتابوں میں انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے - مثلاً زندگی، زندگی کے معنے، کمال زندگی، دکھ، لذت، گناہ، خودی کا ظہور، بنیادی اور آخری حقیقت، انسانی زندگی کا قانون، کثرت میں وحدت، انسانی زندگی کا مقصد، فریب عقیدت، جھوٹے بہانے، راہ نجات، تہذیب (موجودہ و آیندہ) وغیرہ پر بہت سنجیدہ اور معقول خیالات کا اظہار کیا گیا ہے - ہمیں ان کتابوں کے مطالعے سے بہت خوشی ہوئی اور امید ہے کہ یہ اردو داں طبقے میں مقبول ہوں گی —

فلسفہ

فلسفۂ عجم

(مترجمہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی - اے، ایل ایل - بی - احمدیہ پریس، حیدرآباد دکن)

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مشہور مقالے The Development of Metaphysics in persia کا ترجمہ ہے - اسے تصنیف ہوئے تقریباً ۲۷ سال ہوتے ہیں - جیسا کہ خود علامۂ اقبال نے تحریر فرمایا ہے اس کتاب میں دو امور سے بحث کی گئی ہے —

(۱) میں نے ایرانی تفکر کے منطقی تسلسل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو میں نے فلسفۂ جدید کی زبان میں ادا کیا ہے -

(۲) تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹفک طریقے سے بحث کی ہے اور ان ذہنی حالات و شرائط کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو اس قسم کے واقعے کو معرض ظہور میں لے آتے ہیں - لہذا اس

خیال کے برخلاف جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف ان مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں کے باہمی عمل و اثر کا لازمی نتیجہ ہے جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کرکے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف رہنمائی کرتی ہیں' —

یہ بہت اہم تحقیقی مقالہ ہے جس میں ایرانی مابعدالطبیعات اور تصوف سے بحث کی گئی ہے' اردو میں اس کا ترجمہ آسان کام نہ تھا لیکن مولوی حسن الدین صاحب نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے' اور ان کی یہ محنت قابل تحسین ہے —

مذہب و اخلاق

بلاغ الحق

(مصنفۂ شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب ۔
پرفضا' پٹنہ ۔ قیمت دو روپے)

شمس العلما مولانا محب الحق اس سے قبل دعوۃالحق شرعۃالحق' منہاج الحق شایع کرچکے ہیں ۔ یہ کتابیں بہت مقبول ہوئیں ۔ مولانا میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف قرآن مجید سے استدلال فرماتے ہیں اور قرآن ہی سے انہوں نے تمام عقائد اور ارکان اسلام کی تشریح کی ہے قرآن کے رموز و معانی پر مولانا کی بڑی گہری نظر ہے ۔ یہ ان کی آخری کتاب ہے ۔ اس میں انہوں نے حدیث' اسوۂ حسنہ' اطاعت رسول

ایمان ' عقائد ' عبادت ' معاملات ' حلال و حرام اور دیگر مسائل پر بحث کی ہے - اور اس میں بھی انہوں نے تمام استدلال قرآن پاک ہی سے کیا ہے - کتاب مطالعہ کے قابل ہے —

اُردُو کے جدید رسالے

عارف -

(مدیر عبدالرحمن شوق - بل روڈ ' لاہور - چندہ سالانہ ایک روپیہ) —

لاہور کے ماہانہ رسالوں میں ایک اور اضافہ ہوا ہے - اگرچہ عنوان پر " اسلامی ' ادبی ' تمدنی ' معاشرتی مضامین کا رسالہ لکھا ہے " لیکن جزو غالب مذہبی مضامین کا ہے - اس رسالہ کے مالک ملک دین محمد تاجر کتب ہیں اور اس لیے ان کی کتابوں کے اشتہار بھی رسالے کا ایک جز ہے - ایک روپیہ سالانہ قیمت میں یہ رسالہ فی الحقیقت بہت ارزاں ہے - بہت اچھا چھپتا ہے اور خاصی بڑی تقطیع کے ۴۰ صفحے مضامین کے ہوتے ہیں —

محقق -

(بہاول پور - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ رسالہ اسی مہینے بہاول پور سے شائع ہوا ہے - اس کے ڈائرکٹر خواجہ شجاع منعمی ایم - اے (علیگ) - ایم - ایس - سی - ایم - اے

(پنجاب) اڈیٹر، رازی عرفانی - مہتمم شعبۂ نسوان بیگم ح ۔ ش وقعت دہلوی - بی - اے - نگران عربیات، مولوی حافظ عبدالرحمن علامہ مولوی فاضل - نگران سنسکرتیات - پنڈت مدن سنگھ شاستری، ودیا بھاسکر —

جو رسالہ اس اہتمام سے شایع ہوا ہے وہ ضرور قابل قدر ہونا چاہئے - عنوان پر درج ہے "تحقیق کا علمی، ادبی، منطقی وغیرہ ماہوار رسالہ" لیکن اس میں شک نہیں کہ رسالے کے لیے اچھے اچھے ادیبوں کے مضامین مہیا کیے گئے ہیں - یہ پہلا رسالہ ہے جس میں علاوہ ادارہ کے پوروداؤد، پروفیسر غلام محی الدین، ڈاکٹر عندلیب شادانی وغیرہ کے بھی مضامین درج رسالہ ہیں - رسالہ دلچسپ اور مفید ہے اور امید ہوتی ہے کہ آئندہ زیادہ ترقی کرے گا —

---

mohmed

Mela
Maulana

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ چھہ روپے سکۂ انگریزی (سات روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) ۔

طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انھیں چار روپے آٹھ آنے سکۂ انگریزی (پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

VOL. 17 JUNUARY 1937

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq B. A. (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman - I - Taraqqi - e - Urdu, Aurangabad, (Deccan)

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

١ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

٢ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

٣ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

٤ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ' آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیے —

المشتہر: انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

نرخ نامۂ اجرت اشتہارات اردو و سائنس

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	٨ روپے سکۂ انگریزی	٣٠ روپے سکۂ انگریزی
ایک کالم (آدھا صفحہ)	٤ روپے سکۂ انگریزی	١٥ روپے سکۂ انگریزی
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	٢ روپے ٤ آنے سکۂ انگریزی	٨ روپے سکۂ انگریزی

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائےگا اُن کےلیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد مینیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے -

المشتہر مینیجر انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اُردو سے شایع ہوا

اردو

جلد ۱۷ | اپریل سنہ ۱۹۳۷ ع | حصہ ۶۶

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابتہ اپریل سنہ ۱۹۳۷ ع

:o:

مقالات گارساں دتاسی

هندوستانی زبان و ادب (سالانہ تبصرہ)

سنہ ۱۸۷۰ ع

(خطبات گارساں دتاسی اس سے قبل شایع هوچکے هیں - یہ وہ خطبے تھے جو وہ هر سال سنہ ۱۸۵۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک اپنے طلبہ کو بحیثیت پروفیسر کے هندستانی زبان و ادب پر دیتے تھے - لیکن اس کے بعد بھی وہ هندستانی زبان و ادب پر سالانہ تبصرے شایع کرتے رهے - ان تبصروں کا مجموعہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے تلاش کرکے همارے لیے بہم پہنچایا ' جن کا ترجمہ مسلسل اردو میں شایع هوتا رهے گا - گارساں دتاسی نے یہ معلومات بڑی محنت سے جمع کرکے مرتب کی تھیں جو بہت دلچسپ اور قابل قدر هیں - اڈیٹر) -

گزشتہ سال کے نصف آخر میں فرانس (جرمنی کے خلاف) تباہ کن جنگ میں مبتلا رها جس کی وجہ سے یہ ممکن نہ هوسکا کہ میں میقات مقررہ پر اسباق هندوستانی کا افتتاحیہ خطبہ پڑھ سکوں - چنانچہ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کے لیے جو هندوستان کی ادبی و معاشری تحریک کے ساتھ لگاؤ رکھتے هیں ایک دوسرے ذریعے سے دلچسپی کا سامان مہیا کروں ۔ واضح رهے کہ سنہ ۱۸۷۰ ع میں هندوستان میں جو ادبی اور معاشری تحریک جاری رهی هے اور اس کا جو اظہار هندوستانی زبان کے ذریعے سے هوا هے ' میں اس کا اس وقت جائزہ لیتا هوں —

دهلی کالج کو جس کا نام "دارالعلوم" هے اس قدر کامیابی نہیں نصیب هوئی جتنی کہ مسلمانوں کو توقع تھی - سنہ ۱۸۶۹ ع کے آخر میں

۱۸۶۹ ؟

اس کالج کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا - پہلے معتمد نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھی جو زیادہ اطمینان بخش نہیں تھی - اس کے بعد مولوی سید محمد عا... نے جو خاص طور پر اس جلسے میں شرکت کے لیے مرزا پور سے آئے تھے ایک نہایت پر جوش تقریر کی جس میں انہوں نے مسلمانوں کی ا... علوم دینی اور مذہبی زبان کی طرف سے بے توجہی کی جانب اشا... کیا - موصوف نے مسلمانوں کو اپنی حالت بہتر کرنے کے متعلق نہایت دل نشین اور موثر الفاظ میں توجہ دلائی - اس تقریر کا اتنا اثر ہو... کہ بعضوں کے آنسو نکل آئے اور بعض دھاڑیں مار مار کے رونے لگے - اودھ اخبار نے ۸ کالموں میں اس تقریر کو نقل کیا ہے - مقرر نے خاص کر اس موضوع پر زور دیا ہے کہ وہ سائنس جو مذہب پر مبنی ہو دنیا میں سب کچھہ کر سکتی ہے لیکن اگر ایسا نہیں تو وہ محض بے کار ہے - یہ تقریر اس قدر طویل ہے کہ میں پوری اس جگہ نہیں نقل کر سکتا - ہاں اس کے ابتدائی حصے کے چند جملے یہاں نقل کرتا ہوں :-

" مسلمانو ! بارہ سو برس گزرے کہ اللہ تعالیٰ نے علم دین کی شمع عرب میں روشن کی جس کی روشنی سے ساری دنیا منور ہوگئی - آٹھہ سو سال کا عرصہ ہوا کہ اس دین کی شعاعیں ہندوستان کی سر زمین پر پہنچیں اور اس ملک کے ہر گوشے میں اجالا ہوگیا - اسی شہر دہلی سے دین اسلام کی روشنی سارے ملک میں پھیلی - اس لیے کہ جب مسلمان فرماں رواؤں نے ہندوستان کو فتح کیا تو انہوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس کی ترقی و فلاح کی کوشش کی - انہوں نے عرب و ایران کے مشہور علما و فضلا کو دعوت دے کر بلایا اور یہیں

انہیں آباد کیا غرض کہ یہ شہر علم و فضل کا مرکز بن گیا - ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کو دنیا میں وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو شہر دہلی نے حاصل کی اور نہ کہیں علم و فن کی وہ ترقی ہوئی جو اس شہر میں ہوئی - مسلمانو' تمہیں یاد ہے کہ نہیں کہ یہ تمہارے اجداد ہی تھے جنہوں اہل ہند کو علوم سکھائے اور ان کے امام بنے - مجھے خوف ہے کہ کہیں اب تمہارے متعلق یہ نہ کہا جائے کہ تم میں اتنی صلاحیت بھی نہیں کہ اپنے بزرگوں کی علمی تصانیف کو پڑھ سکو اور ان تواریخ کو سمجھہ سکو جن میں ان کی فتحمندیوں اور کشور کشائیوں کے وقائع درج ہیں " * —

سید موصوف نے مسلمانوں کی پستی اور ان کی برائیوں کا جو ذکر کیا ہے اس سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت بیداری کے آثار پیدا ہوچکے ہیں - وہ پھر سے اپنے علوم و فنون کو زندہ کرنے کے متمنی ہیں - اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ان میں اپنے مذہب کے متعلق قدیم کتب کے شایع کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے - چنانچہ تفسیر و حدیث کی کتب مثلاً بیضاوی اور بخاری وغیرہ کے ایڈیشن خوب فروخت ہو رہے ہیں —

کلکتے کے مسلمانوں کی ادبی انجمن کے معتمد مولوی عبداللطیف بہادر ہیں جو مستقل معتمد معلوم ہوتے ہیں - یہ انجمن خوب ترقی کر رہی ہے - اس قسم کی ادبی انجمنیں ہر بڑے شہر میں قایم ہو رہی ہیں - علی گڑھ اخبار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل سرائے کی انجمن

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے - (مترجم) -

خاص جوش و انہماک کے ساتھ کار گزار ہے۔ اس انجمن کے پچھلے جلسے میں بابو امبکا چرن چٹرجی نے "انسان اور اس کے فرائض" پر ایک نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی۔* اس کے علاوہ بابو دینا ناتھ گنگولی نے ایک نہایت دلچسپ تقریر فرمائی جس میں انہوں نے ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہردوار کے سفر کے کوائف بیان کیے۔† یہ انجمن ہندوستانی زبان کے ذریعے اہل ہند کی تعلیم کے لیے بھی خاص طور پر کوشاں ہے اور اس ضمن میں متعدد اہم تجاویز منظور کی گئی ہیں۔ یہ انجمن عقد بیوگان کے متعلق بھی پرچار کر رہی ہے۔ پچھلے زمانے میں ہندوستان میں بیوہ عورتوں کو عقد ثانی کی اجازت تھی۔ جس طرح یہودیوں میں ہے کہ شوہر کے مرجانے پر بیوہ عورت شوہر کے بھائی کے ساتھ نکاح کرلیتی ہے اسی طرح ہندوؤں کی نیچ اقوام میں بھی یہ دستور پایا جاتا ہے۔ گزشتہ زمانے کے رسم و رواج چاہے کچھ بھی کیوں نہ رہے ہوں اب اس وقت انجمن کی جانب سے ہندی میں پنڈتوں کے لیے ایک اپیل شایع ہوئی ہے تاکہ ان کی قطعی رائے معلوم کی جاے —

دھلی کی ادبی مجلس کی جانب سے اس کے جلسوں کی کارروائی اردو میں رسالے کی صورت میں اکمل المطابع سے شائع ہوتی ہے۔ اس رسالے کے سرورق پر ایک شعر لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے "فلسفہ و خطابت کی ترقی کے لیے اس انجمن کے جلسے منعقد ہوتے ہیں جن کا ذکر ان اوراق میں مندرج ہے" —

بہار کی مجلس علمی (سائنٹفک سوسائٹی) کا مرکز مظفر پور ہے۔

* علی گڑھ اخبار ۲ مارچ سنہ ۶۹ ع میں ۲ کالموں میں یہ تقریر نقل کی گئی ہے۔

† علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۷۰ ع —

اس انجمن کے ارکان بیشتر مسلمان ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے عامۃ الناس کی اخلاقی و ذہنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے اسباق کے ذریعے تعلیم کا انتظام کیا جائے - انجمن نے ایک یہ تجویز بھی منظور کی ہے کہ مغربی تصانیف کے ہندوستانی میں ترجمے کرائے جائیں —

انجمن ایک رسالہ بھی شایع کرتی ہے انجمن کے ارکان کا ارادہ ہے کہ اس کے لیے ایک عمارت بنوائی جائے، ایک بڑا کالج قایم کیا جائے - اور غربا کے لیے زراعت و حرفت کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے - اس وقت انجمن کے پانچ مدارس چل رہے ہیں جن میں بلا امتیاز مذہب ہندو اور مسلمان شریک کیے جاتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی لوگوں کو غیر مذہب والوں کے ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا جس طرح کہ فرانس اور آئیرلینڈ میں بعض لوگوں کو ہوتا ہے جو دوسرے عقاید والوں سے بالکل علحدہ رہنا چاہتے ہیں - ان مدارس میں ایک مدرسے نے خاص طور پر ترقی کی ہے - یہاں اردو کے ذریعے سے مغربی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور طلبہ کو اپنی مذہبی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی ہے - چنانچہ ایک پنڈت سنسکرت کی تعلیم کے لیے اور مولوی عربی کے لیے مقرر ہے * —

بندھیلکھنڈ کے ضلع باندہ میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ایک ادبی مجلس قایم کی ہے جس کے جلسے ہفتے کے دن شام میں منعقد ہوا کرتے ہیں - بابو پورنا چند اس مجلس کے صدر ہیں اور بابو گنگا دھر مکرجی معتمد ہیں † —

* علی گڑھ اخبار مورخہ یکم جولائی و ۵ اگست سنہ ۶۹ ع میں یہ لکچر پورا شایع ہوا ہے -
† اخبار عالم مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع مطبوعہ میرٹھ —

مسٹر ڈیگنٹن نے آگرے میں ایک انجمن قایم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے - اس انجمن کے قواعد و ضوابط مرتب ہو چکے ہیں اور اس کے عہدہ دار بھی مقرر کیے جا چکے ہیں * —

مہندر لال رئیس کلکتہ کی تجویز کے مطابق ایک جدید انجمن کی بنا ڈالی گئی ہے - اس انجمن کے قیام سے اہل ہند کی توجہ اس کی جانب منعطف ہوگئی ہے اور توقع ہے کہ یہ انجمن خوب کامیابی حاصل کرے گی جس کی کہ وہ مستحق ہے † —

بنارس کے ان نوجوانوں نے جو اپنی تعلیم ختم کرچکنے کے بعد بھی علم سے اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہتے ہیں ایک ادبی مجلس قایم کی ہے جس کا نام "انجمن نوجوانان بنارس" ہے - اس میں شہر 'بنارس' کے مختلف نوجوان شریک ہیں - اس انجمن کا مقصد عام اصلاح ہے - پچھلے اپریل کی ۱۹ کو اس انجمن کی دوسری سالگرہ منائی گئی - اس موقع پر بابو شیو پرشاد نے اردو میں ایک تقریر کی اور یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ایک ماہانہ یا سہ ماہی رسالے کا اجرا کیا جائے جس میں صرف ارکان انجمن کے مضامین شایع ہوا کریں گے —

ہمیں برہمو سماج سے جسے رام موہن رائے نے سنہ ۱۸۳۰ ع میں قایم کیا تھا ' اسواسطے اور بھی زیادہ دلچسپی ہے کہ اس کی ترقی دراصل ہندوستان میں مسیحی مذہب کے مرادف ہے ‡ سنہ ۱۸۶۹ ع کے آخری

---

* علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۰ مئی سنہ ۱۸۷۰ ع —

† علی گڑھ اخبار مورخہ ۴ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع —

‡ اس کے متعلق تفصیلی معلومات سوفیہ ڈابسن کولٹ کی کتاب "ہندوستانی توحید" میں ملیں گی - اس کتاب کے سرورق پر بطور چے جی وہیٹر کے بارہ اشعار درج ہیں جن میں سے میں ایک یہاں نقل کرتا ہوں : "روح القدس کے سفید پروں کا سایہ ہر کس و ناکس کے سر پر رہتا ہے ' چاہے انہیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے" —

ایام میں بابو کیشب چندر سین نے جو اس وقت اس فرقے کے سرگروہ ہیں اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے لیے ایک نئے مندر کا افتتاح کیا † اس جلسے میں بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی شرکت کی (‡) اب تک اس فرقے میں صرف بنگال کے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوتے تھے لیکن اب اس کا اثر اور آگے بڑھ رہا ہے - گزشتہ سال اس فرقے کی سولہ عبادت گاہیں مشرقی بنگال ' پنجاب ' بمبئی اور دکن میں قائم کی گئیں - دس برھمو مبلغین نے بنگال اور شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں سفر کیا اور انھیں اپنے مقصد میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی - (§) منگلور کے باشندوں نے اس جماعت کی مرکزی مجلس کو لکھا ہے کہ ہماری تعلیم و تلقین کے لیے مبلغین کو بھیجا جائے تاکہ وہ اس اصلاحی تحریک میں شرکت کرسکیں —

ہندؤں میں بعض ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ برھمو سماج

(*) بابو دیکھیے " - بابو کشیب چندر سین بچپن میں یتیم ہوگئے تھے اور کلکتے کے ایک کالج میں انھیں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا - اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ بت پرستی سے نفرت ہوگئی اور آہستہ آہستہ غور و فکر اور عبادت سے انھوں نے خدا کی وحدت کو پہچانا - اس زمانے میں برھمو سماج کی انجمن وجود میں آچکی تھی - انھوں نے اس میں شرکت کرلی اور کچھ عرصے بعد وہ اس انجمن کے پر جوش حامیوں اور چلانے والوں میں ہوگئے - بہت دنوں تک کلکتے کے ایک مندر میں ہندوستانیوں کے بڑے مجمع کے روبرو وہ وعظ و تلقین کرتے ہیں - آج اس انجمن کے پچاس عبادت خانے (مندر) ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں - کشاب چندر سین نے تعلیم کی نشر و اشاعت میں بھی بہت جد و جہد کی - اس کے علاوہ عورتوں کی حالت کو سدھارنے ' اور ذات پات کو توڑنے کا کام ان کے مقاصد میں شامل ہے - اس لیے کہ یہ رسوم تہیہ ملک کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرتی تھیں - برھمو سماج کی تحریک نے ہندو معاشرہ میں ہل چل ڈال دی ہے اور بالخصوص متوسط طبقے کے امرا اس تحریک سے بہت زیادہ متاثر ہیں - (عقیدہ و کلیسا - یکم جولائی سنہ ۱۸۷۰ ع) -

(†) انڈین میل ' مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع -

(‡) انڈین میل ' مورخہ ۸ مارچ سنہ ۱۸۷۰ ع -

§) انڈین میل' مورخہ ۹ فروری و ۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع -

ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کرے - مثلاً بابو پرتاپ چندر نے گزشتہ مئی کے مہینے میں ہندوستانیوں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی - یہ تقریر جوش اور خطابت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے اس میں موصوف نے حاضرین کو عالمگیر مذہب کے خیال سے مانوس کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے کہا "اگرچہ دنیا میں بہت مذاہب ہیں لیکن ان سبھوں میں بعض ایسے اصول ہیں جنہیں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے - جیسے خدا کی ربوبیت انسانوں کی اخوت ' خدا کے آگے انسان کی اطاعت اور موت کے بعد کی زندگی وغیرہ - بالکل ممکن ہے کہ انہیں اصولوں پر ایک عالمگیر مذہب کی بنا رکھی جائے " (*) —

جیسا کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہے اس قسم کا عقیدہ کوئی نئی چیز نہیں ہے - گزشتہ صدی کے بعض فلسفیوں نے اس کی تلقین کی - یہ عقیدہ اس تعلیم سے بالکل مختلف ہے جس کی حضرت مسیح نے اشاعت کی جس سے ہمارے دلوں کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور جس پر ہماری آیندہ نجات کا دارومدار ہے - وہ حضرت مسیح جن کی ذات خدا اور انساں دونوں کا مجموعہ تھی - ان کی حیثیت صرف ایک مظہر الٰہی کی نہ تھی جیسا کے بعضوں کا خیال ہے - نہ وہ حضرت موسیٰ کی طرح محض ایک ہی تھے اور نہ سقراط اور کنفوشس کے مثل تھے —

بابو کیشب چندر سین گزشتہ فروری میں ہندوستاں سے انگلستان روانہ ہوئے - ان کے ہمراہ چھ نوجوان ہندو تھے جو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے تھے - ان میں سے بعض قانون کی اور بعض طبابت کی تعلیم حاصل کرنے کا قصد رکھتے ہیں - ان نوجوانوں میں سے پانچ

(*) مدارس ٹائمز مورخہ ۲۸ اپریل سنہ ۱۷۷۰ ع

پڑھتے ہیں - (*) میسور کے مہاراجا کے خاندان کے ۸ نوجوان بھی انگلستان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہیں - خود کیشب چندر سین کے یورپ آنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسیحی مذہب کے متعلق تحقیق کریں اور اس کے اصول اور عملی زندگی میں اس کا جو تطابق کیا جاتا ہے اس کے متعلق معلومات حاصل کریں - موصوف انگلستان میں اہل ہند کے ترقی پذیر عناصر کی نمائندگی کررہے ہیں اور اگر ضرورت ہوگی تو وہ اہل ہند کی ضروریات اوران کی توقعات ملکہ کے سامنے پیش کرسکیں گے - انہیں ایک مرتبہ ملکہ کے یہاں شرف باریابی حاصل ہوچکا ہے - موصوف انگریزی زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں - انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد انہوں نے ریورنڈ جے مارٹینو کے کلیسا میں اور پھر' ہینوور اسکوائر' کے ہال میں تقریریں کیں - دونوں موقعوں پر حاضرین میں نہایت چیدہ اہل علم کا مجمع تھا جس نے تحسین و آفرین کے نعروں سے موصوف کے ساتھ اظہار عقیدت کیا - کیشب چندر سین نے اپنی پہلی تقریر میں خدا کے وجود کی ہمہ گیری ' حضرت مسیح علیہ السلام اور مسیحیت پر اظہار خیال کیا اور دوسری تقریر کا موضوع ہندوستان کی اخلاقی نشاۃ ثانیہ تھا - ایسٹر کے روز بھی " فنسبری کے گرجا South Place Chapel میں خدا کی محبت کے موضوع پر تقریر کی - یہ تقریر بالکل مسیحی نقطۂ نظر سے کی گئی اور لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ تقریر کلیسائی وعظ کی حیثیت رکھتی تھی - دو ہفتے بعد موصوف نے الگزنڈن کے کلیسا میں تقریر کی - یہ کلیسا موحدین کے لیے مخصوص ہے - گویا کہ بابو صاحب اِس موقع پر اپنے ہم مذہبوں میں موجود تھے - موصوف نے بعد میں بھی متعدد مقامات پر تقاریر کیں - اس پر جن کی مشہور عبادت گاہ

(*) علی گڑھ اخبار - مورخہ ۱۸ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع -

میں بھی ان کی تقریر ہوئی - اب وہ ہندوستان واپس ہوچکے ہیں اور ۱۵ اکتوبر کو بمبئی پہنچ گئے ہیں - بمبئی پہنچنے کے بعد اتوار کے روز کلکتہ روانہ ہونے سے قبل اپنے احباب کے اصرار پر انہوں نے ایک تقریر کی تھی - اس تقریر کا موضوع سفر یورپ کے تاثرات سے متعلق تھا - بعض باتوں میں موصوف کی رائے یورپ کے متعلق زیادہ اچھی نہیں ہے (*) —

بابو کیشب چندر سین اور ان کے متبعین برھمو سماجی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ویدوں کی تعلیم وحدت الٰہی کے عقیدے پر مبنی ہے - یہی حقیقی ہندو دھرم ہے جس کی طرف ہندو سماج کو لوٹ کر آنا چاہیے لیکن بعد میں جب ویدوں کی تعلیم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں تو فطرت پرستی کی تلقین کی گئی ہے اور جن رسوم کی پابندی عاید کی گئی ہے وہ نہایت درجہ ادنیٰ حثیت رکھتی ہیں - چنانچہ اس ملک کے ایک دوسرے مشہور شخص دیندرا ناتھ ٹگور نے صاف طور پر اس کا اعلان کردیا کہ برھمو سماج اپنے عقاید کو ویدوں کی تعلیم پر مبنی قرار دیتے نہیں بلکہ وہ وحدت الٰہی کے عقیدے پر چاہیے وہ ویدوں میں ہو یا نہ ہو، ایمان رکھتے ہیں —

قدیم ہندو مت نے ابھی شکست تسلیم نہیں کی ہے - برھمو سماج کے مقابلے کے لیے "دھرم سبھا" موجود ہے جس میں پرانے خیال کے ہندؤوں کی بہت بڑی تعداد شریک ہے - اس جماعت کے جلسے پابندی کے ساتھ کانگڑھ میں منعقد ہوا کرتے ہیں جن کی نسبت "اودھ اخبار" میں تفصیلات شائع ہوتی ہیں - اس جماعت کے اجلاس شروع ہونے سے قبل

(*) یہ تقریر اور اس کے بعد کی چار تقریریں شائع ہوچکی ہیں —

ارکان بھوانی (درگام کے بت کے سامنے جاکر قنقوت کرتے ھیں - بھوانی کو " شری مھی مائی جی " بھی کہتے ھیں - اودھ اخبار کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ قدیم خیالات کے ان هندؤوں کی انجمن نے اپنے خیالات کی نشرو اشاعت کا کام شروع کردیا ھے - اس کے جلسوں کی روئداد ان هندؤوں کے پاس بھیجی جاتی ھیں جو اس کے خیالات کے حامی ھیں —

باوجود قدامت پسند هندوؤں کی مساعی کے هندوستان برابر ترقی کی منزل کی طرف گامزن ھے - اگرچه ذات پات کی تقسیم مٹی نہیں لیکن نیچی ذات والوں کو چند سال سے بہت سی رعایتیں حاصل ھورھی ھیں (*) پنڈتوں نے اب یه بات تسلیم کرلی ھے کی منو کے شاستر کی روسے بیوہ عورتوں کا عقد ممنوع نہیں ھے - انہوں نے یه بھی تسلیم کرلیا ھے که سمندر کا سفر کرنے سے کسی کی ذات نہیں جاتی - اور اب تو برهمنوں کے گوشت کھانے اور شراب پینے کو بھی زیادہ اهمیت نہیں دی جاتی - اب اس بات کا بھی احساس شروع ھوگیا ھے که لڑکیوں کی شادی سن بلوغت سے پہلے نه کی جاے - برهمنوں کو اس پر اعتراض نہیں ھوتا که جن مدارس میں ان کے بچے تعلیم حاصل کرتے ھیں انہیں میں نیچی ذات والوں کے بچے بھی پڑھنے آئیں - کلکتے کی دھرم سبھا کا صدر آج کل ایک شدر ھے اور برهمن معتمد ھے - بنگال میں برهمن لوگ اس قسم کی ملازمتیں کرنے لگے ھیں جو ان کی ذات کے شایان شان نہیں کہی جاسکتیں - غرض که مختصراً هم یه کہه سکتے ھیں که ذات پات کے امتیاز کی مذهبی نوعیت باقی نہیں رهی بلکه وہ اب ایک سول ادارے کی حیثیت اختیار کرتی جارهی ھے —

(*) انڈین میل مورخه ۱۹ اپریل سنه ۱۸۷۰ ع —

کپورتھلہ کے راجا اندھیر سنگھہ جی ہندوستان سے یورپ آنے کے لیے روانہ ہوے لیکن دست اجل نے انہیں یہاں تک پہنچنے نہیں دیا۔ موصوف ایک نہایت عالی دماغ شخص تھے اور ان کی تعلیم ان اصولوں پر ہوئی تھی جن کے مطابق شہزادوں کی تعلیم ہونی چاہیے۔ آپ مہاراجا رنجیت سنگھہ کے حریف کے پوتے تھے۔ آپ کا مقصد تھا کہ انگلستان میں اپنے قابل وزیر متھراداس کے ساتھہ چند مہینے رہیں۔ آپ کے ساتھہ مشہور مستشرق عالم نسولی اور بیس ہندوستانی تھے۔ موصوف ۱۵ مارچ کو بمبئی سے جہاز پر سوار ہوے اور ۳ اپریل کو داعئی اجل کو لبیک کہا۔ نعش بمبئی پہنچائی گئی۔ ہندوستان کے لیے راجا صاحب کی موت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ راجا صاحب نہایت روشن خیال اور غیر متعصب شخص تو۔ بعضوں کا تو خیال ہے کہ راجا صاحب عیسائی ہوگئے تھے۔ لیکن میرے خیال میں انہوں نے مسیحی تعلیم کو دل سے قبول کرلیا تھا چاہے اس کا اظہار نہ کیا ہو۔ اس وجہ سے راجا صاحب کی یاد ہم لوگوں کو اور بھی زیادہ عزیز ہونی چاہیے —

کولہا پور کے نوجوان راجا صاحب انگلستان بخیروعافیت پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے یہ سفر کیا۔ کولہاپور کے ایجنٹ کپتان ای ڈبلو واٹ نے نہایت سعی و کاوش سے راجا صاحب کو مغربی طرز کی تعلیم سے روشناس کردیا ہے اور کپتان موصوف اس سفر میں بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ راجا صاحب کی اس وقت صرف ۲۰ سال کی عمر ہے۔ سید عبداللہ سے مجھے معلوم ہوا کہ موصوف نہایت خوش مزاج اور قابل نوجوان ہیں۔ آپ انگریزی زبان بلا تکلف لکھہ پڑھ سکتے ہیں اور گفتگو کرسکتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ان اوصاف

کی وجہ سے انگلستان کی اعلیٰ سوسائٹی میں ان کی قدر ہوئی ہوگی- لیکن کیا بدقسمتی ہے کہ براعظم کے راستے سے وطن واپس ہوتے ہوئے ہونہار راجا نے بتاریخ ۳۰ نومبر سنہ ۱۸۶۹ ع بمقام فلورانس انتقال کیا- ہندؤوں کے طریقے کے مطابق نعش کو دریائے آرنو کے کنارے نذر آتش کردیا گیا اور راکھ گنگا میں ڈالنے کے لیے ہندوستان لے گئے —

خبر ہے کہ عنقریب مہاراجا الور اور بیگم صاحبہ بھوپال یورپ آنے والے ہیں- ہمیں پوری توقع ہے کہ ثانی الذکر کا انگلستان میں گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا جائے گا - موصوفہ کے والدہ کی یاد ابھی وہاں لوگوں کے دلوں میں زندہ ہونی چاہیے (*) —

آج کل ہندوستانیوں کی اچھی خاصی تعداد یورپ کے سفر کی غرض سے آرہی ہے - ان میں سے اکثر شہر لندن آتے ہیں جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ مہذب دنیا کا یہ مرکز ہے - وجاہت علی جو اخبار مرأت (اردو اور ہندی) کے مدیر ہیں لندن آے تھے - موصوف نے اردو میں " آئینۂ لندن " کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا ہے جس کا مقصد اپنے ہم وطنوں کی رہبری ہے - یہ رسالہ ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں انگلستان کے دارالحکومت کی خاص خاص عمارتوں کی تصاویر بھی ہیں —

ہندوستانی زبان کے متعلق جو جھگڑا پیدا ہوگیا ہے اس کا بھی خاتمہ نہیں ہوا- دو علحدہ علحدہ جماعتیں قایم ہوگئی ہیں- ایک ہندؤوں کی اور دوسری مسلمانوں کی- میں نے اپنے سنہ ۱۸۶۹ ع کے خطبے میں اس کی نسبت ذکر کیا تھا† ہندو اہل ادب صاف صاف کہتے ہیں کہ

(*) الئنڈین میل ' مورخہ ۲۲ نومبر ۱۸۷۰ ع —

† میرے خیالات کے متعلق اہل ہند نے اچھی راے کا اظہار کیا ہے - چنانچہ میرا یہ خطبہ ہندوستانی میں " علی گڑھ اخبار " میں (مع انگریزی ترجمے کے) اور لکھنؤ کے اخبار "تہذیب" میں شائع کیا گیا ہے-

ان کے کاندھوں پر مسلمانوں کی حکومت کا جوا اتنے عرصے رہا ہے کہ وہ اردو کو کبھی پسند نہیں کرسکتے - وہ اپنی ازمنۂ وسطیٰ کی بولی کو، جسے وہ هندی کہتے هیں، اردو پر ترجیح دیتے هیں - بعض هندو لوگ اس خیال کے بھی قائل هیں کہ اپنے موجودہ آقاؤں کی زبان یعنی انگریزی کو اختیار کرلیا جاے - لیکن ظاهر ہے کہ انگریزی زبان اهل هند کی زبان کے ساتھہ کوئی تعلق نہیں رکھتی —

اردو اور هندی کے قضیے نے اس قدر اهمیت اختیار کرلی ہے اور اس قدر عام هوگیا ہے کہ اس کے متعلق نوجوانوں سے امتحانوں میں سوالات دریافت کیے جاتے هیں - چنانچہ گزشتہ سال فروری میں لکھنؤ میں جو امتحان لیا گیا اس میں اس کے متعلق سوال موجود تھے - (ملاحظہ هو "اخبار سرشتۂ تعلیم اودھ مورخہ یکم فروری سنہ ۱۸۷۰ ع) - وہ سوالات یہ هیں :—

(۱) واضح کروکہ اودھ کی عدالتوں میں اردو کا (فارسی رسم خط میں) یا هندی کا (ناگری رسم خط میں) استعمال مفید اور قرین انصاف هوگا —

(۲) اردو اور هندی کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو - اسی طرح فارسی اور ناگری رسم خط کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو - عوام الناس کے لیے ان هردو زبانوں میں سے کس زبان کے استعمال میں زیادہ سہولت ہے —

(۳) اردو اور هندی سے کیا مراد ہے ؟ - ان دونوں کا فرق واضح کرو -

(۴) اردو اور هندی سے کونسی زبانیں مراد هیں - تم کن تصانیف کو

اردو کی اور کن کو ہندی کی کہو گے* -

ان سوالوں سے آپ خود سمجھہ سکتے ہیں کہ امتحان کے امیدواروں کو اس مسئلے کی نسبت مستقل رائے رکھنی چاہیے —

ہندوستان کے اہل علم کے طبقے میں اردو اور ہندی کی باہمی رقابت کے باعث کشاکش پیدا ہوگئی ہے - لکھنؤ کی انجمن تہذیب" کے ارکان میں مولوی محمد حسین نے جو اس انجمن کے روح رواں ہیں، اس قضیے کے متعلق موافق اور مخالف تقریروں کا خلاصہ شائع کیا ہے جو اس انجمن کے زیر اہتمام جلسوں میں ہوئیں - ہر تقریر کے بعد جو مباحثہ ہوا اس کا بھی ذکر کیا ہے - موصوف نے ایک ایک کر کے ہندوؤں کے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اردو کے خلاف اور ہندی کی موافقت میں کیے جاتے ہیں - موصوف کا یہ رسالہ جس میں ان تمام کارروائیوں کے متعلق اور مختصراً ذکر ہے - ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے "انجمن تہذیب" کے ماہنامے کی اور اس کی تقطیع ایک ہی ہے - ہر صفحہ پر ۲۱ سطریں ہیں - یہ رسالہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :-

" اردو زبان اپنی وسعت، حسن اور شیرینی میں اپنی نظیر آپ ہے - اس کے ذریعے سے قانونی، ادبی اور علمی مطالب پوری طرح ادا کیے جاسکتے ہیں - یہ زبان سارے ملک میں استعمال ہوتی ہے - ہم اس کو کسی ایک صوبے سے مختص نہیں کرسکتے " -

" علی گڑھ اخبار" مورخہ ۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ ع اس میں بحث کے متعلق ایک نہایت معقول مضمون شایع ہوا ہے جس کا عنوان ہے " ہندی زبان کیا چیز ہے " - اس مضمون کے بعض اقتباس ہدیۂ ناظرین ہیں -

* سوالات کا ترجمہ فرانسیسی سے کیا گیا ہے (مترجم) —

"ہندی زبان کے حامی ایک ایسی زبان چاہتے ہیں جس میں ہندوستانی کے سب تصریفی قواعد حسب دستور برقرار رہیں - صرف یہ کیا جائے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ کی جگہہ سنسکرت کے لفظ ٹھونس دیے جائیں - دراصل یہ زبان اس وقت تک وجود میں نہیں آئی ہے اور ہمارے خیال میں اس کو وجود میں لانے کی کوشش غیر ضروری ہے - ہندو ادیب اپنے استعمال کے لیے ہندی زبان چاہے بنا لیں لیکن اس طرح وہ اپنے تئیں عام قومی ادب کے نشوونما سے علحدہ کرلیں گے اور زبان بھی بالکل علحدہ ہوجائے گی - یہ دعوی کرنا کہ اس نئی زبان سے ان کاشتکاروں کو سہولت ہوگی جو انگریزی قانون کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں اور جنھیں عدالتوں میں حاضر ہونا پڑتا ہے ' سراسر غلط ہے - ظاہر ہے کہ عدالتوں کی زبان میں اصطلاحات کے استعمال کے بغیر چارہ نہیں - دیہاتی زبانیں اس قدر مبہم ہوتی ہیں کہ وہ ان اصطلاحات کے مطالب پر کبھی بھی حاوی نہیں ہوسکتیں - یہ عدالتی اصطلاحیں بالعموم فارسی یا عربی سے مستعار لی گئی ہیں اور عام طور پر سمجھی جاتی ہیں - اب اگر ان کی جگہہ دوسری اصطلاحیں وضع کی جائیں گی تو اس سے سب کو بڑی پریشانی ہوگی —

اب ہندو شور کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ ان اصطلاحوں کو پس پشت پھینک دیا جائے جو ساری ہندوستانی قوم میں سمجھی جاتی ہیں جس حد تک کہ اس قسم کے الفاظ عام طور پر سمجھے جاسکتے ہیں - وہ ان الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رائج کرنا چاہتے ہیں جن سے موجودہ زبان بالکل ناآشنا ہے ایسا کرنے کی وہ یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہے اور سنسکرت ایک ہزار

سال قبل ان کی زبان تھی - یہ بات بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انگریز عالم یہ کہے کہ انگریزی زبان میں سے کل لاطینی اور فرانسیسی الفاظ خارج کردیے جائیں اور ان کی جگہ سلیس زبان کے الفاظ رائج کردیے جائیں " —

اگر اس امر پر غور کیا جاے کہ اردو زبان جس زمانے میں وجود میں آئی اور اسے نشو ونما حاصل ہوئی تو معلوم ہوگا کہ اس وقت کئی صدی تک برابر اس کو مختلف رجحانات سے واسطہ رہا - آج اہل ہند میں مختلف دور گزرنے کے بعد ایک طرح کی سول برادری پیدا ہوگئی ہے - متعدد شہنشاہیوں اور حکومتوں کے بعد یہ صورت اب جاکر پیدا ہوئی ہے - ہر شخص اس بات کو تسلیم کرےگا کہ قدیم زمانے کے ساتھ یک لخت قطع تعلق نہیں کیا جاسکتا ' ماضی کے ساتھ تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے - در اصل جو کچھ ہے اس کو ترقی دینا ہے نہ کہ بالکل نئی بنیاد قائم کرنا ہندو لوگ جو ہندی کو رائج کرنا چاہتے ہیں تو وہ در اصل ایک نئی اور عجیب و غریب عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں (*) —

فٹز ایڈورڈ ہال (Fitz Edward Hall) نے بھی ' جو ایک جید عالم ہیں اور ہندی زبان کے حامیوں میں ہیں ' اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہے در اصل بالکل جدید زبان ہے - انیسویں صدی کے خاتمے پر جو ہندی رائج ہوگی وہ بہت مختلف ہوجاے گی -

---

(*) مضمون نگار نے جس کے مضمون کے اقتباس میں نے یہاں درج کیے ہیں ' ہمیں یقین ' دلایا ہے کہ دھرم سنگھ کی تاریخ جو ہندی میں لکھی گئی ہے اس کا سمجھنا دشوار ہے - یہ کتاب سررشتہ تعلیم کی طرف سے شائع کی گئی ہے - اس کتاب میں پچیس تیس الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جنہیں انھوں نے کبھی اپنی عمر میں نہیں سنا جنہیں غالباً وہ کبھی عمر بھر نہیں سنیں گے —

موصوف اس کو بھی تسلیم کرتے ھیں کہ ھندی میں اردو کے جو چھوٹے الفاظ استعمال ھوتے ھیں اور میں ان قدیم سنسکرت الفاظ کے مقابلے میں کہیں زیادہ موسیقی پائی جاتی ہے جو بنارس میں بولے جاتے ھیں —

اردو اور ھندی کے قضیے کے متعلق منشی حکم چند نے جو دھلی کے ایک کالج میں پروفیسر ھیں، ایک مضمون میں اظہار خیال کیا ہے جس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے (*) —

" جس طرح بچوں کی زبان اُکھڑی اُکھڑی ھوتی ہے اور ان کے فقرے بے ربط ھوتے ھیں اسی طرح گاؤں کے رھنے والے شہر والوں کے مقابلے میں اپنا مافی الضمیر صفائی اور صراحت سے نہیں بیان کرسکتے - ان کی زبان ناقص ھوتی ہے - وہ اپنے مطالب کے لیے ٹھیک لفظ اور اصطلاح استعمال کرنا نہیں جانتے - دنیا کی تمام زبانوں میں آپ یہی حالت پائیں گے - اس میں کسی ایک زبان کو دوسری پر فوقیت حاصل نہیں ہے - جب تک کہ کوئی زبان مکمل نہ ھوجائے اس کے خط و خال نمایاں نہیں ھوتے اور اسے ھم اعلیٰ درجے کی زبان نہیں کہہ سکتے - اگر ھم اپنی زبان میں لفظ " پانی " " آب " یا " واٹر " استعمال کریں تو مطلب سب لفظوں سے ایک ھی ھوگا - لیکن ان میں سے ایک لفظ کو ھم فصیح کہتے ھیں اور دوسرے کو غیر فصیح - دراصل ھمیں الفاظ پر نہیں جانا چاھیے - غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم ھونے کی بدولت بعض زبانوں کو نشو و نما کا پورا موقع ملا اور انھوں نے اپنی ایک مخصوص صورت اختیار کرلی - مثلاً عربی، سنسکرت اور یونانی اپنے مخصوص خط و خال رکھتی ھیں اور ان

(*) یہ مضمون " اتالیق پنجاب " مورخہ جون سنہ ۱۸۷۰ ع میں شائع ھوا ہے - (اس جگہ فرانسیسی عبارت سے اردو ترجمہ کیا گیا ہے - مترجم) —

میں فصاحت و بلاغت کے خزانے پوشیدہ ہیں - ہر زبان میں آپ ترقی یا زوال کا رجحان پائیں گے اور دونوں حالتوں میں ان میں تبدیلیاں پیدا ہونا لازمی ہے - ہر صدی کے مشہور مصنفین اپنے زمانے کے ذوق کے ساتھ مطابقت پیدا کرلیتے ہیں - چنانچہ گزشتہ صدی کے مشہور شعرا میرتقی اور رفیع سودا نے جو محاورے اور الفاظ استعمال کیے اس میں سے بعض کو اس زمانے کے شعرا نے متروک قرار دیا ہے - کوئی زبان اپنی اصلی حالت پر قایم نہیں رہ سکتی - ہرزبان میں بعض لفظ متروک ہوتے رہتے ہیں اوران کی جگہہ دوسرے الفاظ رواج پاتے ہیں " —

" میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی زبان میں کیا خاص فرق ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے - میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی ایک زبان بھی ایسی کہی جاسکتی ہے جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہوگئے ہوں - اگر کوئی ایسی زبان موجود ہوتو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں - میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھہ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کرلیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی ہم خالص زبان کہہ سکتے ہیں - دراصل یہ تمام امور اردو زبان کی بحث سے خارج ہیں اسواسطے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس قدر زمانے سے ہندوستان میں استعمال کی جارہی ہے کہ اب اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھایا جاسکتا - یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہے کہ آیا اردو ایک خالص زبان ہے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہے - اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی جگہہ ہندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کردیا گیا ہے اور جس کی حیثیت

ایسی ہی ہے جیسے سنسکرت کی۔ ایک زمانہ تھا جب دلی والے جامہ پہنا کرتے تھے لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کردیا ۔ اگر کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جائے تو لوگ کیا کہیں گے ؟ اکثر لوگ اس کو بہروپیے سے تعبیر کریں گے ۔ زبانوں کا بھی یہی حال ہے ۔ اب اگر آپ "بدن" کی جگہہ "شریر" "آسمان" کی جگہہ "اکاس" اور "شہر" کے بجائے "سنگھ" استعمال کریں تو لوگ آپ کی ہر بات سمجھنے سے قاصر رہیں گے ۔ فارسی رسم خط کی جگہہ جو ناگری رسم خط استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کا بھی یہی حال ہے ۔ دراصل ایک دفعہ اگر بدیسی الفاظ کسی زبان میں چالو ہوجائیں تو اس زبان کو خالص بنانے کے لیے ان کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا اور نہ رسم خط کو بدلا جاسکتا ہے ۔ فردوسی نے شاہنامے میں عربی الفاظ بالکل نہیں استعمال کیے لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی ' انوری اور نظامی وغیرہم اس کا تتبع کرسکے ؟ بر خلاف اس کے ان شعرا کے ہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۔ اس اصول پر ہم اردو میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں ۔ اردو شہری زبان ہے ۔ ہندی دیہاتوں میں استعمال ہوتی اور اس میں بھی بہت سے عربی فارسی لفظ رائج ہوگئے ہیں ۔ شہروں میں ہر چھوٹا بڑا اردو بولتا ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے ۔ اردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور ان کی تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہورہا ہے اردو میں دوسری زبانوں کے مطالب ادا کرنے کی بھی بدرجہ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے " ۔

۱۴ جون سنہ ۱۸۷۰ ع کے "علی گڑھ اخبار" میں سول سروس کے امیدواروں کا جو زبان کا امتحان لیا جاتا ہے اس کے متعلق نہایت معقول

رائے کا اظہار کیا گیا ہے - یہ مضمون اصل میں انگریزی میں لکھا گیا تھا —
"اس کی کیا وجہ ہے کہ سول سروس کے امتحان میں جو اردو کا معیار رکھا گیا ہے اس کو اور زیادہ بلند نہیں کیا جاتا - اردو کی معمولی نثر اور گفتگو کی مشق سے یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوسکتی کہ فلسفیانہ مضامین کو سمجھا جاسکے یا شعرا سے کلام کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے جو ہندوستان میں بہت مقبولیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - اردو زبان تجارتی اغراض کے لیے بھی نہایت مفید ہے - یہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور پنجاب سے لے کر مدراس تک سمجھی جاتی ہے - بالخصوص پچھلے بیس برسوں میں اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا - چنانچہ سول سروس کے امتحان کا سنہ ۱۸۹۰ع کا نصاب دیکھیے اور اس کا اس سال کے نصاب سے مقابلہ کیجیے تو آپ کو اس ترقی کا اندازہ ہوسکے گا جو اردو زبان نے کی ہے - اب ہر صوبے کی زبان کو بھی اہمیت دی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبے آپس میں ایک دوسرے سے علحدہ ہوجائیں گے - چنانچہ بنگال کے صوبے میں بنگالی بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی اور مدراس میں تامل اور تلگو تسلیم کی گئی ہیں - لیکن ان صوبجاتی زبانوں کے متعلق جو دلچسپی ظاہر کی جارہی ہے اس کا کوئی عملی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا بلکہ الٹا اثر نظر آرہا ہے جس کا اظہار بمبئی میں ہورہا ہے - اس صوبے کی حکومت نے ان سپہیوں کے لیے جو سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں اردو کی تعلیم گزشتہ سال سے لازمی قرار دیدی ہے - ہمیں توقع ہے کہ صوبۂ مدراس میں بھی اس کی تقلید کی جائے گی اور اردو زبان اس طرح سارے ہندوستان کے لیے مبادلۂ خیالات کا ذریعہ قرار پائے گی - دراصل وہ تمام رجحانات جن سے مشترک زبان کی جو دوسری زبانوں پر حاوی ہے ' ترقی کی صورت

پیدا ہو ہمت افزائی کے مستحق ہیں - اس سے یہ ہوگا کہ تجارتی اور سول تعلقات میں سہولت پیدا ہوگئی - تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ مشترک زبان کی حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے - ہم امید کرتے ہیں کہ بنگال کے سول سروس کے امتحان میں بنگالی یا ہندی کے ساتھ اردو میں امتحان لیا جائے گا، بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی کے دوش بدوش اردو کو رکھا جائے گا - اور مدراس میں اردو کو تامل یا تلگو کے ساتھ شریک نصاب رکھا جائے گا (*) —

باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلم ہے - ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دوران سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصائد لکھے گئے جن کے متعلق اردو اخبارات سے ہمیں اطلاع ملی (†) آج کل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادۂ البرٹ کے مجسمے کی جو نمائش ہورہی ہے اس کے نیچے اردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہے - یہ مجسمہ ایک دولت مند پارسی مسٹر 'سیسون' نے بمبئی کے "وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم" کو بطور تحفہ پیش کیا تھا —

---

* اگرچہ صوبۂ بنگال کی زبان بنگالی ہے لیکن اردو' جیسا کہ میں پیشتر بوضاحت بیان کرچکا ہوں' وہاں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے - چنانچہ راجا کالی کرشن پرشاد نے حال ہی میں ملکۂ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقع پر سنسکرت زبان میں جو نظم لکھی تھی اس کا انہوں نے اردو میں بھی ترجمہ شائع کیا ہے اور اس کی ایک نقل مجھے بھی بھیجی ہے - یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کا بنگالی میں ترجمہ شائع نہیں کیا —

† بعض قصائد فارسی اور سنسکرت میں بھی لکھے گئے تھے - سنسکرت کی نظموں کو ہریؒ چندر نے شائع کیا ہے - یہ مجموعہ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے —

بہت کچھ پس و پیش کے بعد انگریزی حکومت نے کروڑوں کے خرچ سے دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ نوجوان ہندوستانیوں کو ان کی مادری زبان مفت سکھائی جارہی ہے حالانکہ انگریزی کی تعلیم کے لیے طلبہ کو خود خرچ کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم صرف اعلیٰ طبقے کے ہندوستانی نوجوان حاصل کرتے ہیں جو حکومت میں ملازمت کے خواہاں ہیں۔ میرے خیال میں حکومت کا طریق عمل اس باب میں نہایت قابل تحسین ہے۔ بعض ہندو لوگ اس پر اعتراض کررہے ہیں لیکن واضح رہے کہ یہ وہی اصحاب ہیں جو اردو کے مخالف ہیں اور انگریزی کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر ہر ایک کو معلوم ہے کہ برطانوی ہند کے چھوٹے بڑے عہدہ دار ان صوبوں میں جہاں اردو بولی جاتی ہے، اسی زبان میں اپنی تقریریں کرتے ہیں۔ یہ سب تقریریں عام فہم اور بعض نہایت فصیح و بلیغ ہوتی ہیں۔ خاص طور پر صوبۂ شمال مغربی کے لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور کی تقریروں کا معیار نہایت بلند ہوتا ہے۔ موصوف میری طرح ہندی کے مقابلے میں اردو کے زبردست حامی ہیں۔ خاص طور پر مجھے موصوف کی وہ تقریر پسند آئی جو انہوں نے گذشتہ فروری کی ۷ تاریخ کو ضلع علیگڑھ کے سرکاری مدرسے کے افتتاح کے موقع پر ہندوستانیوں کی ایک بڑی جماعت کے روبرو کی تھی * ۔

ان انگریزوں میں جو ہندوستانی زبان میں بلا تکلف اظہار خیال کرسکتے ہیں کلکتے کے معزز اسقف ملمن صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف کے پیشرو ہیبر کو (Reginald Heber) جو یورپ میں اچھے

* اس مدرسے کی افتتاحی رسم کے متعلق تمام تفصیلات اور اس تقریر کا متن اردو اور انگریزی دونوں میں "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع میں شائع ہوچکا ہے —

ان خطوط کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں جو انہوں نے اپنے سفر کے متعلق لکھے اور جن کی لکھی ہوئی دعائیں انگلستان کے کلیساؤں میں آج تک گائی جاتی ہیں - ہندوستانی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی - موصوفہ کی شادی مشہور مستشرق سر ولیم جونس کی بھانجی کے ساتھ ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ موصوفہ کا گزشتہ مئی کے مہینے میں انتقال ہوگیا اس سے کچھ دنوں بعد جب کہ موصوفہ کے پہلے شوہر کونٹ وسمچی نے ' جو ہماری فلورن لطیفہ کی اکاڈمی کے سنہ ۱۸۱۵ ع سے برابر نامہ نگار تھے ' انتقال کیا ۔

میں نے ان مشہور انگریزوں کے ذکر کے سلسلے میں جنہیں ہندوستان اور ہندوستانی کے ساتھ دلچسپی ہے سر چارلس تریویلین کا بارہا ذکر کیا ہے - مدراس کے ہندوستانی موصوف کی انتظامی قابلیت اور ہمدردانہ رویہ کو ابھی بھولے نہیں ہیں - اب آج کل وہاں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ شہر مدراس میں موصوف کی یادگار کے طور پر ایک مجسمہ بنالیا جائے - دراصل موصوف اس عزت واحترام کے مستحق ہیں - ہمیں امید ہے کہ اس تجویز سے عام طور اتفاق کیا جائے گا ۔

ہندوؤں میں ہندی زبان کے ساتھ جو دلچسپی ظاہر کی جارہی ہے اس کا اظہار فطری طور پر ادبیات کے میدان میں کیا جا رہا ہے - آج کل ہندی زبان میں چند سال قبل کے مقابلے میں' تصانیف کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے - اب تک ہندی صرف و نحو پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہوئے ہیں لیکن اب ہندی صرف و نحو پر ایک مستند کتاب لکھنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے - چنانچہ مشہور مسیحی مبلغ مسٹر ایتھرنگٹن نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندی صرف و نحو پر ایک کتاب بنارس سے شائع کی ہے - اس کتاب میں مصنف نے بنارس کی

بول چال کی زبان کو اصلی ہندی قرار دیا ہے - موصوف کا خیال ہے کہ بنارس کی ہندی بالکل خالص ہے - یعنی اس میں سنسکرت کا عنصر بہت زیادہ ہے - حالانکہ آگرے کی ہندی کو اصلی ہندی کہنا چاہیے جیسا کہ فتز ایڈورڈ ہال کا خیال ہے جنہوں نے اس کتاب کے متعلق بھی یہی راے ظاہر کی ہے کہ وہ عیب سے بالکل پاک نہیں ہے - اور اس کتاب سے بڑی حد تک اس مقصد کی تکمیل ہوجاتی ہے جس کے بعض لوگ آرزو مند تھے - اس کتاب میں ایک باب ہندی عروض پر ہے جو منگیپھر کے مسٹر کرسچین نے لکھا ہے - یہ باب زیادہ مفید ہوسکتا تھا اگر صاف اور عام فہم زبان میں تحریر کیا جاتا - مجھے افسوس ہے کہ مصنف کتاب نے جو ایک مشہور فاضل اور مبلغ ہیں' اپنی تمہید میں اس تعصب کا اظہار کیا ہے جو ہندو لوگ عموماً اردو کے خلاف ظاہر کیا کرتے ہیں - چنانچہ موصوف نے بھی یہ راے ظاہر کی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں تک محدود ہے حالانکہ واقعات اس کے بالکل خلاف ہیں * پھر موصوف کا خیال ہے کہ ہندی زبان سنسکرت سے نکلی ہے لیکن یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے - جس طرح جنوب میں تامل بولی جاتی ہے اس طرح شمالی ہند میں سنسکرت کے علاوہ ایک زبان بولی جاتی تھی جس کا اثر ہندی میں موجود ہے —

ہندی کے ہمعصر مصنفین میں بابو شیو پرشاد اچھے لکھنے والوں میں ہیں موصوف نے ایک مجموعہ شائع کیا ہے جس میں بعض غیر مطبوعہ حصے بھی شایع کیے گئے ہیں مثلاً " راجا بھوج سپنا " جس میں نجات

---

* ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۷۰ ع کے " اودھ اخبار " میں منشی محمد خاں نے یہ دعوی پیش کیا ہے کہ اودھ والے سب اردو بولتے ہیں اس میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں ہے - اگر کوئی شخص اردو کے لفظ کی جگہہ ہندی کا لفظ استعمال کرے تو کوئی اسے نہیں سمجھے گا -

کی راہ بتائی گئی ہے اور "بیر سنگھ کا رونلت" جس میں قصے کے پیرایے میں بچوں کے قتل کو مذموم قرار دیا گیا ہے - یہ دونوں قصے بابو صاحب کے طبعزاد ہیں - کنور لکشمن سنگھ نے سنسکرت کے ناٹک شکنتلا کا ہندی ترجمہ کیا ہے جو اس مجموعے میں ہے - اس کے علاوہ پدماوت کے بعض حصے جس میں دھلی کے شہنشاہ علاءالدین خلجی اور چتور کے راجا کی بیوی پدماوتی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے —

ہندی کے ایک دوسرے فاضل پنڈت رامجس ہیں - انہوں نے بھی ہندی کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے جو خاص طور پر عورتوں کے لیے ہے - انہیں اس مجموعے کے شائع کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپیے صوبۂ شمال مغربی کے لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے دلوائے ہیں - یہ مجموعہ چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کا نام "سکشا سبودھنی" ہے (*) —

جو یورپین لوگ ہندوستانی کی اس شاخ (ہندی) کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے مشہور مستشرق فٹز ایڈورڈ ہال کی لکھی ہوئی "ہندی ریڈر" بہت مفید ثابت ہوگی - اس میں بھی ہندی زبان کی بہترین کتابوں میں سے اقتباسات کا انتخاب کیا گیا ہے - مشکل الفاظ کی تشریح بھی کردی ہے جو عام لغتوں میں نہیں ملتے - اس کتاب کی تعریف جتنی کی جاے کم ہوگی - میں اس کتاب کی خصوصاً مستشرقین کے لیے سفارش کروں گا - مسٹر جے بیمز جو ایک مشہور مستشرق ہیں اور آج کل چند برد ے کی نظم "پرتھوی راج راسو" کا انگریزی ترجمہ کررہے ہیں ان کے لیے بھی یہ کتاب مفید ہوگی —

جے بیمز نے اپنے ترجمے کے نمونے کے طور پر اس کتاب کی نویں فصل

* علی گڑھ اخبار، مورخہ ۲۲ اپریل سنہ ۱۸۷۰ ع —

وسیڈنگز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" میں شائع کی ہے - اس
کو دیکھ کر ترجمے کی خوبی نیز اصل کتاب کی اہمیت کا اندازہ
نظر کرسکتے ہیں - اسی رسالے کے اکتوبر کے پرچے میں ان قلمی
کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں جو موصوف نے اپنا متن تیار
کے لیے استعمال کی ہیں انہوں نے "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی
بنگال" کے چوتھے نمبر میں مسٹر گراؤس کے اعتراضات کا جواب
ہے - یہ اعتراضات نہایت مہمل ہیں - مسٹر گراؤس نے جس طرح
بیمز کے ساتھ ناانصافی روا رکھی ہے اسی طرح وہ ہندوستانی
کے بدخواہ ہیں —

ڈیوک آف آرگائل نے ' جو آج کل وزیر ہند ہیں یہ فیصلہ کیا ہے
ھوں کی مقدس کتاب " ادی گرنتھ " کا انگریزی زبان میں ترجمہ
جائے - اس کام کے لیے ڈاکٹر ٹرمپ کو مقرر کیا گیا ہے جو اس سے
سندھی اور پشتو زبان کے متعلق کافی کام کرچکے ہیں - اب موصوف
س متن کا ترجمہ کرنا ہے - وہ دو ہزار تین سو صفحات پر مشتمل
ر ہندی کی مختلف بولیاں اس میں استعمال کی گئی ہیں - آپ
نسخوں کے علاوہ " ادی گرنتھ " کے اس ایڈیشن کو پیش نظر
ے جو دیوان بوٹا سنگھ نے لاہور سے شائع کیا ہے - (*) میری
ہے کہ یہ فاضل شخص اس کام کو جس کی اہمیت ظاہر کرنا غیر
ی ہے ' پایۂ تکمیل کو پہنچائے - پروفیسر جے ڈاؤسن نے اس کے متعلق
یاد داشت لندن کی رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے پیش کی ہے

* یہ ایڈیشن ۱۸۷۴ صفحات پر مشتمل ہے جیسا کہ (Trubnersliterary Record) مورخہ
بر سنہ ۱۸۷۰ ع سے ظاہر ہوتا ہے —

اور مثال کے طور پر بعض حصوں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے - موصوف نے بتایا ہے کہ " ادی گرنتھہ " کی زبان مختلف لوگوں کی زبان ہے - یہ در اصل قدیم ہندی ہے نہ کہ اصلی پنجابی اور بعض مناجاتیں تو دکنی اردو کی ہیں - انڈیا آفس کا قلمی نسخہ میرے ذاتی نسخے کی طرح گرمکھی میں لکھا ہوا ہے اور ۴۵ حصوں میں منقسم ہے جو راگ یا راگنی کہلاتے ہیں - راگ اور راگنیاں ' محل " اور "گھروں" میں تقسیم کی گئی ہیں * —

بابو ہری چندر کا ہندی ادب کی ترقی کے متعلق جوش اور انہماک بدستور جاری ہے ان کے "کوی بچن سدھا" کی اشاعت جاری ہے - اس کے علاوہ موصوف دوسری ہندی کتب بھی شائع کر رہے ہیں - ہندی کی جو نئی کتابیں مجھے موصول ہوئی ہیں ان میں ایک کتاب ہے جس میں شاستروں سے سنسکرت اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لیے درج کیے گئے ہیں کہ عقد بیوگاں جائز ہے - اس کے خلاف جملہ دلائل کو رد کیا گیا ہے - یہ کتاب لاہور میں چھپی ہے - یجروید کی ہندی تفسیر کئی جلدوں میں بھما کے راجا نے شایع کی ہے جو سنسکرت میں تبحر کے باوجود اپنی مادری زبان میں لکھنا کسر شان نہیں سمجھتا † —

آپ صاحبوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اردو ادب کی ترقی کی رفتار سست ہوگئی ہے - نہ صرف اردو جرائد کی تعداد ہندی جرائد کے مقابلے میں زیادہ ہے بلکہ اور دوسری مطبوعات بھی اردو کی زیادہ

---

* میں نے اپنی کتاب ' تاریخ ادب ہندوستانی " میں اس کے متعلق ذکر کیا ہے جہاں کبیر اور نانک کے متعلق بیان ہے —

† ٹریز ریکارڈ نمبر ٥٩ —

شائع ہوتی ہیں - بیگم صاحبہ بھوپال نے اردو میں اپنے سفر حجاز کے حالات لکھے ہیں اور انگریزی میں بھی ان کا ترجمہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے —

اودھ اخبار مورخہ ۳ مئی سنہ ۱۸۶۹ع میں اردو کی ۲۷ کتابوں کی فہرست درج ہے ان میں سے بعض نئی ہیں اور بعض پرانی ہیں جو دوبارہ شائع ہوئی ہیں - علی گڈھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام متعدد اردو کی کتابیں تیار ہورہی ہیں * —

کپتان ہولرائڈ نے مجھے "سلم الادب" کا ایک نسخہ بھیجا ہے - اس کتاب میں عربی زبان کے صحیح استعمال کے متعلق ہدایات ہیں - اس میں کہانیوں کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا ہے اور نثر اور نظم کے نمونے میں جن کا ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی درج ہے اور مشکل الفاظ کی تشریح اردو میں ہے - یہ کتاب خط نسخ میں ہے —

ڈی ڈبلو ا ڈولبرٹ سول سروس کے ان لوگوں میں ہیں- جو ہندوستانی زبان کے بڑے ماہر ہیں - موصوف نے جارج کیمبل کی تصنیف "ہندوستان کی نسلیں" کا نہایت صاف اور شستہ اردو میں ترجمہ شایع کیا ہے - کلکتے کے "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی" میں اصل کتاب مضامین کی شکل میں شایع ہوچکی ہے —

ہندوستانی زبان کی دکھنی شاخ کے متعلق جس میں شعر و افسانہ پر کثرت سے کتب شائع ہو رہی ہیں، میجر ڈبلو کار نے مدراس میں بعض کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا ہے - وہ کتابیں یہ ہیں :- (۱) "قصہ رضوان شاہ" مصنفہ فیض زیر طباعت ہے - (۲) نصرتی کی "گلشن عشق" اور "پھول بن" † - (۳) "قصۂ بی بی مریم" بھی عنقریب شائع ہونے

---

* علی گڈھ اخبار مورخہ ۳ اپریل سنہ ۱۸۶۹ع -

† نصرتی کے متعلق ملاحظہ ہو میری کتاب "تاریخ ادب ہندوستانی" -

والی ہے - ان سب کتابوں میں ان ٹھیٹ دکھنی الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جو عام طور پر نہیں سمجھے جاتے - اس میں سے جو کتابیں مجھے موصول ہوئی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھہ کام ہوا ہے اس کی سب ہندوستانی ادب کے حامیوں کو ہمت افزائی کرنی چاہیے - جیسا کہ خود فیض نے اپنی کتاب کے دیباچے میں افسانوں کو حقیر نہ سمجھنے کے متعلق اشارہ کیا ہے :—

" حکما کا مقولہ ہے افسانوں کا مقصد نصیحت ہے افسانوی اشخاص سے آدمی خود اپنے متعلق بہت کچھہ معلوم کرلیتا ہے اور کہاوتوں کی شکل میں آدمی کو بہت کچھہ یاد رہ جاتا ہے " —

مسیحی مبلغین یا خود ہندوستانیوں کے زیر اہتمام جو کتابیں شائع ہورہی ہیں ان کی فہرست دینا موجب طوالت ہوگا - ان کے متعلق جان مردوش (gohn murdoch) نے ایک نہایت مفید فہرست شائع کی ہے جسے دیکھنے سے آپ ان مطبوعات کے متعلق خیال قایم کر سکتے ہیں * اردو، ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جو کتابیں شائع ہورہی ہیں اس میں بعض ایسی ہیں جو ہندوستان سے باہر والوں کے لیے بھی دلچسپی کا موجب بن سکتی ہیں - اگر ہم صرف ایسی کتابیں گنائیں تو وہ بہت زیادہ نکلیں گی اور ان کا ایک مستقل کتب خانہ قایم ہو سکے گا -

بابو جلم جہا متھرا کا نیا تذکرہ جس کا نام " نسخۂ دلکشا " ہے عنقریب شائع ہونے والا تھا لیکن مصنف کے بے وقت انتقال کی وجہ سے اس کی

* "Catalogue of the Christian Vernacular Literature of India" مطبوعہ مدراس سنہ ۱۸۷۰ ع - مشتمل بر ۳۱۳ صفحات —

طباعت کا کام روک لیا گیا - بابو صاحب مشہور فاضل رجندر لال مترا کے والد تھے - اس تذکرے میں ہندوستانی کے شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے - اس میں ۹۷۷ شاعروں اور ان ۲۳ شاعرات کا حال قلمبند کیا گیا ہے جو سنہ ۱۱۷۳ ہجری سے لے کر سنہ ۱۲۹۸ ہجری تک گزرے ہیں - ہر ایک کے کلام کی مثالیں پیش کی گئی ہیں - بابو رجندر لال مترا نئی روشنی کے آدمی ہیں - نہ معلوم وہ اس تذکرے کو پورا چھپوائیں گے یا نہیں - مجھے اندیشہ ہے کہ شاید وہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں - انہوں نے مجھ سے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ وہ اس حصے کی جو اب تک چھپا نہیں ہے ایک قلمی نقل بھیج دیں گے لیکن وعدہ ابھی پورا نہیں کیا گیا * -

گزشتہ سالوں میں متعدد یورپین فاضلوں نے سیرت رسول پر کتابیں لکھی ہیں - سر ولیم میور اور ڈاکٹر اے اسپرنگر کی تصانیف خاص طور پر قابل لحاظ ہیں - یہ تصانیف ہمیں چاہے کتنی بھی غیر جانبدار معلوم ہوں لیکن مسلمان انہیں قابل اطمینان نہیں سمجھتے - ابھی حال میں ہندوستان کے مشہور مسلمان سید احمد خاں نے رسول عربی کی سیرت پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "سیرت مصطفی" ہے - † یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے لیکن عربی اور عبرانی کے حوالے اصل زبانوں میں ہیں - سر سید احمد خاں گزشتہ ستمبر کے مہینے میں انگلستان سے ہندوستان واپس ہوگئے اور بنارس میں اپنی ججی کی خدمت کا جائزہ حاصل کرلیا - اس کتاب کی پہلی جلد میں عربستان کے جغرافی حالات اور قدیم عربوں کے مذہب و رسوم کے متعلق بحث کی ہے - اسلامی دینی عقائد پر تبصرے کے ساتھ یہ بتایا

---

* "نسخۂ دلکشا" جلد اول مطبوعۂ کلکتہ ، سنہ ۱۸۷۰ ع - ۲۱۰ صفحات - ہر صفحے پر ۲۰ سطریں ہیں -   † غالباً مصنف کی مراد "خطبات احمدیہ" سے ہے —

ہے کہ مذہب اسلام سے انسانیت کو کیا فوائد حاصل ہوئے - قرآن اس کی زبان اور وہ پیشین گوئیاں جو اس میں ہیں' ان پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے - اس کتاب میں نقشے بھی ہیں - ہمیں توقع ہے کہ مصنف ہندوستان واپس ہونے کے بعد اس موضوع پر اپنی تحقیق جاری رکھیں گے —

ادبی خدمات کے صلے میں حکومت کی طرف سے مصنفین کو جو انعامات دیے جاتے ہیں ان سے بھی ہمت افزائی ہو رہی ہے - جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع میں لفٹننٹ گورنر صوبجات شمال مغربی نے جو دربار منعقد کیا اس میں بعض مصنفین کو انعامات تقسیم کیے گئے - یہ دربار نہایت تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا اور خوب کامیاب رہا - اس میں ۴۳ والیان ملک' بڑے بڑے زمینداروں اور سرداروں نے شرکت کی - لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے اس موقع پر ہندوستانی زبان میں تقریر کی اور سب حاضرین کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے الہ آباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کے متعلق ان کی اپیل پر لبیک کہا - موصوف نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ ہمیں صرف یونیورسٹی قائم کرنے تک اپنی مساعی کو محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ جدید قومی ادب کی بھی بنا ڈالنی چاہیے جو اہل ہند کے جدید حالات کا ترجمان ہو - اس اعلیٰ مقصد کے لیے حکومت نے انعامات مقرر کیے ہیں جو ان مصنفین کو دیے جائیں گے جن کی تصانیف اعلیٰ معیار پر پوری اتریں گی اور مفید ثابت ہوں گی —

لفٹننٹ گورنر کی اس تقریر کے بعد جس کا میں نے مختصراً ذکر کیا ہے' مسٹر کیمپس ناظم تعلیمات صوبجات شمال مغربی نے محمد نذیر احمد کو آگے لاکر پیش کیا جنہیں ان کی تصنیف "مرأت العروس" پر انعام دیا گیا اور آگرے کے پنڈت کاشی ناتھ کی تصنیف "اخلاق" پر انعام دیا گیا - ان

مصنفین کو ایک ہزار روپے کی رقم بطور انعام دی گئی - دونوں کی تصانیف اردو زبان میں ہیں - اس کے بعد بعض دوسرے انعامات تقسیم کیے گئے- پھر پان اور عطر حسب معمول تقسیم کیا گیا اور جلسہ برخاست ہوا -

اعلام جب مشرقی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں تو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں پیدا ہوتی لیکن جب انہیں لاطینی یا رومن رسم خط میں لکھا جاتا ہے جیسا کہ آج کل کیا جا رہا ہے تو اس صورت میں غلطی کا امکان ہے - لاطینی کے رسم خط کے متعلق کوئی قواعد اب تک مقرر نہیں کیے گئے ہیں چنانچہ دو طریقے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اس وقت رائج ہیں - ڈاکٹر گلکرسٹ کا طریق تحریر بالکل انگریزی اصول پر مبنی ہے اور اس پر ہندوستان میں عرصے سے عمل کیا جا رہا ہے - دوسرا طریق تحریر ڈبلو جونس کا ہے جو تمام یورپین لوگوں کے لیے نسبتاً زیادہ قابل قبول ہے - شروع میں ثانی الذکر طریق تحریر کی مخالفت کی گئی اور اس کو کلیتاً ترک کرنے کا ارادہ کیا گیا لیکن کچھ عرصے سے پھر اس کو مقبولیت حاصل ہوگئی ہے - ڈبلو جونس ہی کے طریق تحریر کو چند معمولی تبدیلیوں کے ساتھ حکومت نے اعلام کے لکھنے کے لیے اختیار کر لیا ہے - چنانچہ ڈبلو ہنٹر کو مقرر کیا گیا ہے کہ متذکرہ اصول کے مطابق صوبۂ بنگال کے تمام مقامات کے نام تحریر کیے جائیں * - یہ کام بہت ضروری تھا - اس لیے کہ طریق تحریر کے اختلاف کے باعث یورپ میں بعض لوگ ایک ہی مقام کو دو علحدہ علحدہ مقامات تصور کرنے لگے - حکومت نے صرف صوبۂ بنگال کے لیے جو عمدہ طریق عمل اختیار کر لیا ہے اگر اسے پورے ہندوستان کے لیے اختیار کیا جائے تو وقت کی ایک ضرورت پوری ہوجائے گی اور لوگوں کے لیے

---

* انڈین میل مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع .

سہولت کا موجب ہوگا —

اس سال میں آٹھ اردو کے نئے اخبارات اور تین ہندی کے نئے اخبارات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں - اہل ہند میں اب یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ ان کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات میں پڑھنے کے لیے زیادہ مواد مہیا کیا جائے - ہندوستانی اور دوسری دیسی زبانوں کے اخبارات ان گوشوں میں پہنچتے ہیں جہاں انگریزی اخبارات کے توسط سے مغربی تہذیب و تمدن کے خیالات اہل ہند کو پہنچ رہے ہیں جن کو قبول کرنے کے لیے وہ بے تاب معلوم ہوتے ہیں - جن خیالات کو آپ اہل ہند تک پہنچانا چاہتے ہیں ان کا ضبط تحریر میں آنا بہت اچھا ہے - بعض اوقات اخبارات کی معمولی خبریں ان کے لیے خاص اہمیت اختیار کرلیتی ہیں - فارسی شاعر نے لاطینی مقولے کو یوں بیان کیا ہے - "اپنی نوک قلم سے اپنے خیالات کو متعین کردے اس لیے کہ جو بات صرف زبانی رہتی ہے وہ لوگوں کے حافظے سے محو ہوجاتی ہے" —

بعض اخبارات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ایک کالم میں اردو رکھتے ہیں اور دوسرے میں ہندی - میں اپنے خطبات میں اس قسم کے متعدد جرائد کی نسبت تذکرہ کرچکا ہوں - اس کا نام "برتلد" ہے - یہ کئی سال سے کلکتے سے شایع ہوتا ہے - نہ صرف اردو اور ہندی بلکہ چار اور دوسری دیسی زبانیں اس اخبار میں نظر آتی ہیں - میرے پیش نظر حال کے پرچوں میں اردو، ہندی اور مرہٹی تینوں زبانیں اس میں استعمال کی گئی ہیں - اب میں جدید اخبارات کی فہرست دیتا ہوں :-

اخبار دبدبۂ سکندری - یہ اردو کا اخبار ہے جس کے مدیر محمد حسین

ھیں - یہ رامپور سے شایع ہوتا ھے —

امرت بازار پترکا - یہ ھندی کا اخبار ھے جس کے متعلق میں اب تک ناواقف تھا - اس کا مجھے "علی گڑھ اخبار" کے ذریعے سے علم ہوا -

انوارالشمس - یہ اردو کا اخبار ھے جس کی نسبت میری کتاب "تاریخ ادب ھندوستانی" کے تیسرے حصے میں تفصیل موجود ھے (ملاحظہ ہو میری کتاب کا دوسرا ایڈیشن) —

ھمائے پنجاب - یہ اخبار اس سال ۱۵ اپریل سے شائع ہونا شروع ہوا ھے - اس اخبار میں مضامین کے علاوہ انگریزی اخباروں سے ماخوذ خلاصے ہوتے ھیں، خبریں ہوتی ھیں اور اردو اور ھندی کی جدید کتب پر تبصرے ہوتے ھیں - نامہ نگاروں کے صرف وہ خطوط درج کیے جاتے ھیں جو دلچسپی رکھتے ہوں اور ان کے علاوہ سرکاری اطلاعیں درج کی جاتی ھیں - میرٹھ کے "اخبار عالم" نے اس اخبار کے نام پر اعتراض کیا تھا لیکن اگر دیکھا جاے تو ھندوستان میں بہت سے ایسے اخبارات ملیں گے جن کے نام عجیب و غریب ھیں - اس اخبار کے طرز انشا پر بھی اعتراض کیا گیا ھے کہ اس میں یورپین اثر حد سے زیادہ پایا جاتا ھے * —

جگت سماچار - یہ ھندی نام اردو کے "اخبار عالم" کا ترجمہ ھے - یہ پرچہ محمد وجاھت علی نے از راہ عنایت مجھے بھجوادیا ھے - یہ گزشتہ سال سے میرٹھ سے نکل رہا ھے - اس کا مدیر اور "اخبار عالم" کا مدیر ایک ھی شخص ھے - ہر ھفتہ دوشنبہ

* انڈین میل، مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۸۷۰ ع —

کے روز اس کی اشاعت ہوتی ہے - یہ آٹھہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا بیشتر حصہ اردو سے ہندی میں ترجمہ ہوتا ہے۔

چاہے کوئی کچھہ کہے لیکن یہ مسلم ہے کہ اردو زبان اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مستعمل ہے - اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس ہندی اخبار کا سب سے اہم اشتہار اردو میں فارسی رسم خط میں ہے - اس اخبار میں یہ بات بھی وضاحت سے بیان کردی گئی ہے کہ اس کی زبان عام فہم ہے اگرچہ ناگری رسم خط میں ہے - چنانچہ زبان کے اعتبار سے یہ اخبار اردو کا ہے نہ کہ ہندی کا —

ماہوار گزٹ- یہ ماہوار رسالہ اردو میں نکلتا ہے جس کا اشتہار میں نے اودہ اخبار" مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع میں دیکھا ہے -

منگل سماچار - یہ ہندوستانی اخبار راجا بھما کے زیر پرستی نکلتا ہے - اس کے ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں، ایک ہندی کا اور دوسرا اردو کا - اس کا پہلا نمبر اگست سنہ ۱۸۶۹ ع میں بھما سے شائع ہوا ہے —

رسالہ - یہ مراد آباد سے اردو میں شائع ہوتا ہے - اس میں مفید مباحث ہوتے ہیں - علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ ع میں آرایس سانڈرس نے اس پر تنقید لکھی ہے -

سرکاری اخبار - یہ ناگپور سے اردو، ہندی اور مرہٹی تینوں زبانوں میں نظامت تعلیمات کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے —

شمس الاخبار - یہ مسیحی اخبار لکھنؤ کے "امریکن مشن پریس" کی طرف سے شائع ہوتا ہے - اس کے متعلق اودھ اخبار مورخہ ۲ نومبر سنہ ۱۸۶۹ ع میں ذکر ہے کہ اس کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں -

مجھے "اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ" کے پرچے برابر پہنچ رہے ہیں۔ یہ اردو میں ناظم تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اس صوبے کے ناظم تعلیمات مسٹر ڈبلو ہینڈ فورڈ تھے جن کی مجھ پر خاص عنایت رہتی تھی۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ ان کی قبل از وقت موت کے باعث ہندوستان ایک نہایت روشن خیال حاکم کی خدمات سے محروم ہوگیا انہیں ہندوستانیوں اور ان کی زبان کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ میرے بھی وہ قدیم مہربان تھے اور مجھ سے اور ان سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ رہتا تھا۔ ان کا انتقال ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۶۹ ع لکھنؤ میں ہوا۔ ان پر چیچک کا سخت حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ یہ وبا ہندوستان میں پھیل گئی ہے اور سیکڑوں اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ آئیے، ہم آپ سب یہ سمجھ کر ایک دوسرے کو تسلی دے لیں کہ آج "ہم مختلف کناروں پر پڑے ہوئے ہیں لیکن اپنا پر خطر سفر ختم کرنے کے بعد سب اکٹھا ہوجائیں گے اور بالآخر اپنے باپ (پیدا کرنے والے) کے ہاں پہنچ جائیں گے" * ۔

یکم مئی کے "اودھ اخبار" میں اس ناقابل تلافی نقصان کا ذکر اور اس کی تکلیف دہ تفصیلات موجود ہیں ۔ لکھنؤ کے شاعر حسین نے اس درد ناک واقعے کو ایک مرثیے میں بیان کیا ہے ۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ مرحوم کے جانشین مسٹر کالن براؤننگ جو اردو زبان کے بڑے واقفکار ہیں اس کمی کو اچھی طرح پورا کردیں گے جو مرحوم کے اٹھ جانے سے پیدا ہوگئی ہے ۔

مذکورہ بالا اخبار کی یکم فروری سنہ ۱۸۷۰ ع کی اشاعت میں

* یہ اشعار آرسی ترنچ کے ہیں —

تصوف کی بعض اصطلاحات کی جو دیوان حافظ میں آئی ہیں ' تشریح کی گئی ہے - یکم نومبر کی اشاعت میں بعض ہندوستانی الفاظ کے املا کے متعلق مفید معلومات ہیں - یہ الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے گئے ہیں - ہر لفظ کی تشریح کے ساتھ دلچسپ کہاوتیں اور لطائف بیان کیے گئے ہیں اور نثر و نظم کی مثالیں پیش کی گئی ہیں - بالکل اسی طرح جیسے میرے قدیم دوست نواب دیومست (Boronde dumsat) نے فرانسیسی الفاظ کے متعلق کہا ہے جن کے تبحر علمی اور سخن گستری کی دھوم ہے —

اس اخبار میں ادب کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور اس کے مضامین متنوع اور مفید ہیں - اس کی ہر اشاعت میں دو ایک نظمیں ہوتی ہیں جو کبھی اصل ہوتی ہیں اور کبھی انگریزی سے ترجمے ہوتے ہیں - ان کے علاوہ قصے کہانیاں ' کہاوتیں اور مقولے بھی ہوتے ہیں میں نے فرحت کی وہ کہانی جو لافونٹین (la Fontaine) سے ماخوذ ہے دلچسپی سے پڑھی - اس کا عنوان " بھیڑیے اور بکری کا قصہ " ہے - فرحت اس زمانے کے اچھے شاعروں میں ہیں -

بعض نوجوان شعرا کے نام اخبارات میں آرہے ہیں جن کے کلام پر پبلک کو رائے زنی کا موقع مل رہا ہے - اس سال جن نئے شعرا کے متعلق مجھے معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ ہیں - نجم بلگلوری - ان کی نظم دکن پر " اودھ اخبار " میں شائع ہوئی ہے -

حضور بلگرامی - ان کا ایک نوے بیت کا قصیدہ " اودھ اخبار " نے شائع کیا ہے —

جودھپور کے وزیر اعظم نے اس قصیدے کے صلے میں ایک دوشالا

پہونچا ہے - موجودہ نظم و نثر لکھنے والوں میں حضور کی خاص حیثیت ہے - وہ انگریزی زبان سے واقف ہے اور کسی انگریزی رجمنٹ میں میر منشی کے عہدہ پر فائز رہ چکا ہے * —

" جلسۂ تہذیب لکھنؤ " کے رسائل بدستور شائع ہو رہے ہیں - اس انجمن کے معتمد پنڈت شیو نارائن ہیں گزشتہ مئی کے مہینے کے رسالے میں میر اولاد علی پروفیسر ڈبلن یونیورسٹی کا مضمون ہے جس میں انگلستان کی رسوم پر تبصرہ کیا گیا ہے - پروفیسر صاحب موصوف آج کل رخصت پر ہندوستان گئے ہوئے ہیں یہ فاضل شخص پہلے بھوپال میں مقیم رہا - جہاں اس کا بھائی ڈاکٹر ہے - موصوف نے بعد میں شاہ آباد ضلع ہردوئی میں جو ان کا وطن ہے ایک لکچر دیا جس کا موضوع علم المعاش تھا - اس علم کے علاوہ سائنس کی تعلیم کے فوائد بھی موصوف نے بیان کیے † -

ہندوستانی اخباروں میں بعض اوقات عجیب و غریب قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں - مثلاً آگرے کے ایک اخبار میں میں نے ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان " نور الابصار " تھا - اس مضمون میں فرانسیسیوں کے مقابلے میں جرمنوں کی فتح کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ جرمن لوگ مقدس کتابوں کو پڑھتے ہیں - ایک سبب یہ بتایا ہے کہ بادشاہ ولیم کو وید کا وہ منتر معلوم ہوگیا جس سے کامرانی حاصل ہوتی ہے - ہندوستانی صحافت نگار کہتا ہے کہ شروع ہی سے اگر اس کو یہ منتر معلوم نہ ہوتا تو وہ فتحمند نہ ہوتا —

---

* دوسرے نو جوان ہونہار شاعر یہ ہیں :— میر چشم اور خاور - آخرالذکر نے راجا معصود آباد کی گدی نشینی پر ایک مشہور قصیدہ لکھا ہے - اودھ اخبار ' مورخہ ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۰ ع —

† " جلسۂ تہذیب لکھنؤ " میں یہ لکچر شائع ہوا ہے - مورخہ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع —

میرٹھ کے "کے اخبار عالم" میں میں نے ایک اور عجیب و غریب
مون پڑھا جو پہلے بمبئی کے "کشف الاخبار" میں شائع ہوچکا ہے -
ں مضمون میں یورپین لوگوں کے شادی بیاہ کا حال بیان کیا ہے -
لباً امریکن عورتوں کی برائی مدنظر معلوم ہوتی ہے - مضمون نگار لکھتا
ہے "فرانسیسی عورتیں ایک ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جس کی
ھانی کشادہ اور چہرہ ہنس مکھ ہو - جرمن عورتیں ایسا شوہر پسند
تی ہیں جو ان کی مرضی پر چلے - اور اپنے وعدے کا پابند ہو - ولندیزی
رتیں ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جو امن و عافیت پسند ہو' کسی جھگڑے
ھیڑے میں نہ پڑے اور لڑائی دنگا نہ کرے - ہسپانوی عورتیں ایسا شوہر
ند کرتی ہیں جو اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرسکے اور ضرورت ہو
انتقام کی صلاحیت رکھتا ہو - اطالوی عورتیں ایسے شوہر کو پسند کرتی
ں جو خیال و خواب کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہو - روسی عورتیں
سے شوہر کو پسند کرتی ہیں جو اہل مغرب کو وحشی سمجھتا ہو -
مارک کی عورتیں ایسے شوہر کو پسند کرتی ہیں جو اپنے بس میں
اور باہر سفر کے لیے قدم نہ اٹھائے - انگریزی عورتیں ایسے شوہر کو
ند کرتی ہیں جو "جنٹلمین" ہو اور ارباب دولت کے ہاں اپنی
ائی پیدا کرسکے - امریکن عورتیں ہر کس و ناکس سے شادی کو تیار
ی ہیں وہ اس کی حیثیت اور مرتبے کو نہیں دیکھتی ہیں' چاہے
لنجا' لنگڑا' بہرہ یا اندھا ہو بشرطیکہ وہ مالدار ہو * —

ان اخبارات میں سے صرف میں "اخبار عالم" کی خبروں کا ذکر
ں گا - اس اخبار کی ۲۶ مئی سنه ۱۸۷۰ کی اشاعت میں سنبھل میرا

* یہ ترجمہ فرانسیسی متن سے کیا گیا ہے (مترجم) —

ضلع مظفر نگر کے ایک شخص کا ذکر ہے - جس کا نام مہر دائم علی ہے - جس کی اس وقت ۱۱۵ سال کی عمر ہے - اس کی بصارت اور سماعت بالکل اچھی حالت میں ہے - خوب کھاتا پیتا ہے اور دس میل چل سکتا ہے —

مجھے یہ دیکھہ کر خوشی ہے کہ ان اخبارات میں کم از کم بعض مضمون اس لایق ہوتے ہیں جنھیں توجہ سے پڑھا جاے - مثلاً " اودھ اخبار " ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۶۹ ع میں ۱۲ کالموں کا ایک مضمون ہے جس میں ممالک متوسط کی جغرافی حالت کا بیان ہے —

اس صوبے کی قسمتوں اور اضلاع کے متعلق مفصل معلومات درج ہیں - اس مضمون کا میرے شاگرد موسیو جی گارزنے ' جو فاضل مستشرق ہیں ' فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور یہ مضمون " مجلۂ تعلیمات " میں طبع ہوا ہے —

ہندوستان میں تعلیم کی برابر روز افزوں ترقی ہورہی ہے - مہاراجا جے پور اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کی حتی الامکان کوشش کررہے ہیں اس مقصد کے لیے موصوف نے ریاست کے خرچ سے اپنی ریاست میں ۲۸۰ مدارس قایم کیے ہیں جن میں اس وقت کم و بیش ۸ ہزار طلبہ تعلیم پارہے ہیں (*) —

گزشتہ اکتوبر میں وائسراے لارڈ میونے اجمیر میں والیان ملک کا جو دربار منعقد کیا تھا اس موقع پر لارڈ موصوف نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ راجپوتانہ کے اعلیٰ خاندان کے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص کالج قایم کرنے والے ہیں - موصوف نے شرکاے دربار سے درخواست کی کہ سب والیان ملک اس خیال کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھہ

(*) علی گڑھ اخبار مورخۂ ۱۸ مارچ سنۂ ۱۸۷۰ ع -

تعاون عمل کریں (*) —

تعلیم نسواں کی ترقی میں بمبئی کے پارسی لوگوں نے بڑی حمایت کی ہے - اس تحریک کے حامیوں میں سے ایک ڈاکٹر برزرجی ہیں جو پچھلے دس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں اور اب عنقریب اپنے وطن کو واپس جانے والے ہیں - موصوف کی والدہ اور دونوں صاحبزادیوں کا یہ ارادہ ہے کہ واپسی پر وہ بمبئی میں لڑکیوں کا ایک اسکول کھولیں جس میں دس یا اس سے زیادہ برس کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرسکیں - اس اسکول میں پوری تعلیم مغربی اصول پر دی جائے گی - لیکن اس کی بھی کوشش کی جائے گی کہ مشرقی آداب کی کسی طرح خلاف ورزی نہ ہو - خود ڈاکٹر صاحب اور ان کے خاندان کی خواتین بلامعاوضہ تعلیم دیں گی - ڈاکٹر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ اس اسکول کے لیے لوگ چندے سے ان کی مدد کریں - ڈیوک آف آرگائیل وزیر ہند نے اس تجویز کو بہت پسند کیا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات اس تجویز کو کامیاب بنانے میں ہر ممکنہ امداد کریں گے - اسکول کا انتظام ایک مقامی کمیٹی کے ہاتھ میں ہوگا (†) —

مس کارپنٹر ہندوستان سے یورپ واپس آچکی ہیں - اس دفعہ انہوں نے پھر بہت کام کیا - موصوفہ بمبئی میں عورتوں کا نارمل اسکول قایم کرنے میں کامیاب ہوگئیں - سنہ ۱۸۶۹ ع کے آخر میں اس اسکول میں تین پارسی اور بارہ ہندو لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں - اخبار " ہندو پرکاش " میں بھی اس انسانیت پرست خاتون کی تعریف کی گئی ہے اور لکھا

(*) انڈین میل مورخہ ۲۹ نومبر سنہ ۱۸۷۰ ع —

(†) علی گڈھ اخبار، مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع -

ہے کہ موصوفہ نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے گوڑاؤں میں ایک ماڈل اسکول قایم کیا ہے جس کی افتتاحی رسم گزشتہ فروری کی ۲۲ تاریخ کو منائی گئی - مس کارپنٹر کے کاموں کی سندھ میں بہت شہرت ہے - وہاں کے بہت سے باشندوں نے موصوفہ کو ایک ایڈرس مع تحائف بھجوایا ہے تاکہ اپنی شکر گزاری کا اظہار کریں (*) —

کپتان ہولرائڈ ناظم تعلیمات پنجاب نے اپنی سالانہ رپورٹ کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے - اس میں صوبۂ پنجاب اور اس کے ملحقات کی تعلیمی حالت پر تبصرہ ہے - اس رپورٹ کو پڑھنے سے نہایت آسانی سے تعلیمی ترقی کا پورا حال معلوم ہوجاتا ہے - ہمارے خیال میں حکومت نے اس باب میں جو نتائج حاصل کیے ہیں وہ قابل اطمینان ہیں —

میں مشن کالجوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا اس لیے کہ ان کے متعلق میں بارہا ذکر کرچکا ہوں - اس وقت لکھنؤ کے مارتینیر مشن کا ذکر کروں گا جس کا بانی لیون (Lyon) کا ایک فرانسیسی گزرا ہے - اس سال اس ادارے کو جاسف وال کے انتقال کے باعث بہت بڑا نقصان ہوا جو سنہ ۱۸۵۹ ع سے برابر دیسی شعبے کے صدر تھے - ان کی اردو، ہندی اور فارسی کی قابلیت مسلم تھی اور لکھنؤ بھر میں ان کی شہرت تھی - اس کالج کے پرنسپل مسٹر شلنگ ان کی اس خاص قابلیت کے باعث ان پر خاص توجہ فرماتے تھے —

بنارس کے انگلیکن مشن کی ۳۱ ویں رپورٹ میں لڑکیوں کے نارمل اسکول کے متعلق گورنمنٹ انسپکٹر کی رائے درج ہے - اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی مدرسہ ہے - گورنمنٹ انسپکٹر نے لکھا ہے کہ دوسرے مدارس

(*) انڈین میل مورخہ ۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع —

کے لیے اس کو بطور نمونہ پیش کرسکتے ہیں - اس اسکول کے چار درجوں میں چالیس طالبات تعلیم حاصل کررہی ہیں - اس کے ساتھ ایک بچوں کا مدرسہ بھی ہے تاکہ نارمل اسکول کی طالبات وہاں تعلیمی مشق کرسکیں - انسپکٹر نے طالبات کے خط ' ان کی ہندی اور اردو پڑھنے کی مشق اور ترجمے کی قابلیت کی اچھی طرح جانچ کی اور یورپ کے نقشے پر ان سے سوالات دریافت کیے - نقشے کے متعلق ان کی معلومات نہایت قابل اطمینان تھیں جیسی کہ انگلستان کے اس قسم کے مدارس کی طالبات میں آپ کو ملیں گی - موصوف نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ " ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کے نارمل اسکول قائم کردیے جائیں اور وہاں کی فارغ التحصیل طالبات کو گانووں کے اسکولوں کا صدر بنادیا جائے تو اس ملک میں عورتوں کی تعلیم کا مستقبل نہایت درخشاں ہوسکتا ہے " (*) —

ہندوستان کے مشہور فاضل سید احمد خاں کو اس بات کی بڑی تمنا ہے کہ ان کے ہم مذہب لوگ جدید تہذیب و تمدن سے فیضیاب ہوں - موصوف نے حال میں حکومت کے اصول تعلیم پر اعتراض کیا ہے جوملک میں رائج ہے - اس باب میں سید عبداللہ ان کے ہم نوا ہیں - چنانچہ یہ اعتراضات ایک رسالے کی شکل میں جس کا نام " موجودہ طریق تعلیم پر اعتراضات " ہے ' شائع ہوچکے ہیں (†) - موصوف کا خیال ہے کہ موجودہ تعلیم حد سے زیادہ یورپین مذاق کی ہے - سید احمد خاں نے اس بات پر

(*) انڈین میل ' مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۰ ع -

(†) " Strictures upon the present system of Government "

احتجاج کیا ہے کہ حکومت نے اب تک لاہور میں "اوریئنٹل یونیورسٹی" قائم کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا اس کام کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی اس رسالے کا بابو شیو پرشاد نے جواب دیا ہے اور بالکل مخالفانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے - بابو صاحب کے رسالے کا نام " اعتراضات پر اعتراضات " ہے - (*) بابو صاحب مروجہ طریق تعلیم کے دلدادہ ہیں - اس قسم کا اختلاف آرا بالکل قدرتی ہے اس لیے کہ سید احمد خاں مسلمان ہیں اور بابو صاحب ہندو ہیں - مسلمان عالم اور ہندو عالم کے اختلاف کی بس وہی نوعیت ہے جو اردو اور ہندی کے اختلاف کی ہے - بابو صاحب اپنے استدلال میں اس پامال فقرے کو بہت جگہ دہراتے ہیں کہ " ہندو لوگ آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت کے مظالم برداشت کرچکے ہیں " بابو صاحب نے محمود غزنوی کی بربریت کو ظاہر کیا ہے لیکن اس کی اصلی وجہ غالباً یہ نہیں ہے کہ اس نے سومناتھ کے مندر میں ناپاک لنگم کی مورتی کو اوندھا کردیا تھا بلکہ کچھ اور ہے —

اگر کوئی ہندو اسلامی حکومت کو برا کہے اور انگریزی نظم و نسق کا مداح ہو تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عربی ' فارسی اور اردو جیسی زبانوں کے خلاف تعصب برتنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا - بابو شیو پرشاد جیسے عالم فاضل شخص سے مجھے اس کی توقع نہ تھی - اس واسطے ان کی تحریر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا - بابو صاحب خود اردو نہایت عمدہ لکھتے ہیں اور متعدد تصانیف اس زبان میں شائع کرچکے ہیں - یہ خواہش کرنا کہ ہندوستان میں سوائے سنسکرت ہندی اور انگریزی کے اور کسی زبان کی تحصیل ہی نہ کی جائے میرے خیال

(*) " Strictures upon strictures "

میں تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے - میں سید احمد خاں کی طرح اس باب میں زیادہ وسیع مشرب واقع ہوا ہوں —

میں سید احمد خاں جیسے مشہور و معروف مسلمان عالم کی حمایت میں اور کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا - سید صاحب موصوف خود ان اعتراضات کی مطلق کوئی پروا نہیں کرتے - چنانچہ انہوں نے " علی گڑہ اخبار " کے مدیر سے کہہ دیا ہے کہ ان پر اگر اس قسم کے آئندہ اعتراضات ہوں تو انہیں مطلع کیا جائے لیکن ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے - مجھے اردو زبان اور مسلمانوں کے ساتھ جو لگاؤ ہے وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں - میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان لوگ باوجود قرآن کو کتاب الہی ماننے کے انجیل مقدس کی الہامی تعلیم سے انکار نہیں کرتے حالانکہ ہندو لوگ بت پرست ہونے کے باعث انجیل کی تعلیم کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتے —

اگرچہ سید احمد خاں موجودہ طریق تعلیم کے دلدادہ نہیں ہیں لیکن باوجود اس کے یورپ میں سائنس اور دوسرے علوم میں جو ترقی ہوئی ہے اس کے بڑے مداح ہیں - موصوف کا خیال ہے کہ یورپ کی ترقی عربوں کے زمانے کی ترقی سے بہت آگے بڑہ گئی ہے جن کے علوم ہی پر اہل یورپ نے اپنی سائنس کی بنیاد رکھی ہے - سید صاحب نے اپنے ان خیالات کو " علی گڑہ اخبار " میں پیش کیا ہے اور اپنے ان ہم مذہبوں کی ذہنیت پر افسوس ظاہر کیا ہے - جو تنگ نظری کے باعث وسیع الخیال لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں —

سید صاحب اپنے ہم مذہبوں کو خود اسلام کی خاطر اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں جن کی شہرت کو زمانہ اب تک نہیں مٹا سکا - اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ

قرآن و حدیث کو ترک کردیں - خود سید صاحب پکے " مسلمان ہیں -
بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی راہ سے ہٹانے کی
کوشش کریں - سید صاحب اہل یورپ کو کافر سمجھتے ہیں لیکن اس
کے ساتھ ہی وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل یورپ اپنے علوم و فنون
کے سبب سے اس زمانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں بہت بلند مرتبہ
رکھتے ہیں اور ان کا عام چلن باوقار اور قابل تعریف ہے - چنانچہ
سید صاحب نے اپنے ہم وطنوں کو اس کی دعوت دی ہے کہ وہ خود
انگلستان آئیں اور اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے وہاں بھیجیں
جیسا کہ خود انہوں نے کیا ہے * یورپ اور ہندوستان کی موجودہ
حالت میں اس قدر فرق ہے کہ ثانی الذکر کے لیے اس کے علاوہ کوئی
چارہ نہیں کہ وہ یورپ کے قدم بہ قدم چلے - سید صاحب کو یقین ہے کہ
بغیر یورپ کی تقلید کے ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا - اب
تک جو ہوا سو ہوا لیکن آئندہ کے لیے مسلمانوں کے لیے انہوں نے یہی
لائحہ عمل تجویز کیا ہے —

سید صاحب کی نصیحتوں کا اثر لوگوں پر آہستہ آہستہ پڑ رہا ہے -
چنانچہ کلکتے کے ایک نوجوان مسلمان کے متعلق میں نے سنا ہے جو کچھ
مہینے ہوئے تعلیم کی غرض سے لندن آئے ہیں - ان کا نام سید امیر علی ہے -
ان کا تعلق ایک نہایت اعلیٰ خاندان سے ہے - موصوف نے کلکتہ یونیورسٹی
میں اپنی تعلیم کی تکمیل نہایت امتیاز کے ساتھ کی ہے جس کی وجہ سے
حکومت نے ان کو وظیفہ عطا کیا - لندن میں تقریباً پچاس ہندوستانی

* سید صاحب کے ایک بیٹے جن کا نام سید محمود ہے آجکل کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ
کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں —

نوجوان تعلیم کی غرض سے آج کل موجود ہیں جو اپنے وطن واپس ہونے پر سرکاری عہدوں پر مامور کیے جائیں گے - میں نے سنا ہے کہ دہلی کے معزز خاندانوں کے بعض نوجوان اسی غرض کے لیے لندن آرہے ہیں - آج کل وہ ہندوستان میں اس کی تیاری کے لیے اپنی تعلیم ختم کررہے ہیں تاکہ لندن میں ان کا قیام مفید ہوسکے * وہ مسلمان نوجوان جن کو اعلیٰ تعلیم کا شوق ہے سفر یورپ اور لندن کے قیام کے اخراجات کے متعلق سید احمد خاں سے برابر معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں تاکہ انہیں اپنے وسائل سے زیادہ اخراجات نہ برداشت کرنے پڑیں - میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ حکومت ان نوجوانوں کے لیے لندن میں ایک مکان مخصوص کردے جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوجائیں - اور حکومت کو یہ بھی چاہیے کہ وہ ہندوستان میں والدین کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں —

اس وقت جو مسلمان لندن آتے ہیں ان کی رہبری سید عبداللہ کرتے ہیں جو نہایت دلچسپ اور پر مذاق آدمی ہیں - ان کی بدولت مسلمان نوجوانوں کو انگریزوں کی عمدہ سوسائٹی میں ملنے جلنے کا موقع مل جاتا ہے - "پردیسیوں کا گھر" (sttrongers home) میں جس کے سرپرست لارڈ کولمونڈلے ہیں اور بعض دوسرے با رسوخ یورپین ایشیائی اس کے انتظام میں حصہ لیتے ہیں، بلا کسی تخصیص کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو وہ تمام سہولتیں بہم پہنچ جاتی ہیں جن کی اس قسم کے ادارے سے توقع کی جاسکتی ہے * —

---

* علی گڑھ اخبار، مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۷۰ ع -

اس کا پتا (West India Dock Road, Lune House London) ہے —

مجھے پوری توقع ہے کہ لاہور کی 'اورینٹل یونیورسٹی" کے قایم کرنے میں حکومت زیادہ لیت و لعل نہ کرے گی اور سنہ ۱۸۷۱ ء میں اس کا کام شروع ہوجائے گا - * اس یونیورسٹی کے متعلق اہل ہند برابر کئی سال سے مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ تمام طلبہ کو کلکتہ، مدراس اور بمئی کے نصاب تعلیم کی پابندی نہ کرنی پڑے جو بالکل مغربی طرز کا ہے - اس یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں تعلیم نہیں دی جائے گی بلکہ غالباً ہندوؤں کے لیے ہندی اور مسلمانوں کے لیے اردو میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا - سر ولیم میور نے یہ طے کر لیا ہے کہ الہ آباد میں دیسی زبان کا مدرسہ قائم کریں - اس کے لیے جگہ کا انتخاب ہو گیا ہے - جس جگہ امریکن مشن ہے جس میں ریورنڈ واش' اون اور سائر کام کرتے ہیں' وہیں اس مدرسے کی عمارت بنائی جائے گی - سر ولیم میور کے پیش نظر جو منصوبہ ہے اس کی تکمیل یقینی معلوم ہوتی ہے - اس کے لیے راجا وزیانگرم نے ایک لاکھ روپیہ کی رقم بطور عطیہ دی ہے اور دوسرے امرا بھی اس کام میں مدد کر رہے ہیں† سر ولیم نے حکومت ہند سے پانچ ہزار روپے عمارت کے لیے طلب کیے ہیں - اس مدرسے میں مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم دیسی زبانوں میں دی جائے گی- لیکن کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ اس تجویز کی مخالفت کر رہی ہے لیکن اس پر سنڈیکیٹ بھی آمادہ معلوم ہوتی ہے کہ یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان میں اس مدرسے کے امیدواروں کو اجازت دی جائے کہ وہ مختلف مضامین میں بجائے انگریزی کے ہندی یا اُردو میں جواب دیں‡

---

* حکومت اس پر تیار ہے کہ اس یونیورسٹی کے لیے جس قدر رقم چندے سے جمع ہوگی اتنی ہی رقم حکومت بھی دے گی اور اکیس ہزار سالانہ دیا کرے گی - علی گڑھ اخبار' مورخہ ۷ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع —

† علی گڑھ اخبار' مورخہ ۴ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع — ‡ انڈین میل' مورخہ ۵ نومبر ۱۸۷۰ ع —

ہندوستانیوں کی عادت ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر نام و نمود بہت چاہتے ہیں - اس کی وجہ سے بہت سی سماجی قباحتیں پیدا ہوجاتی ہیں - نمود کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی جاگیروں کو جو انہیں اپنے بزرگوں سے پہنچی ہیں فروخت کرڈالتے ہیں - کبھی وہ اس قدر قرض لے لیتے ہیں جسے کبھی ادا نہیں کرسکتے - اسی وجہ سے بعض لوگ اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے ہیں تاکہ بعد میں اخراجات سے زیربار نہ ہوں - اسی وجہ سے والدین اپنے لڑکوں کے لیے لڑکیاں خریدتے ہیں اور اسی وجہ سے لڑکیوں کو بھگالے جانے کی رسم پائی جاتی ہے - اب ایک انجمن قایم کی گئی ہے جو ان سماجی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے - اس کا اجلاس راجا بنارس کے محل میں بتاریخ ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع منعقد ہوا تھا - صوبۂ شمال مغربی (یو-پی) کے لفٹننٹ گورنر، ناظم تعلیمات اور دوسرے اعلی انگریز عہدہ داروں نے اس جلسے میں شرکت کی - اس جلسے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بلا امتیاز مذہب شرکت کی - اس انجمن کے ارکان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی سماج کے اس بہتے ہوے ناسور کو اچھا کرنے کی تدابیر تجویز کریں - اور دوسروں کے علاوہ مہاراجا وزیانگرم، بابو شیوپرشاد، مولوی فرید الدین اور پیارے لعل اس انجمن کے جلسوں کی صدارت کرچکے ہیں - ان سبھوں نے انجمن کے مقاصد سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور بڑی حد تک اس بات میں کامیاب ہوے ہیں کہ اپنے اہل وطن کو عادات قبیحہ کے ترک کرنے پر آمادہ کریں —

اس جلسے میں سب سے پہلے ایک ہندو نے جو اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں تقریر کی جس میں یہ تجویز پیش کی کہ مختلف ذاتوں

کے لیے شادی کے اخراجات کے متعلق قانون منظور کرانا چاہیے جس کی تمام ہندوؤں کو پابندی لازمی ہوگی - اس طرح سے ان قبیح رسوم کا انسداد ممکن ہوگا جن کے نقصانات ساری دنیا پر آشکارا ہیں - اس کے بعد سر ولیم میور نے جو اس انجمن کے سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں ہندوستانی زبان میں تقریر کی اور کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ ان لوگوں کو نہایت سخت سزائیں دے جو لڑکیوں کے قتل کے مرتکب ہوتے ہیں - موصوف نے یقین دلایا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں اس بری رسم کے انسداد کی پوری کوشش کریں گے - حکومت کو چاہیے کہ بچوں کی خرید و فروخت کے خلاف بھی سخت کارروائی کرے اس لیے کہ حکومت کے فرائض میں یہ شامل ہے — سر ولیم میور نے یہ بھی فرمایا کہ شادی بیاہ میں جو فضول خرچیاں کی جاتی ہیں اس کا انسداد خود ہندوستانیوں کو کرنا چاہیے اور اس کے لیے وہ جو چاہیں طریقے اختیار کریں - حکومت اس باب میں ان کے ساتھ انتہائی ہمدردی کرے گی -

ہمارے خیال میں ہندو فلسفہ یا بت پرستی کی رسوم سے ان قباحتوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا - اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسیحی مبلغین کی مساعی کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ ہندوستان میں مسیحی اخلاق کی ترویج ہو جس کی بنا عقیدت ہے - یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مسیحی مبلغین اپنے کام میں جوش کے ساتھ منہمک ہیں - بقول سینٹ پیٹر کے ان کے نزدیک حضرت مسیح کی ذات ہی سے کلیسا کی مقدس عمارت کی بنیاد قایم ہے - مسیحی مبلغین غفلت شعار اہل ہند کو "یبوس والی دعا" کے الفاظ میں یوں خطاب کرتے ہیں: "اے بد نصیب لوگو! ان گونگے بہرے خداؤں کی پرستش چھوڑو - کیا تمہارے آنکھیں نہیں کہ یہ دیکھو - خدا کے مقدس شہر کے دروازے تمہارے استقبال کے لیے کھلے

ہوئے ہیں - تم ادھر آؤ "---

آہستہ آہستہ اہل ہند پر ان الفاظ کا اثر ہورہا ہے - ان کے بت خانے جہاں ہزاروں خداؤں کی پرستش کی جاتی ہے مسمار ہو رہے ہیں اور باوقار عقل انسانی فتح حاصل کر رہی ہے - ابھی صرف پچاس برس ہوے ہیں کہ انگریز مبلغین نے ہندوستان میں اپنا کام شروع کیا - اس عرصے میں ۸۷ ہزار اہل ہند انگلیکن کلیسا میں شامل ہوچکے ہیں - جن ہندوستانیوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے ان میں بعض نہایت مشہور لوگ شامل ہیں جیسے کلکتے نے بنرجی اور نہمیا، جبل پور کے صفدر علی، دھلی کے رام چندر اور تارا چند، امرتسر کے عبدالله عمادالدین، پشاور کے دلاور خاں وغیرہ - گوبندر موہن ٹیگور بھی جو کلکتے کے رہنے والے ہیں اور آج کل انگلستان میں ہیں، مسیحی حلقے میں شامل ہوگئے ہیں * - ان کے علاوہ اور بھی ہیں جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا ہے، جن میں بعض مصنف ہیں اور جن کی نسبت میں اپنے خطبوں میں ذکر کرچکا ہوں - مقام تلھولی ریورنڈ ڈاکٹر کالڈول نے اونچی ذات کے دو برہمنوں (میاں اور بیوی) کو بپتسما دیا - ڈاکٹر صاحب موصوف کو دڑاوڑی زبانوں کے ساتھ خاص شغف ہے - † بقول شاعر ورڈس ورتھ کے " بپتسما کے پانی پر معبت الہی کا سایہ ہوتا ہے - اس سے روح انسانی کو نئی زندگی ملتی ہے جو عطیۂ ربانی ہے "---

کلکتے کے اسقف ریورنڈ ملمین حسب معمول نہایت جوش و انہماک

* مجھے افسوس ہے کہ اس مشہور ہندوستانی سے میں پیرس میں ملاقات نہ کرسکا - ان کے متعلق مجھے ریورنڈ جیمس لانگ نے اطلاع دی تھی - ثانی الذکر وہی صاحب ہیں جن کا میں نے اپنے سنہ ۱۸۶۸ ع کے خطبے میں ذکر کیا ہے ---

† دیکھو فروری سنہ ۱۸۷۰ ع کا " The Church missionary intelligencer " ---

سے اپنا کام کر رہے ہیں - گزشتہ مارچ کے مہینے میں موصوف جزیرۂ انڈمان گئے تھے جہاں نیم وحشی اور مردم خور آبادی رہتی ہے - وہاں انہوں نے دو کلیسا قائم کیے اور انگلیکن طریقے کے مطابق بپتسمے کی رسوم ادا کیں - وہاں کے انگریزوں' پورشیئوں اور ہندوستانیوں نے ان کا استقبال کیا - وہاں سے موصوف برما گئے اور رنگون میں جہاز سے اُترے جہاں مسٹر ابیج نے عیسائیوں کا ایک نیا فرقہ بنایا ہے جس کو وہ "نئی روشنی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کے متعلق انہوں نے ایک کتاب میں اصولوں کی توضیح کی ہے - برما کے دارالسلطنت مانڈلے میں موصوف نے وہاں کے عیسائیوں کے قبرستان میں جاکر مغفرت کی دعائیں پڑھیں - * اس کے بعد موصوف کوچین روانہ ہوے جہاں انہیں ۱۷ اکتوبر کو پہنچنا ہے —

ہندوستان میں اس وقت کلیسائی عہدہ داروں میں ہندوستانی لوگ بھی ہیں - چنانچہ مدراس کے کلیسائی حلقے میں ۱۹۵ عہدہ داروں میں سے ۷۹ ہندوستانی ہیں - صرف گزشتہ سال اسقف نے ۲۴ دیسی پادریوں کا تقرر کیا - گزشتہ تین سالوں میں مدراس کے کلیسائی حلقے میں ۷ ہزار ہندوستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا † —

کلکتے کے کلیسائی عہدہ داروں نے دیسی عیسائیوں کی تعلیم کے لیے لاہور میں ایک مذہبی مدرسہ قائم کیا ہے جہاں مبلغین کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے گا - یہاں تعلیم اردو زبان میں دی جائے گی -

---

* انڈین میل' مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ ع —

† دیکھو "Colonial church chronicle" مورخہ جولائی سنہ ۱۸۷۰ ع اور انڈین میل مورخہ ۳ مورخہ مئی سنہ ۱۸۷۰ ع —

ان مبلغین کے لیے لاطینی زبان سیکھنا لازمی نہیں ہوگا کیتھولک لوگوں میں دستور ہے۔* اگر کوئی کیتھولک مبلغ مذہب لاطینی زبان سے واقف نہ ہو تو وہ اچھے عہدے سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک میں وہیں کی زبان عبادت کے لیے استعمال کی جائے۔ یہ درست ہے کہ یورپ میں ابھی تک لاطینی زبان کا سیکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے اگرچہ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ لاطینی عام طور پر یورپ کے طول و عرض میں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ایسے ممالک میں جو لاطینی زبان سے بالکل اجنبیت رکھتے ہیں وہاں اس کا استعمال بے سود ہے۔کلیسا کی زندگی کی ابتدائی صدیوں میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ چنانچہ یونانی، قبطی، حبشی، عربی، عبرانی، کلدانی، ارمنی اور سلافی زبانوں میں مسیحی تعلیم و اشاعت کا کام کیا جاتا تھا اور بجائے لاطینی کے ان کی زبانوں میں عبادت کی جاتی تھی۔ ان ممالک میں اب بھی مقامی زبانوں میں عبادت ہوتی ہے حالانکہ ان میں سے بعض کا تعلق روما سے ہے۔ خدا کو یہ تنوع پسند ہے۔ کلیسا کا لباس، سلیمان کی بیوی کی طرح ایک طرح کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں مختلف رنگوں کی جھلک اچھی معلوم ہوتی ہے —

* "Colnial churh chronicle" مورخہ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع —

مسلمانوں کا مرھٹی ادب میں اضافہ

از

(پروفیسر سی این جوشی ایم اے، جامعۂ عثمانیۂ حیدر آباد دکن
مترجمہ مسٹر گلیش راؤ تھتے، ایم - اے - لکچرار اورنگ آباد کالج) -

(۱)

قرن اول (سنہ ۱۳۰۰ ع تا سنہ ۱۸۰۰ ع) و قرن دوم (۱۸۰۰ ع تا سنہ ۱۸۵۰ ع)

" جس ملک میں جو قوم پیدا ہوتی ہے وہ اسی ملک کی زبان بولتی ہے - وہیں کے دیوتاؤں کو خاندانی دیوتا تصور کرتی ہے اور اعتقاد سے انہیں کی عبادت کرتی ہے " —

از شاہ منتی - سدھانت بودھ

عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس ملک میں آدمی پیدا ہوتا ہے اس ملک سے وطن کی حیثیت سے اسے جیسے لگاؤ ہوتا ہے ویسے اس ملک کی زبان سے بھی اس میں فطرتاً محبت پیدا ہوتی ہے - اس ملک کی آب و ہوا اور قدرتی مناظر وغیرہ عام چیزوں پر جس طرح اسے پیدائشی حق حاصل ہوتا ہے اسی طرح وہاں کی زبان پر بھی اسے حق ضرور ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ قومی زبان ذات نسل مذہب و فرقہ کی محدود تفریق سے بالاتر ہوتی ہے - لہذا ہمارے ملک مہاراشٹر کی ملکی زبان مرھٹی پر ہندو مسلمان یہودی عیسائی جین لنگایت مہانوبھاؤ شیو وغیرہ مختلف مذاہب و فرقوں کے لوگوں کو یکساں حق حاصل ہے اور نہایت مسرت کی بات

ہے کہ یہ سب قدیم زمانے سے اس حق کو جتاتے رہے ہیں —

مہار اشٹر ساہتیہ سمیلن یعنی مرھٹی ادبی کانفرنس کے بارھویں جلسے میں مسٹر سالومن سیمپسن نے ایک مضمون بعنوان "بنی اسرائیل قوم کا مرھٹی ادب میں اضافہ" پڑھ کر ہم کو اپنی قوم کی ادبی خدمات سے واقف کر دیا تھا - عیسائی مرھٹی کانفرنس میں جو بہ مقام ناگپور منعقد ہوئی تھی ریورنڈ اُجگرے صاحب نے عیسائی مرھٹی ادیبوں کا حال سنایا تھا - اس کے بعد انہوں نے عیسائیوں کی ادبی خدمات کی مفصل تاریخ بھی شایع کی ہے —

نیز مسٹر سی جی کروے نے سنہ ۳۲ ع میں رسالہ "رتناکر" میں "غیر ہندو مرھٹی ادب" کے عنوان سے نہایت مختصر معلومات پیش کی تھیں - میں صرف مسلمانوں کی مرھٹی ادبی خدمات کا تخمینہ آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں —

مرھٹی ادب میں ہر سال جو اضافہ ہوتا ہے اس کو باقاعدہ طور پر نوٹ کرنے کا نہایت اہم کام ہنوز ہم لوگ نہیں کر رہے ہیں - اس وجہ سے مضمون ہذا کے متعلق باوثوق معلومات کا حاصل کرنا بہت دشوار ہوا - خصوصاً حیدرآباد میں یہ دشواری میں نے زیادہ محسوس کی - تاہم پونا' بمبئی' ستارہ بڑودہ' سانگلی' احمد نگر وغیرہ مقامات سے خط و کتابت کے ذریعے اور موجودہ کتابوں سے جس قدر معلومات کا حاصل کرنا ممکن تھا اتنی معلومات اس مضمون میں اکٹھا کی گئی ہیں - معلومات کے مکمل اور صحیح ہونے کے بارے میں جو خامیاں مضمون میں پائی جائیں انہیں دور کرنے کی التماس لایق عالموں سے کی جاتی ہے —

اس وسیع مضمون کو واضح طور پر پیش کرنے کی سہولت کے خاطر

...س میں تین قرن فرض کر لیے گئے (۱) میں قرن اول سنہ ۱۳۰۰ ع تا سنہ ۱۸۰۰ ع
۲) قرن دوم سنہ ۱۸۰۰ ع تا سنہ ۱۸۵۰ ع (۳) قرن سوم سنہ ۱۸۵۰ ع تا سنہ ۱۹۳۵ع
ان میں سے ہر ایک سے بالترتیب بحث کی گئی ہے —

قرن اول سنہ ۱۳۰۰ ع تا سنہ ۱۸۰۰ ع

اس دور میں مرهٹی ادب کی ابتداء سے یعنی تقریباً سنہ ۱۲۰۰ ع سے اٹھارویں صدی تک جو مسلمان ادیب گزرے ہیں ان کے کلام سے بحث کی گئی ہے —

عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگرچہ غیر مذہب والے زبان رائج الوقت کو اختیار کر بھی لیں تاہم اس زبان میں اپنے مذہب ہی سے متعلق ادب پیدا کرنے کا رجحان ان میں ہوتا ہے - لیکن قرن اول کا ادب اس قاعدے سے مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے - ڈھونڈنے سے اس کا یہ سبب پایا جاتا ہے کہ مہاراشٹر میں صدہا سادھو سنتوں نے جو مذہبی جذبے کو جگانے کا لاجواب کام کیا اس کا ہندو اور غیر ہندو دونوں پر یکساں اثر ہوا - اور اسی سبب سے اعلیٰ ادنیٰ' عالم جاہل' مرد عورت ہندو مسلمان ان سب کے نام اس گروہ میں پائے جاتے ہیں —

مسٹر جسٹس راناڈے نے اپنی مشہور تصنیف "مرهٹی حکومت کے ارتقا" میں "مرهٹہ سادھو" کے عنوان سے اس کا نہایت موثر دلچسپ اور مفصل بیان کیا ہے - اس زمانے میں جیسے بھٹکے ہندوؤں نے دنیاوی فائدے کی خاطر مذہب اسلام اختیار کرلیا' ویسے شیخ محمد وغیرہ مسلمانوں نے اپنی آخرت کے خیال سے ہندو دھرم کا سہارا لیا - اور انہیں حضرات کی تصنیفات سے اس دور میں مرهٹی ادب میں اضافہ ہوا - لیکن شیخ محمد کی طرف متوجہ ہونے سے قبل جن بعض شاعروں

کے تبدیل مذھب کے متعلق کوئی فیصلہ ھنوز نہیں ھوا ھے ان کا ذکر کرنا مناسب ھوگا —

مرھٹی ادب کی ابتداء کے بعد پہلی مرتبہ جس شاعر کے متعلق شبہہ پیدا ھوتا ھے وہ بھرہ جاتوید ھے - مسٹر بھاوے مرحوم نے اپنی کتاب مہاراشٹر سار سوت میں اس کا ذکر کیا ھے اور اس کا زمانہ سنہ ۱۳۰۰ ع بتایا ھے - شاعر مہیپتی اپنی تصنیف بھگت ویجئے (بھگتوں کا تذکرہ) میں لکھتا ھے کہ جھگڑالو بیوی سے اکتا کر اس نے مذھب اسلام اختیار کیا - لیکن بعد میں اس کی حالت بقول شاعر کے "افسوس! یہ نہ ھندو رھا نہ مسلمان" کی سی ھوئی - لیکن مسٹر بھاوے لکھتے ھیں کہ وہ سنیاسی بن گیا - مسٹر چاندورکر نے سنت شاعروں کی فہرست میں اسے مسلمان بتایا ھے - مسٹر آجگانوں کر مہیپتی کی تقلید کرتے ھیں - مشہور شاعر موروپنت اپنی نظم "سمنی مالا" (جواھر کا ھار) میں اس کی یوں تعریف کرتے ھیں - "وہ برھمن بھرا اور دیوانہ تھا لیکن میں اسے تسلیم کے قابل سمجھتا ھوں - ھیرا اگرچہ گھوڑے پر گر جائے اور میلا ھوجائے تو بھی وہ ھیرا ھے نہ کہ معمولی پتھر" —

اس نظم کی دوسری سطر میں شاعر نے نہایت خوبی سے اس کے مسلمان ھونے کی طرف اشارہ کیا ھے - مسٹر جسٹس راناڈے بھی اپنی تصنیف مذکورہ بالا میں اس روایت کا ذکر کرتے ھیں - لیکن اگرچہ پروفیسر پوتدار صاحب نے اس کی تصنیفات اس کے زمانے اور گرو کے نام وغیرہ سے بہت کچھ بحث کی ھے وہ اس کے تبدیل مذھب کا ذکر نہیں کرتے —

اس کے گرو سدہ ناگناتھہ تھے - جب سے ان کی نظر عنایت اس پر

پڑی اس نے وتھل کی بھکتی شروع کی - وتھل کے مندر میں هندو مسلمان کی تفریق نہیں مانتے تھے - شاعر نے سری بھاگوت کے دسویں باب پر جو تفسیر لکھی ھے اس میں وہ خود اپنے دیوتا کا نام مہالنسا بتاتا ھے اور خاندانی (گوتر गोत्र) - कौंडिन्य کونڈ ینہ بتا کر یہ لکھتا ھے کہ " میں پاک نسل سے ھوں " -

اس قسم کا دوسرا شاعر مروتپونجیے سوامی ھے یہ پندھرویں صدی میں گزرا ھے - مسٹر بھاوے بیان کرتے ھیں کہ یہ بیدر کے بہمنی شاھی خاندان سے تھا اور اصل میں مسلمان تھا لیکن پوتدار صاحب لکھتے ھیں کہ شانتی برھمن نامی شاعر اور مروتپونجیے سوامی ایک ھی شخص ھیں اور ان کا قیاس ھے کہ یہ بیدر کے شاھی خاندان کا ملازم تھا - حال میں مزید دریافت کرنے پر بھی انہوں نے کہا کہ یہ مسلمان نہیں تھا اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اب صرف پانچ چھے (गुरुकौशल گرو کے کمالات وغیرہ) ملتی ھیں —

ایسا تیسرا شاعر لولمب راج ھے یہ شاعر سہوکلیان کا ھمعصر تھا لیکن اس کا زمانہ سنہ ۱۵۵۰ ع رہا ھوگا - اس نے ایک مسلمان حسینہ سے شادی کی تھی اور اس کا نام رتن کلا رکھا تھا - اس شاعر نے " قصہ لولمب راج " نامی ایک عمدہ نظم لکھی ھے لیکن وہ نہایت فحش ھے - رتن کلا کے انتقال کے بعد وہ پچھتایا اور قلعہ سپت شرنگ کی بھوانی دیوی کی عبادت کرنے لگا - حتیٰ کہ اس نے دیوی کو راضی کرلیا - تب سے لوگ اسے نظر استحسان سے دیکھنے لگے - مسٹر چاندورکر اور مسٹر سکندر لعل آثار دونوں اس کی تصنیفات کے متعلق معلومات بیان کرتے ھیں لیکن یہ کہیں نہیں بتاتے کہ وہ هندو تھا یا مسلمان —

اس کے بعد البتہ ھم ایک پیدائشی مسلمان شاعر اور سادھو شیخ محمد

بابا سے دو چار ہوتے ہیں۔ مہیپتی نے اس کی سوانح عمری اپنی کتاب کے ۵۲ویں باب میں بیان کی ہے۔ منمنت سوامی بھی سری رام داس کی سوانح عمری میں ان کا قصہ بیان کرتے ہیں مسٹر آج گانوں کرکی کتاب " سوانح شعرا " میں اسی پوتھی کے حوالے سے اُسے بالتفصیل درج کیا گیا ہے۔ شیخ محمد کی تصنیف " یوگ سنگرام " کے دیباچے میں مسٹر شیو رام واگلے نے بھی ان کا حال لکھا ہے اگرچہ اس کی تاریخ ولادت و انتقال یقینی طور پر کہیں درج نہیں لیکن تصنیف مذکورہ بالا سنہ تالیف سکے ۱۶۱۸ یعنی سنہ ۱۶۹۶ عیسوی درج ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سترھویں صدی میں گزرا ہے۔ یہ شاعر ضلع احمد نگر کے قصبہ شری گوندہ کے قریب موضع رونی واھیرہ کا باشندہ تھا اور پیشے کا قصاب تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اسے اپنے رزیل پیشے سے نفرت ہوئی اور اس نے اسے ترک کردیا۔ بعد میں وہ چندر بودھلا یا چاند بودھلا کا چیلا بن گیا۔ ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ مشہور سنت رام سوامی اور تکارام ان کے شفیق دوست تھے اور یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے ــ

اگرچہ اس نے اپنی کتابوں میں بت پرستی اور خدا کی انسانی شکل میں عبادت ان دونوں کی مذمت کی ہے لیکن وہ خود پنڈھر پور کے وٹھل کے درشن کرتا تھا اور اس مشہور زیارت گاہ کے متعلق اس کا قول ہے کہ " پنڈھر پور پر ثواب شہر ہے جہاں کا مالک وٹھل ہے " سادھو پرلہاد بابا راول بابا اور گودھو بابا اس کے ہمعصر تھے۔ پرلہاد بابا اور شیخ محمد بابا دونوں صاحب اولاد تھے آخرالذکر کی اولاد اب بھی شری گوندہ میں موجود ہے۔ پھاگن بد ۹ کی تاریخ کو اس کا عرس ہوتا

اور اس کی قبر پر هندو مسلمان دونوں عبیر چڑھاتے هیں - وهاں
شیخ محمد تکارام چانگ بودهلا " کا فقرہ بهجن میں بولا جاتا هے —

مسٹر آچکانوں کر اور واکلے لکهتے هیں کہ ان کی تصنیفات تین هیں یعنی
گ سنگرام (یوگ کی لڑائی) نشکلنگ پربودہ (پاک تفسیر) اور پون
بجلے یعنی هنومان کی فتح - لیکن چاندورکر بهاوے اور پوتدار کو اصرار
، کہ ان کی اور ایک تصنیف هے یعنی دنان ساگر (علم کا سمندر) - اس
ناب کے بهیروے اودهوت (انتقال سنہ ۱۷۹۵ ع) هری بوا (پیدائش
کے سنہ ۱۶۳۰) اور نارائن بابا (سنہ ۱۷۹۰) وغیرہ مختلف مصنف
بان کیے جاتے هیں - میں نے بمبئی سے شیخ محمد کا مصنفہ " دنان
اگر " منگایا تها - لیکن اس کے عوض نارائن بابا کی تصنیف وصول هوئی -
ون ویجئے غیر شائع شدہ هے اور نشکلنگ پربودہ کمیاب هے ، یوگ سنگرام
لبتہ شائع هوچکا هے - اس کے علاوہ اس نے مختلف چهوٹی چهوٹی حمد
ی نظمیں (پد) بهی لکهی هیں - کہا جاتا هے کہ اس کی ایک آرتی
یں تقریباً پچاس مسلمان سنتوں (اولیا) کے نام درج هیں - لیکن ان
ے متعلق اب تک کوئی مزید معلومات دستیاب نہیں هوئی —

پوتدار وغیرہ حضرات نے شیخ محمد بابا کی سوانح عمری میں
وگ سنگرام کے متعلق کچھ معلومات دی هیں - انهیں دهرائے بغیر
یهاں مزید معلومات دی جاتی هیں —

۱ - اول یہ دیکهنا چاهیے کہ کتاب مذکور کو یوگ سنگرام کا نام کیوں
دیا گیا - اور اس کا مضمون کیا هے - ۱۷ ویں باب میں شاعر
لکهتا هے کہ پدماسن ، وجراسن سدهاسن وغیرہ آسن میں مہارت
حاصل کرنے پر جنگ کی تیاری مکمل هوگئی - اور بعد میں تیلوں

عناصر کو یکجا لاکر لڑائی کا اعلان کیا گیا - بزمانۂ جنگ جپ وغیرہ جملہ حرکتیں موقوف تھیں لہذا اس تصنیف کو یوگ سنگرام نام دیا گیا —

اب لڑائی کے واقعات سنیے - روح نے دل کے گھوڑے پر سوار ہوکر اپنے دشمن " خودی " پر حملہ کردیا - اور یکے بعد دیگرے اس کی گھوڑ سوار فوج یعنی ماں باپ برادر وغیرہ اس کا پیادہ لشکر یعنی " میں ہوں وہ ہے وغیرہ (گویا تفریق کا خیال मैं तोहि تفریق کے خیالات ' نوکر چاکر یعنی اُمید - ارادہ ' تخیل ہوس وغیرہ اور اس کی طوائف سے عشق محبت وغیرہ ان سب کی بیخکنی کی - اور بالآخر " برھمانڈ " یعنی قادر کائنات پر قبضہ کرلیا - بابا شیخ محمد نے تشبیہ کے ذریعے روح اور سنسار کا جھگڑا خوبی سے بیان کیا ہے - اس کتاب سے شاعر کا علم یوگ میں کمال اور تجربہ واضح ہوتا ہے —

۴ - اس تصنیف میں از ابتدا تا انتہا یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس تھا - اس نے وقتاً فوقتاً کبھی اجمالی طور پر اور کبھی تفصیل سے اور تمثیل کے ذریعے قارئین کے سامنے یہ اصول پیش کیا ہے کہ ذات اور رنگ دونوں اہم نہیں ہیں بلکہ یہ چیزیں بالکل ذیلی ہیں - اس ضمن میں ذیل کے فقرے دلچسپ ہیں —

(ا) شیخ محمد کہتا ہے کہ اے ایشور تو مسرت کی جڑ ہے تونے مجھے مسلمان پیدا کیا - پاک برھمن مجھ سے چھوت مانتے ہیں - لیکن اے نرگن جب تو خود پاک ہے تو تیرا یہ بھگت ناپاک کیونکر ہوسکتا ہے ؟ لیکن اے خدا تونے مجھے لوگوں کی نظر میں ناپاک

بتایا یہ بھی ٹھیک کیا - کیونکہ اس وجہ سے میں تیری یاد کرتا ہوں اور اس میں میرا فائدہ ہے - لیکن اے دیو! اگر ان لوگوں نے تجھہ سے چھوت برتی تو تو خانہ بدوش ہوجاے گا اور تجھے چھپنے کے لیے کوئی جگہہ تک نہیں ملے گی —

(ب) یہ کہہ کر کہ پتھر خود بے جان ہے اس کی مورت اپنے بھگت کو کیونکر بچا سکے گی اور کیا نجات دلا سکے گی " شاعر بت پرستی کی مذمت کرتا ہے اور مزید یہ کہتا ہے کہ " لوگ کہیں گے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے یہ ہمارے دیوتاؤں پر اعتراض کرتا ہے اس کے اعتراض کی وقعت ہی کیا ہے ؟ کچھہ بھی ہو یہ بت شکنوں کا ہم مذہب " اس کا شاعر یہ جواب دیتا ہے کہ انسان مقدر کے مطابق پیدا ہوتا ہے میں مسلمان پیدا ہوا یہ میرا قصور نہیں لیکن میں نے گیان حاصل کیا ہے میں قرآن اور پران دونوں کی تفسیر کہتا ہوں اور کامل اور طالب دونوں مجھے مانتے ہیں - سچ پوچھیے تو جس پر خدا کا پریم ہو اس کا خاندان پوچھنا نہیں چاہیے - اپنی دلیل کی تائید میں شاعر نے ویاس، ہنومان، وسیشٹھہ، گوتم، مارکنڈیہ، نارد وغیرہ کے قصے بیان کیے ہیں —

(ج) میں ذات کا مسلمان، میری مرھٹی زبان غیر شستہ، ممکن ہے کہ عالم و پنڈت اس پر اعتراض کریں - لیکن میں نے شاستر اور پران کی تعلیم کہاں حاصل کی؟ میں پاکیزہ زبان کیونکر بول سکوں گا ؟ لیکن سرسوتی دیوی نے مجھہ سے کہا کہ شیخ محمد تو پیدائشی مہایوگی ہے اور ایشور کے حکم سے میں تیری زبان پر آکر ٹھیری ہوں -

(د) بھلاویں کو کوئی چھوتا تک نہیں - لیکن اس کا مغز برت (روزہ)

میں استعمال کرتے ھیں اسی طرح دیگر سابق اعمال کی وجہ سے بھکت
رزیل ذات میں پیدا ھوا ھو تو اس کو خیال میں نہیں لانا چاھیے
بادشاہ نے اگر کسی طوائف کو قبول کرلیا تو لوگ اسے "ماں صاحب"
بولنے لگتے ھیں —

(ھ) شیخ محمد کہتا ہے کہ مجھے ویکنٹھہ (یعنی بہشت) نہیں چاھیے -
مجھے بھکتی دو خواہ مجھے کسی ذات میں پیدا کرو۔ مجھے ایسی
اعلیٰ ذات درکار نہیں جس میں رہ کر میرے دل میں بھکتی نہ ھو۔

۳- اس کتاب میں شاعر نے اپنے والدین اور سلسلۂ مرشدی کا ذکر کیا ہے۔
تیسرے باب میں اپنے خوش اوصاف باپ محمد اور باعصمت ماں
پھلائی کا ذکر ہے اور پندھرویں باب کے شروع میں جانو پنت (جو
قلعہ دولت آباد میں رہتے تھے) - ایکناتھہ (پٹن والے) چانگ بودھلا
اور شیخ محمد کا سلسلہ مرشدی بتایا ہے —

۴- قرآن شریف کے آیات لکھہ کر ان کا مرھٹی ترجمہ کرنے کا اسے بڑا شوق
تھا۔ اور کہیں کہیں اللہ پیغمبر پیر وغیرہ کا بھی ذکر ہے — مثلاً

(ا) شری کارے آرم نارائن کو میں بندگی پیش کرتا ھوں اسی کو مسلمان
اللہ بولتے ھیں —

(ب) سنو بسم اللہ الرحمٰن اکبر اس سے مراد بھکتی کی جڑ دل میں
پیدا کر۔ حضرت میران پیر عاجزوں کی نجات کے لیے اس
کا اعلان کرتے ھیں —

(ج) سنو اگر اللہ اور ھری مختلف ھوتے تو اب تک وہ آپس میں
لڑ کر مر جاتے —

(د) چھ چھ سد گرو کو میں بندگی عرض کرتا ھوں جس کا نام حضرت

میراں پیر ظاہر ہے —

(ی) ظل ظل اللہ پیارے نبی اے قاتم تیری جئے ہو اے پرمیشور تو ہر جگہہ بھرا ہوا ہے جو سچا رحمن ہے - پہلے سمجھہ لو کہ ایک بسم اللہ اول پیدا ہوا اور پھر ہزارہا ناموں سے دنیا میں ظاہر ہوا - چیخ پکار چھوڑ کر بندگی کرو - اور اپنے گرو کی خدمت کرو - مسلمان اسے سچا پیر کہتے ہیں - اور مرھٹے اسی کو سدگرو بولتے ہیں - اے بھائی آنکھیں کھول کر دیکھہ ان دونوں میں کچھہ بھی فرق نہیں - بیسوں زبانیں اور محاورے ہیں ، جو صرف ایک اللہ کا ذکر کرتے ہیں لوگ دل میں تفریق رکھہ کر بولنے میں جھگڑا کرتے ہیں —

(ف) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ان دو کلموں میں دنیا کا سمایا خدا جاننا چاہیے —

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو مسلمان دونوں مذہبوں میں کچھہ بھی تفریق نہیں کرتا تھا —

۵ - الفاظ کی تعریف اور ان کے فرضی ماخذ بتانے کا بھی اُسے بڑا شوق تھا —

(ا) سچا قاضی کون ؟ جو رشوت لیے بغیر انصاف کرتا ہے - سچا ملا کون جو (مول) یعنی اصلیت جانتا ہے دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے فقیر کون جو ہر سانس کے ساتھہ اللہ کو یاد کرتا ہے —

(ب) جوگی کون جو دل کو (جوگ) ویران کرتا ہے جو اپنے سانس کو اُلٹا چڑھاتا ہے مسلمان وہ جو (موس) کوکھہ میں نو ماہ تک بستی کرتا تھا - بغیر موس یعنی کوکھہ کے کائنات میں کچھہ بھی

پیدا نہیں ہوا لہذا ایک حیثیت سے سب لوگ مسلمان ہیں -
لیکن لوگ اپنا اصلی نام چھپاکراپنے کو برہمن کشتریہ ویشیہ وغیرہ
ناموں سے ظاہر کرتے ہیں - یہ سن کر برہمن بگڑ جائیں گے لیکن میں
سچ کہہ رہا ہوں —

(ج) گوئند وہ ہے جو سب کو ایک دھاگے میں (گوتا) پروتا ہے —

(د) شعر متصد میں شے سے مراد گروکی سیوا - کہہ سے مراد کھلبلی
(क्षोभ) وہ یعنی خدا سیں ہوں کے علم سے جو کھلبلی پیدا ہوتی
ہے - م سے مراد مایا کے بغیر ایشو - حم سے مراد (اہم) خودی
کے احساس سے خالی - م سے مراد میل سے پاک خدا اور د اتحاد بتاتا ہے —
یہ معنی علم و قوانین کے مطابق نہیں ہیں تاہم جدت سے خالی
نہیں ہیں اور پر معنی ہیں —

۶ - شاعر نے بہت سے فارسی اور عربی الفاظ استعمال کیے ہیں جن
سے کلام مشکل ہوگیا ہے اور ان کی سادگی اور زبان کی روانی میں
فرق آگیا ہے اور یہ فوراً ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ غیر ہندو اور غیر
زبان شخص کا کلام ہے —

۷ - وہ الفاظ کے لیے رکتا نہیں - بلکہ سکوں کے مانند انہیں جھمک
کھو لیتا ہے . اسم سے فعل بنانے میں وہ بڑا ماہر ہے مثلاً بستی کرنے
والا بستی کارو - عام محاوروں اور ضرب المثل کا استعمال بھی
خوب کرتا ہے - بعض تشبیہات جدید اور دلچسپ ہیں مثلاً سدگرو
زمین کے مانند دبنے والا اور چیلا (شاگرد) کدالی کے مانند کھودنے
والا ہے - چوہوں کی آواز پر بلی چوکنا ہوکر جیسی تن اور من
کی یکسوئی کرتی ہے ویسی یکسوئی پیدا کر —

- اس نے بت پرستی ' ذات پات ' مغرور برہمن ' ہٹ بھرے گرو ' ڈھونگ رچنے والا سادھو ان سب کی پرزور الفاظ میں مذمت کی ہے - ان باتوں کی بحث اس کی سوانح عمری میں آچکی ہے لہذا اسے یہاں دہرانا مناسب نہیں - الفاظ کی تالدار بندش ' معنی آفرینی ' موزوں الفاظ کا انتخاب مضمون کا تسلسل اور روانی وغیرہ بہت سی ضروری خوبیاں اس کی نظم میں خاص طور پر نمایاں ہیں بلکہ بعض اوقات لفاظی ' فحش کلامی ' مضمون سے ہٹ جانا وغیرہ نقص پائے جاتے ہیں - نیز جذبے کی گہرائی اور تخیل کی بلند پروازی بھی کہیں نظر نہیں آتی - اس وجہ سے محض شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے کلام کا درجہ کسی قدر ادنی ماننا پڑے گا - تاہم وسیع مطالعہ ' یوگ کی ماہیت صاف گوئی ' صداقت ' دقیق ویدانت کو سیدھی سادی زبان اور سلیس پیرایے میں بیان کرنے کی خوبی ' ان خصوصیات کی بدولت یہ کتاب قابل مطالعہ ضرور ہے - بلکہ ایک ان پڑھ یا خود خواندہ غیر زبان مسلمان کی تصنیف ہونے کے مدنظر اس کے متعلق ہم میں مسرت و احترام کا خیال بھی پیدا ہوتا ہے —

اسی زمانے کے لگ بھگ وتھل کی بھکتی کا کافی رواج ہوگیا تھا - ان مسلمان بھکتوں میں سے بہت سوں نے شعر لکھے ہیں لیکن ان کے نام اور ان کی مختصر نظموں کے علاوہ اور کچھ بھی معلومات دستیاب نہیں ہوتیں - ان میں سے بعض کے نام (مع انتخاب کلام) ذیل میں درج ہیں —

ا) سید حسین جنگلی فقیر - اس نے " تار کا سور کا قتل " اور " دند بھی

کا قصہ " لکھا ھے —

(۲) زندہ فقیر کے چند پد ملتے ھیں —

(۳) قاضی محمد کے بھی چند پد ملتے ھیں —

(۴) جمال شاہ کو شری دت نے فقیر کے بھیس میں درشن دے کر خود کشی سے بچایا تھا اس نے چند پد لکھے ھیں —

(۵) بہادر بابا نے گل حاجی کا قصہ لکھا ھے —

(۶) شاہ بیگ اپنے پد میں " کیشو " کا ذکر کرتا ھے لیکن اس کا پتا نہیں کہ یہ اس کے گرو کا نام ھے یا ایشور کے معنوں میں لکھا ھے —

(۷) قادر نے " جنگ بہادر " نامی رزمیہ نظم لکھی ھے لیکن وہ اردو میں ھے - البتہ مرھٹی میں پانی پت کی مشہور لڑائی پر جو " پوارے " یا رزمیہ نظمیں لکھی گئیں ان کا ماخذ یہی ھے —

(۸)(۹) لطیف اور شیخ فرید کے پد ھیں —

(۱۰) شیخ سلطان کا نام سادھو گوپال ناتھ کے مریدوں میں پایا جاتا ھے -

(۱۱) دادو پنجاری نے وچار ساگر یا " خیالات کا سمندر " لکھا ھے -

اب جس شاعر کے متعلق کچھ معلومات دستیاب ھوئی ھیں اور جو اس دور کا درحقیقت سب سے بڑا شاعر تھا اس کی طرف متوجہ ھوتے ھیں - اس کا اصلی نام شیخ حسین تھا - لیکن سادھو " ملیدر " کو گرو کرنے پر وہ اپنے کو شاہ منی کہنے لگا - اس کی صرف ایک تصنیف " سدھانت بودہ یعنی " " خلاصۂ اصول " ھے - اس کے ۳۶ ویں باب میں اس نے اپنے متعلق جو معلومات تحریر کی ھیں وہ حسب ذیل ھیں . شاہ بابا اور آمنہ اس کے پر دادا اور پر دادی تھیں - پر دادا فارسی اور مرھٹی دونوں زبانیں جانتا تھا اور وہ شیوجی کی عبادت کیا کرتا

تھا آسلہ بڑی نیک عورت تھی - اس کا لڑکا جناجی اور اس کی بیوی منڈو بائی تھی - جناجی وشنو کی عبادت کرتا تھا - شاعر کے والد کا نام مان سنگھہ اور والدہ کا نام اماں عرف تائی تھا یہ دونوں "گنپتی" کی عبادت کرتے تھے یہ خیال کرکے کہ اپنا دادا پھر پیدا ہوا ہے انہوں نے اپنے لڑکے کا نام شاہ حسین رکھا - شاعر کہتا ہے کہ میرے پڑ دادا کی بھکتی کے بیچ مجھہ میں اگنے لگے - ان کے وطن بالترتیب الہ آباد' اوجین' سدہ ٹیک اور بھیما کے کنارے پر پیر گانوں تھے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاندان مقامی نہیں تھا ـــ

پہلے ہی باب میں اس نے اپنے گرو کا نام بتایا ہے "منیدر سوامی گرو کے قدموں پر اس کا خدمت گار شاہ ہے" - بعد میں خواب میں اسے کبیر کے درشن ہوے تب سے شاعر کہتا ہے کہ وہ بھی میرے گرو ہیں اور ان کا جپ میں رات دن کرتا ہوں" غرض یہ دو گرو مانتا تھا - اپنے مرشدوں کا سلسلہ "دتاترے' منیدر' شاہ منی" بتاتا ہے وہ جوش مسرت میں کہتا ہے کہ بنارس میں گنگا کے کنارے آدھی رات میں جب کہ ریوتی کا رتکی تھی میرے گرو نے میری ذات کو نظر انداز کرکے مجھہ پر (کرپا) عنایت کی اس وقت میں آپ میں آگیا' آپ اپنے اندر سما گیا - میں خود میں منجمد ہوگیا یہ کہنا کہ میں بندھ گیا یا چھوٹا دونوں غلط ہیں" ـــ

شاعر خود ہی بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں اسرار خودی کے کون کون سے عنوانات سے بحث کی ہے وہ کہتا ہے کہ اس میں گیان اور تجربہ دونوں کا نتیجہ پیش کیا ہے' اس میں گیان بھکتی اور بیراگ پر مفصل تبصرہ ہے - شاعر کا عام طرز یہ ہے کہ پہلے ایک عنوان لے کر اس

پر تبصرہ کرتا اور اس کی وضاحت کے لیے ایک یا زاید روایتیں یا قصے اختصار سے بیان کرتا ہے - یہ قصے اس نے مختلف پرانوں سے لیے ہیں - جو اس کے وسیع مطالعے کا پتا دیتے ہیں اور قارئین کو حیرت ہوتی ہے - اس کا دعویٰ ہے کہ با اعتقاد شخص کو یہاں نجات کی کلید مل جائے گی اور عالم کے لیے برہم کا چرچا ملے گا - دنیا دار کو دنیا داری کا راز معلوم ہوگا - اور شعر کے شوقین کو شعر کے جوہر ملیں گے - اپنی کتاب کی وقعت اور اپنی شاعری کے درجے کے متعلق شاعر خود مسرت اور فخر سے ذکر کرتا ہے - بعض نمونے یہاں دیے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ شاعر خود اپنی تصنیف کے متعلق کیا خیال رکھتا تھا -

۱ - "میں نے سنسکرت نہیں رٹی - کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا - لیکن شری دت کی عنایت سے میں اس میں ایسا لطف پیدا کروں گا کہ قارئین مسرور ہو جائیں گے" -

۲ - "شاہ منی کا منہ ایک ڈبا ہے جس میں گرو نے علم کی مشک بھر دی ہے - سامعین کانوں کے ذریعے اس کے شعر کی مہک حاصل کریں گے" -

مشک کی مہک حاصل کرنے سے قبل ہی اسے رکھنے کی ڈبیا دیکھ کر سونگھنے والے کو نفرت ہو!

۳ - "شعر کا راز امرت (آب حیات) کے پھل کے مانند ہے گرو کی کرپا سے وہ پک گیا - اس کا مزہ قارئین تجربے سے چکھیں گے" -

یہاں البتہ بقول شاعر کے سامعین مسرت بھرے شاعر کو دعا دیں گے -

۴ - "محض الفاظ کو جوڑ کر یہ کلام نہیں لکھا گیا میرے گرو میرے دل میں داخل ہوئے اور انہوں نے نظم کا سیلاب بہایا ہے - پر معنی

اور پر لطف پیرایے میں راز کی باتیں بیان کروں کا جس میں غیر معمولی شیرینی ہوگی " ۔

۵ ۔ اب موزوں الفاظ کے انتخاب کے متعلق شاعر کی رائے ملاحظہ فرمائیے ۔
" میں نے الفاظ کے زیور سے اپنی نظم کو سجایا ہے " اگرچہ شاعر کا یہ بیان کلیتاً صحیح نہیں ہے لیکن خاص خاص مقامات پر ضرور صحیح ہے ۔ پچاسویں باب میں شاعر لکھتا ہے کہ " میری کتاب پر میرے گرو کی مہر لگی ہوئی ہے " اور پھر اپنی کتاب کی خوبیاں بہت سی تشبیہات کے ذریعے سے واضح کرتا ہے ۔ درحقیقت وہ جدت بھری اور تازہ ہیں ' ان کا مطالعہ ہمیں ان مماثل خیالات کی یاد دلاتا ہے جن کا اظہار مشہور شاعر دنانیشور نے اپنی تصنیف دنانیشوری کے متعلق کیا ہے ۔

ایک اور لحاظ سے بھی کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ شاعر نے اپنے گہرے مشاہدے کی بنا پر جو استعارے استعمال کیے ہیں ان سے اس زمانے کی سماجی حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے ۔ یہاں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں ۔ اس زمانے میں بھی شادی میں میاں بیوی تو راضی رہتے تھے لیکن مہمان خواہ مخواہ جھگڑا برپا کرتے تھے ۔ چھوت چھات کا بازار گرم تھا بقول شاعر کے ذات اور مذہب کا تعصب اس سنسار کے سمندر کو پار کرنے والوں کی گردنوں میں پتھر کی مانند ہے " یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس وقت اس قسم کا تعصب بہت کچھ پایا جاتا ہے ۔ کوکن (مغربی ساحل) کی غریب عورتیں ناریل کے پتوں کی بالیاں کانوں میں پہنتی تھیں ۔ " گجراتیوں کو مرمرے کے لڈو بہت پسند تھے اسی طرح سادھوؤں کو خدا کی پرستش پسند آتی ہے " ۔ آج کل کے مانند اُس زمانے

یں بھی گجراتی عورتیں مصنوعی غم کا اظہار کرتی تھیں - وہ پانی
نے کے لیے گھڑے پر گھڑا رکھ کر لے جاتی تھیں - بیوائیں سیندور نہیں
لاتی تھیں - باپ اپنی بیٹی کو جس گھر بیاھتا تھا وہاں وہ خاموشی سے
چلی جاتی تھی - منکوحہ عورتیں اپنے بالوں میں زیور پہنتی تھیں -
سنکرانت کے تہوار پر عورتیں ایک دوسرے سے گھڑے لیتی تھیں - شہد
روپے کا ایک سیر اور موم پیسے سیر بکتا تھا - دستی پارچہ بافی کا رواج
تھا کیونکہ دھاگے کے تانے بانے وغیرہ سے متعلق بہت سے مخصوص الفاظ اور
آلات کے نام پائے جاتے ہیں - تجارتی جہازوں کا بار بار ذکر آتا ہے -
یہ بات ثابت کرتی ہے کہ جہازوں کے ذریعے غیر ملکی تجارت بہت کافی
جاری تھی - ملک میں عام طور پر خوش حالی تھی شاعر کہتا ہے کہ جس
طرح تاجر تھیلوں میں مال بھر کر تجارتی سفر پر جاتا ہے ویسے میں نے اپنا
تجربے کا مال تاریخ و سوانح اور روایات و قصوں کے تھیلوں میں بھر کر
تجارت کی اور مجھے اس سے چوگنا منافع ہوا اور یہ سفر کامیاب رہا -
چھوٹے بڑے سب کی دل بہلائی کے بہتیرے ذرایع موجود تھے مثلاً چوسر،
شطرنج اور مات تاش - جوتے پہن کر تھالی میں رسی پر سے گزرنے والے
نٹ، چھوٹے سکے نکالنے والے جادوگر، ہولی میں مرد عورتوں کے سوانگ
کبڈی پانی میں مرغوں کا کھیل وغیرہ مختلف کھیلوں اور مشغلوں کا
ذکر کرتا ہے - وہ دنیاداری کو لہسن کے چھلکے کے مانند ناکارہ بتاتا ہے -
وہ اقرار کرتا ہے کہ آدمی کی پیدائشی ذات کو نظر انداز کرنا چاہیے
اور مثال پیش کرتا ہے کہ "بگھار کے لیے ہینگ استعمال کرتے ہیں لیکن
وہ گندے چمڑے سے نکلتی ہے" - اپنے مسلمان ہونے کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ
میں کوڑے گدو کے مانند ہوں" - چکی اور مکھن کی مثالوں سے وہ

روح اور ایشور کے اتحاد کو واضح کرتا ہے - چکی میں کھونٹے کے پاس کے دانے نہیں پستے - مکھن میں جب تک پانی ہوتا ہے جلتے وقت اس میں سے آواز نکلتی ہے، پانی کے جل جانے پر وہ خاموش ہوجاتی ہے - ان سب باتوں سے شاعر کی باریک بینی اور تجسس خوب ظاہر ہوتا ہے - اس کی اور ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے محاوروں میں ضرب الامثال کا استعمال نہایت موزوں اور معنی خیز کیا ہے اور اپنے طرز بیان کو شاندار بنایا ہے - واقعات کی تصویر بھی وہ خوب کھینچتا ہے - اس کے بعض استعارے ملاحظہ فرمائیے - "دھرم دولت کا جزیرہ (ایک مضبوط قلعہ) قوت کی سرنگ لگانا - منکر کی باروت سے کہیاں بھرنا - ہمت کا قلعہ شانتی کا برج ضمیر کی دیگ - "وہ میں ہوں" (سوہم یعنی وہ خدا اور میں ایک ہیں) کے نعروں سے نقش خیالات کی فوج کو منتشر کرنا - ان مثالوں سے اس کا تخیل اور زبان پر قابو خوب ظاہر ہوتا ہے —

اس نے صنایع بھی بہت سی استعمال کی ہیں خصوصاً صنعت تجنیس جو کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے —

اس کتاب کے متعلق اتنی مفصل بحث کرنے کا یہ سبب ہے کہ اس کی وقعت کے متعلق نقادوں کی رائیں بالکل مخالف ہیں - مسٹر پانکار کرنے ایک طویل تنقید لکھی ہے جسے مسٹر آجگانوں کرنے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے - ان دونوں صاحبوں کی یہ رائے ہے "یہ تصنیف مرہٹی زبان کی اول درجے کی کتابوں میں شمار کرنے کے قابل ہے لیکن ہنوز اس کی واجبی قدر نہیں ہوئی - درحقیقت وہ ایک درخشاں ہیرا ہے" -

اس کے برخلاف مسٹر بھاوے لکھتے ہیں کہ ایک مسلمان کی تصنیف ہونے کی وجہ سے کتاب قابل تعریف ہے اور بس - اس میں اور خوبیاں

نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ کتاب " اٹھارہ اناج کا پکوان ہے اور وہ بھی بے مزہ "۔ اوپر ہم نے شاعر کی ذاتی رائے بھی درج کردی ہے اور اس کی تصنیف کی خصوصیتیں مثالیں دے کر بتائی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد صاحب ذوق حضرات تصنیف زیر بحث کے متعلق اپنی رائے قایم کرسکیں گے۔ شاعر نے خود ہدایت کی ہے کہ "پہلے پوری کتاب پڑھو، بعد اس پر حرف لاؤ۔ اے قارئین! پوری تصنیف کی سیر کرو۔ جب مطلب سے قائل ہوگے تو مسرور ہوگے" اگر مسٹر بھاوے اس ہدایت پر عمل پیرا ہوتے تو مجھے توقع ہے کہ ان کی رائے زیادہ موافق ہوتی۔

اسی طرح صرف اچھائی دیکھنے والے اور جلد تشفی پانے والے مسٹر پانگارکر اگر زیادہ سخت تنقید کرتے تو میرا خیال ہے کہ ان کی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں اول درجے کے شعرا کا جو جھمگٹ جمع نظر آتا ہے وہ بہت کچھ چھٹ جاتا —

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شاہ ملی ایک اوسط درجے کا شاعر تھا۔ لیکن شیخ محمد سے کہیں زیادہ اونچے درجے کا تھا۔ اس کی زبان میں روانی زیادہ ہے اور اس میں فصاحت کی صفت بھی نمایاں ہے۔ شیخ محمد کے مانند اس کی زبان غیر زبانوں کے کٹھن الفاظ کی چٹانوں سے نہیں ٹکراتی۔ نیز ذوق وجدت کے اوصاف بھی اس میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ سپھورتی (Inspiration) کا بہاؤ دونوں میں پتلا ہے لیکن ثانی الذکر میں مقابلتاً زیادہ زندہ ہے۔ بعض نقص مثلاً لفاظی مضمون سے ہٹ جانا، زبان کی پاکیزگی سے لاپروائی، فحش کلامی، گلوارو محاورے، کم و بیش دونوں میں موجود ہیں۔ لیکن شاہ ملی میں ان کی اتنی بہتات نہیں جتنی کہ شیخ محمد میں پائی جاتی ہے۔ دونوں کو اپنے مسلمان ہونے کا

احساس ہے شاہ ملی کی یہ خوبی سمجھنی چاہیے کہ شیخ محمد کے مانند وہ قرآن شریف کی آیات کو ترجمے کے ساتھ قارئین کے گوش گزار کرنے پر اصرار نہیں کرتا —

شاہ ملی ایسے الفاظ کہتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے تکمیل فرض کا یقین ہوگیا تھا - "دل کے ارمان پورے ہوگئے اور تشفی ہوئی - میں نے خوش قسمتی سے گیان کی دولت پائی اور سریر آرائے سلطنت خودی ہوا - آتما کے آنند کا میں نے جھنڈا لہرایا اور میں برہم کے آنند میں مگن ہوگیا - اب میری آواگون (پنر جنم) (مکرر پیدائش) کی تکلیف مٹ گئی - میں نے نجات کی بازی جیت لی - میں نے اپنا وطن (موروثی معاش کے لیے مرہٹی اصطلاح) سنبھالا - اور بے وطن لوگوں کو دیکھ کر میں حقارت سے ہنستا ہوں - خودی کے گیان کے سبب ساری دنیا خدا سے بھری معلوم ہوتی ہے" ان الفاظ سے ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ شاہ ملی جین حیات (موکش) حاصل کرچکا تھا - اس قسم کے خود اعتمادی کے الفاظ شیخ محمد کی تصنیف میں نہیں ملتے - اس لحاظ سے بھی شاہ ملی کی شخصیت شیخ محمد سے عظیم تر معلوم ہوتی ہے —

---

(۲)

قرن سوم - سنہ ۱۸۵۰ تا ۱۹۳۵ ' دور جدید -

اس دور میں مسلمانوں میں مرہٹی کتابیں تصنیف کرنے کا شوق جن اسباب سے نظر آتا ہے وہ پچھلے دور سے بالکل مختلف ہیں - پہلے دور میں ہندو سادھو سنتوں کی تقلید' اور ہندو دھرم کی طرف رجحان تھا - دوسرے دور میں ہندو شاعروں کے مانند وہ مرہٹہ حکومت اور تہذیب

کے دلدادہ بن کر سکن بھاؤ مرہٹی عشقیہ و رزمیہ نظمیں گاتا پھرتا نظر آتا ہے - لیکن قرن سوم میں یہ دونوں اسباب نہیں پائے جاتے - انگریزی حکومت کے قیام کے بعد مرہٹہ دور ختم ہوکر دور جدید شروع ہوتا ہے - انگریزوں کا باقاعدہ طرز حکومت آمد و رفت کے نئے نئے وسائل' فنی تنظیم تعلیم اور ملک کے نئے سیاسی صوبوں وغیرہ کی مختلف تبدیلیوں سے زندگی میں ایک کایا پلٹ ہوگئی تھی - دیگر صوبوں کے مسلمانوں کے مانند مہاراشٹر کے مسلمانوں میں بھی اردو فارسی عربی وغیرہ زبانوں سے زیادہ انس پیدا ہوگیا اور ان کی تعلیم کے لیے علحدہ مدارس اور ٹریننگ سکول کھولے گئے - تاہم روز مرہ کے کارو بار کے لیے انھیں مرہٹی کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا - مہاراشٹر کی ۲ کروڑ آبادی میں سے تیس چالیس لاکھ مسلمان ہیں - ان کی بھی مادری زبان مرہٹی ہے اور اگرچہ مدارس اور کالجوں میں متذکرہ بالا زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے تاہم ایسی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اور ایسے مسلمانوں کی تعداد جنھیں مرہٹی کے بغیر دوسری کوئی زبان اچھی نہیں آتی بہت بڑی ہے - یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال میں جو مرہٹی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں ان کا مقصد یہی نظر آتا ہے کہ صرف مرہٹی جاننے والے مسلمانوں کو اسلام اور اس کی عظیم شخصیتوں سے واقف کرایا جائے - ہماری اس رائے کی تائید اس واقعے سے ہوتی ہے کہ دور جدید میں مسلمانوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں زیادہ تر مذہبی کتابیں ہیں دیگر چند عنوانات پر بھی انھوں نے کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ شاذ و نادر ہیں - ۷۵ سال کے اس عرصے میں پچیس تیس مسلمان مصنف گزرے ہیں ان کی چھوٹی موٹی سب تصنیفوں کو شامل کرنے پر بھی کتابوں کی جملہ

تعداد بمشکل چالیس پچاس ہوگی - لیکن اسی دور میں اسرائیلی مصنف ۸۰ ہوے جنھوں نے ۲۰۰ کتابیں لکھہ کر مرہٹی ادب میں معتدبہ اضافہ کرلیا ہے - اگرچہ ان کی بھی بعض کتابیں مذہبی ہیں تاہم ان کو مرہٹی زبان سے بلا شبہ زیادہ لگاؤ ہے اور اس میں دن بدن ترقی ہونے کے آثار نظر آتے ہیں - فادرستیفن کے "کھرست پوران" سے لے کر لکشمی بائی تلک کے "سمرتی چتر" تک جو عیسائی ادب پیدا ہوا اس کا اضافہ درحقیقت مرہٹی ادب میں بے نظیر ہے اس میں مطلق شک نہیں کہ اس کے مقابلے میں ہمارے مسلمان بھائیوں کی کوششیں بہت کم ہیں - مزید براں مسلمانوں کا رجحان اردو فارسی کی طرف زیادہ ہے اور مرہٹی کی طرف ان کی بڑھتی ہوئی بے توجہی نظر آتی ہے - یہ حالت حال کی نہیں بلکہ ایک عرصے سے چلی آرہی ہے - بڑودہ میں جو دسویں مرہٹی ادبی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں مسٹر سکندر لعل آتار نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں مسلمانوں کو مرہٹی کی طرف زیادہ راغب کرنے کی مختلف تدبیریں تجویز کی تھیں ان تدبیروں کو آج بھی اختیار کیا جاسکتا ہے کیونکہ مرہٹی بولنے والوں کی تعداد جتنی بڑھائی جاسکتی ہے اتنی بڑھانے کی کوشش کرنا مرہٹی زبان کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے - اس قدر تمہید کے بعد اب مسلمان ادیبوں کی تصنیفات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے - میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیان میں زمانے کے تسلسل کو نظر انداز کر کے تصنیفات کی تعداد اور اہمیت کا خیال رکھا جائے -

۱ - ڈاکٹر مولوی حکیم صوفی محمد یعقوب خاں صاحب سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں - ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخ نہیں ملی - اون کا اصلی وطن ضلع ستارہ میں تھا لیکن ان کا بچپن بمبئی میں

گزرا - انھیں علم کا بڑا شوق تھا - انھوں نے اردو فارسی عربی ہندی مرھٹی گجراتی زبانوں کی اچھی تعلیم حاصل کی ان کی متفرق تصنیفات شاید ھی ھوں لیکن ان کا بڑا کارنامہ قرآن شریف کا مکمل ترجمہ ھے یہ ترجمہ تین زبانوں یعنی مرھٹی ' گجراتی اور ہندی میں کیا گیا - اور اول الذکر دو زبانوں میں چھپ کر شایع بھی ھوگیا - ان کی ناگہانی وفات کی وجہ سے ہندی ترجمہ شایع نہ ھو سکا - مرھٹی ترجمہ سنہ ۱۹۱۹ میں شایع ھوا - جس کے لیے انھیں سرکار عالی (نظام گورنمنٹ) سے بارہ ھزار روپے کا گراں بہا عطیہ ملا - اس کے دیباچے میں انھوں نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ھے - صاحب موصوف نے آٹھ نو شادیاں کی تھیں - لیکن صرف ایک لڑکا پیدا ھوا - چونکہ وہ ابھی نابالغ ھے ان کی ملک عدالت کے زیر نگرانی ھے —

ان کی تصنیف کا پورا نام " قرآن پاک کا باتفسیر و رسیلا ترجمہ " ھے جو بمبئی میں شایع ھوئی اس کے قیمت چھ روپے ھے - اس کے دو حصے جزو اول اور جزو ثانی ھیں ' جن کے صفحوں کی مجموعی تعداد ۱۱۷۴ ھے - اس ترجمے کا مقصد مولوی صاحب یوں بیان کرتے ھیں - " اُن دکنی اور کوکنی مسلمان بھائیوں کے لیے جنھیں صرف مرھٹی زبان آتی ھے میں نے یہ فکر کی ھے " اس کام کے لیے انھیں خدا کی طرف سے الہام ھوا تھا جس کے مطابق انھوں نے سنہ ۱۹۱۲ ع کے بعد دو مرتبہ کوشش کی جو ناکام رھی - آخر تیسری کوشش میں انھیں کامیابی نصیب ھوئی - اور جس کا انھوں نے بیڑا اٹھایا تھا وہ تکمیل کو پہنچا —

وہ فرماتے ھیں " عربی زبان مختصر جملوں کی زبان ھے اس کا ترجمہ کرنا مشکل ھے مزید برآں مرھٹی میری مادری زبان نہیں لہذا

بھری کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے تاہم مرھٹی ادب میں اس شہرۂ آفاق اور بے نظیر الہامی کتاب قرآن پاک کی کمی تھی وہ میں نے پوری کی " اور بے شک مرھٹی بولنے والے اس کمی کی تکمیل کے لیے ان کے ممنون ھیں —

قرآن شریف کے نزول کا قصہ جتنا دلچسپ ھو اتنا ھی عجیب و غریب ہے - اسے یہاں اجمالی طور پر بیان کرنا مناسب معلوم ھوتا ہے - مولوی صاحب لکھتے ھیں " قرآن پاک کی آیات کے نزول کے وقت حضرت پیغمبر صاحب بہت تکلیف محسوس کرتے تھے - اور ان کا یہ وقت مشکل سے کٹتا تھا - ان کا جسم اس قدر وزن دار ھوجاتا تھا کہ وہ اونٹ پر سوار ھوتے تو اسے بھی وہ بوجھہ ناقابل برداشت ھوجاتا تھا - اگر کسی کی گود میں سر رکھہ کر آنحضرت اس وقت لیٹے ھوتے تو انہیں خوف ھوتا کہ کہیں اس شخص کا زانو ٹوٹ نہ جاے - ان کا چہرہ یکایک زرد پڑجاتا اور سارا جسم پسینا پسینا ھوجاتا اور وہ خوف زدہ بھی ھوتے - آیات کے نزول کے لیے وقت و مقام کی قید نہ تھی - ان کے پیرووں میں سے جو کوئی قریب ھوتا چمڑا ، ھڈی ، پتے یا پتھروں پر آنحضرت کا کلام تحریر کرلیتا - اس طریقے سے تئیس سال تک قرآن کا نزول جاری رھا - اس وجہ سے اس میں کلام کا دھرانا لازمی تھا لیکن اس سے ھر جگہ معنی واضح ھوتے ھیں - قرآن کے بعض جملوں میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ اختلاف اصولی نہیں محض ظاھری ہے - قرآن پاک میں بہت سے تاریخی واقعات بھی بیان کیے گئے ھیں - مولوی صاحب ھدایت فرماتے ھیں کہ ان کا غور سے مطالعہ کیا جانا چاھیے - قرآن کا جدید سائنس سے بھی کوئی اختلاف نہیں - اس کے الہامی ھونے کی یہ دلیل

ہے کہ اصول دائمی اور تعمیل کے لیے آسان ہیں وہ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ جب اسلام کے معنی خدا کے حکم کی تعمیل ہے تو کیا اس علم سے سب لوگ مسلمان نہیں کہلائے جاسکتے ؟ شیخ محمد کے اس قسم کے عقیدے کا ذکر اوپر آچکا ہے —

قرآن شریف جیسی بڑی کتاب اور طویل کتاب کا خلاصہ اس چھوٹے سے مضمون میں دینا ناممکن ہے اس کتاب کے متعلق جسے پڑھنا چاہیے کچھ تھوڑی سی معلومات درج ذیل ہیں - قرآن کے تیس پارے اور ۱۱۴ سورے ہیں جن میں کل ۶۳۴۷ آیات ہیں قرآن کے معنی کے متعلق اختلاف ہوکر چار شاخیں اور دو فرقے مسلمانوں میں پیدا ہوگئے ہیں' سنی اور شیعہ - خدا نے مختلف پیغمبروں کے ذریعے بنی نوع کو اچھی تعلیم دی ہے - حضرت محمد صاحب ساری دنیا کی خاطر پیدا ہوئے' انہوں نے اپنی عمدہ کردار سے دنیا کے سامنے اچھی مثال پیش فرمائی- قرآن شریف ساری دنیا کا مذہب ہے وہ پوری دنیا کے لیے ہے- اس کا حکم ہے کہ اسلام سے قبل جو پیغمبر اور انبیا پیدا ہوئے ان کا احترام مسلمانوں پر لازم ہے- قرآن میں جملہ مذاہب کا خلاصہ ہے - اس میں مطلق تعصب نہیں اس پر کسی ایک شخص یا قوم کا حق نہیں بلکہ جو چاہتا ہے اسے اختیار کرسکتا ہے- اس کے تسلیم کرتے ہی ہر شخص کو مسلمانوں کے ساتھ مساوات کے حقوق مل جاتے ہیں- اس میں اچھوتوں کی نجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - مے نوشی' ذات پات کی تفریق' بت پرستی وغیرہ رواجوں کی اس میں مذمت کی گئی ہے - دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا ہر مسلمان پر فرض ہے- اس کے خاص عقائد مختصراً حسب ذیل بتائے جاسکتے ہیں-

(۱) خدا کی وحدت - (۲) آواگون کا نہ ہونا - (۳) برائی اور اچھائی کا ثمرہ خدا ہر ایک کو دیتا ہے - مردہ روحیں ویسی ہی پڑی رہتی ہیں - قیامت کے دن وہ سب اٹھیں گی اور اپنے کردار کے لحاظ سے خدا انہیں جنت یا جہنم میں بھیج دے گا - (۴) زکواۃ - (۵) اخوت —

عموماً قرآن کی تعلیم دنیا داری کے موافق ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ترک دنیا کی تعلیم ہی نہیں - البتہ وہ راہ صرف ریاضت کرنے والوں کے لیے بتائی گئی ہے - انہیں دنیا کے کام کرنے پڑتے ہیں لیکن وہ کام بغیر کسی خواہش یا منشا کے ہوتے ہیں - قرآن پاک کی تعلیم یہ بھی ہے کہ کام کسی قسم کا ہو اور کوئی شخص کرے اس کا ثواب خدا کو بخش دینا چاہیے —

مولوی صاحب کی مادری زبان مرہٹی نہ ہونے کے باوجود قرآن شریف جیسی مشکل کتاب کا مکمل مرہٹی ترجمہ شایع کرکے مرہٹی بولنے والوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع انہوں نے دیا اس کے لیے وہ مستحق ستائش ہیں - لیکن اگر بوقت ترجمہ وہ کسی مرہٹی ادیب سے امداد لیتے تو ترجمہ زیادہ عام فہم اور صحیح ہوکر شیر و شکر کے مانند ہوجاتا - پہلا ایڈیشن نکل کر ۲۰ سال ہوچکے ہیں اگر دوسرے ایڈیشن کا پھر موقع آیا تو اس کی اشاعت کرنے والوں سے میں التماس کرتا ہوں کہ اس بیش بہا کتاب کو خامیوں سے پاک کیا جائے -

(۲) اس کے بعد تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے مہر منشی محمد بھالدار صاحب کا نام ہمارے سامنے آتا ہے - منشی صاحب سنہ ۱۸۸۷ میں بمقام کولہا پور پیدا ہوے - وہیں راجا رام ہائی اسکول میں میٹرک تک ان کی تعلیم ہوئی - افلاس کی وجہ سے انہیں تعلیم ترک کرنی پڑی - تاہم انہوں

نے خانگی طور پر مرھٹی اور اردو کی تعلیم جاری رکھی - بعد ازاں انھوں نے ایک ھفتہ واری اخبار "خبردار" اور ایک ماھواری رسالہ "اسلام پرکاش" بزبان مرھٹی جاری کیا - لیکن اھل ملک کی سرپرستی نہ ھونے سے یہ دونوں بند ھوگئے اور انھیں سرکاری ملازمت اختیار کرنی پڑی - چند سال تک مصر فلسطین اور شام میں ملازمت کرکے وہ کولھاپور واپس آئے اور وھاں وکالت شروع کردی -

لیکن اس پیشے میں وہ کامیاب ثابت نہ ھوئے - آج کل وہ پونا میں مقیم ھیں اور فوج میں معلمی کرتے ھیں - منشی صاحب رسالوں میں لکھتے رھتے ھیں - ان کی تصنیفات بھی کثیر اور مختلف ھیں -

ان کے ناتک حسب ذیل ھیں -

۱ - سنہ ۱۹۲۱ - "شراب کا ایک گھونٹ" ناتک مذکور انھوں نے مسٹر گڈکری مرحوم کا مشہور ڈراما "صرف ایک پیالہ" کے خیالات کی بنیاد پر لکھا جس میں ھندوؤں کی تہذیب' پوران اور ھندو دھرم کے عقائد سے ان کی اعلیٰ واقفیت ظاھر ھوتی ھے - اس ڈرامے میں انھوں نے عمدگی کے ساتھ ثابت کیا ھے کہ ھندو عقائد اور قرآن دونوں میں شراب نوشی کی مذمت آئی ھے اور دونوں قوموں کو چاھیے کہ اس بری لت سے باز رھیں - اس ڈرامے کی تشکیل اس قدر اچھی اور متناسب ھے کہ قارئین پر اس کا اثر ھوئے بغیر نہیں رہ سکتا - ایک مسلمان کا ھندو تہذیب میں اس قدر منہمک ھوکر ایسا عمدہ ناتک لکھنا قابل تحسین ھے - زبان نہایت شستہ اور پاکیزہ ھے اور بغیر بتائے معلوم نہیں ھوسکتا کہ اس کا مصنف ایک غیر ھندو شخص ھے —

۲ - "چائے نوشی" جس میں چائے نوشی کے مضر اثرات اچھے پیرایے

میں بیان کیے گئے ہیں —

۳ - " شانت شیلا " یہ ناٹک تعلیم نسواں پر لکھا گیا ہے -

۴ - " گلکودھار " یعنی طوائف سدھار - مضمون واضح ہے یہ ناٹک گوپال کمپنی سٹیج کیا کرتی تھی -

۵ - " اندھ شردھا " یعنی اندھا اعتقاد - مضمون ظاہر ہے -

۶ - سورگ آبھاس یعنی جنت کا تخیل -

یہ ناٹک علحدہ شایع نہیں ہوئے بلکہ " دین بند ھو " " ستیہ پرکاش " وغیرہ کے خریداروں میں شایع کیے گئے - ایک اور ناٹک " ترنو پائے " یعنی راہ نجات ایک کمپنی کیا کرتی تھی لیکن اس میں سودیشی کی طرفداری کی گئی تھی اس وجہ سے اسے ضبط کر لیا گیا -

۷ - " ہمارے نبی " یہ چھوٹی سی کتاب انہوں نے خود علحدہ شایع کی ہے - مہاراشٹر کے مسلمانوں کو " رامجی " " کرشن جی " اور "مہا بھارت" کے حالات سے جتنی واقفیت رہتی ہے اتنی اسلام کی روایات سے نہیں رہتی اس نقص کو دور کرنے کے لیے ایک " سلسلہ کتب اسلامیہ " انہوں نے جاری کیا جس کی یہ پہلی کتاب ہے - مسٹر آپٹے کی کتابیں " بال رامائن ' ' بال بھارت " وغیرہ کے مانند یہ چھوٹی کتاب ہے اس کے صرف ۲۵ صفحے ہیں - پیغمبر اسلام کی سیرت پاک کی خاص خاص باتیں اس میں آگئی ہیں - زبان عام فہم اور سیدھی سادی ہے - یہ بہت مقبول عام ہوئی اس کا پہلا ایڈیشن ایک ماہ کے اندر ختم ہوگیا - حال میں دوسرا ایڈیشن شایع ہوا ہے - در حقیقت سید نواب علی صاحب رضوی ایم اے - سابق پروفیسر بڑودہ کالج اور پرنسپل جوناگڑہ کالج کی کتاب کا یہ ترجمہ ہے لیکن ایسا اچھا ترجمہ ہے کہ ہم محسوس بھی نہیں کرتے کہ یہ ترجمہ ہے -

مسٹر بھالدار کی تصنیفات محتاج اشاعت ہیں (۱) شیکسپیر کا مشہور ڈراما Merchant of Vemice کا ترجمہ - (۲) کرشن کماری - (۳) کھیر کمال - (۴) خوش انجام وغیرہ یہ سب ناٹک یعنی ڈراما ہیں - ان کے ناٹک کی مسٹر کیلکر (مشہور مرہٹی ادیب و مدیر کیسری) مسٹر کولھٹکر (ادیب اور مدیر) اترے صاحب (ڈراما نویس) جوشی صاحب وغیرہ نے بڑی تعریف کی ہے لہذا یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمان ادیبوں میں مسٹر بھالدار کو اعلیٰ ترین سمجھنا چاہیے - ان کی مرہٹی زبان سے محبت اور مسلسل کوشش قابل تعریف ہے '

۳ - ان کے بعد سکندر لعل آتار کا نام ہمارے سامنے آتا ہے - ان کے چچا باپو صاحب آتار بھلوڑی ضلع ستارہ میں دوکاندار ہیں - ان کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہوسکیں - مہاراشٹر ادب کی جنتری میں ان کے نام پر صرف دو کتابیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) امریکہ کی صنعتی ترقی کی تاریخ اور - (۲) جدید سائنس - لیکن انھوں نے بہت سے مضامین شایع کیے ہیں - دسویں کانفرنس میں ان کے لکھے ہوے مضمون کا ذکر اوپر آچکا ہے - صاحب موصوف مشہور محقق تاریخ ہیں اور " بھارت اتہاس سنشودھک منڈل " انجمن تحقیق تاریخ ہند کے سالنامے میں لکھنے والوں میں ہیں ان کے جملہ مضامین ایک جگہ کہیں شایع نہیں ہوے - انجمن مذکور کے ۳۸ سـکے کے سالنامے میں ان کے چار مضامین موسومہ (۱) بالاجی باجی راؤ کا ایک برہمن کے قتل کے متعلق ایک خط - (۲) ۱۱۲۸ سـکے کا ایک مرہٹی تختہ (تانبے کا کندہ) - (۳) قدیم مرہٹی گیت - (۴) ہوماز پلنت ۱۸۴۱ سـکے کے سالنامے میں ایک مضمون " میری تحقیق کی کیفیت " جملہ پانچ مضامین میری نظر سے گزرے ہیں - ان

مضامین سے ان کی زبان مرھٹی کی خدمت در حقیقت اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے —

(۱) بالاجی باجی راؤ کا خط انھیں قصبہ وائی کی باشندہ مسز گودوبائی سے حاصل ہوا - یہ خط وائی کے صوبہ دار ھیبت راؤ کے نام لکھا گیا ہے - " اس فساد میں برھمن کے قتل میں کیشو کا کچھہ حصہ ضرور پایا جاتا ہے - اس کی تحقیق کی گئی اور اسے سزائے پرائشچِت (ایک رسم) تجویز کی گئی " —

(ب) ۱۱۲۹ سکے کی تانبے کی تختی قلعۂ پرنالہ کے خاندان شلاھار کے بھوج راجا کی جاری کردہ ہے - اس کی زبان مرھٹی کی پہلی بڑی تصنیف دنا نیشوری سے ۱۰۰ سال قبل کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندان شلاھار کی زبان مرھٹی تھی اور وہ اس زمانے میں رائج تھی - اس لحاظ سے اس کی اھمیت بہت ہے —

(ج) قدیم مرھٹی گیت - یہ چرواھوں کے گانے ھیں جو زبان زد چلے آتے ھیں - یہ گیت میٹھے اور طویل ھیں - ایسے دس گانے یہاں شایع کیے گئے ھیں —

(د) ھیما ز پنت کا طریقہ جمع و خرچ یہ ایک قدیم پوتھی میں دستیاب ہوا - یہ نہایت اھم ہے اس میں اس زمانے کی سیاسی سماجی اور کاروباری حالت کے پرتو ظاھر ہوتے ھیں - اس میں بہت سے عربی و فارسی لفظ بھی ھیں جن کے مرھٹی ھم معنی الفاظ بھی درج ھیں - اس کی اھمیت تاریخ زبان کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے یہ کافی طویل ہے اور اس میں ۴۸ مصرعے ھیں —

(ہ) میری تحقیق - جس میں صاحب موصوف لکھتے ھیں " اس سال

کی تحقیق موضع والویں میں ہوئی - مصری کی ڈالی جتنی چوسی جائے اتنی زیادہ شیریں ہوتی ہے - اسی طرح تاریخی گاؤں میں جتنی گہری تحقیق کی جائے اتنے ہی زیادہ اہم کاغذات سکے وغیرہ ملتے رہیں گے" - اس گاؤں سے انہوں نے سکے ہتھیار تصویریں اور تانبے کی تختیاں حاصل کیں اور پونا کی انجمن تحقیق تاریخ ہند میں پیش کیں —

اس مضمون کے ختم پر انہوں نے تاریخی تحقیق کی اشاعت کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ اس قدر دلگداز ہیں کہ ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ میاں آثار مذہب کے مسلمان ہیں لیکن ان کا دل سچے مرہٹے کا ہے - وہ فرماتے ہیں" ہمارے اس کام کا پھیلاؤ مہاراشٹر کے ہر قصبے اور ہر دیہات میں ہونا چاہیے - اس مقصد سے مصنف نے حتی الامکان اپنے ضلع میں عوام کو جگانے کی سعی کی ہے نیز پنجاب یوپی بنگال وغیرہ صوبوں کی مختلف انجمنوں کو اس طرف کی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور ان کے تہنیت و مبارک بادی کے پیغام بھی انجمن میں پیش کیے ہیں" - اس قسم کی مسلسل سعی کرنے والا بے غرض علم کا پروانہ اور مرہٹی زبان کا سچا خادم بدقسمتی سے جنون میں مبتلا ہوکر یرودہ کے جیل میں مقید ہے - یہ سن کر کون محب مرہٹی ہے جو آنسو نہ بہائے گا؟ یہ کہہ کر کہ "مقدر کے کام عجیب ہیں" خاموش بیٹھنے کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

مذکورہ بالا بیان سے یہ صاف واضح ہوجائے گا کہ نہ صرف ایک مسلمان ادیب کی حیثیت سے بلکہ عام طور پر مرہٹی ادیبوں میں سکندر لعل صاحب کا درجہ بہت اعلیٰ ہے —

۴ - مولانا غلام یسین خاں وظیفہ یاب داروغہ آبکاری ضلع اکولہ برار نے " بڑے پیغمبر یا پاک اوتار " کے نام سے ایک دلکش اور عجیب و غریب واقعات سے لبریز ۱۰۰ صفحوں کی کتاب شائع کی ہے - کتاب کی ابتداهی میں آٹھ اشکال درج ہیں جن میں آٹھ آیات اس خوبی سے لکھی گئی ہیں کہ بائیں طرف سے پڑھنے سے مودی رسم الخط میں تحریر کیا ہوا سنسکرت مصرع بن جاتا ہے اور دائیں طرف سے پڑھنے سے عربی آیت نظر آتی ہے —

پہلی شکل میں " ॐ नमः परमाकनेहरिः ॐ " یہ سنکرت جملہ ہے اس کو دوسری طرف سے پڑھنے سے " محمد الله لا اله الا الله محمد " کا جملہ بن جاتا ہے - دوسری شکل میں اس طرح ملک " عرب " بنایا گیا ہے - تیسری شکل میں رشی کیشب اور پیغمبر صاحب کے اسمائے گرامی ظاہر کیے گئے ہیں - چوتھی شکل میں " وشنو یشا " یعنی نعم وشنو اور " رسول الله " کے الفاظ ہیں - شکل نمبر ۵ میں " وشنو کیرتی " یعنی شہرت وشنو اور حضرت عائشہ ہیں - شکل ۶ میں ॐ " اوم " اور " محمد " ہیں - ساتویں شکل میں وشنوداس یعنی وشنو کا خادم اور عبدالله ہیں - آٹھویں میں مکرر " عرب " کا خاکہ ہے کتاب کے چھ باب ہیں - پہلے باب میں بڑی کوشش سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ هندو پورانوں میں " ایشور " کے آخری اوتار " کلکی " کے مطابق جو واقعات درج ہیں وہ حضرت محمد صاحب کی سیرت کے مطابق ہیں - کلکی پوران میں جزیرہ سنبھل کا ذکر ہے وہ ملک عرب ہے - کلکی کی والدہ کا نام سومتی تھا جس کے معنی " باعصمت " ہیں حضرت محمد صاحب کی والدہ کا نام حضرت آمنہ تھا جس کے معنی بھی وہی ہیں - نیز ان کے والد کا

نام عبداللہ یعنی خدا کا خادم تھا جو کلکی کے والد کے نام سے ملتا جلتا ہے کلکی پوران میں غار میں بیٹھہ کر عبادت کرنے کا بیان ہے جو پیغمبر صاحب کے مکے کے قریب غار " حرا " میں بیٹھنے کے واقعے کے مماثل ہے —

نیز کلکی کی بیوی حضرتہ عایشہ صدیقہ ہیں اور ان کے چار بھائی یعنی پہلے چار خلفاء ہیں خلاصہ یہ کہ وشنو نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ کہ کلکی کی پیروی کرو اور کلکی کی سیرت پیغمبر اسلام کی سیرت کے مماثل ہے لہذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ حضرت محمد صاحب کی پیروی کرکے نجات حاصل کریں - دوسرے باب میں وید مقدس اور اوپنشد و پوران وغیرہ کے اقتباسات سے اوپر کی دلیل کی تائید کی گئی ہے —

دیگر بابوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ اُپنشد جدید اور بناوٹی ہے اور وہ اکبر کے زمانے میں کسی پنڈت کے ذریعے سے مرتب کرایا گیا یہ بیان بالکل غلط اور بے بنیاد ہے داراشکوہ نے ۶۴ اوپنشدوں میں سے ۵۰ اوپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا- اللہ اوپنشد اور اللہ سوکت فیضی کے بنائے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اس نے کوئی سنسکرت کتابیں نہیں لکھیں - صرف سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا - نیز پروفیسر میکس مولر صاحب نے اپنی تصنیف " قدیم ہندو ادب " میں دیگر اوپنشدوں کے ساتھہ اللہ اُوپنشد کا بھی ذکر کیا ہے - اگر بناوٹی اور جدید ہوتا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے - ان دلیلوں سے مندرجہ بالا حجت غلط ثابت ہوتی ہے - یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پوران کے دیگر واقعات بھی آنحضرت کی سیرت سے ملتے جلتے ہیں - آخر میں مشرقی اور

مغربی علما کی محمد صاحب کی سیرت پاک کے متعلق رائیں درج کی گئی ہیں —

مصنف کہتا ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے بہت سی کتابوں کے حوالے سے لکھی گئی ہے - یہ کتاب ہندو مسلمانوں میں نزاع پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ دونوں کے تعلقات کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی ہے - اس کا مقصد ان دونوں قوموں میں اتحاد و شفقت اور ہمدردی پیدا کرنا ہے - مصنف اس بات کی امید ظاہر کرتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے اسلام کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے وہ رفع ہوجائے گی - زبان کی پاکیزگی کو ایک حد تک نظر انداز کیا گیا ہے لیکن مصنف کی مادری زبان مرہٹی نہ ہونے سے قارئین اس نقص کو بھول جائیں گے - کتاب ہذا میں جو اصول و واقعات درج ہیں ان میں سے کتنے فرضی ہیں اور کتنے صحیح اس کا تعین عربی اور سنسکرت داں حضرات پر چھوڑ دینا مناسب ہے —

(۵) مسٹر سید احمد امین - یہ صاحب ریاست سانگلی کے باشندہ ہیں ان کی تعلیم ولنگڈن کالج میں ہوئی - فی الوقت وہ ایڈوکیٹ کے امتحان کی تیاری کررہے ہیں - لاہور کے مشہور عالم مولانا محمد علی صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ حضرت محمد صاحب کی سوانح ہندوستان کی ساری زبانوں میں شایع کیے جائیں ' اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے مسٹر سید احمد امین نے " حضرت محمد پیغمبر " نامی کتاب لکھہ کر شایع کی - اس کا جدید ایڈیشن بعد اصلاح و اضافہ حال میں شایع ہوا ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہے - کتاب کی چھپائی کاغذ جلد وغیرہ ظاہرہ شکل اس قدر دلاویز ہے کہ دیکھتے ہی لینے کی

خواهش پیدا هوتی هے اور باطن میں داخل هونے پر اس کے بیان کا اعتدال اور دلکش پیرایہ اس خیال کو دل میں پیدا کرتے هیں کہ کتاب مذکور کو " سلسلۂ نوبهارت " میں (ایک جدید عالمانہ کتب کا سلسلہ) شامل کیا جانا چاهیے تها - اور جب هم یہ دیکھتے هیں کہ یہ هر اعتبار سے عمدہ کتاب ایک مسلمان بهائی کی تصنیف هے تو مصنف کے متعلق همارا احترام دگنا هوجاتا هے —

حضرت محمد صاحب کی مرهٹی زبان میں کل سات آٹھ سوانح عمریاں ، شایع هوئی هیں جن میں سے دو هندؤں کی لکھی هوئی هیں ایک مسٹر کالے کی اور دوسری مسٹر پردهان ساکن بمبئی کی - دوسری کتاب جامع اور اچھی هے - دیگر جو مسلمانوں کی لکھی هوئی هیں وہ مختصر هیں اور صرف بچوں کے لیے موزوں هیں - مسٹر امین کی کتاب بہت سی عربی فارسی اردو اور انگریزی کتابوں کے حوالے سے بڑی کوشش سے لکھی گئی هے - میرج اور سانگلی کے راجا صاحب اور مختلف مقامات کے مسلمان تاجر ، لیڈر اور عہدہ داروں نے اس کی اشاعت میں امداد فرمائی هے جو اس کتاب کی قابلیت کا بین ثبوت هے —

اس میں مضمون کی ترتیب بڑی متناسب اور شاندار هے ، غیر ضروری لفاظی ، مضمون سے هٹ جانا ، تعریف میں مبالغہ اور مذاهب پر بری نیت سے حملہ کرنا ان تمام نقائص سے کتاب کوسوں دور هے یہی وجہ هے کہ یہ کتاب ممتاز هے اور اس کی معصومیت همارے دل میں جگہ پیدا کرلیتی هے —

اس کتاب کے چھ حصے هیں اور ۱۵۵ صفحے هیں - پہلے باب میں جس کا عنوان " طلوع سے قبل کی تاریکی " هے اس زمانے کے عرب میں

جو مذهبی سماجی اور سیاسی پستی طاری تھی اس کا هو بہو خاکه کھینچا هے اور آگے چل کر حضرت محمد صاحب کی سیرت اور سوانح پر جو الزامات وارد کئے گئے هیں ان کی تردید کی گئی هے نیز ان کی تعلیم - اور زندگی کی اهمیت کو ظاهر کیا گیا هے - اور آخر میں غیر مذهبی لوگوں کی رائیں سلسله وار درج هیں - میری رائے میں تعلیم اور شخصی اهمیت کے باب خصوصاً قابل مطالعه هیں - اول الذکر میں پیغمبر اسلام نے بانی مذهب مصلح اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے جو کام کیے هیں ان کو نہایت اچھے پیرایے میں بیان کیا گیا هے - باب آخرالذکر میں پیغمبر صاحب کی سیرت کی خصوصیات کا ذکر هے جنهیں پڑھکر ان کی الوالعزمی ، اعلیٰ اخلاق اور غیر معمولی شخصیت کا دل پر بہت اثر هوتا هے - چونکه مسلمان ادیبوں کی مادری زبان مرهٹی نہیں هوتی وه عموماً ناقص پائی جاتی هے لیکن مسٹر امین کو پاکیزه اور شسته زبان لکھنے کا ملکه حاصل هے - ان کی زبان عام فہم سیدھی سادی شیریں هے - کتاب هذا کی مختلف رسالوں نے تعریف و تحسین کی هے - اسے لکھه کر مسٹر امین نے مرهٹی ادب میں بیش بہا اضافه کیا هے وه "اسلام" اور "کمال پاشا" نامی دونئی کتابیں لکھنے کا اراده رکھتے هیں - میں ان سے التماس کرتا هوں که جس قدر جلد وه یه کتابیں شایع کریں گے اسی قدر وه مرهٹی بولنے والوں پر احسان فرمائیں گے —

جن مسلمان ادیبوں اور ان کی تصنیفات کے متعلق مزید معلومات حاصل نه هوسکیں ان کی فہرست درج ذیل هے —

۱ - سلیمان معین الدین صدر مدرس مدرسه تاسگانوں حضرت پیغمبر کی سوانح قیمت ۴ آنے —

۲ - مرزا نیاز بیگ بی اے جی انسپکٹر اردو مدارس بمبئی مسز اینی
بزنٹ کے لکچر "اسلام" کا ترجمہ حضرت پیغمبر صاحب کی سوانح نامکمل
۳ - شیخ سلطان معین الدین پلیگ ' قحط وغیرہ پر موقتی نظم (پوواڑے)
۴ - راو صاحب دادے باپو گدے صاحب معاملہ دار مہرج قانون مالگذاری
کا ترجمہ سنہ ۱۹۰۱ ع
۵ - نور نبی فقیر محمد ساکن ریاست جمکھنڈی مدیر رسالہ "ملونور"
امیر حمزہ کی سوانح -
۶ - یوسف خان پٹھان ناٹک "نالایق کون" مملوع -
۷ - غلام داؤد صاحب رتناگیری مدیر "ینگ مسلم" -
۸ - قاضی سید بابا میاں صاحب رسالوں میں لکھتے ہیں -
۹ - ابن حسن خطیب مدیر "مسلمان" کرہاڑ -
۱۰ - علی جی راج بھائی اسلامی نماز -
۱۱ - شیخ معین الدین مفلس ہے امیر یعنی مہتا شیسہ -
۱۲ - قاسم خان صاحب رتناگیری "دلاور" (ہندو مسلم اتحاد پر ایک ناول) -
۱۳ - خان صاحب عبدالکریم خان بڑودہ موسیقی کی کتابوں نوٹس وغیرہ -
۱۴ - احمد ابا صاحب میرج کر ساکن کولہاپور مدیر "کلادرش" سنہ ۱۹۰۴ ع -
۱۵ - عبدالعزیز صاحب نظمیں گانے وغیرہ -
۱۶ - نصیرالدین صاحب قصے وغیرہ افسانہ -
۱۷ - عمر شیخ صاحب مسز فیر بھلک کی سوانح انجیل کا جغرافیہ -
۱۸ - ملشی شیخ حسین صاحب مئے نوشی کے برے نتائج -
۱۹ - عثمان صاحب فن بازی گری -
۲۰ - لعل محمد خان کھمبا؛ سونا بنانے کا طریقہ -

۲۱ - شیخ داؤد　　ایک مسافر کا قصہ -

۲۲ - صراف شیخ محمد صاحب　فن صرافی -

الغرض ان تینوں قرون کے مسلمانوں کی تصنیفات پر نظر ڈالنے پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی اچھے مصنف ضرور پیدا ہوسکتے ہیں - مسٹر امین اور مسٹر بھالدار جیسے مصنف شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن تیس چالیس لاکھ مسلمانوں میں سے صرف ایک دو مصنفوں کا پیدا ہونا قابل فخر نہیں —

عیسائی اور اسرائیلی بھائیوں کے مانند مسلمانوں کو چاہیے کہ مرہٹی زبان کی طرف وہ اپنایت کے خیال سے دیکھیں - ان سے باادب التماس ہے کہ وہ ادبی خدمات میں عیسائی اور اسرائیلی بھائیوں کی تقلید کریں —

فارسی غزل

از

جناب فضل احمد کریم صاحب ' فضلی بی لیٹ (آکسفورڈ)

آئی - سی ایس (بنگال)

(یہ مقالہ ادبی اور تحقیقی ہے - فاضل مقالہ نویس نے غزل کے ہر پہلو پر نظر تحقیق ڈالی ہے اور بڑی کاوش اور جستجو اور شوق سے اسے مرتب کیا ہے - ہماری زبان میں کیا کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی وسیع اور محققانہ بحث نہیں پائی جاتی - یہ مقالہ باقساط اس رسالے میں شایع ہوگا - اڈیٹر -)

خوش قسمتی سے میں نے جس فضا میں آنکھیں کھولیں اس سے ہندو مسلم ادب کی شراب دوآتشہ ٹپکتی تھی - بچوں پر موسم کا خاص اثر ہوتا ہے اس لیے اس شراب تند کا رگ وریشہ میں سرائت کر جانا لازمی تھا - الغرض مجھے فارسی اور اردو ادب سے ایک شغف سا ہوگیا عموماً غزلیں ہی سننے میں آتی تھیں مشاعروں کا بازار خاص طور سے گرم تھا - وہاں بھی غزلیں ہی غزلیں تھیں - لہذا مجھے غزل سے سب سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی - جیسے جیسے معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے یہ بات ظاہر ہوتی گئی کہ غزل فارسی اور اردو ادب کی بہترین اور بدترین چیزوں کی سرمایہ دار ہے * - ہر دو ادب کا کم سے کم

* بعد میں یہی علم ترکی ادب کے متعلق ہوا —

تین چوتھائی سرمایہ نظم میں ہے اور نظم کا کم سے کم تین چوتھائی غزل میں ان دونوں زبانوں میں ہر موزوں اور غیر موزوں طبع جسے شاعری کا دعویٰ ہے عموماً غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے اور اکثر اسی کا ہو کے رہ جاتا ہے - غریب کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ غزل کے علاوہ کوئی اور صنف سخن بھی ہے یا نہیں- اگر ایک طرف یہ حال ہے تو دوسری طرف بڑے سے بڑا شاعر بھی عموماً غزل ہی کو اپنے لطیف خیالات اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے اور اس زمانے میں بھی شاعری کا بہترین سرمایہ عموماً غزل ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے -اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ صنف سخن قومی اخلاق خیالات اور ادب کا بہترین آئینہ ہے- جب یہ امر پیش نظر رکھا جائے کہ ہندوستان افغانستان ترکستان ایران اور ممالک آل عثمان صدیوں تک اس کے زیر نگیں رہ چکے ہیں اور اب بھی ہیں تو اس صنف سخن کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے —

جب مغربی ادب کے مطالعے نے میری معلومات میں اور اضافہ کیا تو یہ معلوم کرکے بڑا تعجب ہوا کہ جو چیز ایشیا کے اتنے بڑے حصے میں قریب قریب شاعری کے مترادف سمجھی جاتی ہے وہ در حقیقت دنیائے ادب میں ایک نرالی چیز ہے اور ایرانی جدت ہے- اس علم نے میرے دل میں اس بات کے جاننے کا اور شوق پیدا کیا کہ اس نرالی صنف سخن کی تخلیق کیونکر ہوئی' اس کے ارتقا کی کیا تاریخ ہے' اس کی خصوصیات کیا ہیں اور اس کے ہر دل عزیزی کے کیا اسباب ہیں - یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میں یونیورسٹی میں

تھا - مجھے یقین تھا کہ اس موضوع پر اس کی اہمیت کے لحاظ سے کتابوں کا انبار ہوگا خصوصاً مغربی زبانوں میں - اپنی زبان کے حصۂ نثر کی کم مایگی کا مجھے کافی تکلیف دہ علم تھا - اس لیے اس سے کچھ زیادہ توقع نہ تھی - مجھے سخت حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ واقعہ بالکل برعکس ہے یعنی اس موضوع پر بہترین معلومات ہماری ہی نادار زبان میں ہیں —

براؤن کی لٹرری ہسٹری میں غزل کا ذکر ضرور ہے مگر اتنا مختصر اور سطحی کہ نہ ہونے کے برابر - گب (Gibb) کی آل عثمان کی شاعری (Poetry of the Ottomons) میں البتہ قابل قدر مواد ملا - دوسری انگریزی کتابیں بھی جن کے نام یہاں بخیال طوالت نہیں لکھے جاتے کچھ یوں ہی سی نکلیں فارسی یا کسی اور زبان میں بھی اس قسم کی کسی کتاب کا پتا نہ چلا - جہاں تک غزل کی خصوصیات کا تعلق تھا مولانا حالی کی "حیات سعدی" اور "مقدمۂ شعر و شاعری" میں خصوصاً اور اردو کی دوسری کتابوں میں عموماً کافی مواد ملا - مگر اس کی تاریخ جو اصل چیز ہے سوائے مولانا شبلی کی شعرالعجم کے کہیں اور قابل ذکر طور پر نہ ملی - لیکن وہ بھی کچھ تسلی بخش ثابت نہ ہوئی - اول تو مولانا کا موضوع محض غزل نہ تھا فارسی شاعری کے متعلق لکھہ رہے تھے اسی سلسلے میں غزل پر بھی کچھہ تحریر فرمایا - پھر اسی زمانے میں مجھے چند مثالیں ایسی ملی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولانا کبھی کبھی واقعات کی صحت کا خیال نہیں کرتے بلکہ ان کی موج روانی طبیعت اور قلم کا زور جس وقت جو لکھاتا ہے بے تکلف

لکھہ دیکے ھیں * - اس لیے یہ شبہہ قدرتی طور سے پیدا ہوا کہ مولانا نے جو کچھہ غزل کی تاریخ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہیں وہ بھی ان کی شوخئی تحریر کا نقش نہ ہو مگر اس وقت کوئی ذریعہ اس شبہے کے دور کرنے کا نہ تھا - لہذا یہ شبہہ شبہے ہی کی حدود میں رہ گیا -

جب کچھہ عرصے کے بعد ولایت جانا ہوا اور وہاں کے اہرام علم یعنی کتب خانوں کے دیکھنے کا موقع ملا تو پرانے شوق کی دبی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھی اور ان بے بہا نسخوں سے جنھیں دیکھہ کے بقول اقبال دل سیپارہ ہوجاتا ہے بے اختیار فیض اٹھانے کو جی چاہا - ظاہر تھا کہ وطن میں یہ نایاب نسخے کہاں - چنانچہ باڈلین برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کی عرصے تک خاک چھاننی پڑی (اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ اصلی معنوں میں کیونکہ قدیم نسخے عموماً خاک سے اٹے ہوتے ہیں) - اس طرح فرصت ہستی کے بہت سے بے بہا لمحے جو "دادفصل بہار" کے لیے وقف ہوتے نذر کتب ہوگئے - جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور مواد اکٹھا ہوتا گیا ویسے ویسے یہ بات بھی ظاہر ہوتی گئی کہ

* مولانا کے پرستار برہم نہ ہوں ' میرے دل میں مولانا کی بڑی قدر و منزلت ہے اور میں انھیں اردو کے بہترین اہل قلم اور عظیم ترین محسنین میں سمجھتا ہوں ' مگر جیسا وہ خود شعرالعجم میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں انصاف شیوہ است کہ بالاے طاعت ست ' اس مقالے کا مطالعہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مولانا کے شبدیز قلم کو جس وقت ان کی نفاست مہمیز کرتی ہے تو پھر وہ واقعات کے روڑوں کی پروا نہیں کرتا ؛ چھلانگیں بھریں اور یہ جا وہ جا - پھر مولانا کے پاس وہ ذخیرہ کہاں تھا جو یورپ کے کتب خانوں میں ہے ' انھوں نے خود تحریر فرمایا ہے ' پیدا ست کہ با ایں سر و سامان چہ نویسم ' ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے - شعرالعجم کا مطالعہ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ مولانا کا روے سخن اہل علم و تحقیق کی طرف نہیں بلکہ اسکول اور مدرسے کے لڑکوں کی طرف ہے ورنہ ' تم یہ دیکھوگے ' ' تم کو یہ معلوم ہوگا ' ' اگر تم سے کوئی پوچھے ' وغیرہ قسم کے جملوں کا جن سے کتاب بھری پڑی ہے کوئی موقع نہ تھا اس لیے بھی مولانا نے غالباً بہت تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہ خیال فرمائی ہو —

یہ مقالہ مقالے کی حدود میں نہیں رہ سکتا چنانچہ باوجود انتہائی اختصار کے ایک طویل کتاب ہوگئی۔ اس کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہم نے باوجود حضرت دل کے اصرار کے "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" پر بہت کم عمل کیا ہے بلکہ کیفیت اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ بہت سی باتیں ہم اس تفصیل سے جیسی کہ چاہیے نہیں لکھ سکے اور بہت بڑے بڑے غزل گو شعرا کا ذکر ہمیں اس مختصر طریقے سے کرنا پڑا جو ہرگز ان کی عظمت اور اہمیت کے شایاں نہیں۔ عراقی، خسرو رومی، حافظ اور دور پنجم کے اکثر شعرا اسی زمرے میں ہیں ۔ مگر ہم نے ابتدائی دور کے شعرا سے کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارا مقصد غزل کی تاریخ لکھنی ہے نہ کہ غزل گو شعرا کی۔ لہذا ہم نے عموماً غزل گو شعرا کے حسب نسب حالات زندگی اور تاریخ پیدائش و وفات سے صرف اسی قدر بحث کی ہے جس قدر ہمارے مقصد کے لیے ضروری تھا۔ تاریخ وفات اور پیدائش ہم نے عموماً وہی تسلیم کی ہے جو عام طور سے مغربی مصنفین تسلیم کرتے ہیں۔

چونکہ یہ کتاب کم سے کم ہمارے علم میں اپنے موضوع پر سب سے پہلی ہے اور ہزار برس سے زیادہ زمانے پر حاوی ہے اس لیے ہمیں اس کی تالیف میں اسی قسم کی دشواریاں پیش آئیں جو ایسے کاموں کا لازمہ ہیں۔ ہم شروع میں کچھ ہچکچائے بھی خاص کر اس وجہ سے کہ سوائے اپنے دل کے کوئی اور رہبر نظر نہ آتا تھا۔ مگر بالآخر اپنے پیر طریقت کے اس اشارے کو سمجھ کے کہ "سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا" ہم نے

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرساہا

پر عمل کر ہی دیا - جدھر حضرت دل لے جاتے تھے ادھر جاتے تھے - وہ ایسے نا خدا نکلے کہ انہیں خود راستہ معلوم نہ تھا - "ہر اک سے پوچھتے تھے کہ جائیں کدھر کو ہم" - اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی " جاتے تھے تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ (مولانا شبلی سب سے زیادہ تیز رو ثابت ہوئے) اور پھر جب جانتے کہ یہ راستہ غلط ہے تو " آجاتے پھر وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم" - غرض ادھر ادھر بہت بھٹکے - خیر اب تو " سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب" کا مضمون ہے - عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مقالے میں جا بجا اصلاح کی گنجائش ہوگی - مجھے اس کا پورا احساس ہے اور اعتراف - اس کے متعلق صرف یہ عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے کوئی بات " نوشتن باید ضرور" پر عمل کر کے یا محض رعب جمانے کے لیے نہیں لکھی - جو کچھ لکھا اُسی وقت لکھا جب اس کی صحت کا پورا یقین ہوا اور میں نے اس کی تصدیق میں کسی قسم کی سہل انگاری کو دخل نہیں دیا ' مگر پھر بھی بہت ممکن ہے کہ بہت سی ایسی باتیں رہ گئی ہوں جن کا مجھے کسی وجہ سے علم نہ ہوسکا - میں صرف اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے انہیں جان بوجھ کے نہیں چھوڑا - جو حضرات براہ کرم ایسی باتوں کو میرے علم میں لائیں گے میں ان کا واقعی دل سے شکر گزار ہوں گا —

مقالے کا مطالعہ خود یہ بتادے گا کہ اس کی تیاری میں کس قدر تحقیق و تدقیق اور عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے ' کتنے نئے واقعات منظر عام پر لائے گئے ہیں ' کتنی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں اور مزید تحقیق و تلاش و ترقی کے لیے کتنی نئی راہیں کھل گئی ہیں —

جب میں تلاش و تحقیق کے کام میں مصروف تھا اس وقت مجھے بار بار اپنی عربی ترکی فرانسیسی جرمن اور روسی زبان سے قریب قریب

علمی یا تکلیف دہ احساس ہوتا تھا - خیر یورپین زبانوں کا ترجمہ تو مجھے اپنے تھوڑے سے مل جاتا تھا مگر عربی اور ترکی زبانوں سے لاعلمی کی کسر پوری نہ ہوسکی - عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے میں اس امر کے متعلق کسی قسم کی تحقیق و تلاش نہ کرسکا کہ آیا عربی زبان میں بھی کوئی چیز صورت و سیرت میں غزل سے ملتی جلتی رودکی کے زمانے سے پہلے پائی جاتی ہے یا نہیں - اگر ہے تو اس کی ابتدا کیونکر ہوئی - ہم نے یہ گزارش اس لیے کی ہے کہ جو صاحب اس کام کے اہل ہوں اس طرف توجہ فرمائیں * —

یہ مقالہ دو حصوں میں ہے - پہلا بطور مقدمے کے ہے - اس میں غزل کی ماہیت، خصوصیات، محاسن، نقائص اور اس کی ہر دل عزیزی کے اسباب سے بحث کی گئی ہے - بہت سی باتیں تو لازمی طور پر وہی ہیں جن سے عموماً لوگ واقف ہیں اور جو ہماری زبان کی اکثر کتابوں میں پائی جاتی ہیں - لہذا انہیں لکھنا بمنزلہ تحصیل حاصل کے ہے مگر چند باتیں شائد ایسی بھی ہوں جن کا یہ حال نہیں - بہرحال چونکہ یہ کتاب غزل پر ہے اس لیے ان باتوں کا ذکر ناگزیر تھا - امید کہ ارباب علم معاف فرمائیں گے - دوسرے حصے میں جسے اصل کتاب سمجھنا چاہیے غزل کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ مع تنقید کے مندرج ہے —

ذیل میں ان خاص خاص کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے جن سے اس مقالے کی تیاری میں قابل ذکر مدد ملی - اردو کتابوں کے نام غیر

---

* اس کے متعلق نکلسن اور مار گولیتھ جیسے مستشرقین نے جو فرمایا اس کا لکھنا بار خاطر ہے - بقول اکبر مرحوم —

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم   یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ

کتاب حاضر ہے ' ملاحظہ فرمائی جائے —

ضروری سمجھہ کے نظر انداز کیے جاتے ھیں - وہ کتابیں جن کے آگے کسی کتب خانے کا نام مندرج نہیں بادلین کی ھیں - کتابوں کا مخفف نام اور نمبر ان کے سامنے قوسین میں مندرج ھے - اُن الفاظ کے مخفف جن کا بار بار استعمال کیا گیا ھے بخیال سہولت درج ذیل کیے جاتے ھیں ـــ

برٹش میوزیم	مخفف	ب - م
انڈیا آفس لائبریری	"	انڈ
نولکشور پریس	"	ن - ک
ایتھیت	"	ای
اوسلی	"	او
اوسلی ایڈ	"	او - ایڈ
فریزر	"	ف

فہرست کتب

لغات

قلمی نسخے

۱ - کشف اللغات	(کشف - او - ۳۴۳)	سنہ تالیف	۱۵۴۰ء	مفید اورقابل قدر لغت
۲ - زبدۃ الفوائد	(زبدہ - او - ایڈ ۵۶)	"	۱۵۵۰	"
۳ - مدار الافاضل	(ف ۰ ۴۷)	"	۱۵۹۳	مندرجہ بالا لغات سے زیادہ جامع اور کار آمد-
۴ - فرہنگ جہانگیری	(فرہنگ - ف ۴۲)	"	۱۶۰۹	محتاج تعارف نہیں
۵ - فرہنگ ابراھیمی	(ف ۴۳)	"	۱۶۴۰	مفید لغت
۶ - منتخب اللغات شاھجہانی	(منتخب - او ۳۱۹)	"	۱۶۳۷	نہایت جامع اور مفصل

۷ - بہار عجم " (Caps. or B. 15) ۱۷۴۹ کسی تعارف کی محتاج نہیں

مطبوعہ

۸ - لغات فرس اسدی (پال هارن ایڈیشن) فارسی کا قدیم ترین لغت - اس امر نے اس کی اهمیت کو اور بڑھا دیا ھے کہ اس میں قدیم ترین زمانے کے شعرا کا وہ کلام پایا جاتا ھے جو اور کہیں نہیں ملتا

تذکرے

قلمی نسخے

۹ - مرات الخیال (مرات او اے ۲) سنہ تالیف ۱۶۹۱ شیر خان لودی کا مشہور تذکرہ -

۱۰ - سفینۂ خوشگو (ای - ۴۰۰) " ۱۷۳۵ نہایت مفید اور قابل قدر ھے-

۱۱ - ریاض الشعرا (ریاض - ای ۴۰۲) " ۱۷۴۸ والہ داغستانی کا مشہور تذکرہ -

۱۲ - مجمع النفائس (ای - ۳۹۹) " ۱۷۵۱ خان آرزو کی مشہور تصنیف -

۱۳ - خزانۂ عامرہ (عامرہ - او - اے ۹) " ۱۷۶۳

۱۴ - آتشکدہ (او - اے ۱۸۳) " ۱۷۸۰ مشہور و معروف تذکرہ - کسی تعارف کا محتاج نہیں

۱۵ - خلاصۃ الافکار (خلاصہ - ای ۱۸۱) " ۱۸۰۶ ابو طالب کا مشہور تذکرہ

۱۶ - مخزن الغرائب (مخزن - ای ۳۹۵) " "	فارسی کے کامل ترین تذکروں میں سے ہے نہایت مفصل اور جامع - مصنفہ احمد علی خاں ہاشمی سندیلوی-
مطبوعہ	
۱۷ - لب الالباب (لباب - براون ایڈیشن)	فارسی کا قدیم ترین تذکرہ- محتاج تعارف نہیں -
۱۸ - تذکرہ دولتشاہ (")	فارسی کے نہایت دلچسپ اور مشہور تذکروں میں سے ہے قدامت کے لحاظ سے لباب کے بعد اسی کا نمبر ہے - کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں-
۱۹ - تذکرۃ الاولیا (نکلسن ایڈیشن)	شیخ فریدالدین عطار کا مشہور تذکرہ - اس میں ان قدیم شعرا کا حال ہے جن کا شمار اولیائے کرام میں کیا جاتا ہے
۲۰ - نفحات الانس (نفحات - ن - ک)	مولانا جامی کا مشہور تذکرہ - عطار کے تذکرۃ اولیا سے ملتا جلتا-
۲۱ - مجمع الفصحا	رضاقلی خاں کا نہایت جامع

مفصل اور مشہور تذکرہ

مجموعات

۱۶ - بت خانہ (ای - ۳۱ و ۳۲) سنہ ۱۶۳۱ نہایت مفصل اور بیش بہا مجموعہ خصوصاً قدما کے کلام کا دو جلدوں میں -

۱۷ - دقائق الاشعار (ای - ۳۷) سنہ تالیف مندرج نہیں قدما کے کلام کا بہت کافی انتخاب ہے رابعہ بنت کعب کی بھی ایک غزل مندرج ہے -

۱۸ - مجموعہ رسائل (او - اے - ۶۹) ایضاً

۱۹ - نسخہ نمبر ۱ و - ۱۹۸ ایضاً نہایت مفصل مجموعہ جس میں قدما کے کلام کا قابل قدر ذخیرہ ہے -

۲۰ - نسخہ نمبر ۱ و ۳۸۷ ایضاً اس میں بھی قدما کا کلام زیادہ پایا جاتا ہے -

۲۱ - زینت المجالس (ای - ۱۹م) ۱۵۹۶ یہ در حقیقت ایک انسائکلوپیڈیا ہے جس میں پرانے زمانے کے قریب قریب جملہ علوم کے متعلق بیش بہا معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ حصۂ شاعری میں رودکی، دقیقی،

		فرخی، فردوسی، مسعودی اور عنصری کے کلام کا انتخاب ہے -
۲۲ - نسخہ نمبر ای ۲۹۳	مندرج نہیں	قدما میں شہید بلخی، بو علی سینا، شیخ انصاری رودکی اور کسائی کے کلام کا انتخاب ہے -
۲۳ - " " " ۲۹۴	" " "	
۲۴ - " " " ۲۹۲	" " "	
۲۵ - " " کلارک ۲۴	" " "	
۲۶ - " " فریزر ۱۲۴	"	

کلیات و دواوین قلمی نسخے

۲۷ - مجموعۂ کلام رودکی (او - اے - ۱۲۷)		اس نسخے میں کلام رودکی دو جگہ مندرج ہے - مگر بلحاظ تعداد و ترتیب اشعار دونوں یکساں ہیں - اس نسخے کے حصۂ غزل سے رودکی کے ذکر میں بالتفصیل بحث کی گئی ہے -
۲۸ - دیوان فرخی (نمبر ۲۰۳ ب - م)		
۲۹ - دیوان فرخی (نمبر ۲۰۴ ب - م)		
۳۰ - دیوان عنصری (نمبر ۲۰۵ ب - م)		

۳۱- " " " (نمبر ای ۱۱۴)

۳۲ - غزلیات ابو سعید ابوالخیر (او ۱۳۹) — یہ نام غلط فہمی کی وجہ سے ہے - در حقیقت اس نسخے میں حضرت ابو سعید کی کوئی غزل نہیں -

۳۳- دیوان احمد جام (۳۲۹ انڈ)

۳۴- " " " (۳۵۴۷ انڈ)

۳۵ - دیوان ابوالفضل رونی (مارش ۵۵)

۳۶ - دیوان مسعود سعد سلمان (ای ۱۰۹)

۳۷ - دیوان قطران (اور ۳۳۱۷ ب ۔ م)

۳۸ - دیوان سنائی (ای ۱۰۸)

۳۹ - دیوان سید حسن غزنوی (۲۳۹ انڈ)

۴۰ - دیوان سید حسن غزنوی (۳۲۸ انڈ)

۴۱ - دیوان معزی ۱۰۵۸۸ ب - م)

۴۲ - دیوان عبدالواسع جبلی (او - اے ۱۹)

۴۳ - دیوان سوزنی (ای ۱۱۰)

۴۴ - دیوان عماد شہریاری (اور ۲۹۲ ب ۔ م)

۴۵ - دیوان اثیر اخسیکتی (اور ۲۶۸)

۴۶ - دیوان حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (۱۴۳۰ انڈ)

۴۷ - دیوان بیلقانی (ای ۸۱)

۴۸ - دیوان خاقانی (ای ۷۴)

۴۹ - " نظامی گنجوی (ای ۸۸)

۵۰ - "　"　(او - اے ۱۱۴)

۵۱ - "　عطار (ای ۴۶)

۵۲ - دیوان کمال اسمعیل (ای ۶۵)

۵۳ - " امامی (اور ۳۷۱۳) ب - م

۵۴ - "　"　(ای ۱۱۷)

۵۵ - " کلیات سعدی (او - اے ۳۹)

۵۶ - " همام (۱۳۱ - ای)

اس نسخے میں همام کا کلام در حقیقت چند صفحوں کے حاشیے پر ہے - فولیو ۴۴۰ بی لغایت ۴۴۴ بی -

۵۷ - "　علاءالدولہ سمنانی (ای - ۱۱۲)

۵۸ - " کلیات خاجو کرمانی (ای ۲۱۷)

۵۹ - " ابن یمین (باتی ۱۰۲)

۶۰ - " عماد فقیہ (ای ۵۹)

۶۱ - " جلال عضد (ای ۱۲۱)

اس نسخے میں جلال عضد کے اشعار صرف فولیو ۴۶۴ بی لغایت ۴۸۲ بی کے حاشیے پر ہیں -

۶۲ - " حافظ (او - اے ۱۷۵)

دیوان حافظ کے بہت سے نسخے نظر سے گزرے مگر یہ آپ اپنی نظیر ہے - ایسا اعلی درجے کا نسخہ

شاید ھی کوئی اور ھو۔
مہر علی کے ھاتھہ کا لکھا
ہوا ھے جس کا شمار دنیا
ے بہترین خوشنویسوں
میں کیا جاتا ھے ۔ کتاب
شروع سے اخیر تک مطلا
اور مذھب ھے متعدد
اعلیٰ درجے کی تصویریں
ھیں جلد سازی کا نمونہ
بھی قابل دید ھے ۔

۔ دیوان مسعود بیگ (سملق ۳۳)۔

کلیات و دواین مطبوعہ

فہرست بہت طویل ھے ۔ یہاں صرف قابل ذکر کتابیں مندرج کی جاتی ھیں —

- دیوان ملوچہری (پیرس ایڈیشن) (۷۵۷ - ۹ - ۵۲ ب - م ۔
- " (طہران ") (۱۴۷۹۷ - سی - ۱۹ ب - م)
- " دیوان فرخی (۱۴۷۹۷ - سی - ۷ ب " - م)
- " " (" ۔ڈی - ۱۱ ")
- " عنصری (" - سی - ۸ ")
- " " احمد جام (ن - " ک)

قلمی نسخے متفرق کتابیں

زبدۃالاشعار (زبدہ - او ۵۷) علم عروض کی کتاب ھے ۔ قدیم اشعار

بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں -

۷۱ - حدائق الحقائق (او - اے ۴)

۷۲ - بہارستان جامی (ای - ۲۵۴) مولانا جامی کی مشہور کتاب - گلستان کے انداز میں - قدیم شعرا کے متعلق مفید معلومات پائی جاتی ہیں - یہ نسخہ بھی حسن و زیبائش میں دیوان حافظ کے مذکورہ بالا نسخے کے ہم پلہ ہے -

۷۳ - تاریخ گزیدہ (کلارک ۸)

۷۴ - یوسف زلیخا فردوسی و (واکر ۶۴)

۷۵ - " " (ای - ۳۱۴)

مطبوعہ

۷۶ - چہار مقالہ (براؤن ایڈیشن) -

۷۷ - سفرنامہ ناصر خسرو (پیرس ایڈیشن) اس میں شعرائے قدیم کے متعلق کہیں کہیں قیمتی معلومات پائی جاتی ہیں -

ENGLISH BOOKS.

78. Browne's 'A literary history of persia 2 Vols. (Browne Vol. I & 2).
79. " " 'Persian literature under Tarter dominion'. (Browne Vol. III).
80. " 'Persian literature in modern times (Browne Vol. iv)
81. " 'The press and poetry of modern Persia !.
82. Gibbs 'Poetry of the Ottomans' .8 Volumes. of these the first volume has been consulted in detail and the rest only occasionally.
83. Nicholson's 'A literary history of the Arabs'.

84. " 'Studies in Islamic history,.
85. Miss G, Bell'S 'Selected poems from the DiWan of Hafiz,.
86. Sir G. Ouseley's 'Biographical notices of Persian poets, .
87. Bland,s 'A century of Ghazals,.
88. Blockmann's 'The prosody of the persians,.
89. Forbes 'Persian Grammar,.

JOURNALS

مختلف رسائل کے چند اهم مضامین درج ذیل هیں :—

90, The sources of Daulatsh : Materials for a literary history of persia and an excursion on Barbad and Rudaki-Browne. J. R. A. S. for 1899. P. 37
91. Biographies of Persian poets contained in the Tarikh i-Guzida translated by BroWne J. R. A S. for 1900. P 721; for 1901. P. 1
92. Nasir-i-Khusro, poet, traveller and propagandist. BroWne. J. R. A. S. for 1908. P. 313
93. Omar Khayyam. Beveridge. J. R. A. S. for 1905. P. 54.
94. Masud-i-Sad -i-Salman by Mirza Muhammad : translated by BroWne. J. R. A. S for 1905. P. 693 and for 1906 P. 11.
95. Historical enquiry concerning the origin and development of Sufism With definition. Nicholson. J. R. A. S. for 1906. P. 303.
96. Biography of Shaikh Ahmad-i-Jam. W. Ivanes. J. R. A. S. for 1917. P. 291.
97. Ethe's article on Rudaki. Gottinger Nachrichten for 1875. P. 566
98. " " " Bu Ali Sina. Gottinger Nachrichten. for 1875. P.

حصۂ اول

(۱)

منتخب اللغات شاهجهانی میں غزل کے معنی ان الفاظ میں بیان کیے گئے هیں " حدیث زنان و حدیث عشق ایشاں کردن و سخنے که در وصف زناں و عشق ایشاں گفته اید " - پنڈت ٹیک چند بہار نے اسے اپنی مشهور معروف کتاب میں لفظ به لفظ نقل کردیا هے - مدارالافاضل میں

غزل کی تعریف یوں کی گئی ھے "بازی کردن بہ محبوبہ و معشوقہ و حکایت کردن از خوبی و حدیث زنان" - دوسری کتابوں میں جو غزل کے معنی بیان کیے گئے ھیں وہ انھی دونوں کا خلاصہ ھیں - تھوڑا سا الفاظ کا الٹ پھیر ھے اور بس —

فارسی ادب میں اس لفظ سے ایک خاص صنف سخن مراد ھے جس کے لوازمات حسب ذیل ھیں -

(۱) تعداد اشعار - "کم از پنج بیت نہ باشد" (مدار اور کشف) - بہ حیثیت مجموعی یہ صحیح ھے اگرچہ تین چار شعر کی غزلیں بھی کبھی کبھی نظر آجاتی ھیں - سر ڈینیسن راس مس گرٹریو ڈبل کی کے مقدمے میں تحریر فرماتے ھیں

'The Ghazal ranges in lenghth from 10 to 16 couplets'.

تردید کی ضرورت نہیں —

اھل الرائے میں اس امر کے متعلق اختلاف ھے کہ غزل کے اشعار کی تعداد زیادہ سے زیادہ کتنی ھونی چاھیے - مدار اور کشف کے مطابق "زیادہ از یازدہ نہ باشد" - بہار عجم نے اس بحث کا خلاصہ یوں لکھدیا ھے:

"پیش قدما زیادہ از دوازدہ نیست و متاخراں منحصر دراں نہ دانند" - ھم یہاں اتنا اور بڑھادینا چاھتے ھیں کہ قدما کا بھی یہی حال ھے - بہر حال عام طور سے غزل سترہ شعر سے زیادہ کی نہیں ھوتی فوربس (Forbes) نے بہت صحیح کہا ھے:

"On this subject authors by no means agree either with one another or with real facts. Hafiz for example has several Ghazals consisting of 16 even 17 couplets; and Hakim Sanai has many that exceed the latter number...... There are many Persian Ghazals consisting of only four couplets and many more exceeding 20 and upwards" (Forbes' Persian Grammer P. 145-46),

(ب) جملہ اشعار کو ایک ھی بحر میں ہونا چاھیے —

(ج) پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم ردیف و قافیہ ہونے چاہئیں (ایسی غزلیں بھی پائی جاتی ھیں جن کا پہلا شعر مطلع نہیں مگر درحقیقت وہ غزلیں نامکمل ھیں - مکمل غزل کے لیے پہلے شعر کا مطلع ہونا لازمی ھے) - غزل کے دوسرے اشعار چاھے مطلع کی صورت میں ہوں یا نہ ہوں مگر ہر شعر کے آخری مصرعے کا ہم ردیف و قافیہ ہونا ضروری ھے - (ردیف غزل کے لیے ضروری نہیں - ایسی بہت سی غزلیں ھیں جن میں محض قافیہ ھے ردیف نہیں مگر زیادہ تر ردیف پائی جاتی ھے - غزل میں ردیف کی اھمیت کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا) —

(د) آخری شعر میں جسے مقطع کہتے ھیں شاعر عموماً اپنا تخلص استعمال کرتا ھے - شاعر تخلص اور شعروں میں بھی رکھ سکتا ھے مگر عموماً آخری شعر ھی میں رکھتا ھے —

(۲)

خصوصیات

جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہوتا ھے غزل کا اصل تعلق محبت اور اس کی گوناگوں نیرنگیوں اور متعلقہ باتوں سے ھے - مدار کے الفاظ یہ ھیں "دراں ذکر مے و محبت و بیان فراق و وصال محبوب بود" - لیکن غزل کی روز افزوں ہر دلعزیزی کی وجہ سے جس کے اسباب بعد میں بیان کیے جائیں گے اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ دنیا کی تمام چیزیں اس میں داخل ہوگئیں - غزل شاعری کا مترادف بن گئی اور چہار مقالے کی اس عبارت کا مصداق کہ "چنانکہ شعر در ہر علم

بکار ہمی شود ہر علم در شعر بکار ہمی شود" - مگر چونکہ غزل کا اصل موضوع بدستور عشق ہی ہے اس لیے ان مضامین کو جن کا تعلق عشق سے نہیں حدود غزل میں لانے کے لیے عشق ہی کے رنگ میں رنگنا لازمی ہے - بقول عرفی :

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود
بادہ گر خام شود پختہ کند شیشۂ ما

لیکن اگر یہ عشق کی رنگ آمیزی جو جتنی شوخ ہو اتنی ہی بہتر کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو کسی ایسے مضمون کو جو اس حکمراں جذبے سے تعلق نہیں رکھتا حدود غزل میں لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی طرز ادا میں ایسا لطف ہو جس سے دل لذت یاب ہوسکے - کسی بے رنگ اور غیر لطیف خیال کا بے رنگ اور غیر لطیف اظہار حدود غزل سے خارج ہے —

غزل کا چونکہ موضوع محبت ہے اس لیے اس کی زبان بھی محبت کی زبان ہونی چاہیے-نرم' پاکیزہ' شیریں' بے تکلف اور پر اثر - بھونڈے کرخت الفاظ یا عالمانہ زبان غزل کے لیے اسی قدر ناموزوں ہے جتنی کہ کسی سے اظہار محبت کے لیے - مصرعے بھی سانچے میں ڈھلے ہونے چاہئیں کسی اور صنف سخن میں زبان کی لطافت اور قواعد فن کی پابندیوں پر اس قدر زور نہیں دیا جاتا جس قدر کہ غزل میں - (یہ باتیں مقدمہ' شعر و شاعری شعرالعجم اور اردو کی دوسری بہت سی کتابوں میں اس تفصیل سے مندرج ہیں کہ ان کا یہاں خلاصہ لکھہ دینا کافی ہے) -

غزل کی سب سے بڑی خصوصیت جس نے اسے ایک نرالی چیز بنا دی یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے - جہاں تک خیالات یا جذبات کا تعلق ہے اسے اپنے اوپر یا نیچے کے شعروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - ہر شعر میں ایک علحدہ خیال ادا کیا جاتا ہے - بحر قافیہ

اور ردیف هی وہ چیزیں هیں جو ان مختلف اشعار کے موتیوں یا خذف ریزوں کو ایک دھاگے میں پروتی هیں (غزل کی اس خصوصیت کے نتائج کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا) —

اگرچہ مندرجۂ بالا خصوصیت عام طور سے غزل میں پائی جاتی ہے لیکن یہ اس کے لوازم میں سے نہیں - مسلسل غزلیں بھی کافی تعداد میں پائی جاتی هیں خصوصاً اعلیٰ درجے کے شاعروں کے کلام میں - بہت سی ایسی غزلیں بھی هوتی هیں جن میں اگرچہ مضمون کا تسلسل نہیں پایا جاتا مگر پھر بھی ایسا محسوس هوتا ہے کہ ساری غزل میں ایک هم آهنگی کی روح جاری و ساری ہے - حافظ ' سعدی ' رومی ' خسرو ' سنائی ' احمد جام اور دوسرے عظیم المرتبت شاعروں کے کلام اس قسم کی غزلوں سے بھرے پڑے هیں - ان کی تندیء صہبا کے آگے غزل کے اشعار کے مختلف آبگینے خود بخود پگھلنے لگتے هیں - اس کے علاوہ جیسا کہ همارے مقالے کے دوسرے حصے سے ثابت هوگا قدما زیادہ تر مسلسل غزل کہتے تھے - غزل کے اشعار میں هم آهنگی اگرچہ ایک ایسی صفت ہے کہ هر صاحب ذوق اسے لازمۂ غزل گوئی قرار دینا چاهیگا مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے - گب (Gibb) کا یہ کہنا کہ

" Though there may be no definable connection between the individual couplets these ought never to be out of harmony with one another in a single tone of mind should run through the whole poem. Such indeed is what ought to be but in practice we find that in a vast number of Ghazals . . . . . . there is no more unity of thought or feeling between several couplats than there is between the paragraphs in the column of a newspaper " (The poetry of the. Ottomans Vol. 1. P. 83).

در حقیقت واقعیت پر مبنی نہیں - غزل گوئی کا کوئی قانون شعرا کے لیے اس کی

پابندی لازمی قرار نہیں دیتا یہاں تک کہ میری نظر سے کسی تذکرہ نویس کی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں اس صفت کو ممدوح قرار دیا ہوا اور اس کی عدم موجودگی کو مذموم —

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ایک پوری غزل مسلسل یا ہم آہنگ نہیں مگر پھر بھی اس کے چند اشعار میں ایک خیال تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے - ایسے اشعار قطعہ بند کہلاتے ہیں - یہ غزل میں کسی جگہ ہوسکتے ہیں اور ان کے اوپر - "ق" لکھ کے اُنہیں غزل کے دوسرے اشعار سے علحدہ کیا جاتا ہے —

بہر حال مسلسل یا ہم آہنگ غزلیں یا قطعہ بند اشعار اس کلیے کے مستثنیات میں سے ہیں کہ غزل وہ صنف سخن ہے جس کا ہر شعر بلحاظ مضمون، خیال یا جذبات کے ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے - اس مقالے میں جہاں جہاں لفظ غزل استعمال کیا گیا ہے وہاں اس سے یہی کلیہ مراد ہے —

(۳)

غزل کی " صورت و سیرت " بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کے محاسن و معائب سے بحث کرسکتے ہیں - انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی (۱) وہ محاسن و معائب جو غزل کی " صورت و سیرت " کا نتیجہ ہیں پہلے ہم معائب کو لیتے ہیں —

غزل کے معائب بحیثیت ایک صنف سخن کے

غزل کے بہت سے معائب اُس کی اسی امتیازی خصوصیت کا نتیجہ ہیں جس کا ذکر ابھی ہم کرآئے ہیں یعنی اشعار کا ایک دوسرے سے بے تعلق ہونا - یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے غزل کہنا لڑکوں

کا کھیل سمجھا جاتا ہے - عام طور سے شاعر کے سامنے ایک مصرع طرح ہوتا ہے - چونکہ ہر شعر ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اسے ایک ایک شعر کو علحدہ علحدہ مکمل کرنے کی ضرورت و فکر ہوتی ہے - وہ عموماً دوسرے مصرعے سے ابتدا کرتا ہے - قافیوں کی فہرست پہلے ہی سے تیار رہتی ہے - ان میں سے ایک قافیہ چنتا ہے - ردیف کے ساتھ ملاتا ہے - یہ آمیزش چند ایسے خیالات کو جو شاعر دوسروں کے کلام میں پڑھتا چلا آیا ہے اس کے سامنے کھڑا کردیتی ہے - اب اس کے سامنے دو طریق کار رہتے ہیں - ایک تو یہ کہ وہ انہیں خیالات میں سے کسی ایک کو باندھ دے - دوسرا جو مقابلتاً زیادہ عام ہے یہ کہ شاعر پہلے دوسرے مصرعے کو مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہے بغیر اس خیال کے کہ پہلا مصرعہ کیا ہوگا اور شعر میں کیا مضمون باندھا جائے گا - دوسرا مصرع تیار ہوجانے کے بعد پہلے مصرعے کی تلاش شروع ہوتی ہے جو دوسرے مصرعے کی مدد سے بہت آسانی سے مل جاتا ہے اور شعر پورا ہوجاتا ہے - اسی طرح بقیہ اشعار بھی تیار ہوجاتے ہیں - ان اشعار میں بلحاظ خیال یا جذبات کے اکثر کوئی تعلق نہیں ہوتا - یہی وجہ ہے کہ عموماً ایک غزل ہر قسم کے مختلف اور متضاد خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے :—

اس طریقۂ تصنیف کی آسانیاں ایسی ہیں کہ بڑے شعرا بھی اکثر اسے بغیر اختیار کیے نہیں رہتے اس معاملے میں بڑے اور چھوٹے شاعر میں صرف فرق ہے تو اتنا کہ معمولی شاعر اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ وہ شعر میں کیا کہے گا اور کس طرح - اس کا اصل مقصد غزل کی تیاری ہوتا ہے اور بس - اس لیے وہ اپنی غزل میں وہی اوروں کے خیالات جنہیں پڑھتا سنتا چلا آیا ہے بغیر کسی خاص تبدیلی یا ترقی

کے نظم کر دیتا ہے - اس طرح اس کا کلام نقل و سرقہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا - مگر ایک بلند حوصلہ شاعر اس سطح سے بلند ہونے کی کوشش کرتا ہے - وہ ردیف و قافیہ کے ہر پہلو پر نظر ڈالتا ہے اور جس قدر چست مصرع تیار کرسکتا ہے کرتا ہے - اس مصرعے کو لے کے وہ پہلے مصرعے کی تلاش شروع کرتا ہے - چاہتا ہے کہ پہلا مصرع ایسا لگائے کہ اگر بالفرض کسی اور کو دوسرا مصرع سوجھ بھی گیا ہو (جیسا کہ ردیف و قافیے کے ایک ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ہو جاتا ہے) تو کم سے کم پہلا مصرع نہ سوجھے اور یہ پہلا مصرع ایسا ہو کہ اس سے بہتر کوئی اور مصرع نہ لگ سکے - مجھے خود دو ایک ایسے حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جنوں نے فخریہ ارشاد فرمایا کہ " جناب شعر کہنا کھیل نہیں - بڑی جگر کاوی کا کام ہے خدا کی قسم دو دو تین تین دن تک اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند رکھنا پڑا تب جا کر کہیں پہلا مصرع ہوا " صاحب سفینہ طالب آملی کا یہ شعر لکھنے کے بعد کہ -

زغارت چمنت بر بہار منتہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

لکھتا ہے " گویند پیش مصرعۂ این بیت در شش ماہ رسانید " - شعر لاجواب ہے اور اس میں شک نہیں کہ پہلے مصرعے کی وجہ سے - یہ اس طریقۂ تصنیف کی خوبی کی مثال ہے - اس کا ذکر بعد میں آئے گا یہاں ہمیں اس کے نقائص سے مطلب ہے -

ا - یہ طریقہ شاعر کو مشین بنا دیتا ہے ذاتی احساسات اور خیالات کی ضرورت باقی نہیں رہتی - ہر کس و ناکس اپنے کو شاعر بے بدل سمجھنے لگتا ہے - اور غزلیں اسی تیزی اور آسانی سے سے تیار ہونے لگتی ہیں جیسے

مشین سے چیزیں - صاحب مجمع الفصحا اپنی کتاب کے مقدمے میں متاخرین غزل گو شعرا کی بد مذاقی کی شکایت کرتے ہوے بجا طور پر لکھتا ہے " غزل راچوں ترارے معین نہ بود بہر نحویکہ طبائع سقیمہ و سلیقۂ نا مستقیمہ آناں رغبت کرد پریشان گوئی و یاوہ درائی و بیہودہ سرای آغاز نہادند " - ان شعرا کے اشعار میں چونکہ عام طور سے ان چند خیالات بلند شوں اور ترکیبوں کا جلهیں وہ پڑھتے سنتے چلے آے ہیں لامتناہی اعادہ ہوتا ہے اس لیے وہی خیالات اور بندشیں رسمی چیزیں ہو کے رہ جاتی ہیں - گب 'gibb' کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ -

This poetry is highly conventional. It is replete with what are called Stock epithets; the 'moon - face, the 'syprus - form, the 'ruby-lips, occur with wearisom reiteration. In the same way what we may call stock-associations abound. When the nightingale is mentioned we may be sure the rose is not far away and if we read of the moth in the one line we may feel safe about meeting the taperin the next. " (vol ,, p. 29)

یہ بات ایک حد تک غزل کی ماہیت کا نتیجہ ہے جیسا بعد میں ظاہر ہوگا غزل کے حدود بہت تنگ ہیں اس کے اشعار میں اختصار اور اثرپیدا کرنے کے لیے استعاروں ' تشبیہوں ' تلمیحوں اور چست ترکیبوں کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے - یہ اگر موزوں اور مناسب ہوئیں تو عام طور پر استعمال ہونے لگتی ہیں - چونکہ وہ داستان حسن و عشق بیان کرنے کے لیے وضع کی جاتی ہیں اس لیے ان کے ذریعے سے وہ مضامین جن کا تعلق براہ راست حسن و عشق سے نہیں بآسانی غزل میں لائی جاسکتی ہیں - اس طرح جیسے جیسے غزل کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ان کے استعمال کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے - اور جس قدر وہ استعمال کی جاتی ہیں ان کی معنویت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے - جب صوفیاے کرام انہیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اختیار کرتے ہیں

(اس کے اسباب مناسب موقع پر بیان کیے جائیں گے) تو ان کی معقولیت اور بڑھجاتی ہے - ان سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں استعمال نہ کرنا شاعر کے لیے قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے - اگر بالفرض ایسا کرنا بھی چاہے تو مذاق عامہ اسے پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ ان کا ایسا عادی ہوجاتا ہے کہ انہیں لازمۂ غزل گوئی سمجھنے لگتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا شخص بھی جس کی دنیا کے شعرا کی بزم ادب میں ممتاز جگہہ ہے یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ مقصد ہے

ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام	بنتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ان وجوہ کے علاوہ مشرق کی فطری رسم پسندی بھی اس کی شاعری کو رسمی بنا دینے کا ایک بڑا سبب تھی --

یہ رسمیت کچھہ عرصے میں خیالات میں جمود پیدا کردیتی ہے اور لوگوں کو بالکل مضمحل --

(ب) شعر کہنے کا یہ طریقہ ان شاعروں کو بھی جن میں جوہر قابل ہے گمراہ کر دیتا ہے - اس کی وجہ سے خود بخود ان کی توجہ زیادہ تر انہیں رسمی خیالات کے نئے نئے پہلو ڈھونڈھنے یا ان میں طرز ادا سے جدت اور تازگی پیدا کرنے کی طرف رہتی ہے - ایسی شاعری جو تقاضائے طبیعت یا شدت جذبات کی وجہ سے ہوپس پشت پڑجاتی ہے اور رفتہ رفتہ مفقود ہوجاتی ہے - شاعری نازک خیالی اور حسن ادا کا مترادف بنجاتی ہے اور شعرا کا کام بھی رہ جاتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں میں سبقت لے جائیں --

آخرالذکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صنائع بدائع تمسخر آمیز مبالغے ، مشکل ردیف قافیے اور اسی قسم کی لغویات کی بھول بھلیاں

میں کھو جاتے ہیں۔ * اول الذکر یعنی فکر نازک خیالی رفتہ رفتہ ایسی شاعری پیدا کردیتی ہے جس کی حیثیت بال کی کھال نکالنے سے زیادہ نہیں اور جس کا نام متاخرین نے مضمون آفرینی ' خیال بندی یا استعارہ بندی ، کہا ۔ یہ باتیں شاعر کو رفتہ رفتہ صداقت سے دور کرتی جاتی ہیں اور اس کے کلام کو مصنوعی اور بیجان ۔ غزل کی ایک اور خصوصیت بھی اس امر کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے اس کا موضوع عموماً ایک خاص قسم کی محبت ہوتا ہے یعنی صوفیانہ - بہت جلد اس محبت کے مضامین کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے - چونکہ عام شعرا میں صاحب حال کم ہوتے ہیں اس لیے ان کے کلام میں وہ جوش زور اور اثر تو ہوتا نہیں جو صوفیانہ شاعری کی روح و رواں ہیں اس لیے انہیں مجبوراً اپنے کلام میں کوئی نئی بات پیدا کرنے کے لیے اسی قسم کی مہملیات کا یا تو شکار ہونا پڑتا ہے یا پھر انہیں خیالات کی لا متناہی تکرار - بغیر سرقہ کیے ہوے بھی ایک شاعر کا کلام دوسرے کے کلام سے اتنا ملتا جلتا نظر آتا ہے کہ اس پر سرقے کا گمان بجا طور پر کیا جاسکتا ہے - مثلاً اس عام خیال کو کہ درد محبت ایک ایسی چیز ہے جسے نہ ظاہر کرتے بنتا ہے نہ چھپاتے ہلالی یوں نظم کرتا ہے —

---

* غزل کی ترقی سے بہت پہلے ہی شاعری میں یہ باتیں پیدا ہوگئی تھیں بقول نکلسن

"The chief merits of poetry (had come to be) considered to lie in elegant expression, subtle combination of words, fanciful imagery witty conceits and a striking use of rhetorical figures,, (Nicholson,s Literary History of the Arabs) p. 311).

غالباً غزل یوں بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکتی مگر اس کی ماہیت نے شعرا کی توجہ آپ ہی آپ اس طرف مبذول کردی —

مشکل حکایتیست عشق کہ گفتن نمی تواں
این مشکل دگر کہ نہفتن نمی تواں

اسی مضمون کو یحییٰ گیلانی جو اس کا ہم عصر تھا یوں بیان کرتا ہے

درد دل من نہفتنی نیست
این درد دگر کہ گفتنی نیست

دونوں اشعار جس قدر معنی و طرز ادا میں ملتے جلتے ہیں محتاج بیان نہیں - یہی حال سیکڑوں ہزاروں اشعار کا ہے جن سے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں —

چونکہ مشرق میں مذاق شعر و سخن عام ہے اس لیے لازم تھا کہ اس شاعری کے مصنوعی اور رسمی ہونے کا اثر لوگوں کی طبیعت نظریہ اور مذاق پر بہت گہرا پڑے اور یہی ہوا - درحقیقت برائیوں کا ایک ایسا چکر پیدا ہوگیا تھا جس میں ایک برائی دوسری کا سبب تھی - غزل اس لیے روز بروز مصنوعی اور رسمی ہوتی جاتی تھی کہ لوگوں کی افتاد طبع خود ایسی تھی اور لوگوں کی طبیعتیں اس لیے ایسی ہوتی جاتی تھیں کہ وہ ادب جس سے ان کے دل و دماغ کی تربیت ہوتی تھی ایسا تھا - اگرچہ اس تصنع اور رسم پسندی کے بہت سے اور اسباب تھے سیاسی معاشرتی اقتصادی جن سے بحث کا یہاں موقع نہیں تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان برائیوں کو بد سے بد تر کرنے میں غزل کو بہت بڑا دخل تھا —

ج - ایک شعر یا ایک مصرعے کو بغیر اس کے پہلے یا بعد کے شعروں یا مصرعوں کا خیال کیے ہوئے تصنیف کرنے کی عادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ دماغی کاہلی پیدا ہوجاتی ہے اور لوگ عموماً ایسا کام کرنے سے گھبراتے ہیں جس کے لیے مسلسل کوشش کی ضرورت ہو - یہ خرابی

بھی مثل گزشتہ خرابی کے بہت سے اور اسباب کا نتیجہ تھی مگر اس کو ترقی دینے میں ہماری غزل کا کم حصہ نہیں —

(د) اس طریقۂ تصنیف کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بہ یک وقت ایک مضمون کے مختلف پہلو پر نظر ڈالنے کا عادی ہو جاتا ہے - بقول گب (Gibb) —

"Through this mental habit whereby so many aspects of the subject are simultaneously perceived, there arises a certain vasillation of judgment which in practical affairs has led to many disasters,,. (vol. I. P. 27).

(ہ) غزل کی ماہیت کچھ ایسی ہے کہ اچھی غزل کہنی اس قدر مشکل ہے جس قدر معمولی غزل کہنی آسان - اول تو اِن نقائص سے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے بچنا سہل نہیں - اگر شاعر ان سے بچ بھی گیا تو اسے اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے - وہ دیکھتا ہے کہ اسے صرف دو مصرعوں میں سب کچھ کہنا ہے اور وہ بھی لتھہ مار طریقے سے نہیں - غزل گوئی کے جملہ لوازمات کی پابندی ضروری ہے - یہ مشکلیں اُس وقت اور بڑھ جاتی ہیں جب غزل کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ دنیا کے جملہ مضامین اس میں داخل ہو جائیں - دوسرے اصناف سخن کے پس پشت پڑجانے سے شاعر کو غزل ہی کے مفرد اشعار میں سب کچھ کہنا پڑتا ہے - بہت سے مضامین اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ وہ ایک شعر میں آسانی سے بیان نہیں کیے جاسکتے - اس لیے ان کے بہت سے اجزا کو چھوڑنا پڑتا ہے لیکن ساتھہ ہی ساتھہ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو ان چھوٹے ہوے اجزا کی طرف بہ آسانی خیال کو منتقل کرسکیں - ہر لفظ بقول غالب گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتا ہے - لیکن یہ بات آسان نہیں ہر شخص اسے

کامیابی کے ساتھہ نباہ نہیں سکتا - اس لیے اس رنگ کے شعرا کے کلام کا بیشتر حصہ مہملیات سے زیادہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے شعرا کا کلام بھی اکثر چیستان اور معمہ بلکے رہ جاتا ہے - ہمارے پانچویں دور کے شعرا کا کلام عموماً اسی قسم کا ہوتا ہے اور اس پر وہ خود بھی یہ کہہ کے فخر کرتے ہیں کہ —

هم چشمی ما کرا مجالست

فهمیدن شعر ما کمالست

غالب نے جو خود اس رنگ کے استاد تھے اس شعر میں کہ —

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھہ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

جو بات کہی ہے اسے اکثر شاعروں کے دل محسوس کرتے ہیں -

(باقی آئندہ)

باغ نشاط (کشمیر)

(نتیجۂ فکر حضرت شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی)

اے یادگار عہد جہانگیر، اے نشاط   اے بزم عیش رفتہ کی الٹی ہوئی بساط
اے مدفن شکستۂ پارینۂ انبساط   دھندھلا سا حسن و عشق کا اک نقش ارتباط

کشمیر میں تو اب بھی تیرا نام باغ ہے
تو ورنہ کائنات کے سینے کا داغ ہے

مانا کہ گل فروش کا دامن ہے اب بھی تو   گلہائے رنگ رنگ کا مخزن ہے اب بھی تو
مانا کہ عندلیب کا مسکن ہے اب بھی تو   بھٹکی ہوئی نگاہ میں گلشن ہے اب بھی تو

جاری ہے رسم آمد فصل بہار کی
ٹوٹی نہیں ہے آج بھی لے آبشار کی

چشمے بلندیوں سے اُبلتے ہیں آج تک   ہر منزل نشیب پہ ڈھلتے ہیں آج تک
فوارہائے آب اُچھلتے ہیں آج تک   تجھ میں درخت پھولتے پھلتے ہیں آج تک

لیکن نشاط! تجھ میں وہ تیری سی بو نہیں
جس میں سلیم و نور جہاں تھے' وہ تو نہیں!

خطبۂ صدارت

جو اڈیٹر اردو نے اردو کانفرنس میں جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ضمن میں علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی ، ۲۸ اپریل کی شب کو پڑھا -

گری زون سوستان کا ایک پرگنہ ہے اور پہاڑی علاقہ ہے ، اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ، ان کے ہاں قدیم سے ایک روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ خلاق عالم نے فرشتہ کلمائیل کو بیجوں بھرے تھیلے دیے اور فرمایا کہ جاؤ تم دنیا کا ایک چکر لگاؤ ، اور زبانوں کے یہ بیج لوگوں کے سروں میں بوتے چلے جاؤ فرشتے نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کی اور یہ بیج بنی نوع انسان کے دماغوں میں جم گئے اور فوراً اُگنے شروع ہوئے ، اور زبانیں چشمے کی طرح اُبلنے لگیں - جب فرشتہ کلمائیل اپنے تھیلے خالی کرچکا اور خلاق عالم کے پاس واپس آنے کو ہوا تو یہ دیکھ کر اُسے سخت ندامت اور پریشانی ہوئی کہ گری زون کا علاقہ چھوٹ گیا ہے اس نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس فرو گزاشت کے متعلق عرض کیا خدا نے مختلف تھیلوں کے ملے جلے بیج جو بچ رہے تھے اسے دیے اور کہا کہ جاؤ ، یہ وہاں جاکر بو آؤ - یہی وجہ ہے کہ اس پہاڑی آبادی میں طرح طرح کی زبانیں اور بولیاں پائی جاتی ہیں —

یہ نقل بہ نسبت کری زوں کے ہندوستان پر زیادہ صادق آتی ہے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں جن کی تعداد بیسیوں نہیں سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے - لیکن اس ہجوم میں ایک زبان ایسی بھی نظر آتی ہے جو ملک کے اکثر علاقوں میں بولی جاتی ہے اور تقریباً ہر جگہہ سمجھی جاتی ہے - یہ زبان ہندوستانی اردو ہے جس کا ادب نظم و نثر میں نویں صدی ہجری سے مسلسل موجود ہے - یہ ہمارا ہی دعویٰ نہیں بلکہ اس کی شہادت غیروں نے بھی دی ہے اور یہ شہادتیں یوروپی سیاحوں کی تحریروں میں سترھویں صدی کی ابتدا سے بعد تک برابر ملتی ہیں - ایک موقع پر کسی خاص معاملے میں ابی سینیا کے سفیر خوجہ (Movaad) سے چند استفسارات کیے گئے - ان میں سے ایک یہ تھا کہ " فلاں شخص نے آپ کی حضوری میں کس زبان میں گفتگو کی ؟" وہ جواب دیتے ہیں - ' ہندوستانی زبان میں - جس کی ترجمانی ہیراکسلنسیز دی ہائی گورنمنٹ آف بٹاویا کے سکریٹری نے کی - یہ واقعہ سنہ ۱۶۹۷ ع کا ہے - اس زمانے کا ایک سیاح لکھتا ہے کہ " دربار کی زبان تو فارسی ہے مگر عام بول چال کی زبان " اندوستان " ہے " (فرائیر)

یہ اگلی باتیں ہیں انہیں جانے دیجیے - کمپنی کے زمانے کو لیجیے جب ایسٹ انڈیا نے اپنا کاروبار یہاں جمایا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھایا تو تجارت اور سیاست دونوں اغراض کی خاطر تازہ ولائت نوکار انگریز ملازموں کی تعلیم کے لیے ملک کی ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا جو اپنی عام مقبولیت اور وسعت کی وجہ سے سب سے زیادہ کار آمد تھی ' یہ زبان ہندوستانی یعنی 'اردو' تھی - اس کے لیے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا جو فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہے -

اس میں قابل زباں دان ہندی ملازم رکھے گئے جو نوجوان نوواردوں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم بھی دیتے تھے اور کتابیں بھی تالیف اور ترجمہ کرتے تھے - اس کالج کے معلم اول ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اردو کے محسن اور اس کے شیدائیوں میں سے تھے اس زبان کو (Grand Popular Speech of India *) کہتے ہیں - ایک دوسری جگہ وہ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ نہایت کار آمد اور عام زبان ہے جس پر ہندوستان فخر کرسکتا ہے" - وہ اپنی اسی کتاب برٹش انڈیا مونی ٹر میں لکھتے ہیں کہ " چونکہ ہندوستانی، ہندوستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے اس لیے نحوی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سیکھا جائے اسی قدر بہتر ہے † " —

اس زبان کی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ کے احکام نقل کرنے کے بعد وہ ان برٹش افسروں اور دیگر اصحاب کے نام ایک پیام بھیجتا ہے جو ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں - وہ پیام یہ ہے :-

"جب سے مذکورہ بالا احکام نافذ ہوئے ہیں - بنگال گورنمنٹ نے بنگال، مدراس، اور بمبئی کے ملکی اور فوجی علاقوں کے لیے مشرقی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا ہے، ان سب میں ہندستانی بجا طور پر مقدم اور اہم خیال کی گئی ہے اور اس لیے تمام رائٹروں اور کیڈٹوں کو ہندوستان پہنچنے پر سکھائی جاتی ہے —

* **British India Monitor preface, X civ.**

† **British India Monitor preface, X civ.**

ہندستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ہر ایک ایسے اجنبی کے لیے لازم و لابد ہے جو عام طور پر اہل ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہے بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا رستہ بھی کھل جاتا ہے جہاں وہ ہندوستانی کے ذریعے سے جو ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہے، ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے —

بحری اور بری فوج میں نیز ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جیسا ہندوستانی کا اور کیڈٹوں کو جو فوجی اکیڈیمیوں میں اسے پڑھتے ہیں - یا فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ اکیڈیمیاں بنگال، مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئی ہیں —

جس طرح یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لیے بعض جدید اور قدیم زبانوں کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہے اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت فارسی، عربی وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ رکھتا ہے - لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہر شخص کے لیے ہندوستانی کا جاننا ایسا ہی ناگزیر ہے جیسا کہ انگلستان والوں کے لیے انگریزی کا جاننا اور اسی لیے ان حضرات کا جو ایسٹ انڈیز کو آنا چاہتے ہیں سب سے ضروری اور بڑا وصف یہی ہونا چاہیے کیونکہ دیر سویر ان پر صاف کھل جائے گا کہ ہندوستانی کے مقابلے

میں - یہ علمی زبانیں دوسرے درجے پر ہیں' اور بعد میں یہ زبانیں اس ملک میں زیادہ آسانی اور کم خرچ میں سیکھی جاسکتی ہیں —

اگرچہ داخل انگلستان و بیرون انگلستان کے چند سالہ تجربے کی بنا پر معروف و مسلم واقعات پر مبنی ہے تو پبلک بجا طور پر یہ امید رکھتی ہے کہ "ہرفورڈ" اور "مارلو" کے سول اور ملٹری کالجوں کے شعبوں میں ہندوستانی زبان کی تعلیم ان طلبہ کے لیے جو ہندوستان آنا چاہتے ہیں' سب سے مقدم خیال کی جائے گی - کیونکہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے انگلستان کے جج اور سول اور ملٹری کے عہدہ دار خود وہ کیسے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں وہ ہمارے ملک میں اپنے عہدوں کے بالکل نا اہل ثابت ہوں گے اگر وہ ہماری مادری زبان نہیں جانتے - اسی طرح ہندوستان میں ہندوستانی کا وہی درجہ ہے جو انگریزی کا برطانیہ میں یا ترکی کا اس کی سلطنت میں اور یہ ایک ایسی بات ہے جو راہ چلتا بھی سمجھ سکتا ہے" —

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مدراس کے ایک انگریز افسر کا خط بھی نقل کیا ہے جس میں منصلۂ ذیل اقتباس پڑھنے کے قابل ہے -

(خط ۱۹ جون سنہ ۱۸۰۲ ع کا لکھا ہوا ہے)

"ہندوستانی بولی کے متعلق میرا کچھ کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس کی وسعت اور قوت ان تمام اشخاص پر کافی طور سے آشکارا ہے جن کا تعلق ہندوستان کے کارو بار یا ادب

سے ہے، میری رائے میں صرف اس بولی کا معقول علم اس گورنمنٹ کے علاقوں کے ہر حصے کے لیے بالکل کافی ہے .... نواب آف ارکاٹ کے تمام علاقوں اور ٹیپو سلطان کی سلطنت بالا گھاٹ میں ہندستانی سے وہ سب اشخاص واقف ہیں جو سرکاری دفاتر میں مامور ہیں، نیز عام لوگوں کی بڑی تعداد اس زبان کو جانتی ہے" -

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور تصنیف "ایسٹ انڈیا گائڈ" میں تحریر فرماتے ہیں — کہ :-

"اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں خاص خاص بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن ہم جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ اگر فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی عام طور پر ایسی مفید اور ضروری نہیں جیسی ہندستانی ...

اب ہم اس دعوے کی تائید میں چند دلائل پیش کرتے ہیں جو بلا شبہ اس کی صداقت کا تشفی بخش اور دلنشین ثبوت ہوں گی -

ہندوستان کے وسیع ملک میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان پایا جائے گا جو مقامی اور ذاتی حالات یعنی خاندانی و تعلیمی وغیرہ کے لحاظ سے کم و بیش شستگی اور خوبی سے ہندستانی زبان نہیں بولتا یا نہیں سمجھتا - نیز ہر شریف ہندو یا وہ جس کا ذرا سا بھی تعلق کسی مسلمان حکومت یا برٹش گورنمنٹ سے ہے اپنے منصب اور حیثیت کے لحاظ سے ضرور اس زبان سے کچھ نہ کچھ واقف ہے —

علاوہ اس کے یہ ایک مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہل ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں -

اس بیان کی صداقت کی تائید میں ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی (ڈچ)، فرانسیسی، ڈین، عرب، ترک یونانی (گریک) ارمنی، گرجی، ایرانی، مغل اور چینی بھی ہیں جو اکثر باہم ہندستانی میں بات چیت کرتے ہیں، کیونکہ ان کی اپنی زبانوں کے مقابلے میں ہندوستان کی یہ لنگوافرینکا زیادہ سہولت بخش ہے، ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے اگرچہ ان افواج کے اکثر افراد اپنی اپنی حکومتوں، علاقوں، صوبوں اور اضلاع کی بولیوں کو مادری زبان کی حیثیت سے زیادہ بہتر جانتے ہیں ۔

تقریباً کیپ کامورن سے لے کر کابل تک سارا ملک جو طول میں دو ہزار میل اور عرض میں ۱۴۰۰ میل ہے اس میں جہاں جہاں گنگا بہتی ہے شاید ہی کسی بڑے گاؤں قصبے یا شہر میں جسے مسلمانوں نے فتح کیا یا جہاں مسلمان آباد ہیں کوئی ایسا شخص ملے گا جو اچھی خاصی طرح ہندستانی نہ جانتا ہو۔ اور گنگا سے بھی بہت پرے، نیز مشرقی جزائر کے سواحل پر بھی یہ زبان رائج ہے اور اس قدر معروف ہے کہ بہت آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے ۔

اگرچہ ہندستانی میں نثر کی بہت سی کتابیں مثلاً تاریخی، یا علمی تالیفات نہیں ہیں تاہم بہت سے شستہ قصے، اور دلکش نظمیں موجود ہیں۔ عام طور پر خانگی، تجارتی اور فوجی اور نہایت اہم سیاسی معاملات کے متعلق مراسلت اسی زبان میں کی جاتی ہے ۔ اور اس موقع پر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دیسی علماء کا درس اور مطالعہ ادب ہوا ... کی تمام بحثیں اور دلائل اسی زبان میں کی جاتی

هیں اور هر حالت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی هندوستان کا کوئی باشندہ اپنے کسی خیال یا مضمون کو کسی دوسری زبان میں لکھنا یا ترجمہ کرنا چاهتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ اسے فارسی مکتوب کے طور پر لکھے یا کوئی سیاسی تحریر قلمبند کرے وہ همیشہ اپنے خیالات کو هندوستانی میں ترتیب دیتا ہے' اور اپنا مفہوم اسی زبان میں ادا کرتا ہے —

اگر یہ تمام بیانات اور دلائل صداقت پر مبنی هیں تو ان کی قوت کو کون چیز کمزور کرسکتی ہے' اوپر کے صغریٰ کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سوداگر' سیاح' وکیل' ملا یا پادری' فلسفی' طبیب' غرض هر شخص کے لیے جو هندستان میں کسی قسم کا بھی کوئی کام کر رہا ہے یا یہاں امن و خوشی سے رهنا چاهتا ہے هندستانی زبان بہ نسبت کسی دوسری زبان کے عموماً نہایت ضروری اور مفید ہے - اور اس اعتبار سے سب سے مقدم اسی کا سیکھنا ہے اور اس کے بعد بوجہ ان اعلیٰ فوائد کے جو اسے باقی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بدرجۂ اتم حاصل هیں یہ نہایت درجہ قابل قدر اور لایق مطالعہ ہے" -

کول بروک جو بڑے عالم گزرے هیں - ایشیاٹک ری سرچز کی ساتویں جلد میں لکھتے هیں کہ یہ "شستہ زبان جو هندوستان اور دکن کے هر حصے میں بولی جاتی ہے یا جو تعلیم یافتہ دیسیوں نیز هندوستان کے بہت سے صوبوں کے ناخواندہ لوگوں میں باهمی گفتگو کا مشترک ذریعہ ہے اور جسے تقریباً هر جگہ نیز هر گاؤں کے اکثر باشندے سمجھتے هیں" —

ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنے ایک شاگرد رشید کا خط نقل کیا ہے جو بہت دلچسپ اور حقیقت افروز ہے' اس کے کاتب مشہور مسٹر منٹگمری هیں

جو اس وقت دلی کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھے اور بعد میں رزیڈنٹ کیا دلی کے آقا ہوگئے تھے - یہ خط ۲۹ اگست سنہ ۱۸۰۶ ع کا لکھا ہوا ہے - اس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں اردو کی کیا حیثیت اور وقعت تھی - وہ لکھتے ہیں —

" میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اس معاملے کے بارے میں قابل اطمینان اطلاع مہیا کرسکتا ہوں جس کے متعلق آپ کو قدرتی طور پر تشویش ہے —

ہندوستان کے ہر حصے میں جہاں جہاں میں ملازمت کے سلسلے میں رہا ' یعنی کلکتے سے لاہور کے قرب وجوار تک اور کوہستان کمائیوں سے نربدا تک افغانوں ' راجپوتوں ' جاٹوں ' سکھوں ' اور مختلف اقوام میں جو ان ممالک میں آباد ہیں - جس میں میں نے سفر کیا ہے ' میں نے اس زبان کا عام رواج دیکھا جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی ' یوں کہنے کو بہت سی بولیاں اور لہجے ہیں - اپنی بات سمجھانے یا دوسرے کی سمجھنے کے لیے اکثر بہت صبر کی ضرورت ہوتی ہے ' ہمارے کان ہمیشہ ان آوازوں سے آشنا نہیں ہوتے جو ہم سنتے ہیں - اول اول دیسی لوگ ہمارے لہجے اور ڈھنگ کو بغیر بار بار دہرائے نہیں سمجھتے - یہ دقت اکثر مقامات پر واقع ہوتی ہے - لیکن میں ذاتی تجربے نیز ان اطلاعات کی بنا پر جو مجھے دوسروں سے حاصل ہوئی ہیں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں کیپ کامرون سے کشمیر تک اور آوا سے دریائے سندھ کے دہانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو ہندستانی بول سکتے ہیں - میرے کہنے کا یہ منشا نہیں کہ میں ایسے لوگ مطلق نہ پاؤں گا جو یہ زبان نہیں بول سکتے ' کیونکہ

یہ ظاہر ہے کہ اس وسیع خطے میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بلکہ ایسا نہ ہو تو تعجب ہے لیکن ہندوستانی ہی وہ زبان ہے جو عام طور پر کار آمد ہے اور میری رائے میں اسے وہ عام وسعت حاصل ہے جو دنیا کی کسی زبان کو نصیب نہیں - میں ابھی اس زبان میں کچا ہوں لیکن جس قدر میرا جہل زیادہ ہے اسی قدر میری شہادت قوی ہے اور جہاں تک میری شہادت کا تعلق ہے، ہندوستانی کا بول بالا رہے گا - میرے خیال میں دنیا خاص طور پر آپ کی رہین منت ہے اور اسے آپ کی ان پر جوش اور مخلصانہ کوششوں کے لیے آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے جو آپ نے مشرقی ادب کی اس نہایت اہم شاخ کی اشاعت و ترقی میں فرمائی ہیں —

زبان دان اردو ہے ایسا کہ آج
ہے قانون ہندی کو اس سے رواج

میں نے جو کسی قدر طویل اقتباسات پڑھ کر سنائے ہیں اس سے میرا منشا یہ جتانا تھا کہ اردو زبان خاص کر اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی مقبولیت اور عالمگیری میں سب پر سبقت لے گئی تھی اور یہ رفتار اس کی برابر جاری رہی۔ چنانچہ موسیو دیویاں نے جو انسٹیٹیوٹ کے رکن اور سینٹ کے ممبر اور فاضل شخص تھے اپنی کتاب "اقوام کی پیدائش قوت میں" ایک باب ہندوستانیوں کے متعلق لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ، ۴۰ لاکھ ہے - آپ کو معلوم رہنا چاہیے کہ ان میں تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ

اردو زبان ہے ' یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبے کی سر زمین میں بولی جاتی ہے * —

گارساں دتاسی جو اردو زبان کے پروفیسر اور عالم اور اس کے بڑے حامی تھے اور جنھوں نے اپنے زمانے میں اردو کی یادگار خدمت کی اور ایسی عمدہ کتابیں لکھیں اور زبان کے متعلق ایسی قابل قدر معلومات مہیا کیں جو کوئی اپنی زبان میں بھی نہ کرسکا ' سنہ ۱۸۹۵ ع کے خطبے میں کہتے ہیں —

پھر بیچ لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت کچھ ہی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے ' دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جاسکتی ہے ' اس مسئلے کی نسبت کپتان ایچ ' مور نے جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے " بلا شبہ کچھ عرصے کے بعد ہندستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کر لے گی ' اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں ' ریل کی وجہ سے جو اندرون ملک میں ہزارہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہے ' ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقع ملا ہے - چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں - ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے اس لیے کہ اس کی ساخت میں

---

* خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۶۵ -

هندی فارسی، عربی کے عنصر شامل هیں - اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی هے کہ هندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورا کرے۔ میرے خیال میں هندستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات هیں اسی قدر هندستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود هیں " * —

یہ وہ زمانہ هے کہ اردو مقبول خاص و عام تهی اور اس کی مقبولیت کا ناقابل تردید ثبوت یہ هے کہ سنہ ۱۸۳۰ ع کے بعد جب فارسی کے بجاے اردو دفتری زبان قرار دی گئی تو کوئی آواز اس کے خلاف سننے میں نہیں آئی اور کسی نے یہ نہ کہا کہ اردو نہیں فلاں زبان هونی چاهیے - اس کی یہ متفقہ مقبولیت ایک مدت تک برابر جاری رهی، چنانچہ گارساں دتاسی، بمبئی گزٹ مورخہ ۲۹ فروری سنہ ۶۱ ع کے حوالے سے لکھتے هیں کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسراے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرض داشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی کہ جدید هائی کورٹ میں کارروائی اردو زبان میں هونی چاهیے - اس زمانے میں بمبئی کی نئی نئی یونیورسٹی قائم هوئی تهی - سنہ ۱۸۶۰ ع کے ڈگری کے امتحان میں اردو زبان بهی تهی، اور اس کے نصاب میں باغ و بہار، اخلاق هندی، مثنوی میر حسن اور دیوان ناسخ شریک تهے † -

یہ وہ زمانہ تها کہ اُن صوبوں کے هندو تعلیم یافتہ اور اهل قلم جہاں کی زبان اردو نہ تهی نیز انگریز مدبر اور حاکم تک عام جلسوں میں اردو میں تقریریں کرتے تهے - چنانچہ سنہ ۱۸۶۱ ع میں مہاراجا کشمیر کی

---

* خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۴۵۸ سنہ ۱۸۶۵ ع -

† خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۲۴ -

گدی نشینی کے موقع پر جموں میں جو دربار ہوا اس میں مسٹر ڈیوس جو اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمائندہ تھے جب نئے راجا کے سینے پر تمغہ لگا چکے تو مہاراجا نے ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا ۔

سر ، جے ، بی ، گرانٹ ، لفٹننٹ گورنر بنگال جب یورپ واپس جا رہے تھے تو اہل کلکتہ نے ۱۶ اپریل سنہ ۱۸۶۱ ع کو ان کے اعزاز میں ایک عام جلسہ منعقد کیا ، اس جلسے کے صدر رادھا کانت دیو بہادر تھے ، انھوں نے اس موقعے پر اردو میں تقریر کی ، ان کے بعد راجا کالی کشن بہادر نے جو مشہور مصنف گزرے ہیں تقریر کی اور وہ بھی اردو میں تھی - نیز ایک جلسے میں سر جان گرانٹ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کی تحریک ہوئی جو متفقہ طور پر منظور کی گئی - اس جلسے میں راجا اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ میں سر جان گرانٹ کا بت نصب کیا جائے - اسی طرح کلکتے کے ایک اور جلسے میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہار ہمدردی کیا جائے ، مختلف مقرروں نے ہندستانی میں تقریریں کی ، اور راجا نرائن سنگھ نے اس جلسے میں تجاویز کی تائید اردو میں کی ٭ شاہزادہ ویلز کی شادی کے موقع پر ہندستان میں ہر جگہ جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ہندستانی زبان میں تقریریں کی گئیں - فروری سنہ ۱۸۶۴ میں جب سر ہنری منٹگمری لفٹننٹ گورنر پنجاب ریاست کپورتھلہ تشریف لے گئے تو اس موقع پر صاحب موصوف نے مشن اسکول کے طلبہ کے سامنے ہندستانی میں تقریر کی - جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا جس میں مختلف ہندستانی

٭ خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۷۱ -

راجا ' امرا اور سرکاری عہدہ دار شریک تھے ' لفٹننٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں - اردو میں جلسے کو خطاب کیا -

جب سرجان لارنس وائسرائے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے ایک بڑا شاندار دربار آگرے میں منعقد کیا جب وائسرائے تخت پر بیٹھنے کے لیے تشریف فرما ہوئے تو توپوں کی سلامی دی گئی اور سر ولیم میور نے شاہی فرمان کا ترجمہ پڑھا اور خود وائسرائے نے حاضرین کے روبرو ہندستانی میں تقریر کی ' برٹش انڈیا ایسوسی ایشن مراد آباد میں لفٹننٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی نیز مدرسۂ مرادآباد کے افتتاح کے موقع پر بھی صاحب موصوف نے اردو ہی میں جلسے سے خطاب کیا - مہاراجا بنارس نے سنہ ۱۸۹۸ ع میں چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے اردو ترجمے کے لیے دس ہزار روپے منظور کیے بشرطیکہ حکومت بھی دس ہزار دے —

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں - ایک تو یہ کہ اردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں ' دوسرے ہندی اردو کے اختلاف کا مسئلہ کیونکر پیدا ہوا - میں پہلے دوسرے سوال کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ' بعض اصحاب کا جو یہ خیال ہے کہ سر سید احمد خاں نے نیشنل کانگرس سے مخالفت کر کے ہندی اردو کا اختلاف پیدا کیا ' سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے - یہ فساد سب سے اول سنہ ۱۸۶۷ ع میں بنارس سے اٹھا ' جہاں " بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی خط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے ' اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے "

" ہندوؤں کی اس قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی ' اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور

رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں، اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورۂ بالا مجلسیں اور سبھائیں - تھیں" * - اس کے بعد سے یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں طرح طرح سے اب تک چلا آرہا ہے جس کی تاریخ اور تفصیل کا یہ موقع نہیں، میں یہاں صرف مختصر طور پر اس کے اصل وجوہ پر غور کرنا چاہتا ہوں —

پہلے زمانے میں آج کل کی طرح زبان سیاست کے دنگل میں نہیں اتری تھی - لوگ جس زبان میں زیادہ سہولت دیکھتے یا جس زبان میں اشاعت کا زیادہ سامان پاتے اس میں لکھتے تھے، اور اکثر اہل قلم اپنی زبان ترک کردیتے اور غیر زبان میں لکھنا پسند کرتے تھے - ایک زمانے میں لاطینی سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی - اور بعض جرمن اور انگریز مصنفین لاطینی میں تالیف اور تصنیف کرتے تھے، اس میں کسی حکومت کا دباؤ نہ تھا بلکہ اپنے شوق سے کرتے تھے اور انہیں کبھی اس کا گمان تک نہ ہوتا تھا کہ ایسا کرنا قومیت یا وطنیت کے حق میں غداری ہے - فریڈرک اعظم اگرچہ کٹر جرمن تھا لیکن فرانسیسی بولنے اور لکھنے کو ترجیح دیتا تھا اور فرانسیسی لکھتے یا بولتے وقت اس کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس کے جذبۂ قومیت کے منافی ہے - یا ہمارے ملک کی مثال لیجیے - جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو ہمارے ہم وطن تعلیم یافتہ اکثر انگریزی میں بات چیت اور خط و کتابت کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں اگرچہ پہلا سا خبط اب نہیں رہا - اور

* حیات جاوید صفحہ ۱۴۰ -

جنھیں توفیق ہوتی انگریزی میں تصنیف تالیف بھی کرتے ہیں - انگریزی حکومت کا کوئی قانون ایسا نہیں کہ سوائے انگریزی کے کسی دیسی یا دوسری زبان میں تالیف نہ کی جائے - لوگ یہ سب کچھ اپنے شوق سے کرتے ہیں - بعینہ یہی حال مغلوں کی حکومت میں تھا جب کہ یہاں فارسی کا رواج ہوا - مغلوں کی حکومت میں ہندستانی کی کایا بدل گئی ؛ وہ اس ملک میں اپنے ساتھ نئے آئین ' اور نئے اصول حکومت اور نیا مذہب لائے ' انہوں نے نئی تنظیم اور نئی حکمت کو رواج دیا ' اور نئے تمدن اور نئی تہذیب اور نئی معاشرت کا دور شروع ہوا ' نئے آداب مجلس ' نئے رسم و رواج ' اور نئے ذوق نے رواج پایا ' ان کے ساتھ طرح طرح کے کپڑے ' قالین اور فرش فروش سامان آسائش ' نئے آلات جنگ ' نئے پھول اور پھل ' اور نئے قسم کے کھانے ' نئی قسم کی صناعی ' نئی قسم کی اصطلاحات اور الفاظ یہاں آئے اور رائج ہوئے - انہوں نے یہاں کے حالات میں ایک عجیب تغیر پیدا کردیا اور سارے ماحول میں ایک نیا رنگ روپ نظر آنے لگا - اس جدید ذوق ' اس جدید تہذیب اور جدید خیالات کے ادا کرنے کے لیے جو اس ماحول میں ساری تھے ' سوائے فارسی کے کوئی دوسری زبان نہ تھی - ایک تو اس لیے کہ اس زبان میں شیرینی ' لچک ' وسعت تھی ' الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ موجود تھا اور بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے بیان کے سانچے تیار تھے - دوسرے اس میں لکھنے سے تحریر اہل بصیرت اور اصحاب ذوق کی نظر سے گزرتی تھی اور ہندوستان ہی میں نہیں اس سے باہر بھی پہنچتی تھی اور تحسین حاصل کرتی تھی - تیسرے رواج کی پابندی اور ماحول کا اثر خود بخود اس طرف کھینچے لاتا تھا - چوتھے اس میں کسی قدر مشیخت

کا بھی شائبہ تھا - اس میں ہندو مسلمان سب برابر تھے، دونوں کی تحریریں پڑھیے ذرہ برابر فرق نہیں پایا جاتا - یہ اس لیے نہیں تھا کہ مغلوں نے فارسی سیکھنے کے لیے جبر کر رکھا تھا - ان کے عہد میں علم اور زبان کی عام آزادی تھی، بلکہ انھوں نے سنسکرت اور دوسری دیسی زبانوں کی بڑی سرپرستی کی جس کی وجہ سے انھیں بہت فروغ ہوا - چنانچہ ان کے عہد میں سنسکرت کے اعلیٰ مصنف اور سنسکرت اور ہندی کے بہت سے نامور شاعر ہوے ہیں - فارسی کی طرف یہ عام رجحان جدید حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا، ہندستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں زبان کے معاملے میں عام رواداری کا برتاؤ تھا اور لوگ غیر زبان بولنے اور غیر زبان لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے —

لیکن یہ آزادی اور رواداری دنیا میں زیادہ مدت تک نہیں رہی - ایک زمانہ آیا جب کہ مذہب اور عقیدے کی طرح زبان بھی سیاسی اہمیت میں آگئی - جرمنوں نے فرانسیسیوں کی نفرت کی وجہ سے فرانسیسی اور دوسری زبانوں کے لفظ اپنی زبان سے اسی طرح خارج کردینے شروع کردیے جیسے آج وہ یہودیوں کو اپنے ملک سے جلا وطن کر رہے ہیں - اسی طرح سیواجی کے زمانے میں مرہٹی زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکال دینے کی کوشش کی گئی - آئرلینڈ میں محض انگریزی کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جد و جہد جاری ہے - ترکوں نے اپنی زبان سے غیر زبانوں کے لفظ نکالنا شروع کردیے ہیں - ایران میں پہلے بھی ایک کوشش ہوئی لیکن ناکام رہی اب وہ پھر ترکوں کی طرح غیر زبانوں کے الفاظ نکال دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں - زبان کے لیے اب لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں، دوسری زبانوں کو مٹانے اور فنا کرنے کے لیے جابرانہ

احکام اور آئین نافذ کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شہروں اور مقاموں تک کے نام بدل دیے جاتے ہیں --

زبان اور قومیت اب ایک دوسرے کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں اور جب اس کے ساتھ مذہب بھی آ شریک ہوتا ہے تو یہ بادۂ تلخ دو آتشہ ہو جاتا ہے —

یہی صورت ہندوستان میں پیش آئی - سنہ ۵۷ ع کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی - انگریزی راج آیا - حالات نے پلٹا کھایا، جدید قانون نافذ ہوئے، جو آگے تھے پیچھے اور جو پیچھے تھے آگے ہوگئے چند ہی سال بعد قومیت کا خیال جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا اڑتا ہوا یہاں بھی پہنچا - ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراعوں، کالجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریروں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو اور اُکسایا - خاص کر ہنود اس سے زیادہ متاثر ہوئے، وہ اس نئے دور کو اپنے حق میں آزادی کا دور سمجھے، اس کے ساتھ ہی اپنی شاندار قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی دلوں میں نیا جوش پیدا کیا جسے میکس مولر نے ابھارا اور جس سے بعد میں اینی بزانٹ نے خوب کام لیا - لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا، گرو کل قائم ہوئے جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا، ویدک زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی، ننگے پاؤں پھرنا - ایک بے سلی چادر اوڑھنا لپیٹنا، جنگلوں میں رہنا، زیر سما سونا وغیرہ وغیرہ قومی شعار قرار پایا - اسی قومیت کے جذبے، مقدس قدامت اور ماضی کے غرور، نام نہاد نئی آزدی، اور نئی تعلیم نے اس میں نشے کی سی

کیفیت پیدا کردی تھی - وہ طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتانے لگے، اور جس طرح ایک بیوقوف عورت نے اپنی خوبصورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی انھوں نے بھی بنے بنائے گھر کو بگاڑنا شروع کیا - سب سے پہلے نزلہ اردو زبان پر گرا - اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی - یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں اس نے جنم لیا لیکن صرف مسلمان اس کے ذمہ دار نہیں ہیں یہ در حقیقت اس زمانے کے ماحول اور اس تمدن اور تہذیب کی مخلوق تھی جو مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئی اور جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں اور اردو کے بنانے میں تو (یہ میرا ذاتی خیال ہے) ہندو شریک غالب تھے - اور چونکہ یہ اس ماحول میں پیدا ہوئی جس کی تعمیر ہندو مسلمان دونوں کے ہاتھوں سے ہوئی اس لیے اس میں بہ نسبت کسی دوسری ہندی زبان کے عربی، فارسی کے الفاظ زیادہ تھے - اور وہ بھی سب ملا کر کتنے ؟ بقول مولانا حالی " جتنا آٹے میں نمک " - حیرت ہے کہ آریا اس ملک میں آئیں اور ہندی کہلائیں، مغل، ترک، عرب یہاں آباد ہوں اور ہندستانی بن جائیں، اور بیسیوں قومیں یہاں آئیں اور دیسی ہو جائیں لیکن بقول عورتوں کے " جنم جلے " لفظ ہی ایسے ہیں جو صدہا سال رہنے سہنے کے بعد بھی غیر کے غیر ہی رہے اور اپنے نہ ہونے پائے - اب انھیں محض اس شبہے پر کُرید کُرید کر اور اکھیڑ اکھیڑ کر نکالنا نادانی نہیں دیوانہ پن ہے - قومی غرور میں اکثر ایسا ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر حرکتیں سرزد ہوتی ہیں، مثلاً جرمنوں نے لفظوں پر مشق کرتے کرتے انسانوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا - حالانکہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب لفظ ہماری زبان

میں آگیا اور رس بس گیا تو وہ پھر زبان کا نہیں رہتا، ہمارا ہو جاتا ہے اسے اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت - وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا اور کوئی اسے وہاں گھسنے نہ دے گا - اس کے علاوہ اصل زبان کا اس میں کوئی نقصان نہیں، نقصان ہے تو اس زبان کا جس میں یہ آکر بس گئے تھے اور جن کی وجہ سے اس زبان کی رونق، وسعت اور قوت اظہار میں اضافہ ہوگیا تھا —

زبان کی یہی گت اس ہندی اردو جھگڑے میں بنی، عربی، فارسی ہی کے نہیں بلکہ ہندی کے معمولی لفظ بھی جو عام طور پر بول چال میں رائج ہیں خارج اور ان کی جگہ سنسکرت کے اصل لفظ داخل کیے جا رہے ہیں - یہ زبان کا بنانا نہیں بگاڑنا ہے —

بعض حضرات نے اس نزاع کا الزام سر سید احمد خاں کے سر تھوپا ہے، ان کا بیان ہے کہ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کی تو ہندی اردو کا جھگڑا پیدا ہوا - یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، جب یہ جھگڑا اٹھا ہے تو اس وقت کانگرس کا وجود بھی نہ تھا - اس کے متعلق خود سر سید کا بیان موجود ہے، ہم اسے کیوں نہ دیکھیں - وہ علی گڑھ کی تعلیمی سروے میں ایک جگہ لکھتے ہیں - "تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں - مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت

اور ان کی شاہنشہی ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جاے، اس وقت سے مجھہ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں باہم متفق ہوکر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے - میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے، اس کی ابتدا اسی سے ہوئی" جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے، اس کی ابتدا سنہ ۶۷ ع میں بنارس میں ہوئی اور ایسے برے وقت ہوئی کہ اب تک ختم ہونے کو نہیں آئی، بلکہ دن بدن زور پکڑتی جاتی ہے - لیکن اس وقت بھی بعض منصف مزاج اور عاقبت اندیش ہندو اہل قلم نے اس نئی تحریک کی مخالفت کی، چنانچہ سنہ ۱۸۹۹ ع میں منشی حکم چند پروفیسر دہلی کالج نے ایک مدلل اور محققانہ مضمون اس کی مخالفت میں لکھا، پروفیسر موصوف زبانوں کی حقیقت اور ارتقا وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :—

"میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی (مخلوط) زبان میں کیا خاص فرق ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی کہی جاسکتی ہے جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہوگئے ہوں، اگر کوئی ایسی زبان موجود ہو تو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں، میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھہ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کرلیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی ہم خالص زبان کہہ سکتے ہیں- دراصل یہ تمام امور اردو زبان کی بحث سے خارج ہیں اس واسطے کہ اردو

ایک زندہ زبان ہے' اور اس قدر زمانے سے ہندوستان میں استعمال کی جارہی ہے کہ اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھایا جاسکتا۔ یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہے کہ آیا اردو ایک خالص زبان ہے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہے - اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس جگہہ ہندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کردیا گیا ہے اور جس کی حیثیت اب ایسی ہی ہے جیسی کہ سنسکرت کی - ایک زمانہ تھا جب دلی والے جامہ پہنا کرتے تھے ' لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کردیا ہے اب اگر کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جاے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اکثر لوگ بہروپ سے تعبیر کریں گے - زبانوں کا بھی یہی حال ہے اب اگر آپ " بدن " کی جگہہ " شریر " اور شہر کی جگہہ " سنگھہ " استعمال کریں تو لوگ آپ کی بات سمجھنے سے قاصر رہیں گے - فارسی رسم خط کی جگہہ جو ناگری رسم خط استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کا بھی یہی حال ہے - دراصل اگر ایک دفعہ بدیسی الفاظ کسی زبان میں چل جائیں تو زبان خالص بنانے کے لیے انہیں بیدخل نہیں کیا جاسکتا اور نہ رسم خط بدلا جاسکتا ہے فردوسی نے شاہنامے میں عربی الفاظ استعمال نہیں کیے لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی ' انوری ' نظامی وغیرہ اس کا تتبع کرسکے؟ برخلاف اس کے ان کے یہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوے ہیں - اس اصول پر ہم اردو میں عربی ' فارسی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں؟ شہروں میں ہر چھوٹا بڑا اردو بولتا ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے ' اردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہورہا ہے - اردو میں دوسری زبانوں کے مطالب بیان کرنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے " -

اسی رسالے میں گارساں دتاسی لکھتے ہیں کہ " باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اردو ہندستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلم ہے - ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دوران سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے آج کل ساوتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادہ البرٹ کی جو نمائش ہو رہی ہے اس کے نیچے اردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہے " -

اسی مضمون میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں " اگرچہ صوبۂ بنگال کی زبان بنگالی ہے لیکن اردو جیسا کہ میں پیشتر بوضاحت بیان کر چکا ہوں وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے - چنانچہ راجا کالی کرشن پرشاد نے حال میں ملکۂ وکٹوریہ کی سالرہ کے موقع پر سنسکرت میں جو نظم لکھی تھی اس کا اردو میں ہی ترجمہ شائع کیا ہے ' جس کی ایک نقل انہوں نے مجھے بھی بھیجی ہے - یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کا بنگالی ترجمہ شائع نہیں کیا " -

پھر لکھتے ہیں " اگر کوئی ہندو اسلامی حکومت کو برا کہے اور انگریزی نظم و نسق کا مداح ہو تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ' لیکن عربی ' فارسی اور اردو جیسی زبانوں کے ساتھ تعصب برتنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا - بابو شیو پرشاد جیسے عالم فاضل شخص سے مجھے اس کی توقع نہ تھی ' اس لیے ان کی تحریر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا - بابو صاحب خود اردو نہایت عمدہ لکھتے ہیں اور متعدد تصانیف اس زبان میں شائع کرچکے ہیں - یہ خواہش کرنا کہ ہندستان میں سوائے سنسکرت ہندی یا انگریزی کے اور کسی زبان کی تحصیل ہی نہ کی جائے میرے خیال میں تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے ' میں سید احمد خاں کی طرح اس باب میں زیادہ وسیع مشرب واقع ہوا ہوں " —

اس زمانے میں اس نئی تحریک پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں اور
دونوں فریق نے تائید و تردید میں خوب خوب دل کا بخار نکالا اس زمانے کا کوئی
اخبار یا رسالہ شاید ہی اس بحث سے خالی ہو - اس کے بعد کچھ عرصے کے
لیے یہ بحث دھیمی پڑ گئی اور لوگ سیاسی اور معاشرتی مسائل کی طرف
متوجہ ہو گئے - لیکن سر انٹنی میکڈانل کے عہد جبروت مہد میں اس دبی آگ
کو پھونکیں مار مار کر سلگایا گیا - اور ابھی کچھ دنوں دم نہ لینے پائے تھے کہ
شدھی اور سنگھٹن نے وہ شعلے بھڑکائے جن کی آنچ اب تک کم نہیں ہوئی ہے
اور جو آتا گیا ایک آدھ کپا تیل کا اور لنڈھاتا گیا ـــ

انگریز بہت خوش اقبال ہے کہ ہر قرن اور ہر دور میں کوئی نہ
کوئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ ہم آپس میں کٹ مرتے ہیں اور وہ اس
کے مزے لیتا ہے ــ

رشید احمد صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ میں ہندی اردو کے قضیے
سے بیزار ہوں - ان سے زیادہ میں بیزار ہوں، میں اب سے پہلے کبھی اس
بحث میں نہیں پڑا تھا، یہ میرے شعار کے خلاف تھا بلکہ جہاں کہیں میں
نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت ہی کی - جامعۂ عثمانیہ میں ہندی کے
رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل تھا - تین سال
کا ذکر ہے کہ جب مدراس میں بعض پروفیسروں اور دیگر صاحب ذوق اصحاب
نے اردو اکاڈیمی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت احاطۂ مدراس میں ہندی کی اشاعت
اور پراپیگنڈے کا بھی ذکر آیا تو میں نے یہی کہا کہ ہمیں ہرگز اس کی مخالفت
نہیں کرنی چاہیے، جس قدر ان میں ہندی کا زیادہ رواج ہوگا اسی قدر
وہ ہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندوستان
کی کوئی زبان اردو سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہے - (افسوس ہے

کہ مجھے قربت کا لفظ استعمال کرنا پڑا جس سے دوئی کی بو آتی ہے'
حالانکہ کچھہ پہلے ہماری ایک ہی زبان تھی) - لیکن جب میں نے دیکھا
کہ واقعات کا خون کیا جارہا ہے اور دانستہ یا نادانستہ طرح طرح کی
غلط بیانیاں پھیلائی جارہی ہیں تو مجھہ سے نہ رہا گیا اور میں نے
جھجھکتے جھجھکتے اپنی طبیعت کے خلاف اپنی کم زور آواز اور اس سے
بھی کم زور اپنے قلم سے کسی قدر کام لیا - مجبوری میں آدمی کو کبھی
کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے —

حال میں اس معاملے میں دو قسم کی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں
ایک یہ کہ ہندی دو ہزار برس سے یہاں جاری ہے اور یہی ہندستانی
زبان ہونا چاہیے - ہندی کا لفظ عام ہے' اس کا اطلاق برج بھاشا' اودھی'
بندیلی بگھیلی راجستانی' بھوجپوری' میتھلی' چھتیس گڑھی وغیرہ وغیرہ
پر اس طرح ہوتا ہے جس طرح اردو پر ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک زمانے
میں ہندی کہلاتی تھی - مگر وہ ہندی جس کی خاطر یہ سارا طوفان
برپا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو بقول شخصے جمعہ جمعہ آٹھہ دن ہوتے ہیں -
فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے (خدا ان کی ارواح کو شرمائے) بیٹھے بٹھائے
بلا وجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا للو جی لال نے جو اردو کے زبان داں
اور اردو کتابوں کے مصنف بھی تھے' اس کی بنا ڈالی وہ اس طرح کہ
اردو کی بعض کتابیں لے کر انہوں نے ان میں سے عربی' فارسی لفظ چن چن کر
الگ نکال دیے اور ان کی جگہہ سنسکرت اور ہندی کے نامانوس لفظ
جمادیے' لیجیے ہندی بن گئی- جدید ہندی کی تاریخ سے جو واقف ہیں
وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی' یہاں میں
بخوف طوالت ان رایوں کو نقل نہیں کرنا چاہتا — اور یہی وجہ ہے کہ وہ

مشکل ہے اور بھدی ہے - فلنز ایڈورڈ ہال جو ایک جید عالم ہوے ہیں اور ہندی زبان کے بڑے حامیوں میں سے تھے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہے دراصل بالکل جدید زبان ہے اور انیسویں صدی کے خاتمے پر جو ہندی رائج ہوگی وہ بہت مختلف ہوجاے گی"۔ ان کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی --

دوسری غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ اردو کو مسلمان بادشاہوں نے حکومت کے زور سے پھیلایا اور اس وقت ہندوؤں نے بحالت مجبوری سیاسی مصلحت سے قبول کرلیا - یہ بیان سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہے' یہ بات اگر کوئی اور کہتا تو قابل التفات نہ ہوتی لیکن یہ الفاظ ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جو اردو اور ہندی دونوں کا مسلم ادیب تھا اور اپنے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے معمولی آدمی نہ تھا۔ اس لیے اور بھی زیادہ تعجب اور افسوس ہوتا ہے - اردو زبان کی تاریخ ایسی صاف اور کھلی چیز ہے کہ اس پر بحث کرنے یا اس بیان کی تردید کرنے کی مطلق ضرورت نہیں معلوم ہوتی - مسلمان بادشاہوں کے دربار اور دفتر کی زبان ہمیشہ فارسی رہی' ان کو اتنی توفیق ہی نہ ہوئی کہ وہ غریب اردو کی طرف توجہ فرماتے' اور توجہ کی تو کس وقت جب نہ سلطنت رہی' نہ حکومت' اور ظاہر ہے ایسے وقت میں ان کا اثر ہی کیا ہوسکتا ہے - اردو زبان جدید ہندی کی طرح کسی نے بنائی نہیں؛ وہ تو خود بخود بن گئی اور ان قدرتی حالات نے بنائی جن پر کسی کو قدرت نہ تھی - اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اور اگر ہندوؤں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی مسلمان بادشاہوں پر یوں تو بہت سے الزام

عائد کیے گئے ہیں لیکن یہ بالکل نیا الزام ہے اور حال ہی میں گھڑا گیا ہے —

حضرات! اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہوئے - سب سے بڑی وجہ اس کی مقبولیت عام کی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد عوام کی زبان پر رکھی گئی تھی جو بول چال کی زبان تھی - خود اردو کا لفظ ہی اس کی اصل اور ابتدا کا پتا دیتا ہے - اس وقت جتنی شائستہ اور اعلیٰ درجے کی زبانیں ہیں - جن کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھی ہوئی ہے وہ ایک وقت میں عوام کی معمولی بولیاں تھیں اور حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، یہاں تک کہ خود اہل زبان اس میں لکھنا پسند نہ کرتے تھے - بعینہ یہی حال پہلے پہلے اردو کا بھی تھا - اس کے بولنے والے بھی اس میں لکھتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور جو کبھی کوئی لکھتا اور وہ بھی مذہبی ضرورت سے ہوتا تھا، تو پہلے معذرت کرتا کہ چونکہ سب عربی فارسی نہیں جانتے اس لیے ان کے خیال سے اس زبان میں لکھ رہا ہوں، لیکن آخر یہی عوام کی بولی رفتہ رفتہ شائستہ اور ادبی زبان بن گئی، اور اس کا تعلق برابر عوام کی بولی سے رہا - میں نے جو بھارتیہ ساھتیہ پرشد کے جلسے میں یہ کہا تھا کہ اردو میں ہندی زبان کے الفاظ اور محاورے اور امثال جدید ہندی کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں تو یہ میں نے محض دھونس بٹھانے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ امر واقعی ہے ادبی زبان بننے پر بھی وہ عوام کی بولی سے جدا نہیں ہوئی، برخلاف جدید ہندی کے کہ وہ کتابی زبان ہے - انہیں جب کبھی الفاظ کی ضرورت پڑی تو انہوں نے سنسکرت کے ذخیرے کو ٹٹولا، ہمارے پاس پہلے سے ہندی کے لفظ

موجود تھے اور بعد میں بھی ہم نے ہندی سے نئے لفظ لینے میں بخل نہیں کیا - عوام کی زبان مثل قلب کے ہے جس سے تمام اعضا کو خون پہنچتا رہتا ہے اور ان کی تقویت کا باعث ہوتا ہے - جب تک زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی رہتی ہے اور وہ عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے تو وہ زندہ رہتی ہے اور جس وقت سے اس کا تعلق عوام کی بولی سے منقطع ہوجاتا ہے تو اسی وقت سے اس پر مردنی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں - چنانچہ یونانی ' سنسکرت لاطینی جو دنیا کی کامل اور بہترین زبانیں خیال کی جاتی ہیں - اسی لیے مردہ ہوگئیں —

البتہ اردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا کہ ہمارے شعرا نے اکثر ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا' اور ان کے بجائے عربی فارسی کے لفظ بھرنے شروع کیے ؛ اور یہی نہیں بلکہ بعض عربی فارسی الفاظ جو بہ تغیر ہئیت یا بہ تغیر تلفظ اردو میں داخل ہوگئے تھے ' انہیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "اصلاح زباں" رکھا - یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلف اور تصنع ہمارے ادب پر چھاگئے تھے ' شاعری ضلع جگت ہوگئی تھی ' سخنوروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا ' شاعر کا مقصد کچھہ کہنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا کام قافیے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا ' ان میں صنائع و بدائع کا رنگ بھر دینا ' قافیہ ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نباہ دینا رہ گیا تھا - اس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری رنگ برنگ لفظوں کا ایک ڈھانچا تھی جس پر طرح طرح کی نقاشی کی ہوئی تھی لیکن اس میں جان نہ تھی - اور ہماری زبان ایک ایسی زبان ہوگئی تھی کہ اسے بہت کم انسان بولتے تھے - غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان ' بے لطف

اور بے اثر بنا دیا تھا —

لیکن یہ دور تاریکی چند روزہ تھا، اس کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام سید احمد خان نے کیا - اس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی، اگرچہ اس کی زبان اور اس کا انداز بیان سادہ تھا لیکن اس میں فصاحت، اثر اور قوت تھی - اس نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا نیا ڈول ڈالا، اور موافق و مخالف دونوں نے اس کی پیروی کی - اور اس کے رفقا یعنی نذیر احمد، شبلی، حالی، ذکاءاللہ خاں وغیرہ نے اسے اور چمکایا اور بڑھایا - سید احمد خان کا اردو پر بڑا احسان ہے اس نے صرف ہمارے ادب ہی کو نہیں بنایا اور سنوارا بلکہ ہر موقع پر جب ضرورت پڑی اس کی حمایت کی اور اس پر آنچ نہ آنے دی - سر سید کی وجہ سے اب اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا ہے جو "علی گڑہ اسکول" کے نام سے موسوم ہے —

اس نئے اسکول نے پھر عام بول چال کی طرف رجوع کی اور خاص کر نذیر احمد، حالی، آزاد، ذکاءاللہ نے ان الفاظ کو جو گھروں کے کونوں کھدروں، گلیوں بازاروں اور کھیتوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے چن چن کے نکالا انہیں جھاڑا پونچھا، صاف کیا، جلا دی اور ان میں سے بہت سے اچھوتوں کو مسند عزت پر لا بٹھایا - اس نئے خون نے جو ہمیشہ ہماری زبان کی رگ و پے میں پہنچتا رہا ہے، ہمارے ادب کی رونق اور تازگی کو دو بالا کردیا —

حضرات - اردو کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو قابل غور ہے - جس وقت یہ زبان وجود میں آئی تو ملک میں جتنی بولیاں

مروج تھیں وہ سب اپنے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور حلقوں میں محدود تھیں' یہ زبان قدرت سے ایسے ماحول اور ایسے حالات اور اس قسم کے اثرات کے تحت بنی تھی اور اس طرح سے اس کی ترکیب عمل میں آئی تھی کہ وہ خود بخود ملک کے اکثر خطوں میں پھیلتی چلی گئی اور لوگ اسے قبول کرتے چلے گئے۔ ملک میں کوئی دوسری بولی یا زبان ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی' اور جتنی بولیاں یا زبانیں تھیں وہ اپنے حلقے سے باہر نہ بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں' یہی وجہ ہے کہ جب اہل یورپ اور خصوصاً انگریز اس ملک میں آئے تو انہوں نے اسے ہندستانی یعنی ہندوستان کی زبان سے موسوم کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب فارسی کے بجائے اردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی تو کسی نے اختلاف نہ کیا اختلاف ہوتا تو کس بنا پر؟ کوئی دوسری زبان ایسی تھی ہی نہیں جو ہندستانی ہونے کا دعویٰ کرتی —

اردو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ وہ عورتوں کی زبان ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہے لیکن اردو زبان میں یہ امتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اردو نے جس خطے میں جنم لیا یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی ہے اسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت کچھ فرق پیدا ہوگیا' عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرز بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہوگئی عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں

کی نظر نہیں پڑتی- پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امور خانہ داری، بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے تعلق جتنے معاملات ہیں اس میں صرف ہوتا ہے اور اس اقلیم میں ان کی عملداری کامل ہوتی ہے- پھر ان کی زبان اور لہجے میں لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہے اس لیے انہوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ، محاورے، اور مثلیں بنائی ہیں وہ بڑی لطیف، نازک خوبصورت اور سبک ہیں- وہ گیت جو عورتوں نے بنائے ہیں بہت ہی پر لطف اور دلکش ہیں اور نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابل قدر ہیں، ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بد تمیزی سمجھا جاتا ہے یا جن کے کہنے میں شرم و حجاب مانع ہوتا ہے، عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں بلکہ وہ اس مفہوم کو لطیف پیرایے میں یا تشبیہ اور استعارے کے رنگ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کرجاتی ہیں- عربی فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا وہ انہیں بہت سڈول بنالیتی ہیں، بعض اوقات ان کے معنے تک بدل جاتے ہیں اور وہ خالص اردو کے لفظ ہوجاتے ہیں- ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں یا عربی فارسی کے لفظ ہیں تو انہیں ایسا تراشا ہے کہ ان میں اردو کی چمک دمک پیدا ہوگئی ہے- اب جدید حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی ہے- ریختی گو شعرا کا بڑا احسان ہے (اگرچہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انہوں نے اس زبان کو محفوظ کردیا ہے- اس زبان کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ اور محاورے اور مثلیں ادبی زبان

میں آگئی ہیں اور ہمارے ادب کی زیب و زینت ہیں - اسی زمانے میں نذیر احمد ' حالی ' سید احمد دہلوی ' راشدالخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنف نازک کی اس پاکیزہ زبان کا اکثر حصہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہوگیا ہے - اس کے اضافے سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حسن ہی نہیں پیدا ہوا بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی -

حضرات ! آج کل ہر طرف سے یہ آواز سنائی دی جارہی ہے کہ " سادہ زبان لکھو - سہل لکھو " گویا سادہ اور سہل لکھنا معمولی بات ہے - ایک ادیب کا قول ہے کہ " ایک اعلیٰ درجے کے باکمال شخص اور ایک احمق میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے - اور وہ ہے - سادگی " ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھہ لطف بیان اور اثر بھی ہو ' صرف باکمال ادیب کا کام ہے - محض سیدھے سادے لفظ جمع کردینا اور سپاٹ بے لطف ' بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے - ہر شخص کا طرز اور اسلوب بیان جدا ہوتا ہے ' ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کرسکتا کہ یوں نہیں یوں لکھو - حکم سے یا فرمائش سے کسی کو سادہ لکھنا نہیں آسکتا - زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ ایسے مضمون یا مقتضائے حال کے مطابق جو الفاظ موزوں اور بر محل ہوں استعمال کرے - جب ہم کسی بچے یا کسی گنوار سے باتیں کرتے ہیں ' بچوں کے لیے کوئی کتاب لکھتے ہیں تو خود بخود سادہ زبان استعمال کرتے ہیں ' سادہ یا مشکل ' فصیح یا سلیس لکھنا حالات اور ضرورت پر منحصر ہے اور زیادہ تر لکھنے والے پر اس کا انحصار ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کس سے کہنا چاہتا ہے ہماری زبان ہمیں عوام سے ' ان پڑھ لوگوں سے گنواروں سے ' سپاہیوں سے پہنچی

ہے اور اس لیے اس کا تعلق کبھی عوام سے منقطع نہیں ہونا چاہیے - بڑا آدمی وہ ہے جس کی آواز سیکڑوں ' ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اس سے بھی بڑا وہ ہے جس کی آواز لاکھوں کروڑوں تک پہنچتی ہے اور دنیا میں سب سے بڑا وہ ہے جس کا پیام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا - سید احمد خاں بڑا شخص ہوا ہے کیونکہ اس کی آواز لاکھوں آدمیوں تک پہنچتی تھی ' اس لیے کہ اس کی تحریر سادہ پر اثر اور پر خلوص تھی - اگر ہم میں اپنے بھائیوں کا درد ہے تو ہماری تقریر اور تحریر ضرور سادہ اور سہل ہوگی - لیکن بیچارے ادیب یا مصنف ہی کی گردن دبانا کہ " تو سہل لکھہ " ٹھیک نہیں ہے - ہمیں دوسرے پہلو کو بھی دیکھنا چاہیے - آسان اور مشکل اضافی کلمے ہیں - ممکن ہے کہ جو چیز مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے وہ آپ کے لیے آسان ہو اور جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ آپ کے لیے مشکل ہو - انگریزی کی ایک بہت آسان کتاب لیجیے اور اس کا ترجمہ اردو میں کیجیے - اردو میں آکر یہ آسان کتاب مشکل ہوجاتی ہے - کیوں؟ اس لیے کہ اصل کتاب جس ملک والوں کے لیے لکھی گئی تھی وہاں تعلیم عام ہے ' پڑھے لکھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے - وہ الفاظ اور محاورے اور اصطلاحیں جو اس کتاب میں آئی ہیں انہیں وہاں بچہ بچہ جانتا ہے اب جو ہم نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو پڑھے لکھے بھی اسے نہیں سمجھتے ' پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف بعض وقت خود مترجم نہیں سمجھتا کہ میں نے کیا لکھا ہے - اسی لیے جہاں سادہ لکھنے کی فرمائش اور چیخ پکار ہے وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بھی کوشش کرنی

چاھیے ' پھر کچھہ ناخواندہ طبقہ ذرا اوپر اُٹھے گا اور کچھہ ھمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جھکیں گے ' اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے —

یہ کچھہ ایسی مشکل نہیں ہے - لیکن ھماری مشکلات اور بھی ھیں اور ان کی طرف اب خاص طور پر توجہ کی جا رھی ہے مگر اب تک ان کے حل کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی - ان میں سے ایک علمی اصطلاحات کا ترجمہ ہے - میں اس کے متعلق بہت کچھہ کہنا چاھتا تھا' لیکن یہاں نہ اتنا وقت ہے اور نہ مجھے اتنی فرصت ملی کہ تفصیل سے کچھہ لکھتا ' لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا چاھتا ہوں کہ ہم نے جو اصطلاحات کو ہوا بنا رکھا ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں - قدیم زمانے میں پروھتوں اور مذھبی پیشواؤں نے مذھب کو اور اھل علم نے علم کو پر اسرار بنا رکھا تھا - وہ عام آدمی کو اس کا اھل نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے علم ایک خاص طبقے کے قبضے میں رھتا تھا - عام کرنے سے ان کے اقتدار میں فرق آتا تھا - اسے قائم رکھنے کے لیے انہوں نے ایسی اصطلاحات گھڑلی تھیں جنھیں دیکھتے ھی آدمی مرعوب ہوجائے - یہ خیال تو رفتہ رفتہ جاتا رھا لیکن اس کا اثر باقی رہ گیا - آپ نے انگریزی میں لاطینی اور یونانی زبانوں سے مشتق اصطلاحیں دیکھی ہوں گی جو بہت بے ڈھنگی بے ڈول اور بھیانک ھیں ' ھمیں اس کی تقلید نہیں کرنی چاھیے ' جہاں تک ممکن ہو ھمیں اصطلاحات کے لیے ایسے الفاظ رکھنے چاھئیں کہ ایک معمولی لکھا پڑھا شخص بھی اس کے کسی جزو سے واقف ہو اور لفظ اور مفہوم میں جو تعلق ہو اسے تھوڑا بہت پالے ' اس سے اُسے معنی کے سمجھنے

میں بھی آسانی ہوگی اور اصطلاح کے یاد رکھنے میں بھی —

اسی طرح رسم‌الخط اور املا کی اصلاح اور سہل بنانے کا مسئلہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ٹائپ کے بنانے کا مسئلہ ہے جو ہماری زبانوں کے لیے موزوں ہو —

یہ سب مسائل ہماری توجہ کے قابل ہیں - ہمیں ایک طرف اپنے ادب کو مستحکم اور علوم و فنون سے مالا مال کرنا ہے اور دوسری طرف اپنی زبان کی اشاعت منظور ہے، اسی لیے ان تمام وسائل اور ذرائع پر غور کرنا ہمارا فرض ہے جو ہماری زبان کو زندہ رکھنے، اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں، ان تمام امور پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن انجمن ترقیء اردو ان سب پر غور کررہی ہے اور انشاءاللہ جلد ان کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گی -

اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ ہماری زبان ہی ایسی زبان ہے جو سارے ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہوسکتی ہے، اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم سچے دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبان ہماری تہذیب اور ہماری زندگی کا جز ہے تو صاحبو! اگر ہمیں اس کے لیے زیادہ نہیں تو تھوڑا سا تردد، تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کریں اور اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ جب کوئی دوسرا اس کے لیے سرگردانی کے لیے تیار ہو تو اس کا ہاتھ بٹانے میں دریغ نہ کیا جائے —

غزل

از

جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی بی ' لٹ (آکسن) آئی - سی - ایس (بنگال)

۱ - رہ وفا میں جو آج تک ہم کیا کیے ہیں کیا کریں گے
'یہی نا' دیوانہ لوگ ہم کو کہا کیے ہیں کہا کریں گے

۲ - اُنہیں مبارک ہو عیش پیہم ' رہیں ہمیشہ وہ شاد و خرم
ہمارا کیا ' جیسے آج تک ہم جیا کیے ہیں جیا کریں گے

۳ - رہے جو بلبل کا دل ہے خونیں' نہ اس سے بدلیں گے یاں کے آئیں
گلوں کی جانب تو دست گلچیں بڑھا کیے ہیں بڑھا کریں گے

۴ - ملائیں گرچہ نہ ہم نگاہیں' وہ ڈھونڈھ ہی لیں گی اپنی راہیں
یہ کانٹے وہ ہیں جو دل کے اندر چبھا کیے ہیں چبھا کریں گے

۵ - جو کُھل کے ملنا نہیں گوارا تو پھر نہیں کوئی اور چارہ
سوائے اس کے کہ ان سے چھپ چھپ ملا کیے ہیں ملا کریں گے

۶ - جو دل کہے گا وہ ہم کریں گے' رہیں' جو ہیں دوش پر فرشتے
ہمارے اعمال یہ تو بیٹھے لکھا کیے ہیں لکھا کریں گے

۷ - کسی کے ہنسنے کی ہو جو پروا ' تو پھر کوئی کام کر چکے ہم
کہ ہنسنے والے جو ہیں ہمیشہ ہنسا کیے ہیں ہنسا کریں گے

۸ - نہ پار کرنے کی کوئی کوشش نہ ڈوب جانے کی کوئی خواہش
ازل سے دھارے میں عشق کے ہم بہا کیے ہیں بہا کریں گے

۹ - ہے ان میں اک بات ہی کچھ ایسی کہ پڑھ کے سیری ہوئی نہ ہوگی
تمہارے اشعار ہم تو ' فضلی ' پڑھا کیے ہیں پڑھا کریں گے

ادبی معلومات

(مرتبۂ "ناخدا")

———:o:———

ادبی معلومات

زبان کا مسئلہ

ہماری سمجھ میں اب تک نہ آیا کہ زبان کے مسئلے کو لوگ اتنا پیچیدہ کیوں بنا رہے ہیں۔ زبان کی غایت اور مقصد یہ ہے کہ باہمی تعلقات اور میل جول میں آسانی ہو۔ حکومت کی تو بات ہی نرالی ہے۔ وہ اپنے دبدبے اور قوت سے اپنی زبان کو رواج دیتی ہے۔ وہ اپنی سہولت کا خیال پہلے کرتی ہے۔ رعایا میں جن خیالات کی اشاعت اس کے لیے مفید ہو اور جو زبان ان خیالات کا زیادہ سے زیادہ پرچار کرسکے، وہی زبان حکومت کو مرغوب ہوگی اور وہ اسے ہر طرح کا بڑھاوا دے گی۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ حکومت اس زبان کو قبول کرلیتی ہے جو عوام میں مقبول ہے تاکہ اسے اپنے خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو—

اب مذہب کو لیجیے۔ اس کے مبلغ یا تو اپنی مخصوص مذہبی زبان کا پرچار کرتے ہیں اور یا مختلف زبانوں کے وسیلے سے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں—

اسی طرح بنیے بقال اپنے مفاد کا فکر پہلے کرتے ہیں، زبان کے مسئلے کو وہ زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے وہ سب کچھ کر گزریں گے، وقت پڑے تو زبان کی اشاعت بھی کریں گے۔ لیکن وہ اس کے لیے اپنی تجارت پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ غرض یہ کہ زبان

کا سوال ان کے لیئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا —

تعلیم کے ماہروں کو بھی زبان کا خیال ہمیشہ رکھنا پڑتا ہے - ہوشیار استاد اس زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے گا جو طلبا سے کوئی قربت یا نسبت رکھتی ہو - بعدازاں طلبا کی ذہنی تہذیب کے لیے جس قسم کے ادب کی ضرورت ہوگی' تعلیم میں اسی ادب کی زبان کو تقدیم دی جائے گی - تعلیم کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں عمل کی قوت پیدا ہو - جو زبانیں اس قوت کو نکھارتی ہیں اور اپنے خیالات اور علم کے فوائد کو دوسروں تک پہنچانے میں سوئیہ ہوتی ہیں' انہیں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جاتا ہے - آج اگر کسی کو انگریزوں کی نوکری کرنی ہے' انگریزی میں کچھ لکھنا ہے یا سائنس اور انگریزی ادب میں امتیاز حاصل کرنا ہے تو وہ انگریزی زبان پر زیادہ توجہ کرے گا —

ہر آدمی کو اپنا مذہب پیارا ہوتا ہے - اس دائرے میں رہ کر اسے تسکین ملتی ہے - اپنے مذہبی عقائد کی روشنی میں وہ زندگی اور سماج کے متعلق رائے قائم کرتا ہے - اس وجہ سے انسان مذہبی تعلیم کو بہت اہمیت دیتا ہے - زمانۂ قدیم میں لیٹن زبان کا بول بالا تھا - بہت سے عیسائی پادری یونانی اور عبرانی پڑھتے تھے اور آج بھی پڑھتے ہیں - اب تو وہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے دنیا بھر کی زبانوں کو کھنگال ڈالتے ہیں - جو زبانیں بالکل کنگال ہیں پادریوں نے ان کے لغت اور گرامر تیار کر ڈالے ہیں اور اس طرح دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنے مذہب کو پھیلایا ہے —

آج کل دھرم پرچارک جس طرح عوام کی بولیوں کے دل دادہ بنے ہوئے ہیں' اسی طرح سماج سیوکوں کا دم بھی ان پر فدا ہے - جنہیں

سماج میں رہ کر علم' دولت اور شہرت حاصل کرنی ہے وہ کسی خاص زبان سے تعصب نہیں رکھتے بلکہ اسی زبان کو سیکھتے ہیں جس سے انہیں فائدہ ہو - لیکن جنہیں خدمت خلق کرنی ہے' جو اپنے سے زیادہ دوسروں کے بھلے کا خیال کرتے ہیں' وہ ہمیشہ عام زبان کو فوقیت دیتے ہیں —

اس عظیم الشان ملک میں ہر صوبے کی بولی الگ ہے اور چھوٹے چھوٹے اختلافات کی وجہ سے ان کے بھی حصے بخرے ہوگئے ہیں - شہروں کی زبان الگ ہے اور دیہاتوں کی الگ - یہی نہیں بلکہ ہر پیشے کی اصطلاحیں اور محاورے الگ ہوگئے ہیں - مہذب زبان اور عام زبان میں بھی علم پرور حضرات اپنے ذوق کے مطابق مختلف اسالیب بنالیتے ہیں - تعلیم یافتہ طبقے میں بھی سب کی تربیت ایک نہج پر نہیں ہوتی - جو لوگ صرف سنسکرت کا مطالعہ کرتے ہیں ان کی صوبجاتی زبان سنسکرت آمیز اور دقیق ہوجاتی ہے' ان کی بلاغت عوام کے فہم سے بالاتر ہے - ان لوگوں کو اپنی زبان دانی کے مظاہرے کا مرض ہوتا ہے - اور ان کی بات ان کے سوا کوئی نہیں سمجھتا - ایسے لوگوں کی ایک الگ ذات بن جاتی ہے اور یہ گویا اپنی ذات والوں کے لیے لکھا کرتے ہیں - انہیں اپنی ذات کے باہر والوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی - عربی فارسی کے عالموں کی بھی یہی گت ہوتی ہے —

انگریزی کے پنڈتوں کی حالت ان سے بہتر نہیں ہے - ایک صوبے یا سماج کے افراد اگر طویل عرصے کے لیے کسی دوسرے صوبے یا سماج میں رہنے لگیں تو ان کی زبان پر اس صوبے یا سماج کا اثر پڑنا لازمی ہے - زبان کی فطرت ہے کہ وہ وحدت سے کثرت کی طرف جاے - جب کسی سماج کو اتحاد اور تنظیم کے گن کا پتا چلتا ہے تو وہ اختلافات کو

ملا کر یگانگت کی طرف سمٹنے کی کوشش کرتا ہے - ہمارے دیس میں جب پنڈتوں اور ان کے پوتھوں کی عزت تھی' تو سب صوبجاتی زبانوں کا شیرازہ ایک تھا - جب "بھکتی" تحریک کا آغاز ہوا اور عوام میں رہنے بسے کا مسئلہ چھڑا تو لا محالہ زبان کو آسان بنانے کا سوال بھی پیدا ہوا - جب پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنت قایم ہوئی تو عدالت میں' کاروبار میں' لاؤ لشکر میں غرض کہ ہر طرف فارسی کا چلن ہو گیا - ساتھہ ساتھہ فارسی ادب کا چرچا بھی ہوا اور اس کا اثر کم و بیش ہر صوبے کی زبان پر پڑا - ان کے بعد انگریزوں کی آمد آمد ہوئی اور انگریزی زبان کا پرچم لہرایا - نتیجہ یہ ہوا ڈاک گھر' تار گھر' شفا خانہ ہر طرف انگریزی کا طوطی بولنے لگا - انگریزی راج سے زیادہ انگریزی زبان کا اثر ہماری زندگی پر پڑا - صوبجاتی زبانوں میں انگریزی الفاظ جبراً گھسنے لگے - اور ان کے ساتھہ ہمارے جملوں کی ساخت بھی انگریزی کا پیرایہ اختیار کرنے لگی یہی نہیں بلکہ ہمارے نظام زندگی میں مغربی خیالات اور رسوم نے سرنگ لگانی شروع کردی -

بعض لوگوں نے اس اثر کی مخالفت کی اور اپنے پرانے پن کو سنبھالنا چاہا بہتیروں نے اپنا پرانا تانا بانا چھوڑا اور مغربی تہذیب کو دل دے بیٹھے - آج ایک ایسا گروہ نظر آنے لگا ہے جو پرانے اور نئے کو ملا کر ہندستان کے مستقبل کے لیے کوئی تعمیری راہ نکالنا چاہتا ہے - یہ مطلب نہیں کہ اس گروہ کو کھچڑی بہت پسند ہے' بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ ماضی کے جوہر پہنچانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مستقبل کا دھارا کسی طرف بہ رہا ہے اور زمانے کی اس رو میں ہندستان کا مقام کہاں ہے - یہ سب سوچ سمجھہ کر وہ ایک نئے تمدن کی تخلیق کے لیے

جد و جہد کر رہا ہے - اب قدامت کی لکیر کو پیٹنے کا زمانہ گزر چکا - اب تو وہ زمانہ ہے کہ سب کو ساتھہ لے کر اور سب کو ایک کر کے سب کے بھلے کے مستقبل کی طرف قدم بڑھایا جاے —

اب ہمیں عوام کی خدمت کے ارادے سے زبان کی اصلاح کرنا ہے - شہری اور دیہاتی زبانوں کا فرق مٹانا ہے - شہروں کی صفائی کو دیہاتوں میں پھیلانا ہے اور دیہاتوں کی سادگی شہروں میں لانا ہے —

اب مذہب کے نام سے دقیانوسی رسمیں نہیں چل سکتیں - اس کی روح کو روشن کرنے کے لیے نئے طریقے پر چلنا ہوگا اور جہاں تک ہو سکے باہمی امتیاز اور اختلافات کو مٹانا ہوگا - ہمارا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ جو کچھہ ہے وہ سب کا ہے اور اسے سب کے مفاد کے لیے بڑھانا ہے - ہمیں یہ کوشش کرنا ہے کہ صوبجاتی زبان ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور بالآخر آپس میں ضم ہو جائیں - زور زبردستی یا فوجی قانونوں سے ایسے معاملات میں کامیابی نہیں ہوتی ہم صرف ان کے باہمی تعاون سے یہ کام کر سکتے ہیں جنھیں لے کر ایک سماج کی بنا ڈالنی ہے - اگر دلوں میں شبہے پیدا ہوے اور ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھا تو ہماری ساری محنت اکارت جاے گی اور نتیجہ الٹا ہوگا - شبہے کا بیج ہماری کمزوری کو بڑھاے گا اور غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرے گا -

عوام کے خادموں کے لیے صوبجاتی زبانیں یقیناً بہت اہم ہیں - لیکن یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ ہر صوبہ کوئی آزاد ملک نہیں ہے - تمام صوبوں میں بڑی حد تک اتحاد کے عناصر موجود ہیں - ان سب کی قسمت ایک ہی ڈوری سے بندھی ہوئی ہے اور اس کی گرہ ایک ساتھہ کھلے گی - سب یا تو ایک ساتھہ ڈوبیں گے یا ایک ساتھہ ساحل

کو پہنچیں گے ــ

اس لیے صوبجاتی زبانوں کے علاوہ باہمی تعلق کے لیے ہماری ایک ملک گیر زبان بھی ہونی چاہیے۔ یہ سوال قطعی طور پر غیر اہم ہے کہ اس کا نام کیا ہونا چاہیے۔ اسے قومی زبان کہیں یا نہ کہیں، یہ سوال بھی معمولی ہے۔ ہم ایک ہی قوم کے افراد ہیں یا نہیں، اس کی بھی بحث نہیں ہے۔ ہم سب ایک قوم بننا چاہتے ہیں اور بن بھی سکتے ہیں، اس میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ ضرورت ہے خلوص اور ایمان داری سے اس کے لیے کام کرنے کی۔

ہم جانتے ہیں کہ ہندستان کی تمام زبانوں میں ایک ایسی زبان موجود ہے جسے دیس کی بہت بڑی آبادی بولتی اور سمجھتی ہے اور باقی لوگ بھی ایک ذراسی کوشش سے اسے سمجھ سکتے اور کام میں لاسکتے ہیں۔ یہ زبان نئی نہیں ہے۔ اس کا پورا خاکہ اور خط و خال موجود ہیں۔ ضرورت ہے اس میں رنگ بھرنے کی اس کے ذخیرۂ الفاظ کی تاریخ پر ہمیں غور نہیں کرنا ہے۔ یہ الفاظ نئے ہیں یا پرانے پورب کے ہیں یا پچھم کے، آریہ ہیں یا غیر آریہ، ہندو ہیں یا مسلمان۔ ان فضول باتوں کی ہمیں چھان بین نہیں کرنا ہے۔ جس زبان کو شمالی ہند کے شہری اور دیہاتی سمجھتے ہیں اور بولتے ہیں اسی کا سہارا لے کر ہمیں اپنی قومی زبان بنانا ہے۔ جس وقت ہمیں نئے الفاظ کی ضرورت ہوگی ہم ایسے الفاظ انتخاب کریں گے جنہیں اس ملک میں سب لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ اگر لوگوں نے ان گھڑے ہوئے الفاظ کو اپنا لیا تو وہ سب جگہ رائج ہو جائیں گے ورنہ زمانہ اُنہیں خود بھول جائے گا ــ

ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہم بلا امتیاز خلق اللہ کی خدمت کے لیے نکلے ہیں - خاص طور پر دیہاتوں کی — ہندوستان بھر کے دیہات جس زبان کو بلا تکلف سمجھہ سکیں گے اسی کے ذریعے ہم اپنی تمام تحریکیں جاری رکھیں گے —

کیا اچھا ہوتا کہ اس زبان کا نام ایک ہی ہوتا خواہ وہ کوئی کوئی زبان ہوتی - اس نام پر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا - لیکن چونکہ یہ عام فہم زبان فی الحال شمالی ہند میں رائج ہے اور وہاں اس کے کئی نام ہیں اور ان ناموں کی وجہ سے وہاں بڑے جھگڑے ہوچکے ہیں ' اس وجہ سے ہم کسی کی جانب داری نہ کرکے یہی کہیں گے کہ اس زبان کے تمام نام ہمیں منظور ہیں بشرطیکہ یہ زبان ہمارے معیار پر ٹھیک اترے - ایک نام لینے سے دوسرے نام کے فدائی ناراض ہوجاتے ہیں - ہم نام کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے - اگر شمالی ہند کے لوگ آپس میں مل جل کر صلح و آشتی سے اس قضیے کا فیصلہ کرلیں اور اس زبان کا کوئی ایک نام تجویز کرلیں تو ہم شکریے کے ساتھہ اسے قبول کرلیں گے - افسوس ہے کہ مستقبل قریب میں اس کی کوئی امید نہیں ہے - دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پر اٹل ہیں - اور رواداری سے کام نہیں لیتے —

ہندوؤں میں وشنو اور شیو میں کوئی فرق نہیں ہے ' تاہم وشنو کے پجاری شیو کا نام نہ لینا چاہتے تھے - اور شیو کے ماننے والے وشنو کے نام سے جھجکتے تھے - کسی گیانی نے اس تفرقے کو مٹانے کے لیے کہا کہ 'ہری' سب کے دیوتا ہیں اور رفتہ رفتہ لوگ ہری ہری کہنے لگے - ہم نے بھی یہی کیا - جس زبان کو ہم صوبجاتی زبانوں کی سہیلی بنانا

چاہتے ہیں اسے کبھی ہندی کبھی ہندوستانی اور کبھی قومی زبان کہا اور کہتے ہیں اور کہیں گے - اگر اردو کہنے سے ناگری اور فارسی رسم خط میں لکھی جانے والی عام زبان کا مطلب ادا ہوتا ہے تو ہم اسے بھی اردو کہیں گے - ہم ان ناموں کو اُلٹ پلٹ کر اس طرح کام میں لائیں گے کہ ان میں کوئی تمیز ہی نہ رہ جائے - جب زبان عاموں کے لیے بنانا ہے تو یہ نام وام کا جھگڑا کیسا؟ بہت سے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ یہ تحریک صرف شمالی ہند کے لیے نہیں ہے جہاں ایک ہی زبان ہے، خواہ اسے ہندستانی کہیے یا ہندی وہاں زبان کی ہر شکل کو لوگ خوشی سے قبول کرلیں گے - لیکن ہماری توجہ کا مرکز تو وہ صوبے ہیں جہاں یہ زبان اب تک عام فہم نہیں ہے - ہمیں اس مسئلے پر غور کرنا ہے کہ ہم ان صوبوں میں اپنی زبان کو کس طریقے سے قابل قبول بناسکتے ہیں —

دیس کی صوبجاتی زبانوں میں اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ کم و بیش پائے جاتے ہیں - جہاں جہاں "بھاشا کی شدھی" کے خیال سے ان الفاظ کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہاں ہم سختی سے اس تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں - ان صوبجاتی زبانوں میں بہت سے ہندی کے الفاظ موجود ہیں - اگر ہم اپنے مضامین میں ان الفاظ کا استعمال کریں جو ان زبانوں میں مشترک اور ہم معنی ہیں تو اس زبان کو سب لوگ آسانی سے سمجھہ سکیں گے - اس طرح ہمیں ایک آسان راستے سے صوبجاتی زبانوں کو قومی زبان کی طرف راغب کرنا ہے - اگر اس زبان کی ترکیب، گرامر اور سیدھے سادھے الفاظ کو رواج مل گیا تو ہماری آدھی منزل ختم ہو جائے گی - اس کے بعد ہم شمالی ہندستان

کے باکمال مصنفوں کے اسالیب کا تعارف ہم ملک کے گوشے گوشے سے کرا سکیں گے —

ہمیں ہندوستانی تمدن کے ہر پہلو سے باخبر رہنے کی اشد ضرورت ہے - جن جن زبانوں کا اثر اس قومی زبان پر پڑا ہے اور آگے بھی پڑنے والا ہے، ان سے ربط و ضبط پیدا کرنا ہمارا فرض ہے —

اس کام میں ہمیں بہت سے مددگار ملیں گے - یہ ہمیں معلوم ہے جن میں فرقے یا صوبے کا تعصب ہے وہ ہماری مخالفت کریں گے - لیکن جو لوگ وسیع قلب اور قوم پرور ہونے کے باوجود طبیعتاً شکی ہیں، وہ اپنی عادت سے مجبور ہوکر عیب چینی کریں گے - ہم بھی اپنی کم بضاعتی اور کاہلی کی وجہ سے غلطیاں کریں گے - تاہم، ہماری کوشش یہی ہوگی کہ ہمارا مقصد یہی ہو کہ ہم سب کی مخلصانہ خدمت کریں اور کسی کا پاٹھات نہ کرکے تمام صوبوں کو، وہاں کے ادب اور کارکنوں کو ایک دوسرے کے قریب لائیں - اگر ہم نیک نیت ہیں اور ہماری تحریک حق بجانب ہے اور ہندوستان کے مستقبل کو یہ منظور ہے تو ہماری تحریک کے سر کامیابی کا سہرا بندھے گا اور شبہے کی نظر سے دیکھنے والوں کو بالآخر یہ ماننا پڑے گا کہ ہم در اصل ان کی بھی خدمت کرنا چاہتے تھے —

ہندی اردو کا قضیہ

سنہ ۱۸۵۷ ع کی جنگ آزادی کے بعد حکومت کی طرف سے جو تشدد ہوا، اس نے بظاہر ملک کی سرگرمیوں کو سرد کردیا - محکوم

ممالک میں جب عوام کو اپنے سیاسی مقاصد کے اظہار کا موقع نہیں ملتا' تو ان کی سرگرمیاں گمراہی کی طرف چلی جاتی ہیں - وہ اکثر فرقہ وارانہ تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے - ایسی تحریکیں مختلف فرقوں یا طبقوں کو فرداً فرداً فائدہ پہنچا دیں تو عجب نہیں لیکن جہاں تک متحدہ قومیت کا تعلق ہے ان سے بکھرے ہوئے فرقوں میں پھوٹ کا بیج جڑ پکڑتا ہے' آپس کا اختلاف بڑھتا ہے اور قومیت کا شیرازہ بکھرتا ہے —

سنہ ۱۸۷۵ ع میں سوامی دیانند نے بمبئی میں آریا سماج کو جنم دیا' اسی سال سر سید احمد نے علی گڑھ میں ایم - اے - او کالج کا سنگ بنیاد رکھا' سنہ ۱۸۷۹ ع میں مرزا غلام احمد نے قادیانی تحریک کا آغاز کیا' سنہ ۱۸۸۱ ع میں بابو کیشو چندر سین نے بنگال میں برہمو سماج کو نیا جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا - ان فرقہ وارانہ تحریکوں نے ہندو تمدن اور اسلامی تمدن' ہندو سیاست اور مسلم سیاست کی داغ بیل ڈالی - تعلیمی اور سماجی اصلاح کے پردے میں تنظیم اور سنگھٹن کی راگنی چھپی ہوئی تھی —

اسی زمانے میں سنہ ۱۸۸۵ ع میں انڈین نیشنل کانگرس قایم ہوئی - رفتہ رفتہ اس جماعت نے بڑا زور پکڑ لیا اور سیاسی معاملوں میں اس نے حکومت وقت سے مورچہ لینا شروع کیا - ان ٹکروں میں کانگرس کی قوت بڑھتی گئی - حاکموں کو یہ امر سخت ناگوار تھا —

سنہ ۱۹۰۰ میں مہاراجا دربھنگا کی صدارت میں مخالف کانگرس ہندوؤں کا اجتماع ہوا - مہاراجا پابرہنہ' 'ویہ' بدست جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے - کہتے ہیں کہ اس جلوس میں تقریباً ایک لاکھ آدمیوں

کا هجوم تھا - اس جلسے میں بھارت دھرم مہامنڈل کی نیو رکھی گئی اور دوسری چیزوں کے علاوہ اردو هندی کے مسئلے پر بھی غور کیا گیا —

سنہ ۱۸۹۳ ع سے بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا ناگری رسم الخط کا پرچار کر رهی تھی - عدالتوں میں اردو کے ساتھ ناگری کو بھی چلن دینے کی تحریک شروع هو چکی تھی - رسم الخط کے قصے نے اتنا طول کھینچا کہ یہ بھی ایک فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا - سر اینٹانی میکڈانل نے هندوؤں کے اس مطالبے کو واجب قرار دیا چنانچہ سنہ ۱۸۹۸ ع سے یو - پی گورنمنٹ نے هندی کو نوازنا شروع کر دیا اور اس طرح سر میکڈانل هندو دھرم کے چوکی دار بن گئے - پنڈت مالویہ نے ان کی یادگار میں هندو بورڈنگ هوس قایم کیا - پردے کے پیچھے سے تار کھینچنے والے اپنے منصوبے میں کامیاب هوئے - اور سارے ملک میں بہت بڑے پیمانے پر هندو مسلم جنگ چھڑ گئی —

مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان کی هستی خطرے میں هے - اپنی حفاظت کے لیے انہوں نے بھی بند و بست کیے اور ملک بھر کے مسلمان رهنماؤں کی کانفرنس هوئی - اس نے مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ایک آل انڈیا انجمن بنانے کا فیصلہ کیا اور نواب وقارالملک کو اس کا سکرٹری بنایا - چھ سال کے بعد اس انجمن نے آل انڈیا مسلم لیگ کی شکل اختیار کر لی —

بیسویں صدی کے اوائل سے اردو هندی کا سوال ایک مستقل مسئلہ بن گیا هے - اس سے پہلے یہ بات نہ تھی - سچ پوچھو تو هماری موجودہ زبان نے مسلمانوں کے عہد حکومت میں جنم لیا هے - مسلمانوں

ھی نے اسے ھندی یا ھندوی کا لقب دیا - پراکرت کا چراغ بجھ چکا تھا اور چند بردائی کی زبان عام فہم نہ ھوسکتی تھی - مسلمان بادشاھوں کے سپاھیوں نے فارسی ترکی میں برج بھاشا کی رنگ آمیزی کرکے ھندی کو پروان چڑھایا - گرامر برج بھاشا کا ھی رکھا گیا - اس زبان کو اردو بعد میں کہا جانے لگا - بعض محققین کا خیال ھے کہ یہ شاھجہاں کے زمانے میں پیدا ھوئی لیکن بعض کہتے ھیں کہ اس نے اس سے بعد کے زمانے میں آنکھ کھولی - بہرحال ' یہ معلوم ھے کہ ابتدائی دور کے مسلمان شاعر اپنی زبان کو ھندی کہتے تھے —

حقیقت بھی یہ ھے کہ ھندی اور اردو دو مختلف زبانیں ھیں یہ ایک نہر کی دو شاخیں ھیں - ھندو مسلمان دونوں نے ان زبانوں کو گلے لگایا - کبیر ' خسرو ' خان خاناں اور جائسی ھندی کے مشہور شاعر تھے اسی طرح نسیم ' چندو لال ' جوالا پرشاد برق ' رتن ناتھ سرشار ' بشن نرائن در اور چکبست کا اردو پر احسان ھے - ھمارے قومی ادب کے سرمایے کو غالب اور میر ' درد اور نظیر نے اتنا ھی مالا مال کیا ھے جتنا تلسی اور سور ' میرا اور بہاری نے —

بیسویں صدی ' میں ھندی اور اردو کا قضیہ زبان کے میدان سے نکل کر ایک مذھبی اور تہذیبی مسئلہ بن گیا ھے - اخبار آے دن تہذیب کی دھائی دیا کرتے ھیں - کہا جاتا ھے کہ زبان کی وجہ سے ھندو اور مسلم تمدن خطرے میں آگئے ھیں - یوں تو ھر صوبے کی کوئی نجی خصوصیت ھوتی ھے لیکن کوئی قوم اتنے متضاد تمدنوں کو لے کر زندہ نہیں رہ سکتی -

جس باؤلی میں باھر سے پانی آنا بند ھو جاے وہ یا تو سوکھ جاے گی یا اس کا پانی سڑنے لگے گا - آج سے دو ھزار سال پہلے بودھ

مذہب نے بڑے وسیع پیمانے پر بیرونی ممالک سے ہندوستان کے تہذیبی تعلقات قایم کیے تھے - بدھ مذہب کے زوال کے بعد یہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں - راجا ہرش کے بعد کا زمانہ ہماری حماقتوں اور تنگ نظری کا افسوس ناک مرقع ہے - بعد ازآں اس دیس کا تعلق مسلمانوں سے ہوا - دکن کی سامری سلطنت میں عربوں کی نو آبادیاں بس گئیں - یہیں شنکرا چاریا کا جنم ہوا تھا - کون کہہ سکتا ہے کہ شنکر کے ویدانتی فلسفے پر اسلامی تصوف کا اثر نہ تھا؟ ادھر خلفائے عباسیہ کے دربار میں سنسکرت اور پالی کی کتابوں کا رسوخ ہوگیا - برہمن پنڈتوں ' بدھ سادھوؤں اور یونانی فلسفیوں کا تہتھ لگا ہوا تھا - ان کتابوں کے عربی ترجمے بلاد اسلامیہ کی تعلیم گاہوں میں ذوق شوق سے پڑھے جاتے تھے - اس زمانے کے مسلمان علما کی تصانیف پڑھیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گیتا کی تفسیر پڑھ رہے ہیں - اسلام نے دنیا اور مہذب ممالک سے ہمارا رشتہ جوڑ کر از سر نو ہماری رگوں میں تازہ خون پہنچایا —

پندرھویں ' سولھویں اور سترھویں صدیوں میں ہندوستان میں ایک متحدہ تہذیب کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی - کبیر اور اکبر اس تہذیب کے درخشاں ستارے تھے - سیکڑوں صوفی اور سنت اٹک سے لے کر کٹک تک یہی سندیسا پھیلا رہے تھے ' ملک کے رہن سہن ' خورد و پوش ' زبان اور ادب غرض کہ ہر شعبۂ زندگی پر اس رجحان کا بہت اثر پڑا - ہر طرف ایک نئی زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے -

ہماری غلطیوں یا باہر والوں کی خود غرضانہ دست اندازیوں سے ترقی کی یہ بارہ ماری گئی - لیکن اس تحریک کے اثرات ہماری زندگی میں اتنی گہرائی تک پیوست ہوچکے ہیں کہ انہیں باہر نکالنے کی

کوشش خود کشی کے مصداق ہے - کون سمجھ دار ہندو گلاب کو اپنے باغ سے اس لیے نکال پھینکے گا کہ وہ ایران سے آیا ہے یا روٹی کھانا بند کر دے گا کیونکہ اس کی زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے؟ ہماری پوشاک کا نصف بہتر مسلمانوں کی دین ہے - شمالی ہند میں ہر ہندو شادی کے وقت "نوشہ" بنتا ہے اور اس کی شادی سہرے اور جامے کے بغیر پوری نہیں ہوتی - ہماری بہنوں کے بہت سے زیور، ہمارے کل پرزے یہاں تک کہ چارپائی اور بستر اور رشتہ داروں کے القاب، رنگ و روغن بٹنوں کے کاغذات، میوے اور مٹھائیاں غرض کہ ہر کہیں اسلامی تہذیب کا نقش موجود ہے - کاغذ، قلم، دوات، سیاہی اور عینک کے بغیر ہمارے مصنفوں کا کام ایک دن بھی نہیں چل سکتا —

گزشتہ دس سال سے ساورکر صاحب مرہٹی جریدہ 'شودھانند' کے توسل سے کوشش کر رہے ہیں کہ مرہٹی زبان سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکال دیے جائیں - لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے - وہ چاہتے ہیں کہ ہندو تہذیب سے اسلامی اثرات دھو دیے جائیں لیکن یہ خام خیالی ہے —

مثلاً موجودہ یورپین تہذیب کو لیجیے - اگر یورپ والے یہ طے کرلیں کہ ایشیا کے اثرات سے نجات حاصل کرنا ہے تو سب سے پہلے انہیں عیسائیت سے گلو خلاصی کرنی ہوگی - اگر عیسائی یہ فیصلہ کرلیں کہ غیر مذاہب کی علامات اپنے کو پاک کرنا ہے تو سب سے پہلے انہیں صلیب کو خیر باد کہنا ہوگا - کیونکہ یہ قدیم مصر کی دین ہے - کرسمس، ایسٹر اور سنڈے یہ زرتشتی مذہب کے متری فرقے کی خصوصیات ہیں - عیسائیت سے پہلے اس فرقے کا یورپ میں بڑا زور تھا - یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدایش سے پہلے شام میں یونانیوں

کی صدہا خانقاہیں تھیں - اسی وجہ سے عیسائیت کے بہت سے بنیادی اصول بدھ سے مستعار لیے گئے ہیں ---

اگر آپ یورپ کے فنون سے یونانی الفاظ اور قانون سے رومن اصطلاحوں کو نکال دیں تو رہ کیا جاتا ہے - یونان کے خیالات، مصر کی روشنائی اور کاغذ، چین کی دی ہوئی بارود، ٹائپ، کنپاس اور ہیمک، اور عرب کے دیے ہوئے ہندسے یورپ سے چھین لیے جائیں تو اس غریب کے پاس رہ کیا جائے گا ---

اب آریوں کو لیجیے - اگر ہٹلر کی طرح ساور کر صاحب آریا قوم کی خیر گیری کی طرف مائل ہوں تو انہیں کھتری، کشمیری اور دراوڑ بھائیوں کو نکال دینا ہوگا - کیونکہ ان کی رگوں میں غیر آریوں، یونانیوں اور ہونوں کا خون دوڑ رہا ہے - شیو اور درگا آریوں کے دیوتا نہیں ہیں، انہوں نے دراوڑں کی خاطر انہیں اپنا کرلیا تھا - ہم اس موضوع کو طول دینا نہیں چاہتے ہیں - کھلی ہوئی بات ہے ساور کر جیسے لوگ اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں ---

ہماری قومی زبان دھیرے دھیرے بن رہی ہے - نہ سنسکرت سے لدی ہوئی ہندی اور نہ عربی آمیز اردو ہماری قومی زبان بن سکتی ہے کیونکہ ان کی رسائی عوام تک ہے - سنسکرت عربی یا فارسی کے جو محاورے عام فہم اور مقبول ہیں ان سے ہمارا کوئی بیر نہیں ہے - قومی زبان کی تدوین میں ہمیں انگریزی، بنگالی، گجراتی اور تامل تک کا خیر مقدم کرنا ہوگا - آسان اور عام فہم قومی زبان کی تعمیر کا یہی ایک طریقہ ہے ---

لیکن کچھ عرصے سے ہندی اور اردو دونوں پر عربی اور سنسکرت نے

دھاوا بول رکھا ہے۔ لوگوں کو مشکل عبارت لکھنے کا سودا سا ہوگیا ہے۔ یہ مذہبی تعصب صوبجاتی زبان پر بھی برا اثر ڈال رہا ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ع میں بنگال میں سر عبدالرحیم کی سرگردگی میں ایک تحریک شروع ہوئی کہ وہاں کے مسلمانوں کو بنگلے کے بجائے اردو پڑھنا چاھیے۔ لیکن بنگالی مسلمانوں نے ہی اس اپیل کی سخت مخالفت کی۔ مسلمان بنگالیوں کی زبان میں فارسی اور ہندو بنگالیوں کی زبان میں سنسکرت کی زیادتی ہے۔ لیکن اس سبب سے ان میں کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔ قاضی نذرالاسلام کی نظموں کو ہم بطور نمونے کے پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مسلمانوں دونوں میں مقبول ہیں۔ گجراتی میں پارسیوں نے ہزاروں فارسی کے الفاظ کھپائے لیکن کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ یہی حال ہندوستان کی دوسری زبانوں کا ہے۔ پھر سمجھہ میں نہیں آتا کہ ہندی اردو کا قضیہ ملک کے لیے کیوں وبال جان ہوگیا ہے ــــ

رہ گیا رسم الخط کا سوال۔ ٹیگور، شرت چندر اور بابو رامانند چٹر جی رومن رسم الخط کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ موجودہ رومن رسم الخط ابھی ناقص ہے لیکن اس میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ ہندی کے جو اخبارات روٹری مشین میں چھپتے ہیں ان کا تجربہ ہے کہ "ماترائیں" بہت جلد ٹوٹ جاتی ہیں اور ٹائپ کرنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے ــــ

ٹیگور کا استدلال یہ ہے کہ رومن اختیار کرنے سے ایک تو خانہ جنگی کا کوئی امکان نہ رہے گا۔ دوسرے بیرونی ممالک سے بھی تعلق ہو جائے گا۔ صوبجاتی رسم الخط باقی رہیں گے، صرف استعمال کے لیے رومن سے کام لیا جائے گا۔ ترکیہ اور روس کے اسلامی ممالک میں رومن ؟ چلن ہوگیا ہے۔

جاپان کا بھی بہت سا کام رومن میں ہوتا —

اگرہم حسب ذیل امور کوطے کرلیں توہماری مشکلیں بڑی حدتک آسان ہوجائیں گی۔

(۱) ہماری قومی زبان کا نام ہندستانی ہوگا - سنہ ۱۹۲۵ ع کی کانپور کانگرس نے ہندستانی کو ملک کی قومی زبان تسلیم کیا ہے -

(۲) یہ زبان عام فہم اور آسان ہوگی —

(۳) کسی فرقے یا مذہب سے ہندستانی زبان کا تعلق نہ ہوگا —

(۴) جب تک رومن رسم الخط کو قبول عام نصیب نہ ہو اس وقت تک ہندستانی بولنے والے علاقوں میں ناگری اور فارسی رسم الخط کی تعلیم لازمی قرار دی جائے - دکن کی ہندی پرچار سبھا کے کارکنوں کو دونوں خط سکھانے چاہئیں - ہندی ساہتیہ سمیلن اور انجمن ترقیء اردو اس سلسلے میں مفید کام کر سکتی ہیں —

اصطلاحی الفاظ کے لیے سنسکرت اور عربی سے استفادہ کرنا پڑتا ہے - ہونا یہ چاہیے کہ ہندستانی زبانوں کے ماہروں کی ایک کمیٹی بلائی جائے جو مختلف زبانوں سے قابل قبول الفاظ کی ایک فرہنگ تیار کرے - بہت سی اصطلاحیں عربی یا فارسی کی بہ نسبت مرہٹی اور بنگلے میں بہتر نکل آئیں گی - بہت سی اصطلاحوں کے لیے انگریزی الفاظ جوں کے توں رکھے جاسکتے ہیں - اسی طرح پورے ملک کے لیے ایک واحد فرہنگ تیار ہو جائے گی —

آج عوام میں بیداری کی لہر دوڑی ہوئی ہے - ان مظلوموں کے لیے ہم کس قسم کا ادب تیار کر رہے ہیں ؟ جب کروڑوں آدمی بھو کے مر رہے ہیں تو ہمارے شاعر کس شوخ چھوکری کے تیر نظر کے گھایل ہو کر تڑپ رہے ہیں . ہمارا ادب زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کے بدلے

اردو ہندی کے بے معنی قضیے میں پھنسا ہوا ہے - ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے مصنف روپوں کے لیے درسی کتابیں تیار کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور ان بے زبان انسانوں کی طرف توجہ کریں —

زبان کے مسئلے کو بھی عوام ہی طے کرسکتے ہیں - جو زبان عوام کا مطالبہ پورا نہ کرے گی وہ اپنی موت آپ مرجائے گی - ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے اصل مقصد کو ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رکھیں -

---

بنگلہ ادب کے جدید رجحانات

ادب بڑی حد تک اپنے ماحول کا منت پذیر ہے - بنگلہ ادب کے نقاد کا فرض ہے کہ ان طاقتوں کو سمجھے جو بنگالی سوسائٹی کی پرانی بنیادوں کو ڈانواں ڈول کر رہی ہیں کیونکہ یہ کشمکش جدید ادب کو بھی متاثر کر رہی ہے - صنعت و حرفت کے پھیلاؤ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بند و بست دوامی (Permanent Settlement) کا خاتمہ ہوجائے - مگر موجودہ طرز حکومت اس کے خلاف ہے اور یہ دقیانوسی نظام اب بھی مسلط ہے - یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں سامنتی آثار کا زور ہے اور بنکم چندر سے لے کر ہمارے ہم عصر شرت چندر تک کی تحریروں میں اس رجحان کا اثر پایا جاتا ہے - اس دور کے ادب میں وہ رومانی جذبات پرستی کار فرما ہے جو متوسط طبقے کی ماں جائی ہوتی ہے - ہم سب جانتے ہیں کہ اس طبقے کو لارڈ میکالے کے مشہور خریطے نے جنم دیا ہے - کیونکہ دراصل اسی خریطے کی وجہ سے ہماری تعلیم گاہوں نے مغربی یونیورسٹیوں کا چربہ اتارا اور ایسے لوگوں کو پیدا کیا جن کے اثر سے ہمارا سامنتی سماج ایک قسم کے تنت پونجیا سماج میں مبدل ہوگیا —

اس صورت کا دوسرا رخ برهمو سماج اور تجدید ویدانت کی تحریکوں کی شکل میں آشکار ہوا - ان میں جو درد انسانی پنہاں ہے وہ دھیمی سی گونج ہے آزادی، اخوت اور مساوات کے ان نعروں کی جنہوں نے انقلاب فرانس کی آگ کو بھڑکایا تھا - لیکن وہی اب بنگال کی سامنتی، رومانی اور روحانی فضا میں آکر سرد پڑ گئے تھے - رام موہن رائے کے برهمو سماج، اور رام کرشن وویکا نند کی تجدید هندوئیت کی تحریکوں نے اتنا کیا کہ تصوف اور جاگیرداری کی هانڈی میں اصلاح کا نمک چھڑک دیا - ٹیگور اور شرت چندر کی اصلاح پسندی اور روشن خیالی کا سراغ یہاں ملتا ہے —

ٹیگور کے کردار میں سرمایہ دارانہ لبرلزم اور سامنتی میلانات کی فراوانی ملے گی - سماجی مسایل کے متعلق وہ جس قسم کا جذباتی، رومانی اور اصلاحی رویہ رکھتے ہیں وہ اس زمانے کے 'شریف' طبقے کا خاصہ ہے - حالات موجودہ، کی عقلی اور جذباتی تائید ٹیگور کے ادب کا مرکزی نکتہ ہے - حقیقت سے پناہ لینے کے لیے رومانیت کا طلسم کھڑا کیا ہے -

ماضی پرستی اور حال پسندی سے ٹیگور کے قلم کی روشنائی بنی ہے - جو طاقتیں سماج کو بدل رہی ہیں ان میں عملی حصہ لینے کے بجائے، هاتھ پر هاتھ رکھ کر ان کا تماشا دیکھنے اور ان کے متعلق خیالی منصوبے باندھنے سے یہ رومانیت پیدا ہوئی ہے - یہ تو ظاہر ہے کہ هم عصر بنگلہ ادب کے متعلق رجحانات پر ٹیگور کی اتھاہ رومان پسندی کا بڑا اثر ہوا ہے —

- شرت چندر کی تحریروں میں بھی جذبات پسندی کی کمی نہیں ہے، تاہم سماجی مسائل کے متعلق اس کی نگاہ زیادہ حقیقت بین ہے -

پھر بھی یہ حقیقت بھلی واقعات سے دور ہے' اور اس کا مشاهدہ عوام کی آنکھوں سے نہیں بلکہ متوسط طبقے کی اصلاحی عینکوں سے کیا جاتا ہے - سچ تو یہ ہے کہ شرت چندر کی مقبولیت کا انحصار ہی اس پر ہے کہ وہ بنگال کے طبقۂ شرفا کا سچا نمائندہ ہے - ٹیگور کی وسیع رومانیت نے یہاں "تنت پنجیا حقیقیت نگاری" کی شکل اختیار کرلی ہے —

ٹیگور نے انسان اور قدرت کو تصوف کے هار میں ایک ساتھ گوندھنے کی کوشش کی ہے - اس رجحان کو جس گروہ نے زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنایا ہے' اس میں بیھوتی بھوش بنرجی اور جسیم الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں - یہاں ٹیگوریت کے ارتقائی عناصر زیادہ ولولہ انگیز ہوجاتے ہیں اور دیہات پسند رنگ گہرا ہوجاتا ہے - صنعتی تہذیب کی ہنگامہ آرائیوں سے فرار کا جذبہ دیہات کی محبت بن کر ظاہر ہوتا ہے لیکن جب یہ مصنف دیہات کے حسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو انہیں اس تلخ حقیقت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کہ یہ کاغذی پھول بہت جلد بکھر جائے گا - اس قسم کے ادب میں ہم ایسی دیہاتی زندگی کی تصویر دیکھتے ہیں' جو سامنتی اور صنعتی زمانوں کے بیچ میں ڈگمگا رہی ہے —

ٹیگور کی رومانی انسانیت پسندی کے خلاف جن مصنفوں نے بغاوت کی وہ "کلول" کے نام سے موسوم ہیں - ان لوگوں نے سماج کے مصیبت زدہ افراد کے بیان میں حقیقت کے خارجی پہلو تک پہنچنے کی جان توڑ کوشش کی - کیونکہ ان کی صنعت غیر ملکی تھی' اس وجہ سے شروع شروع میں کہا جانے لگا کہ یہ تحریک بے بنیاد اور بدیسی ہے - حالانکہ بات یہ تھی کہ جنگ عظیم کے بعد جو معاشی ابتری پیدا ہوئی

اس نے ہماری خاندانی اور اخلاقی زندگی کے تار و پود بکھیرنے شروع کردیے - ان جوشیلے مصنفوں کا ادب انہیں حالات کا مرقع تھا - قاضی نذرالاسلام، بدھ دیو بوس اور اچھوت کمار گپت اس گروہ کے بہترین نمائندے ہیں —

نریش چندر گپت کے ناولوں میں عوام کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے - گو یہ ضرور ہے کہ مزدوروں کی تصویر کشی میں " تت پلنجیا ذہنیت " سد راہ بن گئی ہے - ان کی تمام تحریروں میں یہ نقص ملے گا کہ وہ تلنت کے موقع پر یہ بھٹک جاتے ہیں - اس سلسلے میں چارو چندر رائے، بھوپیندر ناتھ دت اور نرپیندر کرشن چٹرجی کا بھی نام آتا ہے - یہ سب ادب کی سماجی اہمیت سے واقف ہیں —

شیلجا نند مکرجی کے افسانے اس اعتبار سے قابل توجہ ہیں کہ وہ زیادہ صحت اور جوش کے ساتھ عوام کی زندگی کا مرقع تیار کرتا ہے - خصوصاً مزدوروں کے مصائب کے بیان میں اسے ملکہ حاصل ہے - لیکن کسانوں کو سمجھنے میں وہ اس حد تک کامیاب نہیں ہوتا - اس حیثیت سے پریمانند متر کی تحریریں اہم ہیں کہ وہ مزدور اور کسان دونوں کی تصویر کشی میں ید طولیٰ رکھتا ہے - امید ہے کہ جب معاشی ضروریات کسان اور مزدور کو دوش بدوش کھڑا کردیں گی، تو اس ہونہار مصنف کے قلم میں بھی وہ قوت آجائے گی جو ان دونوں طبقوں کو یک جہتی کی طرف لے جائے گی - بنگال اب بھی زراعتی ملک ہے اور یہ یقین ہے کہ جب زراعت مشین کی مدد سے ہونے لگے گی تو اس صوبے میں بھونچال آجائے گا - اگر ہمارے ادیب سماج کے ان خاموش نغموں سے ہم گوش ہوجائیں جو آج ہوا میں نوا پیرا ہیں تو وہ ہمارے

سماج کا رنگ بدلنے میں بہت معین ہوں گے اور اس طریقے سے ایک بہتر اور برتر تہذیب کے جنم داتا بن جائیں گے —

یہاں موتی لال مجوم دار کی نظموں کا بھی ذکر کرنا ضرور ہے جو اپنے کلاسیکی جوہر کی وجہ سے ممتاز ہیں - قدیم رومانی موضوع' ایک شوخ کلاسیکی انداز میں اس حسن و خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ ٹیگوری رومانیت کو جھلملپ سی آجاتی ہے - مشہور ادبی جریدۂ 'پریچھوہ' کے ایڈیٹر سدھیندر ناتھہ دت بھی اس کے نقش قدم پر گام زن ہیں - انہوں نے ایک جدت یہ کی ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اس طرز میں رد و بدل کرلیتے ہیں - اپنی نظموں میں انہوں نے 'سنگت' کی موسیقی کو اس خوبی سے اپنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے - کیونکہ بنگلہ زبان کے مخصوص عناصر کی وجہ سے یہ چیز ناممکن سمجھی جاتی تھی - گویا یہاں ہمارے صنعتی دور اور کلاسیکی شگفتگی کا سنگم ہوا ہے - یہ جدید صنعت ان لوگوں کے لیے مفید ثابت ہوگی جو زراعت اور تجارت کے اشتراک کو اپنا موضوع بنانا چاہتے ہیں - یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مستقبل قریب میں بنگال کے ادب کا سماجی پس منظر بھی ہوگا —

روس کا سب سے بڑا شاعر — پشکن

گزشتہ ۹ فروری کو دنیا نے روس کے سب سے بڑے شاعر پشکن کی صد سالہ برسی منائی —

اس کی مختصر زندگی بجائے خود ایک افسانہ ہے - دنیائے ادب میں بہت کم نام ایسے ملیں گے جنھوں نے ۳۷ کے سال مختصر عرصے میں وہ سب

کچھ کہا ہو جو اس جادو اثر شاعر نے کہا اور ان سے بھی کم کو وہ امتیاز نصیب ہوا ہوگا جو آج پشکن کو روس میں نصیب ہے --

پشکن کا پر دادا حبش کے کسی رئیس کا بیٹا تھا- بردہ فروش اس لڑکے کو کسی طرح قسطنطنیہ بھگا لائے- جب یہ بچہ روس لایا گیا تو پیٹر اعظم نے اس کی تربیت اپنے ذمے لی اور کسی اعلی خاندان میں اس کی شادی کردی - پشکن اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا-

پشکن نے نوعمری ہی میں شاعری شروع کردی تھی- یہ وہ زمانہ تھا جب سارے یورپ میں فرانس کی تہذیب کا بول بالا تھا- نپولین کا آفتاب اقبال غروب ہوچکا تھا لیکن انقلاب فرانس کی صدائے بازگشت آسمان میں گونج رہی تھی اور ظالموں کے دل دہلا رہی تھی- روس کی دنیائے شاعری بھی دو گروہوں میں بنٹی ہوئی تھی- فطرت نے بوڑھوں کو ماضی کا چوکیدار اور نوجوانوں کو مستقبل کا علم بردار بنایا ہے- چنانچہ ان گروہوں میں سے ایک صرف اسٹائل یا صنعت کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ خیالات کے اعتبار سے بھی قدامت کی طرف مائل تھا- اس کے برعکس نوجوان مصنف زبان کی سادگی اور اصلاح کے قائل تھے اور اپنے سیاسی عقائد میں انتہا پسند تھے —

پشکن، جو طرز جدید کا پیشوا تھا، اب اپنے مداحوں کی نظر میں روس کا بہترین قومی شاعر ہے- لیکن سوویٹ روس اس کی عزت ایک دوسری حیثیت سے کرتا ہے- وہ کہتا ہے کہ پشکن ایک باغی شاعر تھا- جس کا قلم ہمیشہ ظلم کے خلاف نبرد آزما رہا اور رجعت کی سازش نے ایک قاتل کے ہاتھوں اس کی جان لی- اس دعوے میں بڑی حد تک سچائی ہے-

پشکن فطرتاً سرکش تھا اور اسے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اس کے

اجداد ہمیشہ حاکموں کے خلاف لڑتے رہے اور انہوں نے گرتے ہوؤں کی پشت پناہی کی - اس نے ۱۸ سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا کی اور اوائل عمر میں ہی کئی ایسی نظمیں لکھ ڈالیں جنہوں نے دنیائے ادب کو تھرا دیا - اس نے "دیہات" نامی نظم میں زراعتی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور "خنجر" میں سیاسی خون ریزی کو سراہا - اسی زمانے میں زار وقت پال قتل کیا گیا اور پشکن نے "آزادی" نامی نظم میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرکے غاصبوں کو عبرت دلائی - یہ نظمیں ایسے وقت شایع ہوئیں جب یورپ میں آگ لگی ہوئی تھی اور ہر آن انتشار کا کھٹکا لگا رہتا تھا - اس لیے جب زار الیگزنڈر کو اس نوجوان شاعر کی آتش نفسی کی خبر ملی تو اس نے اسے سخت سزا دینے کا فیصلہ کرلیا - مگر شاعر کے چند ہمدردوں کا رسوخ آڑے آیا اور یہ گھڑی تھوڑے عرصے کے لیے ٹل گئی - بالآخر پشکن سنہ ۱۸۲۰ ع میں چار سال کے لیے جنوبی روس میں نظر بند کردیا گیا - سنہ ۱۸۲۴ ع میں اسے سرکاری ملازمت کا نا اہل قرار دیا گیا اور خفیہ پولیس کی نگرانی میں اپنی زمینداری میں رہنے کا حکم دیا گیا —

فرصت کے یہ لمحات پشکن کے لئے ابر رحمت ثابت ہوئے - اسی زمانے میں اس کے قلم نے وہ ادب پارے مرقوم کیے جنہوں نے روسی ادب کی کایا پلٹ کردی - ان تصانیف میں Bronze Horseman اور Evgeni Onegin نے لازوال شہرت حاصل کی اور روسی ادب پر امٹ اثر ڈالا - یہی نہیں کہ ان کتابوں نے روسی ادب کے قالب کو بدل دیا، بلکہ یہ بھی کہا کہ ادب کا موضوع شہروں سے نکل کر دیہاتوں میں چلا گیا - دوسری

کتاب کے متعلق نقادوں کی راے ہے کہ روسی زبان میں اس سے بہتر نظم نہیں لکھی گئی اور بعدازاں اسی نے مثالی تحریک کی بنا ڈالی —

یہ اس وقت کی بات ہے جب اور چیزوں کی طرح روسی ڈراما بھی کس مپرسی کی حالت میں تھا - پشکن کی ہمہ گیر طبیعت اس طرف بھی رجوع ہوئی اور اس نے اس میدان میں نئے اسالیب پیدا کرنے کے لیے شیکسپیر کی صنعت کا خاص طور پر مطالعہ کیا - روسی ادب کے نقادوں کا بیان ہے کہ کردار نگاری' پلاٹ کے اچھوتے پن اور طرز نگارش میں اس نے جو کمال پیدا کیا وہ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا - ڈراماتسٹ کی حیثیت سے پشکن اس وجہ سے مشہور نہ ہوا کہ وہ اول و آخر ایک شاعر تھا - اور ایسا شاعر جس کی عظمت اپنے کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے سے انکار کرتی ہے - انگریزی کے دلدادوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس زبان میں لوچ نہیں ہے اور جب تک مترجم آزادی سے کام نہ لے' ترجمہ کامیاب نہیں ہوسکتا - لیکن پشکن کی نظموں سے آزادی برتنا نادانی ہے - کیونکہ اس کا حسن حسن مصوری نہیں بلکہ طرز ادا کی جادو گری ہے —

ڈراما سے قطع نظر کرکے دیکھیے تو اس وقت نثر کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی - اس کے ادھ کچرے پن سے ہر مصنف دامن بچاتا تھا اور جو کہتا تھا وہ نظم میں کہتا تھا - پشکن کی زندگی کا آخری دور نثر نگاری میں گزرا اور اس کی بعض تحریریں مثلاً Queen of Spades اور Captain's Daughter کا شمار روسی ادب کے شاہکاروں میں ہوتا ہے - خط نویسی کو بھی اس نے بجائے خود ایک فن بنا دیا اور اس طرز میں بھی وہ بے ہمتا سمجھا جاتا ہے - غرض یہ کہ وہ ایک باکمال ہمالی تھا

جس نے بنجر زمینوں کو توڑ کر ان میں ایسی آب یاری اور چمن بندی کی کہ آج بھی وہ باغ سدا بہار اور شاداب ہے - یہی وجہ ہے کہ آج وہ انقلابی روس جو تمام پرانے بتوں کو مسمار کر رہا ہے اس کی قبر پر تہنیت کے پھول لے کر آیا ہے اور اسے روسی زبان اور ادب کا بابا آدم کہہ کر پوج رہا ہے —

سنہ ۱۸۲۷ ع میں پشکن اپنے عروج کی بلندی پر تھا - اس وقت اس کی عمر صرف ۲۸ سال تھی - انہیں دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جو آگے چل کر اس کے لیے مہلک ثابت ہوا - دو سال پہلے زار الیکزنڈر کا انتقال ہوچکا تھا - اس کی موت ایک خونین بغاوت کا پیغام لے کر آئی - مگر اس کے جانشین زار نکولس نے نہایت سفاکی سے اسے کچل دیا - اسی اثنا میں پشکن نے اپنی رہائی کی درخواست دی - نکولس نے اس شرط پر اسے رہا کیا کہ وہ اپنی تصانیف شایع کرنے کے پہلے اسے دکھلا لیا کرے - پشکن نے یہ شرط مان لی - اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف تو سیاسی گروہ میں اس کی عزت گھٹ گئی اور دوسری طرف اس کی تخلیقی قوت پر بہت سی پابندیاں عاید ہوگئیں - پشکن کے دل پر ناکامی اور مایوسی کے بادل چھا گئے اور وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے بادہ نوشی اور آوارہ گردی کی طرف مائل ہو گیا - رفتہ رفتہ یہ بے چینی اور تکان بڑھتی گئی - وہ کسی "مستقل عورت اور مستقل گھر" کی آرزو کرنے لگا - کئی عشق بازیوں کے بعد اس نے ایک لڑکی سے شادی کرلی —

چھ سال تک وہ سکھ چین کی زندگی بسر کرتا رہا - سنہ ۱۸۳۷ ع میں بیرن دانتی نامی شخص نے اس لڑکی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے - پشکن سے یہ نہ

دیکھا گیا اور اس نے اپنے رقیب روسیاہ کی توہین کی - انجام کار دونوں میں ڈوئیل ہوگیا - بیرن نے پہلے گولی چلائی اور پشکن کو بری طرح زخمی کردیا - دو روز بعد پشکن مرگیا —

پشکن کی موت کی خبر نے نوجوان روس کی روح کو چونکا دیا - حکومت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں جنازے کے جلوس میں ہنگامہ نہ ہو - اس لیے اس نے فوراً شاعر کی لاش پر قبضہ کر لیا - اور آدھی رات کے وقت چپ چاپ ایک چھوٹے سے قبرستان میں اسے دفن کردیا —

وقت گزرتا گیا اور پشکن کا انقلاب آفرین پیام زیادہ قوت پکڑتا گیا - آج جب اس کی موت کو سو سال گزر گئے ہیں تو دنیا اس شاعر کی قبر پر کوئی نیا سالدیسا سلنے کے لیے جمع ہو رہی ہے —

افکار و واقعات

۱ - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی

از

(اڈیٹر)

اس کانفرنس کو قائم ہوئے پچاس سال ہوتے ہیں - سر سید نے اسے سنہ ۱۸۸۷ ع میں قائم کیا تھا - اس کے مقاصد بہت وسیع تھے اور اگرچہ ان تمام مقاصد کی پوری پوری تکمیل کبھی نہ ہوئی لیکن اس میں شک نہیں کہ ابتدائی پندرہ بیس سال میں حصول تعلیم کی ترغیب دینے، تعلیم پھیلانے اور خاص کر ادبی فضا پیدا کرنے میں یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی - لوگ دور دور سے بڑے شوق کے ساتھ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کی تقریروں، لکچروں اور مقالوں اور نظموں کو سن کر محظوظ ہوتے اور معلومات کا ذخیرہ اور ادب کا ذوق ساتھ لے کر واپس جاتے تھے - سر سید کے خیالات سے جو پہلے وحشت تھی وہ بالکل جاتی رہی تھی اور وہ قوم کے مسلم سردار مان لیے گئے تھے اور اب ان کی ہر بات غور اور ادب سے سنی جاتی تھی - اُن کو دیکھنے، اُن کی باتیں اور تقریریں سننے، شمس اردو مولانا نذیر احمد کے پر زور اور پرلطف لکچروں سعدیٔ ہند مولانا حالی کی دل گداز

اور حکیمانہ نظموں ، مولانا شبلی کے مقالات ، نواب محسن الملک کی فصیح و بلیغ تقریروں سے لطف اُٹھانے کے لیئے دور دور سے لوگ کھچے چلے آتے تھے - ان بزرگوں اور ادیبوں کی وجہ سے کانفرنس نے ملک میں ایک خاص حیثیت اور اہمیت پیدا کرلی تھی - جوبلی کے چار پانچ روز میں اُس زمانے کی جھلک نظر آتی تھی - تقریباً ایک درجن مختلف شعبوں کا انتظام کیا گیا تھا جن کے اجلاس روز و شب میں الگ الگ ہو رہے تھے - علاوہ ان کے نمائش تعلیمی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا - شعبوں کی تفصیل یہ ہے —

شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرت - شعبۂ تعلیم نسواں - شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارس اردو - شعبۂ اعلیٰ تعلیم - شعبۂ اردو پریس کانفرنس - شعبۂ مدارس اسلامیہ عربیہ - شعبۂ اردو کانفرنس - شعبۂ تعلیم تکنیکل - شعبۂ تعلیم بالغان - شعبۂ ثانوی تعلیم - شعبۂ اسلامی علوم و فنون —

خاص اردو سے متعلق شعبۂ مدارس اردو ، اردو پریس کانفرنس ، اور اردو کانفرنس تھے - اردو مدارس کے شعبے میں زیادہ مدرسین اور مدارس کے ناظر اور انسپکٹر شریک تھے - اس جلسے میں اردو زبان کی تعلیم کے سلسلے میں بعض مفید اور نئی باتیں معلوم ہوئیں اور بعض ایسے حالات کا انکشاف ہوا جن کے متعلق آیندہ انجمن ترقیء اردو کو مناسب کارروائی کرنی پڑے گی - شعبۂ اعلیٰ تعلیم کے اجلاس میں ایک اہم قرار داد یہ منظور ہوئی کہ " ہندستان کی تمام یونی ورسٹیوں میں ہندستانی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے اور ہندستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانا ضروری ہے " —

اردو پریس کانفرنس کے دو اجلاس ہوئے ایک شب کو اور ایک

دوسرے روز دن کو - پہلے اجلاس کے صدر مولوی بشیرالدین احمد صاحب اڈیٹر البشیر اور دوسرے جلسے کے صدر منشی دیا نرائن نگم صاحب تھے - دونوں صاحبوں کے خطبے پر از معلومات تھے اور ایک مدت کے تجربے پر مبنی تھے - اس کانفرنس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو پریس کی ایک جماعت قائم ہوگئی اور انتظامی مجلس بھی بنادی گئی - اگر اس کانفرنس نے زمانے کے حالات کو دیکھ کر مستعدی سے کام کیا تو اردو اخبارات کی اصلاح و ترقی کے لیے بہت مفید کام کرے گی —

اردو کانفرنس میں مولانا سید سلیمان صاحب نے ایک مقالہ ہماری زبان کے نام کے عنوان سے پڑھا - مدلل طور سے یہ ثابت کیا کہ ہماری زبان یعنی اردو کا نام ہندستانی ہے اور اب ہمیں یہی نام اختیار کرلینا چاہیے - اس کے علاوہ افسر صدیقی صاحب (کراچی) نے سندھ کے اردو شعرا پر ایک مقالہ پڑھا - بہلول خاں دانا صاحب ' سکرٹری انجمن ترقیء اردو چوموں نے راجپوتانے میں اردو کی موجودہ حالت پر ایک رپوٹ پیش کی - مولوی محمد ایوب خاں صاحب منشی فاضل ہیڈ مولوی ہائی اسکول ریاست راج گڑھ (بیاورہ) نے جامعۂ اردو (اردو یونیورسٹی) کے قیام و نظام کے متعلق ایک مفصل تجویز مقالے کی صورت میں پیش کی - ایک قرارداد اس اجلاس میں یہ منظور ہوئی کہ صوبۂ متحدہ کے مدارس میں دسویں جماعت تک ہندی اردو ساتھ ساتھ پڑھائی جائے —

یہ جوبلی بعض حیثیتوں سے بہت کامیاب رہی - ضرورت اس امر کی ہے کہ جو قراردادیں اس میں منظور ہوئی ہیں ان پر غور کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان کو عمل میں لانے کی کوشش کی جائے —

جوبلی کی مفصل رپورٹ عنقریب شائع ہونے والی ہے جس میں تمام خطبے اور تقریریں اور قرار دادیں درج ہوں گی اس لیے اس کے حالات تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں —

---

۲ - آل انڈیا ساہتیہ سمیلن ؛ بھارتیہ ساہتیہ پرشد اور دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کے جلسے —

اُنہیں ایام میں جب کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے علی گڑہ میں ہورہے تھے ، مدراس میں ہندستان کی مندرجۂ بالا تین بڑی ہندی مجلسوں کے اجلاس خاص اہتمام سے کیے جارہے تھے —

آل انڈیا ساہتیہ سمیلن ناگری پر چارنی سبھا بنارس کی سرپرستی میں سنہ ۱۹۱۰ ع میں قائم ہوئی - اس کے بانیوں میں ممتاز نام پنڈت مدن موہن مالویہ اور مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کے ہیں - بعد میں ہندوؤں کے نامور اصحاب مثلاً مہاتما گاندھی ، بابو راجندر پرشاد ، سیٹھہ جمنا لال بجاج ، مسٹر برلا ، ڈاکٹر بھگوانداس ، مہاراجا بڑودہ ، مسٹر شیام سندر داس ، مسٹر شو پرشاد گپتا وغیرہ بھی شریک ہوگئے —

اس کا اصلی اور باقاعدہ فروغ سنہ ۱۹۱۸ ع میں ہوا جب کہ گاندھی جی نے اندور کے اجلاس میں صدارت فرمائی - اس کے شاندار نتائج آج ظاہر ہیں - اسی کا ایک بچہ دکشن بھارت ہندی پر چار سبھا ہے جو جنوبی ہند میں ہندی کے پرچار کا کام بڑے زور شور سے کر رہی ہے - اس نے اٹھارہ سال کے عرصے میں چھ لاکھہ اشخاص کو ہندی سکھادی اسی طرح یہ سمیلن اڑیسہ ، بنگال ، آسام ، سندھ ، پنجاب میں کام کررہی ہے - گزشتہ سال ناگپور کے اجلاس میں اس نے ایک اور بڑا کام کیا اور

اپنے مقاصد کو بہت بڑی تقویت پہنچائی - پہلے اس نے ایک پر اثر اور زبردست کمیٹی آل انڈیا ہندی پرچار سبھا کے نام سے قائم کی - اس کے صدر بابو راجندر پرشاد ہوئے اور اس کا مستقر وردھا قرار پایا - اور مہاراشٹر، گجرات، بنگال، اڑیسہ، آسام، سندھ اور دوسرے غیر ہندی صوبوں میں ہندی کی اشاعت کے لیے ایک باضابطہ اسکیم و سیع پیمانے پر مرتب کی گئی - یہ مجلس ان علاقوں میں وہی کام کرے گی جو دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا جنوبی ہند میں کر رہی ہے —

سمیلن نے الہ آباد میں ایک کالج بھی قائم کیا ہے جہاں طلبہ کو امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا ہے - ہندستان میں ان امتحانات کے پانسو مرکز ہیں - ان میں ہندی کے علاوہ دوسرے مضامین مثلاً اخبار نویسی ہندی طب، زراعت، تاریخ، فلسفہ، سائنس وغیرہ کا امتحان بھی ہندی زبان ہی کے ذریعے ہوتا ہے - اب تک تیس ہزار اشخاص امتحان دے چکے ہیں - سیکڑوں ہندی مدارس اور کتب خانوں کا الحاق سمیلن سے ہو چکا ہے -

اس کا ایک شعبۂ تحقیق بھی ہے جس میں قدیم قلمی نسخوں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے اور ان کے مستند اڈیشن مرتب کیے جاتے ہیں —

اس کے سالانہ جلسے مختلف شہروں میں ملک کے نامور لوگوں یا مشہور ادیبوں کی صدارت میں ہوتے ہیں - علاوہ سمیلن کے خاص جلسے کے شعر و سخن، سائنس، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کی مجلسوں کا انعقاد بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے —

اس سال سمیلن کا اجلاس مدراس میں ہوا - یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا اجلاس ایک غیر ہندی صوبے میں ہوا - اس کے علاوہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا (جس کے صدر مہاتما گاندھی ہیں) اجلاس بھی یہیں ہوا —

اجلاس کے کچھ عرصہ قبل آل انڈیا ہندی پرچار سبھا وردھا نے ایک وفد اس غرض سے تیار کیا کہ وہ جنوبی ہند کے علاقوں (آندھرا، تامل ناڈ، کرالا، کرناٹک، میسور وغیرہ) میں دورہ کرے اور ہندی کی اشاعت کی غرض سے تمام بڑے بڑے مقامات میں جاکر لوگوں کو ہندی سیکھنے، ہندی کو ترقی دینے اور ہندی کو تمام ہندستان کی مشترک زبان بنانے کی ترغیب دے - یہ وفد جہاں جہاں پہنچا، اس کا استقبال بڑی شان اور جوش سے ہوا - اس وفد کے سردار مسٹر کاکا صاحب کالیکر تھے اور ان کے ساتھ اور متعدد مشہور اور نامور اشخاص تھے - ان حضرات نیز مدراس کے بعض قابل اصحاب نے جو وفد کے ساتھ ہوگئے تھے ہر مقام پر پر جوش تقریریں کیں اور سب سے زیادہ اسی بات پر زور دیا کہ صرف ہندی ہی ایک ایسی زبان ہے جو صحیح معنوں میں ہندستان کی عام اور مشترکہ زبان ہوسکتی ہے - اور اس لیے ان سب کا یہ فرض ہے کہ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی کریں اور ہندی کو جو "ہندستان کی سب سے قدیم زبان ہے" سارے دیس کی قومی اور مشترک زبان بناکر رھیں اور ناگری رسم خط ہی ہندستان کی تمام زبانوں کا رسم خط ہونا چاھیے - کاکا کالیکر صاحب اور دوسرے مقرروں نے بار بار اس کا اعادہ کیا کہ مہاتما گاندھی نے جو عہد کیا تھا کہ وہ ہندی کو تمام ہندستان کی زبان بناکر رھیں گے، اس کے خوشگوار نتائج اب ظاہر ہو رہے ہیں اور ملک کی خوش نصیبی ہے کہ بھارتیہ ساھتیہ پرشد کے صدر مہاتما جی ہیں - جنوب کی تائید اور حمایت نے ہم سب کے حوصلے بڑھا دیے ہیں —

سیلن ہندی زبان کے بہی خواہوں اور دکشن بھارت ہندی پرچار

سبھا کو جنوبی ہند میں ہندی زبان کی کامیاب تبلیغ پر مبارک باد دی اور میسور، کوچین اور ٹراونکور کی حکومتوں کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انہوں نے اپنے ہاں کے مدارس میں ہندی کی لازمی تعلیم کا انتظام کردیا ہے۔

مسٹر کاکا کالیکر کی تحریک پر یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایسے اداروں میں جن کا تعلق پورے ہندستان سے ہو ہندی زبان ذریعۂ اظہار خیال بنائی جائے اور صوبجات کی حد تک صوبجاتی زبانیں استعمال کی جایا کریں - یہ راشٹر بھاشا سمیلن کی سفارش تھی جو کانگریس کے اجلاس کے زمانے میں فیض پور میں منعقد ہوئی تھی -

متعدد اراکین نے بشمول مسٹر گاندھی، یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کے آل انڈیا اجلاس نیز صوبجاتی اجلاسوں میں ہندی زبان ذریعۂ کارروائی اور ذریعۂ تقریر و بحث قرار دی جائے۔ مگر مدراس کے بعض ذی اثر اصحاب نے اس بنا پر مخالفت کی کہ اس سے ان صوبوں والوں کو سخت دشواری ہوگی جہاں ہندی رائج نہیں - تاہم اس کی زبردست کوشش شروع کردی گئی ہے کہ جنوبی صوبوں میں ہندی زبان رائج ہو جائے اور جلد سے جلد کانگریس کی زبان ہندی قرار پا جائے —

ایک تحریک یہ بھی منظور کی گئی کہ ریلوے بورڈ اور ریلوے کمپنیوں اور خاص کر ساؤتھ انڈین و مدراس اور سدرن مرہٹہ ریلوے کمپنی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے کہ وہ اپنے تمام پمفلٹ، نوٹس، اعلانات، ٹائم ٹیبل (اوقات نامے)، قواعد و ضوابط، ناگری رسم خط میں چھپوا کر شائع کیا کریں۔ نیز اسٹیشنوں کے نام اور پلیٹ فارموں کے نمبر بھی ناگری میں تحریر کیے جایا کریں —

ایک دوسری تحریک یہ منظور ہوئی کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ

سرکاری ٹکنیکل امتحانات میں ہندی شارٹ ہینڈ اور ہندی ٹائپ رائٹنگ کو بھی شامل کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مدارس کے ذمہ دار عہدہ داروں سے اپیل کی جائے کہ ان کی تعلیم کا مدارس میں خاطر خواہ انتظام کیا جائے —

سمیلن کے اجلاس میں جس وقت ہندی صرف و نحو میں ترمیم کا مسئلہ پیش تھا، تو اس بحث کے دوران میں سیٹھہ یعقوب حسن نے کہا کہ ہندی ہندستانی کا لفظ تشریح طلب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابتدا سے ہندستانی ایک زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترکہ طور پر بولی جاتی تھی - مگر چند روز سے اس مشترک زبان کی دو شاخیں ایک دوسری سے مختلف بلکہ متضاد سمتوں میں پھیلتی جاتی ہیں جن میں سے ایک کو سنسکرت کی ٹھونس ٹھانس سے اور دوسری کو فارسی عربی الفاظ کی آمیزش کی بدولت ایک دوسرے سے اور زیادہ دور کیا جارہا ہے - اس طرح وہ زبان جو ایک زمانے میں ہندو مسلم اتحاد و ربط کی ضامن بنی تھی اب اپنے مقصد سے الگ ہوگئی ہے - انہوں نے کہا کہ سمیلن بڑی خدمت انجام دے گی اگر اس رجحان کو بدل سکے۔

۲۹ مارچ کو سمیلن کے دوسرے دن کے اجلاس میں مہاتما گاندھی نے اس کی تشریح کی کہ وہ ہندی یا ہندستانی یا اردو کے بجائے "ہندی ہندستانی" کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں - انہوں نے کہا کہ یہ سوال سب سے پہلے ۱۹۱۸ع میں اٹھایا گیا تھا ۔ اور اندور کی صدارت کے وقت انہوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن سے جو در اصل سمیلن کے بانی مبانی ہیں اس کی تشریح بھی کردی تھی - " ہندی ہندستانی " کا مرکب لفظ ناگپور کے اجلاس کے بعد سے اختیار کیا گیا جہاں یہ دکھانا مقصود تھا کہ انہیں اردو سے محض اس وجہ سے کوئی پرخاش نہیں کہ اس کا رسم خط مختلف ہے

یا یہ کہ اس میں معمولی ہندی الفاظ کے لیے بھی فارسی لفظ مستعمل ہیں - بہر حال ہم لفظ "ہندی" کو کسی طرح ترک نہیں کرسکتے کیونکہ یہ سمیلن کا جزو لاینفک ہے - اس کے علاوہ ہندی وہ لفظ ہے جو اس زبان کے لیے مسلمان بھی ابتدا میں استعمال کرتے تھے - "ہندی ہندوستانی" سے ایک ایسی زبان مراد ہے جو نہ تو غیر معمولی سنسکرت الفاظ سے معمور ہو اور نہ غیر معمولی طور پر فارسی عربی الفاظ سے - ارباب سمیلن ہندو اور مسلمان اہل قلم میں انتہائی خوشگوار تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہیں - اس لیے انہوں نے "ہندی ہندستانی" کا لفظ اختیار کیا —

بھارت ساہتیہ پرشد کے خطبۂ صدارت میں مہاتما گاندھی نے رسم خط کے متعلق فرمایا کہ اگر کوئی رسم خط جو ہندستان کی تمام زبانوں کے مشترک ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے تو وہ ناگری خط ہے - میرے خیال میں کوئی دوسرا رسم خط موزوں نہیں ہو سکتا - مجھے معلوم ہے کہ ناگری اور اردو میں ایک قسم کا مقابلہ ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں سنسکرت خاندان کی زبانوں کی ضرورتیں اردو اور رومن رسم خط سے ایسی پوری نہیں ہوسکتیں جیسی ناگری سے ... ... اگر لوگ اپنی مادری زبان کے ذریعے سے خواندہ بنائے جاسکتے ہیں تو کیوں نہ کوشش کی جائے کہ وہ ناگری خط کے ذریعے خواندہ بنائے جائیں خصوصاً اس لیے کہ یہ کوشش انہیں قومی اتحاد کی طرف لے جائے گی - بر خلاف اس کے مادری زبانیں صوبہ واری اختلافات کو زندہ رکھنے کا موجب ہوں گی -

مسٹر رام کیشو راؤ نے پرشد کی کارروائیوں کے متعلق تلنگی میں ایک مقالہ پڑھا جس میں انہوں نے یہ کہا کہ پرشد کی تمام کارروائیاں

صرف ھندی ھی میں نہ ہونا چاھیئیں بلکہ انگریزی کو بھی جو اس وقت بین اقوامی زبان ہے استعمال کرتے رہنا چاھیے - اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ جب کہیں زبان کے متعلق کوئی کانفرنس منعقد ہوگی تو آس پاس کے علاقوں کے نمایندوں کو اپنے ادب پر روشنی ڈالنے کے لیے مدعو کیا جاسکے گا ' نیز خود ہندستان کے مختلف علاقوں کے نمایندے ایسی کانفرنس میں بلائے جاسکتے ہیں تاکہ اپنی خاص زبان کے متعلق دوسرے کے لیے معلومات بہم پہنچائیں - مترجموں کی ایک ایسی جماعت کی بھی ضرورت ہے جو ہندستان کی مختلف زبانوں کے علمی ذخیرے کو ہندستانی نیز دیگر دیسی زبانوں میں ترجمہ کرکے پیش کرسکیں - رہا رسم خط کا مسئلہ تو ہندی ' گجراتی اور مرھٹی کے لیے ایک مشترکہ رسم خط معین کیا جاسکتا ہے لیکن تامل اور تلنگی کو اس سے مستثنیٰ کرنا ہوگا کیونکہ ان زبانوں کا صدیوں پرانا رسم خط بالکل مختلف پیرایے میں موجود ہے - پرشد کو ان زبانوں کے لیے بھی ناگری رسم خط مقرر کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنی چاہیے کیونکہ لوگوں کو اپنا رسم خط اتنا ہی عزیز ہے جتنی اپنی مادری زبان —

دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کے مبلغین کی ساتویں سالانہ کانفرنس بھی سمیلن کے پنڈال میں ہوئی - صدر مسٹر جمنا لال بجاج تھے - پنڈت ہری ہر شرما جنرل سکرٹری سبھا نے حاضرین کو اطلاع دی کہ سبھا کی تجویز پر مدراس یونیورسٹی نے ودوان کے نصاب میں ہندی زبان کی تعلیم شامل کرلی ہے - سبھا کے دفاتر ' مدارس اور مطبع کے لیے ایک وسیع قطعۂ زمین حاصل کرلیا گیا ہے اور کافی تعمیر بھی ہوچکی ہے - شمالی مبلغین نے تبلیغ کی خاطر جنوبی زبانوں پر بھی عبور حاصل

کرلیا ہے —

انہیں جلسوں کے دوران میں ایک علمی نمائش بھی ہوئی تھی - مسز لیلاوتی منشی نے اس کی افتتاح پر اپنی تقریر میں کہا کہ "ہندی کی پشت پر سنسکرت زبان ہے اور سوائے ایک کے ہندستان کی تمام زبانوں کا یہی حال ہے - یہی ایک ایسی زبان ہے جسے ہندو مسلمان سب سمجھتے ہیں - بارہ کروڑ سے زیادہ یعنی ہندستان کی آبادی کا ایک تہائی حصہ پہلے سے اسے مثل مادری کے استعمال کرتا ہے - اور گیارہ کروڑ ہندی ایسے ہیں جو اسے سمجھتے ہیں ' اگرچہ اُن کی مادری زبان نہیں ہے - اس تقسیم میں گجراتی ' مہاراشٹری ' بنگالی آجاتے ہیں - ہندستان کی ادبیات میں صرف ہندی ایک مشترکہ ذریعہ ہوسکتی ہے —

قومیت جگناتھ کی رتھ کی طرح بڑھی چلی جارہی ہے - اُسے کم زور سے کوئی ہمدردی نہیں جسے وہ اپنی رفتار میں کچلتی ہوئی چلی جاتی ہے - اس لیے جنوب کو زمانے کا ساتھ دینا چاہیے - گزشتہ زمانے میں جنوب نے شمال سے سنسکرت کے ذریعے اتحاد کیا ' آج اس اتحاد کو اُس نے انگریزی کے ذریعے قائم رکھا ؛ اور کل اسے ہندی اور صرف ہندی کے ذریعہ قائم رکھنا پڑے گا " —

۳ - گاندھی جی اور اردو

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب ناظم شعبۂ اطلاعات سیاسی نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے " مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ - گاندھی جی اور اردو " کے عنوان سے آٹھ صفحے کا ایک پمفلٹ شایع کیا ہے - پہلے صفحے پر ڈاکٹر صاحب کا خط ہے اور باقی سات صفحوں پر اخبار

هریجن اور دستور کانگریس کے اقتباس هیں ۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہ جو " بعض فرقہ پرست اخبارات نے یہ خیال منظم طور پر پھیلانا شروع کردیا ہے کہ اس سمیلن کی کارروائیوں اور ان میں گاندھی جی کی شرکت کا منشا محض اس قدر تھا کہ هندستان میں اردو زبان اور رسم الخط متاکر هندی زبان اور دیو ناگری رسم الخط رائج کردیا جائے " وہ غلط ہے بلکہ " حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے " - اس کے بعد فرماتے هیں کہ ان اقتباسات کے مطالعے کے بعد " آپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہ هوگا کہ ان حالات میں اردو کی عمومی تحریک کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ " —

جو اقتباسات اس پمفلٹ میں درج هیں وہ کچھ نئے نہیں هیں تاهم هم نے پھر انھیں غور سے پڑھا، ان سے هرگز وہ منشا نہیں پایا جاتا جو ڈاکٹر صاحب ثابت کرنا چاھتے هیں - بھارتیہ ساهتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور میں ساری بحث یہ تھی کہ هندستانی کا لفظ رکھا جائے یا هندی هندستانی کا - میں هندستانی کے لفظ پر اس لیے زور دیتا تھا کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس نے اپنی قرارداد میں اسی کو منظور کیا تھا - " هندی هندستانی " کا لفظ اُس وقت پہلی دفعہ سننے میں آیا - اس سے پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا - یہ خاص گاندھی جی کی ایجاد تھی - اس جلسے میں کانگریس کے تین جیتے جاگتے پریزیڈنٹ موجود تھے لیکن کسی نے کانگریس کے رزولیوشن کی تائید میں کچھ کہنا تو در کنار سر تک نہ هلایا جب اس بھونڈے مرکب " هندی هندستانی " پر ذرا گرم بحث هوئی تو گاندھی جی نے اسے بدل دیا اور اس کی بجائے " هندی یعنی هندستانی " کا فقرہ تجویز کیا اور اسی پر ووٹ لیے گئے اور یہی منظور هوا - لیکن

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ گاندھی جی منظور شدہ قرار داد کے خلاف پھر " ہندی ہندستانی " استعمال کرنے لگے ہیں - کیا یہ امر دیانت کے خلاف نہیں ہے ؟ یوں ہٹیں قدیم سے مشہور چلی آرہی ہیں لیکن چوتھی ہٹ گاندھی ہٹ ہے جو ان سب سے بڑھ کر ہے - وہ کبھی کسی کی بات نہیں مانتے اور اپنی ضد پر قائم رہتے ہیں - " ہندی ہندستانی " کا لفظ نہایت مغالطہ آمیز اور دھوکے میں ڈالنے والا ہے اور اس سے یہ لوگ خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں - ناگپور میں جو انہوں نے اس کے معنے فرمائے تھے وہ اور تھے اور اب جو تشریح کی ہے وہ کچھہ اور ہی ہے -

مدراس میں اس سال سمیلن اور پرشد وغیرہ کے جو اجلاس ہوئے ہیں اس میں جو تقریریں ہوئیں اور جو مقالے اور خطبے پڑھے گئے انہیں ملاحظہ کیجیے ہندی کے سوا کہیں کوئی دوسرا لفظ آیا ہے - اس کا اعلان ہوچکا ہے اور ان جلسوں میں بھی بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ گاندھی جی (اور ان کے ساتھہ ان کے رفقا) نے یہ عہد کرلیا ہے کہ ہندی کو سارے ہندستان کی زبان اور ناگری خط کو دیس کی ساری زبانوں کا رسم خط بنا کر رہیں گے - ہم ڈاکٹر محمد اشرف صاحب سے صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ وہ اور کچھہ نہیں تو کم سے کم اپنی یاد تازہ کرنے کے لیے اپنا لکھا ہوا وہ مضمون ہی پڑھ لیں جو گزشتہ سال انہوں نے سہیل میں لکھا تھا —

اچھا یہ بھی جانے دیجیے - مسٹر جمنا لال بجاج اور مسٹر کاکا کالیکر وغیرہ کے خطبے دیکھیے کہ یہ کیا زبان ہے - نہ ہندستانی ہے نہ اردو - شاید یہ وہ جدید ہندی ہے جس کو سارے ملک کی عام زبان بنانا مقصود ہے - ڈاکٹر محمد اشرف صاحب نے جو گاندھی جی کا قول نقل کیا ہے اس میں وہ صاف کہتے ہیں کہ " جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ

صرف ایسی ہندی زبان سے لاگ کھاسکتی ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ زبانیں سنسکرت کے الفاظ اور سنسکرت آواز سے مانوس ہیں" موجودہ ہندی میں پہلے کیا کم سنسکرت کی ملاوٹ تھی جو اب جنوبی ہند کی خاطر اور آمیزش کی ضرورت ہوئی —

ہندی کی اشاعت اور پروپاگنڈے میں روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے اور اس امر کی طرح طرح سے کوشش کی جارہی ہے کہ ہندی دانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ چند سال بعد اس کی اکثریت ثابت ہوسکے اور ہندستان کی عام اور مشترک زبان ہونے کا دعوی کرسکے - ہندی کے معاملے میں یہ سرگرمی اور جوش و خروش اس وقت سے شروع ہے جب سے گاندھی جی نے سمیلن میں شرکت کی اور اس کے بعد بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے مستقل صدر بنے - گاندھی جی کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے لیکن افسوس کہ کچھہ عرصے سے وہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہوگئے ہیں - اور ان کے خیال اور عمل میں قوم پرستی کی وہ شان نہیں رہی جو پہلے تھی - مثلاً جب انہوں نے اچھوت اقوام کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تو اس لیے نہیں کہ وہ مظلوم، پامال اور ستم رسیدہ انسانی جماعت ہے بلکہ اس خیال سے (جیسا کہ اس وقت انہوں نے صاف الفاظ میں فرمایا تھا) کہ وہ نہیں چاہتے کہ ہندو جاتی کے استحکام میں فرق آئے - کیونکہ اس وقت کے حالات سے گاندھی جی کو یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں اچھوت دوسرے فرقوں میں نہ جا ملیں اور ہماری اکثریت اقلیت میں نہ بدل جائے - اس لیے کہ اچھوتوں کا شمار ہندوؤں میں محض سیاسی اغراض سے کیا جاتا ہے - اچھوتوں کی اصلاح اور ترقی نہایت نیک اور مقدس کام ہے

لیکن گاندھی جی نے جس نیت سے شروع کیا وہ سخت تنگ نظری اور فرقہ پرستی پر مبنی ہے - کچھہ تعجب نہیں کہ یہی نیت ہندی کے پرو پاگنڈے میں کار فرما ہو—

حال ہی میں مجھے اپنے ایک قابل احترام بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بڑے پکے قوم پرست (نیشنلسٹ) اور زبردست کانگریسی ہیں- میں نے اپنے مسلمان ملاقاتیوں میں صرف دو شخصوں کو پکا کانگریسی اور قوم پرست پایا جن کا قدم اپنے اصول سے کبھی نہیں ڈگمگایا - ایک تو ڈاکٹر انصاری مرحوم تھے اور دوسرے یہ صاحب جن کا میں ذکر کر رہا ہوں - ان سے جب اُن امور میں گفتگو آئی تو کہنے لگے کہ میں اب بھی ویسا ہی قوم پرست اور کانگریس کے اصول کا حامی ہوں جیسا پہلے تھا لیکن حال میں کانگریس کے بعض لیڈروں کی کارروائی سے مجھے تشویش پیدا ہوگئی ہے - جب ان لوگوں سے ان معاملات پر گفتگو آتی ہے تو اپنے آپ کو بالکل معصوم اور بری الذمہ بتاتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ان کا رنگ دوسرا ہوتا ہے - جب ایسے مستقل مزاج اور مستحکم خیال کے شخص کو تشویش پیدا ہوجائے تو دوسروں کی بدگمانی کچھہ بیجا نہیں - اور ظاہر ہے کہ جب کانگریس کے سر برآوردہ ارکان ملک میں جگہ جگہ پرو پاگنڈا کرتے پھریں اور خصوصاً جس تحریک کے سر پرست اور حامی گاندھی جی ہوں تو وہ لامحالہ کانگریس ہی کی تحریک سمجھی جائے گی - توجیہوں اور تاویلوں کا میدان بہت وسیع ہے ۔اصل چیز عمل ہے اور جب ہم عمل دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں پر سے پردہ سا ہٹ جاتا ہے —

افسوس ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ ملک کے مختلف فرقوں میں

اتحاد کی شدید ضرورت تھی گاندھی جی نے یہ تحریک اس ڈھنگ سے شروع کی کہ جس سے بجائے اتفاق کے نفاق کی بنیاد پڑ گئی اور فرقہ پرستی کی جڑیں اور مضبوط ہوگئیں - اس کے بعد دوسروں کو فرقہ پرستی کا الزام دینا کہاں تک جائز ہوسکتا ہے - آزادی حاصل کرنے کے یہ لچھن نہیں ہوتے - جس طور سے جس ہندی کا پروپاگنڈا کیا جا رہا ہے اور جو طریقے اس کی اشاعت کے اختیار کیے جا رہے ہیں' اس سے یہ ہندی کبھی ملک کی زبان نہیں ہوسکتی - البتہ اس سے جو نقصان پہنچا ہے اور آیندہ پہنچنے والا ہے وہ نہایت قابل افسوس ہے اور اس کے ذمہ دار سراسر مسٹر گاندھی ہیں اور میں انھیں اور ان کے رفقا کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ —

جس رستے وہ چل رہے ہیں وہ پھوت نگر کو جاتا ہے

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان نے اپنے خطبے میں جو انھوں نے جامعۂ عثمانیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا تھا' بہت معقول بات کہی ہے -

"اگر تمام ہندستان کی ایک زبان اور ایک رسم خط ہوجائے تو قومی نقطۂ نظر سے یہ منتہاے کمال ہوگا' لیکن ایسا منتہا چند صدیوں میں بھی حاصل نہیں ہوسکتا - زبان بول چال کی بولی ہے کسی کے حکم یا اشارے سے نہیں بن سکتی - سیاسی لوگ (پولی ٹی شین ز) اسے پیدا نہیں کرسکتے - یہ (زبان) قدرتی نامی شے سے ملتی جلتی ہے جو خود اپنی ذات سے بڑھتی اور پھیلتی ہے' اگرچہ یہ ضرور ہے کہ غور و پرداخت کرنے سے اس کے نمو میں ترقی ہوسکتی ہے - ایسا قیاس کرنا بھی ممکن نہیں کہ کوئی ایسی صورت ہوسکتی ہے جب کہ تمام ملک کی زبان

دفعتاً بدل دی جائے - زبان کا نمو ایک تدریجی عمل ہے (یعنے یک بارگی نہیں ہوتا رفتہ رفتہ ہوتا ہے) جس کی تکمیل کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں" —

لسانیات میں اب تک یہی اصول مسلم ہے جو سر شاہ محمد سلیمان نے فرمایا ہے؛ لیکن اب ایک نیا تجربہ ہو رہا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ زور وزر سے بھی زبانیں بنتی بڑھتی اور پھیلتی ہیں یا نہیں —

پنڈت جواہر لال نہرو کا سر کلر

آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے بذریعۂ سرکلر دسترکٹ اور لوکل کمیٹیوں کو ہدایت کی ہے کہ ان مقامات میں جہاں اردو داں آبادی ہے وہ اپنے جلسوں کی اطلاعیں وغیرہ اردو میں شایع کیا کریں، خصوصاً پنجاب، دہلی، صوبۂ متحدہ اور دوسرے بڑے شہروں میں —

شاید اس الیکشن (انتخاب) کے بعد ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ اب مسلمانوں کو پرچانا چاہتے ہیں - خیر صبح کا بھولا شام کو آجائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہیے —

---

۵ - آل انڈیا ساہتیہ سمیلن کا اجلاس الہ آباد

یہ اجلاس الہ آباد میں ۲ مئی کو بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی صدارت میں ہوا اس میں یہ قرار دادیں منظور ہوئیں —

(ا) نیشنل کانگریس، صوبوں نیز صدر مجلس وضع قوانین کے ارکان سے درخواست کی جائے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں

اس قسم کی تبدیلی کی تحریک کریں کہ جس سے ان کونسلوں کی کارروائی هندی زبان میں هوا کرے - نیز یہ طے پایا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کی جاے کہ اپنی تمام کارروائی هندی میں کیا کرے —

(۲) کمیٹی نے یہ بھی ے کیا کہ ریلوے حکام سے تحریک کی جاے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل ' نقشے ' قواعد اور ٹکٹ سب هندی زبان میں هوں -

(۳) کوچین ' ٹراونکور اور میسور کے حکام سے ' جنھوں نے اس سے قبل اپنی اپنی ریاستوں میں هندی کے پرو پاگنڈے میں بہت بڑی مدد دی هے ' یہ درخواست کی جاے کہ وہ ریاست کے مدارس میں هندی کی تعلیم لازمی قرار دیں -

(۴) یونیورسٹی اور انٹرمیڈیٹ بورڈ سے درخواست کی جائے کہ هندی شارٹ هینڈ (مختصر نویسی) اور ٹائپ رائٹنگ کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کریں -

(۵) نیز هندی ساهتیہ سمیلن کی استینڈنگ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ڈاکٹر خاں صاحب کانگریس پارٹی لیڈر ' چیف منسٹر ' مسٹر مہر چند کھنا وزیر صوبۂ سرحدی سے درخواست کی جائے کہ وہ حکومت سرحدی کے اس سرکلر کے منسوخ کرانے کی کوشش کریں جو هندی اور گرمکھی کے خلاف نافذ کیا گیا تھا -

(۶) یہ بھی طے پایا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کی گورنمنٹ سے درخواست کی جاے کہ هندی ممالک محروسہ سرکار عالی کی سرکاری زبان تسلیم کی جاے —

اس تمام کارروائی میں کہیں بھی هندستانی کا نام آیا هے - باجود

اس کے جو لوگ ہندستانی (یا اردو) کی اشاعت کا کام کرنا چاہتے ہیں انہیں فرقہ پرست کہا جاتا ہے - یہی الزام دینے والے سمیلن والوں سے کبھی کچھہ نہیں کہتے اس لیے کہ گاندھی جی ان کی پشت پر ہیں —

۲ - انجمن ترقیء اردو کی شاخیں

میں پچھلے نمبر میں ذکر کر چکا ہوں کہ جدید قواعد کی رو سے انجمن کی شاخیں مختلف مقامات میں قائم ہو رہی ہیں - بعض شاخوں کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں - اس کے بعد جو شاخیں قایم ہوئی ہیں ان کا ذکر کیا جاتا ہے -

بنگلور میں انجمن کی پہلے سے ایک شاخ ہے - اس کے متعلق اردو زبان کا ایک کتب خانہ بھی ہے - یہ کتب خانہ پہلے سے قائم تھا - اس سال اسے قایم ہوے ۲۵ سال ہوتے ہیں - چنانچہ حال ہی میں اس کی سلور جوبلی منائی گئی جس میں اردو کی ترقی و اشاعت کے متعلق جلسے ہوے اور ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا - اس لائبریری کے صدر جناب محمد صالح صاحب بی - اے ' بی - ایل ایڈ وکیٹ ہیں جو ہمدرد اور پر جوش ہونے پر بہت خاموش کام کرنے والے ہیں - کتاب خانے کی عمارت بنانے کی بھی تجویز ہوئی ہے اور سرمایہ جمع کرنے کا آغاز کردیا گیا ہے - یہ کتاب خانہ بنگلور کے نوجوانوں کی کوشش کا نتیجہ ہے جسے انہوں نے بڑے استقلال سے قائم رکھا اور ترقی دی ہے —

بنگلور شہر میں بھی طالب علموں کی ایک انجمن ہے انہوں نے مجھہ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اردو کی اشاعت کے لیے ہر قسم کا کام

کرنے کے لیے تیار ہیں - مجھے ان طلبہ اور ان کے بعض اساتذہ کی تقریریں اور مقالے سننے کا اتفاق ہوا - ایسی اچھی اور فصیح زبان میں انھوں نے تقریریں کیں اور اپنے مضمون پڑھے کہ تھوڑی دیر کے لیے میں بھول گیا کہ جنوبی ہند کے کسی شہر میں ہوں یا علی گڑھ' الہ آباد' حیدرآباد یا لاہور میں ہوں - میں نہیں کہہ سکتا کہ ان طلبہ کے جلسے میں شریک ہونے سے مجھے کس قدر خوشی ہوی -

خسرو پور پٹنہ میں ہماری پرانی شاخ ہے اور اب تک قائم ہے - اس کے صدر جناب سید مظہر امام صاحب ہیں جو ادبی اور علمی معاملات میں بڑا ذوق رکھتے ہیں - معتمد شاہ محمد حسن صاحب بسمل ہیں -

جموں کی بزم اردو کا الحاق بھی انجمن ترقیء اردو سے ہو گیا ہے - اس کے صدر جناب پنڈت دینا ناتھ مست کشمیری اور نائب صدر پنڈت وشو ناتھ ماہ بی - اے اور جنرل سکرٹری قیس شروانی ہیں -

اجمیر میں بھی ہماری ایک شاخ قائم ہوئی ہے جس کے صدر نواب محمد عمر خاں صاحب نائب صدر مولانا حمیداللہ خاں صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج اور سکریٹری مولوی عبدالباری معنی صاحب ہیں جو اس شاخ کی ترقی کے لیے خاص طور پر کوشش کر رہے ہیں -

میرٹھ میں بھی ایک شاخ قائم ہوئی ہے جس کی کیفیت آئندہ لکھی جائے گی —

اس سال صوبۂ متحدہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس جونپور میں ہوا تھا - اس میں ایک رزولیوشن یہ بھی منظور کیا گیا -

" چونکہ تمام ملک میں ایک مشترک زبان کا رواج دینا اور اس غرض سے زبان اردو کا تحفظ کرنا ملکی مفاد کے لیے نہایت درجہ اہم

ہے اس لیے یہ کانفرنس انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن کی ان کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھتی ہے جو اس نے اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے کی ہیں اور جن کو زیادہ وسیع اور عملی صورت دینے کے لیے علی گڑھ میں اکتوبر گزشتہ میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی جس میں اردو کی ترویج کی تجویز اور زبان کی اصلاح کے لیے مختلف مفید تجاویز منظور کی گئی تھیں اور مسلمانان صوبۂ ھذہ سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے مقامات میں انجمن ترقیء اردو کی شاخیں قائم کریں جن کے ذریعے سے اردو کتب بینی اور اخبار بینی کا مذاق عوام میں پیدا کیا جائے اور اردو زبان کے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے -

مولوی نظام الدین حسن صاحب جنرل سکرٹری کانفرنس اطلاع دیتے ہیں کہ "اس قرار داد کے منظور ہونے کے بعد فوراً ہی جون پور میں ترقیء اردو کی ایک انجمن قائم ہوگئی جس کے صدر خان صاحب عبدالحمید خاں صاحب مختار منتخب ہوے" - امید ہے کہ یہ انجمن کانفرنس کی قرار داد کے مطابق اردو کی اشاعت و ترقی کے لیے مفید کام کرے گی —

نرسنگھ پور میں بھی ایک کتب خانہ قائم ہوا ہے جس کا الحاق انجمن سے کیا گیا ہے —

حال میں احمدآباد میں انجمن کی ایک شاخ قائم ہوئی ہے جس کے صدر جناب ایچ بی مشہدی صاحب ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر؛ نائب صدر خان صاحب ایم - او قریشی صاحب و سید مصطفیٰ حسن قادری صاحب؛ جنرل سکرٹری سید احمد امین صاحب قادری؛ جائنٹ سکرٹری رضی میاں

فاروقی صاحب سپرنٹنڈنٹ اردو مدارس احمد آباد میونسپلٹی ہیں -
احمد آباد میں ایک ایسی انجمن کی مدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن ان تمام فرائض کو بخوبی انجام دے گی جو اردو کانفرنس میں طے کیے گئے تھے —

جل گانو میں بھی حال میں ایک شاخ قائم ہوئی ہے جس کے سکرٹری سید منظور بخاری صاحب ہیں —

بھوساول میں بھی ایک شاخ کام کررہی ہے یہ زیادہ تر ریلوے کے ملازمین میں کام کرتی ہے اور بہت مفید کام کررہی ہے - ان کے حالات آئندہ لکھے جائیں گے —

تبصرے

ادب

تاریخ و سیر

مذہب و اخلاق

درسیات

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

خاص نمبر

—:o:—

تبصرے

ادب

بہارستان-

شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہور نے، یا جن صاحب نے بھی اس کتاب کو جمع اور شائع کیا، بڑا احسان کیا کہ مولانا ظفر علی خاں جیسے پختہ مشق استاد سخن کا کلام پہلی مرتبہ ایک مجموعے کی صورت میں طبع کرادیا چونکہ کتاب میں سنہ ۳۲ ع کے بعد کی نظمیں نہیں ہیں اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ اسی زمانے میں مرتب ہوگیا تھا مگر طبع و اشاعت میں چار پانچ سال اور صرف ہوگئے - یہ دعوی بھی نہیں کیا جاسکتا کہ سن ۳۲ تک جو کچھہ مولانا نے کہا ہے وہ سب مجموعے میں آگیا - ایسی مصروف اور پھر طوفانی زندگی والے سے یہ امید رکھنی فضول ہے کہ وہ باقاعدہ خوش خط بیاضیں لکھتا یا لکھواتا رہے گا اور پھر آے دن کی دار وگیر، ترقی اور ضبطی میں اپنے کاغذات کو محفوظ رکھہ سکیگا۔ لیکن ہمارا یہ مطالبہ کرنا کچھہ بیجا نہیں کہ جو نظمیں زمیندار یا کسی دوسرے جریدے میں چھپ چکی ہیں وہ اس مجموعے میں ضرور شامل ہونی چاہیے تھیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ناشر 'بہارستان' نے یا تو اس کا

اهتمام نہیں کیا اور یا ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی —

کتاب کی ترتیب میں جیسی کچھہ بے پروائیاں کی گئی ہیں ' انہیں دیکھہ کر یہی گمان ہوتا ہے کہ مطبوعہ نظموں کو بھی فراہم کرنے میں پوری کوشش نہیں کی گئی - تاہم ' جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا یہ بھی ناشر کا احسان ہے کہ اس نے چھوٹی بڑی ۶۵۰ نظمیں یک جا کر کے چھپوا دیں اور اس زمانے میں جب کہ ہر طرف نوخیز اور معمولی شعرا کے رنگ برنگ کے دیوان اور منقش و مصور مجموعے شایع کر رہے ہیں ' ظفر علی خاں کا کلام خاصی ضخیم کتاب کی شکل میں چھپ گیا البتہ یہ ہماری سمجھہ میں نہیں آتا کہ جن نظموں کی تاریخ تصنیف معلوم اور قلمبند کی گئی ہے ان کو ترتیب زمانی کے ساتھہ درج کرنے میں کیا امر مانع تھا؟ مثلاً کتاب کے ایک باب " مغربی تہذیب " میں صفحہ ۲۲۴ پر ایک نظم سن ۱۹۲۴ کی ہے - اس کے بعد والی کی تاریخ سن ۱۹۲۰ ع تحریر ہے - پھر سن ۳۰ کی دو نظمیں ہیں اور کچھہ آگے چل کر یک بہ یک سن ۱۹۱۱ کی نظمیں آجاتی ہیں - یہ بے ترکیبی جا بہ جا نظر آتی اور بعض اوقات نہایت گراں گزرتی ہے - ممکن ہے حضرت ناشر شاعر کے کلام میں ارتقائی مدارج دکھانے کی ضرورت نہ تسلیم کرتے ہوں - پھر بھی اس کی کوئی وجہ یا مصلحت نہیں ہو سکتی کہ ابتدائی زمانے کا کلام بیچ میں یا آخر میں اور بعد کے زمانے کی نظمیں پہلے درج کردی جائیں - ابواب کی بے ڈھنگی تقسیم اور ان کی ذیل میں بے جوڑ نظمیں جمع کرنے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ترتیب کتاب میں غور و فکر کی زحمت بالکل نہیں اٹھائی گئی اور غالباً کتاب نظر ثانی سے بھی محروم رہی کہ اس میں بعض نظمیں دو دو مرتبہ درج ہو گئیں - جیسے " شیعی اور بریلوی " صفحہ ۱۱۵ اور مکرر صفحہ ۷۳۳

"باباے خلافت صفحه ۵۱۲ اور مکرر صفحه ۷۷۸ پر - "فن لابه گری کے امام" صفحه ۵۳۶ اور مکرر ۷۸۲ پر -

کتاب ۱۸ یا ۱۹ ابواب میں منقسم هے لیکن فہرست مضامین میں انہیں نمایاں نہیں کیا گیا ' ظفر علی خاں اور ان کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نه سہی لیکن یه مجموعه شائع کرتے وقت ضروری تھا که کم سے کم اس کی فراهمی اور ترتیب کے متعلق هی کوئی دیباچه یا تمہید لکھه دی جاتی - به خلاف اس کے کتاب کے شروع میں مولانا حالی مرحوم کی ایک نظم " تقریب ' کے عنوان سے درج کی گئی جو کم و بیش پچیس برس قبل یعنی جنگ بلقان کے زمانے کی لکھی هوئی هے اور اس میں ظفر علی خاں کے جوش و غیرت دین اور خدمات ملی کی اسی پراثر ' حکیمانه پیرایے میں داد دی گئی هے جو مولانا مرحوم کا حصه تھا لیکن ظفر علی خاں کی شعر گوئی کے متعلق کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا اور وہ مشکل سے " بہارستان " کی موزوں تقریب هوسکتی هے —

همیں امید هے که ناشر کتاب هماری ان نکته چینیوں سے مکدر نه هوں گے کیونکه در حقیقت هم مولانا ظفر علی خاں کو زمانۂ حاضرہ کے ممتاز ترین شعرا میں شمار کرتے هیں اور اسی لیے آرزومند هیں که ان کا کلام بہترین ترتیب و طباعت کے ساتھه شائع هو اور " بہارستان " کے مکرر طبع کرتے وقت وہ اهتمام اور کوشش صرف کی جاے جس کا یه مجموعه مستحق هے —

مولانا نے شعر گوئی کو کبھی مستقل مشغله نہیں بنایا - اُن کے کلام کا بیشتر حصه بدیه گوئی کی صنف میں داخل هے اور ان کے اکثر احباب گواهی دیں گے که ایسا بارها هوا هے که کوئی خیال آیا یا کوئی موضوع

سوجھا اور مولانا نے باتیں کرتے کرتے اچھی خاصی نظم موزوں کردی - چونکہ یہ نظمیں عموماً وقتی مسائل یا اخباری مباحث پر کہی گئی ہیں لہذا ایسے کلام کو اخباری شاعری سے موسوم کرسکتے ہیں اور بے شبہ اس میں ہر جگہ وہ معنویت اور جلا نظر نہیں آتی جس کی ظفر علی خاں جیسے ذی علم اور صاحب ذوق ادیب سے توقع ہوسکتی ہے بایں ہمہ مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور طبیعت کی خدا داد جودت و موزونیت نے وہ وہ گلریزیاں اور جواہر نگاریاں کی ہیں کہ بہت سے اشعار اپنے رنگ میں شاید کوئی نظیر نہیں رکھتے —

مولانا کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کے وہ ان کے اسثائل اور محسوسات کا آئینہ ہے - وہ جو کچھہ دل سے مانتے یا جن کیفیات و اثرات سے متاثر ہوتے ہیں ' ان کو بجنسہ زبان شعر سے ادا کرتے ہیں اور ان کی یہی حیرت انگیز صداقت پسندی ہے جس کی بدولت وہ قدیم طرز کی مصنوعی شاعری یعنی عاشقانہ غزل گوئی پر غالباً کبھی مائل و متوجہ نہیں ہوے - چنانچہ پیش نظر مجموعۂ کلام اس صنف شعر سے بالکل خالی ہے - رہے وہ عقائد و جذبات جو ان کی شعر گوئی کے قوی محرک ہیں تو ان میں سب سے ممتاز ان کے مذہبی یا اسلامی جذبات ہیں - جیسا کہ خود فرماتے ہیں : —

خدا کی حمد پیغمبر کی نعت اسلام کے قصے
میرے مضموں ہیں جب سے شعر کہنے کا شعور آیا

" بہارستان " کے آغاز میں حمد اور چند منظوم دعاؤں کے بعد پہلی نعت " عرض حال بدرگاہ رب العزۃ " کے عنوان سے یوں شروع ہوتی ہے —

اے کہ ترا جمال ہے زینت محفل حیات
دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکواۃ
تیری جبیں سے آشکار پرتو ذات کا فروغ
اور ترے کوچے کا غبار سرمۂ چشم کائنات
بارگہ الست سے بخش دیے گئے تجھے
سب ملکی تصرفات سب فلکی تجلیات
چہرۂ کُشا کرم تیرا قاف سے تابہ قیرواں
لطف تیرا کرشمہ سنج کعبہ سے تابہ سومنات
تیرے سلام کے لیے گلشن قدس کے طیور
گھوم رہے ہیں ڈال ڈال جھوم رہے ہیں پات پات
دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف الٹ گئی
جھک گئی گردن ہبل ٹوٹ گیا طلسم لات
آنکھ کے اک اشارے سے تو نے معاً بدل دیے
ذہن کے سب تصورات قلب کے سب تاثرات

نظم کی روانی اور قوت بیان داد کے قابل ہیں اور یہی کیفیت اُن نعتیہ نظموں کی ہے جن کے عنوان ہیں : " صلوا علیہ و آلہ " " اسلامیان ہند کی فریاد " " عرش سے فرش تک " " فخر رسل " اور " انک انت الا ملی " —

حمد و نعت کے بعد " اسلام " " اسلامی روایات " اور " اسلامی نغمے " تین عنوانوں کے تحت میں اسلامی مسائل و مباحث ، اور عہد ماضی و حال کے بعض مشاہیر مسلمانوں پر بہت سی نظمیں درج ہیں -

ظفر علی خاں کو اپنے مذہب سے جو والہانہ شیفتگی ہے اسی کا اثر ہے کہ ملت اسلامی سے بھی وہ پرجوش محبت رکھتے ہیں - مسلمانوں کے موجودہ زوال کا انہیں سخت رنج و ملال ہے لیکن اس کے ساتھ کامل یقین ہے کہ یہ حالت زیادہ دن رہنے والی نہیں - دین حقہ کے ماننے والوں کو کوئی قوت مٹا نہیں سکتی - ایک جگہ فرماتے ہیں —

زندہ جاوید ہے اللہ والوں کا گروہ
امت مرحوم سو سکتی ہے مر سکتی نہیں !

مسلمانوں کو اچھے رہنما مل جائیں تو ظفر علی خاں کا خیال ہے کہ آج بھی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کرسکے گی - لیکن چونکہ وہ مسلمانوں کی اصلی قوت اُن کے ایمان کو سمجھتے ہیں لہذا احیاے ملت کے لیے ایمان کی وہی تازگی شرط ہے جو کامیاب اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی - ذیل کی منتخب نظم " اسلام کی شہنائی " میں یہ خیالات اُن کے خاص پر جوش و پراثر انداز میں جمع ہوگئی ہیں : —

ہیں نوا ریز آج بھی کانوں میں وہ شہنائیاں
جن سے گونجی تھیں کبھی آفاق کی پہنائیاں
آج بھی لاتی ہیں جاکر عرش اعظم کی خبر
نعرۂ اللہ اکبر کی فلک پیمائیاں

(اگلے شعر کا انگریزی اسلوب بیان ملاحظہ ہو :)

آج بھی آنکھوں میں ہیں ' اسلام کی دہلیز پر
اُمت عیسوی کی نخوت کی جبیں فرسائیاں

رہ نما گم کردہ راہ ہیں ورنہ رہرو پھاند جائیں
آج بھی جبرالٹر جیسی ہزاروں کھائیاں
پاک قصہ ہو پرایوں کے ستم کا آج اگر
کارفرما ہوں نہ اپنوں کی کرم فرمائیاں
رب اکبر سے ہو گر پیماں ہمارا استوار
پھر وہی گہرائیاں ہوں اور وہی دارائیاں !

اس محبت ملی کا تقاضا ہے کہ ظفر علی خاں آزاد اسلامی ممالک اور سلاطین اسلام سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں اور ان میں بھی وہ ذاتی تعلق کی بنا پر سب سے بڑھ کر حضور نظام حیدرآباد کی مدح سرائی کرتے رہے ہیں - امان اللہ خاں سے ان کے اخراج کے بعد بھی عقیدت مندی قائم رہی اور شاید ابھی تک وہ ان کی تخت کابل پر واپسی کے آرزو مند ہیں - " بہارستان " میں اس موضوع پر متعدد نظمیں ہیں اور بچہ سقہ اور اس کے طرف دار افغانی مشائخ و علما کی بھی دل کھول کے خبر لی گئی ہے اسی انقلاب حکومت کے زمانے کی نظم میں ایک موقع پر خفا ہوکر لکھتے ہیں کہ —

گدھوں کی آج کل کابل میں ہے ایسی فراوانی
گماں ہونے لگا انساں یہاں پیدا نہیں ہوتے !

ظرافت ' ظفر علی خاں کی فطرت کا گویا خمیر ہے اور مذاق جدید کے مناسب ہجو نگاری میں ہندوستان کا کوئی ہمعصر ادیب ان کا مشکل سے مقابلہ کرسکتا ہے - اُن کے طنزیہ اشعار میں اس قدر لطف و معنویت نہ سہی جو کلام اکبر کی خصوصیت ہے لیکن مضامین کا تنوع اکبر سے زیادہ اور ان کی ضرب بھی زیادہ کاری پڑتی ہے - یوں تو کونسا سیاسی اختلاف

اور حریف ایسا ہوگا جس کی شاعر نے دو چار پھبتیوں سے تواضع نہ کی ہو لیکن سب سے زیادہ اور بار بار جن پر ہاتھہ صاف کیا گیا ہے وہ حضرات معصولین ' علماے مخالفین ' اصحاب قادیان ' علی برادران ' اور سر محمد شفیع اور دوسرے خیر خواہان سرکار ہیں - ہندو مسلمانوں کے کے نقصان دہ اختلاف کے سلسلے میں مالوی جی اور ان کے ہم خیال سنگھٹنی علم برداروں کا کافی مضحکہ اڑایا ہے اور حکومت انگریزی اور استبداد پسند حکام کی خبر لینے میں بھی کچھہ کمی نہیں کی گئی ہے - لیکن ان میں سے متعدد نظمیں جو وقتی اختلافات و مجادلات کی یاد دلاتی ہیں اور جن میں ذاتیات کا رنگ جھلکتا ہے ' ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ یا حذف کردی جاتیں یا انہیں " فکاہات " کی ذیل میں نقل کیا جاتا - اس جگہ ہم باب فکاہات کی ایک بہتر نظم " ریل اور تیل " نقل کرتے ہیں جو روز مرہ کی صفائی اور خوبیء بیان کے اعتبار سے قابل داد ہے : —

" اگر نجد میں بھی پہنچ جاے ریل
اور اس سرزمیں سے نکل آے تیل
تو خوش حال ہوجاے ابن سعود
پھرے یوں نہ اونٹوں کی تھامے نکیل
عرب میں بہے جوے سیم و طلا
ہر ایک سمت دولت کی ہو ریل پیل
کہا میں نے سنکر یہ ' فلبی ' کا قول
ملدھے چڑھنے والی نہیں ہے یہ بیل
میں منکر نہیں ریل اور تیل کا
کہ اچھے ہیں یہ سب تمدن کے کھیل
یہ مقصد ہو لیکن اگر آپ کا
کہ نجدی ہو نصرانیوں کا دبیل
تو رکھیے مری آج کی بات یاد
فرنگی سے بدو کا ہوگا نہ میل
یہ ہے ناقۂ ریگ زار حرم
وہ ہے رود بار کلیسا کی وھیل
مہری صاف کوئی کو کہتے معاف
کہ ' رابغ نہیں سلتگمری کا جیل '

(رابغ ساحل حجاز کا مشہور مقام ہے جہاں مولانا کی فلبی صاحب سے سنہ ۱۹۲۵ میں ملاقات اور یہ گفتگو ہوئی) —

لیکن ہمارا گمان ہے کہ سیاسیات کے دلدادہ نوجوانوں کو مولانا کی وہ نظمیں سب سے زیادہ پسند آئیں گی جو ہندستان کی آزادی اور تحریک انقلاب کی تائید میں لکھی گئی ہیں - ظفر علی خاں جس قدر پر جوش مسلمان ہیں ویسے ہی وطن کے بھی شیدائی ہیں اور عمر کے ساتھ ان کے دل میں ہندستان کی آزادی کا جذبہ بھی برابر ترقی کرتا گیا ہے - بہارستان کی بہت سی جوش انگیز و پر اثر نظمیں اس جذبے کی شاہد ہیں - مثال کے طور پر ایک نظم کا عنوان ہے "تخت یا تختہ" ردیف 'انقلاب' اور آخری شعر یہ ہے :—

"وقت آپہنچا کہ مرجاؤ یا آزاد ہو!
تخت یا تختہ' ہے حکم تاجدار انقلاب"

ایک اور جگہہ انقلاب ہندستان کا ان الفاظ میں خیر مقدم کرتے ہیں :

بارہا دیکھا ہے تونے آسماں کا انقلاب
آنکھہ کھول اور دیکھہ اب ہندستاں کا انقلاب
مغرب و مشرق نظر آنے لگے زیر و زبر
انقلاب ہند ہے سارے جہاں کا انقلاب!

انقلاب پسندوں کی جو اس راستے میں جان پر کھیل گئے جا بجا ستائش کی ہے - ایک موقع پر مسلمانوں کو ان اشعار میں غیرت دلاتے ہیں :—

اپنے آبائی شرف کا گر تجھے احساس ہو
شان ابراہیم پیدا کر امام الناس ہو

بن نہیں سکتا صلاح الدین ایوبی اگر
ہند کی حرمت پہ موہن‌داس اور چندر داس ہو!

غرض بہارستان، یا کہنا چاہیے کہ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری میں ہر مذاق کی دلکشی کا سامان موجود ہے - اس مجموعے کی ضخامت ۸۱۸ صفحات، لکھائی چھپائی بہت صاف چکنا سفید کاغذ اور قیمت مجلد کی پانچ اور غیر مجلد کی صرف چار روپے فی نسخہ ہے جو ہمارے خیال میں واجبی سے بھی کم ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ان مولویوں مولانا کے ہزاروں قدر دان ہاتھوں ہاتھ یہ بہار لوٹ کر لے جائیں گے —

(ھ)

—:*:—

طنزیات مانپوری -

جناب مانپوری کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے ·
بعض بعض جگہہ ظرافت کے اچھے نمونے پیش کیے گئے ہیں -

اکبر الہ آبادی نے جس مہم کا آغاز اپنی شاعری سے کیا تھا، جناب مانپوری نے ان مضامین کے ذریعے اس کی کامیابی میں خاصی کوشش کی ہے · اردو ادب میں اچھی معیاری طنزیہ اور ظریفانہ عنصر کی کمی اس قسم کی کتابوں سے بہت کچھہ پوری ہوسکتی ہے، مگر معیار کا لحاظ ضروری ہے، ظرافت اور طنز میں اگر اس معیار کو ذرا بھی ترک کیا گیا تو سوقیانہ پن آجاتا ہے - کتاب کے مقدمے میں اردو زبان اور پورب کا تعلق بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، ملنے کا پتا دفتر رسالۂ "ندیم" گیا - قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے —

—:*:—

گلدستۂ اکبر -

(مرتبۂ مولوی عبدالله صاحب کامل ایم - اے لکچرار
اردو فارسی و عربی گورمنٹ کالج لائل پور پنجاب)

حضرت اکبر آبادی مرحوم کے منتخب اشعار ۳ × ۴ انچ کی تقطیع پر چھوٹی سی بیاض کی شکل میں مرتب کیے گئے ہیں۔ انتخاب کے معیار میں اکبر مرحوم کے صوفیانہ خیالات کی اشاعت کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے - گلدستے کے شروع میں شاعر کی مختصر سی سوانح عمری بھی درج ہے -

—:*:—

ذوق کے سو شعر -

محمد عبدالله صاحب کامل لکچرار گورمنٹ کالج لائل پور کی نگرانی میں کالج کی سکنڈ ایر کی جماعت کے طلبہ نے ذوق کے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ طلباء کے ذوق کے اختلاف نے ذوق کے انتخاب کو قابل دید چیز بنا دیا ہے - ۳ × ۴- انچ کی تقطیع پر انتخاب کلام ذوق شائع کیا گیا ہے اور گورمنٹ کالج لائل پور سے دستیاب ہو سکتا ہے —

—:*:—

روح کلام غالب -

(یعنی تضمین غزلیات غالب از مرزا عزیز بیگ المتخلص
بہ مرزا سہارن پوری - صفحات ۲۵۲ - قیمت دو روپے -
ناشر مرزا ظفر بیگ صاحب سہارن پوری)-

مرزا عزیز بیگ مرحوم ایک شریف مغل خاندان سے تھے جو شاہ عالم

بادشاہ کے عہد میں ہندستان آیا اور سہارن پور میں آباد ہو گیا۔
مرزا عزیز بیگ کی ولادت سنہ ۱۸۶۵ اور وفات سنہ ۱۹۲۰ ع میں ہوئی۔
اوائل عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور مولوی حبیب الدین صاحب سوزاں
کی شاگردی اختیار کی جو مرزا غالب مرحوم کے تلامذہ میں تھے۔ بظاہر
اسی نسبت سے اپنے دادا استاد کے پورے اردو دیوان کی تضمین کی جو
مصنف کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز نے اب چھاپ کر شایع کی اور
صاحب مطبع مولوی نظام الدین حسن نظامی صاحب بدایونی نے اس
پر ایک مقدمہ لکھ کر مصنف مرحوم کی خوش گوئی کی داد دی ہے۔
ان کی رائے میں مصنف کی تضمین نے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ
بنا دیا ہے۔ "اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے
معانی اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے
کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور اس لحاظ سے "روح کلام غالب"
کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے" —

ہمارے خیال میں زیر تبصرہ تضمین کی اتنی تعریف مبالغہ آمیز
ہے۔ مطلع دیوان ہی کی تضمین ملاحظہ ہو:

"کیا یہ منشا تھا ازل میں کاتب تقدیر کا
ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز اس تعمیر کا
رنگ جھلکایا ہے کیوں ہر چیز میں تغیر کا
نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا"

اصل شعر میں تصویر کے کاغذی پیکر کی محض ایک خیالی توجیہ
پیش کی گئی ہے کہ نقاش کی شوخیء تحریر سے خود نقش ملنے سے ہوا

اٹھا بلکہ الاماں پکارنے لگا اور گویا اسی وجہ سے فریادیوں کے لباس یعنی کاغذی پیرھن میں نمودار ھوا - یہ شبہ اس توجیہ میں شاعرانہ غلو سے کام لیا گیا ھے جس نے شعر کے مفہوم میں کسی قدر دشواری پیدا کردی اور یہ بھی سچ ھے کہ مرزا غالب نے دوسرے موقعوں پر ھستی کو نیستی کی تمہید قرار دیا اور اس مضمون کو طرح طرح سے بڑے لطف کے ساتھہ اپنے خاص انداز میں بیان کیا ھے لیکن زیر نظر شعر میں تعمیر و فنا کا کوئی تخیل نہیں پایا جاتا جسے مرزا عزیز بیگ نے اپنی تضمین میں بیان کرکے محض خمسے کی تکمیل کرلی ھے - اب ھماری سمجھہ میں نہیں آتا کہ ان کے اس غیر متعلق یا طبعزاد خیال کو اصل شعر کی صحیح شرح کیونکر قرار دیا جاسکتا ھے ؟ غالب کے دوسرے پیچیدہ یا فلسفیانہ رنگ کے اشعار کی تضمین پر بھی اگر نظامی صاحب غور فرمائیں گے تو عجب نہیں کہ انہیں اپنی فیاضانہ رائے میں ترمیم کی ضرورت ماننی پڑے —

تضمین کی بحث میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاھیے کہ کسی استاد کے کلام پر کیسے ھی کامیاب مصرعے لگائے جائیں ایک اعلیٰ درجے کے شعر کے پہلو بہ پہلو کمتر درجے کا کلام عموماً اور بھی پھیکا اور کم وزن معلوم ھونے لگتا ھے - مقدمۂ کتاب میں غالب کی دو غزلوں پر میر مہدی مجروح کی تخمیس مصنف کی تضمین کے پہلو بہ پہلو نقل کی ھے - ھم ان دونوں کی پہلی تخمیس کے ابتدائی دو بند ذیل میں نقل کرتے ھیں جس سے اندازہ ھوگا کہ میر مہدی مجروح جیسا پختہ مشق اور غالب کا شاگرد رشید بھی اس کوشش میں کس حد تک کامیابی حاصل کرسکا ھے —

مجروح	عزیز بیگ مرزا
۱ - کام نخوت نے کچھ روا نہ ہوا	یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
در حاجت کسی پہ وا نہ ہوا	کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا	سمجھ پہ احساں طبیب کا نہ ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا - میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا	درد منت کش ـــ الخ
۲ - دے خدا رحم ان طبیبوں کو	ہو کے رسوا تمہیں، کہا مانو
کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو	بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو	چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو - اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا	جمع کرتے ہو کیوں ـــ الخ

دوسری غزل میں جس کی تضمینیں بطور تقابل پیش کی گئی ہیں، غالب کے دو شعر قطعہ بند کے طریق پر واقع ہوئے ہیں اور ان میں معشوق یا مدعائے عشق کے حصول کی دشواری اور اپنے حوصلے کی انتہائی بلندی اور بلند نگاہی کو بیان کیا گیا ہے لیکن تضمین کو دیکھنے سے گمان ہوتا ہے کہ غالباً دونوں تضمین نگاروں سے مطلب سمجھنے میں تسامح ہوا یا وہ خود کچھ اور ہی مضمون باندھ گئے = ملاحظہ ہو:

مجروح	عزیز بیگ مرزا
جب تک کہ پیر خاص مقدر ہی کا نہ جائے	جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے
بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائیے	مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے	لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے

(غالب) وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

مجروح	عزیز بیگ مرزا
مقدور تک تو شعی میں پل دست و پا ہلائے	وہ نالہ جو کہ عرش معلیٰ کو بھی ہلائے
پر کیا کریں مراد ہی جب کوئی بر نہ آئے	وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے	وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے نہ جائے

(غالب)   وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے

جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

بہر حال مرزا عزیز بیگ مرحوم نے جس محنت اور شوق سے پورے دیوان غالب کی تخمیس کی ہے ' وہ یقیناً قدر کے لائق ہے اور ہمیں امید ہے کہ نہ صرف مرحوم کے احباب اور شاگرد بلکہ کلام غالب کے عام شائقین بھی ان کی کتاب کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں گے —

(ھ)

سراج سخن

مرتبہ مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم - اے ' ایل ایل - بی - اردو لکچرار جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن حجم ۱۵۲ صفحے قیمت بارہ آنے) —

یہ سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی چوتھی کتاب ہے - شاہ سراج الدین اورنگ آبادی بارھویں صدی میں بہت خوش گو شاعر ہوئے ہیں - ان کا کلام ولی سے زیادہ صاف اور شستہ اور پر سوز و گداز ہے - ضرورت تھی کہ ان کا پورا کلام یا انتخاب شایع کیا جائے اور اس ضرورت کو سروری صاحب نے بخوبی پورا کیا ہے - کتاب کے شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین

قادری زور صاحب کا ایک مختصر مگر جامع دیباچہ دکن کی اردو شاعری پر ہے - اس کے بعد دوسرا مقدمہ قابل مرتب کا ہے جس میں سراج کی زندگی اور کلام پے بحث کی گئی ہے —

داستان-

(ہاشمی بک ڈپو - ریلوے روڈ لاہور قیمت دو روپے)

فرانس کے مشہور انشا پرداز لوتی پیر نے یونان کے قدیم فلسفۂ زندگی کی روشنی میں جہاں جسم و روح کی نشو و نما دوش بدوش ہوتی تھی اپنی غیر معمولی ذہانت اور جودت طبع کی مدد سے ایک نہایت رنگین دنیا کا خاکہ پیش کیا ہے ' اسی شہرہ آفاق کتاب " افرودائت " کا ترجمہ "داستان" کے نام سے ہاشمی بک ڈپو' ریلوے روڈ لاہور نے شایع کیا ہے ' لکھائی چھپائی وغیرہ بہت دیدہ زیب ہے —

یہ کتاب اردو ادب میں ایک اچھا اور ضروری اضافہ ہے ' مگر ترجمے کی مشکلات پر جیسا کہ مترجم صاحب کو اعتراف بھی ہے پوری طرح عبور حاصل نہ ہو سکا اور جیسے پرانے اردو لکھنے والوں پر یہ اعتراض ہے کہ فارسی عبارت کا ترجمہ کرتے وقت " من آمدم " کو " میں آیا میں " کی سی بے ربط عبارت میں تبدیل کر دیتے ہیں اسی طرح موجودہ زمانے کے بعض مترجمین بھی ایسی ہی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں چنانچہ ایسی بعض مثالیں اس کتاب میں بھی ملیں گی یہ تعجب کی بات ہے کہ یوں تو مشرقی دماغ ' فرضی معشوق کی نوک پلک سدھارنے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینے میں مشہور ہیں مگر

جب حقیقت حال نثر میں واضح کرنی ہوتی ہے تو اعضاء وجوارح کا بجنسہ چربہ اتارنے کی بھونڈی کوشش کو کامیابی کا معیار قرار دے لیتے ہیں' حالانکہ بعض انسانی اعضا کے تذکرے مغربی زبانوں میں لطافت پیدا کرسکتے ہیں مگر ان کے اردو نام اپنی صوتی خصوصیت کی وجہ سے تحریر کے لیے ننگ اور لطافت کے لیے سم قاتل بن جاتے ہیں اور عریانیات اگر فحاشیات کے درجے تک نہ پہنچے تو شک ایک لطیف چیز رہتی ہے 'اچھا ہوتا کہ وفاداری اور ایمانداری کے ساتھہ ترجمے " کی کوشش کے بجائے با استثنائے اسما کتاب کے مضامین کو اردو میں منتقل کرلیا جاتا' اب بھی جہاں ایسا کیا گیا ہے' کتاب کے وہ حصے لاجواب ہوگئے ہیں بعض ناموں کا ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کے ذریعے اصل زبان میں جو لطف پیدا ہوتا تھا اسے برقرار رکھا جائے مگر بعض جگہ مترجم نے ٹھوکر کھائی ہے' تاہم یونانی اور لاطینی اسما والفاظ کے تلفظ کا خاص طور سے قابل تعریف لحاظ رکھا گیا ہے' ترجمے سے قطع نظر کتاب پڑھنے کے قابل ہے — (ر)

Persian Influence on Hindi.

(By Ambikapersad Vajpeyi. Published by the University of calcutta.)

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مصنف نے اس کتاب میں یہ دکھایا ہے کہ ہندی پر فارسی کا کیا اثر پڑا ہے - لیکن وہ اپنے اس موضوع کے ساتھہ ہندی سے متعلق بعض دوسرے مضامین کو بھی زیر بحث لے آئے ہیں - اس وجہ سے نہ تو وہ ہندی سے متعلق ان مضامین پر پوری تحقیق

سے لکھہ سکے ھیں اور نہ اصل موضوع پر —

ھندی کس طرح کن "پراکرتوں" کے ذریعے پیدا ہوئی، ھندی میں کس وقت سے اور کس طرح فارسی اور عربی کے الفاظ آنے لگے، کن کن مسلمانوں نے ھندی کو ترقی دی اور اس کی خدمت کی، کھڑی بولی، ڈنگل، پنگل، اردو شاعری کی خصوصیات، ھندی اور اردو کی بحث اور فارسی سے کون سے الفاظ ھندی میں داخل ہوئے وغیرہ وغیرہ مضامین پر انہوں نے جو کچھہ لکھا ھے بالکل سرسری طور پر لکھا ھے - جن مضامین کی تحقیق کی جاتی ھے، اگر انھیں سرسری طور پر لکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ھے - اردو کا نام انہوں نے "مسلمانی ھندی" رکھا ھے - ھماری رائے میں زبانوں کو مذھب سے منسوب کرنا ٹھیک نہیں ھے - کیونکہ زبان کا دیس تو ہوتا ھے مگر کوئی مذھب نہیں ہوتا - پھر اردو کی خدمت میں ھندوؤں کا بھی بہت بڑا ھاتھہ رہا ھے —

ھندی کی پیدائش کس طرح ہوئی، اس پر لکھتے ہوئے انہوں نے لکھا ھے کہ "آرش" پراکرت سب سے پہلی پراکرت ھے - رامائن، مہابھارت میں جہاں جہاں بحر وزن یا قواعد کی کوئی غلطی آجاتی ھے یا کوئی غیر مروج محاورہ آجاتا ھے اسے نظر انداز کرنے کے لیے اور اس غلطی میں بھی عظمت پیدا کرنے کے لیے یہ لکھہ دیا جاتا ھے کہ یہ "آرش پریوگ" ھے یعنی اس طرح کا استعمال "رشی" کا اپنا ھے - اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی ایسی زبان تھی جو "آرش پراکرت" کہلاتی تھی -

"سدھانت کومودی" میں اس کے معنی یہ لکھے گئے ھیں —

" سنسکار ھنتویپی - رشی نا پریوکتہ "

" संस्कार हानत्वऽपि ऋषिणा प्रयुक्त "

یعنی غلط ہوتے ہوئے بھی جس لفظ کو رشی نے استعمال کیا ہے -

" دا چسپیکم صفحہ ۸۱۴ " میں " آرش " لفظ کے یہ معنی لکھے گئے ہیں' ویا کرنو وکتا نو شاسن مولنگھئے رشی نا - پریوکتے - اسادھونیپی — سادھو توینا بھیمتے - شبد بھیدے " -

" व्याकरणोक्तानुशासनमुल्लंघ्य ऋषिणा प्रयुक्ते असाधुत्वेपी साधुत्वेनाभिमते शब्द भेदे "

یعنی وہ لفظ قواعد کی رو سے غلط ہے لیکن چونکہ رشی نے استعمال کیا ہے - اس لیے ٹھیک سمجھا جاتا ہے -

اسی طرح انہوں نے کھڑی بولی کے بارے میں یہ لکھا ہے —

" It was also Called Khadi or Khadi Boli on account of its purity"

یعنی -

چونکہ یہ زبان صاف ستھری تھی' اس لیے "اس کو کھڑی بولی" کہا جاتا تھا -

لیکن اس کے لیے انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا - ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی صرف بولی جانے والی زبان پاک صاف نہیں ہوسکتی - کھڑی بولی میں ابتدا میں کسی قسم کا ادب نہیں ملتا - اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ کھڑی بولی بولنے کی زبان ضرور تھی لیکن وہ ادبی زبان نہ تھی - مسلمانوں نے اس زبان کو ترقی دی اور اسے ایک ادبی سانچے میں ڈھال دیا - اس وقت ہندی میں عموماً برج بھاشا میں نظم لکھی جاتی تھی - اور اس میں جو مٹھاس اور لوچ تھا - وہ کھڑی بولی میں نہیں تھا - اور اس کا نام کھڑی بولی اس لیے رکھا گیا

سے لکھہ سکے ھیں اور نہ اصل موضوع پر —

ھندی کس طرح کن "پراکتوں" کے ذریعے پیدا ھوئی' ھندی میں کس وقت سے اور کس طرح فارسی اور عربی کے الفاظ آنے لگے' کن کن مسلمانوں نے ھندی کو ترقی دی اور اس کی خدمت کی' کھڑی بولی' ڈنگل' پنگل' اردو شاعری کی خصوصیات' ھندی اور اردو کی بحث اور فارسی سے کون سے الفاظ ھندی میں داخل ھوئے وغیرہ وغیرہ مضامین پر انھوں نے جو کچھہ لکھا ھے بالکل سرسری طور پر لکھا ھے - جن مضامین کی تحقیق کی جاتی ھے' اگر انھیں سرسری طور پر لکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں پیدا ھونے کا اندیشہ ھوتا ھے - اردو کا نام انھوں نے "مسلمانی ھندی" رکھا ھے - ھماری رائے میں زبانوں کو مذھب سے منسوب کرنا ٹھیک نہیں ھے - کیونکہ زبان کا دیس تو ھوتا ھے مگر کوئی مذھب نہیں ھوتا - پھر اردو کی خدمت میں ھندوؤں کا بھی بہت بڑا ھاتھہ رھا ھے —

ھندی کی پیدائش کس طرح ھوئی' اس پر لکھتے ھوئے انھوں نے لکھا ھے کہ "آرش" پراکرت سب سے پہلی پراکرت ھے - رامائن' مہابھارت میں جہاں جہاں بحر وزن یا قواعد کی کوئی غلطی آجاتی ھے یا کوئی غیر مروج محاورہ آجاتا ھے اسے نظر انداز کرنے کے لیے اور اس غلطی میں بھی عظمت پیدا کرنے کے لیے یہ لکھہ دیا جاتا ھے کہ یہ "آرش پریوگ" ھے یعنی اس طرح کا استعمال "رشی" کا اپنا ھے - اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی ایسی زبان تھی جو "آرش پراکرت" کہلاتی تھی - "سدھانت کومودی" میں اس کے معنی یہ لکھے گئے ھیں —

" سنسکار ھنتویپی - رشی نا پریوکتہ "

" संस्कार हानत्वऽपि ऋषिणा प्रयुक्त "

یعنی غلط ہوتے ہوے بھی جس لفظ کو رشی نے استعمال کیا ہے -

" داچسپیکم صفحہ ۸۱۴ " میں " آرش " لفظ کے یہ معنی لکھے گئے ہیں' ویاکرنو وکتانوشاسن مولنگھئے رشی نا - پریوکتے - اسادھونیپی — سادھو تویناا بھیمتے - شبد بھیدے " -

" व्याकरणोक्तानुशासनमुल्लंघ्य ऋषिणा प्रयुक्ते असाधुनेपी साधुत्वेनाभिमते शब्द भेदे "

یعنی وہ لفظ قواعد کی رو سے غلط ہے لیکن چونکہ رشی نے استعمال کیا ہے - اس لیے ٹھیک سمجھا جاتا ہے -

اسی طرح انہوں نے کھڑی بولی کے بارے میں یہ لکھا ہے —

" It was also Called Khadi or Khadi Boli on account of its purity"

یعنی -

چونکہ یہ زبان صاف ستھری تھی' اس لیے "اس کو کھڑی بولی" کہا جاتا تھا -

لیکن اس کے لیے انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا - ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی صرف بولی جانے والی زبان پاک صاف نہیں ہوسکتی - کھڑی بولی میں ابتدا میں کسی قسم کا ادب نہیں ملتا - اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ کھڑی بولی بولنے کی زبان ضرور تھی لیکن وہ ادبی زبان نہ تھی - مسلمانوں نے اس زبان کو ترقی دی اور اسے ایک ادبی سانچے میں ڈھال دیا - اس وقت ہندی میں عموماً برج بھاشا میں نظم لکھی جاتی تھی - اور اس میں جو مٹھاس اور لوچ تھا - وہ کھڑی بولی میں نہیں تھا - اور اس کا نام کھڑی بولی اس لیے رکھا گیا

تھا کہ یہ بولی سخت تھی اور کانوں کو اتنی میٹھی نہیں معلوم ہوتی تھی - ہم اس بارے میں تفصیل سے "اردو" میں لکھ چکے ہیں —

- مصنف نے ایک اور جگہہ لکھا ہے - کہ "ناگر" سے "هندی" یا "هندوی" پیدا ہوئی اس کے لیے انہوں نے یہ حوالہ دیا ہے —

" ناگرنتو - مہاراشٹری شورشینیوستو سنکرات "

" नागरन्तु महाराष्ट्री शौरसेन्यॉस्तु संकात "

یعنی مہاراشٹری اور شورسینی پراکرتوں کے ملنے سے ناگر بھاشا پیدا ہوئی - آگے وہ لکھتے ہیں —

With a little dose of Apababhramsa this "Nagari" became modern 'Hindi"

ناگر اور ناگری ملتے جلتے نام ہیں - اس سے یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ناگر سے ناگری اور اس سے هندی پیدا ہوئی - اوپر لکھے ہوے شلوک کے یہ معنی ہیں - جیسے مہاراشٹر کی پراکرت کو مہاراشٹری کہا جاتا تھا اور شورسین (متھرا) کی پراکرت کو شور سینی ' اسی طرح "ناگر" کی پراکرت کو "ناگر" کہا جاتا تھا - جو مہاراشٹری اور شورسینی پراکرت سے مل کر بنی تھی - ناگر ایک دیس کا نام تھا وہیں کی یہ پراکرت تھی - ناگری لفظ تو دیوناگری کی ایک مخفف شکل ہے - یہ اس رسم الخط کا نام ہے جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے - اور بعد میں هندی ' مرہٹی وغیرہ بھی اسی میں لکھی جانے لگیں —

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا هندی پر جو اثر پڑا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو اردو پیدا ہوگئی اور دوسرے هندی میں بہت سے فارسی الفاظ ' محاورے اور کئی دیگر اقسام کے الفاظ استعمال ہونے لگے - مصنف نے کتاب کے آخر میں ان الفاظ کی ایک

فہرست بھی دی ہے - ان الفاظ میں فارسی کے ساتھ عربی الفاظ بھی دیے گئے ہیں —

یہ اثر تو صرف بیرونی ہے - لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ فارسی کا اثر اس سے کہیں بہت زیادہ گہرا پڑا ہے - فارسی کی بدولت ہندی میں کئی نئی بحریں پیدا ہوئی ہیں قافیہ اور ردیف بھی موجودہ شکل میں فارسی سے آئے ہیں اور ان کی وجہ سے نظم میں نیا سنگیت اور نئی روح پیدا ہوئی ہے - لکھنے کے نئے طرز پیدا ہوئے ہیں' ہم نے یہ باتیں بالکل سرسری طور پر لکھی ہیں جن پر مصنف نے خاص طور پر کچھ نہیں لکھا ہے —

ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی کتابیں بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر سکتی ہیں اور ایسے ماحول کو پیدا کر سکتی ہیں - جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ذرا آزادی سے کھل کر سانس لے سکیں —

ہم مصنف کی مندرجہ ذیل سطور سے متفق ہیں —

" Unless one studies Urdu he Can not be a master of " Hindi "

جب تک اردو کا مطالعہ نہ کیا جائے ہندی پر پورا عبور حاصل نہیں ہو سکتا - اردو پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہندی اور اردو کو ملانا اتنا مشکل نہیں رہے گا جتنا کہ آج کل سمجھا جاتا ہے —

(ونشی دھر ودیا النکار)

——‡*‡——

تاریخ و سیر

خاتم سلیمانی -

(تالیف شاہ غلام حسنین صاحب ندوی پھلواروی - ۵۴۷ صفحات-
قیمت دو روپے - پتا : خانقاہ سلیمانیہ - پھلواری - ضلع پٹنہ) -

اس کتاب میں شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی مرحوم کے حالات زندگی کو کافی تفصیل اور خوبی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے - شاہ صاحب مرحوم ایک ذی علم صوفی اور نہایت ذہین و خوش بیان واعظ تھے - اور مسلمانوں کی جدید قومی خصوصاً تعلیمی تحریکات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے - اسی لیے وہ نہ صرف عوام یا پرانے خیال کے مسلمانوں میں بلکہ جدید تعلیم یافتہ خواص کے طبقے میں بھی مقبول و ممتاز تھے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کے صاحبزادے نے مرحوم کی یہ سوانح عمری لکھ کے شائع کردی جو یقین ہے کہ اس شعر کا مصداق ہوگی کہ :

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

لیکن کتاب میں اخباروں کی آرا اور تعزیتی خطوط کا حصہ ضرورت سے زیادہ طویل معلوم ہوتا ہے اور آخر میں مرحوم کے جو ملفوظات نقل کیے ہیں ، ان میں بعض ایسے اہم اختلافی مسائل پر اظہار خیال کیا

گیا ہے ' جن کے متعلق یا زیادہ مدلل اور متین بحث کی ضرورت تھی ؛ یا سکوت بہتر ہوتا - بہر حال ہمیں امید ہے کہ عقیدت مند فرزند کی یہ سعیء تالیف مشکور ہوگی اور مرحوم کے احباب اور معتقدین میں ہاتھوں ہاتھہ لی جائے گی — (ش)

رہ نمائے حیدرآباد

انڈین سائنس کانگریس کا گزشتہ اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہونے سے اور جو کچھہ فوائد ہوئے ہوں ' ایک یہی بات کچھہ کم کارآمد نہ تھی کہ اہل الرائے کو ریاست کے حالات دلچسپ و مختصر پیرایے میں شائع کرنے پر توجہ ہوئی اور مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ کی صدارت میں ایک کمیٹی کے مشورے سے اردو اور انگریزی میں ایک مفید رہ نما (یا گائڈ) مرتب کرلی گئی جس کا باتصویر و دیدہ زیب اردو نسخہ ہمارے سامنے ہے - ممالک محروسہ کی مجمل تاریخ ' طبیعی حالات و معادن ' آثار قدیمہ ' مشہور مقامات ' مصنوعات ' انتظامات ' جدید ادارے ' خصوصاً جامعۂ عثمانیہ کے متعلق کارآمد معلومات کو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۹ صفحات میں سلیقے سے جمع کردیا گیا ہے - اہل ذوق ' خصوصاً سیاحوں کے حق میں یہ کتاب حقیقت میں بہت اچھے رہ نما کا کام دے سکتی ہے - قیمت درج نہیں - غالباً مہتمم صاحب جامعۂ عثمانیہ کے پتے سے دستیاب ہوسکے گی — (ش)

سیاحت نامہ -

(نواب محمد ظہیرالدین خان بہادر بی - اے (عثمانیہ)
کے حالات سفر یورپ و امریکہ)

یہ سیاحت نامہ نواب محمد ظہیرالدین خان بہادر خلف اکبر نواب معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ کے حالات سفر یورپ و امریکہ پر مشتمل ہے - نواب صاحب نے ابتدائے سفر سے اپنا روز نامچہ لکھنا شروع کردیا تھا اور انھیں روز نامچوں سے بعد میں سیاحت نامہ مرتب کیا ہے - جہاں جہاں کی سیر کی' جن جن اشخاص سے ملاقات ہوئی' جو جو مناظر اور عجائبات دیکھے ان سب کی کیفیت بلا تکلف سادہ اور اچھی زبان میں قلمبند کردی ہے - بعض حالات بہت دلچسپ ہیں ـــ

ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ نواب صاحب نے اپنی سیاحت کا زمانہ بہت اچھی طرح بسر کیا اور دنیا کے نئے مشاہدوں سے مستفید ہوے انھیں کے نامور جد امجد امیر کبیر نواب شمس الامرا تھے جو اپنے ذوق علم اور خصوصاً ریاضی و فلکیات کی مہارت کی وجہ سے تمام ہندستان میں مشہور تھے - ہمیں امید ہے کہ اس خاندان کے چشم و چراغ یہ ہونہار نوجوان اپنے بزرگوں کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کریں گے ـــ

تاریخ دکن -

(مولفۂ پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب (جامعۂ عثمانیہ)
صفحات ۱۷۴ قیمت چودہ آنے' مجلد ایک روپیہ)

اس کتاب میں دکن کی پوری تاریخ (ابتدا سے لے کے اب تک کی)

آگئی ہے - لکھنے کا ڈھنگ بہت اچھا ہے - یعنی بے تکلف اور رواں لیکن کہیں کہیں نظر ثانی اور اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہے - زبان کے لحاظ سے بھی اور واقعات کے اعتبار سے بھی —

مذہب و اخلاق

اسلام اینڈ کرسچی اینٹی -

(بزبان انگریزی - مصنفۂ محمد امیر عالم صاحب مرحوم - ضخامت ۲۵۶ صفحات - مجلد - قیمت دو روپے - ملنے کا پتا : اوری اینٹل پرنٹرز اینڈ پلبشرز - (۴۰) مچھوا بازار اسٹریٹ - کلکتہ)

فاضل مصنف نے اس کتاب میں کلیسا کے بنیادی عقائد ' جیسے کفارہ ' ابنیت مسیح ' تثلیث فی التوحید وغیرہ کی حقیقت بیان کی اور اس کے مقابلے میں اسلامی عقائد کی شرح لکھ دی ہے اور پادریوں کے اعتراضات کا جو دین اسلام پر کیا کرتے ہیں مدلل جواب دیا ہے - طرز بیان ہر جگہ صاف اور نہایت شائستہ بلکہ کہیں کہیں مودبانہ ہے - جن لوگوں کو تحقیقات مذاہب یا مناظرے کا شوق ہو ان کے مطالعے کے قابل ہے —　　(ھ)

۲ - معیار السلوک -

(تالیف محمد ہدایت علی صاحب نقشبندی مجددی جے پوری -
ضخامت ۳۰۱ صفحے - لکھائی چھپائی بہت عمدہ قیمت ایک
روپیہ آٹھہ آنے - ملنے کا پتا : منشی سید محمود علی صاحب -
دہلی گیٹ - نیا دوا خانہ - دہلی)

اس کتاب میں فاضل مولف نے نقشبندی مشرب کے مطابق تصوف کی حقیقت اور ضرورت پر کافی طویل بحث لکھی ہے - پھر اس طریقے کے مراقبات وغیرہ کی شرح کی ہے اور آخر میں چند مشاہیر بزرگان دین اور صوفیہ کے حالات اور خصوصیت کے ساتھہ اپنے پیر و مرشد ' دادا پیر اور پردادا پیر کے کمالات اور کرامتوں کا ذکر کیا ہے - سب سے آخر میں بعض مجرب تعویذ اور چند نصائح بھی تحریر فرمائے ہیں - مولف ایک متشرع بزرگ ہیں اور صوفیہ میں شریعت کے خلاف جو عقائد یا اعمال رواج پاگئے ہیں ' ان کی ہر جگہ تردید کرتے ہیں - البتہ بعض ایسے خیالات جو صوفیہ کے تمام طبقوں میں پھیل گئے ہیں' اور علمی یا معقولی اعتبار سے قابل گفتگو ہیں ' مولف نے ان کو مقلدانہ طریق پر قبول کرلیا ہے - بہر حال یہ دیکھہ کر کہ کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہے اور سفید چکنا کاغذ لگایا گیا ہے ہمیں خوشی ہوئی - ورنہ ان کے طرز انشا پردازی اور طبعزاد اشعار دیکھہ کر مولف کے حسن مذاق کی نسبت کوئی خاص عقیدت پیدا نہ ہوئی تھی —

(ھ)

تفسیر سورۂ لہب —

(تالیف استاد مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ '
مترجمہ مولوی امین حسن صاحب اصلاحی حجم ۷۴ صفحات
سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ - کاغذ سفید ' کتابت طباعت معمولی - قیمت
کہیں درج نہیں ملنے کا پتا : دائرۂ حمیدیہ مدرسۃالاصلاح سرا ے
میر اعظم گڑھ —

مولانا حمیدالدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ کی ہستی بھی ایک عجیب ہستی تھی ' اگر ایک طرف وہ لغت اور ادب عربی کے امام تھے تو دوسری جانب قرآنی علوم و فنون کے انسائیکلو پیڈیا تھے - جہاں تک قرآن کریم کے مطالب کی توضیح و تشریح کا تعلق ہے نہ صرف ہندوستانی بلکہ دوسرے اسلامی و عربی ممالک میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جنھیں اُن کی صف میں جگہ دی جا سکے - دائرہ حمیدیہ سرا ے میر اعظم گڑہ کی یہ کوشش یقیناً لائق ستائش ہے کہ اُس نے مولانا مرحوم کی عربی تفسیروں کو اردو کا جامہ پہنانا شروع کردیا ہے چنانچہ یہ مختصر رسالہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے —

سورۂ لہب پر بعض کوتہ اندیشوں کی طرف سے یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ وہ بد دعا ہے - اس غلط فہمی میں نہ صرف غیر مسلم بلکہ وہ مسلمان نوجوان بھی مبتلا ہیں جن کی تعلیم و تربیت مغربی فضا میں ہوئی ہے —

مولانا حمیدالدین مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں اُن تمام

شبہات و اعتراضات کا شافی جواب دے دیا ہے جن کی بنا پر سورۂ مذکور پر بد دعا کا حکم لگایا جاسکتا ہے - انداز بیان اور طریق استدلال کے بارے میں کچھہ لکھنا بے کار ہے کیونکہ ان کا اندازہ غیر ممکن ہے جب تک کہ مولانا کی تصانیف کا غائر نظر سے مطالعہ نہ کیا جائے - مرحوم کی یہ بھی ایک خصوصیت تھی کہ انھوں نے ہمیشہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم اور مستند کلام عرب سے کی - اُن کے یہاں اُن دور از کار عقلی تاویلات کا نام نشان نہیں جن کی بنیاد قدیم یونانی یا مصری فلسفے پر تھی اور جن کی لغویت اب مسلم ہوچکی ہے - جو لوگ قرآن کریم کو اُس کے اصل رنگ میں سمجھنا چاہتے ہیں اُن کے لیے تفسیر سورۂ لہب کا مطالعہ ضروری ہے —

درسیات

اردو کی پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں -

انتخاب اردو - نصاب اردو -

(مولفہ خان صاحب خواجہ لطیف احمد بی - اے، پراونشل
ایجوکیشنل سرویس صوبۂ متوسط و برار ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ اُردو ہائی اسکول، امراؤتی، برار)

خواجہ لطیف احمد صاحب کی ساری عمر تعلم و تعلیم میں صرف ہوئی ہے اور اس شعبے میں اُن کا تجربہ بہت وسیع ہے - انھوں نے

بڑی محنت اور احتیاط سے صوبۂ متوسط و برار کے لیے وہاں کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے ایک سلسلہ اردو کی ابتدائی کتابوں کا پرائمری مدارس کے لیے لکھا ۔ اب اس کے بعد مڈل اور ہائی اسکول کی جماعتوں کے لیے یہ سلسلہ تیار کیا ہے ان کتابوں میں نظم و نثر کا انتخاب زیادہ تر ایسے اصحاب کے کلام سے کیا ہے جو مستند ادیب ہیں - یہ سلسلہ جیسا کہ قابل مولف نے دیباچے میں لکھا ہے - "محض ادبی نقطۂ خیال سے تیار کیا گیا تاکہ طلبا کو اردو ادب کے ساتھ صحیح مذاق اور دلچسپی پیدا ہو" - اس اعتبار سے مولف کا انتخاب اور اس کی ترتیب قابل قدر ہے - جو کتابیں مڈل کی جماعتوں کے لیے لکھی گئی ہیں' اُن میں ہر سبق کے بعد سوالات ہیں اور مشکل الفاظ اور جملوں کی تشریح بھی کردی گئی ہے - نصاب اردو میں جو ہائی اسکول کی اعلی جماعتوں کے لیے ہے' ان ادیبوں اور شاعروں کا مختصر حال اور ان کے کلام کی خصوصیات بھی لکھہ دی گئی ہیں جن کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے - ان کتابوں میں کسی کسی شاعر یا ادیب کا فوٹو بھی ہے - تمام کتابیں بہت صاف اور اچھی چھپی ہیں --

---

علم بدیع -

(مولفہ مولوی رشید احمد صاحب ایم - اے' ایم - او - ایل
پرنسپل دارالعلوم گوجرانوالہ) -

یہ چوبیس صفحے کا چھوٹا سا رسالہ ادبی صنائع پر ہے - جس قدر

معروف صنائع (معنوی و لفظی) شعر میں آتی ہیں ان سب کا ذکر مختصر طور پر مع مثالوں کے اس رسالے میں آگیا ہے —

متفرقات

عجائبات سائنس -

جناب محمد عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹکنیکل - اسکول - لاہور نے سائنس کے ابتدائی اور اساسی کلیوں اور نظریوں سے لے کر نظریۂ اضافیت تک بہت سادہ اور سلیس زبان میں تمام ضروری مسائل سمجھائے ہیں - فی زماننا سائنس کو عام کرنے کی جو شدید ضرورت لاحق ہوگئی ہے اس کے مدنظر یہ مختصر سی کتاب بہت مفید ہے - ایک عامی شخص بھی سائنس کے وسیع مطالعے کے لیے اس کو پڑھ کر اچھی طرح تیار ہوسکتا ہے - بجلی اور ریڈیو کے متعلقہ ابواب بہت ہی اچھے ہیں - کتاب میں شروع سے آخر تک عام الفاظ اور علمی اصطلاحوں میں خاصا توازن قائم رکھا گیا ہے جو اس قسم کی کتابوں میں اکثر ناپید ہوتا ہے ' حمایت اسلام پریس لاہور سے طلب کی جاسکتی ہے — (ر)

مینول خط شکستہ اردو -

(مرتبۂ مولوی ضیاءالحسن صاحب علوی انسپکٹر عربی مدرسہ جات یوپی اور مولوی عبدالباری صاحب - آسی نولکشور پریس قیمت ایک روپیہ دو آنے)

اس کتاب میں انشا پر بہت اچھا ذخیرہ فراہم کیا ہے ' خط شکستہ کے علاوہ کئی قسم کے خط کے نمونے پیش کرکے ایک قریب مرگ فن کو زندہ کرنے کی اچھی کوشش کی ہے - کاغذ اور طباعت کی خوبی سے کتاب کا رتبہ اور بھی بلند ہوگیا ہے - اب تک اس موضوع پر جو کتابیں موجود تھیں وہ کاغذ اور طباعت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ تر کس مپرسی میں پڑی رہتی تھیں اور جس طرح ہمارے مشاہیر کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف اسی خامی کی وجہ سے صرف پرانے اور فرسودہ کتب خانوں میں پڑی تھیں اسی طرح خطاطی کا فن بھی تقریباً نابود ہو چلا تھا مگر ایسی دیدہ زیب کتابوں کے وجود سے امید ہے کہ اس فن میں دوبارہ جان پڑ جائے گی — (ر)

طب العرب حصۂ اول با تصویر -

حجم ۸۵ صفحات - سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ - کاغذ ' کتابت اور طباعت معمولی - قیمت ایک روپیہ جو کتاب کے حجم ' کاغذ اور کتابت و طباعت کو دیکھتے ہوے بہت زیادہ ہے - کتاب ملنے کا پتا - رسالۂ شمس الاطبا جوی بوتی بھاٹی گیٹ لاہور)

پروفیسر ایڈورڈ - جی براؤن مرحوم نے سنہ ۱۹۱۹ ء سنہ ۱۹۲۰ ع

میں کیمبرج یونیورسٹی میں " طب عربی " کے عنوان پر چار لکچر دیے تھے - ان میں سے پہلے لکچر کا ترجمہ " طب العرب حصہ اول " کے نام سے حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی نے اردو میں کیا ہے ' اور اسی کو رسالۂ شمس الاطبا جڑی بوٹی کے ادارے نے جنوری سنہ ۱۹۳۷ ع کی اشاعت خاص کی شکل میں پیش کیا ہے —

حکیم صاحب نے لکچر کے لفظی ترجمے ہی پر کفایت نہیں کی ہے بلکہ جابجا اصل رسالے پر مفید حواشی تعلیقات بھی لکھے ہیں جن سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ آپ نے اس الزام کو بھی عربوں کے سر سے دھونے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے جو عام طور سے مستشرقین کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے کہ طب عربی میں بہت کم چیزیں عربی ذہانت نے پیدا کیں - زیر نظر رسالے کو اگر پروفیسر براؤن کے لکچر کا ترجمہ قرار دینے کے بجائے ' اُس پر ایک تبصرہ کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا کیونکہ فاضل مترجم کے نوٹوں نے کتاب کے تہائی حصے سے زیادہ جگہ گھیرلی ہے - بہر حال مجموعی حیثیت سے رسالہ دلچسپ اور طبیب و غیر طبیب کے لیے یکساں کارآمد ہے - فاضل مترجم نے ایک جگہ غالباً dark ages کا ترجمہ " دور مظلمہ " کیا ہے جو غرابت سے خالی نہیں اس کے بجائے " زمانۂ تاریک " یا " عہد تاریک ' زیادہ عام فہم اور آسان ہے —

اسباق العروض -

(مرتبہ و مولفہ جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب
ایم ' اے - ایم - او - ایل - ایچ - پی - ایچ - یو - پرنسپل
دارالعلوم گوجرانوالہ حجم۲۰۱ صفحات - سائز $\frac{20\times30}{16}$

جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی بے مثل کتاب ترجمان القران کا انتساب ایک غیر معلوم سرحدی پٹھان سے کیا ہے اسی طرح اس کتاب کے مصنف نے اپنی کتاب کو ایک پرانی وضع کے لالہ صاحب کی ذات پر معنون کیا ہے جن کی وجہ سے انہیں عروض کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا - یہ ایک درسی کتاب ہے جو یونیورسٹی کے امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ کے فائدہ کے لیے لکھی گئی ہے - کتاب میں اشعار کی تقطیع کرنے کے صاف طریقے بتائے گئے ہیں - جا بجا تشریحی دائرے اور مشقی سوالات بھی دے دیے گئے ہیں - چونکہ یہ موضوع ضرورت سے زیادہ خشک ہے اس لیے ضرورت تھی کہ کتاب کو دلچسپ بنانے کی طرف توجہ کی جاتی - سرورق پر لفظ قیمت تو درج ہے لیکن شاید سہو کاتب یا اور کسی وجہ سے رقم کا اندراج رہ گیا - ضرورت مند اصحاب میسرز لطیف الحسن صدیقی اینڈ برادرس چوک مولوی الہی بخش صاحب گوجرانوالہ سے استفسار فرمائیں —

—— :*: ——

اُردُو کے جدید رسالے

رسالۂ حیوانیات ۔

جناب بابر مرزا صاحب پروفیسر حیوانیات مسلم یونیورسٹی کی زیر نگرانی اس نام کا بہت اچھا رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے یہ جدید دریافت کو سلیس زبان میں بیان کرنے کی طرف خوش آیند اقدام ہے۔ اگر یہی کوشش توجہ کے ساتھ جاری رہی تو ایسے رسالے بہت جلد عوام کو جدید انکشافات کے ایک بڑے شعبے سے واقف کرادیں گے۔ اس قسم کے رسالوں کی اردو زبان میں بڑی ضرورت ہے۔ مرزا صاحب نے جس خوبی سے اسے مرتب کیا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے ۔

(و)

مجلۂ طیلسانین ۔

جنوری سنہ ۳۷ سے مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ نے ایک جدید سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے۔ حیدرآباد ایسے علمی اور ادبی مرکز سے ایسے رسالوں کی اشاعت بہت ضروری بھی ہے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ اپنی ذہنی قوتوں کے لیے ایک اچھا راستہ منتخب کرسکے۔ جلد اول نمبر

اول میں فلسفہ' ادب تاریخ اور فقہ اسلامی پر اچھے مضامین ہیں' طیلسانین کی خاص توجہ کا مستحق اور عام طور پر قدر افزائی کا مستحق ہے - سالانہ چندہ (پیشگی) تین روپے سکۂ عثمانیہ ہے —

حکیم دکن—

ایک طبی ماہوار رسالہ ہے جو اعلیٰ حضرت نظام الملک تاجدار دکن و برار خلداللہ ملکہ و سلطنۃ کی جشن جوبلی کی یادگار میں' حیدرآباد سے نکلنا شروع ہوا ہے - رسالے کے حلقۂ ادارت میں ایک نہیں اکٹھے چھ طبیب شامل ہیں اور مدیر مسئول ان کے علاوہ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اگرچہ قدرے تلخ ہی سہی کہ رسالے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو اُسے ملک کے دوسرے طبی رسالوں سے ممتاز کرسکے - ہمارے خیال میں کسی رسالے کا اجرا بےکار ہے اگر مقصود کسی ایسی کمی کا پورا کرنا نہ ہو' جو اسی قسم کے دوسرے رسالوں میں پائی جاتی ہو - طب یونانی یا صحیح معنوں میں طب عربی فن دوا سازی کے لحاظ سے بہت کچھ اصلاح طلب ہے' کیا اچھا ہو اگر "حکیم دکن" کے کارکن اسی کو اپنا نصب العین متعین کرلیں - کتابت اور طباعت اگرچہ بری نہیں مگر جو کاغذ لگایا جاتا ہے وہ کسی ایسے طبی رسالے کے شایان شان نہیں جو نصف درجن سے زائد اطبا کی نگرانی و ادارت میں نکلتا ہو اور حیدرآباد ایسے ترقی یافتہ شہر کا واحد طبی رسالہ ہو - رسالہ $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ سائز کے تقریباً پچاس صفحات پر نکلتا ہے - سالانہ قیمت دو روپے اور فی پرچہ تین آنے ہے ملنے کا پتا - دفتر حکیم دکن یونانی طبی بورڈ حیدرآباد دکن - (ا-ا)

نوید بریلی -

سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$ حجم ۶۴ صفحات - چندہ سالانہ دو روپے ششماہی ایک روپیہ چار آنے - فی پرچہ تین آنے اب تک اس رسالے کے دو نمبر نکل چکے ھیں - رسالہ تین شعبوں پر منقسم ھے اور ہر شعبے کا اڈیٹر الگ - ادبیات کی علان ادارت میر نوید نقوی امرو ھی کے ھاتھوں میں ھے - نسوانی حصے کی اڈیٹر محترم ثریا خاتون بی - اے ھیں اور فلمی ٹکڑے کی ترتیب مسٹر اصغر بریلوی سے متعلق ھے - جیسا کہ سرورق کے بعد دوسرے صفحے پر درج ھے "نوید" ایک علمی - ادبی' نسوانی - فلمی ماھوار رسالہ ھے لیکن ابھی اس کو ان شاندار لفظوں کا مصداق بنانے کے لیے سخت کاوش اور بڑی محنت کی ضرورت ھے - کتابت اور طباعت بھی فوری توجہ کی محتاج ھے - "نوید' نزول ذخیرہ اسٹریٹ بریلی سے طلب فرمائیں — (ا - ا)

—— ⁑ ——

خاص نمبر

مجلۂ عثمانیہ (جشن سیمین نمبر) -

طلبائے جامعۂ عثمانیہ کا سہ ماھی رسالہ سلطان العلوم خلداللہ ملکہ کے جشن سیمین سے منسوب ھوکر ترتیب و طباعت کی دقتوں کے باعث اگرچہ بر وقت شائع نہ ھوسکا مگر دیر آید درست آید کے مصداق اپنی گونا گوں خصوصیات کا حامل ھے - یہ نہ صرف جشن سیمین کے متعلقہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ھے بلکہ اپنی اس خصوصیت کے باعث کے مجلے

میں دکھنی قومیت کے پہلو کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے یہ ایک تاریخی یادگار ہے - نطق ہمایونی ' جواب سپاسنامہ اور ہز ہائنس والاشان شہزادہ برار کا شفقت و خلوص سے معمور پیام فرزندان عثمانیہ کے لیے باعث فخر ہے - اردو اور انگریزی میں مشاہیر کے پیام جن سے نہ صرف ان کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کو ہندستان میں کیا اہمیت حاصل ہے طلبہ کے لیے نہایت ہمت افزا ہیں -

حصۂ اردو میں یوں تو تمام مضامین منتخب ہیں مگر "جامعۂ عثمانیہ کے مزدور" جامعہ کی حقیقی پیداوار کا آئینہ دار ہے ' ملک کی دیہی تنظیم ' صنعت و حرفت اور زراعت پر ٹھوس مضامین نہ صرف مفید اور کارآمد ہیں بلکہ موقع کے لحاظ سے دور عثمانی کی ترقیوں کو حقیقی طور پر اس سے زیادہ مناسب پیرایے میں بیان ہی نہ کیا جاسکتا تھا - "بھاگ متی کی آپ بیتی" اپنے ماخذ پر ایک اضافہ ہے -

حصۂ انگریزی میں حضرت ظل اللہ کے کلام شاہانہ کے دو انگریزی ترجموں نے مجلے میں چار چاند لگادیے ہیں - پنڈت ہری ہرشاستری کا مبارک باد کا خطبہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے —

ٹائٹل لکھائی چھپائی اور کاغذ سب جشن سمین کی پر مسرت تقریب کے ہر طرح موزوں ہیں -

(ر)

رهنمائے تعلیم لاهور - تعلیم جدید نمبر -

اپنے موضوع کے لحاظ سے بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے اور ماسٹر جگت سنگھہ صاحب کی ان تھک محنت کا نتیجہ ہے، اس خاص نمبر کا حجم ۵۰۰ صفحات کے قریب ہے جو نو حصوں میں منقسم ہے اور اس میں تعلیم جدید کے تقریباً ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے - ہر خاص عنوان پر تجربہ کار ماہرین فن کے اچھے مضامین کو یکجا کرنا قابل تعریف ہے، نظموں کو خوش اسلوبی سے جا بجا چسپاں کرنا ماسٹر صاحب کے حسن ذوق کا شاہد ہے - ہر حصے کا سرورق اور فہرست علحدہ ہے - اس تعلیمی گلدستے کی آرائش میں ہندو، مسلم اہل قلم کا برابر برابر حصہ لینا ایک طرف تو ماسٹر جگت سنگھہ صاحب کی انصاف پسند طبیعت کا ثبوت ہے اور دوسری طرف اس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ اردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قومی زبان ہے - تعلیم کا مبحث یوں بھی بہت اہم ہے اور ایسے مضامین طلبہ اساتذہ اور طلبہ کے والدین تک زیادہ سے زیادہ پہنچنا چاہئیں - اس نمبر میں اکثر مضامین بڑی توجہ اور کاوش سے لکھے گئے ہیں، فی زمانہ ان خوبیوں کے ساتھہ اتنا ضخیم پرچہ شائع کرنا ایک بڑی خدمت اور ماسٹر صاحب کی زبردست قوت ارادی، مستقل مزاجی اور ایثار کا ثبوت ہے، ضرورت ہے کہ اس مفید نمبر کی ایک ایک جلد مدارس کے لیے محکمہ جات متعلقہ کی جانب سے فراہم کی جائے - تعلیم جدید نمبر کی قیمت دو روپے رکھی گئی ہے جو اس کی افادیت اور ظاہری محاسن کو دیکھتے ہوئے کچھہ زیادہ نہیں اس کا مطالعہ طلباء ان کے والدین اور اساتذہ سب

کے لیے حد درجہ مفید ہوگا ۔

سال نامہ "ادب لطیف لاہور" سنہ ۱۹۳۷ ع

اگرچہ اب پنجاب میں سالناموں کی اشاعت کوئی بڑی بات نہیں رہ گئی اور شاید ہی کوئی بدنصیب رسالہ ہو جس کا سالنامہ نہ نکلتا ہو، اور شاید یہی وجہ ہوکہ اب ان سالناموں سے وہ عظیم مقاصد پورے نہیں ہو رہے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر سال میں خواہ مخواہ یہ زحمت گوارا کی جاتی ہے - عام طور سے یہ سالنامے جو لٹریچر پیش کرتے ہیں وہ پست ہی نہیں بلکہ ایک حد تک بازاری اور بعض اوقات مخرب اخلاق بھی ہوتا ہے - تصویریں بھی حیاسوز اور سفلی جذبات کو ابھارنے والی ہوتی ہیں - غرض کہ ان سالناموں سے زبان کی ادبی ضرورت پوری ہوتی ہے اور نہ اُس کے علمی خزینے میں کچھہ اضافہ ہوتا ہے - مالی منفعت اور جلب زر ہی کے لیے اگر یہ صورت اختیار کی جاتی ہے تو اُس کی اور بھی شکلیں ہوسکتی ہیں - مقام مسرت ہے کہ ادب لطیف کا سالنامہ سالناموں کی ایسی ارزانی کے دور میں مجموعی حیثیت سے کامیاب اور قابل قدر ہے - قابل مدیر نے " نذر اولین " کے عنوان سے مضامین پر خود ہی ایک سیر حاصل تبصرہ کرکے ہمارے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے - " بیروزگاری کا نسخہ " اور " درس حیات " پر نوٹ لکھنے میں اڈیٹر صاحب نے ضرورت سے زیادہ فراخدلی کا ثبوت دیا ہے، مانا کہ ان دونوں مضامین کے لکھنے والے پروفیسر علی عباس صاحب حسینی اور جناب منشی رام پوری اردو کی دنیا میں معروف و مشہور

میں لیکن یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ایک مشہور مضمون نگار ہمیشہ اچھا ہی لکھے - " پیروز کاری کا نسخہ " بجائے مزاحیہ رنگ میں ہونے کے ایک پھس پھسا مضمون ہے - خلیفہ ہارون الرشید نے بونائی کا جو نسخہ ایک بڑے میاں کو بتایا تھا غالباً اسی کو سامنے رکھہ کر پروفیسر صاحب نے اپنے نسخے کو مرتب فرمایا ہے - قیسی صاحب کا افسانہ " درسی حیات " اگر " ادب لطیف " میں شائع ہونے کے بجائے دھلی کے " مولوی " یا " پیشوا " میں چھپتا تو کھپ بھی جاتا لیکن " ادب لطیف " کا دامن تو اسی کی روکھی پھیکی منطقی بحث اور غیر مرتب واعظانہ استدلال کے بوجھہ کو اٹھانے سے قاصر ہے - اسی کے ساتھہ نہ انداز بیان میں کوئی شگفتگی ہے اور نہ پلاٹ میں کسی قسم کی دلکشی - اسی قسم کے ایک دو مضمونوں اور بعض غزلوں اور نظموں کو چھوڑ کر سالنامہ " ادب لطیف " میں جو کچھہ ہے اچھا ہے اور پڑھنے کے لائق - تصویریں بھی مذاق عام سے الگ ہیں - سالنامہ $\frac{20\times30}{8}$ کے ۲۲۹ صفحات پر مشتمل ہے - قیمت صرف ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے جو ہمارے خیال میں ایک ایسے اچھے سالنامے کے لیے بہت کم ہے —

(ا-ا)

——:*:——

سالنامہ ادبی دنیا لاہور سنہ ۱۹۳۷ع -

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ بڑے سائز کے ۲۳۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے - چند تصویریں بھی ہیں ' جن میں بظاہر کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی - افسانوں میں " مہارانی کا تحفہ " کردار کی مافوق الفطرت پاکیزگی

اور "دولہا دلہن" کی قارئین نفسیاتی اعتبار سے خوب ہیں - "پنجاب کا ادبی اردو ماہنامہ" خاصہ کوئی کا پر از معلومات مضمون ہے - پروفیسر آر.کامو صاحب جاپانی کا مضمون "جاپان کی موجودہ تعلیم پر ایک نظر" جس قدر مختصر ہے اسی قدر کارآمد - "تہذیب کدھر جا رہی ہے" ڈاکٹر ایس' ایم اختر صاحب کا بہترین سیاسی مضمون ہے' ہماری زبان کو ایسے مضامین کی بہت زیادہ ضرورت ہے - "نیلا" "بھوریا" اور "تخیل پرست" ترجمے ہیں اور کامیاب - نظم کا حصہ بھی بھچا نہیں - مجموعی حیثیت سے موجودہ سالنامے کا معیار رسالے کے گزشتہ سالناموں سے بلند ہونے کے بجائے ایک حد تک پست ہے - امید ہے کہ اڈیٹر صاحب آئندہ تلافی مافات ہی پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ نعم البدل پیش کرنے کی کوشش فرمائیں گے اتنے بڑے سائز کے ۲۳۵ صفحات کا سالنامہ اگر ایک روپیہ چار آنے میں ملتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی اردو داں اس کی خریداری سے محروم رہے —

(ا-ا)

——:*:——

کتابستان لاهور -(امتحان نمبر)

سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ حجم ۸۴ صفحات مرکز اشاعت موہن لال روڈ لاہور "کتابستان" ایک تعلیمی پرچہ ہے جو دو سال سے لاہور سے نکل رہا ہے - زیر نظر رسالہ اس کا امتحان نمبر ہے - رسالے میں

مختلف مضامین کے آزمائشی سوالات درج کیے گئے ہیں جو ورنیکلر مڈل اسکول کے امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔ رسالے کا سالانہ چندہ ایک روپیہ اور فی پرچہ ۲ آنے ہے جو اس کے افادی پہلو کو دیکھتے ہوئے کچھ نہیں — (ا - ا)

——:o:——

مجمع الادب

اسماعیل کالج جوگیشوری

انعامی مقابلہ

اسماعیل کالج میں ۷ فروری کو جو "یوم ولی" منایا گیا تھا اس کو عملی و علمی صورت سے مستقل و مفید بنانے کے لیے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشا پردازوں اور مضمون نگاروں سے درخواست کی جائے کہ وہ مندرجۂ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں - جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے ان کے لیے معقول انعامات پیش کیے جائیں گے - انشا پردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں - طلبہ کے مضامین میں سے بھی سب سے اچھے دو مضامین میں اول کو ایک سونے کا تمغہ اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائے گا - موصولہ مضامین میں سے چند مضامین ایک کتاب کی صورت میں شائع کیے جائیں گے - مضامین مندرجۂ ذیل پتے پر یکم جولائی ۱۹۳۷ ع تک پہنچ جانے چاہیئیں - طلبہ کو اپنے مضامین اپنے کالج یا اسکول کے اعلیٰ افسر کے ذریعے روانہ کرنے چاہیئیں - کوئی ایسا مضمون جو کہیں پڑھا جا چکا ہے روانہ نہ کیا جائے —

(۱) اردو ادب و شاعری میں ولی کا درجہ -
(۲) ولی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اردو کا درجہ -
(۳) ولی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات -
(۴) موجودہ اردو ادبیات پر ولی کا اثر -

نجیب اشرف ندوی
صدر شعبۂ اردو

مجمع الادب - اسماعیل کالج جوگیشوری
۲۰ فروری سنہ ۱۹۳۷ ع

"هندوستانی" مراد آباد

ماہوار مصور رسالہ

ہندوستانی زبان کا ترجمان - غیر مانوس اور مشکل الفاظ سے پاک و صاف اردو ہندی کے جھگڑے کو فنا کرنے والا - مشہور اہل قلم کہنہ مشق مضمون نگاروں، روشن خیال عورتوں، ہونہار نوجوانوں، طالب علموں کی مضامین آرائی کا مرقع - زیر ادارت حضرت رشید 'کنالی' ایم - اے عنقریب نکلنے والا ہے - مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ جون کے پہلے ہفتے تک اپنے مضامین بنام ایڈیٹر ارسال فرمائیں - مشتہرین اپنے اشتہار کے لیے جگہ حاصل کریں —

قیمت سالانہ تین روپے نمونے کی کاپی چار آنے —

المشتہر

مینیجر رسالہ ہندوستانی عزیز منزل مراد آباد

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جاے ' دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ' ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھہ بیان کیا جاے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ چھہ روپے سکۂ انگریزی (سات روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) - طلباء کے ساتھہ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں چار روپے آٹھہ آنے سکۂ انگریزی (پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

VOL. 17 APRIL 1937 No. 66

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq B. A. (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, (Deccan).

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقیء اردو نادر منزل - سیف آباد - حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کو لکھنا چاہیے -

المشتہر : انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

نرخ نامۂ اجرت اشتہارات اردو و سائنس

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۸ روپے سکۂ انگریزی	۳۰ روپے سکۂ انگریزی
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ روپے سکۂ انگریزی	۱۵ روپے سکۂ انگریزی
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۴ آنے سکۂ انگریزی	۸ روپے سکۂ انگریزی

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اُن کےلیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے -

المشتہر منیجر انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) سے شایع ہوا

اردو

جلد ۱۷ | جولائی سنہ ۱۹۳۷ ع | حصہ ۶۷

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابتہ جولائی سنہ ۱۹۳۷ ع

سر سید راس مسعود مرحوم

سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ) کے بے وقت اور ناگہانی انتقال سے جو نقصان عظیم ملک و قوم کو اور خاص کر انجمن ترقیء اردو کو پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے —

مرحوم بوجہ اپنی شرافت نفس، عالی ظرفی، فیض رسانی اور ذوق علم کے ہماری قوم میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے - انجمن ترقیء اردو کی بڑی بڑی امیدیں ان سے وابستہ تھیں اور مرحوم نے حتمی طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھہ عرصے کے بعد صرف انجمن ترقیء اردو ھی کا کام کریں گے - اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر کوئی شخص اس کام کو نہیں کر سکتا تھا - ان کی شخصیت اور وجاہت، ان کی سحر بیانی اور ان کے اخلاق ہر شخص کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے - وہ جہاں جاتے کبھی خالی ھاتھہ نہیں آتے تھے —

انجمن کی مالی حالت کے درست کرنے میں انہوں نے بڑی مدد دی اور آیندہ اس سے زیادہ توقعات تھیں - لیکن افسوس! صد افسوس! کہ ان کی بے وقت موت سے ہماری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا —

مرحوم کی یادگار میں اردو کا آیندہ نمبر مسعود نمبر کے نام سے شایع ہوگا جس میں مرحوم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہوگا - ہم نے ان کے احباب سے خاص طور پر اس نمبر میں لکھنے کی درخواست کی ہے - چنانچہ سر محمد اقبال کا مرثیہ، سر ریجنالڈ گلانسی، مسٹر ای - ایم فارسٹر، ڈاکٹر کرنکو، خان بہادر خوشی محمد خاں صاحب ناظر کا مرثیہ نیز ایک دو اور مضمون وصول ھوچکے ھیں - یہ نمبر اکتوبر یا نومبر کے شروع میں شائع کیا جائے گا —

اڈیٹر

ہندوستان کے درویشوں کی بولیاں اور اردو

از

جناب الحاج محمد اجمل خاں صاحب ایم اے - محقق اسلامیات۔
شانتی نکیتن (بنگال)

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ہندوستان کی پہلے یہ حالت تھی کہ یہاں جتنے مذاہب پیدا ہوتے تھے وہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار نہیں رہتے تھے - آریہ اور دراوڑ اقوام کے اختلاط سے ایک نئے قسم کا مذہب پیدا ہوگیا تھا جو نہ آریہ تھا نہ دراوڑ - اس کے علاوہ مختلف فلسفی اور پڑھے لکھے آدمی بھی اپنے خیالات کی بنا پر نئے نئے مذاہب ایجاد کرتے رہتے تھے، حتیٰ کہ بدھ مذہب کی بنا پڑی جو در حقیقت فلسفۂ ہنود کی بنا پر ایک مذہبی عمارت تعمیر ہوگئی ہے - ہندوستان میں اس کی نظر آسمان کی طرف ہے اور روحانیت کا غلبہ ہے - لیکن یہی مذہب چین میں زمین کی طرف دیکھ رہا ہے اور مادیت غالب ہے - عرصے تک بدھ مذہب اور مختلف ہندو مذاہب رواداری کے ساتھ ہندوستان میں رہے - لیکن سیاسی وجوہ کی بنا پر اختلاف ہوا اور مذہب کی تجدید کا نام لے کر شنکر نے اسے ہندوستان سے خارج کرکے چھوڑا —

مسلمانوں کی آمد نے قدیم ہندوستانی مذاہب کے تار و پود کو بالکل منتشر کردیا - لیکن خود مسلمان بھی فلسفۂ ہنود سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے - اس طرح آپس کے میل جول سے فقرا کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو کچھہ تو محکومیت کی وجہ سے متشائم فلسفے کو ٹھیک اسی طرح ترقی دینے لگے جس طرح رومن حکومت کے تسلط سے کلبیئون اور متشائم فلسفیوں کا یونان میں وجود ہوا تھا - اور کچھہ یہ بھی وجہ تھی کہ حقیقتاً مسلمانوں کی فوجی تنظیم و اخوت و وحدت کے خیالات نے مفتوحین کو مرعوب کردیا تھا - جسے آج کل کی بولی میں احساس پستی (Inferiority Complex) کہتے ہیں - اس طرح بہت سے ہندو فقرا نے اور چند مسلمان صوفیوں نے وحدت انسانی اور توحید یزدانی کے خیالات اسی ملک کی رائج زبان میں ادا کیے - نثر میں بہت کم کہا گیا - نظم اس زمانے میں عوام پسند بھی تھی اور آسانی سے حافظے میں محفوظ بھی رہ سکتی تھی - اس لیے عموماً دوہے ' چوپائیاں اور بانی (یعنی فقیر کی صدائیں) کہی گئیں - اور ان میں آزادی سے نہ صرف فارسی الفاظ کا استعمال کیا گیا بلکہ اکثر تصوف و مذہب اسلام کی اصطلاحات کو بھی فہم عوام سے قریب تر کر دیا گیا —

مختصر سی تمہید کے بعد ' اس مضمون میں زیادہ تر سکھہ مذہب کے بانی گرو نانک اور ان کے مجموعۂ کتب یعنی گرنتھہ صاحب کے متعلق لکھا گیا ہے - کبیر ' فرید ' دادو اور دیگر درویشوں کے متعلق اس میں بہت کم لکھا گیا ہے - لیکن نمونے کے طور پر ان سب کے کلام کا کچھہ کچھہ حصہ ' اور خصوصیت سے گرنتھہ صاحب کی صبح کی دعا جپ جی ' فرید کے دوہے ' اورنگ زیب کے نام فارسی زبان اور گورمکھی خط میں چند

خطوط اور فارسی کی بعض کہانیاں جو "دسویں پادشاہ کے گرنتھہ" میں ہیں ' آئندہ پیش کی جائیں گی - مشکل یہ ہے کہ گرنتھہ صاحب کی لکھائی اس طرح کی ہے کہ کوئی لفظ علحدہ نہیں اور سکھہ بھی مشکل سے پڑھ سکتے ہیں - بہر حال کوشش ہے کہ لکھاؤ کے گرد وارے سے چند نمونے اردو رسم خط میں حاصل ہوجائیں —

فلسفۂ ہنود

ستلج - بیاس - راوی - چناب - جہلم اُن دریاؤں کے نام ہیں جن سے پنجاب بنا ہے - فارسی میں آب بمعنی دریا استعمال ہوتا ہے اسی مناسبت سے یہ ملک مشہور ہوا - خشکی سے سفر کرنے والوں کے لیے دریا اور پانی خاص طور پر جاذب توجہ ہوتا ہے اور دریاؤں سے سڑکوں کا کام بھی لیا جاسکتا ہے - اس لیے ہندوستان کا قدیم تمدن دریاؤں کے کنارے پیدا ہوا ' بڑھا اور مٹ گیا —

ہندوستان آنے والوں میں جو لوگ شمال مغرب کے دروں سے خشکی کا سفر کرکے آئے اُن میں سے آریہ نسل کے غول کے غول عرصۂ دراز تک یکے بعد دیگرے پنجاب سے گزر کر شمالی ہندوستان میں پھیلا کیے - اُنھوں نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کو جسے دراوڑ اقوام نے عروج پر پہنچایا تھا بالکل مٹا دیا اور اُنہیں جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا ' اور دہلی لاہور ' گجرات اور بنگال میں اپنی سلطنتیں قائم کرلیں - اور جس تمدن نے گنگا کے کنارے پرورش پائی تھی وہ دریائے سندھ سے برھم پتر تک پھیل گیا —

نیچر پرستی فلسفے میں بدلی - پھر برھمنوں نے مذہب اور علم

پر قبضہ کیا - اور اس میں وہ وہ موشگافیاں کیں کہ یورپ والے اب تک اُن کا لوہا مانتے ہیں - ریاضی ' کیمیا ' طب اور موسیقات و نجوم پر اپنے تجربوں کی بنا پر وہ وہ نظریے قائم کیے جو اب تک عملی طور پر غلط ثابت نہیں ہوسکے - شمسی سال میں ایک پل کی غلطی نہیں ہوتی - چاند اور سورج کے گرہن ' موسمی پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوتی ہیں - ریاضی کے اصول تو قطعاً نا قابل تبدیل طریقے سے سچے ہیں اور بیدک طب بھی ہندوستان کی آب و ہوا کے لیے کم مفید نہیں —

مذہب میں خدا کا بلند ترین اور وسیع ترین تخیل موجود ہے - روح کو نا قابل فنا بھی مانتے ہیں اور لوکایتک بھی ہیں جو روح اور خدا دونوں سے بے نیاز ہیں - غرض کہ یونان کا وہ فلسفہ جو مغرب کا سرمایۂ ناز ہے ہندو فلسفے کے سامنے ہیچ معلوم ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ آگ اور سورج کی بھی پرستش کی جاتی ہے - لیکن سرد ملک سے آنے والوں کے لیے ان سے زیادہ واجب التعظیم اور حیات بخش کیا چیز ہوسکتی تھی - ایران میں تو آتش پرستی تھی ہی لیکن خود سامی مذاہب میں آگ کو دیوتا مانا گیا ہے - سٹراؤس نے "حیات مسیح" (Strauss, Life of Jesus.) کے صفحۂ ۳۹۱ میں لکھا ہے - کہ عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید میں بھی آگ ہی روح القدس کا مخصوص (Symbol) نشان ہے —

روح کی قدامت اور عدم فنائیت کے متعلق توریت کے موسی یا تو خاموش ہیں یا چند مبہم الفاظ کہتے ہیں - سترابو (Strabo) تو موسی کو ایک مشرک مصری پجاری کہتا ہے - (Volneys Ruins,ch. XXii, Section 9, note) اور یہی خیال ون وڈ ریڈ (W.Reade) "انسان کی

قربانی " (Martyrdom of man) میں ظاہر کرتا ہے - گو موسیٰ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ روح کے فانی ہونے کے قائل تھے لیکن خود سقراط اور افلاطون بھی روح کی عدم فنائیت کو نہ سمجھہ سکے تھے (دیکھو فیڈو - سڈنہم اور ٹیلر کا ترجمہ صفحہ ۳۲۴) چہ جائیکہ توحید یزدانی کے متعلق یہ لوگ کچھہ رائے قائم کرسکتے - اُس زمانے میں بلکہ اُس سے بھی پہلے جب کہ یونانی ایک لامعلوم خدا کا نام " قسمت " یا خونخوار نیے سس رکھتے تھے ہندوستان میں برہمہ (خالق اعظم) اور پرجاپتی کے متعلق بلند ترین تخیل کا وجود پایا جاتا تھا —

بدھ مذہب

اس میں شک نہیں کہ آواگون کے لایعنی یا پیچیدہ خیال نے (جو رامچندر جی کے گرو کی بھی عقل سے باہر تھا) روح کی عدم فنائیت کو مادیت کا جامہ پہنا دیا تھا - اور انسانوں میں اخلاقی فضائل کی ترقی کے بجائے جسمانی ریاضتیں زیادہ پھیل گئی تھیں - لیکن یہ چیزیں مہابھارت کے زمانے کے بعد کی ہیں - پراچین دھرم یعنے قدیم مذہب زیادہ واضح ' ستھرا ' معقول اور فطری تھا برہمنوں نے بعد میں جو ایجادیں کیں اُس نے مذہب کو فلسفہ بنا دیا - اور فلسفہ نام ہی ہے خیالی اور ذہنی ورزش کا - نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ذہنی انقلاب ہوا اور اُن ہی بنیادوں پر ایک نیا مذہب قائم ہوگیا جسے " بدھ مذہب " کہتے ہیں —

بدھ مذہب کے وجود میں آنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ برہمنوں نے بعض اقوام کو نہایت پست درجہ دے دیا تھا - اور

عیسائیوں کی طرح عورت میں یا تو روح کا وجود ہی نہیں مانا جاتا تھا یا انہیں اتنا ذلیل اور ناقابل اعتنا بلکہ شیطانی سمجھ لیا گیا تھا کہ رهبانیت عام ہو گئی تھی، حتیٰ کہ اب بھی برہم آچاری (مجرد) رہنا انسان کو خدا بنانے کا ایک زبردست ذریعہ سمجھا جاتا ہے —

لیکن انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ وہ آزادی کی جگہ قید کو زیادہ پسند کرتی ہے، غلامی کو حریت پر ترجیح دیتی ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ خود بدھ دیو کی زندگی میں بدھ مت کے پیرووں میں ذاتیں بننا شروع ہو گئیں - یہ دیکھ کر گوتم بدھ خفا ہو گئے اور "سنگھ" یا جماعت فقرا کو چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیے - وہ تو ہر ذات کو برابر کر دینا چاہتے تھے، نیچ اونچ کا فرق مٹا دینا چاہتے تھے، عورت کو وہی درجہ دینا چاہتے تھے جو فطرت نے اسے دیا ہے - لیکن وہ لوگ جو ہندو دھرم کی بے عنوانیوں اور بد راہیوں سے تنگ آکر بدھ مذہب کی امن پسندی اور مساوات میں پناہ لے چکے تھے، وہ خود اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق کرنے لگے - اس کے علاوہ گوتم بدھ سے ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے نجات کے لیے کامل تیاگ مکمل سنیاس اور ترک دنیا کا ایسا سبق پڑھایا کہ دو جماعتیں قائم ہو گئیں - بھکشوؤں کو دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا - لیکن گرہست کے بغیر بھکشو کو بھیک دینے والا اور بن مانگے کھلانے والا بھی کوئی نہ تھا - "گرہست آشرم" ضروری ہو گیا - لیکن بھکشوؤں کو ان سے کوئی واسطہ نہ تھا - لہذا ہوا یہ کہ زندگی اور موت، نروان اور "جاندار سے ہمدردی" کے مفہوم پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا لوگوں نے جان بچانے، مریضوں کی مدد کرنے کے لیے شفا خانے بنانے سلطنت نے اس قسم کے ہمدردیٔ جانداراں کے کاموں میں مدد

کی۔حالانکہ اصولاً زندگی اور رنج والم مترادف مانا گیا تھا۔گویا جان بچانا ایسا تھا کہ کسی کو مصیبت میں گرفتار رکھنا - اور یہ کام بہر حال نیک نہیں ہو سکتا تھا۔ بانی مذہب نے کچھہ کہا ' عوام نے کچھہ سمجھا۔ اور وہی کام کیا جو اصولاً فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ سے قریب تر تھا۔

مسیح کے ۹ سو برس بعد کچھہ تو مسلمانوں کے اثر سے اور کچھہ بدھ حکومت اور جماعت کے انتشار کی وجہ سے برہمنوں کو دوبارہ موقع ملا کہ وہ اپنے مذہب کو عوام کے منشا کے مطابق پھر میدان میں لا سکیں۔ آخر زمانے میں بدھ مذہب والوں نے شعبدہ بازی ' جادو گری سنیاس اور اسی قسم کی پر فریب یا تعجب میں ڈالنے والی چیزوں کو مذہب کا اصل الاصول بنا لیا تھا۔ لیکن عوام کے لیے صرف دھوکا ھی کافی نہیں کہ وہ کسی مذہب کو اچھا سمجھتے رہیں ' ان کا پول کھل گیا۔ اور موجودہ زمانے کے پیروں اور پیرزادوں کی طرح بدھ مذہب کے بھکوؤں کو برہمن عالم کے سامنے فرار ہونا پڑا —

احیاے مذہب ہنود

مسیح کے ۹ سو برس بعد شنکر آچاریہ نے مکمل طور پر بدھ مذہب والوں کو ہندوستان سے خارج کر دیا - بدھ مذہب کا فلسفۂ لا ادریت جس میں خواہشات کو مٹانا ہی فراغت کاملہ کا مترادف تھا ' فنا ہو گیا۔ کپل کی دہریت اور چارواک کی مادیت شکست کھا گئی۔ اور بت پرستی کے ساتھہ ساتھہ صفات و قوی (گن) کی پرستش رائج ہوگئی - مندروں میں فنا کنندۂ مخلوقات (شیو) کی قوت حیات کا مظہر "لنگم" کی شکل میں رونما ہوا۔ اور موجودہ زمانے کے محققین کے خیال کے مطابق دراوڑ

مذہب کے دیوتا (شیو) نے برہمن دیوتاؤں کو کسی لامعلوم طریقے سے خارج کرکے اپنا تسلط کرلیا - وشنو (خالق کائنات) اور مہیش یا برھمہ یعنی خالق اعظم نے ھندو مذہب کی تثلیث کو پورا کردیا - اور مقامی رسم ورواج کے اعتبار سے ہزارہا دیوی دیوتاؤں کو پھر آزادی مل گئی کہ اپنی پرستش کرائیں - ویدوں اور پرانوں پر عقیدہ رکھنا کافی تھا - حتیٰ کہ لامذہبیت بھی ھندو دھرم میں شامل تھی بشرطیکہ ویدوں اور سمرتیوں کے تقدس کا انکار نہ ہو اور دو جنموں میں برھمنوں کو تفوق ھی حاصل ہو' بلکہ وہ دیوتا سمجھے جائیں - اس طرح آریہ اقوام کے مذہب نے گو دراوڑ مذہب سے نادانستہ شکست کھائی مگر موجودہ ہٹلر یا مسولونی کی طرح ملک میں آریوں کی ایک مضبوط فاشسٹ پارٹی شنکر آچارج نے قائم کر دی —

یاد رکھنا چاھیے کہ تقریباً دو سو سال کے بعد (بارھویں صدی میں) رامانج نے وشنو (خالق کائنات) کی پرستش جاری کی تھی - کرشن جی وشنو ھی کے اوتار مانے جاتے ھیں - اور باوجودیکہ کرشن جی نے مہابھارت کی سی عظیم الشان جنگ کرادی تھی لیکن غالباً شیو پرستوں کی ضد پر وشنو پرست قطعاً اہمسا (عدم تشدد) کے قائل ھیں اور ان کا مذہب ویشنوی کہلاتا ھے - مسٹر گاندھی اسی صلح کل' غیر موذی مذہب کے سچے پرستار ھیں - اور بھگوت گیتا کی غلط تفسیر سمجھنے کے بعد دوسروں کو بھی اس کا پیرو بنانا چاھتے ھیں —

گرو بھگتی پر دونوں مذہب متفق تھے - اور تن من دھن سے برھمن گرو کی بھگتی کرنا ھر وفا شعار ھندو چیلے کا فرض تھا - عبادت کے لیے خاص رسمیں بھی تصنیف کرلی گئی تھیں تاکہ بدھ فلسفے کی خیالی دنیا

سے نکل کر ایک عامی ہندو کو ظواہر کی عبادت میں ذاتی تسکین حاصل ہوسکے - اسی لیے رام اور کرشن کی پرستش بھی ایزاد کردی گئی تھی - اور الفنسٹن کا خیال صحیح ہے (تاریخ ہند صفحہ ۱۸۹) کہ "ان کی انسانی صفات و افعال کی وجہ سے لوگوں کو ان سے اور ان کے مصائب سے ہمدردی ہوگئی تھی اور اسی لیے ان کی پوجا ہوتی تھی" "بعینہ یہی کیفیت کلوویس (Clovis) کی نفسیاتی کیفیت کی مظہر ہے - جب اُس نے اپنی عیسائی بیوی سے مسیح کی دردناک سولی کا حال سنا تو فوراً عیسائی ہوکر رائمز (Rheims) کے راہب کا مرید ہوگیا اور کہنے لگا کہ کاش میں اپنے بہادر فرینک سپاہیوں کے ساتھ اُس وقت موجود ہوتا تو سولی دینے والوں کو مزہ چکھا دیتا (گبن "انحطاط و زوال سلطنت روما" جلد ۲ صفحہ ۳۰۲) - اسی قسم کے الفاظ تیمور لنگ نے شہادت حسین کا حال سن کر کہے تھے اور اب تک بہت سے مسلمان مجالس عزا میں پکار اُٹھتے ہیں کہ "ہائے حسین! ہم نہ ہوئے" —

اسلام

مسیح کے ہزار سال بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کافی اثر پھیل گیا تھا - محمود غزنوی کی موت سے پہلے مسلمانوں کا پنجاب پر قبضہ ہوچکا تھا - قنوج اور گجرات پر حملے ہوچکے تھے - اور سنہ ۱۱۸۳ ع میں غزنویوں کو غوری نکال چکے تھے - وہ ترک تھے یہ افغان تھے - غور وہ علاقہ ہے جو غزنی اور ہرات کے درمیان واقع ہے - انہوں نے غزنی کے بعد پنجاب ہندستان اور بنگالہ فتح کرلیا - اور فتح کی یاد میں قطب مینار دلی میں قائم کردیا، اور راجپوت جمنا اور نربدا کے درمیانی علاقے میں

چلے گئے - پھر خلجیوں نے اپنی نوبت بجائی - چتوڑ، گجرات اور دکھن فتح کرلیا - اور بختیار خلجی اور علاءالدین خلجی نے بحیثیت جنرلوں کے وہ کار ہائے نمایاں کیے کہ سکندر بھی عالم بالا سے حیرت سے دیکھ رہا تھا - تیرھویں صدی کے شروع میں ہندوؤں نے بغاوت کردی اور اس کا اثر دکن تک پہنچا - لیکن پنجاب کا تغلق صوبہ دار آپہنچا اور اُس نے اپنی سلطنت قائم کرکے دہلی کے بجائے تغلق آباد بسایا سنہ ۱۳۹۸ میں تیمور نے ہندوستان فتح کرکے چھوڑ دیا - اس کے بعد ۵۲ سال تک سیدوں کا دور دورہ رہا - پھر لودھی پٹھان آئے اور آخر کار سنہ ۱۵۵۵ ع میں ہمایوں نے مغل سلطنت کی بنیاد مستحکم کردی اور سنہ ۱۵۵۶ ع سے ۵۰ سال تک اکبر نے اس طرح سلطنت کی کہ بعض اسے بادشاہ سمجھتے تھے اور بعض دیوتا —

پٹھان بادشاہوں کو مذہب سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی محمد بن قاسم کے زمانے کے عربوں کو ہو سکتی تھی - ان بادشاہوں نے ہندوستانی رسوم کو فراخدلی سے جذب کرنا شروع کیا - تجارتی اصول ہندوؤں کے اختیار کیے - زراعتی سال بھی شمسی رائج کردیا جو اب تک فصلی سنہ کے نام سے رائج ہے - اور ان میں سے اکثر ایسے بھی پٹھان تھے جو ہندو راجاؤں کے ملازم ہوکر مسلمانوں کے ساتھ لڑنے میں کوئی مذہبی نقیض نہیں پاتے تھے - یہ لوگ بھی ہندوؤں کے کرشن اور بھیروؤں کی بجائے پیروں اور شہیدوں کی پرستش کرنے لگے تھے اور ہندوؤں سے میل جول رکھتے رکھتے ہندی فارسی پشتو اور ترکی سے مل کر ایک نئی زبان بھی پیدا ہوچلی تھی جو بعد میں ریختہ یا اردو کے نام سے مشہور ہوئی —

علما تو ہمیشہ سے عوام‌الناس کی صحبت سے پرہیز رکھتے تھے - اور اب تک اپنا تقدس قائم رکھنے کے لیے اکثر سعدی کے اس شعر پر عمل کرتے ہیں کہ —

زجاہل گریزندہ چوں تیر باش نیا میختہ چوں شکر شیر باش

لیکن غوریوں کے زمانے ہی سے ہندوستان میں کچھ ایسے روشن خیال علما بھی آگئے تھے جنھوں نے بجائے درسیات کے تبلیغ اسلام کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا - انھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ان مقامات کو چنا تھا جہاں دین اسلام کو جاننے والا کوئی نہ تھا - اور عامتہ‌الناس کی کشش کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ اپنی مجلسوں میں فارسی اور ہندی "چیزوں" کے گانے والوں کو دعوت عام تھی کہ وہ آئیں اور توحید الٰہی اور توحید بنی نوع انسان کے نغمے گائیں - ان کی مجالس میں اونچ نیچ کی تفریق نہ تھی ' نہ ذات پات کا خیال تھا - محبت اور خدمت خلق ' ذریعۂ عبادت تھی - اور اجمیر ' پاک پٹن دھلی ' ملتان ' کڑامانکپور ' ناگور ' حیدرآباد ' میسور ملابار اور کرناٹک غرض کہ کوئی ہندو راجدھانی ان کے فیوض سے خالی نہ تھی - یہ لوگ تھے تو عالم دین اسلام لیکن اپنی صلح جویانہ حکمت عملی کی وجہ سے مشائخ یا اللہ والے لوگ (اولیاء اللہ) مشہور تھے —

رد عمل کا نتیجہ

اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی خیالات نے سیاسی سرپرستی میں نشوونما پائی اور عمل و رد عمل شروع ہوا - لیکن ہوا یہ کہ ہندوؤں ' خصوصاً برہمنوں کی تنگ نظری کی وجہ سے

جب خود ہندو علوم سنسکرت سے محروم تھے تو بھلا مسلمان کب محرم ہو سکتے تھے - لہذا مسلمانوں کو جو کچھہ معلوم ہوا وہ نتیجہ تھا ان کی ظاہری پرستش اصنام کا مسلمان عموماً سب ہندوؤں کو بت پرست سمجھنے لگے اور ہندوؤں نے اپنے برادری اور ذات کے نظام کی وجہ سے مناسب نہ سمجھا کہ وہ ترک مذہب کریں اور اسلام کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں - سنی سنائی باتوں یا مشائخ کی مجلسوں سے جو کچھہ معلوم ہو سکتا تھا وہ اتنا ہی تہا کہ مسلمان ایک اللہ کو پوجتے ہیں اور ان میں چھوت چھات نہیں ہے - مسلمان یہ سمجھتے کہ سب ہندو مشرک اور بت پرست ہیں اور گوشت خوری سے ڈرتے ہیں - ان کا مذہب چھونے اور نہ چھونے کے قواعد کا نام ہے - حالانکہ جو لوگ جانتے ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ —

(۱) ہندوؤں میں ایسے فلسفۂ مذہب کے ماننے والے بھی ہیں جو ادَویت یا وحدت وجود کے قائل ہیں جو جیو آتما (روح انسانی) کو پرماتما (خدا) سمجھتے ہیں ' اور دورنگی یا دوئی کو محض دھوکا جانتے ہیں —

(۲) ان میں اس قسم کے ادویت کے ماننے والے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ بعض اعمال (کَرَم) کی وجہ سے تم خدا سے جدا ہوگئے ہو' نیک اعمال کرکے پھر اسی ذات سے واصل ہوجاؤ گے اور نجات کامل حاصل کرو گے —

(۳) ان میں اس قسم کے بھی لوگ ہیں جو بالکل دُویت (ثنویت) کے قائل ہیں - جیو آتما اور پرماتما کو الگ الگ تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ممکن نہیں کہ خدا سے وصال ہو البتہ نیک

افعال کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی قربت حاصل ہو جائے
اور پھر دوبارہ پیدا ہونے سے نجات حاصل ہو جائے —

۴) ہاں ایسے بھی ہیں جو نہ صرف بتوں کی پرستش کرتے ہیں بلکہ جنھوں نے پست ترین جذبات میں گھر جانے ہی کا نام نجات رکھا ہے - شراب خوری، زنا، انسانی قربانی، ٹھگی وغیرہ مذہب کے نام پر کرنا برا نہیں سمجھتے بلکہ بام مارگی اور کالی پوجا کے حامی تو اکثر بدکاریوں کو محاسن میں شمار کرتے ہیں - اور اگر غور کیا جائے تو ان کے فلسفے میں بھی بہت سی حقیقی خوبیاں نظر آئیں گی - کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں کو اچھا کہا جائے جو شراب کی تعریف کے راگ گاتے ہیں، غزل اور رباعی کو اس کے لیے مخصوص کردیتے ہیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ علانیہ شراب پئیں اور ان بیچارے بام مارگیوں کو برا کہا جائے جو شراب پینا ہی سرے سے برا نہیں سمجھتے بلکہ اچھا سمجھتے ہیں اور پیتے ہیں - پھر مرد و عورت کے جنسی تعلقات پر اتنا پردہ ڈالا جاتا ہے کہ سوائے فقہ کے یا یورپ کی طلاق کی عدالتوں کے اس کا ذکر کرنا بھی خلاف تہذیب اور خلاف فطرت سمجھا جاتا ہے - حالانکہ قوانین قدرت کے مطابق ایک عورت اور ایک مرد کو ہمیشہ کے لیے باندھ دینا سخت ظلم ہے - دونوں کو اپنی اپنی تجویز کو مسترد کردینے کا کامل حق ہونا چاہیے - اسے طلاق کہیے یا خلع - بہر حال بام مارگیوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے اصول کے مطابق عمل کرنا شروع کیا - اور وہ ہندو یا عیسائی جو عورت کے وجود ہی کو سر تا پا گناہ سمجھتے ہیں، جو جنسی تعلقات کو اتنا برا سمجھتے ہیں کہ کنواریوں سے پیغمبروں اور "سنتوں"

پیدا کرانا مناسب سمجھتے
کو پیدا کرانا یا بسا اوقات بغیر عورت ہی کے
ہیں ' وہ لگے منہ چڑانے اور گالیاں دینے - کوئی ان عقلمندوں سے پوچھے
کہ اگر بام مارگی غلطی پر ہیں تو تم کہاں راستی پر ہو ' جو عورت
کو ناپاک اور غیر ذی روح تو سمجھتے ہو - مگر بغیر اُس کے نہ تم وجود
میں آئے نہ دوسروں کو وجود میں لانے کے بغیر چارہ سمجھتے ہو —
رھی کالی ' شکتی یا پاربتی (زوجہ شیو) کی پوجا اور اُس پر
آدمیوں کی بجائے بھینسوں اور بکروں کی بلی (قربانی) چڑھانا تو
کیا تم روز نہیں دیکھتے کہ ایک مرد دوسرے کے لیے ' ایک قوم دوسری
قوم کے لیے مسلسل قربان ہورہی ہے اور ہوگی - جہد حیات کبھی نہ
مٹ سکتی ہے نہ مٹے گی - اگر جنگ کی دیوی نے اپنے قبیلے کے دشمنوں
کا خون بہتے ہوئے دیکھنا چاہا ' تو وہ سادہ لوح پرستار ہرگز قابل الزام نہیں
جو قدیم زمانے سے اپنے دشمنوں کا خون اپنی پیاری دیوی کے سامنے بہاتے
تھے - کیا اُنہیں یقین کامل نہ تھا کہ اسی دیوی کی عزت و پرستش
نے اُنہیں فتح کامل نصیب کرائی ہے - اس کے علاوہ کیا اُن کا انسانی
قربانی کرنا اس سے بہتر نہ تھا کہ سب قیدی غلام بنائے جائیں اور
جیتے جی دائمی جہنم میں پڑے رہیں - میں تو یہ کہوں گا کہ غلام بنانے
سے بہتر اور مناسب تر سوائے قتل کے اور کچھ نہ تھا —
آج ہندوستان میں ہزاروں نہیں لاکھوں اچھوت اپنی دائمی غلامی
سے بیزار ہوکر مسیحیوں اور مسلمانوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں - غلامی
اور ذلت و مسکنت نے اُن کا یہ حال کردیا ہے کہ وہ صحیح طور پر
سوچ بھی نہیں سکتے —
اس کے علاوہ اُن بیچاریوں کی حالت کو دیکھیے جنہیں ہندؤور

میں پیدا ہونے کا فخر تو حاصل ہوا لیکن کرموں کے کھوٹ نے اُنہیں بیوہ کردیا - دلہن ' سہاگن ' بہو کے معزز خطابات چشم زدن میں نصیبوں جلی ' سبز قدم ' منحوس میں تبدیل ہوگئے - گویا اس فریب ہی کے مشورے سے شیو جی نے اپنا حربۂ فنا استعمال کیا تھا - سیج کو فرش زمین سے تبدیل کردیا گیا - مخمل کو ٹاٹ سے ' اور راحت ارضی اور لذائذ جسمانی کو زندہ جہلم سے - ہنسنا گناہ ہے - کھانا گناہ ہے - سونا گناہ ہے - سنگھار تو ناممکن ہے - یا شیو ! کیا تیرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس ناکردہ گناہ پر ایسے راحت وسکون بخش ہتھیار کا پہلا وار ہوتا ' کیا زندگی بھر جلنے سے چند منٹ کی چتا کی اذیت اور دائمی سکون بہتر نہ تھا - کتنا ظلم ہوا کہ ستی کی رسم مٹانے سے پہلے لارڈ ولیم بنٹنک صاحب نے یہ قانون نہ نافذ کیا کہ ہر بیوہ کی شادی لازمی ہوگی - اور جس ہندو کے یہاں بیوہ نظر آئے گی اُس خاندان کے پروہت (برہمن) کو ملزم سے دگنی سزا دی جائے گی —

نئے مذاہب کی بناء

غرض کہ مسلمانوں اور ہندؤوں کے خیالات کے تصادم نے ہندوستان میں ایک نئی تحریک اصلاح پیدا کردی - نہ تو مسلمانوں نے ہندوؤں کے مذہب کو پورے طور پر سمجھا تھا نہ ہندؤوں نے مسلمانوں کے مذہب کو جانا - لیکن عوام سے سن سناکر چند نظریات دونوں جماعتوں نے قائم کرلیے - نتیجہ یہ ہوا کہ چودھویں صدی مسیحی کے اخیر میں " رامانند " نے بنارس سے ایک نیا مذہب یا نئی اصلاح شروع کی - یہ "رامانج" کے شاگرد تھے - اور مسلمانوں کے خیالات اخوت ومساوات سے متاثر معلوم

ہوتے تھے - اُنھوں نے ذات پات کے جھگڑوں کو مٹاکر ہر شخص کو رام کی پرستش کے لیے بلانا شروع کیا - چونکہ رام وشنو کے اوتار مانے جاتے ہیں لہذا اس جماعت کو شیو کے پرستاروں سے نفرت سی ہوگئی تھی - حتیٰ کہ دریائے نربدا کو عبور کرنا بھی گوارا نہ تھا - اس لیے کہ یہ دریا شیو کے پرستاروں کے نزدیک مقدس تھا اور ممالک متوسط ہند میں یہ مثل مشہور تھی کہ " رھوا (یعنی نربدا) کے کنکر سب شنکر (شیو) " یعنی نربدا کے کنکر تک شیو کی مانند ہیں —

اسی زمانے میں گرو گورکھ ناتھ نے پنجاب میں جوگ (ترک لذات) کی تعلیم دینی شروع کی - انھوں نے شیو کی پرستش جاری کی - اور جسمانی ریاضتیں اور حبس دم وغیرہ کے طریقے رائج کیے جن کے ذریعے سے ہر ذات کا شخص وجود مطلق سے واصل ہوسکتا ہے - یہ جوگی کن پھٹے ہوتے تھے یعنی بجائے ترسول کی علامت کے (جو پیشانی پر بنائی جاتی ہے) جوگیوں نے اپنی علامت کان میں بڑا سوراخ کرکے مقرر کی تھی - محسن فانی مؤلف " دبستان مذاہب " نے جوگیوں اور صوفیوں میں ایک قسم کی مماثلت بتائی ہے کہ کس طرح روح کو بقا بالله کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے اور " حق " یا " ست " تک رسائی ہوسکتی ہے —

پچاس سال کے بعد کبیر نے سنہ ۱۴۵۰ ع کے قریب بت پرستی کے خلاف جہاد شروع کردیا - اور ظاہری رسوم کو چھوڑ کر دل کی صفائی اور پاکیزگی کی طرف ہندو مسلمانوں کو بلانا شروع کیا - جس خیال کو کبیر نے

" نا کاشی میں نا متھرا میں نا بندرا بن میں
کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہر تو تورے من میں "

کہ کر رائج کیا تھا - اس کو اس سے بہت پہلے فارسی شعرائے ایران و

ھند نے مختلف طریقوں سے ظاہر کیا - حافظ و سعدی نظیری و صائب خیام و ابوالعلاءالمعری سب وحدت انسانی ' ترک رسوم اور صفائی قلب کے نغمے گا چکے تھے - آخر زمانے میں درد نے کہا :

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ' ہم کنشت دل میں ہو
درد منزل ایک تھی کچھ راہ ھی کا پھیر تھا

اور غالب نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا :

ہم موحد ھیں ھمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

غرضکہ کبیر کی معرفت آمیز تعلیم اور مساوات انسانی کے دوھوں نے جو نہ سنسکرت تھی نہ عربی بلکہ عام لوگوں کی سادہ اور فطری زبان میں تھی ' ھندوستان میں مشرق سے مغرب تک دھوم مچادی - کبیر نے دنیا کو مایا' فریب یا ایک خوبصورت عورت سے تشبیہہ دی اور گمراھی سے دور رھنے کی تعلیم دی - لیکن کبیر نے شاید یہ غلطی کی کہ ترک دنیا اور سنیاس کی بھی تعلیم دی - محسن فانی کا بیان ہے کہ کبیر کی تعلیم سے نہ صرف ھندو بلکہ بہت سے مسلمان بھی بیراگی بن گئے - اور ترک رسوم کرکے "رام" اور "رحیم" دونوں کو لفظی ھیر پھیر سمجھنے لگے —

سولھویں صدی کے شروع میں چیتن نے بھگتی کی تعلیم (جو راماننڈ اور کبیر سے شروع ہوئی تھی) بنگال میں جاری کی - لیکن انہوں نے بیراگ پر زور نہیں دیا - گرھست زندگی اور شادی بیاہ کو جائز سمجھا - لیکن گرو بھگتی یا پیر پرستی کو جاری کردیا - حتیٰ کہ ان کے پیرووں نے گروؤں کے نام کو خدا کے نام سے پہلے جگہ دی اور بعد میں تلنگانے کے ولبھہ سوامی نے بیراگیوں پر شادی شدہ یا گرھست گروؤں کو بہتر بتایا -

اور گوسائیوں کی جماعت پیدا ہو گئی جو دین و دنیا دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے لگے ۔ انہوں نے بال گوپال (معصوم کرشن) کی پرستش کی تعلیم بھی جاری کی جس سے ایک قسم کی بت پرستی شروع ہوگئی —

رجب، کمال اور داؤد نے جو ہندوؤں میں دادو کے نام سے مشہور ہیں، اس بھگتی کی تعلیم کو ملک میں عام کیا - ان کے دوہے اب تک زبان زد خلائق ہیں - ان کے سامنے ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی - یہ مذہب صلح کل، عام پسند اور رسم شکن تھا - ذات پات کو مٹانا اور ظاہری مذہبی پابندیوں اور رسوم کو مٹانا اس کا مقصد تھا - گو بعد میں بعض مشرکانہ رسوم اور ایک قسم کی مورتی پوجا بھی رائج ہوگئی - لیکن اب بھی اس جماعت کے موحد کثرت سے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں - رامانندی، کبیر پنتھی، کن پھٹے جوگی، بال کرشن اور نانگے (یادگار دادو) اب تک توحید و محبت کے گیت گاتے ہیں —

گرو نانک

یہ زمانہ تھا جب کہ نانک سنہ ۱۴۶۹ ع میں لاہور کے قریب اپنی ننھیال میں پیدا ہوئے اسی وجہ سے ان کا نام نانک ہوگیا - شروع میں ایک برہمن کے زیر تعلیم رہے - لیکن وہ اس ہونہار بچے کو معقول تعلیم نہ دے سکا - پھر مولوی سید حسین نے نہایت محبت سے تعلیم دینی شروع کی - اس لیے کہ بقول صاحب سیرالمتاخرین اس کے کوئی اولاد نہ تھی - اور زمانے کے رواج کے مطابق فارسی عربی پڑھائی - ملکم کا

قول ہے (سکھ صفحہ ۱۲) کہ " نانک کے متعلق مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ انہیں کل علوم وفنون میں خواجہ خضر نے تعلیم دی تھی" - اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پیدائشی ولی تھے اور خدا نے ان کی فطرت ہی میں محبت بنی نوع انسان کے وہ اصول داخل کردیے تھے جو دنیا کی ظاہری تعلیم سے بہت کم حاصل ہوتے ہیں - سکھہ مصنفین کی عام رائے یہ ہے کہ انہوں نے بظاہر بہت کم تعلیم حاصل کی - جو کچھہ انہیں علم تھا وہ سرچشمۂ ازل ہی سے حاصل ہوا تھا —

آدی گرنتھہ وہ کتاب ہے جس میں سکھوں کے لیے بہت کچھہ اخلاقی تعلیم جمع کردی گئی ہے - اس میں کبیر اور گورکھہ ناتھہ کے دوہوں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی تعلیم کا بھی نانک پر اثر ہوا تھا - دبستان مذاہب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان درویش نے انہیں تعلیم دی تھی - اور ملکم نے (سکھ صفحہ ۱۳۰۸ میں) تحریر کیا ہے کہ " اتفاقاً کچھہ فقیروں سے ملاقات ہوگئی - ان کی صحبت کا نانک کی طبیعت پر بہت اثر ہوا " --

اس میں شبہہ نہیں کہ نانک نے نہ صرف ہندوستان کا دورہ کیا بلکہ تلاش حق میں مکے کا سفر بھی کیا - اس زمانے میں زیادہ تر پیدل حج کیا جاتا تھا اور راستہ دشوار گزار تھا اور اب بھی ہے - آج کل بھی ہزاروں مسکین فقیر پنجاب اور سندھ سے پیدل سفر کرکے مکے پہنچ جاتے ہیں - بعض تو ان میں ایسے ہوتے ہیں کہ مزدوری سے پیٹ پالتے ہیں لیکن زیادہ تعداد بھیک مانگ کر زندگی بسر کرتی ہے - لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ بے مایہ اور مفلس لوگ کس قدر جری اور شوقین ہیں کہ جان پر کھیل کے ایسے سفر کرتے ہیں | چونکہ عموماً فقیر تعلیم

یافتہ ہوتے ہیں اس لیے یورپ والوں کی طرح ان کے سفر نامے مرتب نہیں ہوتے - نہ اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے کس طرح سندھی، فارسی اور عربی زبانوں پر حاوی ہو جاتے ہیں - اس قسم کے سفروں کے لیے اگلے زمانے میں ایک مثل تھی "الرفیق قبل الطریق" - یعنی راستہ چلنے اور سفر کرنے سے پہلے ایک ساتھی کی تلاش ضروری ہے - آج کل بھی یہ مثل صادق ہے - عرب کے سفر کے لیے خصوصیت سے ضروری ہے کہ ایک رفیق ضرور ہو اور اگر دو ہوں تو کیا کہنا ہے - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایام حج میں بدری اونٹوں کی دوڑ اور کشمکش میں اور عربی شو فروں کی جان ہار موٹر بازی میں پیدل چلنے والوں کو اپنی جان نذر کرنی پڑتی ہے - اور اگر کوئی رفیق نہ ہوا تو یہ معلوم ہونا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی نعش ہے - البتہ پتے کا کارڈ یا پاسپورٹ جیب میں ہو تو شاید کوئی پتا لگانے کی زحمت گوارا کرے —

فرض کہ گرو نانک نے ایک رفیق سفر کے ساتھ عرب کا سفر کیا - یہ رفیق مسلمان تھا جو سفر کی صعوبتوں کو کم کرنے اور بہر حال ایک روحانی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنے ساتھ ایک رباب بھی رکھتا تھا - غالباً یہ یادگار ان مشائخ چشتیہ و نظامیہ کے سلسلے کی ہوگی جنہوں نے موسیقی کو اپنے حلقوں میں داخل کر لیا تھا - اور عوام و خواص دونوں بقدر ظرف و ذوق اس سے بہرہ اندوز ہوتے تھے - بہر حال مردانہ ربابی ساتھ تھے اور دونوں فقیر نیل کے رنگے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے مصروف سفر تھے -

ہندوستان میں عموماً یہ خیال ہے کہ کعبے کی طرف پاؤں کر کے نہ لیٹنا چاہیے - ہندوؤں میں بھی بعض سمتیں متبرک سمجھی جاتی ہیں اور پکے ہندو ادھر پاؤں کر کے نہیں سوتے - اسی خیال کے ماتحت

نانک کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ حرم کے اندر
ہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹے ہوے تھے تو کسی نے غصے سے کہا کہ خدا کے
کی توہین کیوں کرتے ہو - تو انہوں نے نرمی سے جواب دیا کہ
ی جدھر خدا کا گھر نہ ہو وہ سمت بتاؤ تو میں ادھر پاؤں کرلوں -
میں اس پر یہ اضافہ ہوا کہ اس شخص نے ان کے پیر دوسری
ـ گھمانے چاہے لیکن جدھر گھماتا تھا اسی طرف کعبہ بھی چلا جاتا تھا -
م کے روسے تو کعبے کی صرف اتنی عزت ہے کہ یہ حضرت ابراھیم
نایا ہوا مکان ہے جو خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا - لیکن اس
ـ پاؤں کرنا یا نہ کرنا نہ تو مذہب میں داخل ہے نہ کبھی اس پر
ہ کی گئی - آج تک ہزاروں مسلمان وہاں سوتے ہیں' گپ بازی
ہیں - پانی پیتے ہیں' کفن کو زمزم کے پانی میں بھگو کر سکھاتے
- (یہ فعل صرف ہندوستانی کرتے ہیں) ' کبوتروں کو دانا دیتے
- غرض کہ عبادت سے زیادہ تفریح کرتے ہیں - اور حرم کے باہر
صفا اور مروہ کے درمیان جو سڑک ہے اس میں تو اس کثرت سے
ا بجایا جاتا ہے کہ جو لوگ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں وہ اپنی
ئیں بھول جاتے ہیں اور بعض تو مرتے مرتے بچتے ہیں - ہوتا یہ ہے
اس جگہہ اس کثرت سے موٹریں دوڑائی جاتی ہیں اور سعی کرنے
ں کو موٹروں کے کریہ الصوت بھونپو (ہارن) اتنی مہلت نہیں دیتے
وہ دلجمعی سے عبادت کرسکیں —

جس قدر کوئی خیال قدیم ہوتا جاتا ہے اسی قدر وہ مقدس بھی
ا جاتا ہے - اسی نظریے کے ماتحت مسیح کے پرستاروں نے سیکڑوں
[illegible] کی طرف منسوب کردیے - حالانکہ موجودہ تنقید نے خود

انجیل مقدس کے بعض اجزا کو مہمل اور فاضل قرار دے دیا ھے اور پادری بھی معجزات کے منکر ھیں (دیکھیے سنڈر لینڈ " عروج و ترقی مسیحیت ") - اسی قسم کے معجزات مسلمانوں نے اپنے پیغمبر سے منسوب کردیے ھیں - حالانکہ قرآن میں سوائے اعجاز قرآن کے اور کسی معجزہ کا ذکر نہیں - گرو نانک تو بالکل تاریخی زمانے کے بزرگ ھیں - اگر میں ذرا اور بوڑھا ھوتا تو کہتا کہ کل کی بات ھے کہ گرونانک نے فقیری لی ' سادھی کی اور ھندو و مسلمانوں کے بلند فلسفے اور مہمل علم کلام سے نفرت کا اظہار کیا - صلح کل رھے اور اس طرح زندگی بسر کی کہ نہ ھندو انہیں ھندو کہتے تھے نہ مسلمان مسلمان - بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ھے کہ - ھندو انہیں ھندو سمجھتے تھے اور مسلمان مسلمان —

اگر کوئی قوم اپنے مذھب کو فلسفہ بنادے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ھوگا کہ وہ مذھب اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ باقی نہ رھے گا - ھندوؤں نے برھمنوں کو اتنا آرام پہنچایا کہ وہ سوائے فلسفے کے دوسری چیز ھی نہ جانتے تھے - ان کا مذھب ' ان کی شاعری ' ان کی زندگی ان کی موت سب فلسفہ تھی - اس کا یہ اثر ھوا کہ آج بھی ھندوستان کا ایک عامی سے عامی کچھ نہ کچھ مسائل کرم اور آواگون سے واقف ھے - مسلمانوں نے بھی جب سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرلیں اور ملک گیری سے فرصت ملی تو ان میں بھی برھمن پیدا ھو گئے جنھوں نے علوم و فنون کو اپنی جاگیر بنانا چاھا - لیکن خیریت ھوئی کہ صرف مذھب تو فلسفہ بن کے ان کے پاس رہ گیا لیکن رند مشرب شعرا اور آزاد خیال معتزلہ کی بدولت زندگی کی بہت سی دلچسپ چیزیں فلسفہ بننے سے بچ گئیں - لیکن بہر کیف مذھبی فلسفے کا یہ اثر ھوا کہ مسلمان عوام افلاطون اور

ارسطو، جالینوس اور فیثا غورث کے ناموں سے واقف ہوگئے اور انہیں مسلمان سمجھنے لگے۔ اور علمائے کرام نے بھی اتنی فراخ دلی ضرور برتی کہ دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندو کافروں کے ریاضی و نجوم اور یونانی مشرکوں کے فلسفے اور طب کو مدارس میں جاری کرنے سے گریز نہیں کیا —

لیکن ہندو اور مسلمان صرف برہمن اور ملا ہی کو نہیں کہتے۔ اس میں ۹۹ فی صدی سے زیادہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے یا جنہیں زندگی میں یہ جاننے کی فرصت نہیں ملتی کہ مذہب کیا ہے اور واجب الوجود اور پرجاپتی کا تخیل کیونکر پیدا ہوا اور اس کا کیا مفہوم ہے۔ پنڈتوں اور ملاؤں کی اس فلسفیت کا ایک اچھا اثر یہ ہوا کہ عوام نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا۔ وہ زبانی تو یہی کہتے رہے کہ ہم ہندو ہیں ہم مسلمان ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بالکل ایک انسانی اور فطری مذہب کو ایجاد کر چکے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ وہ رام لیلا میں بھی جاتے تھے اور امام باڑے کی بھی سیر کرتے تھے۔ وہ کالی کی پوجا بھی کر لیتے تھے اور شہید مرد کی قبر پر چراغ بھی جلاتے تھے۔ غرض کہ ان کا مذہب رواداری تھا۔ وہ محبت کے بندے تھے اور جب سلطنت کی طرف سے زیادہ محاصل نہ عاید ہوتے تھے تو انہیں یہ بھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ نادر آیا یا ابدالی گیا۔ انہوں نے سنسکرت کو چھوڑ دیا تھا۔ عربی سے دلچسپی نہ تھی۔ اگر کبھی فوجی بازار میں گزر ہو جاتا تھا تو فارسی ملی ہوئی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اور اسی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے —

بہر حال فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم اسلامی ممالک کا پیدل سفر اور خصوصاً ایران و عرب کی سیاحت نے مسلمانوں کی اُن مذہبی کیفیات کو جو عوام میں رائج تھیں' گرونانک کے دل و دماغ کو کافی روشن کردیا تھا - ہندوستان میں اب تک جو چھوت چھات ' ذات پات کے بندھن ہندوؤں میں ہیں ' اُن کی سختی کا کوئی سولھویں صدی میں اندازہ کرے تو آسانی سے سمجھہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی عام اخوت و مساوات کا ایک پاکیزہ دل پر کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا - بقول مکالف (Macauliffe) کے " یہ گمان غالب ہے کہ آزاد خیالی اور دوسروں کے خیالات کی رواداری کی عادت کو اس طرح مدد پہنچی ہوگی کہ نانک نے مسلمانوں کی ان تحریروں کو دیکھا ہوگا جن سے فارسی زبان بھری پڑی ہے "

گرو نانک کی تعلیم

آدی گرنتھہ * یعنی کتاب قدیم جو پہلے گرو' گرونانک سے منسوب ہے - (یہ سکھہ گروؤں کی پہلی کتاب ہے - اس میں تاریخی حالات بیان نہیں کیے گئے - اور براہ راست سولھویں اور سترھویں صدی کے

---

* مندرجہ بالا تلخیص کننگھم کی تاریخ سکھاں سے ماخوذ ہے - اس میں بعض بعض مقامات پر کننگھم نے جو غلطیاں کی ہیں وہ قوسین کے اندر صیحح کردی گئی ہیں - یہ کتاب بمقام سیہور (بھوپال) سنہ ۱۸۴۸ ع میں لکھی گئی تھی - اور شائع ہونے کے بعد لرڈ ڈلہوزی نے اس کی اشاعت کو جرم قرار دیا تھا - وجہ یہ تھی کہ اس میں سکھوں کی پہلی لڑائی کے سچے اور ناگوار واقعات درج کردیے گئے تھے - کننگھم ذمہ دار سیاسی ملازم کمپنی تھا - اُس کی راے میں یہ لڑائی نامناسب تھی - بہر حال لاٹ صاحب نے اُسے بھوپال کی ملازمت سے بر طرف کردیا اور بیچارہ کننگھم دل شکستہ ہوکر مرگیا - یہ کتاب دوبارہ سنہ ۱۹۰۳ میں شائع ہوئی - اور اکثر واقعات نہایت پرلطف طریقے پر اس میں درج کیے گئے ہیں - (مؤلف) -

حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی - لیکن اُس زمانے کی سوسائٹی کے حالات کے متعلق اس میں بہت سی باتیں مل جاتی ہیں - اس سے اس وقت کے مذاہب کی کیفیت بھی معلوم ہوتی ہے - اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی حقیقی اور روحانی پرستش کرنی چاہیے۔ اور ظاہری رسوم کا عبادت سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ نجات بغیر بھگتی ، ایمان اور نیک اعمال کے حاصل نہیں ہوسکتی —

آدی گرنتھہ میں وہ تعلیم ہے جو پہلے گرو نانک سے منسوب ہے - اور نویں گرو تیغ بہادر تک کی تعلیم بھی اس میں شامل ہے - لیکن اس میں چھٹے ساتویں اور آٹھویں گرو کی تعلیم نہیں ہے - اس میں گرو گوبند نے بھی کچھہ اضافہ کیا ہے —

اس کے علاوہ اس میں کچھہ بھگتوں کی بھی تصلیفیں شامل ہیں - یہ بھگت عموماً ہندو تھے - ان کی تعداد سولہ ہے - اس کے بعد کچھہ بھاٹوں کی کبتائیں ہیں - جو یا تو نانک کے سکھہ تھے یا دوسرے گروؤں کے سکھہ تھے - (سکھہ بمعنی مرید اور گرو بمعنی مرشد استعمال ہوتا ہے - اور یہ اصطلاح مشائخ اسلام سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے) - بھگتوں کی تعداد اور بسا اوقات اُن کے نام تک مختلف گرنتھوں کی نقلوں میں ایک نہیں ہیں - لہذا موجودہ مؤلفین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس تحریر کو چاہا رکھا ، جسے چاہا خارج کردیا - سولہ بھگتوں میں دو ڈوم بھی شامل ہیں - یہ گرو ارجن کے سامنے گایا کرتے تھے - اور ان میں گرو ارجن کی صفات کا اثر ہوگیا تھا - اس کے بعد ایک ربابی کے گانے ہیں ، یہ بھی صوفی ہوگیا تھا —

گرنتھہ صاحب میں کبھی کبھی ایک ضمیمہ ہوتا ہے جس میں ایسی

صنفیں ہوتی ہیں جن کی صحت مشکوک ہوتی ہے یا دوسرے اسباب کی وجہ سے اُن کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا —

گرنتھہ صاحب کو پہلے ارجن نے جمع کیا - یہ پانچویں گرو ہیں - لیکن بعد میں جو گرو ہوئے انہوں نے بھی کچھہ اضافے کیے ہیں —

پوری گرنتھہ صاحب نظم میں لکھو ہوئی ہے - اس میں مختلف قسم کی بحریں ہیں - زبان عموماً پوری شمالی ہند کی ہندی ہے - پنجاب کی بولی نہیں ہے - اخیر کے بعض حصے سنسکرت میں ہیں ' طرز تحریر پنجابی ہے جو ہندوستان کی بہت سی تحریروں میں سے ایک ہے - چونکہ اسے سکھہ گروؤں نے استعمال کیا اس لیے اسے گرو مکھی بھی کہتے ہیں - موجودہ سکھوں کا خیال ہے کہ گرو نانک کی زبان وہی ہے جو لاہور کے جنوب مغربی خطے کی ہے - ارجن کی بولی نہایت خالص سمجھی جاتی ہے —

عموماً گرنتھہ صاحب ۱۲۳۲ صفحوں کی ایک چھوٹی تقطیع کی کتاب ہوتی ہے - ہر صفحے میں ۲۴ سطریں اور ہر سطر میں ۳۵ حروف ہوتے ہیں - زائد کتابوں کی وجہ سے صفحات ۱۲۴۰ تک ہوجاتے ہیں —

آدی گرنتھہ کے مضامین

۱ - " جپ جی یا صرف جپ " جسے گرو منتر بھی کہتے ہیں - یہ خاص دعا سات صفحوں میں ہے - اس میں ۴۰ اشلوک ہیں جنھیں پوری کہتے ہیں - بعض میں دو اور بعض میں کئی مصرعے ہیں - جپ کے معنی یاد کرنے کے ہیں (تصوف کی اصطلاح میں اسے ذکر کہتے ہیں) یہ گرو نانک کی تصنیف ہے جس کا ہر صبح کو پڑھنا فرض ہے - یہ سوال جواب کی صورت میں ہے - سکھوں کا خیال ہے کہ سوال کرنے والے انگد تھے —

۲ - " سودر رہ راس " : - سکھوں کی شام کی دعا - یہ گرو نانک
ی تصنیف کردہ شام کی دعا ساڑھے تین صفحوں میں ہے - اس میں رام داس
رجن اور بقول بعض) گرو گووند نے اضافے کئے ہیں - گرو گووند نے جو اضافے
کئے ہیں وہ ایسی کتاب میں ضرور شامل کردیے جاتے ہیں جس میں یہ
یہ دعا علحدہ لکھی جاتی ہے - سودر ایک خاص قسم کی نظم کو کہتے ہیں
یہ نصیحت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے - اور راس کرشن جی کے
ھیل یا کتھا کو کہتے ہیں - اسے کبھی کبھی رہ راس بھی کہتے ہیں -
وہ (راہ) پنجابی میں راستے کو کہتے ہیں —

۳ - " کیرت سوہیلا " : - یہ دعا سونے سے پہلے پڑھی جاتی ہے (گویا
ہ مسلمانوں کی عشا کی نماز کی قائم مقام ہے) یہ ایک صفحہ اور
یک یا دو مصرعوں پر مشتمل ہے - یہ گرو نانک کی تصنیف ہے - لیکن
س میں رام داس اور ارجن کے اضافے ہیں اور ایک مصرعہ گرو گووند
ا بھی ہے - کیرت سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی تعریف یا ثنا کے ہیں اور
سوہیلا شادی کے گانے کو کہتے ہیں (اردو میں سوہیل بمعنی خوشی کے
یت کے ہیں) —

۴ - گرنتھہ کا دوسرا حصہ ۳۱ حصوں میں تقسیم ہے جو اپنی مخصوص
سم کی نظم کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل طریقے پر تقسیم ہے (ہر حصے کے
شروع میں راگ یا راگنی کا نام ہے جو

(۱) سری راگ (۲) مجھہ (۳) گوری (۴) آسا (۵) گوجری
(۶) دیو گندھاری (۷) بہاگ (۸) ودھنس (۹) سورتھہ
(۱۰) دھنا سری (۱۱) جیت سری (۱۲) توڈی (۱۳) بیراری (۱۴) تیلنگ
(۱۵) سودھی (۱۶) بلاول (۱۷) گوڑ (۱۸) رام کلی (۱۹) نت نرائن

۲۰) سالی گورا (۲۱) مارو (۲۲) تکھاری (۲۳) کدارا (۲۴) بھیروں
۲۵) بسنت (۲۶) سارنگ (۲۷) ملہار (۲۸) کانرا (۲۹) کلیان
۳۰) پربھاتی (۳۱) جے جے ونتی —

یہ سب ۱۱۵۴ صفحوں میں ہے - یعنی مکمل گرنتھہ کا بہت بڑا صہ یہی ہے - اس کے ہر ایک حصے کو ایک یا کئی گروؤں یا بھگتوں تصنیف کیا ہے - مندرجۂ ذیل گروؤں کی نظمیں اس میں شامل ہیں —

(۱) نانک (۲) انگد (۳) امیر داس (۴) رام داس (۵) ارجن ۶) تیغ بہادر اور شاید کچھہ حصہ گووند کا بھی ہے —

(گرنتھہ صاحب کے جو بھگت (یا صوفی) اور دوسرے مصنف ہیں ان ، نام یہ ہیں) :-

(۱) کبیر (مشہور مصلح) - (۲) تریلوچن برھمن - (۳) بھنی - ۴) راؤ داس چمار - (۵) نام دیو چھیپا (۶) دھنّا جاٹ (۷) شیخ فرید یک مسلمان پیر (جو بابا فرید گنج شکر کی نسل سے تھے) - (۸) جے ،یو برھمن (۹) بھیکن - (۱۰) سین نائی (۱۱) پیپا جوگی - (۱۲) سدھنا صاب - (۱۳) رامانند بیراگی (ایک مشہور مصلح) - ۱۴ پرمانند - ۱۵) سورداس نابینا - (۱۶) میرن بائی بھگتنی - (۱۷) بلوند - ۱۸) ستّا ڈوم (۱۹) سندر داس رہابی (یہ بھگتوں میں شمار نہیں یا جاتا) —

۵ - بھوگ :- سنسکرت میں اس لفظ کے معنی ہیں کسی چیز کا ستعمال کرنا - لیکن عام طور سے ہندو اور سکھہ اسے کسی مقدس تحریر کے خاتمے کے ے استعمال کرتے ہیں - اس کے ۹۱ صفحے ہیں- اور نانک ، ارجن ، کبیر شیخ فرید ر دوسرے مصنفوں کے علاوہ اس میں نو بھاٹوں کی تصنیفیں بھی ہیں-

بھاٹ أمیر داس ' رام داس اور ارجن کے ساتھہ رہا کرتے تھے —

بھوگ سنسکرت کے پانچ اشلوکوں سے شروع ہوتا ہے جو نانک صاحب
تصنیف ہیں - اس کے بعد ۶۷ سنسکرت کے اشلوک ہیں جو ارجن
ایک ہی بحر میں لکھے ہیں ۔ اور پھر ۲۴ اشلوک ارجن ہی کی
ہف سے دوسری بحر میں ہیں - اس میں ۲۳ اشلوک پنجابی اورھندی میں
ن کے ہیں جس میں امرتسر کی تعریف ہے - اس کے بعد ہی کبیر
۲۴۳ اشلوک اور شیخ فرید اور دوسروں کے ۱۳۰ اشلوک ہیں جن
ں ارجن کے کچھہ اقوال ہیں - اس کے بعد کل بھاٹ اور دوسرے
ٹوں کے گانے ارجن کی نظموں کے ساتھہ ملے ہوئے اخیر تک ہیں —

جن نو بھاٹوں نے بھوگ کی تالیف میں حصہ لیا وہ یہ ہیں : —

(۱) مھکا - أمیر داس کا ملازم ۲ - کل رام داس کا ملازم - ۳ - کل
ر ۴ - جالپ ' ارجن کا ملازم ۵ - سل ' ارجن کا ملازم ۶ - نل ۷ - متھرا
- بل ۹ - کیرت —

یہ نام بظاہر خیالی و فرضی ہیں - ' گرو بلاس ' نامی کتاب میں صرف
ہ بھاٹوں کے نام ہیں - اور ' نل ' کے علاوہ جتنے نام ہیں وہ سب گرنتھہ
مختلف ہیں —

گرنتھہ کا تتمہ یا ضمیمہ

۶ - " بھوگ کا بانی یا خاتمہ کا تتمہ " : - اس کے تقریباً ۷ صفحے
ں - پہلے کچھہ تمہیدی اشلوک ہیں جنھیں " اشلوک مہل پہلا " کہتے
ں - یعنی پہلی عورت کا گانا - دوسرے نمبر پر " ملہار راجہ کو نانک
نصیحت " ہے - تیسرا نمبر نانک کی " رتن مالا " کا ہے جسے حرام هار

کہہ سکتے ھیں ' جس میں اصلی درویشوں کے صفات بتائی گئی ھیں - چوتھے نمبر پر " حقیقت " ھے جس میں لنکا کے راجہ شیو ناب کے واقعات ھیں جو ایک کتاب موسومۂ " پران سنگھلی " سے متعلق ھیں - اسے بھائی بھنّو نے گووند کے زمانے میں تصنیف کیا تھا —

رتن مالا کے متعلق کہا جاتا ھے کہ اصل میں یہ ترکی (یا مسلمانوں کی زبان) میں لکھی گئی تھی یا کسی ترکی تصنیف سے ماخوذ ھے —

دسویں بادشاہ کا گرنتھہ

یا

دسویں گرو یعنی گرو گووند سنگھہ کی کتاب

نوٹ - آدی گرنتھہ کی طرح یہ کتاب بھی نظم میں ھے - لیکن بحریں اکثر بدلتی گئی ھیں —

یہ ھندی بولی میں ھے - رسم خط پنجابی ھے - اگرچہ آخری حصہ فارسی ھے لیکن رسم خط گور مکھی ھی ھے - گرو گووند کی ھندی تقریباً ویسی ھی ھے جیسی وادیء گنگا میں بولی جاتی ھے - اور اُس میں پنجابی بولی کی بہت کم خصوصیات ھیں —

اس کتاب کی ایک فصل بھانیہ یا تاریخی سمجھی جا سکتی ھے - یعنی " وچتر ناٹک " جسے خود گووند نے لکھا ھے - لیکن فارسی حکایات یا کہانیاں بھی تقریباً اسی قسم کی ھیں - اور جو استعارے اس میں درج ھیں اُن سے معلوم ھوتا ھے کہ خاص حالات کے ماتحت وہ لکھی گئی تھیں اس کتاب کے دوسرے حصے پہلی فصل کے مقابلے میں زیادہ اساطیری ھیں اس کا طرز دنیاوی سا ھے - اگرچہ اس میں توحید باری تعالے اور اُس کی عظمت و رحمت کا بھی اکثر مقامات پر شاندار تذکرہ ھے —

پانچ فصلوں اور چھٹی فصل کی ابتدا گووند سے منسوب ہیں - باقی حصہ (جو بہت زیادہ ہے) چار منشیوں نے لکھا ہے جو گرو کے ملازم تھے ' جو شاید کسی حد تک گرو کے کہنے کے مطابق لکھا گیا ہے - دو فصلوں کے مصنفوں کا نام شام اور رام درج ہے - لیکن حقیقت میں اس کے مصنفوں کے متعلق بہت کم معلومات ہے - (ممکن ہے کہ شام سے مراد سری کرشن جی اور رام سے مراد رامچندرجی ہوں - اور ان کی تعلیم عمل و محبت کو اس طرح شام اور رام کے عنوانوں سے ظاہر کیا گیا ہے) —

دسویں بادشاہ کا گرنتھہ چھوٹی تقطیع کی ۱۰۶۶ صفحوں کی کتاب ہے - ہر صفحے میں ۲۳ مصرعے - اور ہر مصرعے میں ۳۸ سے ۴۱ تک حروف ہیں —

" دسویں بادشاہ کے گرنتھہ " کے مضامین

(۱) - " جاپ جی " یا مختصراً جاپ جو گرو نانک کی جپ جی کا پہلا یا آخری ضمیمہ ہے (یعنی سابقہ یا لاحقہ ہے) - یہ صبح کی دعا ہے (اور تقریباً مسلمانوں کی نماز صبح کے مقابلہ میں ہے) اس میں ۱۹۸ شعر ہیں اور سات صفحوں میں لکھی ہوئی ہے - یہ دعا گورو گووند جی کی تصنیف ہے —

(۲) - " اکال ستت " حمد باری تعالی - یہ ایک بھجن ہے جو عموماً صبح کو پڑھا جاتا ہے - ۲۳ صفحے ہیں اور صرف نظم کی ابتدا گرو گووند کی تصنیف ہے —

(۳) - " وچتر ناتک " یعنی حیرت انگیز قصہ - یہ گووند کی تصنیف ہے - اس میں اُنہوں نے پہلے اپنے خاندان کی فرضی تاریخ لکھی ہے - پھر اپنے اصلاحی کام کا تذکرہ ہے - اس کے بعد ہمالیہ کے سرداروں اور شہنشاہی افواج کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی ہیں اُن کا تذکرہ ہے - اس کے چودہ

حصے میں - پہلے حصے یا باب میں حمد ہے - آخری بھی اسی قسم کا ہے - اور اس میں ایک اضافہ ہے جس میں بتایا ہے کہ میں اپنے گزشتہ خوابوں کا حال اور موجودہ تجربات کو آئندہ لکھوں گا - وچتر ناٹک گرنتھہ کے ۲۴ صفحوں پر مشتمل ہے —

(۴) "چنڈی چرتر" اس میں چنڈی دیوی کی کرامتیں درج ہیں کہ کس طرح اُس نے آٹھہ دیوؤں (شیطانوں) کو فنا کیا - کہتے ہیں یہ کسی سنسکرت قصے کا ترجمہ ہے جو خود گرو گووند نے کیا ہے - یہ قصہ بیس صفحوں میں ہے —

جن شیطانوں یا دیوؤں کو چنڈی دیوی نے تباہ کیا ان کے نام یہ ہیں - (۱) مدھو کیٹب - (۲) میدھ کھسور - (۳) دھومر لوچن - (۴) چنڈ - (۵) منڈ (۶) رکت بیج - (۷) نشمبھہ (۸) شمبھہ —

(۵) "چنڈی چرتر (خرد)" اس میں وہی قصے ہیں جو چنڈی چرتر (بزرگ) میں ہیں - البتہ نظم کی بحر دوسری ہے - ۱۴ صفحے ہیں —

(۶) "چنڈی کی وار": یہ چنڈی کی کہانیوں کا ضمیمہ ہے - ۶ صفحے ہیں -

(۷) "گیان پر بودہ" معرفت و عقل کی خوبیاں - اس میں خدا کی حمدیں ہیں - اور مہابھارت کے راجاؤں کی طرف بھی کچھہ کچھہ اشارہ ہے - ۲۱ صفحے ہیں —

(۸) "چوپائیاں چوبیس اوتاران کیاں" - یعنی چوبیس اوتاروں کے متعلق رباعیاں - یہ رباعیاں ۳۴۸ صفحوں میں ہیں - اور شام کی تصنیف سمجھی جاتی ہیں اوتاروں کے نام درج ذیل ہیں - (یہ اوتار سوائے نمبر ۲۲ کے سب ہندو اوتار ہیں) —

(۱) مچھہ (مچھلی) - (۲) کچھہ (کچھوا) - (۳) نر (شوہر) - (۴) نرائن -

(۵) موهنی - (۶) ورة (سؤر) - (۷) نرسنگه - (۸) (بون (بونا) -
(۹) پرسرام - (۱۰) برهمه - (۱۱) رُدر (رعد) - (۱۲) جالندهر - (۱۳) وشنو
(۱۴) (نام نهیں هے) (۱۵) ارهت دیو (جهنیوں کا بانی مذهب) -
(۱۶) من راجا - (۱۷) - دهننتر (ڈاکٹر یا وید) - (۱۸) سورج -
(۱۹) چندر مان - (۲۰) رام - (۲۱) کرشن - (۲۲) نر (یعنی ارجن) -
(۲۳) بودھ ۲۴ - کلکی جو کلجگ کے اخیر میں ظاهر هوگا جب که
انسانوں کے گناہ حد سے زیادہ بڑہ جائیں گے —

(۹) — " مہدی مہر " (کوئی نام درج نہیں هے لیکن ' مہدی
مہر " کے نام سے مشہور هے) - یہ ۲۴ اوتاروں کا ضمیمہ هے کہتے هیں که
جب کلکی اوتار کا کام ختم هو جاے گا تو مهدی ظاهر هوں گے - یہ نام اور
خیال مسلمانوں سے لیا گیا هے - یہ ایک صفحہ سے بھی کم هے —

(۱۰) - " برهمه کے اوتار " (حالانکه عنوان پر کوئی نام درج نہیں
هے) - اوتاروں کے نام درج ذیل هیں —
(۱) والمیک - (۲) کشپ - (۳) شکر - (۴) بشیس - (۵) ویاس -
(۶) ششت ریشی یا چھہ بزرگ - (۷) کل داس —

راجاؤں کے نام درج ذیل هیں :—
(۱) من - (۲) پرتھہ - (۳) سگر - (۴) بن - (۵) سندهاتا - (۶)
دلیپ - (۷) رگھہ - (۸) آج —

(۱۱) " رُدر یا شیو کے اوتار " - (حالانکه یہ نام درج عنوان
نہیں هے) یہ ۵۹ صفحوں میں هے - اور صرف دو اوتاروں کے نام درج
هیں یعنی " دت " اور " پرسناتھہ " —

(۱۲) — " شستر نام مالا " (هتھیاروں کے ناموں کی زنجیر) گرو

حصے ہیں - پہلے حصے یا باب میں حمد ہے - آخری بھی اسی قسم کا ہے - اور اس میں ایک اضافہ ہے جس میں بتایا ہے کہ میں اپنے گزشتہ خوابوں کا حال اور موجودہ تجربات کو آئندہ لکھوں گا - وچتر ناٹک گرنتھہ کے ۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے —

(۴) "چنڈی چرتر" اس میں چنڈی دیوی کی کرامتیں درج ہیں کہ کس طرح اُس نے آٹھہ دَیتوں (شیطانوں) کو فنا کیا - کہتے ہیں یہ کسی سنسکرت قصے کا ترجمہ ہے جو خود گرو گووند نے کیا ہے - یہ قصہ بیس صفحوں میں ہے —

جن شیطانوں یا دیوؤں کو چنڈی دیوی نے تباہ کیا ان کے نام یہ ہیں - (۱) مدھو کیٹب - (۲) میہ کھسور - (۳) دھومر لوچن - (۴) چنڈ - (۵) منڈ (۶) رکت بیج - (۷) نشمبھہ (۸) شمبھہ —

(۵) "چنڈی چرتر (خرد)" اس میں وہی قصے ہیں جو چنڈی چرتر (بزرگ) میں ہیں - البتہ نظم کی بحر دوسری ہے - ۱۴ صفحے ہیں —

(۶) "چنڈی کی وار" : یہ چنڈی کی کہانیوں کا ضمیمہ ہے - ۶ صفحے ہیں -

(۷) "گیان پر بودھ" معرفت و عقل کی خوبیاں - اس میں خدا کی حمدیں ہیں - اور مہابھارت کے راجاؤں کی طرف بھی کچھہ کچھہ اشارہ ہے - ۲۱ صفحے ہیں —

(۸) "چوپائیاں چوبیس اوتاران کیاں" - یعنی چوبیس اوتاروں کے متعلق رباعیاں - یہ رباعیاں ۳۴۸ صفحوں میں ہیں - اور شام کی تصنیف سمجھی جاتی ہیں اوتاروں کے نام درج ذیل ہیں - (یہ اوتار سوائے نمبر ۲۲ کے سب ہندو اوتار ہیں) —

(۱) مچھہ (مچھلی) - (۲) کچھہ (کچھوا) - (۳) نر (شوہر) - (۴) نرائن -

(۵) موھنی - (۶) ورہ (سؤر) - (۷) نرسنگھ - (۸) (بون (بونا) - (۹) پرسرام - (۱۰) برھمہ - (۱۱) رُدر (رعد) - (۱۲) جالندھر - (۱۳) وشنو (۱۴) (نام نہیں ھے) (۱۵) ارھنت دیو (جینیوں کا بانی مذھب) - (۱۶) من راجا - (۱۷) - دھننتر (ڈاکٹر یا وید) - (۱۸) سورج - (۱۹) چندر مان - (۲۰) رام - (۲۱) کرشن - (۲۲) نر (یعنی ارجن) - (۲۳) بودھ ۲۳ - کلکی جو کلجگ کے اخیر میں ظاھر ھوگا جب کہ انسانوں کے گناہ حد سے زیادہ بڑہ جائیں گے —

(۹) - " مہدی مہر " (کوئی نام درج نہیں ھے لیکن ' مہدی مہر " کے نام سے مشہور ھے) - یہ ۲۴ اوتاروں کا ضمیمہ ھے کہتے ھیں کہ جب کلکی اوتار کا کام ختم ھو جائے گا تو مہدی ظاھر ھوں گے - یہ نام اور خیال مسلمانوں سے لیا گیا ھے - یہ ایک صفحہ سے بھی کم ھے —

(۱۰) - " برھمہ کے اوتار " (حالانکہ عنوان پر کوئی نام درج نہیں ھے) - اوتاروں کے نام درج ذیل ھیں —

(۱) والمیک - (۲) کشپ - (۳) شکر - (۴) بشیس - (۵) ویاس - (۶) ششت ریشی یا چھہ بزرگ - (۷) کل داس —

راجاؤں کے نام درج ذیل ھیں : —

(۱) من - (۲) پرتھہ - (۳) سگر - (۴) بن - (۵) مندھاتا - (۶) دلیپ - (۷) رگھہ - (۸) آج —

(۱۱) " ردر یا شیو کے اوتار " - (حالانکہ یہ نام درج عنوان نہیں ھے) یہ ۵۹ صفحوں میں ھے - اور صرف دو اوتاروں کے نام درج ھیں یعنی " دت " اور " پرسناتھہ " —

(۱۲) - " شسکر نام مالا " (ھتھیاروں کے ناموں کی زنجیر) گرو

گووند ھتھیاروں کو گرو مانتے ھیں اور اُن کی مدح کرتے ھیں - حالانکہ یہ تصنیف گرو گووند سے منسوب نہیں ھے - ۶۱ صفحے ھیں —

(۱۳) - "سری مکھہ واک سو تیا بکھیس" (۳۲ مصرعوں میں گرو گووند کی آواز) یہ نظم گرو گووند کی تصنیف ھے اس میں وید ' پُرا اور قرآن کی برائی کی گئی ھے - ۳ ۱/۲ صفحوں میں ھے —

(۱۴) هزارہ شبد (هزار الفاظ) ۱۰ مصرعے ھیں - دو صفحوں میں خدا کی تعریف اور شرک اور بت پرستی کی برائی میں ھے —

(۱۵) استری چرتر (عورتوں کے قصے) ۴۰۴ کہانیاں ھیں جس میں عورتوں کے چال چلن اور عادات کا تذکرہ ھے - ایک سوتیلی ماں ا سوتیلے بیٹے پر عاشق ھو جاتی ھے - جب وہ لڑکا اس کی خواھشات کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ راجا سے کہتی ھے کہ تمہارے ولی عہد نے مجھ پر ھاتھہ ڈالا ھے - راجا اس کے لیے موت کا فتویٰ صادر کرتا ھے - لیکن وزرا نے درمیان میں پڑ کر کچھہ دنوں کی مہلت لی - پھر انھوں نے کہانیو کا ایک سلسلہ شروع کردیا جس میں راجا کو یہ معلوم ھو گیا کہ میرا لڑ بے قصور اور میں جلد باز ھوں - یہ کہانیاں ۴۴۶ صفحوں (بعد نصف گرنتھہ) میں ھیں - ان کہانیوں کے لکھنے والوں میں شام ک نام بھی ھے —

(۱۶) حکایات - بارہ کہانیاں ھیں جو ۸۶۶ اشعار پر مشتمل ھیں یہ فارسی زبان اور گورمکھی رسم خط میں ھیں - یہ گووند کی تصنیف ھیں اور اورنگ زیب کو نصیحت کے طور پر ھیں - یہ حکایات شہنشاہ کے پاس دیا سنگھہ اور چار سکھہ لے گئے تھے - اس کے ساتھہ ایک خط بھی تھا جو گرنتھہ میں شامل نہیں ھے - یہ حکایات ۳۰ صفحوں میں ھیں اور گرو گوند سنگھ

کا گرنتھہ ان پر ختم ہو جاتا ہے —

دسویں پادشاہ کا گرنتھہ اردو زبان کے نقطۂ نظر سے اس لیے زیادہ دلچسپ ہے کہ عوام میں فارسی کی حکایتوں اور فارسی الفاظ نے زبان اور خیالات میں ایک قسم کی تبدیلی پیدا کردی ہے - یہ اس قلبی احساس کو بھی ظاہر کرتا ہے جو عموماً کل ہندوستانیوں اور خصوصاً سکھوں کو مسلمانوں کے مذہب ' تصوف ' زبان اور طرز حکومت سے تھا - اس کا ثبوت یہی کافی ہے کہ انہی درویشوں کے مقولے ان ہی کی زبان سے ادا کردیے جائیں اور اُن کا ترجمہ بھی دے دیا جائے - آئندہ صحبت میں اس دلچسپ موضوع سے بحث ہوگی —

روسی ڈراما

از

جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے (آکسن)

(اوس تروف سکی سے انقلاب تک)

اوس تروف سکی کے ہم عصر انشاپردازوں میں سے کئی نے ڈراما نویسی کے میدان میں طبع آزمائی کی، لیکن اس فن کی قدرتی استعداد کسی میں نہیں تھی اور کسی نے مشق اور محنت بھی جیسی کہ چاہیے نہیں کی۔ تور گینف نے ۱۸۴۸ اور ۱۸۵۱ کے درمیان کئی فرحیہ ڈرامے لکھے جو زبان کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں، مگر فن ڈراما نویسی کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ الکساندر تالستائی کے تین تاریخی ڈرامے، " آورن ہیبت ناک کی موت " " بوریس گودو نوف " اور " زار فیوڈر اوانووچ " اس صنف کے خاصے نمونے ہیں اور روسی دربار کے جو مناظر ان میں دکھائے گئے ہیں وہ استیج پر بہت شاندار اور موثر بنائے جاسکتے ہیں۔ الکساندر تالستائی زار الکساندر دوم کا قریبی دوست تھا، درباری زندگی سے خوب واقف تھا، اور وہ دشواریاں جو روس جیسے ملک کے بادشاہ کو گھیرے رہتی تھیں، وہ قوتیں جو اسے راہ راست پر آنے

سے روکتی تھیں سب تالستائی کی نظر میں تھیں ۔ اس وجہ سے وہ تاریخی ڈرامے لکھنے کے لیے بہت موزوں تھا ' اور اپنی واقفیت اور تجربے سے اس نے فائدہ بھی اُٹھایا - مگر اور تاریخی ڈراموں کی طرح تالستائی کی تصانیف میں بھی رومانیت اور مصنف کے اپنے خیالات اور تخیل نے ذرا زیادہ دخل دے دیا ہے اور معاشرتی حیثیت سے ان کی قدر کچھہ کم کردی ہے —

مقبولیت اور جدت خیال کو دیکھا جائے تو اوس تروف سکی کے ڈراموں کے بعد ناول نویس پی سم سکی کے ڈراما " بدبختی " کا درجہ آتا ہے - ڈراما کا موضوع ۱۸۶۱ کی اصلاح سے پہلے کے زمینداروں اور کسانوں کے تعلقات ہیں - قدرت نے نہ زمیندار کو اخلاقی حس سے محروم رکھا ہے نہ کسان کو ' دونوں میں معقول زندگی بسر کرنے کی صلاحیت موجود ہے ' لیکن " بدبختی " میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک وحشیانہ قانون سب کی سیرتوں کو اس طرح بگاڑ دیتا ہے کہ وہ نیم مجرم ہوکر رہ جاتے ہیں اور انتہائی بداخلاقی کی حرکتیں کرتے ہیں - ڈراما کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک کسان نے ' جو قانون کے روسے غلام تھا ' اتنی آزادی حاصل کرلی ہے کہ گانو چھوڑ کر دارالسلطنت میں اپنی قسمت آزمانے کو جاسکے ۔ وہ کئی سال وہاں رہ کر واپس آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی کا زمیندار آقا سے ناجائز تعلق ہوگیا ہے ' اور آقا سے اس کے ایک بچہ بھی ہوا ہے - کسان غصے میں آکر بچے کو مار ڈالتا ہے اور پھر اسے اپنے جرم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے - جو لوگ غلامی کے قانون سے نفرت کرتے تھے انہیں یہ ڈراما بہت پسند آیا ' ہم بھی کسی ایسے قانون کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھیں گے ' لیکن " بدبختی " کے بارے میں یہی خیال ہوگا کہ اس

میں نفاست اور شائستگی نہیں' اور اس کی دلچسپی کا دارومدار ایسی واردات پر ہے جو حد درجہ ناگوار ہوتی ہیں اور یہ ذرا مشکل سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ عام حقیقت کا آئینہ ہیں —

" بد بختی " کے علاوہ اور بہت سے ڈرامے اسی زمانے میں لکھے گئے جن کا محرک خالص ادبی شوق تھا یا اصلاح کی خواہش - کوبی لن' پالم (۱۸۲۲ - ۱۸۸۵) اور پوتھیے خن (۱۸۲۹ - ۱۹۰۲) ان ڈراما نویسوں میں سب سے ممتا مانے جاتے ہیں - کوبی لن کا انداز طنزیہ ہے' اور اس کے ڈرامے جن میں " کرش چن سکی کا نکاح " سب سے زیادہ کامیاب ہوا ' سرکاری ملازموں کی رشوت ستانی اور دوسرے عیبوں کو ظاہر کرتے ہیں - پالم کا مقصد روسی زمینداروں کی سیرت اور فلسفہ حیات واضح کرنا تھا' اور اس طبقے کے جو نمونے اس نے پیش کیے وہ تور گینف کی مشہور سیرتوں سے کچھہ کم حقیقت نما نہیں - پوتھیے خن کا موضوع وہی ہے جو کوبی لن کا' فرق بس یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں جن سرکاری ملازموں کی قلعی کھولی گئی ہے وہ ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کے بعد کے ہیں - وہ رشوت نہیں لیتے مگر کسی کا کام بھی نہیں کرتے ' اور " ایمانداری " نے ان کی خود پسندی اور خود غرضی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ ملک کے لیے اپنے پیش رووں سے بھی بد تر ثابت ہوئے ہیں —

ان تمام ڈراما نویسوں اور ڈراموں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اوس تروف سکی کے مرنے پر جو عہدہ خالی ہوا اس کا کوئی حقدار ثابت نہ ہوا' اور جب ۱۸۹۸ میں ماسکو آرٹ تھیٹر نے چیخوف کا پہلا ڈراما دکھایا تبھی لوگوں نے محسوس کیا کہ روس کو اوس تروف سکی کا ایک جانشین نصیب ہوا ہے - یورپ کے اہل ذوق

میں اوس تروف سکی سے بہت پہلے چخوف کا چرچا ہوا' اور یورپ میں چخوف ہی خاص روسی طرز کا موجد اور استاد مانا جاتا ہے لیکن اگر اس کے ڈراموں کا اوس تروف سکی کے آخری کام سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہوجائے گا کہ چخوف نے کوئی نیا طرز ایجاد نہیں کیا بلکہ اوس تروف سکی کے طرز کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ اسی طرح ماسکو آرٹ تھیٹر کو بھی ایک بالکل ہی نیا مظہر نہ سمجھنا چاہیے۔ ایکٹنگ کا جو مسلک اس تھیٹر نے اختیار کیا اس میں پہلا قدم اوس تروف سکی نے رکھا تھا' اور اس تھیٹر کے وہ اوصاف جو یورپ میں نئے اور بہت نرالے سمجھے گئے ان ایکٹروں میں موجود تھے جنھوں نے اوس تروف سکی سے سبق لیا تھا اور جو گفتگو اور واقعات کے سہارے اس خاص فضا کو بھی پیدا کرسکتے تھے جس میں ڈراما کی سیرتیں ڈوبی ہوئی ہوتیں۔ چخوف کے ڈراموں کا پورا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اسٹیج پر دیکھے جائیں' اس لیے کہ وہ اسٹیج ہی پر جاکر مکمل ہوتے ہیں' اور انھیں ایکٹرہی تکمیل کو پہنچاسکتے ہیں۔ ایکٹروں کو فن کے وہ بھید بتانا کہ بھیس بدلنے کے ساتھ ان کی کایا بھی پلٹ جائے اوس تروف سکی کا کام تھا' اور اس کی رہبری کے بغیر روسی ایکٹروں میں وہ مہارت ہرگز پیدا نہ ہوسکتی تھی جو چخوف کے ڈراموں میں جان ڈالنے کے لیے درکار ہے —

چخوف کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت' جس پر یورپی نقادوں کی سب سے پہلے نظر پڑی' پلاٹ کی عدم موجودگی ہے۔ یہ خصوصیت ہم بیان کرچکے ہیں کہ اوس تروف سکی میں بھی پائی جاتی ہے' چخوف نے ذرا مبالغہ کر کے اپنے آپ کو قصہ سنانے کی پابندی سے بالکل آزاد کرلیا' جس زندگی کے مناظر وہ دکھانا چاہتا تھا اسے انتہائی وسعت

دے دی ' اور ان سیرتوں اور روحانی کیفیتوں کو جو اس کا موضوع تھیں اپنی اصلی اور مکمل صورت میں پیش کیا- اس کے زمانے تک وہ تمام مسائل جن پر اوس تروف سکی بحث کرنا ضروری سمجھتا تھا اپنی اہمیت کھو چکے تھے ' معاشرت میں جو تبدیلیاں ہو سکتی تھیں ' ہو چکی تھیں ' اب ایسی رکاوٹیں نہیں رہی تھیں جو حوصلے کو دبا کر ابھارتی ہیں بس سیاسی غلامی باقی تھی اور اس سے حوصلے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہتے تھے ' روس ایک جنگل تھا جسے باغ بنانے کی خاطر لوگ درختوں کو کاٹ کر برابر کرچکے تھے ' لیکن جب ایک صاف سپاٹ میدان نکل آیا تو اسے زر خیز اور شاداب بنانے کی مہم سے سب جی چرانے لگے ' اور روسی زندگی کو ویرانی کی ہوا لگ گئی - چیخوف کا زمانہ شدید مایوسی اور پست ہمتی کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا اور زندگی کی چہل پہل پر بھی سناٹا چھایا رہتا تھا - یہی وجہ ہے کہ ہمیں چیخوف کے ڈراموں میں انفرادی زندگی کے چھوٹے مقاصد بھی نہیں ملتے ' اور اس کشمکش کا تو نام و نشان بھی نہیں جسے پیش کرنے کے لیے ڈراما کا فن ایجاد کیا گیا —

چیخوف کا کمال اس میں ہے کہ اس نے ایسی سیرتوں اور ایسی زندگی کو جو مقاصد ہی نہیں بلکہ شکل سے محروم تھی ڈراما کی شکل دیدی - قصہ سنانا ' نصیحت کرنا ' اصلاح کو مد نظر رکھہ کر عام زندگی کے بصیرت افروز نمونے منتخب کرنا آسان ہے ' ایسے لوگوں کے حالات کو جو نہ کچھہ ہونا چاہیں اور نہ کچھہ کرنا چاہیں ' ایسی معاشرت کو جس میں کوئی تحریک باقی نہ رہی ہو ایک موثر ڈراما بنا دینا نہایت ہی نازک خیال ' نکتہ بیں اور اپنے فن میں کامل آرٹسٹ کا کام ہوسکتا ہے - بظاہر چیخوف کے سامنے ڈراما کے لیے کوئی سامان ہی نہ تھا ' لیکن اس نے اپنے ہم وطنوں

کی بود باش ، ان کی ناکامیوں اور حسرتوں کو لے کر ایک پوری دنیا آباد کردی ، ان کی سیرتوں کے اس پہلو کو جو سب سے زیادہ عمومیت رکھتا تھا خاص انداز سے نمایاں کر کے ان کی سرگزشت اور ان کی کیفیتوں کو ایک لطیف ہنگامہ بنا دیا - چیخوف کے ڈرامے اپنے زمانے کی حقیقت یعنی ایک نسل اور اس کی تہذیب کو فنا ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں ، مگر ناکامی اور زوال کی یہ کیفیت عام انسانی احساسات کا عکس ہے ، روسی تاریخ کا ایک دور ہی نہیں ، ہماری آپ بیتی کا ایک ٹکڑا ہے —

چیخوف کے ڈراموں میں پلاٹ نہیں ہوتا ، بلکہ غور کیا جائے تو فنا کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ چیخوف نے حقیقت کا خیال کرکے معاشرتی مقاصد اور ان سطحی اور گہرے تعلقات کو جو یہ مقاصد لوگوں کے درمیان پیدا کرتے ہیں نظر انداز کیا ، اور آدمی آدمی کے رشتے کو بالکل ہی توڑ دیا - اس کے ڈراموں میں ہر سیرت ایک بالکل جدا ہستی رکھتی ہے ، نگاہوں کے ملنے پر بھی دل دور رہتے ہیں ، اور محبت کی تیز آنچ بھی دو ہستیوں کو گلا کر ایک نہیں کرسکتی - وہ سمجھتا تھا کہ انسان اتنا تنگ نظر ، خود غرض اور سرد مہر ہوتا ہے کہ اس کے وہ اعلیٰ جذبات جن پر وہ ناز کرتا ہے ، یا وہ حوصلے جو زندگی میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اس کی سرشت کے ان عیبوں پر غالب نہیں آسکتے - چیخوف کے ڈراموں کی گفتگو اکثر بے سروپا ہوتی ہے ، ہر شخص اپنی بات کہے جاتا ہے ، دوسرے کی سمجھے کیا ، سنتا ہی نہیں ، ہر شخص اپنی ذات میں محو رہتا ہے ، اور اپنی آرزووں اور حسرتوں کے آگے کچھ دیکھتا ہی نہیں - یہ بیگانگی جانوروں کی سی بے تعلقی نہیں ہے ، ایک مجبوری معلوم ہوتی ہے ، ایک سزا جسے سب کو یکساں بھگتنا

پڑتا ہے اور جس کا سب کو صدمہ ہوتا ہے - سب ذات کی اس کال کوٹھری سے نکلنا چاہتے ہیں ، ایسی جماعت بنانا چاہتے ہیں کہ جس پر وہ اپنی انفرادیت نثار کرسکیں ' لیکن انھیں نہ اپنی ذات میں ثبات اور استحکام نظر آتا ہے اور نہ جماعت میں ' وہ نہ درخت کی طرح زمین کو مضبوط پکڑ سکتے ہیں نہ پانی کے قطروں کی طرح دریا بن کر بہہ سکتے ہیں ' بس ایک غبار ہیں کہ جس کا اٹھنا بیٹھنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں بلکہ بے مقصد حادثات کا سب سے حقیر اور بے معنی پہلو ہے —

چخوف کے نقطۂ نظر کی تمام خصوصیات اس کے پہلے ڈرامے "اوانوف" میں پائی جاتی ہیں - اوانوف ایک حوصلہ مند نوجوان ہے جو خاصے مفید کام میں مشغول ہے اور روسیوں اور یہودیوں کے درمیان تعصب کو مٹانے کے خیال سے اس نے ایک یہودن سے شادی کی ہے - سیرت کی ناموافقت سے دونوں میں ناچاقی پیدا ہوجاتی ہے ' جس کے صدمے سے اوانوف کی بیوی کو دق ہوجاتی ہے - بیوی کی بیماری اور آئے دن کی مالی دشواریاں اوانوف کی زندگی کو بالکل بے لطف کردیتی ہیں اور اس کا مزاج بہت بگڑ جاتا ہے - پہلے تین ایکٹ میں میاں بیوی کے تعلقات کا یہ رنگ ہی بس ڈراما کا موضوع ہے ' اور باقی جو سیرتیں ہیں وہ اپنے خیال میں محو اور ایک دوسرے سے بے خبر رہتی ہیں - بیوی کی بیماری کے زمانے میں اوانوف اور ایک لڑکی ساشا کے درمیان ہمدردی اور ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا اشتیاق خاص لگاؤ پیدا کردیتا ہے ' اور (چوتھے ایکٹ میں) جب اوانوف کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے تو ساشا اوانوف کو خوش رکھنے اور اس کے دل سے گزشتہ غموں کی یاد مٹانے کا بیڑا اٹھاتی ہے - لیکن بیوی کے مرنے پر اوانوف کی طبیعت میں

ایک اور انقلاب رونما ہوتا ہے ' پہلے وہ ہمدردی کی تلاش میں تھا تو اب اپنی سرشت کی خرابیوں کا ہر وقت ذکر کرتا رہتا ہے ' اور پچھلی غلطیوں اور ناکامیوں کا اس کی اپنی طبیعت سے جو تعلق تھا اسے بیان کرتا رہتا ہے - ساشا کا نوجوان دل جو ایثار پر آمادہ ہوگیا تھا اس قسم کی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کر پاتا ' وہ اپنے مستقبل سے بہت مایوس ہو جاتی ہے مگر اوانوف سے شادی کرنے کے ارادے پر قائم رہتی ہے - ڈراما کے آخری سین اس بے تعلقی کو جو تمام اشخاص کے درمیان تھی بالکل واضح کردیتے ہیں ' سب محسوس کرتے ہیں کہ کوشش کرنے پر بھی وہ ایک دوسرے کی طبیعت کو سمجھہ نہیں سکتے ' اور یہ احساس سب میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا کردیتا ہے - آخر میں اوانوف ' جو یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اپنی زندگی کو سدھارنے کی امید میں ساشا کا مستقبل خطرے میں ڈالا جائے ' خودکشی کرلیتا ہے ' اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات اور ایسی سیرتیں زندگی میں جو گتھیاں ڈال دیتی ہیں انہیں موت کے سوا کوئی سلجھا نہیں سکتا —

" اوانوف " میں بہت صفتوں کے ساتھہ وہ خامیاں بھی موجود ہیں جن کے تجربے اور مشق کی کمی کا پتہ چلتا ہے - مختلف اشخاص میں جس طرح کی بے تعلقی دکھائی گئی ہے اس پر مبالغے کا شبہ ہوتا ہے ' اوانوف کی سیرت اچھی طرح سمجھہ میں نہیں آتی ' اور نفسیات کے معمے پیش کرنے میں سبب اور نتیجے کا اصول کچھہ نظر انداز کیا گیا ہے - چیخوف کی ڈراما نویسی کے تمام اوصاف اس کے دوسرے ڈرامے " بگلے " میں پائے جاتے ہیں اور انسان کی طبیعت اور اس کی زندگی کی فضا کا ایک دوسرے سے جو تعلق ہے وہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے - " اوانوف " کے مقابلے میں

یہ ہم کو کہیں زیادہ افسردہ اور اداس کرتا ہے' اور اگر پہلے ڈرامے میں ایک اوانوف تھا جسے زندگی کی دشواریوں نے عاجز اور دیوانہ کردیا تھا تو " بگلے " میں کئی صورتیں ہیں جن کی یہی کیفیت ہے' اور جنہیں چند روز کے لیے بھی ساشا کی طرح کا کوئی قدردان اور غم میں شریک ہونے والا نہیں ملتا - لیکن بعد کے تینوں ڈراموں " وانیاماموں " " تین بہنوں " اور " باغ " کی طرح یہ بھی چخوف کے فن کا کامل نمونہ ہے' اس میں کوئی بات ادھوری' کوئی رنگ ہلکا یا پھیکا نہیں رہ گیا ہے —

" بگلے " میں کوئی مرکزی شخص یا صورت نہیں' ہر ایک کا اپنا الگ دکھ ہے' اور سب یکساں بےبسی میں تڑپتے رہتے ہیں - آرکاوینا ایک سن سے اُتری ہوئی ایکٹرس ہے جو دن رات بس اپنی شہرت اور کامیابیوں کے خیال میں ڈوبی رہتی ہے' یہاں تک کہ اسے اپنے بھتیجے کونستان تن سے بھی' جو ایک ہونہار' حوصلہ مند اور شاعرانہ مزاج کا نوجوان ہے کوئی مطلب نہیں - کونستان تن سے آرکاوینا کے داروغہ کی لڑکی ماشا کو ایسی محبت ہے کہ اس کا نام ہی پکارنے میں ماشا کو بڑا مزہ آتا ہے' مگر کونستان تن کو اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں' اور اس کو اسی سے الجھن ہوتی ہے کہ ماشا اس کا نام لیا کرتی ہے - خود کونستان تن کو پڑوس کے ایک زمیندار کی لڑکی نینا سے محبت ہے' مگر جب نینا کی آرکاوینا کے یہاں ایک مشہور انشاپرداز تری گورن سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ کونستان تن اور اس کی دوستی کو بالکل بھول جاتی ہے اور تری گورن پر عاشق ہوجاتی ہے - نینا کو شہرت حاصل کرنے کی ہوس ہے' وہ تھیٹر میں نام پیدا کرنا چاہتی ہے' اور شاید اسی امید میں

کہ تری گورن کی سرپرستی اسے جلد کامیاب کردے گی' وہ کونستان تن کو چھوڑ دیتی ہے- لیکن تری گورن کچھ دنوں اس کی محبت سے نا جائز فائدہ اٹھانے کے بعد اپنا برتاو بدل دیتا ہے اور دوسری عورتوں کے پیچھے لگ جاتا ہے' اور تھیٹر میں بھی نینا کو قابلیت کی داد دینے والے نہیں ملتے' حسن کے خریدار ہی ملتے ہیں - نینا کا باپ خفا ہو کر اسے گھر سے نکال دیتا ہے اور شریف عورتیں اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں' پھر بھی نینا اپنی شکست کو تسلیم نہیں کرتی' اور آخری ایکٹ میں کونستان تن کو اپنا سارا ماجرا سنا کر کہتی ہے کہ میں یہ اور ایسے اور صدمے برداشت کرتی رہوں گی - وہ جانتی ہے کہ کونستان تن کو اس سے سچی محبت ہے' یہ بھی جانتی ہے کہ دنیا میں بس وہی اس کی تمام لغزشوں کو معاف کر سکتا ہے اور اس کی قدر بھی کر سکتا ہے' مگر یہ سب جانتے ہوے بھی وہ تری گورن کو نہیں چھوڑتی' اور برا برتاؤ اس کی محبت کو گھٹاتا نہیں بلکہ اور بڑھا دیتا ہے - اس آخری گفتگو کے بعد کونستان تن اپنے افسانوں وغیرہ کے مسودے جلا دیتا ہے 'ور اپنے گولی مار لیتا ہے —

" بگلے " میں جذبات کا جو الجھاؤ ہے اسے سلجھانا خالی ارادے کے بس کی بات نہیں - ایک موقع پر ماشا ڈاکٹر دورن سے کہتی ہے —

" میری مدد کیجیے' ورنہ میں کوئی بے تکی حرکت کر بیٹھوں گی اپنی جان لے لوں گی' تباہ ہو جاؤں گی --- مجھے بڑا دکھ ہے' میرے دکھ کا حال کوئی بھی نہیں جانتا' کوئی بھی - (دورن کے سینے پر سر رکھ کر) میں کونستان تن کو چاہتی ہوں' بیچارے ڈاکٹر کے پاس اس بیماری کی کوئی دوا نہیں - وہ جواب دیتا ہے —

" تم سب کے اعصاب کیسے کمزور ہیں! .. اور محبت کی بھی کیا

بھرما رہے! ... (نرمی سے) مگر، میری بچی، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟" —

ماشا نے خود ایک تدبیر سوچی ہے، جو وہ تری گورن سے بیان کرتی ہے —

"میں یہ سب آپ کو اس خیال سے بتا رہی ہوں کہ آپ انشاپرداز ہیں ... دیکھیے میں نے بیٹھے بیٹھے طے کیا ہے کہ کونستان تن کی محبت کو اپنے دل سے نکال دوں گی، جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گی ... محبت کرنا جب کوئی امید نہ ہو، برسوں انتظار کرنا کہ شاید کچھہ ہوجائے .. لیکن جب میں شادی کرلوں گی تب محبت کرنے کی مہلت ہی نہ ہوگی، نئی فکریں اور ذمہ داریاں سب گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو مٹادیں گی- اور پھر یہ بھی ہے کہ ذرا تبدیلی ہوجائے گی" —

ماشا شادی کرلیتی ہے اور اس کے ایک بچہ بھی ہوجاتا ہے، مگر کونستان تن کی محبت اسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے- اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس کے شوہر کا کسی اور شہر میں تبادلہ ہوجائے تو شاید اس کی حالت سنبھل جائے گی، مگر اس کے انداز سے ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ یہ بھی خالی بہلاوا ہے —

چیخوف کے تیسرے ڈرامے "وانیا ماموں" میں جذبات کا وہ الجھاؤ نہیں ہے جو روسی معاشرت نے پیدا کیا تھا، لیکن اس وجہ سے اس کو پڑھ کر دل پر اور بھی زیادہ سخت چوٹ لگتی ہے- سے ریب ریاکوف، ایک پروفیسر اور انشاپرداز، جس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا ہے، دوسری شادی کرتا ہے اور بیوی کے ساتھہ اس مکان میں جا کر رہتا ہے جو اس کی پہلی بیوی کو جہیز میں ملا تھا- مکان کے ساتھہ تھوڑی سی

جائداد بھی ہے جس کا انتظام شروع سے اس کے سالے (پہلی بیوی کے بھائی) ووئی نیت سکی کے سپرد رہا ہے، اور سریب ریا کوف کی لڑکی سونیا بھی ہوش سنبھالنے کے بعد سے جائداد کے کام میں اپنے ماموں کی مدد کرتی رہی ہے - ماموں بھانجی دونوں خوش اور مطمئن تھے، اور چونکہ انہیں خیال تھا کہ سریب ریا کوف علمی اور ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس کی خدمت کرنا ضروری اور اچھا سمجھتے تھے - مگر جب پروفیسر اپنی نوجوان اور خوبصورت بیوی کے ساتھ مکان میں آکر رہنے لگتا ہے تو دونوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - سونیا شروع میں اپنی سوتیلی ماں سے بات تک نہیں کرتی، ووئی نیت سکی کو یقین ہوجاتا ہے کہ پروفیسر اوچھے علم اور کمینی طبیعت کا آدمی ہے، وہ اسے خوبصورت بیوی رکھنے کا مستحق نہیں سمجھتا، اسے موقع بے موقع برا بھلا کہتا ہے اور اس کی بیوی سے ایسی باتیں کرتا ہے جو کوئی شریف عورت گوارا نہیں کرسکتی - ووئی نیت سکی کو سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ وہ ۴۷ برس کا ہوگیا ہے قابلیت میں کسی سے کم نہیں، مگر ایک غلط فہمی کی وجہ سے اس کی عمر کا بہترین حصہ ضایع ہوچکا ہے اور اب اس کے لیے زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع نہیں - سریب ریاکوف کو عورتیں نہ معلوم کیوں پسند کرتی ہیں، وہ واقعی نہایت خود غرض اور تکلیف دہ مزاج کا ہے، اور ہمیں اس پر مطلق افسوس نہیں ہوتا کہ ووئی نیت سکی اسے طعنے دیکر گھر سے بھگا دیتا ہے - لیکن اس کے چلے جانے سے کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی - ووئی نیت سکی کے شکوہ شکایت کا انداز وہی رہتا ہے اور بیچاری سونیا کو دنیا سے کوئی امید ہی نہیں رہتی - جب تک

پروفیسر مکان میں رہا، آستروف، ایک ڈاکٹر، اسے اکثر دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سونیا کی ڈاکٹر سے پہلے بھی ملاقات ہوتی تھی، اور سونیا کو اس سے بڑی محبت تھی، مگر سونیا کی صورت شکل اچھی نہیں تھی، اس لیے ڈاکٹر نے کبھی اس کی محبت کی پروا نہیں کی۔ باپ کی موجودگی کے زمانے میں سونیا نے ایک مرتبہ اپنی سوتیلی ماں سے کہا کہ آستروف سے باتوں باتوں میں دریافت کرلے کہ وہ شادی پر راضی ہوگا یا نہیں، اسے کیا خبر تھی کہ اس درمیان میں آستروف اس کی سوتیلی ماں کا گرویدہ ہوگیا ہے، اور وہ بھی اپنے اصولوں کے باوجود ڈاکٹر سے بالکل بے التفاتی نہیں برت سکی ہے۔ وہ گفتگو جس میں سونیا کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا ڈاکٹر کے لیے اپنے جذبے کے اظہار کا موقع بن جاتی ہے اور ڈاکٹر کو سونیا کی سوتیلی ماں کے میلان کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ گفتگو کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سونیا کی سوتیلی ماں کو دوچار مرتبہ پیار کرلیتا ہے، اور وہ شوہر کے ساتھ جانے لگتی ہے تو یادگار کے طور پر ڈاکٹر کی ایک پنسل اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔ آخر میں جب سب چلے جاتے ہیں تو سونیا اور اس کے ماموں کے لیے کسی نہ کسی طرح دل کو سمجھا بجھا کر تنہائی اور بے لطفی کی زندگی برداشت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ چخوف نے ڈرامے کے آخری سین میں اپنے دل کا سارا درد بھر دیا ہے:—

ووئی نیت سکی (سونیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے): میری بچی میرے دل پر بڑا بوجھ ہے، تجھے کیا بتاؤں کیسا بوجھ ہے! سونیا: کیا کریں، جینا تو پڑے ہی گا! (خاموشی) تو کیا ہوا، وانیا ماموں، پھر جئیں گے۔ دنوں کا ایک لگاتار سلسلہ، شام کا گراں وقت، گزار دیں گے

قسمت ہماری جس طرح پر بھی آزمائش کرے ' ہم اسے صبر کے ساتھ بھگت لیں گے - اب 'اور بڑھاپے میں ہم دوسروں کے لیے محنت کریں گے آرام کا نام نہ لیں گے 'اور جب ہماری گھڑی آئے گی تو عاجزی کے ساتھ مر جائیں گے 'اور قبر کے اس پار پہنچ کر ہم کہیں گے کہ ہم نے مصیبتیں جھیلی ہیں ' روئے ہیں ' ہم کہیں گے کہ ہمارے لیے زندگی تلخ تھی ' خدا کو ہم پر رحم آئے گا اور تب ' ماموں ' میرے پیارے ماموں ' ہم پر ایک روشن حسین ' پر لطف زندگی کا دروازہ کھلے گا ' اس وقت کے غم پر ہم کو حیرت ہوگی ''اس کا خیال کر کے ہم مسکرائیں گے - اور تب ہمیں آرام ملے گا - مجھے یقین ہے ' دل و جان سے یقین ہے ... (گھٹنوں پر کھڑی ہوکر ماموں کے ہاتھوں پر سر رکھہ دیتی ہے : تھکی آواز سے) ہم کو آرام ملے گا ! ... مجھے یقین ہے یقین ہے ... (ماموں کے آنسو پونچھتی ہے) میرے بیچارے ' بیچارے ماموں ' آپ رو رہے ہیں ... (خود رو کر) زندگی میں تو آپ کو کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی ' مگر ٹھہرئیے ' وانیا ماموں ' ٹھہرئیے ' ہم کو آرام ملے گا ... (ماموں کو لپٹ کر) آرام ملے گا ... آرام ملے گا - " وانیا ماموں " کے آخر میں ان آنسوؤں کے ساتھہ تھوڑا بہت غم بھی بہ جاتا ہے 'اور طبیعت کچھہ ہلکی ہو جاتی ہے '' تین بہنوں '' میں تسلی کا یہ بہانہ بھی کام نہیں آتا ' اور شروع سے آخر تک ایک ایسی اداسی چھائی رہتی ہے کہ جس سے دم گھٹتا ہے - ڈراما کی مرکزی صورتیں تین بہنیں ' اولگا ' ماشا اور ایرینا ہیں - پہلے ہی سین میں ان کی ساری کیفیت معلوم ہو جاتی ہے ' ان کے ارمان ' ان کی مصیبتیں ' اور وہ غم جو ہر ایک کے دل میں گھر کیے ہوئے ہے - ان کا باپ فوج میں کسی بڑے عہدے پر ملازم تھا ' اور کسی زمانے وہ سب دارالسلطنت ماسکو میں

رہتی تھیں - لیکن باپ کا انتقال ہو گیا ' مالی دشواریوں نے ان کو ایک قصبے میں جاکر رہنے پر مجبور کیا ' جہاں رہتے انہیں گیارہ برس ہو گئے ہیں - اولگا اسکول میں پڑھاتی ہے مگر اس کام میں اس کا جی نہیں لگتا ' اور اسے اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس کے ہر وقت سر میں درد رہتا ہے - غالباً اس خیال سے کہ اس کی عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے وہ شادی کا حوصلہ نہیں کرتی ' مگر اس کے دل میں محبت اور انسانی ہمدردی کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ اپنا اور پرایا دکھہ درد اسے ہر وقت بے چین رکھتا ہے - دوسری بہن ماشا کی ایک اسکول کے استاد سے شادی ہو گئی جسے وہ پہلے بہت لائق سمجھتی تھی اور اس سے ڈرتی دبتی بھی تھی - لیکن ساتھہ رہنے نے شوہر کی قلعی کھول دی ہے ' اور ماشا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ذہانت اور علمی قابلیت معمول سے بھی کم ہے ' اور وہ ایک دبو ' خوشامدی اور بدمذاق آدمی ہے - ماشا نے اس کا ادب اور لحاظ کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے ' اپنے آپ کو بالکل آزاد رکھتی ہے مگر اس کی سمجھہ میں نہیں آتا کہ اس آزادی کو کرے کیا - سب سے چھوٹی بہن ایرینا کو اس کا حوصلہ ہے کہ ماسکو جاکر وہاں رہے اور اسے یقین ہے کہ وہ ایسا کرسکی تو اس کی تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی ' اور اسے جینے میں وہ مزا ملے گا جس کو وہ اب تک ترستی رہی ہے - وہ صرف بڑے شہر میں رہنے ' شائستہ لوگوں سے ملنے ' اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی خاطر ماسکو نہیں جانا چاہتی وہ ایک موقع پر کہتی ہے کہ " محنت کرنا چاہیے ' محنت - ہم خوش اس وجہ سے نہیں رہتے زندگی کو ہم ایسی اداس نظروں سے اس لیے دیکھتے ہیں کہ ہم محنت کرنا نہیں جانتے ' ہم ایسے لوگوں کی اولاد ہیں جو محنت کو حقیر جانتے

تھی" - وہ خود محنت کرکے عمل اور خیال میں مطابقت قائم رکھتی ہے ' مگر اس کے دل میں یہ بات بیٹھہ گئی ہے کہ اگر وہ ماسکو نہ جاسکی تو سب کچھہ ہیچ ہوگا ' اور اس لیے محنت کرنے پر بھی اس کی طبیعت پژمردہ رہتی ہے - ایک فوجی افسر توزن باخ ' جو ایریدا سے محبت کرتا ہے ' محنت کرکے روٹی کمانے کے شوق میں ملازمت سے استعفاء دے دیتا ہے - ایریدا جانتی ہے کہ وہ بڑی خوبیوں کا آدمی ہے اور دل سے اس کی قدر کرتی ہے ' مگر اُسی دل کو اس کی طرف سے ٹھنڈا بھی پاتی ہے ' اس سے شادی کرنے پر راضی ہوجاتی ہے مگر جو محبت اس کے خیال میں عورت کو مرد سے ہونا چاہیے اس سے اپنے سینے کو خالی دیکھتی ہے - شادی کی نوبت نہیں آنے پاتی ' اس لیے کہ توزن باخ کا ایک ملاقاتی فوجی افسر رشک میں اسے مار ڈالتا ہے اور ایریدا ہاتھہ مل کر رہ جاتی ہے - ماشا پر اس سے بھی زیادہ سخت مصیبت آتی ہے - وہ ایک فوجی افسر سے ملتی ' دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند آتے ہیں ' لیکن پھر محبت کی آگ بجھانے کی تدبیریں کرنا پڑتی ہیں ' کیونکہ فوجی افسر بیوی بچوں والا آدمی ہے ' اور اس کی شاعرانہ گفتگو بے بسی اور مظلومیت کا ترانہ ہے —

" تین بہنوں " کو پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ روسی سوسائٹی زیادہ دن قائم رہنے والی نہیں ' اور چخوف نے اپنی طرف سے اس کے عنقریب فنا ہو جانے کی پیشین گوئی " باغ " * میں کی - اس ڈراما میں مرکزی حیثیت ایک شریف خاندان کی عورت لیوبوف آندریے یفنا کو دی گئی ہے - اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ایک وکیل سے شادی

* ڈراما کا پورا عنوان " چیری کا باغ " ہے —

کرلی تھی جو طبیعت کا بہت اچھا مگر بہت گیا گزرا شرابی تھا اور اسی لت کی وجہ سے جلد مرگیا - اس کے مرنے پر لیوبوف آندریے ینا کی ایک اور شخص سے آشنائی ہوگئی جس کی خاطر اس نے اپنی ساری جائداد گلوادی اور پھر اس کے قریب رہنے کے لیے پیرس میں جاکر پڑرہی - ڈراما کا قصہ جب شروع ہوتا ہے تو وہ پانچ برس کے بعد پہلی دفعہ گھر واپس آئی ہے - اپنا پیدائشی گھر دیکھہ کر اسے جو خوشی ہوتی ہے ' جس محبت سے وہ ہر ایک سے ملتی ہے اس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے ' مگر ہم یہ بھی دیکھہ لیتے ہیں کہ اسے اپنی طبیعت پر ذار بھی قابو نہیں اور نہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں گذر بسر کرنے کے لیے کیسی احتیاط اور عاقبت اندیشی درکار ہے - اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مکان اور باغ نیلام ہونے والا ہے تو اسے بچانے کی وہ خود کوئی فکر نہیں کرتی اور کسی دوسرے کو بھی کچھہ کرنے نہیں دیتی - لیکن جب مکان اور باغ نیلام ہوجاتا ہے تو وہ ہر شخص اور ہر چیز سے اس طرح رخصت ہوتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں —

لیوبوف آندریے ینا کا بڑا بھائی گایف اپنی طبیعت میں کچھہ کم تباہی کا سامان نہیں رکھتا - وہ ذہین تو ہے مگر ساری عمر بیکاری میں گزارنے سے پچاس برس کی عمر میں اس کا یہ حال ہوگیا ہے کہ اس کی بچوں کی طرح دیکھہ بھال کرنا اور اسے بات بات پر ٹوکنا پڑتا ہے - معاملے کی کوئی بات اس کی سمجھہ میں نہیں آتی ؛ وہ ہر وقت یا تو تقریر کرتا ہے یا بلیرڈ کے ہاتھہ دکھاتا ہے - اسی ذہنیت اور مزاج کا ایک اور نمونہ تروفی موف ہے ' جو کسی زمانے میں لیوبوف آندریے ینا

کے بچے کو پڑھایا کرتا تھا ، اور اس کے انتقال کے بعد بھی گھر میں پڑا رہا - اس کی تقریریں سن کر خیال ہوتا ہے کہ وہ نہایت بلند حوصلہ اور مضبوط ارادے کا آدمی ہے اور ضرور کچھہ کر دکھائے گا ' دراصل اس کے تخیل کی بلند پروازی گایف کی تقریروں کی طرح ایک لت ہے ' جس نے اس کو بالکل نکما کردیا ہے - ڈراما کی سیرتوں میں اگر کوئی ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہے تو وہ ایک تاجر کا لڑکا لوپوخن ہے - وہ ڈنڈے کھا کھاکر پلا ہے ' یورپی تہذیب سے بے بہرہ ہے ' مگر اپنے فائدے نقصان کو سمجھتا ہے اور اس میں اتنی چستی اور دوڑ دھوپ کا مادہ ہے کہ اپنے منصوبے پورے کرلے - اوس تروف سکی کو روسی سوسائٹی کی فلاح اسی طبیعت کے آدمی پیدا کرنے میں نظر آئی تھی' چیخوف نے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا' لیکن وہ جانتا تھا کہ تعلیم یافتہ روسی دنیا سے رخصت ہوجانا اپنی وضع بدلنے سے زیادہ آسان سمجھیں گے —

چیخوف کو رونے اور رلانے کے ساتھہ ہنسنے اور ہنسانے میں بھی کمال حاصل تھا - اس کے فرحیہ ڈرامے' جو بہت مختصر ہیں اپنے طرز میں بے مثل ہیں - لیکن ان کا مزہ سیرتوں کی خصوصیات میں نہیں بلکہ گفتگو میں ہے ' اور بغیر ڈراموں کو پڑھے حاصل نہیں ہوسکتا —

چیخوف کا خاص طرز بہت مقبول ہوا ' لیکن چیخوف استاد کا حق ادا نہ کرسکا ' اس لیے کہ اس کے طرز کی نقل کرنا ممکن نہیں - اس کے اور ان استعاریت پسندوں کے درمیان جن کا جنگ عظیم سے پہلے چرچا تھا صرف گورکی کا ڈراما " قعر مذلت " ذکر کے لائق ہے ' جس پر چیخوف کا اثر نظر نہیں آتا بلکہ دستہ ئف سکی کا - روسی نقادوں نے تو اس میں کوئی خاص خوبی یا جدت نہیں پائی' کیونکہ ان کے نزدیک

گورکی اور دوسرے انشاپرداز ایسے فلسفیانہ مزاج کے خانہ خراب لوگوں کو جن کی ذہنیت اور حالات اس ڈراما کا موضوع ہیں' بہتیری تصانیف میں پیش کرچکے ہیں ' مگر یورپ میں یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا' اور واقعی وہ ہزار خوبیوں کی چیز ہے - اس کا پس منظر ایک سرائے ہے جس میں بے روزگار اور جرائم پیشہ لوگ رات کو پناہ لیتے ہیں' اور ایک چور' ایک شرابی ' ایک مفلس خطاب یافتہ زمیندار' ایک لوہار اور اس کی مدقوق بیوی' سرائے کی بھٹیارن' اس کی ایک رشتہ دار جوان لڑکی شاشا' اس کی خادمہ ناستیا ڈراما کی ممتاز ہستیاں ہیں- ان سب کے دن کسی نہ کسی طرح کٹ رہے ہیں کہ اچانک لوکا' ایک فقیر آکر ان کی طبیعتوں میں انقلاب پیدا کردیتا ہے - کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے' لیکن اس میں معاملے کو سمجھنے اور سلیقے سے بات کرنے کی ایسی حیرت انگیز قدرتی صلاحیت ہے کہ وہ فوراً اعتبار حاصل کرلیتا ہے اور سب کا راز داں بن جاتا ہے - اس کے لہجے میں کچھہ ایسی نرمی' اس کی زبان میں ایسا جادو ہے کہ سب اُسی کی بات کو سنتے ہیں اور اسی کو سننا چاہتے' دنیا ان سے جو برتاؤ کرتی رہی ہے اسے معاف نہیں کرتے مگر لوکا کے سامنے سر جھکالیتے ہیں - لوہار کی مدقوق بیوی' جس نے ساری عمر میں ایک لمحہ بغیر تکلیف کے نہیں گزارا ہے خدا کے رحم وکرم اور جنت کے سکون اور آرام کی کہانی سنتے سنتے آخر کو مسکراتی ہوئی اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کرلیتی ہے' شرابی کو' جس کے قویٰ آہستہ آہستہ جواب دے رہے ہیں لوکا ایک ہسپتال کا قصہ سناتا ہے جہاں شرابیوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے اور ان کی مہلک عادت سے نجات دلائی جاتی ہے - ہسپتال کا

ڈکر سن کر شرابی کی ڈھارس بندھ جاتی ہے، اور یہ امید کہ وہ ہسپتال تک پہنچ جائے گا اس کی زندگی کا ایک اکیلا سہارا بن جاتی ہے، ایسا سہارا کہ جب لوگ شرارت میں اس سے کہتے ہیں کہ یہ ہسپتال فقیر کی ایجاد ہے اور کوئی اصلیت نہیں رکھتا تو شرابی مایوس ہوکر خودکشی کرلیتا ہے - فقیر کی خاص توجہ چور اور شاشا کی طرف رہتی ہے، اور انہیں وہ نئی اور پاک صاف زندگی کی رغبت دلانے کی بڑی کوشش کرتا ہے - چور دراصل خاصا اور نیک دل ایماندار آدمی ہے، جس کا باپ چور تھا اور جسے لوگوں نے چور کہتے کہتے باپ کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کردیا - اس کا چوری کرنا اور مذہب اور اخلاق کو ڈھکوسلا سمجھنا اس کی اخلاقی حس کا پتا دیتا ہے، اسے عیب اور ریاکاری پر غصہ آتا ہے، نیکی پر ہنسی نہیں آتی - ایک موقع پر وہ فقیر سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ خدا ہے یا نہیں، اور فقیر جواب دیتا ہے کہ "مانتے ہو تو ہے اور نہیں مانتے ہو تو نہیں" - یہ جواب سن کر چور ایسا چپ ہوتا ہے کہ دیر تک اس کے منہ سے کوئی بول نہیں نکلتا اور وہ فقیر کا دل سے معتقد ہوجاتا ہے - لیکن فقیر کا حوصلہ کہ چور اور شاشا ایک دوسرے سے محبت کریں پورا نہیں ہوتا، اس لیے کہ چور کا بھٹیارن سے یارانہ ہے اور وہ اسے شاشا کی طرف مائل دیکھ کر ایسا فتنہ برپا کرتی ہے کہ چور اور فقیر دونوں غائب ہوجاتے ہیں —

"قعر مذلت" کے علاوہ گورکی نے اور کئی ڈرامے لکھے جو کوئی خاص خوبی نہیں رکھتے - ویاچلاف اوانوف نے چیخوف کے طرز میں طبع آزمائی کی لیونِد آندریے یف نے ڈراما کو اعصابی دیوانِ پن میں رنگنے کی کوشش کی، الکسے ئی تالستائی نے نفسیاتی پیچیدگیوں اور روحانی امراض

کے مطالعے کو چھوڑ کر صحیح العقل یورپی انشاپردازوں کی طرح قصے اور کشمکش کو نمایاں کرنا اور استعاریت پسندوں نے ڈراما میں اپنے خاص انداز کو کھپانا چاہا - ان میں سے کسی میں اتنا مادہ نہیں تھا اور کسی کے پاس علم، تصورات اور عقائد کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا کہ ایک نیا ڈھب اختیار کیا جاسکے اور انشا پردازی کی دوسری قسموں کی طرح انقلاب سے پہلے کی ڈراما نویسی بہت سے رنگوں کی یک جائی ہے جسے تصویر نہیں کہا جاسکتا - ان کوششوں میں اگر کوئی قابل ذکر ہیں تو استعاریت پسندوں کی، جن میں سب سے ممتاز شخصیت الکساندر بلوک کی ہے —

بلوک کے ڈرامے بہت انوکھے اور نرالے ہیں، ان کی زبان بہت فصیح ہے، اور ان میں سے جو استیج پر دکھائے گئے وہ خاصے مقبول ہوے - لیکن زندگی کو بلوک جس رنگ میں دکھاتا ہے، انسانی کیفیتوں کو جس انداز سے وہ پیش کرتا ہے اسے سمجھنا ذرا مشکل ہے، اور نتیجے کے طور پر جو حقیقت آخر میں واضح ہوتی ہے - وہ ہمیں ایسی بلند اور بصیرت افروز نہیں معلوم ہوتی کہ جس کی خاطر روز مرہ زندگی کا نقشہ اس طرح بگاڑا جاے جیسے کہ استعاریت پسند چاہتے ہیں - مثلاً بلوک نے اپنے ڈراما "انجان عورت" میں اس حجاب کو اپنا موضوع بنایا ہے جو دیدار کے مشتاق شاعر کو حسن کامل سے جدا رکھتا ہے - حسن کامل کا مجسمہ ایک انجان عورت ہے جو آسمان پر ایک ستارہ تھی، اور زندگی اور جذبات کی پیچ و تاب کا مزہ اٹھانے کے شوق میں زمین پر اتر آئی - چونکہ شاعر میں اتنی حس نہیں کہ اس کے قرب کو محسوس کرے، نہ آنکھ میں اتنی قوت کہ اسے پہچان سکے، انجان عورت کا کوئی پرسان حال نہیں - پہلے وہ ایک شراب خانے کے دروازے پر جس کے اندر

اور لوگوں کے ساتھہ شاعر بھی بیٹھا شراب پی رہا ہے منتظر کھڑی رہتی ہے' پھر ایک میدان میں نازل ہوتی ہے جس میں سے کچھہ پہلے دو آسی مست اور بے خبر شاعر کو پکڑ کر لیجا چکے ہیں۔ شاعر کو کچھہ تو خیال ہوتا ہے کہ وہ کہیں قریب آئی ہے' مگر جب تک اس کا نشہ اترے اترے' انجان عورت کو ایک بوالہوس لے اڑتا ہے۔ تیسرا منظر ایک مکان ہے جس میں بہت سے مہمان جمع ہیں' انھیں میں شاعر بھی ہے' اور اس وقت جب وہ اپنی ایک نظم سناتا ہوتا ہے' انجان عورت بھی آپہنچتی ہے۔ شاعر اسے پہچان تو لیتا ہے' مگر خاکساری اور بے مائگی کا احساس اسے انوکھے مہمان سے دور رکھتا ہے' انجان عورت مایوس ہوجاتی ہے اور پھر آسمان پر جاکر ستارے کی طرح چمکنے لگتی ہے۔ اس ڈراما کا وہ پہلو جو استعاریت پسندوں کے نزدیک اس کی جان ہے سچ پوچھا جاے تو بہت کمزور ہے' البتہ وہ حصے جن میں عام زندگی کی بیہودگی اور لغویت ظاہر کی گئی ہے' یعنی اس میں حقیقت نگاری کا جو پہلو ہے' وہ بہت موثر ہے' اور واقعی دنیا کو شائستہ اور پاک کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے —

۱۹۱۰ تک سمجھنا چاہیے چیخوف کے طرز کا دور ختم ہوگیا اور استعاریت کی ادبی تحریک کمزور پڑگئی۔ اسی کے ساتھہ ایکٹنگ کے وہ اصول جن کے مطابق حقیقت نگاری اور ڈراما کی فضا سٹیج پر پیدا کرنا فن کا اصل مقصد تھا چھوڑے جانے لگے۔ خود ستانسلاف سکی' ماسکو آرٹ تھیٹر کے بانی نے پرانے مسلک سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنا شروع کیا' اور انقلاب' جو تھیٹروں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا' نئے تجربے کرنے کی تحریکوں کی سرپرستی کرتا رہا۔ ان مظاہر پر

یہاں بحث نہیں کی جاسکتی' اس لیے کہ ایسی بحث بالکل اصطلاحی ہوجائے گی' اور پھر یہ بھی ہے کہ نئی تحریکوں میں سے کوئی بھی پائدار یا مقبول عام ثابت نہیں ہوئی ہے۔ آگے تھیٹر اور ڈراما کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ خدا جانتا ہے۔ اندیشہ تو یہ ہے کہ سنیما نے تھیٹر کو کاری ضرب لگائی ہے اور اب وہ شاید ہی پنپ سکے —

انگریزی میں اردو الفاظ

از

(جناب شیخ محمد اسمعیل صاحب سکرٹری اورنٹیل پبلک لائبریری پانی پت)

اردو زبان کی مقبولیت ' ہردلعزیزی اور وسعت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ صدیوں کی نشو و ترقی کے بعد بھارت کی اس بیٹی کے حسن و شباب کی کرنیں اب سمندر پار کے دور دراز ممالک میں بھی پڑنے لگی ہیں - تمدن و تہذیب کے اس دور جدید میں شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں اردو سمجھنے والے اور ہندوستانی بولنے والے افراد موجود نہ ہوں - دنیا کا کوئی براعظم ایسا نہیں جہاں بالعموم اردوداں اور اردوخواں اصحاب نہ پائے جاتے ہوں - بعض ممالک میں تو (جیسے جاپان وغیرہ) حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کے طلباء کو اردو پڑھانے کا نہایت معقول انتظام ہے - اور وہاں کی لائبریریوں میں بہت بڑا ذخیرہ اردو لٹریچر کا پایا جاتا ہے - انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں جس قدر عظیم‌الشان ذخیرہ اردو کتابوں کا مہیا کیا گیا ہے ہندوستان کی شاید کسی لائبریری میں ہوں - ہندوستان سے باہر دنیا کے اکثر ممالک میں اس کثرت سے اردو جاننے والے اشخاص موجود ہیں کہ ہندوستان کے کسی آدمی کو وہاں جاکر زبان کے لحاظ سے کوئی دقت پیش نہیں آسکتی - اور قدم قدم پر اس کو اردو جاننے والے

اصحاب مل جاتے ہیں —

اردو کی اس عالمگیری کو نظر انداز کرتے ہوئے آج ہم اس کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا ایک دوسرا دلچسپ ثبوت پیش کرتے ہیں —

قاعدہ ہے کہ فاتح قوم کے غلبہ اور اثر کی وجہ سے مفتوح قوم کے عادات و اطوار اور رسم و رواج پر بہت گہرا اثر پڑا کرتا ہے - اور سب سے زیادہ یہ اثر محکوم قوم کے لٹریچر اور اس کی زبان پر پڑتا ہے - چنانچہ دیکھہ لو کہ آج کل اردو انشا پردازی میں انگریزی کا کس قدر تتبع کیا جاتا ہے اور انگریزی کے کس قدر بکثرت الفاظ اردو میں رائج ہوگئے ہیں - لیکن اس کے برعکس ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ فاتح قوم مفتوح اقوام کے رسم و رواج اختیار کرلے اور مفتوح قوم کے لٹریچر کا اثر فاتح قوم کی زبان و ادب پر پڑے - مگر آپ کو یہ بات کس قدر عجیب معلوم ہوگی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی آپس میں بہت کچھہ مغائرت اور علحدگی کے باوجود ہندوستان میں رہنے کے باعث انگریزی زبان میں اردو کے بہت سے الفاظ شامل ہوگئے ہیں جنہیں ہندوستان میں رہنے والے انگریز افسر بلا تکان بولتے اور آسانی کے ساتھہ سمجھتے ہیں - اور یہ صورت حال بلا شبہ اردو کی عظیم الشان فتح اور اس کی آئندہ ہردلعزیزی ' مقبولیت اور وسعت کی بین دلیل ہے - کیونکہ جب ہندوستان میں رہنے والے انگریز اپنے ملک کو واپس جاتے ہیں تو اردو کے یہ الفاظ جو ان کی زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں اپنے ساتھہ لے جاتے ہیں - اور اس طرح بہت قریب زمانہ میں اردو کے یہ تمام الفاظ آہستہ آہستہ انگریزی زبان کا ایسا جزو بن جائیں گے کہ بہت مشکل سے پہچانے جاسکیں گے —

ہم یہاں ناظرین کی دلچسپی کے لیے ایسے الفاظ کی جو ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی زبان پر بالعموم چڑھ گئے ہیں اور جنہیں یہاں کے یورپین عام طور پر استعمال کرتے ہیں ایک مختصر فہرست پیش کرتے ہیں - جو ہم نے عرصہ کی تلاش و انتخاب کے بعد مختلف اصحاب اور ڈکشنریوں کی مدد سے مرتب کی ہے - سب سے زیادہ امداد اس کام میں ہمیں اس جدید لغت سے ملی جو گزشتہ دسمبر میں سنہ ۲۶ میں کلکتہ نے شائع کی ہے اور جسے ایک فاضل پرنسل Mr A. M. Williams M. A نے پروفیسر Ernest Weekley M. A کی اعانت سے بڑی لیاقت کے ساتھ مدون کیا ہے اس بالکل تازہ اور جدید ترین لغت کا نام New Standard Illustrated, Dictonary ہے —

اردو میں یہ ایک بالکل نیا مضمون ہے - اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا - ہم نے آسانی کے لیے ہر اردو لفظ کا انگریزی تلفظ بھی لکھ دیا ہے جو انگریزوں میں مستعمل ہے - اور یہ تلفظ غیر ملک کے آدمیوں کی زبان پر چڑھنے کی وجہ سے اکثر جگہ لہجے اور طرز ادا کے اختلاف کی وجہ سے اردو تلفظ سے مختلف بھی ہو گیا ہے - مگر تاہم اس بدلے ہوئے لہجے میں بھی اصلی اردو لفظ کی شان پورے طور پر نظر آتی ہے - اور لسانیات کا ماہر فوراً پہچان جاتا ہے کہ اس لفظ کی اصل شکل و ہئیت کیا ہے ؟ —

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم ان اردو الفاظ کی فہرست ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو انگریزوں کی زبان پر رائج ہو کر انگریزی میں شامل ہو گئے ہیں —

ابا	Abba
الماری	Almira
امین (عدالتی)	Ameen
امیر (سردار کے معنی میں)	Ameer / Emir
ابدال (بمعنی پیر - درویش)	Abdal
آبدست (ہاتھہ دھونا)	Abdest
امیرالبحر	Admiral
اسلام	Islam
الجبرا	Algebra
الپکا	Alpaca
الکحل	Alcohol
امیدوار	Umedwar
آنہ	Anna
امام	Imam / Imaum
بابو	Babu
بدمعاش	Badmash
بہادر	Bahadur
بنیا	Baniah
برسات	Barsat
باورچی	Bawarchi

بیگار	Begar
بہشتی	Bihisti / Bheesty
بندوبست	Bundobast
بڑا (جیسے بڑا صاحب)	Burra
بستی	Bustee
بخشش	Baksheesh
بھتہ (الاؤنس کے معنوں میں)	Batta
(بی بی بیوی)	Beebee
بھنگ	Bang
بسم اللہ	Bismillah
بند	Bund
پالکی	Palki
پان	Pan
پیسہ	Pies / Pice
پنجراپول	Pinjrapole
پیر	Pir
پوجا	Puja
پکا	Pukka / Pucka
پاپوش (سلیپر - جوتی)	Pabouche

Pashm	پشم
Pergunnah	پرگنہ
Peri	پری
Pindaree	پنڈاری
Pipul	پیپل
Pugaree	پگڑی
Punchayet	پنچایت
Pundit	پنڈت
Punkah	پنکھا
Tamasha	تماشا
Tehsil	تحصیل
Terai	ترائی (ہمالیہ کی وادی)
Thana	تھانہ
Carcass / Carcase	ترکش
Tael / Tola	تولہ
Jampani	تام جھام (رکشا)
Taj	تاج
Taluk / Talook	تعلقہ (ضلع - علاقہ)
Jatha	جتھا
Talukdar / Talookdar	تعلقہ دار
Tanjib	تن زیب (کپڑا)
Tap	تپ (بخار)
Tariff	تعریف
Tash	تاش (زرین دو پٹہ)
Teapoy	تپائی
Toddy	تاڑی
Tonga	تانگہ
Trisul / Trisula	ترسول
Talwar	تلوار
Tat	ٹٹو
Tattie / Tatty	ٹٹی (پھونس یا سرکنڈوں کی)
Thug	ٹھگ
Tom tom	ٹن ٹن (گھنٹہ یا گھڑیال کی آواز)
Tusser	ٹسر
Jadu	جادو
Jagir	جاگیر
Jagirdar	جاگیر دار
Jamadar	جمعدار

Jheel	جھیل
Jihmill	جھلمل
Jirga	جرگہ ، کونسل - عدالت)
Gymkhana	جمخانہ (کلب گھر)
Jihad	جہاد
Julep Julap	جلاب
Chalaan	چالان
Chick	چق (چلمن)
Chit	چٹ (مختصر چھٹی)
Chiz	چیز
Chota	چھوٹا (جیسے چھوٹی حاضری - چھوٹا صاحب)
Chowdhry	چودھری
Chowk	چوک
Chowkidar	چوکیدار
Charpoy	چارپائی (یعنی پلنگ)
Chattah	چھاتا - چھتری
Chowry	چوری
Chutney	چٹنی
Shooldarry	چھولداری
Chithi	چٹھی
Hafiz	حافظ (قران مجید کا)
Havildar	حولدار
Hazri	حاضری (کھانا)
Hukum	حکم
Huzoor	حضور
Hadj	حج
Hadji	حاجی
Hakem	حکیم (طبیب)
Harem	حرم
Hookah Hooka	حقہ
Khansama	خانساماں
Khas	خس (گرمی کے موسم میں جس کی ٹٹیاں یا چلمنیں بنتی ہیں)
Khassadar	خاصہ دار
Caliph	خلیفہ
Khan	خان (سردار یا سرائے کے معنوں میں
Khitmatgar	خدمتگار
Chushy	خوشی
Daffadar	دفعدار
Dafter	دفتر
Daftari	دفتری

Dai	دائی
Daroga	داروغہ
Darshan	درشن
Dasehra	دسہرا
Dek / Dekko	دیکھ یا دیکھو
Dewali	دیوالی
Dewan	دیوان (وزیر)
Dhatura	دھتورہ
Dhoty	دھوتی
Dik	دق (یعنی پریشان ہونا)
Durbar	دربار
Durwan	دربان
Dustoor	دستور
Deodar	دیودار
Dooab	دوآبہ
Doosootee	دوسوتی
Durra	درہ
Dhobi	دھوبی
Dak / Dawk	ڈاک
Dak Bangalow	ڈاک بنگلہ
Dolly	ڈالی
Dhak	ڈھاک
Dooly	ڈولی
Dakoit	ڈاکو
Diabetes	ذیابیطس
Rais	رئیس
Ramzan	رمضان
Rani	رانی
Rickshaw	رکشا
Raj	راج
Raja / Rajah	راجا
Ramadhan / Ramadan	رمضان
Rana	رانا
Ream	ریم (کاغذوں کے بیس دستوں کو ریم کہتے ہیں) عربی لفظ 'رزمۃ' سے بنایا گیا ہے ۔ جس کے معنی گٹھڑی یا بنڈل کے ہیں
Ressaldar	رسالدار (فوج کا ایک عہدہ دار)
Rumal	رومال
Rupee	روپیہ

Zabardasti	زبردستی
Zemindar / Zamindar	زمیندار
Zemindari / Zemindary	زمینداری
Zenana / Zanana	زنانہ
Zendik	زندیق
Zumbooruk	زنبورک (توپ)
Sepoy	سپاہی
Sanad	سند
Sanyasi	سنیاسی
Sardar	سردار
Satyagraha	ستیاگرہ
Seer	سیر (وزن)
Swadeshi	سودیشی
Swaraj	سوراج
Syce	سائیس
Circar	سرکار (آقا - افسر - گورنمنٹ)
Salaam / Salam	سلام
Santer	سنتر (بربط - باجا)
Sarab	سراب (دھوکا)
Seetulputty	سیتل پاتی (چٹائی)
Serai	سرائے
Sicca	سکہ
Simoor / Simoom	سموم (سخت گرم ہوا)
Soneri	سنہری
Sujee	سوجی (روا)
Sultan	سلطان
Sultana / Sultaness	سلطانہ
Sun	سن
Sunn	(درخت کا وہ ریشہ جس سے رسیاں وغیرہ بٹی جاتی ہیں)
Surma	سرما (جو آنکھوں میں لگایا جاتا ہے)
Sabre	سیف (تلوار)
Shabash	شاباش
Shamiana	شامیانہ
Satan / Shaitan	شیطان
Shah	شاہ
Shaheen	شاہین

شیخ	Sheikh Sheik
شربت	Sherbet Sorbet
شراب	Shrab
صوفا (دراصل عربی لفظ صفہ ہے)	Sofa
صفر	Cipher
صوفی	Sofi Sufi
صاحب	Sahib
ضلع	Zillah
طربوش (پھندنے دار ٹوپی)	Tarboosh Tarbouche
طبل (ڈھول)	Timbal Tymbal
ظرف	Zarf
ظلم	Zoolum
علمدار	Alemdar
عماری	Ambarie
عنبر	Amber
عطر	Attar

عید	Id
عزت	Izzat
علماء (عالم کی جمع)	Ulema
عسکری (لشکری)	Askari
غزال	Gazelle
غربال (چھلنی)	Garble
فرنگی	Firenghi
فقیر	Fakir
فرمان	Firman
قلندر	Calender
قند (چینی یا شوگر)	Candy
قوس	Coss
قرمزی	Crimson
قلی	Cooly
قبلہ	Keblah
قسمت	Kismet
قرآن	Koran
قلعہ دار (محافظ قلعہ)	Quilladar
کباب	Cabob
کچہری	Cutchery
کالا پانی (جزائر انڈمان)	Kala Pani

کھادی یا کھدر	Khadi / Khadder
کرپان	Kirpan
کوتوال	Kotwal / Cutwal
کچا	Kutcha
کپاس	Kapoc
کاروان (قافلہ)	Caravan
کاروان سرائے	Caravansary
کافی (قہوہ)	Coffee
کھاٹ (چارپائی)	Cot
کافر	Kafir / Kaffir
کمخواب	Kimcob
کحل (سرمہ)	Kohl
کھاتہ	Khata
کوٹھی	Kothi
کوئی ھے	Coi hai
گدی (دوکانداروں کی یا سلطنت)	Gaddi
گاڑی	Gharry
گھی	Ghee
گرجا	Girja

گودام	Godown
گماشتہ	Gomastal
گورا	Gora
گوردوارہ	Gurdwara
گھاٹ	Ghat / Ghaut
گزی (گاڑھا)	Guzzy / Guzzie
لشکر	Lashkar
لاکھہ (سو ہزار)	Lac
لوٹ	Loot
لنگور	Langur
مچان	Machan
مہاجن	Mahajan
میدان	Maidan
مولوی	Maulvi
من (وزن)	Maund
مہتر (حلال خور - خاکروب)	Mehtar
منجی (ملاح)	Manji
مفصل (مرکز کے قریب کے اضلاع)	Mofussil
مختار	Muktear
ملا	Mollah

مہاوت	Mahout
منتر	Mantra
مسجد (انگریزی کا لفظ Mosque بھی ' مسجد ' کی بگڑی ہوئی شکل ہے)	Masjid
منبر	Mimbar
مینار	Minar
مہر (اشرفی)	Mohur
مولا (آقا)	Mollah
منشی	Munshi / Moonshee
میم صاحب	Mem Sahib
مسلم	Muslem
موذن (اذان دینے والا)	Muezzin
مفتی	Mufti
ممی (فارسی لفظ ہے یعنی وہ لاشیں جو خشک شدہ حالت میں مصر میں موجود ہیں)	Mummy
مندیل (دستار)	Mundil
منصف (حاکم)	Munsiff
مرشد (ہادی - رہنما)	Murshid
مسند	Musnud

مشعل	Mussal / Mussaul
مست (ہاتھی کے لیے بولا جاتا ہے)	Must
نمبردار	Lumbardar
نائب	Naib
نائک (ہندوستانی فوج کا ایک افسر)	Naik
نوکر	Naukar
نواب زادہ	Nawabzada
نذر	Nazar
نیم کا درخت	Neem
نالہ	Nullah
نواب (امیر یا رئیس کے معنوں میں)	Nabob / Nawab
نادر	Nadir
ناچ	Nautch
ناظر (عدالتی عہدہ دار)	Nazir
نیل گائے	Nilghai
نارنج	Orange
ولایت (انگلستان)	Bilayat
وکیل	Vakil / Vakeel

وزیر	Vazir Visier Vizier
وزارت	Vizierate Vizerate
وادی	Wady Wadi
ہودہ	Houdah Howdah
یکہ	Ekka

سال وفات جرات

از

(جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا (پٹنہ)

جرات کی سال وفات کے متعلق آزاد* لکھتے ہیں:

"آخر عمر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں ۱۲۲۵ ھجری میں فوت ہوے، شیخ ناسخ نے تاریخ کہی:

'جب میاں جرات کا باغ دھر سے گلشن فردوس کو جانا ہوا

مصرع تاریخ ناسخ نے کہا ہاے ہندوستان کا شاعر موا'"

ہندستان کو ہندوستان بنادینے کی داد خواہ آزاد کو دی جاے خواہ کاتب آب حیات کو، اس اصلاح کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ مصرع آخر سے اضافۂ واو کی بدولت ۱۲۲۵ کی جگہ ۱۲۳۱ مستخرج ہوتا ہے، جو صریحاً غلط اور ناسخ اور آزاد دونوں کے منشا کے خلاف ہے —

ناسخ جرات کے ہم عمر نہ تھے، لیکن جرات اور ناسخ دونوں نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا تھا، جرات و ناسخ میں ذاتی تعلقات بھی ہوں تو عجب نہیں ناسخ گو عمر میں کم تھے، لیکن جرات کی زندگی ہی میں صاحب طرز استادوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا ناسخ کی عمر کا کچھہ حصہ لکھنؤ سے باہر بھی بسر ہوا ہے، مگر یہ ۱۲۲۴ - ۱۲۲۵ ھ کے بعد کی بات ہے ان امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص ناسخ کے قول

---

* آب حیات طبع نہم ص ۲۳۹ —

کو صحیح سمجھے' تو اسے الزام نہیں دیا جاسکتا' لیکن ۱۲۲۴ ھ کے حق میں اتنی قوی شہادتیں ہیں کہ ہمیں ۱۲۲۵ ھ کو ناچار مسترد کرنا پڑتا ھے - سب سے پہلے شیخ مصحفی کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو یہ قطعہ ان کے دیوان ششم* میں موجود ھے - مصحفی جرات کے دوست اور ہم چشم تھے کچھ دنوں دونوں بہ یک وقت سلیمان شکوہ کے ملازم بھی رھے تھے - مصحفی ۱۱۹۸ ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرتے دم تک وہیں رھے :-

جب قلندر بخش جرات مر گیا ریختے کے خوں نے کھایا دل میں جوش
ہو گئی تختہ دکان نظم و شعر اٹھ گیا بازار سے گوہر فروش
سال رحلت اس کے بعد از یک دو ماہ مصحفی سے کہ گیا پھر یوں سروش
سو وو ھے یہ مصرع بے بیش و کم 'ہو گئی کہا بلبل نالاں خموش'

واضح رھے کہ مصحفی نے 'گئی' کے ۳۰ عدد لیے ہیں' اور کوئی قاعدہ ایسا نہیں جس کے روسے ۳۱ لیے جاسکیں —

مصحفی کے بعد راجا جسونت سنگھ پروانہ ہیں یہ لکھنؤ کے باشندے اور مہاراجا بھلی بہادر' نائب شجاع الدولہ کے بھتیے تھے - اردو میں مصحفی کے اور فارسی میں دیوانہ کے شاگرد تھے - وہی دیوانہ جو جرات کے استاد حسرت کے استاد تھے - ان کے دیوان† میں قطعۂ ذیل پایا جاتا ھے جسے کریم الدین نے بھی اپنے تذکرے‡ میں نقل کیا ھے - اس قطعے کے آٹھویں اور دسویں مصرعے سے سال وفات الگ الگ نکلتا ھے :-

جو کہ کرتا ھے فکر شعر و سخن اس زمانے میں وہ غنیمت ھے

---

* قلمی کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور - † قلمی ایشیاٹک سوسائٹی -

‡ تاریخ شعرائے اردو ص ۲۰۵ کریم الدین کے نزدیک بھی ۱۲۲۴ ھ ھی سال وفات ھے —

کہ نہ اگلے سے لوگ باقی ہیں نہ وہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے
اک سخن گو جو تھا قلندر بخش نام جرات سے جس کی شہرت ہے
کر چکا کوچ اس مقام سے حیف آج منزل نشین حسرت ہے
ہے یہ تاریخ اول اور ثانی کہو' جلت نصیب جرات ہے

تیسری شہادت گنگا پرشاد رند کی ہے - یہ بھی لکھنؤ کے باشندے تھے اور بہ قول بعض جرات کے شاگرد - ان کا قطعۂ تاریخ تذکرۂ خیراتی لعل بے جگر * میں منقول ہے - 'جرات ہائے جرات' سے تاریخ نکالی ہے - بے جگر نے بھی قطعات تاریخ لکھے ہیں جو تذکرے میں مندرج ہیں -

ناسخ کو ہم غیر معتبر نہیں سمجھتے' لیکن قانون شہادت کے مسلمہ اصول کی بنا پر تین معتبر گواہوں کے بیان کو ایک معتبر گواہ کے بیان پر ترجیح دینا ضروری ہے —

اس سوال کا جواب کہ ناسخ سے غلطی کہاں ہوئی مشکل ہے - دانستہ غلط بیانی تو خارج از بحث ہے' یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ ناسخ سے حساب میں غلطی ہوئی ہو' اس لیے کہ وہ بہت محتاط آدمی تھے ہمارا قیاس + یہ ہے کہ جرات کا انتقال ۱۲۲۴ ھ کے آخری ایام میں

---

* قلمی انڈیا آفس - + جرات ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۵ ھ سے قبل مر چکے تھے ان کے شاگرد حقیقت نے ایک مثنوی گلزار حقیقت لکھی ہے جو ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۵ ھ کو تمام ہوئی ہے - اس کی تکمیل کے قبل جرات انتقال کر چکے تھے - اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :-

جیتا رہتا اگر مرا استاد سرہ و نا سرہ کا وہ نقاد ص ۱۰۷
ایسا آوازہ کس کا تھا سنتا یعنی یحیی امان جرات کا " "

(بقیہ بر صفحہ ۵۶۰) -

ہوا ہوگا۔ناسخ کو جو اطلاع ملی اس میں ایک دن دو دن کی غلطی تھی' نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ہی بدل گیا —

(سلسلہ از صفحہ ۵۵۹)

نامۂ نامی جب ہوا یہ طے سن تھے پچیس اور بارہ سے ص ۱۰۸
ختم جس روز مثنوی یہ ہوئی گیارھویں تھی ربیع الاول کی " "

یہ مثنوی کرناٹک میں لکھی گئی ہے (ص ۴) اور ظاہر ہے کہ اس زمانے میں وفات کی خبر کرناٹک پہنچنے میں کچھ وقت گزرا ہوگا۔ مثنوی مطبع مصطفائی لکھنؤ میں سنہ ۱۲۶۷ ھ میں طبع ہوئی ہے —

فارسی غزل

از

(جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی ' بی - لٹ

(آکسفورڈ) آی - سی - ایس) -

گزشتہ سے پیوستہ

(۴)

گذشتہ باب میں غزل کے ان نقائص کا ذکر کیا گیا تھا جو اس کی ساخت اور ماھیت کا نتیجہ ھیں - یہاں ان نقائص سے بحث کی جائےگی جو خارجی اسباب سے رونما ہوئے —

غزل کے اوپر ایک بہت اھم اور سنگین اعتراض یہ کیا جاتا ھے کہ اس کا محبوب صنف قوی کا فرد ھے - اس سے اھل مشرق کے مذاق ذھنیت' اخلاق اور کردار کے متعلق طرح طرح کے نتائج نکالے گئے ھیں- چونکہ میری نظر سے کسی مغربی زبان میں کوئی ایسا مضمون نہیں گزرا جس میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہو اس لیے میں نے اپنے انگریزی کے مقالے میں اس سے بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی تھی مگر خوش قسمتی سے ھماری زبان میں اس موضوع پر کافی مواد موجود ھے- اکثر کتابوں میں اس سے بحث کی گئی ھے - مولانا حالی کی

حیات سعدی اور مقدمہ شعر و شاعری ' مولانا شبلی کی شعرالعجم اور مولوی مسعود حسن رضوی کی ہماری شاعری اس سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں لہذا یہاں اس کے متعلق کچھہ مختصراً عرض کردینا کافی ہے —

پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کا چنداں جھگڑا نہیں جہاں تک افعال ' ضمیر اور صفت کا تعلق ہے کوئی چیز اس امر کی ظاہر کرنے والی نہیں ہوتی کہ جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ صنف نازک کا فرد ہے یا صنف مخالف کا - لہذا جب تک کوئی بات کسی مخصوص صنف کی طرف اشارہ نہ کرے ایک شعر کا اطلاق دونوں صنفوں پر یکساں طور سے کیا جاسکتا ہے - ایسے اشعار کی تعداد کم سے کم پچہتر فی صدی ہوگی ' بقیہ پچیس فی صدی میں بہت سے ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب صنف نازک کا فرد ہے مثلاً —

جز پردہ نہ خواہم کہ کسے روئے تو بیند
جز خویش نہ خواہم کہ کسے کوئے تو آید

(نظامی گنجوی)

ایسے اشعار جن میں محبوب کو حور ' پری ' محبوبہ ' و معشوقہ یا لیلیٰ شیریں عذرا کہا گیا ہے اسی زمرے میں شامل ہیں مثلاً —

معشوقہ کہ او چابک و چالاک نہ باشد
آرام دل عاشق غمناک نہ باشد

(حکیم سنائی)

ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں مگر محبوب کے صنف مخالف کی

طرف اشارہ کرنے والے اشعار کی تعداد مقابلۃً زیادہ ہے - ان اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے —

(الف) وہ جو صراحتاً معشوق کو صاف قوی کا فرد ظاہر کرتے ہیں —

(ب) وہ جن سے اشارتاً یہ بات ظاہر ہوتی ہے —

(ب) اخرالذکر کی تعداد اول‌الذکر سے کہیں زیادہ ہے - ان میں محبوب ہر طرف بے تکلف بے پردہ گھومتا پھرتا نظر آتا ہے ' ہر جگہ شمع انجمن ہے اور عاشقوں کی تعداد برساتی پروانوں سے بھی کہیں زیادہ ' سر محفل وہ بے حجابیاں یا در پردہ لگاوٹیں ہوتی ہیں کہ محفل مقتل بن جاتی ہے ' وہ "خانہ بر انداز چمن" ہر طرف گل و ثمر پھیلکتا جاتا ہے مگر اس طرح کہ کسی کو بھی نہیں ملتا اور ہر ایک " کچھ تو ادھر بھی " کی صدا لگایا کرتا ہے - وہ کہیں ساقی ہے ' کہیں مطرب ' کہیں ترک جلگجو ' کہیں محبوب نیک خو ' الغرض سارے عالم کا منظور نظر ہے - اس لیے یا تو شاعر کی نگاہوں میں سارا جہاں تاریک ہے اور ہر شخص رقیب روسیاہ کا مصداق یا پھر اسے سارے جہاں سے محبت ہے اور ہر چیز اس کی ہمراز - اس قسم کے اشعار میں خود کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس سے محبوب کا مذکر ہونا لازمی طور سے ظاہر ہو - چنانچہ اگر ان کا مغربی زبانوں میں ترجمہ کردیا جائے تو کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ آئے گا کہ محبوب صنف نازک کا فرد نہیں ہے - مگر مشرق میں جہاں پردے کی رسم سختی سے رائج ہے (یا کم سے کم تھی) مذکورہ بالا باتوں کا وقوع پذیر ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ محبوب کا مذکر ہونا تسلیم کیا جائے - اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب مذکر ہے —

(الف) ایسے اشعار کی تعداد جن میں محبوب کا مذکر ہونا با لتصریح پایا جائے بہت کم ہے - بمشکل ۵ فی صدی ہوگی - ان اشعار میں عموماً معشوق کی جسمانی تصویر نظر آتی ہے - اس وقت تک کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی جب تک شاعر اس کی نرگس چشم، غنچہ دہن، برگ لب، گل عارض، سیب ذقن، زلف گرہ گیر، * اور دوسرے ایسے اعضاکی تعریف کرتا ہے جو دونوں اصناف میں مشترک ہیں - مشکل کا سامنا اس وقت ہوتا ہے جب شاعر سبزہ و خط کی توصیف شروع کرتا ہے یا محبوب کو غلام و پسر کے القاب سے ملقب کرتا ہے - ایسے اشعار کو پڑھ کے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ شاعر کا محبوب صنف قوی کا فرد ہے - انہی اشعار کی بنا پر لوگوں نے یہ خیال کیا کہ بقیہ اشعار کے محبوب کا بھی یہی حال ہے - یعنے فارسی شاعری کا معشوق ہی مرد ہے —

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں —

(الف) پہلی بات تو فارسی عشقیہ شاعری کی وہ خصوصیت ہے جو خود ہدف ملامت ہے یعنی اس میں شاعر اپنے ذاتی احساسات جذبات خیالات تجربات اور واقعات زندگی کو بیان نہیں کرتا بلکہ خیالی باتوں کا ذکر کیا کرتا ہے - اس کے چند وجوہ گذشتہ باب میں بیان کیے جا چکے ہیں، ان کے علاوہ مشرقی سوسائٹی اور تہذیب بھی اس کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے اور بالخصوص صوفیانہ شاعری کا مذاق - ایران میں کچھہ تو آب و ہوا کچھہ جائے وقوع کچھہ تاریخی واقعات اور کچھہ ایرانیوں کی افتاد طبع کی وجہ سے اس تہذیب و تمدن نے جسے مشرقی کہا جاتا ہے سب سے پہلے ترقی کی اور ایران اس تہذیب کا علمبردار بن گیا -

* پرانے زمانے میں مرد بھی زلف گرہ گیر رکھتے تھے -

شرم و حیا جو اس تہذیب کی اجزاے ترکیبی میں سمجھی جاتی ہے سب سے پہلے ترقی پذیر ہوئی - غالباً جس قوم میں سب سے پہلے پردے کی رسم پیدا ہوئی وہ اسی خاک پاک ایران کے فرزندوں کی تھی - ممکن ہے کہ فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کی عدم موجودگی اسی جذبۂ شرم و حیا کی مرہون منت ہو - ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب ایرانی تہذیب کا چربہ ہے - اس لیے اول الذکر کی مدد سے آخرالذکر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے - ہمارے ہاں مرد عورت کے صنفی تعلقات پر جتنا زور دیا گیا ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں - بہتوں کو اس کا تکلیف دہ احساس ہوگا - حدود جواز کے باہر کسی شریف عورت سے داستان حسن و عشق چھیڑنی اپنے سر بلاے بے درماں مول لینی ہے - اپنی محترمہ سے عشق کا حال معلوم' اور اگر ہو بھی تو اول تو قابل ذکر بات نہیں دوسرے مذموم - اب بیچارہ شاعر جس کی نگاہوں میں دنیا پریخانہ ہے اور جو خواہ مخواہ اس کا دیوانہ' نہ محض دیوانہ بلکہ اظہار دیوانگی کے 'جذبۂ بے اختیار شوق' سے بھی مجبور' کیا کرے اپنے جذبات کو کہاں لے جاے کیسے چھپاے - 'اگر گویم زباں سوزد' ورنہ 'مغزاستخواں' - مجبوراً اپنے پردہ نشین محبوب پرو، الٹا گہرا پردہ ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے عزیز اقارب بھی اسے پہچان نہ سکیں - یہ امر نہ محض تقاضاے تہذیب ہے بلکہ تقاضاے مصلحت بھی - اگر عاشق بدنام کو بالفرض اپنے ننگ و نام کی پروا نہ بھی ہو تو کم سے کم محبوب کے ننگ و نام کی پروا اس وقت تک تو ضرور ہوتی ہے جب تک وہ سچ مچ فرہاد و مجنوں نہ بن جائے - اس پردہ پوشی کا بہترین و موثر ترین طریقہ شاعر کے پاس بقول مولانا روم کے یہ ہے کہ —

خوشتراں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

یہ تو ان شاعروں کا ذکر ہے جو واقعی کسی مخصوص معشوق کے تیر نظر کے گھایل ہوتے ہیں مگر ایسے شاعر بھی (متشاعر نہیں) بکثرت ہیں جو کسی خاص لیلیٰ کے مجنوں نہیں لیکن جن کی چشم مجنوں صفت میں ساری کائنات لیلیٰ ہے - پوچھیے تو کسی سے بھی عشق نہیں دیکھیے تو سب سے ہے - در حقیقت انہیں جذبۂ عشق ہی سے عشق ہوتا ہے - وہ اپنی ایک خیالی دنیا بنائے رہتے ہیں ان کا معشوق ان کی رعنائی خیال کا ممنون احسان ہوتا ہے اور اسے ان کے ارد گرد کی دنیائے واقعات سے چنداں سرو کار نہیں ہوتا - ایسے شعرا کے انداز بیان میں وہ جامہ زیبی ہوتی ہے کہ عشق کے ہر قد موزوں پر راست آئے - لہذا جب شاعر محبوب کو غلام وپسر کہتا ہے تو اس کا مقصد ان الفاظ کے لغوی معنی نہیں ہوتے بلکہ وہ انہیں محض بطور محبوب کے مترادف کے استعمال کرتا ہے - وہ عشق مجرد کا خیال کرتا ہے نہ ان افراد کا جن کے مابین یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے - اسی طرح جب وہ خط کا ذکر کرتا ہے تو اس کی مراد سچ مچ کسی خاص شخص کی بڑھتی ہوئی ڈاڑھی سے نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی چیز سے جو مثل ڈاڑھی کے چہرے کے حسن و زیبائش کا سبب ہو - اس سلسلے میں گب (Gibb) کے حسب ذیل الفاظ کی نقل بیجا نہ ہوگی :-

"The poet rarely deals with external objects exclusively on their own merits. When he sings, as he constantly does, of wine and beauty, of roses and nightingales, it is not to tell of these as they are in themselves. What seems to strike him first and with the greatest force is not the effect which they produce upon his senses but the suggestions they evoke in his mind". (The Poetry of the Ottomans Vol. I. P. 28.).

جو حال گل و بلبل کا ہے وہی غلام، پسر اور خط کا - اس کے علاوہ شاعر عموماً ان الفاظ کو متصوفانہ انداز میں استعمال کرتا ہے - سنائی عطار اور مولانا روم جیسی مقدس ہستیوں کے کلام جن میں یہ الفاظ خاص طور سے پائے جاتے ہیں اس امر کا ثبوت ہیں (یہ الفاظ خصوصاً غلام وپسر فارسی شاعری کے ابتدائی دور میں عموماً نظر آتے ہیں بعد میں ان کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ گذشتہ تین صدیوں میں قریب قریب معدوم ہو جاتا ہے لہذا اس عہد کے اشعار عموماً وہی ہوتے ہیں جن کے معشوق کو ہر شخص اپنے خیال کے مطابق جس صنف کا چاہے تصور کر سکتا ہے) —

شعرا محبوب کی مذکورہ بالا تصویر اکثر اس وجہ سے بھی کھینچتے ہیں کہ ایسی رسم چلی آئی ہے اور یہ باتیں خیالی محبوب کے لازمی صفات میں شمار کی جاتی ہیں جن کا بیان شاعر کے لیے ناگزیر ہے بقول غالب —

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام   چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اس رسمیت کے چند وجوہ بیان کیے جاچکے ہیں - مولانا حالی نے اس نظریہ کو بڑے پر زور طریقے سے حیات سعدی میں پیش کیا ہے، فرماتے ہیں —

"فارسی زبان میں ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت، رند ہو یا صوفی، خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا، بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس

سے معلوم ہوکہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اُس کا معشوق دونوں مرد ہیں ۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت...... مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہوکہ شاعر عورت ہے اور اس کا معشوق مرد - اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کرلیتا ہے - اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا - حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی کی غزلوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رخ لڑکے پر مفتوں ہیں اور ان کے ہندی دہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیب سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطر و بے قرار ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقت واقعی سے کچھہ علاقہ نہیں ہے - جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزہ چکھا نہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بو سونگھی صدہا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں اسی طرح ہزاروں پاکباز اور صاحب عفت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو

امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں " (صفحہ ۲۳۳ - ۲۳۴) —

ایسا کیوں ہے اس کے اسباب کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ایک خاص امر پر غور کی ضرورت ہے - ایرانی ادب میں ڈرامہ اور ناول کا پہلے وجود نہ تھا - اور نثر کا فسانوی ادب قریب قریب نہ ہونے کے برابر تھا سارا ادب شاعری کے زیر نگیں تھا اور شاعری غزل کی مترادف - لہذا وہ حضرات بھی جنہیں فطرت نے ڈرامہ نگاری کی صلاحیت ودیعت کی تھی اپنے جوہر قابل کو غزل ہی کے پیرایہ میں استعمال کرنے پر مجبور ہوے - ڈرامہ نگار کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ ہر کردار کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرے یہ نہ معلوم ہو کہ اس کے کردار " ہز ماسٹرس وائس " کا کام کر رہے ہیں - وہ انہیں جتنا زیادہ زندہ بنا سکے گا اتنا ہی بڑا ڈرامہ نگار سمجھا جائے گا اس کی اس امر میں کامیابی محض اس کی اس صلاحیت کی ممنون احسان ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر حالت میں رکھہ کے ہر شخص کی حالت کا اس کے مخصوص کردار کے مطابق اندازہ کرسکتا ہے - ایک ڈرامہ نگار کی عظمت کا انحصار اسی صلاحیت کی کمی یا زیادتی پر ہوتا ہے - ہمارے بہت سے شعرا بھی اکثر اپنی شاعری میں ڈرامہ نگار کی اس صلاحیت کو کام میں لاتے ہیں - وہ چاہے خود عاشق ہوں یا نہ ہوں یا خود کامیاب عاشق ہوں اور دل ان کا واقعی یہ کہہ رہا ہو کہ —

اے بخت سرکش تنگش بہ برکش   کہ جام زر کش کہ لعل دلخواہ (حافظ)

مگر جب وہ حرمان زدہ عاشق کی کیفیت بیان کرنا چاہیں تو اس کا یہ کہہ کے سچا نقشہ کھینچ دیں کہ —

جاناں چہ گویم شرح فراقت   چشمے و صد نم جانے و صد آہ (حافظ)

اس لیے ان کے کسی شعر کو ان کے ذاتی خیالات و جذبات کا آئینہ دار سمجھنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے کسی ڈرامہ نگار یا ناول نویس کے مختلف کرداروں کے مکالموں کو خود اس کی گفتگو سمجھنا۔ اس طرح عموماً ان کے اشعار میں مولانا حالی کی تحریر مندرجہ بالا کے مطابق مفروضہ انسانوں کی مفروضہ حالتوں کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے عرفی نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اس کی بہت خوب توجیہ کی ہے —

ملکم نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن گر نہ بود بادیگراں ہست

ہماری شاعری کے اس پہلو پر نظر کم گئی ہے اگر یہ بات مدنظر رکھی جائے تو ایک دیوان غزل کے متضاد اشعار کا معمہ حل ہو جائے اور وہ فسانوی ادب کی ایسی کتاب معلوم ہو جس میں مختلف و متضاد کردار اور مواقع مختلف اور متضاد خیالات اور جذبات کے ذمہ دار ہیں اور ان متضاد خیالات و جذبات میں مصنف کے اپنے ذاتی خیالات و جذبات یوں شیر و شکر ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علحدہ کرنا آسان کام نہیں —

یہ سب صحیح ہے لیکن اس قسم کی رسم کا پیدا ہونا ہی قابل اعتراض امر ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کا کسی قدر اور تجزیہ کیا جائے تاکہ اس کے اسباب و علل ٹھیک سے سمجھ میں آئیں —

مولانا حالی نے اس کی ایک بڑی لطیف توجیہ کتاب مذکورہ بالا میں کی ہے - فرماتے ہیں —

" فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث

کا تفرقہ نہیں ہے اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں - پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ فارسی میں عاشق و معشوق دونوں مرد فرض کیے جاتے ہیں " (صفحہ ۱۳۹) مولانا کی اس رائے کی ابن رشیق کی کتاب العمدہ کے ان الفاظ سے پرزور تائید ہوتی ہے کہ "عربوں کی رسم یہ ہے کہ شاعر (مرد) عاشق ہوتا ہے برعکس اس کے عجمیوں میں عورت مرد کی طالب اور عاشق ہوتی ہے * " یہ توجیہہ بعید از قیاس نہیں - لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ فارسی شاعری کے مرد معشوق کی ابتدا یوں ہوئی پھر بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس شاعری کے ابتدائی دور میں صورت حالات کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ یہ رسمی مرد معشوق بڑی حد تک اصلی بن گیا تھا - مولانا شبلی نے ان حالات کو بالتفصیل شعرالعجم میں بیان کیا ہے † - مولانا کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عربوں کو یہ بری عادت پہلے تو مستورات کی عدم موجودگی کی وجہ سے پڑی پھر ترک غلاموں کے حسن نے اس کا چسکا ڈال دیا —

اگرچہ ترکان شیرازی اس عادت قبیح کے پھیلانے میں سب سے پیش

* مولانا حالی نے بکثرت کتاب العمدۃ کا حوالہ دیا ہے مگر تعجب ہے کہ ان کی نظر اس اقتباس پر نہیں گئی کیونکہ وہ اس کا کوئی حوالہ نہیں دیتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس توجیہہ کو وہ طبعزاد ظاہر کرنا چاہتے ہیں -

† ملاحظہ ہو شعرالعجم حصہ چہارم صفحہ ۱۸۴ - ۱۷۹ -

پیش تھے تاہم وہ تنہا اس کے ذمہ دار نہیں - ایران کی جائے وقوع ' اس کی تاریخی اہمیت اور اُس کے تمدن نے اُسے مرجع حسینان جہاں بنا دیا تھا ' اُسی نے حافظ سے یہ شعر کہلایا —

شہرے پر از کرشمہ و خوباں زشش جہت
چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

مگر ان ترکوں مغبچوں اور برہمن زادوں کے حسن کی تعریف میں نغمہ سنجی کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ شاعر کی نیت زبردستی خراب ہے بلکہ واقعہ اس کے برعکس ہے - مرد معشوق خالص بے لوث اور غیر نفسانی محبت کے لیے صنف نازک کے معشوق سے زیادہ موزوں خیال کیے جاتے تھے - وجہ ظاہر ہے - اول تو عورتیں پردے میں تھیں' دوسرے ان سے عشق میں نفس پرستی کا شائبہ ضرور رہتا تھا اس لیے وہ نامناسب بھی تھا اور اخلاق سوز بھی - حسین لڑکے البتہ ہر جگہ بکثرت پائے جاتے تھے ان سے عشق میں نفس امارہ کا اتنا دخل نہ تھا. کم سے کم خیال یہی کیا جاتا تھا اور اس سے جذبۂ عشق کی پاکی و برتری ظاہر ہوتی تھی لہذا عشق مجازی کی مشق کے لیے صوفیان باصفا نے ان ہی نوخطوں کو تجویز کیا - ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ پیر نے مرید سے اس بات کی تاکید کی کہ پہلے جا کے کسی سے عشق کرے تاکہ اس کے دل میں اتنا سوز و گداز پیدا ہو جائے کہ گرمئی عشق حقیقی کی تاب لاسکے - پھر کہا تھا —

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

مگر یہ پیر و مرید عموماً شیخ سعدی کے اس شعر کے مصداق ہوتے تھے کہ -

ما را نظر بخیر است از حسن سادہ رویاں
هر کو بہ شر کند میل او هم بشر نہ باشد

اس میں شک نہیں کہ اس پاک محبت کی تتی کی آڑ میں اکثر بزرگ دل کھول کر شکار کھیلتے تھے مگر ایسے بزرگوں کی کسی قوم و ملک میں بھی کمی نہیں۔ خدا کے یہ مقبول بندے هر ملک و قوم میں برابر پیدا هوتے رهے هیں اور شاید پیدا هوتے رهیں - ایرانیوں هی نے کیا قصور کیا هے —

بهر حال یہ اسباب تھے جن کی بنا پر فارسی شاعری کا محبوب ابتدائی دور میں مرد قرار پایا - مگر سوائے ان بدمذاقوں کے جو هر ملک و قوم میں پائے جاتے هیں کوئی شخص بھی معشوق کو جیتا جاگتا مرد تصور نہیں کرتا - عموماً وہ عشق مجرد کے اظہار کا آلہ خیال کیا جاتا هے تاهم ان لوگوں کے سامنے جو محبوب کی ایک تصویر پیش نظر رکھنا چاهتے هیں وہ صنف نازک کا ایک پیکر جمیل بن کر آتا هے —

خود یہ امر کہ ایرانیوں نے اپنی عشقیہ نظم کو غزل کے نام سے موسوم کیا جس کے لغوی معنی هیں " عورتوں سے باتیں کرنیں اور ان کے عشق کا ذکر کرنا " اصل صورت حالات کو ظاهر کرتا هے —

(۲) - مولانا حالی غزل کے ایک اور نقص کو یوں بیان کرتے هیں —

" اس بادہ هوش ربا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مترتب نہ هوے - شعر کو خواہ وہ عاشقانہ هو خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ هوتا هے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع هو جاتے هیں اور مجالس و محافل میں پڑھے اور گائے جاتے هیں

وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاح شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کی تاثیر جلد اور پائدار ہوتی ہے - شیخ سعدی خواجہ حافظ امیر خسرو ...... وغیرہ کی غزلیں ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصے میں پڑھی اور گائی جاتی ہیں - اگرچہ ان بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف .. پرمبنی ہے لیکن اس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں - جس طرح اس سے ایک صوفیء خدا پرست روحانی کیفیت اٹھاتا ہے اُسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اس کے سننے اور پڑھنے سے برانگیختہ ہوتے ہیں - سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں - وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے - عشق حقیقی کے ساتھ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی و کامجوی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے - مال و دولت علم و ہنر نماز و روزہ حج و زکواۃ زھد و تقویٰ غرض کہ کسی شے کو نظر بازی و شاھد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی - وہ عقل و تدبیر مآل اندیشی تمکین و وقار ننگ و ناموس جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی رہے اور آوارگی رسوائی بدنامی بدمستی بے سرو سامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے

بہتر ظاہر کرتی ہے - دولت دنیا پر لات مارنا عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا ...... کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا جو کچھہ ہاتھہ لگے اس کو فوراً رائگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں - ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو نوجوانوں اور بے فکروں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے ان کو لے اُڑتی ہے اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کردیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے - کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ و مشائخ کرام ہیں ...... جن کا شعر شعریت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشین ہوتے ہیں ...... جب ہم مسلمانوں کے اخلاق و معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو اکثر ان صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اس مجموعہ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے " (حیات سعدی ۱۷۸ - ۱۸۰) —

یہ در حقیقت غزل کی خرابی نہیں ہے بلکہ غزل خوانوں کی - شاعری بجلی کی طرح ایک زبردست قوت ہے - اس سے روح کی جلا بھی کی جاسکتی ہے اور اس کا کام بھی تمام کیا جاسکتا ہے - استعمال کرنے والے پراسکا انحصار ہے - جب یہ ہے تو بقول سعدی " چشمۂ آفتاب را چہ گناہ " —

(۳) غزل پر ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی تشبیہیں تمثیلیں استعارے اور تلمیحیں سب محدود ہیں وہی گل و بلبل' وہی شمع وپروانہ' وہی سرو شمشاد' وہی نرگس و نسترن وغیرہ وغیرہ - گزشتہ باب میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ خود غزل کی ساخت اس امر کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے - ہماری زبان کی بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر کافی مواد ملتا ہے اس لیے یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ —

سمجھتا نہیں کوئی طرز کلام بھڑکتا ہے وہ سن کے بلبل کا نام

(۴) غزل پر ایک اور الزام یہ عاید کیا جاتا ہے کہ اس میں زیادہ تر رنج و غم حزن و ملال کے مضامین پاے جاتے عالم کی بے ثباتی' قسمت کی ناسازگاری چرخ کج رفتار کے مظالم' انسان کی بے بسی' محبوب کی بے اعتنائی' غم ہجراں' رقیب روسیاہ کی خوش بختی' عاشق صادق کی بدبختی وغیرہ وغیرہ کا عموماً رونا رویا جاتا ہے - فرط انبساط کے نعرہاے مستانہ شاذ ہیں - اس کے اسباب کچھ تو سیاسی اور تاریخی ہیں اور کچھ یہ کہ شعرا شیلی (Shelley) کے الفاظ میں اس راز سے واقف تھے کہ —

"Our sweetest songs are those
That tell of saddest thought."

اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کو دنیا کی سب سے زیادہ غمگین اور شیریں بنا دیا —

(باب سویم)

ابھی تک غزل کے معائب کا ذکر رہا اب "ہنرش نیز بگو" -

غزل کے محاسن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے -

(۱) غزل کے محاسن بحیثیت صنف سخن کے اور (۲) غزل کے داخلی محاسن -

(۱) - پہلی چیز جو قابل لحاظ ہے وہ غزل کی ساخت ہے - پہلے شعر یعنی مطلع کے دونوں مصرعوں کے اخیر میں ردیف و قافیہ کی موجودگی اور پھر ان کی ہر شعر کے اخیر میں تکرار بہت بھلی معلوم ہوتی ہے - ایک مستقل ردیف کے ساتھ بدلتے ہوئے قافیوں کی آمیزش نظم میں ایک خاص موسیقیت پیدا کردیتی ہے - یہ آمیزش بہت سے ایسے لطیف خیالات اور معانی کے پہلو شاعر کو سجھاتی ہے جو غالباً یوں نہ سوجھتے - پرانے مضامین میں ترقی کے امکانات کی تلاش انہیں نئے نئے انداز سے بیان کرنا یا نئے مضامین پیدا کرنا شاعر کے لیے آسان ہو جاتا ہے - یہی وجہ کہ بقول گب (Gibb) —

" Persian poetry ... ... shows extraordinary fertility of imagination and not infrequently almost super-gracefulness both of thought and expression ,, (Poetry of the Ottomans Vol, I, P. 29.)

باستثنائے اردو کے غالباً دنیا کی کسی زبان میں ایک خیال کے گونا گوں لطیف و نازک پہلو کا بیان اس تفصیل کے ساتھ نہیں پایا جاتا جتنا کہ فارسی زبان میں - خزانۂ عامرہ کے یہ الفاظ بہت صحیح ہیں -

" ردیف مخصوص زبان فارسی است کہ ابیات را طرفہ آرائش می دهد ... وبسبب ردیف تلوع اشعار فارسی از دائرۂ انحصار بیرونست " —

ردیف و قافیہ کی آمیزش شاعر کے جذبات خفتہ کو اس طرح گدگداتی ہے کہ وہ انگڑائیاں لینے لگتے ہیں - ایک شاعر کی زندگی میں ایسے خوش قسمت لمحات کم ہی ہوتے ہیں کہ اس کے سامنے کوئی

محرک جذبات چیز وقوع پذیر ہوئی اور فوراً "بادل سے چلے آتے ہیں مضمون مرے آگے" کی کیفیت پیدا ہوگئی جب شاعر کے جذبات بہت زیادہ برانگیختہ ہوجاتے ہیں تو عموماً اس کی قوت ناطقہ جواب دے جاتی ہے - انگریزی کی ایک مثل (When heart is full words are few) کسی محبوب کی عارضی یا دائمی جدائی ' کوئی دل ہلا دینے والا حادثہ قدرت کے ہوشربا مناظر ' مستانہ گھٹاؤں کی گرج ' بجلی کی تڑپ ' یکا یک "دست برسینہ نظر بر لب بام" بن جانا اور اسی قسم کے واقعات سے جب شاعر دو چار ہوتا ہے تو وہ فوراً شعر کہنے نہیں بیٹھ جاتا ' بلکہ عموماً مبہوت و مسحور ہو جاتا ہے اور دم بخود - مگر ان کے مرتعش نغمے اس کے ساز ہستی میں جذب ہو جاتے ہیں - ردیف و قافیہ وہ مضراب ہے جس سے شاعر اس ساز کو بجاتا ہے اور وہ سب نغمے بیتاب ہو کے تاروں سے نکلنے لگتے ہیں - بقول مرزا غالب "زخمہ بر تار رگ جاں می زنم" - یہی وہ نغمہائے منظوم ہیں جنہیں الہامات کہا جاتا ہے اور جو شاعر کو تلمیذالرحمٰن بنا دیتے ہیں - یہیں پر یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا یہ عام خیال حقیقت پر مبنی نہیں کہ شاعر کو خیالات و جذبات ردیف و قافیہ سجھاتے ہیں اور متشاعر کو ردیف و قافیہ مضامین - اگر ایسا ہوتا تو نہ آج دیوان حافظ کا وجود ہوتا نہ کلیات سعدی کا نہ کسی ایسی نظم کا جس میں ردیف خواہ قافیے کی پابندی لازمی خیال کی جاتی ہے - حافظ شیرازی اور حافظ حلوای دونوں ردیف و قافیے کی مدد سے شعر کہتے ہیں ایک لسان الغیب بن جاتا ہے دوسرا سارق و تک بند -

Mathew Arnold نے شاعری کی تعریف "Emotions recollected in tranquillity" بہت صحیح کی ہے —

غزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک مختصر چیز ہے اس لیے اسے پڑھکے قصیدہ کی طرح ردیف و قافیے کی قریب قریب لا متناہی تکرار سے جی نہیں اکتاتا - پھر ہر شعر بذاتہ مکمل ہوتا ہے اور ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے - اس کا لازمی نتیجہ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے یہ ہوتا ہے کہ شاعر کو چست و معنی خیز ترکیبیں و بندشیں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور انداز بیان میں اکثر کنایہ سے کام لینا پڑتا ہے جو یوں بھی لطیف چیز ہے - چونکہ ہر شعر کی انفرادی حیثیت ہوتی ہے - اس لیے شاعر اس کے ہر ٹکڑے کو علحدہ علحدہ سوچ سکتا ہے اور اس کی تکمیل اس باریک بینی اور تفصیل کے ساتھہ کرسکتا ہے جو ایک طویل اور مسلسل نظم میں بمشکل ممکن ہے - غزل نے جس قدر فارسی ادب کو اعلیٰ درجے کے اشعار و تراکیب سے مالا مال کیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں اور فارسی ادب اس امر کے لیے اس کا جس قدر ممنون احسان ہو کم ہے —

موضوع غزل کو عشق اور اس کے متعلقہ مضامین تک محدود کردینے کی وجہ سے چند مفید نتائج بھی مترتب ہوے - ایک تو یہ کہ اس " ہر دلعزیز " جذبے اور اس کی گونا گوں نیرنگیوں کا بیان اس تفصیل و تکمیل کے ساتھہ کسی ایسے ادب میں نہیں پایا جاتا جس کے اصناف سخن میں غزل شامل نہیں - دوسرے بہت سے اخلاقی فلسفیانہ اور مذہبی مضامین جنھیں حدود غزل میں لانے کے لیے شاعر لباس حسن و عشق میں جلوہ گر کرتا ہے وہ اس نئے لباس میں اپنی اصلی حالت سے کہیں زیادہ دلاویز اور موثر بن جاتے ہیں - فارسی زبان اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے لکھنے کی ضرورت نہیں —

غزل کی زبان کے لیے جیسا کہ لکھا جاچکا ہے خاص شیرینی نزاکت

و لطافت کی ضرورت ہے - اس لیے شاعر کی توجہ ہمیشہ اسی طرف رہتی ہے اس امر نے فارسی کو بقول Sir W. Jones کے —

— "The softest and one of the richest in the world" —

بنا دیا اس میں شک نہیں کہ فارسی زبان میں خود نرم و شیریں ہونے کی صلاحیت تھی لیکن غزل نے شعرا کی توجہ خاص طور سے اس طرف مبذول کر کے اس صلاحیت کو پوری طرح اجاگر کر دیا - یہ امر قریب قریب یقینی ہے کہ اگر غزل کا وجود نہ ہوتا تو فارسی زبان کی موجودہ لطافت و شیرینی میں بہت کافی کمی ہوتی —

غزل کی ساخت کے چلد اور محاسن کا ذکر اس کی ہر دلعزیزی کے اسباب کے سلسلے میں کیا جائے گا —

(۲) غزل کے داخلی محاسن ہمارے مقالے کے حصہ دوم میں پوری طرح واضح ہوں گے یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ غزل فارسی ادب کے بہترین جواہر ریزوں کا خزانہ ہے اس کے اشعار عموماً طویل نظمیں ہوتی ہیں جن کے دریا کو شاعر نے دو مصرعوں کے کوزوں میں بھر دیا ہے اور اس میں حیات انسانی کا ہر پہلو ارفع خواہ ادنیٰ نظر آتا ہے —

باب چہارم

(غزل کی ہر دلعزیزی کے اسباب*)

غزل کی ہر دلعزیزی کے بہت سے اسباب خود اس کی ساخت اور خمیر میں مضمر ہیں —

(الف)۔ اس کے خمیر کا جزو اعظم عشق ہے - کون ہے جو اس بادۂ سرخوش کو کم سے کم چکھنا نہیں چاہتا - لہذا جتنا غزل کہنے اور

* نوٹ نمبر ۱ - اس کے تاریخی اسباب مقالے کے دوسرے حصے میں بیان کیے جائیں گے -

پڑھنے میں لطف آتا ہے اتنا کسی اور صنف سخن میں نہیں آتا - پھر بقول مولانا شبلی کے "یہاں (ایران میں) مدت دراز کے تمدن نے انسانی جذبات کو نہایت لطیف اور زود اشتعال بنادیا تھا اس لیے ذراسی تحریک سے یہ شعلہ بھڑک اُٹھتا تھا اور دل و دماغ کو آتش فشاں بنادیتا تھا - (شعرالعجم حصہ پنجم صفحہ ۲۳) —

تصوف کی ترویج نے اس ذوق عشق کی آگ کو اور بھڑکایا- ہم بیان کرچکے ہیں کہ صوفیان باصفا نے عشق مجازی کو بام عشق حقیقی کا زینہ قرار دیا اور اس امر پر خاص طور سے زور دیا ' ان کے تقدس نے اس دل پذیر حکم پر مہر تبریک ثبت کی اور ہر شخص کو ' درسر ہوس ساقی در دست شراب اول ' کا مصداق بنادیا عشق و محبت کے دار دورے کے ساتھہ ساتھہ غزل کا داردورہ لازم تھا —

(ب) غزل کے اشعار کی دلکشی ان کی انفرادی حیثیت ' اختصار اور جامعیت بھی اس کی ہر دلعزیزی کا بہت بڑا سبب ہیں ' غزل کے اشعار کو یاد کرنا جتنا آسان ہے اتنا کسی اور صنف سخن کے اشعار کو نہیں ' قطعہ و رباعی وغیرہ کو عموماً پورا پورا یاد کرنا پڑتا ہے غزل کا ایک شعر یاد کرنا کافی ہے - غزل کے اشعار اپنی نوعیت کی وجہ سے ہر موقع محل پر جس قدر چست بیٹھتے ہیں اتنے کسی اور صنف سخن کے نہیں - یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں جو زبان زد خلق ہیں تقریباً نوے فی صدی غزل کے اشعار ہیں- مشرق میں مناسب موقع شعر پڑھ دینا ایک بڑی صفت سمجھی جاتی ہے - ایسے واقعات بکثرت منقول ہیں کہ اس صفت نے لوگوں کی نہ محض جانیں بچائی ہیں بلکہ ان کے منہہ کو زروجواہر سے بھر دیا ہے اس لیے بھی غزل گوئی و غزل خوانی

ضروری چیز سمجھی جاتی تھی —

(ج) اہل مشرق کو کنایہ خاص طور سے مرغوب ہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کسی صنف سخن کے اشعار کے انداز بیان میں کنایہ کا استعمال اس قدر نہیں ہوتا جس قدر کہ غزل کے اشعار میں —

(د) غزل کے اشعار کا تنوع بھی اس کی ہردلعزیزی کے بڑے اسباب میں سے ہے - عموماً ایک غزل میں جتنے مختلف اشعار ہوتے ہیں اتنے ہی مختلف مضامین بھی - یہ اہل مغرب کے نزدیک نقص ہو تو ہو لیکن اہل مشرق کو اس کی یہی ادا بھاتی ہے - پڑھنے والا ایک شعر کو جتنی دیر چاہے پڑھ کے لطف اٹھائے سلسلۂ خیالات کے ٹوٹنے کا کوئی ڈر نہیں کیونکہ وہ سرے سے غائب ہے - یہ بات کسی اور صنف سخن میں ممکن نہیں —

چونکہ ہر شعر کا مضمون الگ ہوتا ہے اس لیے پڑھنے والے کا جی نہیں اکتاتا بلکہ یہ احساس کہ دیکھیں آگے کے شعر میں کیا مضمون ہے اس کے شوق کو اکسایا کرتا ہے - پڑھنے والا جس شعر کو جی چاہے پڑھے یا چھوڑ جائے کوئی ہرج نہیں - جہاں سے جی چاہے دیوان غزل کھول کے پڑھنا شروع کردے اور جہاں جی چاہے بند کردے - اس مسلسل توجہ اور طویل وقت کی غزل کے پڑھنے کے لیے ضرورت نہیں جس کی مثنوی یا قصیدے کے لیے ہے —

(ر) مختصر اور مفرد خیالات کے اظہار کے لیے بھی غزل کے اشعار سے زیادہ موزوں کوئی اور چیز نہیں اور چونکہ اسی قسم کے خیالات زیادہ تر سوجھتے ہیں اس لیے غزل کی ضرورت بھی مقابلتاً زیادہ ہوتی ہے —

(س) مسلسل غزل اور قطعه بند اشعار نے تنگنائے غزل میں کافی وسعت پیدا کردی تھی اور طویل واقعات کے علاوہ ہر چیز اس میں نظم کی جاسکتی تھی- غزل کے اختصار کی وجه سے دیوان غزل کا مطالعه بار خاطر نہیں ہوتا- ردیف و قافیه و بحر کا جلد جلد بدلنا خاص لطف رکھتا ہے —

(ش) غزل کہنے کی سہولت بھی اس کی ہردلعزیزی کا بہت بڑا سبب ہے - ہر وہ شخص جو طبع موزوں رکھتا ہے به آسانی غزلوں کا انبار لگا سکتا ہے اور بہت کم وقت میں- ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں که شاعر صاحب بیت الخلا سے ایک کافی لمبی چوڑی غزل تصنیف کیے ہوئے نکل آئے - وہ مستقل اور مسلسل توجه و کوشش جو ایک طویل و مسلسل نظم کی تصانیف کے لیے ضروری ہے اس کی غزل کے لیے ضرورت نہیں —

(ص) اگر غزل کہنے کی سہولت اسے تک بندوں میں ہردلعزیز بناتی ہے تو اس کی برعکس وجه بلند حوصله شاعروں میں اس کی مقبولیت کا سبب ہے - ہم یه دیکھه چکے ہیں که اچھی غزل کہنا کس قدر دشوار ہے اور کہاں تک غزل کے اشعار کی انفرادی حیثیت بلند ہمت شاعروں کو مرصع سازی میں اپنا کمال دکھانے کا موقع دیتی ہے - جزئیات کی تکمیل کا شوق مشرقی دماغ کا خاصه ہے - غزل میں اس شوق کو پورا کرنے کی جتنی گنجائش ہے اتنی کسی اور صنف سخن میں نہیں —

(ض) ردیف و قافیه کی موجودگی کو بھی غزل کو ہردلعزیز بنانے میں بڑا دخل ہے - اس نے شاعروں کے لیے آپس میں زور قلم آزمانا

آسان بنادیا- بحرو ردیف وقافیہ مقرر ہوتا ہے - بحر و ردیف تو بدلتی نہیں ہم قافیہ الفاظ صرف بدلتے رہتے ہیں - اس لیے مقابلے اور مسابقے کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور سارا زور طبع ایک قافیہ کو بہتر سے بہتر طریقے سے استعمال کرنے میں صرف کیا جا سکتا ہے - عموماً ایک شاعر کی عظمت کا اسی امر سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے کس قافیہ کو کتنے عمدہ طریقے سے استعمال کیا ہے اس بات نے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس کی ہردلعزیزی محتاج بیان نہیں ' نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد مشق غزل گوئی فن شاعری کی تربیت کے لیے لازمی قرار پاگئی - اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ جب تک شاعر غزل کہنے میں مشاق نہ ہو جائے کسی اور صنف سخن کو اچھی طرح نہیں نباہ سکتا اور جو غزل کہہ سکتا ہے وہ سب کچھہ کہہ سکتا ہے بقول ہلالی —

آں کہ نظم غزل تو اند گفت   مثنوی راچو در تواند سفت

(ط) ردیف و قافیہ اور بحر کے موسیقی اثر اور اپنے موضوع کی دلاویزی کی وجہ سے غزل گانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں قرار پائی اور ہر محفل میں چاہے وہ رقص و سرود کی ہو چاہے سماع کی اسی کے اشعار زیادہ تر گائے جانے لگے - اس امر نے بھی اس کے دائرۂ مقبولیت کو بہت وسیع کیا —

(ظ) - باوجودان سب صفات کےغزل آج غزل نہ ہوتی اگر صوفیائے کرام نے اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کے لیے اسے انتخاب نہ کیا ہوتا- درحقیقت غزل کے مندرجۂ بالا صفات اسی وجہ سے نمایاں ہوئے اس انتخاب کے بہت سے اسباب تھے - اول تو غزل اور تصوف دونوں کا

موضوع ایک تھا یعنی عشق - صوفیوں کا عشق حقیقی عشق مجازی کی زبان میں آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے - اس بھیس میں وہ زیادہ دلاویز بھی بن جاتا تھا اور لوگوں کے دلوں میں چپکے چپکے گھر بھی کرتا جاتا تھا اگر صوفیانہ خیالات اپنی اصلی آب و تاب میں جلوہ پیرا ہو کے نگاہ عقل و ہوش کو خیرہ کرتے تو وہ اتنے زیادہ مقبول عام نہ ہوسکتےتھے جتنے کہ اس صورت میں ہوئے - پھر یہ بات بھی تھی کہ علمائے ذوالاحترام کے خطرناک حملوں سے محفوظ رہنے کا یہ عمدہ طریقہ تھا - غزل جیسا کہ ابھی ذکر کیا جاچکا ہے محفل سماع میں گائے جانے کے لیے بھی سب سے زیادہ موزوں تھی اور حلقۂ صوفیاں میں تربیت روح و تذکیۂ نفس کے لیے اس محفل کا انعقاد ضروری سمجھا جاتا تھا - یہ چند اسباب تھے جن کی بنا پر صوفیان کرام نے غزل گوئی اختیار کی - ان حضرات صوفیہ میں چند بلند ترین فطری شاعر تھے - عشق حقیقی کی دھکتی ہوئی آگ نے انہیں شعلہ افشاں بنا دیا تھا - ان کی تصانیف میں وہ خلوص جوش زور اور سرمستی تھی جو دوسرے شاعروں کے کلام میں نہ پائی جاتی تھی لہذا یہ نامکن تھا کہ ان کا کلام مقبول عام نہ ہوجاتا - ان کے تقدس اور مرتبہ کا بھی ان کے کلام پر اثر پڑنا لازمی تھا چنانچہ بہت جلد ان کا کلام صوفیوں کے لیے کتاب مقدس کا کام دینے لگا - ہر وہ شخص جسے تصوف سے ذوق تھا (اور ایسے اشخاص کی تعداد بہ کثرت تھی کیونکہ تصوف سے دلچسپی کا اظہار فیشن بن گیا تھا) ان غزلوں کو پڑھنا اور اگر ممکن ہو تو کچھہ خود بھی اسی انداز میں کہنا اپنا فرض سمجھتا تھا ' اس طرح تصوف کی روز افزوں ترویج (جو کچھہ تو انہیں غزلوں کی وجہ سے تھی اور کچھہ تاریخی اور تمدنی اسباب سے) غزل کے دائرۂ مقبولیت کو روز

بروز وسیع کرتی گئی —

(ع) - حضرات صوفیہ بلند پایہ فلسفی اور معلم اخلاق بھی تھے اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں کو فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین سے بھر دیا - غیر صوفی شاعروں نے بھی اس کی تقلید کی ' کچھہ تو اس وجہ سے کہ انھیں صوفی شعرا کی نقل منظور تھی اور کچھہ اس وجہ سے کہ شاعر کے فرائض میں درس اخلاق بھی سمجھا جاتا تھا - اس کے لیے غزل کے مفرد ' آسانی سے یاد ہوجانے والے اور روز افزوں ہردلعزیز اشعار سے زیادہ اور کون چیز موزوں تھی - اس کا نتیجہ جیسا ہم بیان کرچکے ہیں یہ ہوا کہ غزل چہار مقالہ کی اس عبارت کا مصداق بن گئی کہ —

" چنانکہ شعر در ہر علمے بکار ہمی شود
ہر علمے در شعر بکار ہمی شود "

یہاں تک کہ ممدوح کی تعریف میں قصیدہ خوانی بھی اسی کے ذریعہ سے ہونے لگی - لہذا لوگوں کو بالعموم کسی اور صنف سخن کی ضرورت باقی نہ رہی - شعرا علاوہ مندرجہ بالا اسباب کے جملہ " سخنہاے گفتنی " غزل ہی کے پیرایے میں اس لیے بیان کرتے تھے کہ لوگ عموماً غزل ہی پڑھتے تھے اور لوگ عموماً غزل علاوہ اور اسباب کے اس لیے بھی پڑھتے تھے کہ ہر چیز اس میں پائی جاتی تھی —

ان سب چیزوں نے مل کے غزل کو شاعری کا قریب قریب مترادف بنا دیا اور مذاق شعر گوئی کو اتنا عام کردیا کہ ہر کس و ناکس اس کا دلدادہ نظر آنے لگا - شاعر ہونا یا مذاق شعر و سخن رکھنا طغرۂ امتیاز سمجھا جانے لگا - جسے دیکھئے لہو لگا کے شہیدان سخن میں داخل ہونے پر تیار ہے چاہے اس کے لیے اسے شعر کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے -

اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ فارسی شاعری دنیا کے لطیف ترین ادب میں شمار کیے جانے کے لائق ہوگئی اور دوسری طرف بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوئیں جن کا ذکر کیا جاچکا ہے - یہاں ہم ایک خرابی کا اور ذکر کرتے ہیں جو اس ہردلعزیزی کا براہ راست نتیجہ تھی یعنی اس نے اوسط درجہ کے عمدہ ادب کی تخلیق کو سخت نقصان پہنچایا - ہم بیان کرچکے ہیں کہ اچھی غزل کہنا اچھی نظم کہنے سے بہت زیادہ مشکل ہے - اوسط درجہ کے شعرا جو یوں اچھی نظم کہہ لیتے یا اوسط درجہ کے عمدہ ادب کی کسی دوسری صورت میں تخلیق کرسکتے فنافی الغزل ہوکے رہ گئے ایسے اصناف سخن جن میں تسلسل خیال کی ضرورت ہے وہ کبھی اتنے مصنوعی اور رسمی نہیں ہوسکتے تھے جتنی کہ متاخرین کی غزلیں بن گئیں پھر ایک مسلسل نظم کہنا معمولی غزل کہنے سے مشکل ہے - اس کے علاوہ وہ مستقل توجہ اور کوشش جو ایک نظم کی تصنیف کے لیے ضروری ہے ان متشاعروں کو شعر گوی سے باز رکھتی جنھیں غزل گوئی کی آسانی نے "پانچویں سواروں" میں شامل کردیا - لہذا اگر غزل اتنی ہردلعزیز نہ ہوگئی ہوتی تو فارسی ادب میں غالباً اب سے زیادہ تنوع ہوتا اور اتنا رطب و یابس بھی نہ ہوتا جتنا کہ اب ہے —

—— ‡*‡ ——

سندھ کے اردو شاعر

از

جناب افسر صدیقی امروھی صاحب

(یہ مضمون افسر صدیقی صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اردو اجلاس میں پڑھا تھا - اڈیٹر)

حضرات !

جو مضمون میں اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کررھا ھوں وہ دراصل انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کی تحریک جائزہ زبان اُردو کی صدائے بازگشت ھے اور غالباً کئی سال کے بعد شرمندۂ تکمیل ھوئی ھے مجھے اگرچہ اپنے زمانۂ ورود کراچی ھی سے سندھ میں آغاز و ارتقائے اُردو کی بابت تحقیق کا خیال پیدا ھو چلا تھا لیکن اس خیال کو عملی صورت میں لانے والی چیز وہ استفسارات ھوئے جو انجمن مذکورہ نے مختلف حصص ملک کے ھمدردان اردو کے نام روانہ کیے تھے —

اولاً شاید سنہ ۱۹۲۸ ع میں مجھے سندھ کے دو قدیم اُردو شاعروں کا پتہ چلا تھا جن میں سے ایک بارھویں صدی کے وسط میں گزرے ھیں اور دوسرے تیرھویں صدی کے آغاز میں لیکن جب جلون تحقیق و تفتیش نے مقالات الشعرائے 'قانع' کے حصول میں کامیاب کیا تو معلوم ھوا کہ

سندھ کا علاقہ اس قدر فصل و بعد کے باوجود تقریباً اسی زمانے میں اردو کی طرف متوجہ ہوچکا تھا جو اس قومی و ملکی زبان کے آغاز کا شرف رکھتا ھے اور یہ زبان اُردو کی خدا داد شیرینی و موزونیت کا بہت بڑا ثبوت ھے —

تضیع اوقات تو ہوگی لیکن مجھے اجازت دیجیئے کہ میں 'قانع' اور ان کے تذکرۂ شعرا کا مجمل سا ذکر بھی کرتا چلوں - میر علی شیر ساکن ٹھٹھہ جو قانع کے نام سے مصنفین میں ممتاز ھیں سندھ کے ان افراد میں سے ھیں جن کے کمالات علمی بہت زیادہ توجہ طلب ھیں- 'قانع' مرحوم نے اپنے بلند پایہ ذخیرۂ نظم کے علاوہ دو کتابیں ایسی یادگار چھوڑی ھیں جو ان کی حیات جاوید کے لیے ضامن ھیں ایک تحفۃالکرام جو بمبئی سے شائع ہوچکی ھے اور دوسری مقالات الشعرا' جس سے اردو داں طبقہ ابھی تک روشناس نہیں- مقالات الشعرا' میں تقریباً سات سو ان فارسی گو شعرا کا تذکرہ ھے جو سندھ سے تعلق رکھتے ھیں- ان میں کچھہ تو ایسے ھیں جو ھندوستان سے ایران جاتے ہوئے یا ایران سے ھندوستان آتے ہوئے کچھہ مدت سندھ میں مقیم رھے کچھہ ایسے ھیں جو حکومت وقت کی طرف سے سندھ کے مختلف عہدوں پر تعینات ہوئے اور ایک خاص تعداد ایسے شعرا کی ھے جنھوں نے سندھ میں تعلیم و تربیت حاصل کرکے یہیں اپنی زندگی گزاری —

مقالات الشعرا کو مصنف نے سنہ ۱۱۶۸ ھ میں لکھنا شروع کیا اور پانچ برس کی مدت میں یہ تذکرہ تکمیل کو پہنچا - مجھے جو نسخہ بالکل اتفاقیہ طور پر دیکھنے کے لیے دستیاب ہوا وہ مصنف کا اصلی مسودہ تھا جس میں جا بجا حذف و اضافہ بھی کیا گیا تھا نیز ہر حرف

کے آخر میں کچھہ جگہہ چھوڑ دی گئی تھی جس میں بعد میں اضافہ کرنا مقصود تھا - معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دوسری مصروفیات کے باعث یہ تمنا پوری کرنے کا موقع نہ ملا —

مقالات دراصل فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن ان میں جو حضرات اردو بھی کہتے تھے ان کے حالات میں جا بجا اس کے اشارے کیے گئے ہیں اور یہ حصہ ہمارے لیے بہت زیادہ قیمتی ہے - مقالات الشعرا کے مطالعہ اور دیگر تصنیفات پر نظر ڈالنے کے بعد سندھ میں اردو کی تدریجی ترقی کی جو تاریخ مرتب ہوتی ہے اس کا ماحصل یہ ہے —

جس وقت 'ولی' اورنگ آبادی شاہ سعداللہ گلشن کی ترغیب و ہدایت سے دہلی میں ادب اردو کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے سندھ میں علامہ عبدالجلیل واسطی بلگرامی کی ذات گرامی بارش علم و فضل میں مصروف تھی - موصوف سنہ ۱۱۱۷ ھ میں سیوستان و بھکر متعلقات سندھ کی وقایع نگاری و بخشی گری و سوانح نویسی پر مامور ہوئے اور سنہ ۱۱۲۹ ھ میں سبک دوش ہوکر وطن مالوف کی طرف سدھارے - ظاہر ہے کہ اہل سندھ کو دس سال کے قیام سے علامہ ممدوح نے کہاں تک متاثر کیا ہوگا - میرا تو یقین ہے کہ شاہ محمد معین 'تسلیم'، اور میر حیدرالدین 'کامل' جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا یا اس زمانے کے دیگر ہندی گو اصحاب جنھوں نے مستقل قریب میں اس طرف توجہ کی یہ انھیں کے فیضان کا نتیجہ تھا -

علامہ عبدالجلیل کے سبک دوش ہونے کے بعد ان کے عالی مرتبت فرزند علامہ سید محمد شاعر اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے اور سنہ ۱۱۳۳ ھ سے سنہ ۱۱۴۳ ھ تک فرائض مذکورہ بالا کی ادائیگی کے بعد اپنا چارج علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کو دے گئے - موصوف نے

سنہ ۱۱۴۵ ھ میں دوبارہ سندھ کو رونق بخشی اور سنہ ۱۱۵۵ ھ تک متیم رھے - علامہ عبدالجلیل واسطی اور علامہ سید محمد شاعر بلگرامی عربی فارسی ترکی کے ماسوا ھندی کے بھی بہترین شاعر تھے - علامہ سید محمد شاعر کے معاصرین میں ایک صاحب جعفر علی 'بھنوا' گزرے ھیں جو نواب مہابت خاں کاظم کی صوبیداری یعنی سنہ ۱۱۳۲ ھ تا سنہ ۱۱۳۵ ھ میں وارد ٹھٹھہ ھوئے - میر 'قانع' لکھتے ھیں —

"از ھند بہ تتہ رسیدہ بود گویند طرفہ مشربے داشت و
از ما سوا بکلّی پرداختہ - صحبتش خالی از حالتے نبود" -

کتب تواریخ کی اوراق گردانی سے 'بھنوا' تخلص کے ایک شاعر کا پتہ چلتا ھے جو محمد شاہ بادشاہ دھلی کے آغاز عہد سلطنت میں دھلی پہنچے تھے شیخ قیام الدین 'قایم' نے مخزن نکات میں ان کا تذکرہ کیا ھے لیکن نام نہیں لکھا - میر حسن نے تقریباً اسی کیفیت کی نقل کی ھے - نواب علی ابراھیم خاں 'خلیل' نے بھی گلزار ابراھیم میں خان 'آرزو' کی بیاض سے 'بھنوا' کے دو شعر دیے ھیں اور باشندۂ قصبۂ سنام اور معاصر خان 'آرزو' و شاہ 'آبرو' لکھہ کر بیان کو ختم کر دیا ھے - گردیزی میں 'بھنوا' کا ذکر نہیں ھے چونکہ محمد شاہ بادشاہ کا عہد حکومت سنہ $\frac{\text{۱۱۲۸ ھ}}{\text{۱۷۱۵}}$ سے شروع ھوا اس لیے 'قایم' نے اوائل سلطنت محمد شاہ میں جس 'بھنوا' کا دھلی وارد ھونا بیان کیا ھے غالباً یہی میر جعفر علی بھنوا ھیں جو دھلی سے کسی بنا پر ٹھٹھے میں آئے اور میر علی شیر قانع نے زبانی روایات کی بنیاد پر "از ھند بہ تتہ رسیدہ بود" تحریر کردیا - 'بھنوا' فارسی کے بھی شاعر تھے اور اردو کے بھی' ان کے صرف دو شعر ھیں جو فرداً فرداً تمام تذکروں میں درج ھوئے ھیں' مقطع خوب لکھا ھے —

'بھتوا' ھوں زکواۃ حسن کی دے او مہاں مالدار کی صورت

علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی نے جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے ...
.. سال تک سندھ میں وقائع نگاری وسوانح نویسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و
تالیف اور درس و افادہ کا دریائے بیکراں جاری رکھا اور یہیں "ید بیضا"
ترتیب دیا - آزاد مرحوم عربی و فارسی کی طرح اردو کے بھی بلند پایہ
شاعر تھے - سخن شعرا میں مولوی عبدالغفور خاں 'نسّاخ' نےاور خمخانۂ جاوید
میں لالہ سوبر ام- ایم- اے' نے ان کے اردو اشعار درج کیے ہیں -
ان کے چند فیض یافتہ بھی تھے جن میں سے میر مرتضیٰ کا تذکرہ مصنف
مقالات الشعرا نے کیا ہے —

میر غلام علی 'آزاد' کا زمانۂ قیام سندھ نہایت زریں ہے یہی وہ وقت
ہے کہ شیخ محمد علی 'حزیں' ایران سے تشریف لائے اور ہندوستان
جاتے ہوئے ٹھٹھہ میں چند ماہ قیام کیا - ملّا باقر 'شہید' صفاہانی المتوفی
جب سنہ ۷۸ ا ھ اورنگ آباد سے آکر شیخ کے تلمذ اور صحبت سے بہرہ
ور ہوے - 'شہید' صفاہانی نے فارسی کی طرح اردو میں بھی طبع آزمائی
کی ہے اُن کے جو اشعار مولوی عبدالجبار خاں آصفی نے تذکرۂ شعراے دکن
جلد دوم میں دیے ہیں اُن میں یہ شعر سب سے زیادہ پسند
خاطر ہوسکتا ہے —

شہید اُس نفس کافر کیش کو مار حقیقت کا مظفر جنگ ہو جا

تقریباً اسی زمانے میں آفتاب رائے 'رسوا' ہندوستان کی گشت کرتے
ہوئے وارد سندھ ہوئے اور چند شعرائے سندھ کے ساتھ جن میں ملّا محمد باقر
ملی عبدالقادر اور شیخ محمد کریم کے نام معلوم ہوسکے ہیں بزم شعر و سخن
منعقد کی - صاحب مقالات لکھتے ہیں کہ ایک روز 'صائب' کی غزل کو

مخمس کہا گیا جس کی زمین "خریدار تو نیست" ہے - مذکورۂ بالا شرکائے مجلس نے مقابلتاً غزل مرقومہ کے ایک ایک شعر کو انتخاب کرکے تضمین کی جس پر 'رسوا' رنجیدہ ہوگئے اور مندرجۂ ذیل مقطع کہہ کر سلسلۂ سخن مسدود کر دیا —

وعظ کم کن تو بہ این مردم کودن صائب
بکش از صحبت این سلسلہ دامن صائب

حرف 'رسوا' شلو و شور میفکن صائب
پیش ارباب حسد مہر بلب زن صائب

گوش این بد گہراں لایق گفتار تو نیست

یہ تضمین مقالات الشعرا میں درج ہے —

ملا محمد باقر غالباً وہی بزرگ ہیں جن کا ذکر 'شہید' تلخص کے نام سے اوپر کیا گیا ہے اور جن کے فیض تربیت نے بقول 'مصحفی' مرزا قتیل جیسا نغز گو فارسی شاعر پیدا کیا —

اس عہد کے ایک سندھی نژاد اور قابل ذکر شاعر اور ہیں جن کا تخلص مصنف مقالات الشعرا نے 'ورد' تحریر کیا ہے - ان حضرت نے قاضیٔ شہر تھتھہ کی ہجو میں بہت سی اردو نظمیں کہی تھیں جن میں سے ایک 'حافظ' شیرازی کی مشہور غزل " الا یا ایہاالساقی ادر کاساً و ناولہا" کی زمین میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھہ کہی گئی تھی اس غزل کا مطلع یہ ہے جو بطور مزاح کہا گیا تھا —

الا یا ایہاالمفتی شدہ ریش تو جلگلہا
اُکھاڑوں بال یک یک کر بناؤں خوب کنگلہا

شیخ 'ورد' نے بقول صاحب مقالات الشعرا سنہ ۱۱۴۳ ھ کے قریب

ایک خون کے الزام میں پھانسی پائی —

اس عہد کے ایک اور اردو کے شاعر محمد سعید صاحب 'راہنور' گوالیاری ہیں جو نواب سیف اللہ خان متعینہ سنہ ۴۳ – ۱۱۲۷ ھ کے عہد میں ٹھٹھے میں آئے تھے مقالات الشعرا میں تحریر ہے "شعر ہندی بسیار می گفت" لیکن کوئی شعر درج نہیں کیا گیا جس سے مرتبۂ سخن کا اندازہ ہوتا۔

غیر سندھی شعرا میں ایک صاحب تھے جن کا نام میر غلام مصطفیٰ اور تخلص مجذوں لکھا ہے یہ زیارت عتبات عالیات سے واپس آتے ہوئے کچھ مدت ٹھٹھے میں ٹھہرے میر قانع ان کے تعارف کلام میں کہتے ہیں۔

"در واقعہ حضرت امام مرثیہ ہائے زبان ہندی و پارسی بسیار دارد" —

غالباً مجذوں مذکور نے شیخ عبدالسبحان فائز کے مکان پر قیام کیا تھا کیونکہ مقالات الشعرا کے مصنف نے 'مجذوں' کا کلام فائز مذکور کی بیاض سے نقل کرکے درج تذکرہ کیا ہے۔ خود 'فائز' بھی نہایت بذلہ سنج شاعر اور اپنے وقت کے 'انشا' تھے۔ مقالات کے مصنف نے ان کی حاضر جوابی کی بہت تعریف کی ہے' کہتے ہیں —

"در ظرافت گوئی بے مثل بود حتیٰ کہ سخنش بہ سبب بذلہ گوئی از لطف شعری عاری ماندہ' ایہام ہندی خوب می بندد۔ شعر ہندی و پارسی بسیار گفتہ و اکثر آں در مناقب و مرثیہ واقع" —

اس دور کا حال نا تمام رہے گا اگر سندھ کے دو خاص اور بے مثال بزرگوں کے نام بھی نہ کہے جائیں۔ ان میں سے ایک مخدوم محمد معین 'تسلیم' تھے اور دوسرے میر حیدرالدین 'کامل'۔ ابو تراب میر حیدرالدین 'کامل' فقیر صاحب دل اور مرجع ارباب کمال تھے' عزلت گزینی و گوشہ گیری میں عمر گزاری۔ میر علی شیر قانع کو انہیں سے فیض پہنچا تھا۔ فارسی

کے دو بڑے دفتر اپنے شاگرد میاں محمد پناہ 'رجا' کو ترتیب کے لیے دے تھے اور ابھی مبیضہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خود ان کا سنہ ۱۱۹۴ ھ میں انتقال ہوگیا - موصوف فارسی کے علاوہ ہندی کے بہترین شاعر تھے 'میر' قانع' نے اردوگوئی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے —

"هر چه اشعار هندی ایشاں عالمگیر است اما آنچه

فقیر یاد می دارد می نویسد" —

اس کے بعد دس اشعار نقل کیے ہیں جن میں یہ تین قابل شنید ہیں —

لبوں دلبر کے میرے قتل پر بیڑا اٹھایا ہے

الٰہی خون سے میرے تو اُس کو سرخرو کرنا

خال رخسار پر اچھلتا ہے　　کال کے کھیت میں اُگا ہے تل

دوست بخشیگا دوست سب کے سب　　گرچہ عاصی ہوں اُس کا آسی ہوں

جن حضرات نے کامل مرحوم سے استفادۂ سخن کیا ان کا ذکر آئندہ آتا ہے —

مخدوم محمد معین 'تسلیم' ٹھٹھوی تمام علوم معقول و منقول کے جامع تھے - فقر میں بے مثال اور صاحب حال و قال گزرے - میاں ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹھوی اور شاہ عبدالطیف نازک بھٹائی سے ارادت رکھتے تھے - میر نجم الدین عزلت رضوی بھکری اور مولوی محمد صادق خاص شاگردوں میں تھے میر سعداللہ سورتی اور ان کے درمیان مراسلات اخلاص و محاکمات علمی ہوتے تھے - مدت تک مسند علم پر متمکن رہے سنہ ۱۱۶۰ ھ میں وفات پائی - شہر کے اکثر ارباب ذکر نے وفات کی تاریخیں کہیں جو مقالات الشعرا میں ہیں - فارسی میں 'تسلیم' اور ہندی میں 'بیراگی'

تخلص کرتے تھے - مصنف مقالات کا بیان ہے —

" در هندی از قسم دوهره و کبت ' بیراگی ' تخلص داشتند " —

افسوس نمونۂ کلام دستیاب نہ ہوسکا —

میں نے اس وقت تک بارہ اردو شاعروں کا ذکر کیا جن کا تعلق سندھ سے ثابت ہوتا ہے ان میں سے میر عبدالجلیل تو یقیناً ولی کے معاصر اور دور اول کی یادگار ہیں' بقیہ حضرات کو دوسرے دور کا شاعر کہا جاسکتا ہے - بہر حال یہ امر ثابت ہے کہ اردو نے ابتدائے آغاز ہی میں دوسرے صوبوں کی طرح سندھ کو بھی اپنی طرف ملتفت کرلیا تھا -

اب تیسرے دور کے چند شعرا کے نام سن لیجیے یہ تعداد میں ۸ ہیں -

میر محمود 'صابر' رضوی استرابادی دلی میں پیدا ہوئے زیارت عتبات عالیات کے لیے گئے تھے سنہ ۱۱۳۰ ھ میں واپس آکر ٹھٹھے میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور تاہل کی زندگی گزارنے لگے - بہت پرگو تھے اور سنہ ۱،۷۳ ھ تک بقول صاحب مقالات الشعرا تقریباً ایک لاکھ اشعار تصنیف کر چکے تھے - مرثیہ گوئی میں خاص مزاولت تھی ' روضۃ الشہدا کے مصنف ہیں - تحفۃالکرام کی تکمیل سے چند ماہ پہلے فوت ہوئے - " بزبان هندی و پارسی دیوانهائے متعدد در مرثیه و بعضے در غزلیات و مناقب درست کرده " سے اُردو گوئی کی تصدیق ہوتی ہے —

محسن الدین شیرازی سورت سے سندھ کو آتے ہوئے قانع کے همسفر رہے تھے ' اس لیے ان کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملا —

" اگرچه ولایت زا بود اما هندی فصیح یاد داشت " —

میر حفیظ الدین علی میر حیدرالدین ' کامل ' مسبوق الذکر کے بھتیجے تھے ان کی بابت تو مقالات الشعرا کی پوری عبارت پڑھ دینا ضروری ہے —

" باوجود کم سوادی و بصارت بصرو کژی گوشہا در زمین لطائف و غرائب شعر بزبان هندوی خسرو ثانی است - معانیها که وے در دوهرهاوکبت و ابیات و نکات هندی می بندد و فہم آں برهمه کس از قبیل دشوار ' اغلب کلام در هندوی طرز ایهام واقع اماچه ایهام که از دو سه وچهار و پنج معنی هم گاه گاهے تجاوز دارد " —

اس کے بعد دو عام فہم بیتیں ایہام بندی کی مثال میں درج کی ہیں جن کو رسم الخط خراب ہونے کے باعث میں اچھی طرح پڑھ نہ سکا ان میں سے ایک شعر کا ایک مصرع یہ ہے —

پہلی ہے کہوں کنواری سونا نہیں "لھُرکا"

اور دوسرے شعر کا ایک مصرع یوں ہے —

سرکا بلا تو آکے سوئے سلونے اچھے

سید فضائل علی 'بیخبر' اصلاً سندھی نہ تھے بلکہ اولاً عمدۃالملک نواب امیر خاں کی نیابت میں اور بعدہ بالاصالت ٹھٹھہ کے صوبیدار ہوکر سندھ میں پہنچے تھے میر علی شیر نے ان کو دیوان لکھا ہے ' مرزا عبدالغفار 'صہبا' تبریزی کے ذکر میں ہے —

" همراه نواب رضی محمد خاں در بلدہ آمدہ نسبت دامادی به دیوان فضائل علی خاں درست کردہ - همیں جا در اواخر عہد نواب سیف اللہ خاں از صہبائے کل من علیها فان نوش کردہ " —

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فضائل علی خاں نے ٹھٹھہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی - فضائل علی خاں اُردو کے اچھے شاعر تھے '

اُن کی ایک مثنوی اپنے عشق و محبت کی داستان سے لبریز پانچسو اشعار کی ھے جس کا انتخاب میر حسن اور علی ابراھیم خاں کے تذکروں میں دیا گیا ھے جوان محمد شاھی تھے لیکن اس وجہ سے کہ گردیزی و قائم کے تذکروں کے بعد نام و نمود حاصل کی میں نے اُن کو تیسرے دور میں شامل کیا ھے —

عماد الملک غازی الدین خاں 'نظام' فیروز جنگ بہادر - احمد شاہ کے عہد میں بخشی الممالک اور عالمگیر ثانی کے عہد میں وزیر الممالک کے خطابات سے سرفراز ھوے - سنہ ۱۱۹۵ ھ میں حسب قول صاحب گلزار ابراھیم اطراف سندھ میں تشریف لے آئے تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ھیں —

سید ضیاءالدین 'ضیا' - مصنف مقالات الشعرا میر علی شیر 'قانع' کے برادر عمزاد تھے میر تھارا خاں رفیق سوم والیء ریاست میر پور خاص متوفی سنہ ۱۲۴۵ ھ کے مصاحب اور درباری شاعر تھے اُن کا قلمی دیوان فارسی اُن کے اخلاف کے پاس موجود ھے جس کے دیباچے میں لکھا ھے " بالفعل دیوان بزبان ھندی تصنیف نمودہ " - دیوان ھندی میں غزلیات ' مستزاد ' ترجیع بند ' قصائد ' مخمس ' مسدس وغیرہ تمام اصناف سخن موجود ھیں - رنگ کلام کا اندازہ ان اشعار سے ھوتا ھے —

کس کی طاقت نہیں ھے دیکھے اُسے جن نے دیکھا ھے بے قرار آیا
جب ذکر ھوا اُس کے کبھی موئے میاں کا باریک ھوا برگ سمن کا زخجالت
عاشقاں میں جو بانیاز ھوا ھے وہ خلوت نشین محفل قدس

میر علی شیر 'قانع' مصنف مقالات الشعرا بھی اسی دور کے شاعر

میں اُنہوں نے میر حیدرالدین 'کامل' کے فیضان تلمذ سے اُردو شاعری کی طرف توجہ کی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں —

" فقیر نیز در حضور آں اُستاد کامل گاہے گاہے فکر سندی می کرد " —

اور اس کے ساتھہ مندرجۂ ذیل شعر بھی درج کیا ہے —

مجھہ شہادت کی جگت میں تھی پیاس
کیوں نلواوے نولے انکھیاں کربلا

شعر کا مطلب خدا جانے کیا ہے میں نے مقالات الشعرا سے بجنسہ نقل کرکے آپ کے سامنے پیش کردیا ہے - ان کے شاگردوں میں منشی پرسرام 'مشتری' ایک فارسی گو شاعر تھے انہیں اُردو لکھنے کا بھی شوق تھا 'بیربل' تخلص کرتے تھے اور میر محمود 'صابر' رضوی سابق الذکر سے اصلاح لیتے تھے سنہ ۱۱۷۳ ھ میں مبتدی تھے —

سندھ کی قدیم اُردو تاریخ کے سلسلے میں جو معلومات مجھے بہم پہنچی تھیں پیش کردی گئیں جتنے شعرا کا ذکر اب تک کیا گیا اُن کا زمانۂ حیات زیادہ سے زیادہ تیرھویں صدی کے آغاز تک ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد موجودہ صدی کے اوائل میں اُردو گو شعرا ملتے ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ نواب عبداللہ خاں 'ضیغم' نے اپنی تصنیف " یادگار ضیغم " میں کیا ہے اور کچھہ اصحاب کے حالات و کلام میں نے دیگر ذرائع سے فراہم کیے ہیں - اب رہا درمیانی وقفہ جو سو برس سے کچھہ ہی کم ہوگا وہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے - دور چہارم کے بعد اور دور ششم کے آغاز تک یقیناً متعدد شعرائے اُردو ہوے ہوں گے لیکن مجھے صرف پانچ نام معلوم ہوسکے ہیں - ان میں سب سے مقدم العصر سید ثابت علی زوار سیوستانی تھے جن کو فارسی و سندھی کے سوا اردو لکھنے کا شوق

بھی تھا باکمال شاعر اور عدیم النظیر تاریخ گو مخدوم نورالحق مستانی سیوستانی اور غلام علی 'مداح' تھتھوی سے استفادہ کیا تھا' سنہ ۱۲۲۵ ھ میں وفات پائی - ان کے بعد میر صوبیدار خاں 'میر' خلف میر فتح علی خاں رئیس حیدرآباد سندھ خوش گو شاعر اور شعرا کے قدرداں تھے سنہ ۱۲۶۴ ھ میں فوت ہوے - مخدوم عبدالکریم 'کرم' خلف غلام حیدر ساکن تھتھہ نے سنہ ۱۲۷۴ ھ میں انتقال کیا - غلام حسین 'افضل' سبز پوش تھتھوی شاعر نازک خیال اور قدر شناس سخن تھے نثر نویسی میں بھی مہارت رکھتے تھے تنبیہ المعاندین' مثنوی نان و نمک' نظم نوروز اور انشاء افضل یادگار چھوڑ کر ۱۴ جمادی الآخر سنہ ۱۲۷۸ ھ میں وفات پائی - آخر میں 'اسد' تخلص کرلیا تھا —

یہ سلسلۂ شعرا سید غلام محمد 'گدا' ہاشمی پر ختم ہو جاتا ہے جو علوم معقول و منقول میں اخوند احمدی و اخوند روشن حیدرآبادی سے مستفید تھے - میروں کی حکومت کے خاتمے پر بھی عزت سے گزاری اور ہزہائینس میرحسین علی خان بہادر کے وظیفہ خوار و مصاحب رہے - میر صاحب کو سندھی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں پوری قدرت حاصل تھی ان کا سندھی ترجمۂ سکندر نامۂ نظامی مطبوعہ موجود ہے - تفصیل کے لیے ماہنامۂ تنویر اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ ع ملاحظہ فرمائیے —

ساتویں دور کے شعرا میں سب سے مقدم العصر تو مخدوم محمد ابراہیم 'خلیل' تھتھوی ہیں جو اپنے والد بزرگوار مخدوم عبدالکریم صدیقی نقشبندی سے تعلیم و تربیت حاصل کرکے میاں محمد زاہد شاکرانی کے شاگرد ہوئے اور مسکین کے بدلے 'خلیل' تخلص سے شہرت پائی زبان فارسی کے علاوہ اردو سے بھی نابلد نہ تھے' خود لکھتے ہیں کہ "بزبان ہندی

ہر چہ کردہ ام درآں ہم تخلص مسکین است وزبان ہندی را فقیر نداند مگر از سبب اثر صحبت سید غلام محمد 'گدا' تخلص کہ چار پنج روزہ در بلدہ (ٹھٹھہ) بود و دیوان 'ناسخ' و 'آتش' و آباد را دیدہ شد ازاں ایں قدر اثرے شد کہ چند غزل گفتہ" - ان کی قابل قدر تصنیف مقالات الشعرا کا تکملہ ہے جس میں سنہ ۱۳۰۶ ھ تک کے حالات درج کیے گئے ہیں - افسوس یہ ہے کہ تکملہ کا قلمی نسخہ جو موصوف کے اخلاف کے پاس محفوظ ہے مجھے دیکھنے کے لیے نہ مل سکا اگر مل جاتا تو دور چہارم و ہفتم کے درمیان اس قدر بے ربطی باقی نہ رہتی —

'خلیل' مذکور کے شاگردوں میں ایک تو ان کے صاحبزادے محمد زماں 'حبیب' تھے جن کا انتقال سنہ ۱۳۰۶ ھ میں ہوا اور دوسرے قاضی غلام علی جعفری خاف یحییٰ جعفری طیاری ٹھٹھوی ان کا انتقال سنہ ۱۳۰۳ ھ میں ہوا ہر سہ حضرات کو دور ششم کی یادگار کہا جاسکتا ہے - مخدوم محمد ابراهیم 'خلیل' کے مفصل حالات تنویر ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۱ ع میں شائع ہو چکے ہیں —

ساتویں دور میں میر حیدر علی 'افسر' مہر غلام حیدر 'تاب' اور سیٹھہ محمد اسمعیل 'مغموم' رئیس مدراسی ہیں ان میں سے 'مغموم' کے حالات یادگار ضیغم میں دیے گئے ہیں بقیہ دو حضرات کے صرف نام ہیں' حالات و نمونۂ کلام مہیا کرنے میں مصنف یادگار ضیغم کو کامیابی نہیں ہوئی - اسی دور کے ایک اور سندھی نژاد شاعر محمد یوسف خاں 'ظہیر' تھے جنھوں نے ملازمت کی وجہ سے سندھ کو ترک کردیا تھا اور یو - پی کے علاقے میں آگئے تھے - غلام محمد خاں 'خبیر' کے شاگرد تھے کلام اردو کا نمونہ یادگار ضیغم میں موجود ہے - مذکورۂ بالا حضرات کے

علاوہ اس دور کے شعرا میں منشی دھلپت رائے 'بیکس' قاضی محمد ہاشم 'مخلص' شیر علی خاں 'اسد' سعداللہ 'نیازی' انصاری' ولی محمد 'ولی' ولیم برویت 'ولیم' - پیر بخش 'اثر' اور منشی محمد مظہر 'مظہر' وغیرہم ہیں جن کا کلام میں جمع کرچکا ہوں اور تدوین حالات میں ساعی ہوں - ان میں سے اکثر حضرات کی منظومات اس وقت کے ماہانہ گلدستوں میں شائع ہوتی تھیں —

سندھ میں اردو کا آٹھواں دور نہایت حوصلہ افزا ہے خصوصاً اس حالت میں کہ آغا 'حشر' کا شہری مرحوم منشی عبدالعزیز 'ذائق' فرخ آبادی' منشی عبداللہ 'فضا' حیدرآبادی وغیرہ نے مدت تک ہنگامۂ شاعری برپا رکھا - خواجہ ولایت حسین 'صغیر' مرحوم کی تحریک سے سیٹھ فدا علی صاحب رئیس کراچی نے ڈھائی ہزار کے عطیہ سے انجمن ترقیء اردو کی بنیاد رکھی - اور میونسپل بورڈ کراچی نے اردو داں پبلک کے لیے پرائمری اسکول جاری کیے - خدا کا فضل ہے کہ موجودہ زمانے میں تقریباً (۹۰) سرکاری و غیر سرکاری مدارس اردو اردو کی اشاعت کر رہے ہیں اور ایک درجن سے زیادہ کتب خانے اور دارالمطالعہ قایم ہیں اور یہ اس امر کی بین دلیلیں ہیں کہ اب اشاعت اردو کا دریائے مواج کسی عارضی و عصبی بندش سے آسانی کے ساتھہ نہیں روکا جا سکتا —

اردو شعرائے سندھ کے دو قلمی تذکرے اس وقت میری تحویل میں ہیں ایک میں نے مرتب کیا ہے جس میں سنہ ۱۱۳۵ ھ سے سنہ ۱۳۳۵ ھ تک اردو شعرا جمع کیے گئے ہیں - دوسرا میرے عزیز دوست و شاگرد سید محمد ارشاد حسین 'شاد' صابری کا مرتب کیا ہوا ہے جس میں صرف ان پچاس شعرا کا تذکرہ ہے جو سنہ ۱۹۳۰ ع میں کراچی میں موجود

تھے ، نہیں کہا جا سکتا کہ کب طبع ہوں —

یہاں یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ شاہی زمانے میں ٹھٹھہ - سیوستان اور بھکر کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور موجودہ سلطنت نے کراچی کو صدر مقام مقرر کیا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دونوں حالتوں میں صرف مرکزی مقامات ہی میں اردو کی اہمیت جاذب قلوب ہوئی اور ہے ' مفصلات و اضلاع میں نہ پہلے کوئی چرچا تھا نہ اب پایا جاتا ہے - اگر ایسا نہ ہوتا اور سندھ کے اطراف میں رغبت اردو یکساں طور پر ہوتی تو مجھے ماہنامۂ تنویر کے اجرا سے اب تک جس کو تقریباً تین سال کی مدت منقضی ہوتی ہے اس اردو رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں نقصان برداشت کرنا نہ پڑتا —

ضرورت ہے کہ ایک منظم و موثر لائحہ عمل سے کام لے کر سندھ کے گوشے گوشے کو آوازۂ اردو سے معمور کر دیا جائے —

مقامی اعتبار سے اشاعت و ترویج اردو میں کون کون سی مشکلات حائل ہیں اور وہ کون کون سے وسائل و ذرائع ہیں جن سے مقصد اشاعت میں عاجلانہ کامیابی ہوسکتی ہے یہ تمام باتیں انشااللہ ماہنامہ تنویر کراچی کے صفحات سے ہمدردان و بہی خواہان اردو کے سامنے وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہیں گی - مضمون ختم ہوگیا اب مجھے صرف آپ کا دلی شکریہ ادا کرنا باقی ہے کہ مجھے اس اہم اجتماع کے موقع پر جب کہ بہتر سے بہتر مضامین و تقاریر بالیدگیء ذوق کی موجب ہوسکتی تھیں یہ مقالہ پڑھنے کی اجازت عطا فرمائی اور میرے طول طویل بیان کو جس میں کسی قسم کی ندرت و شگفتگی کا شائبہ تک نہیں نہایت دلجمعی و اطمینان و سکون کے ساتھ سماعت فرمایا —

رپورٹ انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ

از

(مولانا محمد بہلول خاں صاحب "دانا")

[یہ رپورٹ محمد بہلول خان صاحب دانا صدر جمعیت افاغنہ چوموں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی میں پیش کی - محمد بہلول خان صاحب انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ کے بانی اور اردو کے بڑے حامی ھیں - انھوں نے اپنے علاقے میں اردو کی اشاعت میں جس سرگرمی اور مستعدی سے کام کیا ھے وہ اس رپورٹ سے ظاھر ھے - اڈیٹر]

راجپوتانہ میں (۲۰) ریاستیں ھیں - ان ریاستوں میں قدیم الایام سے سرکاری دفاتر کی زبان اردو تھی جب سے اردو زبان کے خلاف تحریک شروع ھوئی اردو زبان ریاستوں کے دفاتر سے مفقود ھونے لگی یہاں تک کہ سوا جے پور کے تمام ھندو رجواڑوں کے دفاتر سے اردو نکال دی گئی —

میں نے دیکھا کہ جے پور سے بھی اردو آھستہ آھستہ مٹ رھی ھے دفاتر سرکاری میں جہاں صرف اردو رواج پائے ھوئے تھی بتدریج ھندی بھی جگہہ پارھی ھے اور دیہاتی مدارس میں عام طور پر نری ھندی پڑھائی جارھی ھے تو میں سمجھہ گیا کہ اگر فوری حفاظتی تدابیر کام میں نہ لائی گئیں تو راجپوتانہ کی اس چوٹی کی ریاست سے بھی ھم اردو کو خارج ھوا دیکھہ لیں گے —

میں نے صورت حال سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو مطلع

کیا اور ایسا مفید مشورہ طلب کیا جس سے راجپوتانہ میں اردو زبان کی حفاظت ہوسکے اور وہ فروغ پاسکے - مجھے خبر دی گئی کہ عنقریب علی گڈھ میں انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد (دکن) کا جلسہ ہونے والا ہے - میں اس میں شریک ہونے کی کوشش کروں' مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میں تحفظ و ترقیء اردو کے سلسلہ میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) سکریٹری انجمن ترقیء اردو سے خط کتابت کروں - میں نے جناب مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں اردو زبان کی راجپوتانہ میں کس مپرسی کا حال ظاہر کیا - مولوی صاحب نے بھی مجھے انجمن ترقیء اردو کی آل انڈیا اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور میں ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ ع کو اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں شریک ہوا تبادلہ خیالات کے بعد مجھے جناب سکریٹری صاحب نے " انجمن ترقی اردو راجپوتانہ " قایم کرنے کی ہدایت کی - میں نے اس خدمت کو بسروچشم اٹھایا اور اپنے وطن میں پہنچ کر انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کی بنیاد رکھی - او اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کیں —

(ا) اردو کی حمایت میں پرزور مضامین لکھے اور متعدد اخبارات میں انہیں اشاعت دی ان مضامین میں ظاہر کیا کہ —

(ا) اردو تمام ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہے اور کسی ایک فرقہ اور ایک علاقہ کی زبان نہیں ہے —

(ب) اردو کو ہمیشہ سے ہندؤں مسلمانوں اور گورنمنٹ نے آل انڈیا حیثیت کی زبان مانا ہے اور اردو کے سوا کسی دوسری زبان کو یہ درجہ نہیں دیا ہے چنانچہ اس دعوے کی دلیل میں گورنمنٹ کے روپیہ

کو پیش کیا گیا ہے جس پر صرف ہندوستان کی ایک زبان اردو میں " یک روپیہ " منقش ہے اور یہ زبان اردو کے تمام ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہونے کا بین ثبوت ہے —

(ج) اردو ہندو مسلم اتحاد کی زندہ یادگار ہے -

(د) اردو ہندو مسلم اختلافات کے دور کرنے کا ذریعہ ہے -

(ھ) اردو ہندو مسلم مفاہمت کا واسطہ ہے -

(و) اردو ہند کے اجزاے مختلفہ کو دولت مشترکہ میں ڈھالنے کا بہترین سانچا ہے -

(ز) بیرون ہند کی تمام مہذب دنیا نے بھی اردو ہی کو ہندوستان کی عام زبان تسلیم کیا ہے -

(ح) اردو وہ زبان ہے جو ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران، عراق، حجاز، عمان، بحرین، کویت، یمن، عدن، زنجبار، سمالی لینڈ، سنگاپور، جاوا، وغیرہ دور دراز مقامات تک میں سمجھی جاتی ہے -

(ط) اردو وہ زبان ہے جس کا رسم الخط افغانستان اور وسط ایشیا اور ایران اور عرب اور تمام شمالی اور مغربی افریقہ اور سوڈان وغیرہ میں پڑھا جاسکتا ہے -

(ی) اردو وہ زبان ہے جس کی نشر و اشاعت ہندو مسلمان دونوں نے مل کر کی ہے اور آج بھی اس کام میں یہ دونوں اپنا سرمایہ اور محنت برابر لگا رہے ہیں ۔ سوا اردو کے کسی اور ہندوستانی زبان کو یہ بات حاصل نہیں ہے -

(ک) اردو وہ زبان ہے جسے (۱۲) کرور ہندوستانی اور کروروں غیر ہندوستانی بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں، یہ مقبولیت ہندوستان کی کسی اور زبان کو حاصل نہیں ہے -

(ل) اردو وہ زبان ہے جسے تمام ہندوستان کے مسلمان اپنی مشترکہ زبان تسلیم کرتے ہیں —

(م) اردو وہ زبان ہے جسے ہندو مسلمان قدیم الایام سے اپنی واحد مشترکہ زبان سمجھتے آئے ہیں —

(ن) اردو وہ زبان ہے جسے ہندوستان کی مشترکہ زبان اور واحد مشترکہ زبان آئندہ بھی رکھنا ضروری ہے یہ وہ حقایق ہیں جن پر متعدد مضامین میں مختلف اخبارات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی —

(۲) اردو کی حفاظت اور ترقی کے لیے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ہندوستان کے با اثر اور مقتدر لوگوں سے نامہ و پیام کے ذریعہ سے اردو کی اہمیت پر توجہ دلا کر اس کی حفاظت اور ترقی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی - اور دکھلایا گیا کہ اردو کی مقبولیت کا راز اس کی شیرینی اور پاکیزگی میں ہے اس کے ساتھ یہ باتیں اور ہیں کہ یہ کم از کم جگہہ گھیرتی ہے یہ جلد از جلد لکھی اور پڑھی جاتی ہے اور یہ مختصر نویسی کا نہایت آسان طریقہ ہے اور ہندوستان کے ارد گرد کے ممالک میں اس کے رسم الخط کا رواج ہونے سے یہ ہندوستان کی تجارت کو فروغ دینے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے —

ہند کے ارباب سیاست سے یہ کہا گیا کہ وہ ہند کے مختلف المذہب مختلف القوم افراد کے جوڑنے والے رشتہ کو نہ توڑیں اور یہ رشتہ اردو زبان اور اردو رسم الخط ہے اردو کی مخالفت ہندو مسلم مغائرت کی خلیج کو بہت گہرا کردے گی اور انجام کار ناقابل عبور بنادے گی کیونکہ ہند کی دو زبردست اقوام ہندو مسلمانوں کی جب زبانیں بھی دو ہو جائیں گی اور وہ ایک دوسرے کی بات سمجھہ نہ سکیں گے تو

ظاہر ہے کہ افہام و تفہیم کی راہیں مسدود ہو جائیں گی —

جب مہاتما گاندھی جی کو اردو کی طرف توجہ دلائی گئی تو انہوں نے سودیشی کاغذ پر جو خاص جے پور ہی کا بنا ہوا ہے مجھے یہ لکھا کہ

"بھائی محمد بہلول خان! میری طرف آپ کبھی ڈر نہ رکھیں کہ میں اردو کی مخالفت کروں —

سیگاون وردھا ۱۱/۳۶ — ۱۲ م - ک - گاندھی آپکا

جب میں نے مہاتما جی کو پھر لکھا کہ مخالفت نہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں وہ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان "اردو" کی ترقی میں کوشش کیوں نہ کریں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا :—

بھائی محمد بہلول خاں! مجھے پتا نہیں اردو کی ترقی میں میں کیا کوشش کروں یا کرسکتا ہوں میرا خیال ہے میں مخالفت نہ کروں وہی میری کافی کوشش ہے اس سے زیادہ میری شکتی کے باہر ہے - آپ اچھے ہوں گے—

م - ک - گاندھی

سیگاوں وردھا ۳۶ - ۱۲ - ۲۳

یہ دونوں خط گاندھی جی نے اپنے قلم سے اردو میں لکھے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اردو لکھنے کی مشق کر رہے ہیں اور اردو کی مخالفت کبھی نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ میں اسے بڑی کامیابی سمجھتا ہوں جو مجھے خلاف توقع اتنی جلد حاصل ہوئی ہے مجھے مہاتما جی سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے بچن پر قایم رہیں گے اور جب ہند کی مشترکہ زبان کے تعین میں اختلاف کرنے والوں کی صفیں ان کے سامنے کھڑی ہوں گی تو وہ ان میں ہرگز نہ کھڑے ہوں گے - انجمن ترقی اردو راجپوتانہ ان کا پہلے ہی سے شکریہ ادا کرتی ہے -

اس سلسله میں مہاتما یوگندر پوری جی نے جو شنکر یہ اچاریہ کی سمپرداے کے بڑے مہنت ہیں جو خط مجھے لکھا ہے اس کا تذکرہ بھی ضرور کروں گا وہ لکھتے ہیں کہ اردو زبان کی بنیاد ہندوں نے رکھی کیونکہ شاہی فوج میں جو راجپوت ایرانیوں مغلوں اور ترکوں اور عربوں کے ساتھہ رہتے تھے وہ درباری زبان سے جو کہ فارسی تھی نا آشنا تھے وہ اپنی زبان میں کچھہ فارسی عربی کے الفاظ ملا ملا کر مطلب برآری کرلیتے تھے عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ایک مستقل زبان کی صورت پکڑ گیا اس زبان کے بولنے والے فوج میں دراصل راجپوت ہی تھے ان کے مسلمان ساتھی بھی ان کی خاطر سے اُس زبان میں جو راجپوت فوجی بولتے تھے بات چیت کرنے لگے اور اس مخلوط زبان کی شیرینی اور فائدہ رسانی کو سمجھہ کر اسے اپنا بیٹھے - انگریزی دور میں اس زبان نے وہ فروغ پایا کہ ہندوں کے وید شاستر اور علوم فنون سب اس میں ترجمہ ہوگئے اور مسلمانوں نے بھی قرآن حدیث اور اپنے علوم و فنون کو اس میں ترجمہ کرلیا - ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں ہے اردو کے سوا کوئی بتائے کہ کس زبان کو ہندوستان میں یہ باتیں حاصل ہیں ؟ —

(۳) اردو کی حفاظت اور ترقی کی تیسری تدبیر جو اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ چوموں میں ایک شبینہ مدرسہ بالغوں کو اردو پڑھانے کے لیئے کھولا گیا اور اس غرض کے لیے ابتدا میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں ہندؤں کو بہ کثرت بلایا گیا اور سمجھایا گیا کہ اردو چونکہ ریاست جے پور کی سرکاری زبان ہے اس لیے ہندو ہو کہ مسلمان سب ہی کو اس کا پڑھنا ضروری ہے ' اس شبینہ مدرسہ میں (۴۰) کے قریب

ہندو طلبہ اردو کی تعلیم پا رہے ہیں- علاوہ ازیں چوموں کے سرکاری مدرسہ میں جو اردو پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا اس کو اور بھی ترقی دلائی- چوموں کے اردگرد کے دس دس میل فاصلے کے دیہات میں قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے مکاتب کھولے گئے —

دارالعلوم ماجدیہ میں اردو خوان طلبہ کا شمار بڑھاتے بڑھاتے (۱۵۰) تک پہنچا دیا —

ریاست جے پور اور الور کے باشندوں کو اردو مکاتب و مدارس کے قیام پر ترغیب دلائی گئی چنانچہ ریلگس - کھیجڑولی ' ڈونگری ' داڑوہ تگھریہ ' کانوٹ ' پراگ پورہ پاوتہ ' ہلکونیا ' اودے پور گربند گوہ ' گوھالہ ' وغیرہ میں اردو مکاتب قائم کردیے - اور اعلیٰ حضرت نظام خلداللہ ملکہ ' کی سلور جوبلی کے موقعہ پر جب دارالعلوم ساجدیہ چوموں میں جمعیۃ افاغنہ ' اور انجمن ترقی اردو کا مشترکہ جلسہ ہوا تو یہ طے پایا کہ راجپوتانہ کے لیے ایک پنج سالہ پروگرام ابتدائی لازمی تعلیم کا راجپوتانہ اسٹیٹس ایجوکیشنل کانفرنس مرتب کرے اور اسے عملی جامہ پہنائے- چنانچہ پروگرام عنقریب مرتب کیا جاکر انشااللہ کام شروع کردیا جاےگا وما توفیقی الاباللہ —

(۴) اردو کی حفاظت اور ترقی کی چوتھی تدبیر یہ اختیار کی کہ راجپوتانہ میں اردو زبان کا جائزہ لینا شروع کردیا اور انشااللہ دو ماہ اندر یہ کام تکمیل کو پہنچ جاے گا اور رپورٹ انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر کو بھیج دی جاے گی —

(۵) چونکہ اردو زبان مہاراجہ مان سنگھ اور ان کے دادا مہاراجہ بہارا مل کے عہد سے راجپوتانہ میں عموماً اور ریاست جے پور میں خصوصاً

رائج ہوگئی تھی اس لیے اس ریاست میں بہت پرانا ذخیرہ اردو کی کتابوں اور فرامین کا جمع ہو سکتا ہے جو اردو زبان کی تواریخ میں شاندار اضافہ کردے گا اس لیے وہ نادر کتابیں قدیمی کتب خانوں سے دارالعلوم ماجدیہ کے کتب خانہ میں جمع ہو رہی ہیں جلہیں بعد میں انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کو دیدیا جائے گا ایسی چند کتابوں کے نام یہاں درج ہوتے ہیں جو فراہم ہو چکی ہیں :—

(۱) معراج نامہ قلمی - (۲) رسالہ کفایہ قلمی —

(۳) دیوان ولی قلمی - (۴) مورکھہ سمجھاونی قلمی —

(۵) چھلد روشن راسا قلمی —

(۶) اردو کی حفاظت اور ترقی کی چھٹی تدبیر یہ اختیار کی کہ چوموں کے کتب خانہ مظہرالعلوم میں پندرہ اخبار جاری کرادیے —

(۷) اردو کی حفاظت اور ترقی کی ساتویں تدبیر یہ اختیار کی کہ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھانے کی کوشش ہو رہی ہے جن کی مکمل فہرست مرتب کی جاکر پیش ہوگی۔

(۸) راجپوتانہ میں (۲۰) ریاستیں ہیں اور کوشش ہو رہی ہے کہ ہر ریاست میں ایک شاخ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کی قایم ہوجائے۔ اس کام کے سر انجام کے لیے دورہ کی اشد ضرورت ہے —

(۹) اردو کی حفاظت اور ترقی کی بہت بڑی تدبیر یہ ہے کہ مخلص کارکن کے ہاتھہ میں کافی سرمایہ ہو جس سے وہ پروپیگنڈا کر سکے اور دورہ کر سکے نہایت افسوس کے ساتھہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی کمی حوصلہ شکن ہلنے کی دھمکی دیتی ہے - اس مد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے ۲۵ روپیہ کی امداد ملی ہے - جس کے لیے انجمن ترقی اردو

راجپوتانہ شکریہ ادا کرتی ہے —

اب تک مصارف انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کے حسب ذیل ہوے ہیں :-

سفر	۴۰ روپے
ڈاک	۵۰ روپے
ڈوپلی کیٹر	۲۲ روپے
اسٹیشنری	۵ روپے
	۱۱۷ روپے
اخبارات	مفت

اب تک جو کچھہ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ نے کیا وہ آپ کے سامنے ہے - جناب سکریٹری صاحب نے رسالہ "اردو" بابت جنوری سنہ ۱۹۳۷ع میں جو رائے میری ناچیز اور حقیر خدمت گزاری کے بارے میں اظہار فرمائی ہے اس ہمت افزائی کا میں ممنون و مشکور ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ وہ ٹھوس اور مفید کام کر کے دکھاے گی جس کا مطالبہ ملک و ملت کی طرف سے ہو رہا ہے - بزرگان قوم سے اپیل ہے کہ وہ راجپوتانہ کے حال کو خاص توجہ سے دیکھیں اور اپنے گرانقدر مشوروں سے اہل راجپوتانہ کی عقدہ کشائی میں مدد دیں - ربنا اتنا من لدنک رحمۃ و ھئی لنا من امرنا رشدا و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین —

ادبی معلومات

مرتبۂ " ناخدا "

(۱) ہندی، اردو اور ہندوستانی	از ڈاکٹر تارا چند
(۲) ہندی اور اردو کا مستقبل	از منشی پریم چند
(۳) ادب کا مستقبل	از پنڈت جواہر لال نہرو
(۴) ہندی جاتری منڈل	از کاکا کالیلکر

ادبی معلومات

ہندی، اردو اور ہندوستانی

از

ڈاکٹر تارا چند

عموماً موجودہ ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً اس علاقے کی زبان کے ادب سے تعلق رکھنے والے بعض مسئلوں کا چرچا اخباروں میں زور شور سے ہو رہا ہے - یہ مسئلہ نیا نہیں ہے - انیسویں صدی کے آغاز میں جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے گل کرائیسٹ صاحب نے للو جی لال، سدل مسرا، میر امن، میر بہادر علی، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولا، نہال چند، شیر علی افسوس وغیرہ کو فارسی اور برج بھاشا سے ترجمہ کرنے کے لیے بلایا، تو ترجمے کی زبان کے نام اور انشاء و اسلوب وغیرہ کا سوال پیدا ہونا ناگزیر تھا - پوری انیسویں صدی میں اس مسئلے پر لوگوں کا دھیان لگا رہا اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے بڑے بڑے مباحثے بھی چھڑ گئے - سنہ ۱۸۶۰-۷۰ میں جون بیمس (John Beams) اور گراؤز (Growse) کے مابین مشہور علمی رسالوں میں اسی پر بحث بھی ہوتی رہی - راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند نے بیمس کی تائید کی جو زبان میں عربی اور فارسی عناصر کی حمایت

* یہ ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ ہے - (ایڈیٹر)

کر رہا تھا - لیکن راجہ لچھمن سنگھہ نے ان کی مخالفت میں گراؤز کا ساتھہ دیا جو کہتا تھا کہ ان زبانوں کی جگہہ سنسکرت کو ملنا چاھیے - یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس رجحان کو پرچانے میں عیسائی پادریوں کا بڑا ھاتھہ تھا - ھندوستانی لسانیات کے مشہور ماھر سر جارج گریرسن اپنی کتاب (Linguistic Survey of India) کی نویں جلد میں لکھتے ھیں :-

"بدنصیبی یہ ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کا سارا اثر سانسکرت پسندوں کی پشت پر رھا - پادریوں نے سنسکرت آمیز ھندی کو خوب اچھالا اور انجیل کے ترجمے اسی میں کیے - تھوڑے بہت مصنف عام فہم ھندی میں لکھتے رہے لیکن اس غلط روی کے سیلاب میں اُن کی دال نہ گلی" —

بیسویں صدی کی ابتدا سے یہ جھگڑا پھر چھڑ گیا ہے - یہ ماننا پڑے گا کہ جس سوال کو لے کر ڈیڑھ سو سال سے لوگ حجت کر رہے ھیں وہ معمولی نہیں ھو سکتا - ضروری ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور اپنے فیصلے میں انصاف کا دامن نہ چھوڑیں —

مسئلے کے تجزیہ سے پہلے میری رائے میں یہ درست ھوگا کہ ہم ان ناموں کو طے کرلیں جن کا استعمال کرنا ہے کیونکہ اس معاملے کو گول مول رکھنے کی وجہ سے بھی بدگمانیاں پیدا ھوئی ھیں - اس سلسلے میں بہت سے نام آئے ھیں جن میں یہ خاص ھیں : بھاشا 'ھندوی' ھندی 'ھندوستانی' زبان دھلوی' کھڑی بولی' مدھیہ دیش کی بولی' ریختہ' زبان اردوئے معلیٰ' اردو - ان میں سے ھندی' ھندوستانی اور اردو سب سے زیادہ اہم ھیں اور سارا جھگڑا انہیں کے استعمال کی نوعیت

سے شروع ہوا ہے —

ہندی

سب سے پہلے ہندی کو لیں - ہندوستانی لسانیات کے ہر جان کار کو معلوم ہے کہ ہندی یا ہندوی کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا رہا ہے - ان میں سے تین جو سب سے اہم ہیں حسب ذیل ہیں:—

(۱) ہندی یا ہندوی سے عام طور پر ہر وہ دیسی چیز مراد ہے جو غیر ہندوستانی نہیں ہے - یہ مطلب اسی وقت ظہور میں آگیا تھا جب مسلمان پہلے پہل اس دیس میں آئے اور دلی اور لاہور میں بسنے لگے اور وہاں کی بولی کو اپنانے لگے - اس کی کچھ مثالیں لیجیے - سنه ۱۲۲۸ ع میں محمد عوفی نے ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں وہ خواجہ مسعود سعد سلمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے ہندوی زبان میں ایک دیوان تیار کیا ہے - علاؤالدین خلجی کے زمانے میں فخرالدین مبارک غزنوی نے ایک لغت تیار کی جس میں فارسی کے ہم معنی 'ہندی' الفاظ جمع کیے - شاہ میراں جی شمس العشاق جن کا انتقال سنه ۱۴۹۵ میں ہوا اپنی نظم کی زبان کو ہندی کہتے ہیں - دکن میں 'ہندی' کا استعمال 'دکنی' کے ساتھ عام طور پر ہوتا تھا - نصرتی نے بھی اپنی زبان کو 'ہندی' کا لقب دیا ہے - شاہان مغلیہ کے دربار میں بھی جب 'دکنی' کی شاعری کا چرچا ہونے لگا تو دلی والے اسے ہندی ہی کہتے تھے - شاہ حاتم سے لے کر غالب تک اور پرانے سے پرانے نثر نگار سے لے کر سر سید احمد تک اس استعمال کے نمونے ملتے ہیں - اس معنی میں ہندی کا وہی مفہوم ہے جو اردو کا —

(۲) لفظ ھندی کا دوسرا مطلب ھے وہ بولیاں جنھیں من جملہ ' نئی انڈو آرین زبانیں کہتے ھیں - یہ جس علاقے میں بولی جاتی ھیں وہ پچھم میں سرھند سے لے کر پورب میں بنارس اور اُتر میں ھمالیہ کی ترائی سے لے کر دکن میں نربدا کی گھاٹی تک پھیلا ھوا ھے - یہ بولیاں پچھمی اور پوربی ھندی کے کنبوں سے نکلی ھیں - لہذا ' ھندی ' سے حسب ذیل بولیاں مراد ھیں : بندیلی ' کنوجی ' برج بھاشا ' بانگرو ' ھندوستانی (گریرسن) یا کھڑی بولی یا دھلوی اودھی ' بگھیلی ' اور چھتیس گڑھی - کچھ عالموں نے اس گروہ میں راج استھانی اور ماگھی کو بھی شامل کر لیا ھے - یوں دیکھو تو شمالی ھند کی تمام بولیاں ' ھندی ' میں ضم ھو جاتی ھیں —

(۳) ھندی سے جو تیسرا مفہوم پیدا ھوتا ھے ' وہ موجودہ زبان ھے جو ھندوستانی ' کھڑی بولی یا دھلوی کی ادبی شکل ھے - ھر لحاظ سے موجودہ ھندی پچھمی اور پوربی ھندی کی بولیوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ھے اور معنی نمبرا کی ھندی یا اردو کی ھم معنی ھے —

ھندی (۱) کے معنی میں اردو کا استعمال غالباً مصحفی نے سب سے پہلے کیا - میر نے نکات الشعرا میں اسے ' زبان اردوئے معلی ' سے موسوم کیا ھے - قایم کے مخزن نکات (سنہ ۱۷۵۴) میں بھی اردو کا نام آتا ھے - دکن کے شاعر باقر آگا نے سنہ ۱۷۷۲ میں اور تذکرہ گلزار ابراھیم کے مصنف علی ابراھیم خاں نے ۱۷۸۳ میں لفظ اردو کا استعمال کیا ھے عطا حسین تحسین (۱۷۷۰ یا ۱۷۹۷) نے زبان اردوئے معلی ' لکھا ھے - میر امن اپنی کتاب باغ و بہار کی زبان کو اردو بتلاتا ھے -

انیسویں صدی میں یہ نام مقبول ہوا اور اب اس سے ہندوستانی کھڑی بولی یا دہلوی کی ادبی صورت مراد ہے۔ صوریاتی و صوتیاتی اعتبار سے اردو اور موجودہ ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ جو فرق ہے وہ پرانی زبانوں سے لیے ہوئے الفاظ کے ذخیرے کا ہے ــ

"زبان ہندوستان" کا لفظ وجہی (۱۹۳۵) کی کتاب کی تاریخ فرشتہ (سنہ ۱۹۵۰) اور عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ (۱۹۵۰) میں ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں ہماری زبان کا یہ نام رائج تھا اور اس زمانے کے یورپین سیاحوں نے بھی اسی کا استعمال کیا ہے۔ ٹیری (۱۶۱۶) اور فریو (۱۶۷۳) نے اسے (Indostan) کہا ہے۔ امادوزی (۱۷۰۴) نے (Indostani) کی ایک لغت کے مسودہ کا ذکر کیا ہے اور کیٹلیر نے (Lingua Hindostanica) کی پہلی گرامر اور ذخیرۂ الفاظ تقریباً سنہ 1715 میں مرتب کیا تھا۔ لفظ 'ہندوستانی' اٹھارھویں صدی میں چل پڑا تھا۔ میر امن نے باغ و بہار میں ٹھیٹھ ہندوستانی' کو اپنی زبان بتلایا ہے۔ گل کرسٹ نے اپنی کتابوں کے عنوان میں ہندوستانی' کا ہی استعمال کیا ہے مثلاً "انگریزی ہندوستانی ڈکشنری"۔ گارساں دتاسی نے پیرس میں ہندوی' اور' ہندوستانی' کی تاریخ پر متعدد تقریریں کیں۔ 'ہندوستانی' کا استعمال کھڑی بولی' کے معنی میں بھی کیا گیا ہے۔ اکثر مصنفوں نے اسے 'اردو' کا مترادف لکھا ہے اور بعض نے 'جدید ہندی' کے لیے استعمال کیا ہے ــ

معاملے کی صفائی کے لیے نیچے ہم گریرسن کی تعریفات نقل کرتے ہیں:

"ہندوستانی خاص طور پر بالائی دوآبہ کی زبان ہے اور ساتھ ساتھ ہندوستان کی قومی زبان بھی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں

رسم الخطوں میں لکھے جانے کی صلاحیت اس میں ہے اور ادب میں سنسکرت یا فارسی الفاظ کے کثرت استعمال سے بھی وہ بچی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے اردو سے هندوستانی کی وہ صورت مراد ہے جس میں فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور اسی طرح هندی هندوستانی کی وہ شاخ ہے جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے" —

اس سے یہ ثابت ہوا کہ 'هندوستانی' کوئی ایسا نام نہیں جو هندی اور اردو کو نکالنے کے لیے گھڑا گیا ہو بلکہ ایک پرانا جانا پہچانا نام اس بولی کا ہے جو هندی اور اردو دونوں کی مشترکہ بنیاد ہے —

نام کے متعلق غلط فہمی کی وجہ سے زبان کے متعلق بھی عجیب عجیب بد گمانیاں پھیل گئی ہیں۔ زبان و ادب کے بڑے بڑے ماہر هندی، اردو اور هندوستانی کی ابتدا اور نشو و نما کے بارے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ان غلطیوں کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ہمارے ادب کی مختلف صورتوں سے ناواقف ہیں یا یہ کہ هندی کے مختلف معنوں (خصوصاً ۲ اور ۳) کے سمجھنے میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جو لوگ هندی کی اٹھان کا ذکر کرتے ہیں وہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ هندی کی تاریخ برج بھاشا، اودھی وغیرہ کی تاریخ سے الگ ہے۔ اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ هندی اور اردو کی تاریخ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں —

هندوستانی کی تاریخ

هندوستانی یا کھڑی بولی کا ارتقا نئی انڈو آریا بولیوں کی کسی ایک شاخ سے ہوا اور تقریباً دسویں صدی سے اس کی تاریخ کم و بیش مسلسل چلی آتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہی بنیادی بولی پہلے بھی اور اب بھی دوآبہ اور پڑوس کے علاقوں کی بول چال کی زبان ہے —

بارھویں صدی کے لگ بھگ جب مسلمان دھلی میں بسنے لگے تو یہ بولی خود بخود ان میں رائج ھوگئی۔ ان لوگوں نے کھڑی بولی کی صوتیات میں نئی نئی آوازیں پیدا کیں جو پہلے انڈو آریا زبانوں میں بالکل ناپید تھیں۔ مسلمانوں کے ذخیرۂ الفاظ کا اثر لامحالہ اس بولی پر پڑنا ھی تھا۔ یہ بول چال کی زبان رفتہ رفتہ ادبی زبان کے مرتبہ کو پہنچ گئی۔ کہتے ھیں کہ خسرو نے چودھویں صدی میں اس میں بہت کچھ لکھا۔ لیکن اس زمانے کی تحریروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ امر مشتبہ ھے۔ لیکن دکن میں یہ بولی نظم و نثر دونوں میں رواج پا گئی اور چودھویں و اٹھارھویں صدی کے درمیان وھاں ایک شاندار ادب کو فروغ ھوگیا۔ اس زبان میں جو ادب پیدا ھوا وہ بول چال کے الفاظ سے مالا مال ھے اور ادب پر غیر ملکی اثرات کا زیادہ اثر نہیں ھے۔ دکنی مصنفوں کا یہ دعوی بالکل حق بہ جانب تھا کہ ان کی زبان ھندی ھے —

مگر شمالی ھند کی حالت عجیب تھی۔ گو کھڑی بولی یا ھندوستانی کا بول چال میں چلن تھا لیکن اسے ادبی زبان کی حیثیت دکن نے ھی دی کیونکہ شمال میں سترھویں صدی سے پہلے کی ایسی کوئی قابل توجہ تحریر نہیں ملتی جسے اس نام سے موسوم کر سکیں۔ شاید اس کا سبب یہ ھے کہ جب کھڑی بولی تیرھویں صدی میں سلور نکھر کر تیار ھوئی تو اسے راج استھانی کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس زمانے میں شمال کی مقبول عام ادبی زبان تھی اور اس میں جینیوں کی تصانیف لکھی گئیں اور نرپتی نلہا اور دوسرے شاعروں نے رزمیہ اور دیگر اصناف کی نظمیں لکھیں —

پندرھویں صدی میں 'بھکتی' تحریک نے تین نئے فرقوں کا ڈول ڈالا : نراکار بھکتی' کرشنا بھکتی' اور رام بھکتی - پہلے فرقے کے علم بردار مثلاً کبیر' نانک اور دادو اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے کھڑی بولی یا ہندوستانی کو کام میں لائے - دوسرے فرقے کے حامی سورداس' نند داس وغیرہ نے برج بھاشا کو لیا اور تیسرے فرقے نے تلسی داس کی سرکردگی میں اودھی کو بڑھایا —

پندرھویں صدی سے لے کر بہت بعد تک ادب برج بھاشا اور اودھی کی گود میں پھولتا پھلتا رہا - ہندوؤں نے ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی انہیں کو اختیار کیا - چنانچہ برج بھاشا میں خان خاناں' رس لین اور رس خاں کا درجہ بہت بلند ہے - اور یہ سب مانتے ہیں کہ اگر ملک محمد جائیسی پہلے اودھی میں پدماوت نہ لکھتا تو تلسی داس جی کی راماین کو ہرگز یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا —

کھڑی بولی

اس زمانے میں موجودہ ہندی یا سنسکرت آمیز ہندوستانی کسی کونے کھدرے میں پڑی ہوئی تھی - بول چال تو کھڑی بولی میں ہی ہوتی تھی لیکن ادب کی تخلیق یا تو ہندوی (فارسی آمیز ہندوستانی) یا برج بھاشا اور اودھی میں ہی ہوئی یہ سلسلہ اٹھارھویں صدی تک قائم رہا - ہندی ادب کے کچھہ نئے مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ ہندی اٹھارھویں صدی سے بھی بہت پہلے موجود تھی لیکن یہ دعویٰ بالکل بے حقیقت ہے - سولھویں صدی میں گنگا بھٹ نے سولہ صفحے کا ایک رسالہ 'چند چھند برنن کی مہما' کے نام سے لکھا تھا جسے موجودہ ہندی نثر کا پہلا نمونہ بتلایا جاتا ہے - سو ڈیڑہ سو سال

بعد جاٹ مل کی ایک کتاب 'گورا بادل کی لڑائی' ملتی ہے - پہلا رسالہ برج بھاشا سے مرکب کھڑی بولی میں لکھا گیا ہے اور دوسری کتاب کے متعلق یہ طے ہوچکا ہے کہ وہ انیسویں صدی میں لکھی گئی اور ایک راج استھانی نظم کا ترجمہ ہے - کہتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی میں کھڑی بولی کی دو تین کتابیں اور لکھی گئی تھیں مثلاً منڈو ور کا ورنن' چکتا کی پت سہاھی کی پرم پرا - لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں کوئی ادبی خوبی نہیں اور وہ فارسی آمیز ہندوستانی ' برج بھاشا یا اودھی کی ہم عصر تصانیف سے مقابلہ نہیں کر سکتیں —

اس تمام عرصے میں 'ہندوستان کی قومی زبان اور ہندو مسلمان شرفاء کی بولی فارسی آمیز ہندوستانی ہی تھی' سنسکرت آمیز ہندوستانی نہیں' - سنہ ۱۸۷۱ ع کو زیادہ دن نہیں گذرے جب بھارتیندو ہریشچندر نے اپنی ایک کتاب 'اگروال جاتی کی ابتدا' کے دیباچے میں لکھا تھا کہ "ان کی بولی 'استری اور پرش سب کی' کھڑی بولی ارتھات اردو ہے" - اکیلی اگروال جاتی ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کی تمام جاتیوں کی زبان اردو ہی تھی —

موجودہ ہندی کی زندگی انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے - منشی سدا سکھ لال نیاز ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے پنشن لے کر الہ آباد میں رہنے لگے تھے - انہوں نے بھاگوت پران کا ایک آزاد ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام 'سکھ ساگر' رکھا - اسی زمانے میں انشاللہ خاں نے 'رانی کیتکی کی کہانی' لکھی - پھر سدل مسرا اور للو لال کو فورٹ ولیم کالج کے انگریز استادوں نے حکم دیا کہ ایک ایسا ادبی اسلوب ایجاد کرو جو فارسی آمیز ہندوستانی کی جگہ لے کر

ہندوؤں میں مقبول ہو سکے - مسٹر کے (Keay) اپنی انگریزی تصنیف (History of Hindi literature) میں فرماتے ہیں: " لیکن اردو کا ذخیرۂ الفاظ عربی اور فارسی سے مستعار تھا اور خاص طور پر اسلام سے وابستہ تھا - ہندی بولنے والوں کی ایک ایسی ادبی زبان کی اشد ضرورت تھی جو ہندوؤں کے لیے پسندیدہ ہو - یہ کام اس طرح انجام پایا کہ اردو سے فارسی و عربی کے الفاظ نکال کر ان کی جگہہ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بھر دئے گئے ... للوجی لال کی ہندی ایک نئی ادبی بولی تھی " - پنڈت چندردھر شرما گلیری ' سنہ ۱۹۲۱ میں ناگری پر چارنی سبھا کے آرگن میں لکھتے ہیں: " ہندوؤں کی رچی ہوئی پرانی کوتا جو ملتی ہے وہ برج بھاشا یا پوربی بیسواری ' اودھی ' گجراتی آدی میں ملتی ہے ' ارتھات ' پڑی بولی ' میں پائی جاتی ہے - کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ یا ورتمان (موجودہ ہندی کے آرمبھہ کال (ابتدائی زمانہ) کے گدیہ اور پدیہ (نظم و نثر) کو دیکھہ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اردو رچنا میں سے فارسی عربی شبدوں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی شبد رکھنے سے ہندی بنالی گئی ہے " - موسیے ژول بلوک نے بھی ان دونوں بیانوں کی تصدیق کی ہے - وہ لکھتے ہیں: " ڈاکٹر گل کرسٹ کی ترغیب سے للولال نے پریم ساگر کو لکھہ کر یہ سب کچھہ بدل دیا - اس کتاب کی نثر اردو ہی ہے ' فرق اتنا ہے کہ فارسی کے الفاظ کی جگہہ اندوآرین ' الفاظ نے لے لی ہے ... یہ نئی بولی آگے چل کر ہندوؤں کی قومی زبان بن گئی " —

ہندی ۱۳۵ سال پرانی ہے

ہندی کے کچھہ نئے لکھنے والوں نے ہندی کی تاریخ کے اس نظریہ

سے اختلاف کیا ہے - لیکن میری رائے میں ان کے اختلاف کی کوئی بنیاد نہیں ہے - میرا خیال ہے کہ موجودہ ہندی کی پیدائش اور ارتقا کا مطالعہ اگر انصاف سے کیا جائے تو صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ یہ ہندی ۱۳۰ سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے اور شاید اتنی بھی نہیں - کیونکہ سدل مسرا اور للو لال نے ہندی کا جو راگ چھیڑا تھا وہ فوراً فضا میں گم ہو گیا اور غدر سے پہلے بالکل نہ سنائی دیا - غدر کے بعد راجہ شو پرشاد، راجہ لچھمن سنگھہ اور بابو ہرشچندر نے اس بھولے ہوئے گیت کو پھر الاپنا شروع کیا اور ہندی کے لیے ایک مستقل راستہ بنا دیا —

غلط فہمی سے بچنے کے لیے میں چند امور بیان کرتا ہوں جس کی تصدیق ہماری زبان کا ہر انصاف پسند محقق کرے گا —

(۱) انڈو آریائی کنبے کی پوربی بھتی "ماگھی" کا ادب آٹھویں صدی سے شروع ہوتا ہے —

(۲) اسی کنبے کی دوسری بھتی راج استھانی کا ادبی ذخیرہ ۱۲ سے لے کر ۱۹ ویں صدی تک مالا مال رہا لیکن اب بالکل تلاش ہو گیا ہے —

(۳) برج بھاشا کو ۱۵ اور ۱۹ ویں صدی کے درمیان بڑا عروج حاصل ہوا لیکن موجودہ ہندی کی ترقی کے بعد اس میں نثر کا نشان بھی نہ رہا اور اب اس میں شاعری بھی بہت کم لوگ کرتے ہیں —

(۴) اودھی کو پندرھویں صدی میں مقبولیت ہوئی لیکن وہ برج بھاشا کی رقیب کبھی نہ بن سکی اور اب اسے ادبی زبان کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا —

(۵) پوربی اور پچھمی ہندی کی مختلف شکلوں میں ۱۴ سے لے کر ۱۹ ویں صدی تک ادبی تصلیفیں پیدا ہوتی رہیں لیکن اب ان میں کوئی کچھہ نہیں لکھتا —

(۶) کھڑی بولی یا ہندوستانی کی دو ادبی صورتیں ہیں - پرانی شکل پہلے ہندی کے نام سے اور اب اردو کے نام سے معروف ہے - اس کی تاریخ چودھویں صدی سے لے کر آج تک مسلسل چلی آتی ہے - دوسری شکل ہے موجودہ ہندی جس نے ادبی شکل انیسویں صدی کے آغاز میں اختیار کی اور غدر کے بعد سرعت سے ترقی کی —

ہندی ' اردو اور ہندوستانی

ہندی ' اردو اور ہندوستانی کے باہمی تعلق کے متعلق بھی بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے - اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان تینوں ناموں سے مراد صرف ایک ہی زبان ہے - زبانوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کے تقابلی جانچ کی ضرورت ہوتی ہے : (۱) صوتیاتی پہلو - (۲) صوریاتی یا نحوی پہلو - (۳) ذخیرۂ الفاظ —

ان تینوں میں پہلے دو کی اہمیت زیادہ ہے - لسانیات کے سب ماہر مانتے ہیں کہ ہر زبان کے عناصر میں نحوی ساخت سب سے زیادہ مستحکم چیز ہے اور نسلاً بعد نسل تمام ارتقائی تبدیلیوں میں اپنی اصلی صورت میں برقرار رہتی ہے - اسی طرح صوتیات کا نظم بھی اگرچہ ایسا مستقل نہیں ہوتا ' تاہم کم و بیش یک ساں رہتا ہے - لیکن ذخیرۂ الفاظ میں بے ڈھب تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں - زبان کے بہت بڑے ماہر موسیئے میلے (A. Meillet) ایک جگہہ لکھتے ہیں : " تلفظ اور گرامر مستقل عناصر ہیں

اور ان دونوں کے تمام اجزا آپس میں گھل مل جاتے ھیں - صوتیاتی اور صوریاتی نظام میں کسی دوسری جگہ سے مستعار لینے کی صلاحیت نہیں ھوتی - اس کے برعکس الفاظ کسی نظام کے تحت نہیں آتے - زیادہ سے زیادہ وہ گروھوں میں منقسم رھتے ھیں ورنہ ہر لفظ منفرد ھوتا ھے اور یکہ و تنہا رھتا ھے ..... کسی خاص زبان کو بولنے کی مسلسل خواھش لسانیاتی اعتبار سے زیادہ تر تلفظ اور گرامر میں ھی ظاھر ھوتی ھے —

فارسی زبان میں عربی الفاظ کی بہتات ھے تو کیا ھوا - اس کا شمار آریائی زبانوں میں ھی ھوتا ھے - انگریزی ٹیوٹانی زبان ھی رھیگی خواہ اس میں لیٹن کے کتنے ھی الفاظ موجود ھوں - انگریزی زبان کا ایک حصہ اگر لیٹن الفاظ کو ترجیح دیتا ھے اور دوسرا انگلوسکسن کو، تو اس سے یہ مراد نہیں کہ انگریزی دو زبانوں میں بٹ گئی - اپنے گھر میں دیکھو - سندھی اور پنجابی میں عربی کے الفاظ کس کثرت سے گھل مل گئے ھیں لیکن ان کی صوتیات اور گرامر پکار پکار کر کہہ رھی ھیں کہ وہ آریائی قبیلے میں سے ھیں —

ذخیرۂ الفاظ کا انحصار بڑی حد تک تاریخ پر ھوتا ھے - اس کی ایک مثال گذشتہ جنگ عظیم ھے - انگلنڈ میں امرا کے جرمن نام بدل کر انگریزی کر دیے گئے، حتیٰ کہ House of Hanover کو House of Windsor کہا جانے لگا - فرانسیسی جو غیر زبان کے الفاظ کو اپناتے ھوئے ناک بھوں سکیڑتی ھے اب انگریزی الفاظ کو سر آنکھوں پر لینے لگی - روسیوں نے اپنے شہروں کے نام سے جرمن لاحقہ Burg کو نکال کر سلاوک لاحقہ Grad جوڑ لیا - تاریخی اسباب قومی تعصبات اور دوسرے سماجی تغیرات ذخیرۂ الفاظ پر برابر اثر پذیر ھوتے رھتے ھیں —

ان اصولوں کی روشنی میں ہم کیا دیکھتے ہیں ؟ ہندی، اردو اور ہندوستانی کی صوتیات میں کوئی فرق نہیں - سب میں آواز کی وہی تین قسمیں ہیں : قدیم انڈو آریائی حروف صحیح و حروف علت ؛ جدید انڈو آریائی حروف صحیح و حروف علت اور سامی اصوات - نحویوں نے بھی گھما پھرا کر اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے مثلاً کامتا پرشاد گرو نے ہندی ویاکرن میں، ڈاکٹر دھرندر ورما نے اپنے 'ہندی بھاشا کا اتہاس' میں اور مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں ' صوتیاتی اعتبار سے ہندی اردو اور ہندوستانی میں یکانگت ہے لیکن اور دوسری آریائی و سامی زبانوں مثلاً سنسکرت، برج بھاشا، اودھی، فارسی اور عربی سے مختلف ہیں —

پھر یہ بھی ہے کہ تینوں کی گرامر تقریباً ایک ہے - گریرسن کا بیان ہے کہ اردو اور ہندی کی تصریف یا گردان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے - بقول مسٹر بیمس " ہندی اور اردو کو دو مختلف زبان بتانا، لسانیات کی کم علمی اور اس مسئلے کی نوعیت کے متعلق سخت غلط فہمی کی دلیل ہے " —

البتہ ذخیرۂ الفاظ کے معاملے میں دونوں میں فرق ہے - ہر زبان کے الفاظ کے ذخیرے میں اس کے اصلی یا بول چال کے بھی الفاظ ہوتے ہیں اور بہت سے پرانی زبانوں کے بھی جو اس میں کھپ گئے ہیں - جہاں تک ہندی اور اردو کا تعلق ہے، ان کے اسما، افعال، حروف عطف، حروف ربط اور حروف فجائیہ وغیرہ مشترک ہیں - جہاں تک اسم اور صفت کا تعلق ہے، دونوں نے بول چال کے علاوہ سنسکرت، پراکرت، عربی اور فارسی وغیرہ سے بکثرت الفاظ مستعار لیے ہیں - اس قرض کی صحیح نوعیت نامعلوم ہے کیونکہ ایسی لغات موجود نہیں جو جدید اصولوں پر

مرتب کی گئی ہوں - سید احمد دہلوی نے اپنی مشہور لغت ' فرہنگ آصفیہ ' میں اُن الفاظ کا تجزیہ کیا ہے جنہیں وہ جمع کرسکے - الفاظ کی کل تعداد ۵۰ ہزار ہے - ان میں عربی کے ۷۵۸۴ ' فارسی کے ۶۰۴۱ سنسکرت کے ۵۵۴ ' انگریزی کے ۵۰۰ اور دوسری زبانوں کے ۱۸۱ الفاظ ہیں - باقی الفاظ ملکی ہیں - اب ہندی شبد ساگر کو دیکھئے جو ہندی کی سب سے بڑی لغت ہے - اس میں عربی کے بھی ۷۵۸۴ اور فارسی کے ۶۰۴۱ الفاظ تقریباً اسی طرح موجود ہیں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کے متعلق ہندی اور اردو میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے - اب مرکب اور مشتق الفاظ کے لیے ان دونوں کے گراموں کو دیکھیے تو پتا چلے گا کہ ان کے سابقے اور لاحقے بہت بڑی حد تک ایک ہی ہیں —

۵ لائل سنسکرت آمیز ہندی کے حق میں

اگرچہ ہندی اور اردو کے ذخیرۂ الفاظ کے مشترک پہلوؤں کا تذکرہ ضروری ہے لیکن یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اس معاملے میں دونوں میں بڑا اختلاف بھی ہے اور اگر مناسب تدبیر نہ اختیار کی گئی تو یہ اختلاف بڑھتا ہی جائے گا - ہندی اور اردو کے مصنف دو گروہوں میں بٹے ہوے ہیں - ایک کا خیال ہے کہ کلاسکل زبانوں کے الفاظ کا چلن کثرت سے ہونا چاہیے ' لیکن دوسرا ان کے استعمال کو محدود کرنا چاہتا ہے - اپنی اپنی تائید کے لیے وہ یکساں دلیلیں پیش کرتے ہیں - مثال کے لیے ہندی کے اس اسکول کو لیجیے جو سنسکرت کے اصل الفاظ کے کثرت استعمال کا حامی ہے اور فارسی و عربی الفاظ کو چن چن کر نکالنا چاہتا ہے - اس کے دلائل حسب ذیل ہیں —

(۱) هندی ایک اندو آریائی بولی هے اور اپنے قبیلے کی دوسری زبانوں سے مثلاً بنگالی ' گجراتی اور مرهٹی سے اس کا تعلق بہت گہرا هے - فطرتاً یہ سب اپنی جنم سوت یعنی سنسکرت کے الفاظ مستعار لیں گی - ان سب میں سنسکرت کے اصل الفاظ کا جتنا زیادہ استعمال هوگا اور اصطلاحات میں سنسکرت کے مادے جتنے زیادہ آئیں گے ' ان سب کا باهمی تعلق اتنا هی بڑھتا جائے گا اور ان زبانوں کے بولنے والوں کو هندی سیکھنے میں اتنی هی آسانی هوتی جائے گی - اس طریقے سے بین صوبجاتی زبان کی حیثیت اختیار کرنے میں هندی کو سہولت هوگی —

(۲) الفاظ کے ساتھہ تمدنی روایات وابستہ هوتی هیں - سنسکرت الفاظ میں قدیم هندوستانی تمدن کی روح سمائی هوئی هے - لیکن فارسی و عربی الفاظ میں غیر ملکی بو باس پائی جاتی هے - اس لیے ایک هندوستانی زبان کے لیے لازم هے کہ وہ پردیسی الفاظ کے مقابلے میں دیسی الفاظ کو رواج دے —

یہ دلیلیں وزنی هیں - دل پر ان کا اثر بھی هوتا هے - اچھا هو اگر ان کو غور سے پرکھا جائے —

دلائل فارسی آمیزش کے حق میں

جو لوگ مستعار الفاظ (Loan Words) کا تنہا ماخذ عربی کو بنانا چاهتے هیں وہ بھی تقریباً ایسی هی باتیں کہتے هیں - ان کا بیان هے کہ عربی ایک بہت بڑے فرقے کی مذهبی زبان هے اور ایسی روایات کی حامل هے جو انهیں نہایت محبوب هیں - پھر یہ بھی هے کہ عربی زندہ زبان هے اور مغرب کے جدید علوم کو تیزی سے ضم کر رهی هے - اس لیے جدید علوم کی ترجمانی کی اس میں بڑی صلاحیت هے - هندوستان بھر کے مذهبی حلقوں میں بڑے شوق سے اس کا مطالعہ

کہا جاتا ہے اور اس کی مخصوص آوازیں و محاورے لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں - اس نے ہندوستانی یا کھڑی بولی کو ہمیشہ متاثر کیا ہے - اس کے صوتیاتی و نحوی نظام اور ذخیرۂ الفاظ کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے - عہد ماضی کے مشہور مصنف مثلاً سورداس اور تلسی داس بھی اپنے دوہوں اور گیتوں میں بے تکلف عربی الفاظ کو جگہہ دیتے ہیں - اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے ہزاروں بول زبان کے رگ و ریشہ میں گھل مل گئے ہیں - اس کی شہادت ہندی شبدساگر سے مل سکتی ہے —

ان دلائل کا تجزیہ

کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ دلیلیں بالکل بیکار ہیں - لیکن انہیں اچھی طرح جانچنے کے بعد اس نتیجے پر آنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں میانہ روی ہی راہ راست ہے —

ہندوستانی کو سنسکرت آموز بنانے کے خلاف سر جارج گریرسن اور جے - بیمس جیسے مشہور یورپین عالموں نے ہی نہیں بلکہ راجہ شیو پرشاد پنڈت بال کشن بھٹ ، پنڈت گردھر شرما ، پنڈت پرم سنگھ شرما اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیائے جیسے نامور حضرات نے بھی آواز بلند کی ہے - میں یہاں صرف پنڈت گردھر شرما کا قول نقل کرتا ہوں - فرماتے ہیں :

" سنسکرت جٹیے بناکر آپ نے بنگال مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار شیگھر (جلدی) کر لیا کنتو (لیکن) وہ کیول سکچھتوں (پڑھے لکھوں) کی بھاشا بن گئی - سرو سادھارن (عوام الناس) اسے بالکل نہ سمجھہ سکے تو کیا لابھہ ہوا - لابھہ کیا بڑی ہانی (نقصان) ہو گئی ... ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد ہي پرتھم (پہلے) لینے چاہیئیں ، پھر جب ان سے اوشیکتا پوری نہ ہو

تب سنسکرت بھاشا سے سرل شبد لینے چاہیئیں" —

دوسری طرف سید علی بلگرامی مولوی وحیدالدین سلیم اور مولانا عبدالحق جیسے عالموں نے عربی پسند طبقے کے جوش کو سلامت روی کی طرف لانے کی کوشش کی ہے - مولوی وحیدالدین " وضع اصطلاحات " کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" ہم کو اس دھوکے سے بچنا چاہیے اور ہندی زبان کے الفاظ و حروف سے جو ہماری زبان کی فطرت میں داخل ہیں ' ناک بھوں چڑھانا نہیں چاہیے - ہم جس طرح عربی فارسی سے اصطلاحات لیتے ہیں اسی طرح ہندی سے بھی بے تکلف وضع اصطلاحات میں کام لینا چاہیے " —

مشکل یہ ہے کہ ان دونوں ہم خیال گروہوں میں اشتراک عملی کی صورت نہیں نکلی اور اسی وجہ سے ان کے مشورے کا زبان پر اثر نہ ہوا - انجام یہ ہوا کہ ہندی اور اردو دونوں علما کی مخصوص بولی ہوتی جاتی ہیں اور عوام کی بولی سے ان کا بعد بڑھتا جاتا ہے - ان کا فرض تھا کہ پڑوسیوں میں بھائی چارے کا ناتا جوڑتیں لیکن اس کے برعکس وہ ان میں خلیج پیدا کر رہی ہیں ' اپنی افادیت کے دائرہ کو تنگ اور اپنی مقبولیت کو محدود کر رہی ہیں —

" تہذیبی تعلق "

تہذیبی تعلقات کی دلیل پر خواہ مخواہ زور دیا جارہا ہے - تہذیب ' روحانی اخلاقی سماجی اور جمالیاتی اقدار سے تعلق رکھنے والی چیز ہے - یہ اقدار کچھہ تو قدرت سے جد و جہد کرنے سے پیدا ہوتے ہیں جس سے انسانی نسلیں اپنے آپ کو قائم رکھہ سکتی ہیں - اور کچھہ انسان کی باطنی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں آگے بڑھنے

اور ترقی کرنے کی ترغیب ہوتی ہے - غرض یہ کہ تہذیب حیاتی و نفسی عناصر سے عبارت ہے - اسی لیے جغرافی تہذیبیں - رونما ہوتی ہیں مثلاً فرینچ' انگلش' چینی یا ایرانی - اور طبقاتی تہذیب بھی مثلاً سامنتی' سرمایہ دارانہ یا مزدورانہ ـــ

ہم ہندوستانی تہذیب کا بھی ذکر کرتے ہیں - لیکن یہ 'اردو تہذیب' یا 'ہندی تہذیب' کیا بلا ہے؟ - اردو (فارسی آمیز ہندوستانی) میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کا پرچار ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی نہ ہو - اسی طرح ہندی (سنسکرت آمیز ہندی) نے مسلمانوں کی بھی خدمت کی ہے - اور کیوں نہ ہو؟ - جب چینی' فارسی' پشتو' جاوی - اودھی اور بنگالی وغیرہ بیسیوں زبانیں جنھیں عربی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا' مسلمانوں کے مذھبی خیالات کو تحریر و تقریر میں ادا کرسکتی ہیں' تو ہندوستانی میں سنسکرت الفاظ کے استعمال سے مذھب پر کیوں آفت آنے لگی؟

ہندوستانی تہذیب ابھی حال ہی کی چیز ہے' اور اس کی ٹکسال میں اس ملک کے سب بسنے والے اپنا اپنا ہدیہ لاکر دیتے ہیں - صداقت اور قدر کے متعلق اس کا نصب‌العین صوبوں' فرقوں یا عقیدوں کے بندھنوں کو توڑ کر قومیت کی رفعت کو پہنچتا ہے - یہ تہذیب جن حیاتی اور سماجی حالات میں پروان چڑھ رہی ہے وہ گذرے ہوئے زمانے سے یکسر مختلف ہیں - اور ہماری باطنی اور خارجی کشاکش کی نوعیت اب بالکل الگ ہے - پرانے اقدار کو اب ہم نئی کسوٹیوں پر کستے ہیں اور اس کے لیے اظہار و ترجمانی کا نیا پیرایہ درکار ہے - ایک مشترکہ

تہذیب کے احساس ھی کو ھندوستان کی تمام ادبی کاوشوں کا محرک ھونا چاھیے، خواہ ان کا ذریعۂ اظہار ملک کی کوئی بھی زبان ھو ــ

ان سب باتوں کو مدنظر رکھہ کر ھمیں اردو اور ھندی کی دو الگ الگ تہذیبی فضاؤں کو بیجا اھمیت نہ دینا چاھیے - اس کے برعکس ھمیں دیکھنا چاھیے کہ اگر وہ خیال عام ھوگیا جو ذیل کی اصطلاحات وضع کرنے والوں کے ذھن میں تھا تو اس کا کیا نتیجہ ھوگا ــ

انگریزی	اردو	ھندی
Abscissa	فصلہ یا مقطع	بھُج
Absolute term	رقم مطلق	پرم پد
Accelerate	اسراع حرکت	گتی وردھی کارن
Algebra	جبر و مقابلہ	بیج گنت
Alternando	تبدیل	ایکانتر نشپتی
Antecedent	مقدم وغیرہ	پور و پد وغیرہ

عملی دشواریاں

یہ الفاظ میں نے ناگری پرچارنی سبھا، اور انجمن ترقیء اردو کی لغات اصطلاحات سے چنے ھیں - یہ الجبرا کی بعض اصطلاحات کا نمونہ ھے اور اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ھندوستانی کی ان دونوں شاخوں میں کتنی دوری پیدا ھوگئی ھے - جب تک انگریزی ذریعۂ تعلیم تھی ھندوستانی طلبا کو اس کا فکر نہ تھا کہ ھندوستانی زبان میں اصطلاحات کی کتنی شکلیں ھیں - لیکن اب جب کہ ثانوی درجوں کے لیے ھندوستانی کو ھی ذریعۂ تعلیم بنایا جارھا ھے اور وہ دن دور نہیں جب اعلیٰ تعلیم بھی ھندوستانی زبانوں میں دی جائے گی، تو خاص طور پر شمالی ھند میں (بنگال کو

چھوڑ کر) اصطلاحات کا یہ دو دھارا بڑی الجھن پیدا کر دیتا ھے - کیونکہ اس علاقے میں ھندی اور اردو دونوں کے رسیا رستے بستے ھیں - اگر اردو اور ھندی طلبا کے لیے ناقابل فہم بن جائیں تو پھر اس کے سوا کیا کیا جاسکتا ھے کہ اسکولوں میں دوھری تعلیم کا انتظام کیا جائے - اس سے یا تو معیار تعلیم پر اثر پڑے گا یا خرچ بڑھ جاے گا - اور یونیورسٹی میں تو یہ دشواری حد سے زیادہ بڑھ جائے گی - تحقیق و اشاعت علم اور حصول تعلیم کی راہ میں سیکڑوں رکاوٹیں پڑ جائیں گی - کیا ھمیں ھر یونیورسٹی میں ھندی اور اردو کے پروفیسر الگ الگ رکھنے ھوں گے ' اور نہیں تو کیا ایک مقام پر دو دو یونیورسٹیاں ایک ھندی اور ایک اردو کے لیے قایم کرنا ھوگی —

اور حکومتوں اور کونسلوں کی زبان کیا ھوگی ؟ - اس مسئلے پر پنجاب میں بحث شروع ھوچکی ھے - اور وہ دن دور نہیں ' جب یو - پی بہار اور آخر میں دھلی کو بھی اس سوال کا جواب دینا ھوگا - ریڈیو سینما ' ناٹک ' بین صوبجاتی بیوپار اور بیوھار کی زبان کی صورت کیا ھوگی - انگریزی کی جگہہ کون سی دیسی زبان قرار پاے گی ؟ - میں یہ باور کرلیتا ھوں کہ ھم سب کم از کم اس معاملے میں متفق ھیں کہ انگریزی مستقبل میں یہ فرائض انجام نہیں دے گی —

یہ امر کس قدر افسوسناک ھے کہ مستعار الفاظ کی خاطر ھم ایک ھی زبان کی دونوں شاخوں کو مختلف راستوں پر لے جا رھے ھیں اور سرکاری اور تعلیمی مسائل کے حل کو زیادہ مشکل بنا رھے ھیں —

ھندوستانی کی حمایت میں چند باتیں

میں نے اوپر یہ دکھانے کی کوشش کی ھے کہ ھندوستانی کوئی

مصنوعی بولی نہیں ہے - ہزار برس سے زبان کے اعتبار سے اسے خاص حیثیت حاصل ہے - اس کے ادب کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے - کیونکہ دکن میں نظم اور نثر کے جتنے نمونے ملتے ہیں ان سب کو میں ہندوستانی میں شامل کرتا ہوں - شمال میں، پردیس کی نقل پر ادیبوں نے زیادہ توجہ کی، تاہم نظم کا بہت سا حصہ ایسا بھی ہے جو صاف، سلیس اور عام فہم ہے - کسی زمانے کا بھی دیوان اٹھا لیجئے اس کی مثالیں ملیں گی - حالی کی 'مناجات بیوہ' اور 'برکھارت' اس اردو کے بہترین نقش ہیں جسے ہم جذبات اور محاورہ دونوں کی رو سے ہندوستانی کہہ سکتے ہیں - ڈھونڈنے سے نئی ہندی میں بھی ہندوستانی کی جھلکیاں مل جاتی ہیں - میں صرف ایک مصنف کا ذکر کروں گا، لیکن وہ ایسا ہے کہ نئے ہندی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتا - میرا اشارہ پریم چند کی طرف ہے —

اصل حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ادبی عبارت کا تعلق ہے، موجودہ ہندی اور اردو، ہندوستانی ہی کے دو اسالیب ہیں - اور علمی تحریروں میں ان کا اختلاف مستعار الفاظ کی حد تک ہے - میرا خیال ہے کہ اگر ایمانداری سے کوشش کی جائے تو یہ امتیاز بھی دور ہوسکتا ہے - ذاتی طور پر مجھے اس کی کامیابی پر پورا یقین ہے اور میں ان لوگوں کے آگے اسی نیت سے چند تجویزیں ذیل میں پیش کرتا ہوں، جو چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے تفرقے کی خلیج پٹ جائے :-

(۱) ایسی تدبیریں اختیار کرنا کہ اردو بولنے والے نئی ہندی سیکھیں اور ہندی بولنے والے اردو سیکھیں —

(۲) اردو اور ہندی کے مانے ہوئے مصنفوں نے جن الفاظ کا استعمال کیا

ہے' ان کی ایک لغت تیار کرنا ۔

(۳) جدید اصولوں پر ایک گرامر مرتب کرنا جس میں ہندی اور اردو کے صوتیاتی و صورںیاتی طریقوں کا تجزیہ ہو اور ترکیب و تصریف کے قاعدوں کو لکھنے میں فراخ دلی سے کام لیا جائے ۔

(۴) ہندی اور اردو کے مصنفوں کے استعمال کے لیے اصطلاحات کی لغت تیار کرنا ۔

(۵) مترجموں کے لیے ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری تیار کرنا ۔

(۶) اردو اور ہندی ادب کے ایسے نمونوں کا مجموعہ جو سلیس اور عام فہم ہوں ۔

ان تجویزوں میں سے بعض ایسی ہیں جن پر افراد یا ادارے عمل کر سکتے ہیں ۔ لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن کے لیے حکومت کی مدد ضروری ہے ۔ مثلاً اسکولوں میں ہندی اور اردو کی مشترک تعلیم کا انتظام حکومت ہی کر سکتی ہے ۔ اسی طرح' اصطلاحات کی لغت کی ترتیب کے لیے ہندی اور اردو کے عالموں کا تعاون ضروری ہے ۔ اس تجویز کا اثر کئی صوبوں اور ریاستوں پر ہوگا ۔ اس لیے وہاں کی حکومتوں کے اشتراک کے بغیر یہ کام آسانی سے نہیں ہو سکتا ۔ لیکن مسئلے کی اہمیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں ۔ فرانس کی اکیڈمی کی طرح یہاں کوئی انجمن نہیں ہے ۔ اس لیے تعلیم گاہوں' حکومت کے نمائندوں اور ادبی و علمی انجمنوں کے نمائندوں کی ایک ایسی کمیٹی ہونا چاہیے جو مشترک اصطلاحات کے مخصوص مسئلوں پر غور کرے اور اس کی رائے قطعی حیثیت رکھتی ہو ۔

اگر سائنس و حرفت کی اصطلاحات کا جھگڑا طے ہوگیا تو اردو

اور ہندی کی نزاع کی جڑ کٹ جائے گی ، اور ایک ہی علاقے میں دو دو زبانوں کے وجود سے پیدا ہونے والی مشکلات رفع ہونے لگیں گی - اور ہندی اردو کا بہاو ادب اور بول چال دونوں میں ایک ہی سمت ہو جائے گا —

ہندی اور اردو کا مستقبل

منشی پریم چند مرحوم کی ایک تقریر

میں یہاں ہندی زبان کی اُٹھان اور اُبھار کی داستان نہیں سنانا چاہتا - اس موضوع پر متعدد کتابیں موجود ہیں - صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آج یہ پندرہ سولہ کروڑ ہندوستانیوں کی زبان ہے - البتہ یہ دو رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے اور اسی اعتبار سے اسے کہیں ہندی اور کہیں اردو لکھتے ہیں ، لیکن در اصل یہ ہے ایک - بول چال میں ان میں فی الواقع کوئی فرق نہیں ہوتا ، لیکن ادب میں تمیز ضرور بڑھ جاتی ہے - مگر یہ امتیاز ہندی کے لیے مخصوص نہیں - گجراتی ، بنگالی اور مرہٹی وغیرہ زبانوں میں بھی کم و بیش ایسا ہی فرق پایا جاتا ہے - ہر زبان کے ارتقا میں وقتی تمدن کو بھی دخل ہوتا ہے اور تمدنی اختلاف کی وجہ سے زبانوں میں بھی بال پڑنے لگتا ہے - ہم لوگ جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ صوبۂ دہلی کی زبان ہے ، اسی طرح جیسے ' برج بھاکھا ' اودھی ' میتھلی ' بھوج پوری اور مارواڑی وغیرہ مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں اور ان سب کو کبھی ادبی زبانوں کا مرتبہ حاصل تھا - بولی کی مہذب شکل ' زبان ہے - سب سے زیادہ اثر برج بھاکھا کا ہوا ، کیونکہ وہ صوبۂ آگرہ اور بندیل کھنڈ کی زبان ہے - اودھی اودھ

میں بولی جاتی ہے - بھوج پوری پوربی یو-پی میں بولی جاتی ہے اور میتھلی بہار کے بعض اضلاع میں - برج بھاکھا کی شاعری ہندی ادب کی جان ہے - اودھی تصانیف میں تلسی داس کی راماین اور ملک محمد جائیسی کی 'پدماوت' بہت مقبول ہوئیں - غرض کہ ادب میں برج بھاکھا اور اودھی کا استعمال زیادہ ہوا - ہندی کے ابتدائی دور میں برج بھاکھا کو خاص فوقیت حاصل تھی اور صرف بنارس ہی نہیں بلکہ گیا (بہار) تک کے شعرا اسی زبان میں شعر کہتے تھے —

بعد ازآں یک بیک ان مقامی بولیوں کا تختہ اُلٹ گیا اور ہندی نے ان سب کا نمبر چھین لیا - برج بھاکھا کو اب بھی تھوڑے سے لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں ورنہ اور دوسری بولیوں کو ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں - ہندی کو یہ امتیاز مسلمانوں نے بخشا تھا - صوبۂ دہلی کی اس بولی کو مسلمانوں نے ہی نوازا' اسے سنوار نکھار کر دربار کی زبان بنایا اور ان کے امرا اور سپاہی جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے - انہیں کے ساتھ یہ دکن پہنچی اور وہیں اس نے اپنا بچپن گذارا - دہلی میں عرصۂ دراز تک افراتفری رہی اور اس زبان کو ترقی کا موقع نہ ملا - لیکن دکن میں یہ پھولتی پھلتی رہی - گول کنڈہ' بیجاپور وغیرہ کے درباروں میں یہ پروان چڑھتی رہی - مسلمان سلاطین بالعموم ادب کے رسیا ہوتے تھے - بابر' ہمایوں' اکبر' جہاں گیر وغیرہ کو ادب سے بڑا لگاو تھا - دکن کے بادشاہوں میں بیشتر سخن گو اور سخن سنج تھے - آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ہندی کا بابا آدم امیر خسرو ہے جو خلجیوں کا ہم عصر تھا —

مسلمانوں کے عہد میں ہندی کی تین شکلیں ہوں گی - ایک ناگری

خط میں ٹھیٹھہ ہندی جسے بھاکھا یا ناگری کہتے تھے - دوسری اردو یعنی فارسی خط میں لکھی ہوئی فارسی آمیز ہندی اور تیسری برج بھاکھا - ہندی زبان کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں لگ گئیں - یہاں تک کہ سنہ ۱۸۰۳ ع سے پہلے کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوتی - اس کتاب کا نام 'چندراوتی' ہے - اور اسے سدل مسرا نے لکھا تھا - اس کے بعد ہی للوجی لال 'انشاءاللہ خاں وغیرہ کا نام آتا ہے - مقام حیرت ہے کہ سوا سو سال پہلے جس زبان کے نثر کا پتہ نہیں چلتا وہ آج ہندوستان کی قومی زبان بن رہی ہے - مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر اسے یہ درجہ ہرگز نہ مل سکتا تھا —

زبان کی نہج

ہندوؤں کی خاص تعداد اب تک اردو پڑھتی ہے لیکن یہ تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے - مسلمانوں نے ہندی سے کوئی سروکار نہ رکھا - کیا اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ شمالی ہند میں آئندہ ہندی اور اردو دو زبانیں رہیں گی اور وہ اپنے اپنے تمدن کے سایہ میں دو مختلف راستوں پر چلتی رہیں گی اور ان میں اتحاد کی کوشش بے سود اور بے کار ہے ؟ یا یہ ممکن ہے کہ ان دونوں زبانوں کو اس قدر قریب لے آیا جائے کہ ان میں رسم خط کے علاوہ کوئی فرق نہ رہے —

اس اندھیر نگری میں اب بھی تھوڑے سے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ ان میں گنگا جمنا کا پریاگ بھی مل سکتا ہے اور ان میں یگانگت پیدا ہوسکتی ہے - لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا کی طرح ہے - یہ لوگ ہندی اور اردو ناموں کا استعمال نہیں کرتے کیونکہ اس سے دونوں کی خلیج بڑھتی ہی جائے گی - یہ لوگ دونوں کو

هندوستانی کہتے هیں- ان کا مقصد یہ هے کہ حتی‌الامکان ' لکھی جانے والی زبان اور بول چال کی زبان کی صورت ایک هو اور وہ مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں کی زبان نہ هوکر تمام قوم کی زبان هو- جو کچھہ لکھا جائے اس سے عوام بھی بہرہ‌مند هوسکیں اور همارے ملک میں علم پرور طبقے کی جو ایک الگ جماعت قائم هو رهی هے اور عوام سے دور هٹتی جاتی هے وہ عوام سے قریب تر هوجائے اور علما و جہلا میں ایسا رشتہ پیدا هوجائے جس سے قوم میں تازگی اور طاقت پیدا هو—

چونکہ اردو زبان عرصہ سے عدالتوں اور شریفوں کی واحد زبان رهی هے ' لہذا اس میں عربی و فارسی کے هزاروں الفاظ اس طریقے سے گھل مل گئے هیں کہ دیہاتی بھی انھیں آسانی سے سمجھہ سکتے هیں- ان الفاظ کو بالارادہ هندی سے نکالنے کی کوشش کو هم قوم و ملک کے ساتھہ بے انصافی سمجھتے هیں- اسی طرح هندی سنسکرت یا انگریزی کے جو بگڑے هوے الفاظ اردو میں گھل مل گئے هیں انھیں متروک کرنے اور ان کی جگہہ ان غیر عربی و فارسی ترکیبوں کو رائج کرنے کی کوشش بھی غیر مستحسن هے- دونوں طرف سے اس کھینچا تانی کی وجہ صرف یہ هے کہ همارا تعلیم یافتہ طبقہ جنتا سے الگ هوتا جارها هے اور اسے اس کی مطلق خبر نہیں کہ عوام اپنے جذبات و خیالات کو کس طریقے سے ادا کرتے هیں- ایسی زبان جس کے لکھنے اور سمجھنے والے لوگ تھوڑے سے هوں یقیناً بے جان مصنوعی اور بوجھل هوگی- اس میں وہ قوت کہاں سے آئے گی جو عوام کے نبض پر هاتھہ رکھہ سکے- وہ اس تالاب کی طرح سے جس کے گھاٹ سنگ مرمر کے هوں جس میں کنول کھلے هوں لیکن پانی کے لیے نکاس اور بہاؤ کا راستہ نہ هو- قوم کی زبان وہ هے جسے قوم سمجھے

جس میں قوم کی روح ہو اور اس کے جذبات ہوں- اگر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان قومی زبان ہے تو کیوں نہ ہم انگریزی کو قومی زبان بنائیں- کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات جس بے تکلفی سے انگریزی لکھہ پڑھ سکتے ہیں اس روانی سے نہ ہندی یا اردو لکھہ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں- بڑے بڑے دفتروں اور اونچے طبقوں میں برسوں ہندی یا اردو بولنے کی ضرورت نہیں ہوتی - خانساماں اور خدمت گار بھی ایسے رکھے جاتے ہیں جو انگریزی سمجھہ لیتے ہیں- جو لوگ اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ہندی اردو اور ہندوستانی کا جھگڑا ہی نہیں رہتا- وہ اتنی بلندی پر رہتے ہیں کہ دنیا کی گرد ان تک پہنچ ہی نہیں سکتی- وہ معلق ہوا میں لٹکے رہتے ہیں- لیکن ہم غریب لاکھہ پر ماریں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے- ہمیں تو اسی گرد و باد میں جینا ہے —

یہ یاد رکھو کہ علما کی قوت کا مخزن عوام الناس ہیں- ان سے الگ رہنے کی صرف یہ صورت ہے کہ ان پر حکومت کی جائے- لیکن عوام اور حاکم یہ دو متضاد چیزیں ہیں- عوام میں رہنا ہے تو ان کے خادم بن کر رہو- ایسے اہل علم کی آواز عوام کے کانوں تک نہیں پہنچتی - وہ آپ اپنے نمائندے ہیں- عوام کی نمائندگی سے انہیں کوئی تعلق نہیں-

ہندوستانی

یو- پی کے ایک سابق گورنر سرولیم میرس نے ہندوستانی اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر ہندی اور اردو کے مصنفوں کو جو مشورہ دیا تھا اسے دھیان میں رکھنے کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس وقت تھی، شاید اور زیادہ انہوں نے کہا تھا کہ اردو لکھنے والوں کو یہ سمجھہ کر

لکھنا چاہیےکہ ان کی چیزیں ہندو پڑھیں گے اور اسی طرح ہندی لکھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے ناظر مسلمان ہیں —

یہ ایک سنہری مشورہ ہے - کاش ہم اُسے اپنے دلوں پر نقش کرلیں تو زبان کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجاے - میرے مسلمان دوست مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اس معاملے میں وہ ہندو مصنفوں سے زیادہ خطاوار ہیں - مثلاً یو - پی کی کامن لینگویج ریڈروں کو دیکھئے آپ سہل قسم کی اردو پائیں گے - ہندی کی ادبی کتابوں میں عربی و فارسی کے صدہا الفاظ مل جائیں گے لیکن اردو ادب روز بروز فارسیت کی طرف زیادہ مائل ہوتا جاتا ہے - اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں نے ہندی سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ رکھنا چاہتے ہیں - شاید ہندی سے خفیف سی واقفیت بھی ان کے لیے کسر شان ہے حالانکہ ہندی ایک ہفتے میں سیکھی جاسکتی ہے —

جب تک دونوں زبانوں کا میل نہ ہوگا ہندوستانی زبان کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی - یہ ساری کرامات فورٹ ولیم کالج کی ہے جس نے ایک زبان کے دو ٹکڑے کردیے - ہم کہہ نہیں سکتے کہ کسی سیاسی مقصد کی وجہ سے ایسا ہوا یا اسی وقت یہ زبانیں الگ الگ ہوگئی تھیں - لیکن یہ حقیقت ہے کہ جن ہاتھوں نے ہماری زبان کے دو ٹکڑے کردیے انہوں نے ہماری قومی زندگی کے بھی دو ٹکڑے کردیے —

اپنے ہندو دوستوں سے بھی میری درخواست ہے کہ جن الفاظ نے عوام میں اپنی جگہ بنالی ہے' انہیں نکالنے کے لیے سنسکرت لغت کی طرف رجوع ہونا مضر ہے - 'موجود' کے لیے 'اپستھت' - 'ارادہ' کے لیے 'سنکلپ' - 'بغاوتی' کے لیے 'کرترم' کو کام میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے -

اسی طرح مستعمل الفاظ کے اصلی سنسکرت ماخذوں کی تلاش بھی بے معنی ھے —

ھندوستانی کو رائج کرنے کی دوسری تدبیر یہ ھے کہ میٹرک تک ھندی اور اردو دونوں کی تعلیم سب کے لیے لازمی قرار دی جائے - اس طرح ھندوؤں کو اردو میں اور مسلمانوں کو ھندی میں کافی مہارت ھو جائے گی اور باھمی بد گمانیوں کا سد باب ھو جائے گا - چونکہ تعلیم کا صیغہ دیسی منسٹروں کے ھاتھہ میں ھے اور نصاب میں اس تبدیلی سے زائد خرچ نہ ھوگا' اس لیے اگر ھندو اور مسلمان دونوں کا متحدہ مطالبہ ھو تو حکومت کو کوئی انکار نہ ھوگا -

ادیب کے فرائض

ادیب کی حیثیت سے ھمارا یہ فرض ھے کہ ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ھمیں زندگی کے ھر پہلو میں ترقی کرنے کا موقع دے - ادیب ازلی حسن پرست ھوتا ھے - وہ زندگی کے ھر شعبے میں حسن کو ڈھونڈتا ھے - لیکن حسن وھیں ھے جہاں ھم آھنگی ھے - وھیں حقیقت بھی ھے - حسن وہ شے ھے جو زندگی کو ترقی دیتی ھے اور اس کی حفاظت کرتی ھے - در اصل یہ ھماری روح کا لباس ھے - اگر ھماری روح صحت مند ھوتی ھے تو وہ بے اختیار حسن کی طرف دوڑتی ھے - کیا یہ کہنے کی ضرورت ھے کہ نفاق اور حسد' بد گمانی اور کشمکش' ھماری زندگی کے لیے مہلک ھیں اور اس وجہ سے مکروہ ھیں؟ ادب نے ھمیشہ ان برائیوں کے خلاف احتجاج کیا ھے - دنیا میں انسانیت کی بھلائی کے لیے جتنی تحریکیں پیدا ھوئی ھیں - ادب نے ان کے لیے صرف زمین ھی تیار نہیں کی بلکہ ان کی تخم ریزی اور آبیاری بھی کی - ادب

یاست کے پیچھے چلنے والی چیز نہیں اس کے آگے چلنے والا نشان بردار ہے -
دب اس بغاوت کا نام ہے - جو انسان کے دل میں ظلم' بے انصافی
ور غرض پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے - ادیب اپنے خوبصورت پیرایہ
یں اسی بغاوت کی ترجمانی کرتا ہے - دوسروں کے دلوں میں بھی درد
وتا ہے لیکن وہ اپنی چوٹ کو دل ہلا دینے والے الفاظ میں ظاہر نہیں
رسکتے - ادب ان زخموں کی گہرائی کو اس طریقے سے ظاہر کرتا ہے کہ
وسرے بھی درد کی شدت سے چیخ اٹھتے ہیں —

کسی نے ' روما رولاں ' سے پوچھا تھا کہ " آپ کن کے لیے لکھتے
یں" - اس کا جواب یہ مشہور عالم مصنف ان الفاظ میں دیتا ہے :
' میں ان کے لیے لکھتا ہوں جو بڑھتی ہوئی فوج کے پیشوا ہیں - میں
ن کے لیے لکھتا ہوں جو اس بین اقوامی جنگ میں شریک ہیں جس
یں فتحیاب ہونے کے بعد ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھی جائے گی جس
یں نہ اونچ نیچ کا فرق ہوگا اور نہ جغرافی حدود ہونگی - ہم جو
دیب ہیں پیسدی لوگوں سے کہتے ہیں کہ بڑھے چلو لیکن ہم ان کا انتظار
ہیں کرتے - یہ ان کا فرض ہے کہ دوڑ کر ہمارے پاس آئیں - چڑھتا ہوا
ریا کسی کا انتظار نہیں کرتا —

ادب بدگمانیوں کو مٹانے والی چیز ہے - اگر ہندو اور مسلمان ایک
وسرے کے ادب سے زیادہ آشنا ہوں تو ممکن ہے کہ وہ زندگی میں بھی ایک
وسرے سے زیادہ قریب ہو جائیں - ادب میں ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان
ور نہ عیسائی - ہم انسان ہیں اور ہم میں صرف انسانیت کا رشتہ
ے - کیا یہ شرم کا مقام نہیں کہ ہم ایک ہزار سال سے ایک ہی ملک میں
ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور پھر بھی ایک دوسرے کے ادب سے بے خبر

ہیں؟ - یورپین مصنفوں کو دیکھے - انہوں نے ہندوستان سے متعلق ہر مضمون کی تحقیق کی اور وہ ہمیں جتنا جانتے ہیں ہم خود اپنے کو اتنا نہیں پہچانتے - اس کے برعکس ہم ایک دوسرے سے ناآشنا ہونے ہی میں مگن ہیں - ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہماری انسانیت کی اصلاح کرتا ہے یعنی ہم میں ہمدردی اور رواداری کے جذبات پیدا کرتا ہے - جس ہندو نے معرکۂ کربلا کی تاریخ پڑھی ہے ناممکن ہے کہ اس کا دل نہ پسیج جائے - جس مسلمان نے رامائن پڑھی وہ یقیناً ہندو سے ہمدردی کرنے لگے گا - کم از کم شمالی ہند میں ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو اپنے کو نیم جاہل سمجھنا چاہئے جو ہندو ادب سے ناآشنا ہے اور اگر ہندو ہے تو مسلم ادب سے ناواقف ہے - دونوں کے لیئے دونوں زبانوں اور دونوں رسم الخطوں کا علم لازمی ہے جب ہم زندگی کے پندرہ سال انگریزی کے لیے قربان کر سکتے ہیں تو کیا ماہ دو ماہ اس رسم الخط اور ادب کے لیے نہیں دے سکتے جس پر ہماری قومی ترقی کا ہی نہیں بلکہ قومی زندگی کا بھی انحصار ہے؟ -

ادب کا مستقبل

از

پنڈت جواہر لال نہرو

[پنڈت جی کا ایک ہندی مضمون زبان کی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ذیل میں درج کیا جاتا ہے]

کچھ عرصے سے پھر ہندی اور اردو کی بحث چھڑ گئی - اور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا ہونے لگا ہے کہ ہندی والے اردو کو دبا رہے ہیں اور اردو والے ہندی کو - اس مسئلے پر غور و فکر کی زحمت کوئی گوارا

نہیں کرتا - جوشیلے مضامین لکھے جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جتنا ہم دوسرے پر حملہ کریں اتنا ہی ہم اپنی پیاری زبان کو فائدہ پہنچائیں گے - لیکن ٹھنڈے دل سے ذرا دیر سوچو تو یہ کوشش بے سود معلوم ہوتی ہے ادب کو بڑھانے کے یہ طریقے نہیں ہیں —

دوسری بات یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ اکثر ادب کا مطلب ہم کچھ اور ہی سمجھتے ہیں - ہم زبان سے متعلق چھوٹی موٹی باتوں میں پھنس کر بنیادی باتوں کو بھول جاتے ہیں - ادب کن کے لیے ہوتا ہے ؟ وہ تھوڑے سے خوش پوش و خوش خوراک 'بالا دست' حضرات کے لیے ہوتا ہے یا عوام الناس کے لیے ؟ جب تک ہم اس کا جواب نہ دیں' ہمیں ادب کے مستقبل کا راستہ نہیں سجھائی دے سکتا - اگر ہم اس کا تصفیہ کرلیں تو شاید ہمارے دیگر اختلافات (مثلاً ہندی اردو وغیرہ کے) بھی حل ہوجائیں —

پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا موجودہ ادب بہت پچھڑا ہوا ہے - یورپ کی کسی بھی زبان سے مقابلہ کیا جائے تو ہم نرے پھسڈی نکلیں گے - جو نئی کتابیں ہمارے یہاں نکل رہی ہیں وہ اول درجہ کی نہیں ہوتیں - اگر کوئی آدمی آج کل کی دنیا کو سمجھنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ غیر ملکی زبانوں کا مطالعہ کرے - ہمارے ادب میں نئے رجحانات کا خفیف سا پرتو بھی نہیں ملتا - تاریخ ' سائنس ' اقتصادیات اور سیاست وغیرہ پر ہماری زبانوں میں بہت کم معقول کتابیں ملیں گی - ہمیں اس طرف فوری توجہ کرنا چاہئیے ورنہ ہماری زبانیں ترقی نہیں کر سکتیں - جو لوگ ان مضامین کے شائق ہیں انہیں مجبوراً کہیں اور جانا ہوگا —

کئی سوال پیدا ہوتے ہیں - ان سب پر میں ابھی کچھہ نہیں کہہ سکتا - لیکن چند ضروری مسائل کی طرف بہت اختصار سے دو چار باتیں کہتا ہوں :—

(۱) مجھے کامل یقین ہے کہ ہندی اور اردو کے مقابلہ سے ان دونوں کو نقصان ہوگا - یہ دونوں باہمی تعاون سے ہی ترقی کرسکتی ہیں - ایک کے بڑھنے سے دوسری کو بھی فائدہ ہوگا - خواہ وہ کبھی کبھی الگ الگ راستوں پر ہی چلیں' لیکن انہیں ایک دوسرے کی کاٹ نہیں کرنا چاہئے - ایک کو دوسرے کی ترقی سے خوش ہونا چاہئے کیونکہ اس سے انہیں آگے چل کر فائدہ ہی ہوگا - یورپ کے نئے ادب (انگریزی' جرمن اور فرانسیسی) ایک دوسرے کو دباکر نہیں بڑھے بلکہ ساتھہ ساتھہ بڑھے —

(۲) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر زبان کے شائق اپنی زبان کی انفرادی ترقی کے لیے کوشاں نہ ہوں - لیکن ایک دوسرے کے اختلاف کے بغیر بھی یہ کام ہوسکتا ہے —

(۳) صرف ہندی اور اردو کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام اہم زبانوں — بنگالی مرہٹی' گجراتی' تامل' تیلگو' کناڑی اور ملیالم — کے لیے بھی یہ تصفیہ ہوجانا چاہیے کہ ہم ان سب کی ترقی کے خواہاں ہیں اور باہمی مقابلے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا - ہر صوبے میں وہاں کی زبان کو فوقیت دی جائے گی - ہندی یا ہندوستانی قومی زبان ضرور ہے - لیکن وہ صوبجاتی زبان کے بعد میں آتی ہے - اگر یہ فیصلہ ہوجائے اور صاف صاف کہہ دیا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوجائیں اور زبانوں میں

کسی قسم کے اشتراک کی صورت نکل آئے ـــ

(۴) گو ہندی اور اردو کا تعلق بہت قریب کا ہے، تاہم ان میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے - اس سے دونوں کو نقصان ہوتا ہے - گویا ایک دھڑ پر دو سر رکھے ہوئے ہیں جو ایک دوسرے سے پیہم ٹکرا رہے ہیں - ہمیں دو باتیں سمجھنی ہیں اور گو وہ بادی النظر میں متضاد معلوم ہوتی ہیں، پھر بھی ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے - ایک تو یہ کہ ہم ایسی زبان ہندی اور اردو میں لکھیں اور بولیں جو میں میں ہو اور فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ سے معرا ہو - عام طور پر اسی کو ہندوستانی کہتے ہیں - اس پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے (اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے) کہ اس درمیانی زبان میں ہندی اور اردو کی خوبیاں تو آتیں نہیں خرابیاں البتہ آجاتی ہیں اور دونوں کی کھچڑی سے ایک ایسی دوغلی زبان بن جاتی ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا کیونکہ اس میں نہ حسن ہوتا ہے اور نہ زور - یہ اعتراض اپنی جگہہ پر صحیح ہوتے ہوئے بھی سطحی ہے - میرا خیال ہے کہ ہندی اور اردو کے میل سے رفتہ رفتہ بہت زور دار اور خوبصورت زبان پیدا ہوسکتی ہے - اس میں جوانی کی قوت آسکتی ہے اور وہ دنیا کی باعزت زبانوں میں خاص مرتبہ حاصل کرسکتی ہے ـــ

لیکن یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ زبانیں زبردستی نہ بن سکتی اور نہ بڑھ سکتی ہیں - ادب پھول کی طرح کھلتا ہے اور دباؤ ڈالنے سے مرجھا جاتا ہے - اس لیے اگر کچھہ عرصے تک ہندی اور اردو کا ارتقا دو مختلف منزلوں کی طرف ہو تو مایوسی کی

کوئی وجہ نہیں ہے - ہمیں دونوں کو سمجھنا چاہیے کیونکہ - ہماری زبان کے الفاظ کا ذخیرہ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے -

(۵) رسم خط کے متعلق قطعی طور پر فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ ہندی اور اردو دونوں خط ہمیشہ رائج رہیں گے اور ہر آدمی کو اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرے - اکثر چرچا ہوتا ہے کہ فلاں صوبے میں ہندی رسم خط پر تشدد ہو رہا ہے (مثلاً صوبۂ سرحد میں) یا دوسرے صوبے میں اردو خط پر بیجا دباؤ ڈالا جا رہا ہے (مثلاً صوبۂ بہار میں — اڈیٹر) - ہمیں ناجائز طور پر کسی ایک فریق کی تائید نہیں کرنا چاہیے اور دونوں کو مساوی آزادی دینا چاہیے - ہندی اور اردو دونوں کے مویدوں کو اس اصول پر عمل کرنا چاہیے —

(۶) یہ سوال دراصل ہندی اور اردو دونوں کے حدود سے آگے جاتا ہے - میری رائے میں ہر زبان اور ہر رسم خط کو پوری آزادی دینا چاہیے — بشرطیکہ اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد کافی ہو - مثلاً اگر کلکتہ میں تامل بولنے والوں کی خاص تعداد ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے اسکول کا ذریعۂ تعلیم تامل نہ ہو - ظاہر ہے کہ ایک صوبہ کے سیاسی اور دیگر فرائض مختلف زبانوں میں انجام نہیں پا سکتے - ان کے لیے صوبے کی خاص زبان کا انتخاب کرنا ہی ہوگا - شمالی اور متوسط ہند میں ہندوستانی عوام کی زبان ہے - یہاں دونوں رسم خط اور ایک زبان کے چلن میں کوئی دقت پیدا نہیں ہو سکتی - یہ مدعا نہیں کہ ہر آدمی کے لیے دونوں رسم خطوں کا حصول ضروری ہوگا - اس سے بچوں پر

بار پڑے گا۔ رسم خط کا انتخاب یا تو وہ خود کریں یا ان کے والدین۔ اگر کچھ لوگ دونوں رسم خطوں میں مہارت حاصل کرسکیں تو بہت اچھا ہو —

(۷) 'ھندی' اور 'ھندوستانی' پر بہت بحث ہوئی ھے اور ان الفاظ کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئی ھیں۔ یہ بحث بے معنی ھے۔ اپنی قومی زبان کے لیے ھم ان دونوں الفاظ کا استعمال کرسکتے ھیں' دونوں سننے میں بھلے لگتے ھیں' ھمارے ملک اور 'جاتی' سے تعلق رکھتے ھیں۔ لیکن اچھا ہو اگر اس بحث کو بند کرنے کے لیے ھم زبان کو ھندوستانی کہیں اور رسم خط کو ھندی یا اردو کہیں اس سے خلط مبحث کا امکان نہ رھے گا —

(۸) یہ ھندوستانی زبان کیا ہو؟۔ دھلی یا لکھنؤ والے کہتے ھیں کہ ھماری بولی عام فہم ھے۔ اسی کو ھندوستانی بناؤ۔ لیکن بنارس اور پٹنہ یا راجپوتانہ کی طرف جاؤ تو کافی فرق ملتا ھے۔ اگر شہروں کو چھوڑ کر دیہاتوں میں جاؤ تو یہ فرق زیادہ بڑھ جاتا ھے۔ اس صورت میں ھماری زبان کا معیار کیا ہو؟ —

ھماری زبان کو مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ عام فہم ہونا چاھیے۔ دو چار لغات کی مدد سے اس کی تدوین نہیں ہوسکتی اور نہ اردو ھندی کے دو چار ادیب مل کر اسے پیدا کرسکتے ھیں۔ اس کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہوگی جب لکھنے والے عوام کے لیے لکھیں گے اور تقریر کرنے والے انھیں کے لیے بولیں گے۔ پھر یہ دفتری بحثیں — کتنی فی صدی اردو اور کتنی فی صدی ھندی — ختم ہو جائیں گی۔ فیصلہ جنتا کرے گی۔

جو اس کی سمجھہ میں آے گا سمجھے گی اور جو سمجھہ میں نہ آیا نہیں سمجھے گی —

لہذا ہمارے آگے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم عوام کے لیے ادب پیدا کریں اور جب لکھیں تو اپنی نظر کے آگے انہیں رکھیں - ہر ادیب کو اپنے سے سوال کرنا چاہیے کہ " میں کس کے لیے لکھہ رہا ہوں " —

هندی جاتری منڈل

از

کاکا کالیلکر

هندی ساهتیہ سمیلن نے ایک پرچار سمتی (کمیٹی) بنائی ہے ' جس نے ایشیا کے کچھہ ممالک کو ایک " جاتری منڈل " بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے - اس گروہ میں کاکا کالیلکر ' سیٹھہ جمنا لال بجاج ' بابو پرشوتم داس ٹنڈن ' بابو راجندر پرشاد وغیرهم کے نام نامی نظر آتے ہیں - کالیلکر صاحب نے ایک هندی پرچے میں اپنی جاترا کے متعلق چھوٹا سا مضمون لکھا ہے جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

" سمیلن نے جو هندی پرچار سمتی قایم کی ہے - اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک جاتری منڈل لنکا ' برما ' ملایا ' جاوا ' بالی ' سیام وغیرہ کو بھیجا جائے - اس کے متعلق ابھی سے غلط فہمیاں شروع ہو گئی ہیں - اخباروں نے اس ' منڈل ' کو ' تہذیبی سفارت ' کا لقب دیا ہے - ' تہذیب ' کا نام آتے ہی هندوستان کے فن رقص و سرود ' مصوری وغیرہ کی ترجمانی کے پیام بھی آنے لگے ہیں —

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس ہندی پرچار منڈل کو 'وشال بھارت (Greater India) یعنی وہ ممالک جہاں کاکا صاحب تشریف لے جانے والے ہیں - ایڈیٹر) کے ساتھہ مشرقی و جنوبی افریقہ ماریشس' فجی وغیرہ میں بسنے والے ہندوستانیوں کو پہلے لینا چاہیے —

جاتری منڈل کے ارکان کے انتخاب پر بھی اعتراض کیا گیا ہے - ان سب کو ہندی سمیلن کے صدر سیٹھہ جمنالال بجاج نے نامزد کیا ہے اور یہ اصول مدنظر رکھا ہے کہ صرف وہ اصحاب اس میں لیے جائیں جن کا ہندوستان کے "قومی اتحاد" میں کچھہ حصہ ہے اور اس کے ساتھہ وہ راشٹر بھاشا کے پرچار میں بھی دلچسپی لیتے ہیں —

جہاں تک اس منڈل کے مقاصد کا تعلق ہے میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی تہذیب کا سندیسہ ٹیگور دیس بدیس میں پہنچا چکے ہیں - بھارت کے ناچ رنگ کا پرچار وہ جتنے اچھے ڈھنگ سے کرچکے ہیں' اس میں یہ ہندی جاتری منڈل خواہ مخواہ رخنہ نہیں ڈالنا چاہتا —

جن ممالک کے سفر کا تہیہ کیا گیا ہے' انہیں ہندوستان سے قدیمی تعلق ہے - پرانے زمانے میں انہوں نے سنسکرت سیکھہ کر ہندوستان سے بڑی قرابت حاصل کرلی تھی - بودھوں کے عہد میں انہوں نے پالی کے ذریعے سے ہندوستان سے اپنا رشتہ قائم رکھا - اب ہمیں انہیں سمجھانا ہے کہ وہ بھارت کو انگریزی کی عینک سے نہ دیکھیں' بھارت کی آتما ہندوستانی زبانوں میں ہی نمایاں ہوسکتی ہے اور پھر ان میں بھی ہندی وہ زبان ہے جسے تمام ہندوستان نے متفقہ طور پر قومی زبان تسلیم کرلیا ہے - لہذا اپنے پڑوسی ہندوستان کو وہ اسی زبان کے وسیلے سے پہچانیں —

ہندوستان کی قومی زبان صرف ایک ہے - ہم نے اس کے نام کا جھگڑا ہی نہیں رکھا - اسی قومی زبان کو ہمالیہ اور پورب سمندر (بحر عرب کا نیا نام — ایڈیٹر) سے لے کر بنگال کی کھاڑی تک پھیلانے کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے —

ماریشس وغیرہ میں جو ہندوستانی جاکر بس گئے ہیں، وہ تو ہندی کو ہر صورت میں اختیار کرلیں گے - وہاں کے خاص حالات کے مطابق وہاں کام کرنا چاہیے - یہ کام ہمارے لایحۂ عمل میں نہیں آتا - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں ہندی پرچار کی اہمیت کا ہمیں اندازہ نہیں ہے" —

نوٹ:- ہندی کے مشہور رسالہ 'وشال بھارت' نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مضحکہ خیز بتلایا ہے —

افکار و واقعات

(از ایڈیٹر)

افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

(۱) بہار کمیٹی کی روئداد

صوبۂ بہار میں ہندی اردو کا تنازع زمانۂ دراز سے چلا آرہا ہے اور غالباً اس تنازع کی ابتدا اول اول بہار ہی سے ہوئی —

سنہ ۱۸۳۷ ع میں جب فارسی زبان عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے خارج کی گئی تو صوبۂ بہار میں (جو اس زمانے میں صوبۂ بنگالہ میں شامل تھا) فارسی کی جگہ اردو نے لے لی - لیکن اس کے کچھہ عرصے بعد ملک میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی جو اردو زبان اور اردو رسم خط کی مخالفت شد و مد سے کرنے لگی - اس جماعت کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت بنگالہ نے سنہ ۱۸۸۱ ع میں ایک اعلان کے ذریعہ سے صوبۂ بہار میں اردو رسم خط کی جگہ ہندی رسم خط جاری کردیا - باوجود اس کے اردو زبان اور اردو رسم خط عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے بالکل خارج نہ ہوا - زبان تو وہی (اردو) رہی لیکن رسم خط بدل گیا - قانونی اصطلاحات وہی ہیں جو سابق میں تھیں - سنسکرت آمیز ہندی کا عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اب تک رواج نہیں ہوا - لیکن ایسا سننے میں آیا ہے کہ ایک جماعت اس کوشش میں ہے کہ قانونی اصطلاحات بھی سنسکرت سے بنا کر رائج کی جائیں - امید نہیں کہ یہ کوشش بار آور ہو —

اب سے چند سال قبل تک ۸۰ فی صدی وثائق جو رجسٹریشن کے محکمے میں آتے تھے ' اردو رسم خط میں آتے تھے - لیکن سر گنیش دت سابق وزیر بہار و اڑیسہ کے ایک حکم کی بنا پر ہندی لکھے ہوئے وثائق کی تعداد بڑھ گئی ہے - رفتہ رفتہ سرکار دربار میں اردو گھٹتی گئی اور ہندی بڑھتی گئی —

اردو داں طبقے نے بہت کچھ ہاتھ پانو مارے اور اپنی سی کوشش کی ' لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی - چار بار یہ مسئلہ لیجس لیٹو کونسل میں آیا اور چاروں بار ناکامی ہوئی - ملک کی بد قسمتی کہ اسے مذہبی ' سیاسی اور فرقہ داری رنگ دیا گیا اور ایک معمولی سے معاملہ نے جو بآسانی طے ہو سکتا تھا ہماری شامت اعمال سے ایک ناگوار صورت اختیار کر لی —

آخر غالباً سنہ ۱۹۲۹ ع میں حکومت نے ایک اعلان کے ذریعے سے تھوڑے سال کے لیے بطور تجربہ صرف قسمت پٹنہ کی دیوانی عدالتوں میں اردو رسم خط کے استعمال کی اجازت دی - حامیان اردو اس سے مطمئن نہ ہوئے اور برابر مطالبہ کرتے رہے کہ فوجداری عدالتوں وغیرہ نیز صوبۂ بہار کے اور حصوں میں بھی اردو رسم خط کو اختیاری رسم خط قرار دیا جائے —

مئی سنہ ۱۹۳۷ ع میں حکومت نے ان مطالبوں کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا اور یہ قرار پایا کہ عرضیاں اور بیانات تحریری وغیرہ اردو ہندی دونوں خطوں میں داخل کیے جائیں یعنی یہ کہ اگر عرضی اردو میں ہے تو اس کی نقل ہندی میں ' اور اگر ہندی میں ہو تو اس کی نقل اردو میں ہو - البتہ سنتھال پرگنہ اور قسمت چھوٹا ناگپور

کو یہ رعایت حاصل نہ ہوئی —

حامیان ہندی کی طرف سے اس کی بڑی مخالفت ہوئی اور حکومت نے دوسرا اعلان شایع کیا جس کے رو سے اعلان سابق منسوخ ہوگیا اور یہ حکم جاری ہوا کہ اردو رسم خط کل عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں جہاں جہاں پہلے کبھی رائج تھا ' اختیاری رسم خط ہوگا - قسمت چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ اس حکم سے مستثنی ہیں —

اس کے چند روز بعد ہی حکومت کی طرف سے ایک اعلان شایع ہوا کہ اگر کوئی عرضی یا تحریری بیان اُردو میں داخل ہو تو فریق مخالف کے مطالبے پر اُسے اس کی ہندی نقل ملنی چاہیے - اس کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ یہ رعایت صرف ہندی والوں کے لیے ہے ' اُردو داں اس سے محروم رہیں گے - اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۳۷ ع کو ایک اور اعلان شایع ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ یہ رعایت صرف ہندی داں فریق ہی کے لیے نہیں بلکہ اس میں اردو داں بھی شامل ہیں - لیکن یہ معاملہ حکومت کے طے کرنے کا نہیں ہے ' ہائی کورٹ اس کا فیصلہ کرے گا جس کی توجہ اس طرف منعطف کرائی گئی ہے —

اب یہ معاملہ ہائی کورٹ میں پیش ہے - دیکھیے وہاں سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے - جہاں تک وہاں لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقع ہوا ' اس میں کچھ زیادہ کامیابی کی توقع نہیں معلوم ہوتی —

ہندی اردو کی بحث مدارس کی تعلیم میں بھی آگئی ہے جو بہت اہم ہے - چند سال ہوے پٹنہ یونیورسٹی اور بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ایک کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے بنائی کہ امتحان میٹریکولیشن

کے نتائج اس قدر خراب کیوں ہوتے ہیں اور بہتر نتائج کیونکر حاصل ہوسکتے ہیں - اس کمیٹی نے منجملہ دیگر امور کے ایک تجویز یہ پیش کی کہ علوم کا ذریعۂ تعلیم بدل دیا جاے - یہ سفارش منظور کرلی گئی - اور جب ۲۴ نومبر ۱۹۳۶ ع کو سینٹ کا جلسہ ہوا تو بابو بل دیو سہاے نے ایک تحریک یہ پیش کی کہ میٹریکولیشن کے امتحان کے لیے سواے انگریزی کے ہر مضمون کا ذریعۂ تعلیم هندی ' اردو ' اڑیا ' بنگالی یا نیپالی ہونا چاہیے اور ہر مدرسے میں ان زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا انتظام کیا جاے - لیکن اگر کسی طالب علم کی مادری زبان ان میں سے کوئی زبان بھی نہ ہو تو ایسے طلبہ کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا انتظام کیا جاے اور ان طلبہ کا ذریعۂ امتحان بھی انگریزی ہو —

محترک نے اس تجویز میں جو سنڈیکیٹ کی منظور کردہ تھی یہ ترمیم پیش کی کہ هندی اردو کے بجاے " هندستانی " کا لفظ رکھا جاے - جس کی تعریف انھوں نے ان الفاظ میں کی کہ :

> " هندستانی سے اس دفعہ میں وہ زبان مراد ہے جو بہار کے هندو مسلمان عام طور پر بولتے ہیں اور جو ناگری یا اردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے " —

هندستانی کے لفظ پر بہت بحث اور رد و کد ہوئی - بعض ارکان کی بحث یہ تھی کہ هندستانی کوئی زبان نہیں ' اردو هندی البتہ زبانیں ہیں - جسے مشترک زبان کہا جاتا ہے اُس میں علمی ادب مطلق نہیں ' ایسی زبان کیونکر ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہے —

غرض بہت کچھہ گفتگو کے بعد کثرت راے سے ترمیم منظور ہوگئی —

لیکن انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار اور خاص کر انجمن کے قابل معتمد قاضی عبدالودود صاحب نے صوبے کے اہل الرائے اصحاب کی ایک کانفرنس اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے منعقد کی اور اپنے مطالبات پیش کیے - اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) ہندستانی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بالکل ناکافی اور مبہم ہے - (۲) چونکہ اردو کا مسئلہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہے لہذا حکومت بہار ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق انجمن ترقیء اردو ہندستان سے دریافت کرے کہ وہ موجودہ زبان میں کس حد تک تغیر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہے - اور کوئی فیصلہ جو اس انجمن کو جو اردو بولنے والوں کی واحد مسلمہ انجمن ہے منظور نہیں ' بہار کے حامیان اردو کو منظور نہ ہوگا —

جب نئی حکومت قائم ہوئی تو ایک عام جلسے میں جو انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار کی طرف سے ۲۷ مئی سنہ ۱۹۳۷ ع کو منعقد ہوا یہ تجویز منظور ہوئی اور اس کی ایک نقل وزیر تعلیم کو بھیج دی گئی —

(۱) یہ جلسہ اس امر کا مخالف نہیں کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے دی جائے لیکن بوجہ اس کے کہ سینٹ کے رزولیوشن میں لفظ "ہندستانی" کی تعریف مبہم ہے یہ ضرور تھا کہ قبل اس کے کہ متذکرہ بالا تجویز منظور کی جائے ' اردو داں طبقے کے اطمینان کے لیے مفصلہ ذیل سوالات کا جواب دیا جاتا —

(۱) سائنس کی اصطلاحات کس زبان سے لی جائیں گی —

(۲) سائنس کی اُن اصطلاحات کا کیا حشر ہوگا جو روز مرہ کی زبان میں داخل ہوچکی ہیں —

(۳) الفاظ کے داخل یا خارج کرنے کا کیا معیار ہوگا —

(۴) بہت سے ایسے الفاظ اور محاورات ہیں جو ہندی کے رو سے بالکل صحیح ہیں لیکن اردو انشا پردازوں نے انہیں کبھی استعمال نہیں کیا اور یہی حال اس کے برعکس ہندی انشا پردازوں کا ہے۔ ایسی صورت میں ان الفاظ و محاورات کے متعلق کیا عمل کیا جائے گا۔

(۵) اگرچہ بنیادی لحاظ سے اردو اور ہندی ایک ہیں لیکن بعض اوقات صرف و نحو میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں کسے ترجیح دی جائے گی —

(۶) ہندستانی زبان کے بنیادی قواعد کونسی جماعت وضع کرے گی —

(ب) اس جلسے کا یہ مطالبہ ہے کہ اگر گورنمنٹ حسب سفارش سہلت ذریعۂ تعلیم کے مسئلے کے حل کرنے کے لیے کسی کانفرنس کا انعقاد کرے تو اس میں صدر انجمن ترقیء اردو اور صوبۂ بہار کی انجمن کے نمایندے بھی مدعو کیے جائیں۔ یہ جلسہ گورمنٹ کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر متذکرۂ بالا انجمنوں کے مشورے کے بغیر اردو زبان میں کچھہ تغیرات کیےگئے تو وہ بہار کے اردو داں طبقے کےلیے ناقابل قبول ہوں گے"۔

اس کے علاوہ صوبۂ بہار میں اردو کی درسی کتابوں کی حالت بھی قابل اطمینان نہیں اور بہت کچھہ قابل اصلاح ہے - یہ سب امور فیصلہ طلب تھے۔ صوبۂ بہار کی انجمن نے اس بارے میں جو جد و جہد کی وہ بہت قابل ستایش ہے —

اس اندیشے سے کہ نئی حکومت اس مسئلے کے متعلق جلد کوئی فیصلہ صادر نہ کردے، انجمن ترقیء اردو ہندستان نے قاضی عبدالودود صاحب کی تحریک پر ان مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کے منعقد کرنے کی تجویز کی اور ایسے اصحاب کو مدعو کیا جو ان حالات سے واقف

ہیں یا ان مسائل کے متعلق مفید مشورہ دے سکتے ہیں -
معتمد انجمن ترقیء اردو (ہندستان) نے دعوت کے نامے کے ساتھ ان مسائل کی مختصر تاریخ بھی طبع کرکے بھیج دی تھی —

کمیٹی کے جلسے ۲۸ ' ۲۹ اگست کو بہ مقام پٹنہ شاہ رشید اللہ صاحب ایڈوکیٹ کے دولت خانے پر ہوے -

حسب ذیل اصحاب شریک جلسہ ہوے

پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی - مولوی سید سلیمان ندوی صاحب خواجہ غلام السیدین صاحب ایم - اے پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈہ پروفیسر محمد مجیب بی - اے (آکسن) جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی - مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی - مولوی ظفرالملک علوی اڈیٹر الناظر - قاضی عبدالودود صاحب بی- اے (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا معتمد انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار - مولوی نظام الدین حسین نظامی اڈیٹر ذوالقرنین و سکرٹری پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ متحدہ - مولوی رشید احمد صدیقی ایم - اے صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - آل احمد سرور صاحب ایم - اے لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - سید الطاف علی صاحب بی - اے ' ہیڈ اسسٹنٹ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس - مسٹر محمد یونس صاحب بیرسٹر ایٹ لا ' ایم - ایل - اے پٹنہ - مسٹر سید محمد حفیظ ایڈوکیٹ ایم - ایل - سی ' رکن سنڈیکیٹ پٹنہ یونیورسٹی - عبدالحق سکرٹری انجمن ترقیء اردو (ہندستان) -

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی آنے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن عین وقت پر کچھ ایسے واقعات پیش آگئے کہ وہ شریک نہ ہوسکے - نواب صدر یار جنگ بہادر (مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی) بھی کسی مجبوری کی

وجہ سے نہ آسکے - مگر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے انہوں نے سید الطاف علی صاحب ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس کو شرکت کے لیے بھیجا - میاں بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن) شملہ میں تھے اور بوجہ ناسازی طبع شریک نہ ہوے - ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے —

میری تحریک پر مولانا سید سلیمان صاحب بالاتفاق کمیٹی کے صدر منتخب ہوے -

سب سے پہلے صاحب صدر کی یہ تحریک منظور ہوئی -

(۱) انجمن ترقیء اردو کا یہ جلسہ نواب سر راس مسعود کی وفات پر اپنے دلی جذبات رنج و غم کا اظہار کرتا ہے - مرحوم کے انتقال سے ملک و قوم اور خصوصاً انجمن ترقیء اردو کو جس کے وہ صدر تھے ایسا نقصان عظیم پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی -

یہ جلسہ ان کی والدہ ماجدہ اور دوسرے متعلقین سے دلی ہمدردی ظاہر کرتا ہے —

اس کے بعد میں نے قاضی عبدالودود صاحب سے درخواست کی کہ وہ اُن معاملات کو پیش کریں جو کمیٹی کے سامنے زیر بحث آنے والے ہیں - قاضی صاحب کی مختصر تقریر کے بعد عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ کمیٹی اس وقت تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک "ہندستانی" زبان کے حدود متعین نہ کرے - چنانچہ طویل گفتگو اور مباحثے کے بعد ہندستانی کی یہ تعریف بالاتفاق منظور کی گئی —

(۲) ہندستانی سے مراد وہ زبان ہے جو اس ملک کی ہندو مسلمان

قوموں کے میل جول اور ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہونے سے بنی ہے؛ جسے شمالی ہند کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں، اور ہندستان کے دوسرے حصوں کے رہنے والے سمجھتے ہیں؛ جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے خالی ہے؛ اور جو اردو، دیوناگری یا کسی دوسرے رسم خط میں لکھی جاتی ہے —

بہار ٹکسٹ بک کمیٹی اور ابتدائی جماعتوں کی مشترکہ ریڈروں کے متعلق کمیٹی نے یہ تجویزیں منظور کیں :—

(۳) اس کمیٹی کی راے میں ابتدائی چار جماعتوں کے لیے کتابیں ایسی عام فہم اور آسان ہندستانی زبان میں لکھی جائیں جو اردو اور ہندی رسم خط کے اختلاف کے علاوہ یکساں طور پر اردو ہندی جاننے والوں کی سمجھ میں آسکیں —

ایسی کتابوں کے انتخاب اور منظوری کے متعلق جو طریق عمل جاری ہے وہ قابل اطمینان نہیں ہے - حصۂ نثر میں کم اور حصۂ نظم میں زیادہ بے عنوانیاں اس قسم کی ہیں جن کی اصلاح ہونی ضروری ہے - تفصیلات سے قطع نظر اس اصول کو سامنے رکھنا لازم ہے کہ ہندی اور اردو طلبہ کی ذہنیت اور مذاق پر ایسا اثر نہ پڑے جو آگے چل کر اُن کے ادبی مذاق میں حائل ہو - یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کا حصۂ نظم لازمی طور پر مشترک نہ رہے —

ٹکسٹ بک کمیٹی کی تدوین کے متعلق اس وقت ہماری طرف سے کسی تجویز کا پیش کرنا بر محل نہیں معلوم ہوتا، لیکن یہ کمیٹی بہت زور سے حکومت کی خدمت میں سفارش کرتی ہے کہ کتابوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے - اس سلسلے میں ماہرین اور ریویو

کرنے والوں کے تقرر میں انجمن ترقی اردو سے استصواب کرنا قرین مصلحت ہے" —

(۴) اس کمیٹی کی راے میں ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لیے ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہونا چاہیے - لیکن ثانوی جماعتوں کے لیے ادبی ریڈروں کا اردو ہندی میں الگ ہونا ضروری ہے (با شرائط بالا) —

(۵) اس کمیٹی کی راے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہندستانی زبان کے قواعد، اصطلاحات، لغات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جاے جس میں انجمن ترقیء اردو (ہندستان) اور ہندی کی کسی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں ہوں - اس کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اتفاق سے کام لیا جاے - لیکن اختلاف کی صورت میں اصولی حیثیت سے یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہندستانی کی اردو کتابوں کے متعلق انجمن ترقیء اردو کے قائم مقاموں اور ہندستانی کی ہندی کتابوں کے متعلق ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی راے فیصلہ کن سمجھی جاے گی - سر دست کامل اتحاد کو ضروری سمجھنا لازمی نہ ہوگا —

(۶) اس کمیٹی کی راے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ اردو داں طلبہ کے لیے ہندی اور ہندی داں طلبہ کے لیے اردو جاننا ثانوی جماعتوں کے لیے لازمی کر دیا جائے، جیسا کہ صوبۂ متحدہ میں ہے —

(۷) عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں رسم خط کے رواج اور دوسرے مقامی مسائل کے متعلق کمیٹی نے یہ طے کیا کہ انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار مقامی ضرورتوں کا لحاظ کر کے خود ہی تجاویز منظور کرے -

ان تجاویز کے علاوہ یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ ارکان کمیٹی بابو راجندر پرشاد صاحب سے مل کر بہار میں اردو کے مسئلے پر خصوصاً اور ہندی، اردو، ہندستانی کے مسئلے پر عموماً تبادلۂ خیالات کریں - چنانچہ ۲۸ اگست کو ۳ بجے دن کے بابو راجندر پرشاد مع بابو بلدیو سہاے ایڈوکیٹ جنرل اور بابو متھرا پرشاد سکرٹری بہار پراونشل کانگریس کمیٹی ہمارے کمیٹی میں تشریف لاے، جہاں تقریباً دو گھنٹے تک تمام متعلقہ مسائل پر نہایت خوشگواری سے بحث ہوتی رہی - حاضرین نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ تمام اہم مسائل پر قریب قریب اتفاق ہوچکا ہے اس لیے ایک متفقہ اعلان سکرٹری انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اور بابو راجندر پرشاد کی طرف سے شایع کیا جاے جس سے ملک میں ایک بہتر فضا قائم ہوجانے اور خوشگواری پیدا ہوجانے کا امکان ہے - چنانچہ دونوں صاحبوں کے دستخط سے حسب ذیل بیان شایع کیا گیا —

" بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست سنہ ۳۷ ع کے زمانے میں ہمیں ہندستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا - ہمیں فکر تھی کہ " اردو، ہندی، ہندستانی " کے مناقشے میں جو افسوسناک غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں انہیں دور کیا جاے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اُن میں بڑی حد تک ہم متفق الراے ہیں —

چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہندستانی ہونی چاہیے اور یہ اردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے (سرکاری زبان)

تسلیم کی جانی چاہیے - ہندستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے - اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول و انتخاب کا معیار بھی یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہیے - مزید برآں ہماری راے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بحیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دیے جانے چاہیں —

ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جاے - اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے ' ایک مختصر نمایندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہیے - جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت مانتے ہیں اور ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہیں ' تاکہ اس طرح ان دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جاے —

اسی اثنا میں بابو بل دیو سہاے صاحب ایڈوکیٹ جنرل سے جو گفتگو فرمائی اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے - اس کی نقل قاضی عبدالودود صاحب نے بابو صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی انھوں نے اس کی صحت کو تسلیم کیا اور نمبر (۹) کا اضافہ فرمایا —

۱ - ہم انگریزی کو ذریعۂ تعلیم نہیں رکھنا چاہتے - اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہتے ہیں - رہا یہ سوال کہ یہ سب کے لیے ہندستانی ہو یا اردو والوں کے لیے اردو اور ہندی والوں کے لیے ہندی ' آپ جس طرح

چاہیں طے کر سکتے ہیں —

۲ - اس وقت اردو ہندی کی کشمکش ہمارے یہاں نہیں ہے - میں نے مولوی حفیظ صاحب کے ساتھہ دورہ کیا تو معلوم ہوا کہ اکثر اسکولوں میں ایک ہی استاد اردو اور ہندی بولنے والوں کو ساتھہ ساتھہ پڑھاتا ہے - اردو والے اردو کی کتاب اور ہندی والے ہندی کتاب سامنے رکھہ کر پڑھتے ہیں اور سبق اور استاد کی باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی —

۳ - ہمارے ٹریننگ کالج میں امیدواروں کے داخلے میں ایسوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ہندی اردو دونوں زبانیں جانتے ہیں —

۴ - ہمارے ٹریننگ اسکولوں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں —

۵ - استادوں کے تقرر میں ایسے اُستادوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو دونوں زبانوں سے واقف ہوں —

۶ - ہندی یا اردو جاننے والے طلبہ کی مشترک جماعت ہونی چاہیئے —

جب درسی کتابوں کی اصطلاحات کے متعلق گفتگو آئی تو بابو راجندر پرشاد صاحب نے فرمایا کہ اصطلاحیں جہاں تک ممکن ہو ہندوستانی سے لی جائیں اور جو عام طور پر رائج ہیں وہ بجنسہ رہنے دی جائیں اور جو موجود نہ ہوں ان کے لیے اردو ہندی کی عام فہم اصطلاحوں کو ایک ساتھہ استعمال کیا جائے - اردو رسم خط میں جو کتابیں ہوں اُن میں ہندی اصطلاحیں قوسین کے اندر لکھہ دی جائیں اور اسی طرح ہندی کی کتابوں میں اردو کی اصطلاحیں درج کی جائیں —

اس موقع پر انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار نے صوبے کے ممتاز

حامیان اردو کی ایک کانفرنس بھی منعقد کی جس کا جلسہ ۲۸ اگست کی شب کو اردو کتب خانہ بانکی پور میں مسٹر محمد یونس کی زیر صدارت ہوا۔ اس جلسے میں سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، مولوی ظفرالملک علوی، مولوی رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالودود صاحب نے تقریریں کیں۔ جناب صدر نے انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کرنے پر زور دیا۔ اس جلسے میں کوئی تجویز منظور نہیں کی گئی، لیکن جو اظہار خیال کیا گیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ شرکائے جلسہ کو انجمن ترقیء اردو ہند کی مقرر کردہ کمیٹی پر اعتماد ہے —

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر یہ انتظام بھی کیا تھا کہ ہندوؤں مسلمانوں کے تہذیبی تعلقات پر لکچر دیے جائیں۔ چنانچہ وھیلر سینٹ ھاوس میں ۲۹ کی شب کو ایک بڑے مجمع کے سامنے، اصحاب ذیل نے اس موضوع پر لکچر دیے۔ پنڈت برجموھن دتاتریہ صاحب۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، خواجہ غلام السیدین صاحب، شید احمد صدیقی صاحب۔ ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صوبۂ بہار صدر جلسہ تھے —

ارکان کمیٹی کے قیام وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے اہل پٹنہ نے خان بہادر سید ابراھیم حسین صاحب کے زیر صدارت ایک استقبالی کمیٹی قائم کرلی تھی۔ اس کمیٹی کی طرف سے کمیٹی کے ارکان کو ۲۹ کی شب کو دعوت دی گئی جس میں شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز حامیان اردو شریک تھے۔ مسٹر سچدانند سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے کمیٹی کے ارکان کو ایٹ ھوم دیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے صبح کے کھانے پر بلایا، اور مسٹر شرف الدین حسن ایم۔ ایل۔ اے نے لنچ کی دعوت دی۔

کمیٹی کا کام ۲۹ اگست کو ختم ہوگیا تھا لیکن میں ایک روز اس غرض سے اور ٹھہر گیا کہ بہار کے دیہات میں جہاں مسلمان آباد ہیں اور ان کی اردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں وہاں ابتدائی مدرسے قائم کرکے اس کا انتظام کیا جائے - چنانچہ اس کے متعلق پٹنے کے بعض احباب اور اضلاع بہار کے بعض اصحاب سے گفتگو کی ۔ ان صاحبوں نے اس پر پوری آمادگی ظاہر کی - بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ سید ضمیرالدین احمد صاحب وکیل نے جن کی مستعدی اور خلوص کو سب تسلیم کرتے ہیں سیاسی تعلقات کو ترک کرکے اپنے فرصت کے اوقات اسی کام کے لیے وقف کردیے ہیں - ولی الحق صاحب نے بھی جو مستعد نوجوان ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کام میں پوری مدد دیں گے - قاضی عبدالودود صاحب اب انجمن کی تنظیم و تشکیل اور شاخیں قائم کرنے اور اردو مدارس کھولنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں —

مجھے اہل بہار سے کامل امید ہے کہ وہ اس کام کو پوری مستعدی اور انہماک سے انجام دیں گے —

(۲) مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبۂ متوسط سے گفتگو

بہار کمیٹی سے فارغ ہوکر میں ناگپور پہنچا اور صوبۂ متوسط (سی-پی) کے وزیر اعظم مسٹر کھرے اور اس کے بعد خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب بی-اے، ایل ایل-بی، سابق ڈپٹی کمشنر اور نواب محی الدین خاں صاحب ایم-ایل سی کی معیت میں مسٹر شکلا وزیر تعلیم سے ملاقات کی -

وزیر تعلیم سے جن امور پر گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) - صوبۂ متوسط میں پرائمری مدارس کے لیے اردو ریڈروں کے متعدد سلسلے منظور کیے گئے ہیں اور اس لیے مختلف مدارس میں مختلف سلسلے پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ دوسری زبانوں کے لیے ریڈروں کا ایک ہی سلسلہ ہے - یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سارے صوبے کے لیے اردو ریڈروں کا ایک ہی سلسلہ منظور کیا جائے —

اردو ریڈروں کے موجودہ طریقے سے بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں خصوصاً جب طالب‌علم کو ایک مدرسہ چھوڑ کر کسی دوسرے مدرسے میں داخل ہونے کی ضرورت پڑتی ہے - یا جب امتحان کے پرچے میں سے یہ تلاش کرنا پڑتا ہے کہ سوالات مندرجۂ پرچہ میں کون سے سوالات ان ریڈروں سے تعلق رکھتے ہیں جو اس نے اپنے مدرسے میں پڑھی ہیں - اس سے طالب‌علم کی پریشانی کا اندازہ ہو سکتا ہے —

(۲) میونسپل حلقوں کے اکثر سپرنٹنڈنٹ تعلیم اردو سے ناواقف ہیں - اس وجہ سے ایسے حلقوں کی اردو تعلیم ناقص رہ جاتی ہے - یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسپکٹروں کے لیے اردو کا جاننا بھی ایک ضرور شرط قرار دیا جائے —

(۳) ہماری رائے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے ہندی کا جاننا اور ہندی خواں طلبہ کے لیے اردو کا جاننا لازمی قرار دیا جائے مڈل اسکولوں میں اس طریقے کا رائج کرنا زیادہ مناسب ہوگا —

(۴) ابتدائی تعلیم کے لیے اس صوبے میں جو نیا طریقہ یا نئی تجاویز اختیار کی جائیں، ان میں اردو کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے —

) ناگپور یونیورسٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ اردو کے امتحانات
کا نصاب متعین کرکے شایع کرے —

اس گفتگو کی یادداشت میں نے لکھ کر بھی وزیر تعلیم کی خدمت
بھیج دی تھی کہ وہ اس کی توثیق فرمادیں —

انہوں نے اپنی مہربانی سے جو جواب عنایت فرمایا اس کا ترجمہ
میں درج کیا جاتا ہے —

" جناب من -

آپ کا خط (بلا تاریخ) پہنچا اور اس کے ساتھ وہ اموریادداشت بھی وصول ہوے جو آپ نے ۳ ستمبر کوناگپور میں بوقت ملاقات پیش کیے تھے - عنقریب کونسل ایک مستقل مجلس تعلیم مقرر کرنے والی ہے اس وقت آپ کی یادداشت اس کے سامنے پیش کردی جائے گی - اس کی رپورٹ پر تعلیم کی اس پالیسی کے ساتھ غور کیا جائے گا جو اس صوبے کے لیے آئندہ دو تین مہینے کے عرصے میں مقرر کی جائے گی - اس وقت میں آپ کو آپ کے مطالبات کے متعلق حکومت کے فیصلے سے باقاعدہ اور سرکاری طور پر مطلع کرسکوں گا —

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کانگریس کی یہ پالیسی ہے کہ وہ تمام
قوموں کی زبان اور تہذیب (کلچر) کی حفاظت کرے - آپ کے
مطالبات کا مناسب لحاظ کیا جائے گا اس وقت اس سے زیادہ میں
کچھ نہیں کہہ سکتا " —

آپ کا نیاز مند
آر - شکلا

یہ معلوم کرکے ہمارے ناظرین کو ضرور خوشی ہوگی کہ وزیر اعظم مسٹر کھرے اور وزیر تعلیم مسٹر شکلا بہت صاف اور بلا تکلف اردو (یا ہندستانی) بولتے ہیں' اور لطف یہ ہے کہ اردو شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے ہیں ۔ یہی وہ زبان ہے جس کی حفاظت اور بقا کے ہم متمنی ہیں —

---

(۳) گاندھی جی اور اردو ہندی

جولائی کے ابتدائی ہفتے میں ہندی پرچارک ادھیا پن مندر (یعنی ٹریننگ اسکول وردھا کا افتتاح کرتے وقت جو تقریر فرمائی اس میں یہ بھی فرمایا :—

"انہیں (مدرسین) کو اُس ہندی زبان پر پورا عبور حاصل کرنا پڑے گا جس کی تعریف ساھتیہ سمیلن اندور میں کی گئی تھی' یعنی وہ زبان جسے شمالی ہند میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور دیوناگری یا فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے ۔ اس زبان پر قدرت حاصل کرنے کے معنے صرف یہ نہیں ہوں گے کہ اس آسان ہندی ہندستانی کو سیکھہ لیا جائے جسے عوام بولتے ہیں بلکہ اس فصیح و بلیغ ہندی کو جس میں سنسکرت الفاظ کی بھر مار ہوتی ہے نیز اس فصیح و بلیغ اردو کو بھی جس میں فارسی عربی الفاظ بکثرت استعمال ہوتے ہیں' سیکھنا لازم ہوگا ۔ ان زبانوں کے علم کے بغیر انہیں زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوسکتی' جیسے کوئی

شخص انگریزی زبان پر عبور حاصل کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا جب تک وہ چاسر، سوفسٹ اور جانسن کی انگریزی پر قادر نہ ہو یا کوئی شخص سنسکرت زبان کا عالم نہیں ہوسکتا جب تک وہ والمیک اور کالیداس کی سنسکرت کا علم نہ رکھتا ہو" - (ہریجن، ۱۷ جولائی) —

گاندھی جی کی یہ تجویز نہایت معقول اور قابل ستایش ہے - لیکن ایک دوسرے مقام پر (ہریجن ۳ جولائی) فرماتے ہیں کہ "ہندی، ہندستانی اور اردو تینوں لفظوں سے ایک ہی زبان مراد ہے جسے شمالی ہند میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے" اسی تحریر میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

" میں نے ایک لحاظ سے اردو کی حمایت کی، اگر اسے ہندی سے الگ سمجھا جائے، جب ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسۂ اندور میں میرے تحریک پر وہ تعریف منظور کرلی گئی جو دفعہ (۱) میں دی گئی ہے (جو ہم نے اوپر نقل کی ہے - اڈیٹر) اور جب بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسۂ ناگپور میں بھی میری تحریک پر یہ تعریف قبول کرلی گئی اور صوبجاتی تعلقات کی مشترک زبان کو ہندی یا ہندستانی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح ہندؤں اور مسلمانوں کو پورا موقع دیا گیا کہ وہ اس کوشش میں شریک ہوکر مشترک زبان کو ترقی دیں اور اپنے اپنے صوبے کے اعلیٰ خیالات کو اس زبان میں ظاہر کریں " —

گاندھی جی کی تعریف سے زبان کی نوعیت نہیں بدل سکتی - اُن

کا یہ فرمانا کہ ہندی، ہندستانی اور اردو تینوں لفظوں سے ایک ھی زبان مراد ہے ہرگز صحیح نہیں - جس ہندی کا پرچار گاندھی جی اور اُن کے شریک اور پیرو اس وقت ملک میں کررہے ھیں وہ نہ ہندستانی ہے اور نہ اردو - اور گاندھی جی کی اس تعریف کو کوئی زباندان قبول نہیں کرے گا کیونکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے - لفظوں کی آڑ میں پناہ لینے اور منطقی حجتوں سے حقیقت کو چھپانے سے کام نہیں چلتا - سارا ہندستان جانتا ہے کہ گاندھی اور اکثر کانگریس لیڈر کس زبان کی اشاعت کی کوشش کر رہے اور کس طرح زبردستی یہ زبان لوگوں کے سر منڈھ رہے ھیں - غور کرنے کی بات ہے کہ صوبۂ مدراس میں جسے ہندی سے دور کی نسبت بھی نہیں ہندی کی اشاعت کے لیے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے - اور اگر کچھ کہو تو گاندھی جی کی تعریف پیش کی جاتی ہے کہ ہندی، ہندستانی اور اردو ایک ھی تو ھیں - کیا جھوٹ کی طرح سچ کہنے کے بھی مختلف ڈھنگ ھیں —

گاندھی جی نے ہندی پرچارکوں کے لیے جو یہ تجویز کی ہے کہ وہ فصیح و بلیغ ہندی اور اردو سیکھیں، اس کے مفہوم کو ہریجن کے قابل اڈیٹر نے کھول کے بیان کیا ہے - وہ کہتے ھیں کہ " پرچارک کے لیے یہ شرط اس لیے لازم کی گئی ہے کہ وہ غیر اردو داں اور غیر ہندی داں صوبوں کے لیے ایک ایسی زبان پیدا کرے جو آسانی سے سمجھ میں آسکے - جس طرح اسلامی فتوح کے زمانے میں آسانی کے لیے سمو کر ایک زبان بنالی گئی تھی، اسی طرح قومی اتحاد کی خاطر ایک ایسی زبان بنالی جائے جسے گاندھی جی ہندی ہندستانی سے موسوم کرتے ھیں اور جس کی شدید ضرورت ہے " —

فاضل اڈیٹر نے جو مثال پیش کی ہے وہ صحیح ہے - اسلامی زمانہ میں جو زبان بنی وہ اقتضاے زمانہ اور اقتضاے ضرورت کی وجہ سے خود بخود بن گئی ' اور خود بخود پھلی پھولی اور پھیلی اور آج تک قائم اور جاری ہے - آج کل کی طرح احکام و فرامین ' جلسوں اور کمیٹیوں ' پراپیگنڈے ' لاکھوں روپیے کے صرف اور حکومت کے زور سے نہیں پھیلائی گئی تھی - یہ فرق بہت بڑا فرق ہے - ایک چیز کا قدرتی طور پر بننا اور بڑھنا اور کسی چیز کا زبردستی حلق میں اتارنا ' دو ایسی باتیں ہیں جن کا کسی طرح مقابلہ نہیں ہوسکتا - اس کے علاوہ پرچارک کو اجازت ہے کہ بنگال ' آسام ' مدراس میں دل کھول کے سنسکرت چھانٹے اور گجرات اور مہاراشٹر میں اردو فارسی کے صرف وہی لفظ بولے جو پہلے سے رائج ہیں - سارا انحصار پرچارک پر ہے ' اس کی زبان کون پکڑ سکتا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ وہ کس زبان کی اشاعت کرے گا - ہم ملفقی حجتیں کرتے رہیں گے اور وہ اپنا کام کرتا رہے گا کیونکہ اس کی پشت پر دولت ' اثر اور ایک حد تک حکومت ہے - ہم بدگمانی نہیں کرتے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ اُس ذہنیت سے بحث کررہے ہیں جو آج کل پیدا کردی گئی ہے اور جس کے ذمہ دار بڑی حد تک گاندھی جی ہیں - انہوں نے ناحق یہ جھگڑا چھیڑ کر ملک میں پریشانی اور نفاق پیدا کردیا ہے —

---

(۴) بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور ہندی اردو

بابو پرشوتم داس ٹنڈن صاحب جو ہندی ساہتیہ سمیلن کے روح و رواں ہیں انہوں نے ڈاکٹر اشرف کو ایک خط لکھا ہے جس میں اردو

ہندی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے - فرماتے ہیں کہ :

"ذاتی طور پر میں ہندی کے لفظ کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس سے وہ خیالات وابستہ ہیں جو قدیم اور خوش کن ہیں' اور اس میں ہندو اور مسلم تہذیبوں کا نچوڑ ہے - "ہندی" "ہند" سے نکلا ہے جو ہمارے ملک کا نام ہے اور میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ یہ لفظ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے - اس میں اُس زبان کی کئی بولیاں اور شکلیں داخل ہیں - اردو اس کی صرف ایک خاص صورت ہے - ہندی کا لفظ سب سے پہلے خسرو نے اس زبان کے لیے استعمال کیا تھا اور خسرو کے بعد کثرت سے مسلمان مصنفین نے اس لفظ کو نہ صرف قدیم دیسی زبان کے لیے بلکہ فارسی آمیز زبان کے لیے بھی استعمال کیا" - اس کے بعد انہوں نے باقر آگاہ اور میر تقی میر کے نام پیش کیے ہیں کہ انہوں نے اپنے کلام کو ہندی کے نام سے موسوم کیا —

یہ وہی منطقی اور ملایانہ دلیل ہے - خسرو نے ہرگز ہندی کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا جن معنوں میں اس وقت استعمال کیا جاتا ہے - اور نہ باقر آگاہ اور میر نے ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں خسرو نے استعمال کیا تھا - لفظ گو بے جان سہی لیکن وہ بھی انسان کی طرح ایک زندگی رکھتا ہے - جس طرح حالات اور زمانہ کا انسان پر اثر پڑتا ہے اسی طرح لفظ بھی ان تمام حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے - کسی لفظ کی اصل تحقیق کرنا اور اس کے بعد یہ کہنا کہ اس کا مفہوم یہ ہونا چاہیے' بچوں کی سی

بات ہے - بیشک ہندی کا لفظ ایک زمانے میں اردو کے لیے استعمال ہوتا تھا- اور یہ استعمال فارسی کے مقابلے میں تھا - چونکہ اس زمانے میں فارسی کا عام رواج تھا، مدرسوں، مکتبوں اور دفتروں میں اسی کا بول بالا تھا، اس لیے نئی زبان جسے بعد میں اردو کہنے لگے فارسی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی - محض فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے اسے ہندی کہنے لگے - جب اس نے علمی اور ادبی حیثیت حاصل کرلی تو نام بھی بدل گیا اور مفہوم بھی بدل گیا - کیا ٹنڈن اور ان کے ہم خیال یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی کے آج کل وہی معنے لیے جاتے ہیں جو میر اور مصحفی کے زمانے میں لیے جاتے ہیں؟ یہ اور بات کہ ٹنڈن صاحب کو یہ لفظ پسند ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہی لفظ سب زبانوں اور سب معنوں پر ہوجائے - ذاتی پسند یا ناپسند سے عام رواج اور عام مفہوم نہیں بدل سکتا - ہندی کے معنے اب نہ اردو ہیں اور نہ ہندستانی، خواہ ٹنڈن صاحب اور گاندھی کچھہ ہی کہا کریں —

---

(۵) پروفیسر جھا اور اردو ہندی

پروفیسر جھا نے اخبار لیڈر میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے اس امر پر بحث کی ہے کہ اردو اور ہندی کو الگ الگ ترقی کرنے دینا چاہیے - ہندستانی کوی زبان نہیں اور نئی زبان محض فضول ہے - اسی مضمون کے دوران میں وہ فرماتے ہیں —

" صاف بھائی ہر حال میں بہتر ہے - کسی ایک سال کو لیجیے اور اُن ہندو طلبہ کی فہرست دیکھیے جو یونیورسٹی یا بورڈ کے امتحانات میں اردو لے کر شریک ہوئے ہیں اور

نیز ان ہندو طلبہ کی تعداد دیکھیے جنھوں نے فارسی لی ہے اور اس کے مقابلے میں ان مسلمان طلبہ کی تعداد کو دیکھیے جو ہندی لے کر شریک ہوے ہیں اور اگر کسی مسلمان نے سنسکرت لی ہے تو اسے معجزہ سمجھنا چاہیے - یا ہندو ہوسٹل میں جائیے وہاں کے مطالعہ خانے میں ہمیشہ اردو رسالے اور اخبار پائیے گا - مسلمان اقامت خانے جاکر دیکھیے وہاں کوئی ہندی رسالہ یا اخبار نظر نہ آے گا " —

اس سے تو اردو کی فوقیت پائی جاتی ہے - ہندو طلبہ اردو اس لیے نہیں پڑھتے کہ وہ مسلمانوں پر احسان کرتے ہیں بلکہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ وہ اس زبان کو پسند کرتے ہیں - اس میں جو دلکشی اور فصاحت ہے وہ انھیں دوسری زبان میں نظر نہیں آتی - اردو بھی تو آخر دیسی زبان ہے - اگر وہ طلبہ کو زیادہ تر پسند ہے تو اس میں کیا برائی ہے - اب رہا یہ الزام کہ ہندی کی طرف سے مسلمان بے پراوئی کرتے ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں - اب بھی بہت سے مسلمانوں میں بہت سے ہندی کے شاعر موجود ہیں - جامعۂ عثمانیہ میں ہر اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے ہندی کا پڑھنا لازم ہے - اور ایم - اے میں تو یہ قید لگادی گئی ہے کہ اگر ہندی میں تیس فی صدی سے کم نمبر آئیں تو سارے امتحان میں ناکامیاب سمجھا جاے - کیا بنارس یونیورسٹی، ودیا پیٹھہ یا کوئی گروکل ایسی کوئی مثال پیش کرسکتا ہے —

انجمن ترقیء اردو نے حال میں ہی شکنتلا کا راست سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے اور زیر طبع ہے - اسی انجمن کی سرپرستی میں ہندی اردو لغت تیار ہو رہا ہے - یہی انجمن کبیر کے کلام کا انتخاب

بھی مرتب کرا رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ترجمے زیر تجویز ہیں۔ اس سے قبل تلسی داس کی راماین فارسی رسم خط میں مع ترجمہ کے شائع ہوئی تھی۔ اور بہت سے سنسکرت کتابوں کے ترجمے اردو میں شایع ہوچکے ہیں۔ آئندہ ہم کسی وقت اس کی مفصل فہرست شایع کریں گے —

۲- پنڈت جواہر لال نہرو اور مسئلۂ زبان

کانگرس کے صدر جناب پنڈت جواہر لال نہرو نے (The Question of Language) کے نام سے انگریزی میں ایک رسالہ شائع کیا ہے اور گاندھی جی نے اس کے ہر لفظ میں ان کے خیالات کی "عمومی" تصدیق فرمائی ہے۔ نظر بریں یہ امید کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کانگرسی طبقوں میں یہ تحریر کافی پر وزن تسلیم کی جائے گی۔ اگر جدید ہندی زبان کے طرف دار بھی پنڈت جی کی مصالحانہ روش اختیار کریں اور زبان اردو کی مخالفت سے فی الواقع باز رہیں تو کم سے کم انجمن ترقی اردو کے ساتھ کسی مناقشے کی نوبت نہ آئے گی کیونکہ انجمن کا مسلک صرف زبان اردو کی ترقی اور جائز حقوق کی حفاظت کرنا رہا ہے اور وہ کسی دوسری زبان سے اُلجھنا نہیں چاہتی۔ اس مسلک کو یہاں تفصیل سے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس وقت صرف پنڈت جواہر لال صاحب کے رسالے پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں گے :—

پنڈت جی نے شروع ہی میں اس "جاہلانہ" قول کی کہ ہندوستان بھانت بھانت کی بولیوں کا ملک ہے، تردید فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں صرف چند زبانیں اور وہ بھی باہم متحد پائی جاتی ہیں اور

ایک زبان سب پر حاوی ہے جس کے معتقدین کی تعداد قریباً دس کرور ہے (صفحہ ۲)- کچھ آگے چل کر (صفحہ ۵) اس ہمہ گیر زبان کو وہ 'ہندوستانی' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کے بولنے والوں کا شمار بارہ کرور اور سمجھنے والوں کی تعداد مزید برآں دو کرور کے قریب تحریر فرماتے ہیں :—

پنڈت جی کی حب وطن میں شک کرنے والا ' کافر- لیکن اس بحث کو محض " علمی " سمجھ کر ہم اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ " ہندوستان کی تحقیقات لسانی " (Linguistic Survey of India) کے ضخیم مجلدات میں ہماری کثرت السلہ کے متعلق جو حقائق جمع کیے گئے ہیں ' ان کے بطلان کے لیے حب وطن کے سوا کچھ اور مواد بھی درکار ہے اور محض خیال کی بلند پروازی سے واقعات نہیں بدل سکتے- رہی ہندوستانی زبان ' جس کے بولنے ' سمجھنے والوں کی تعداد کہیں دس ' کہیں چودہ کرور بتائی گئی ہے ' تو اگر 'ہندی' اور 'اردو' میں اختلاف بلکہ صرف امتیاز بھی جائز رکھا گیا تو ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ خود بخود باطل ہو جائے گا :—

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تعلیمی اور سرکاری اغراض کے لیے پنڈت جی وہاں کی بڑی زبانوں کو تقویت دینے کے حامی ہیں اور ان زبانوں کی یوں تصریح کرتے ہیں :—

' ہندوستانی ' جس کی دو صورتیں ہیں ' ' ہندی ' اور ' اردو '- اور جس میں اس کی چند شاخیں شامل ہیں- پھر ' بنگالی ' ' مرہٹی ' اور ' گجراتی ' جو ہندی کی بہنیں اور اس سے قریبی اتحاد رکھتی ہیں- جنوب میں ' ' تامل ' ' تلنگی ' ' کنڑی ' ' ملایلم '- ان کے علاوہ ' اُڑیا '

'اسامی' اور 'سندھی'- اور شمال مغرب میں 'پشتو' اور 'پنجابی' بس یہی ۵ درجن بھر زبانیں سارے ہندوستان پر محیط ہیں - (صفحہ ۴) -

اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ پنڈت جی صرف ان زبانوں کو قابل شمار سمجھتے ہیں جن میں کچھہ نہ کچھہ ادبی سرمایہ موجود ہے - لیکن پنڈت جی کی جمہوریت پرستی مسلم ہے اور اس رسالے میں بھی عوام' خاص کر دیہاتی آبادی کے حقوق زبان و تعلیم پر کافی زور دیا گیا ہے - اب اگر دیہات والوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کے اصول پر واقعی انصاف اور سچائی کے ساتھہ عمل کیا جائے گا تو پھر زبانوں کی تعداد کسی طرح ایک درجن تک محدود نہیں رہ سکتی - شمالی ہند ہی میں' مثلاً' 'کشمیری' 'لہندا' 'ملتانی' 'باگڑی' 'راجستانی' 'اودھی' 'بہاری' وغیرہ کئی بولیاں موجود ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے اور جو ایک دوسرے سے کم و بیش اتنا ہی اختلاف رکھتی ہیں' جتنا باہم 'اسپینی' 'فرانسیسی' اور 'اطالوی' میں پایا جاتا ہے -

تمام صوبوں میں تبادلۂ خیالات کا مشترک ذریعہ بنانے کے لیے پنڈت جی ہندوستانی زبان کو پیش کرتے ہیں - ان کا یہ فرمانا درست ہے کہ انگریزی جو بالکل اجنبی زبان ہے یہ رتبہ نہیں پاسکتی اور نہ ہندوستان کے لاکھوں باشندے اس کی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں - پھر انہوں نے 'ہندوستانی' کی تعریف یہ کی ہے کہ اس میں ہم سرسری طور پر 'ہندی' اور 'اردو' دونوں کو شامل کرتے ہیں جو 'دیوناگری' اور فارسی' رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں - پنڈت جی کی خواہش ہے کہ گجراتی' مرہٹی' بنگالی اور ممکن ہو تو جنوبی ہند کے رسوم خط

ھی 'دیوناگری' یا اس کے مماثل کردئیے جائیں اور اسی طرح سندھی کے لیے اردو رسم الخط اختیار کیا جائے - بہرحال 'وہ 'اردو' کے (فارسی) رسم الخط کو فی الحال قائم رکھنے کے موید ھیں —

'اردو' اور 'هندی' کی ابتدا اور بعد کے مناقشوں پر بھی فاضل مقالہ نگار نے کچھہ تاریخی' کچھہ لسانی اور کچھہ سیاسی بحث کی ھے لیکن آخر میں ایک عجیب نتیجہ یہ نکالا ھے کہ "آج کل 'اردو' اور 'هندی' میں اصلی فرق صرف یہ ھے کہ 'اردو' شہروں کی اور 'هندی' دیہات کی زبان ھے - 'هندی' تو یقیناً شہروں میں بھی بولی جاتی ھے لیکن اردو قریب قریب کلیتاً شہری ھے" (صفحہ ۱۰) —

اس میں شک نہیں کہ 'اردو' شمالی هندوستان کے تمام شہروں اور قصبات میں 'لاهور' سے 'پٹنے' تک یکساں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے لیکن ان شہروں کے نواحی دیہات میں 'پنجابی' سے لیکر 'بہاری' تک جو بولیاں مروج ھیں' ان سب کو کسی ایک ھی زبان (هندی) ے موسوم کرنا ' قطعاً اور صریحاً غلط ھوگا - ممکن ھے پنڈت جی اپنا مطلب صاف طور پر نہ بیان کرسکے ھوں اور یا ھم اسے سمجھنے سے قاصر ھے - بہرکیف ظاهر ھے کہ اگر ان دیہاتی بولیوں کو شہروں میں رائج یا گیا تو موجودہ یکسانی بھی غارت ھوجائےگی - بخلاف اس کے اگر ہری زبان اپنے اپنے حلقے کے دیہات میں پھیلائی جائے تو زبان کی یکسانی ا مقصد بخوبی حاصل ھوجائے گا - لیکن افسوس ھے کہ یہی وہ صفیوں' وہی مقصد ھے جسے نئی هندی کے پرچارک ناسمجھی سے مٹانے کے درپے و گئے ھیں —

'هندی' اور 'اردو' کے اختلاف اور جداگانہ راستوں پر گامزن

ہونے سے ' فاضل مقالہ نگار مطلق خوف زدہ نہیں بلکہ قوی امید رکھتے ہیں کہ زمانے کی ضروریات اور وطن پرستی کا تقاضا انہیں قریب لائے بغیر نہ رہے گا اور آخر میں یہ دونوں اصولاً ایک زبان بن جائیں گی - ہم اس آرزو میں دل سے پنڈت جی کے شریک ہیں اگرچہ فراق کی قائیت اور وصال کی امید میں ایک دلچسپ تضاد ضرور پایا جاتا ہے —

پنڈت جی کی ایک تجویز یہ ہے کہ ممکن ہو تو (Basic English) کے طرز پر ایک " مجمل ہندوستانی " مرتب کی جائے جسے غیر ہندوستانی صوبوں میں تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنانا آسان ہو - تجویز بہت اچھی ہے اور اگر 'ہندی' اور 'اردو' والوں میں اشتراک نہ ہو سکے تو بھی دونوں اپنی اپنی زبان کا ایسا سہل و مختصر مجموعہ تیار کر سکتے ہیں جس میں کم سے کم تعداد میں ضروری اور مقبول عام الفاظ شامل ہوں اور صرف اسی کو سیکھ کر غیر زبان والے معمولی گفتگو کرنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائیں - اسی سلسلے میں پنڈت جی نے اصطلاحی الفاظ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ علحدہ علحدہ اصطلاحیں وضع کرنے سے بہتر ہے کہ ہندوستان کی سب زبانوں میں جہاں تک ہو سکے فرنگی اصطلاحات بجنسہ اختیار کرلی جائیں تاکہ ہماری علمی کتابوں میں یک رنگی پیدا ہو جائے - لیکن یہ تجویز جیسی نظر آتی ہے ' حقیقت میں ایسی سہل اور قابل عمل نہیں ہے - ہم بخوف طوالت یہاں صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ پیچیدہ علمی مسئلہ بہت کچھ غور و بحث کا محتاج ہے - نیز یہ کہ خود یورپ و امریکہ میں اب بین الاقوامی اصطلاحات کی وہ یکسانی قائم نہیں رہی جس کا بیس تیس برس پہلے تک ہر ملک میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا —

رسالے میں سب سے اہم بحث سرکاری اور تعلیمی زبان کی ہے -
پنڈت جی کی رائے ہے کہ ہر صوبے میں سرکاری' اور ابتدا سے انتہا
تک تعلیم کا ذریعہ وہیں کی زبان ہونی چاہیے - صوبوں کی ان (بارہ)
زبانوں کی فہرست ہم پہلے نقل کر چکے ہیں - اگر چہ ' پنجابی ' اور
' پشتو ' کے علاقے میں فاضل مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا
ذریعہ ' ہندوستانی ' کو بنانا بہتر ہوگا - دوسرے صوبوں کے ثانوی مدارس
میں " مجمل " اور کالجوں میں مکمل ہندوستانی کی تعلیم لازمی ہونی
چاہیے اور یہ حیثیت پورے ملک کی زبان ہونے کے ' عدالتوں وغیرہ
میں بھی اس کا استعمال جائز قرار دیا جانا چاہیے - ہندوستانی کے
لیے ہر محل پر دونوں رسم الخط روا رکھے جائیں گے اور خود ہندوستانی
کے علاقے میں بھی طالب علم ' دیوناگری ' یا ' اردو ' رسم الخط پسند
کر سکے گا —

لیکن اس موقع پر یہ بات پنڈت جی نے صاف طور پر تحریر نہیں
کی کہ اردو اور ہندی زبان کی کتابیں بھی جداگانہ ہوں گی یا ایک
ہی کتاب کو صرف دو خطوں میں چھاپ دیا جائے گا ؟ یہ صراحت کی
جانی ضروری ہے کیونکہ خاص ' ہندوستانی ' کے صوبے میں ہم یہ شکایت
سن رہے ہیں کہ نصاب کی تازہ اردو کتابوں میں مصنوعی ہندی الفاظ
کی بھر مار ہوتی جاتی ہے اور ہماری ادبی زبان کا معیار گر گیا ہے -
ہمیں یقین ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا ہرگز یہ منشا نہ ہوگا کہ
محض رسم الخط کے بہس میں ' اردو ' والوں کو کوئی دوسری زبان
پڑھنے پر مجبور کیا جائے بلکہ وہ خوشی سے اس دشواری کا یہ حل
قبول کریں گے کہ اردو کی کتابیں اسی زبان کے مستند ادیب تیار کریں

اور " هندی " نصاب 'هندی ' کے انشاپرداز تحریر فرمائیں - بہر حال هم چاهتے هیں کہ اس خلش کو جو ان کے اجمالی بیان سے پیدا هوگی ' پنڈت جی جلد سے جلد دور کرنے پر توجہ فرمائیں —

رسالے کا بغور مطالعہ کرتے وقت هم جا بہ جا یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ فاضل مقالہ نگار بھی کچھہ نہ کچھہ اس هنگامے سے متاثر هیں جو "هندی ' کے مدعیوں نے ملک میں مچا رکھا ہے - لیکن پنڈت جی کے ایسے خیالات پر گرفت کرنا ' هم اُن کی صلح جوئی اور نیز ممتاز شخصیت کی بنا پر مشکل سمجھتے هیں اور اس جگہ نئی "هندی" کے دعاوی پر بھی کوئی جرح کرنا نہیں چاهتے - البتہ هماری اس قدر گزارش ضرور ہے کہ زیادہ تحقیق و تفحص نہ سہی ' کم سے کم ایک بار جناب موصوف الہ آباد کے کسی دیہاتی کی ' ضلع آگرہ یا دهلی کے کسی گاؤں والے سے ملاقات کرا کے دیکھیں کہ ان دونوں کی مقامی اور اصلی بولیوں میں کس قدر یکسانی یا تفاوت پایا جاتا ہے —

تبصرے

ادب

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

خاص نمبر

تبصرے

ادب

غالب نامہ -

(تالیف شیخ محمد اکرام صاحب ایم - اے - آئی سی ایس)-

مولانا غلام رسول صاحب 'مہر' کی کتاب "غالب" کی سیاہی سوکھنے نہ پائی تھی کہ پنجاب ہی کے ایک نوجوان فاضل کی یہ کتاب غالب اور کلام غالب پر صوبہ بمبئی سے شایع ہوئی جہاں لائق مولف آج کل افسر حصہ ضلع ہیں - کتاب کے تین حصے ہیں - اول 'تذکرہ' - جس میں مرزا صاحب کے سوانح زندگی' حالات خاندانی وغیرہ زیادہ تر انہی کے خطوط اور تصانیف کی مدد سے مرتب کیے گئے ہیں - اس کے بعد ان کی ذاتی سیرت و کردار اور شاعری پر مفصل 'تبصرہ' لکھا ہے اور آخر میں ان کا منتخب اردو اور فارسی کلام ترتیب زمانی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے - نوجوان مولف نے جس محنت و شوق سے کئی سال تک اس مضمون کا مطالعہ کیا اور جس اہتمام سے یہ کتاب ترتیب دی وہ نہایت قدر و تحسین کے قابل ہے لیکن سوانحی حالات میں وہ 'یادگار غالب' اور پھر 'مہر' کی تازہ اور ضخیم تالیف پر کوئی خاص اضافہ نہیں

کرسکے ہیں - ان کتابوں میں جزئی واقعات یا سنین و اسما کی کوئی غلطی رہ گئی تھی تو انہیں اپنی تمہید میں صاف کردینا بالکل کافی ہوتا۔ اس سے تصحیح کی غرض پوری ہوجاتی اور نوجوان مولف کی تحقیق و تدقیق کا بھی ناظرین کو بخوبی اندازہ ہوسکتا تھا - موجودہ صورت میں دقت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ مقابلے میں ایک طرف نثر اردو کے استاد کامل 'حالی' کی کتاب ہے اور دوسری طرف ایک پختہ کار انشا پرداز 'مہر' کی ضخیم تالیف رکھی ہے - ان کے سامنے شیخ محمد اکرام صاحب کی تحریر' ہمیں خوف ہے کہ نکتہ چینوں کو مبادا لوزات اور فیرنی کے دسترخوان پر گڑ کا دلیا نظر آے —

البتہ 'تبصرہ' میں لائق مولف نے بعض مباحث' جیسے غالب کا فلسفہ' مذہب وغیرہ عنوانوں پر بہت مفید و پر مغز بحث کی ہے - وہ اس عام خیال کی کہ غالب کی اپنے زمانے میں کافی قدر نہیں ہوئی' تردید کرتے ہیں اور ذاتی اخلاق و عادات کی نسبت بھی جو خوش اعتقادیاں پھیل گئی ہیں' انہیں مرزا صاحب کے مسلمہ حالات زندگی کی بنا پر غلط یا مبالغہ آمیز بتاتے ہیں - اردو' فارسی کلام کے مختلف دور' نیز محاسن و مدارج کلام کے متعلق فاضل مولف کا تبصرہ ان کے وسیع مطالعے اور عمدہ فہم و مذاق کی بین دلیل ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسے مباحث میں انفرادی ذوق کی بنا پر قیل و قال کی بہت کچھ گنجائش رہ جاتی ہے - مثلاً غالب کے اس شعر کو لائق مولف بہترین کلام کا نمونہ سمجھتے ہیں —

بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفت است

بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

حالانکہ مصاخفتن سرے سے بے معنی ہے اور مرزا صاحب نے اعتراض کا جو جواب دیا تھا' اُس نے غلطی کو اور بھی فاحش بنا دیا ہے -

لیکن شیخ محمد اکرام صاحب کا اصلی کارنامہ کلام غالب کی تاریخی تدوین ہے جس کے لیے انہوں نے سالہا سال محنت و دیدہ ریزی کی اور ہندوستان سے زیادہ انگلستان کے کتب خانوں میں کتب گردانی کرتے رہے - مرزا غالب کا زمانہ اتنا قدیم نہیں ہے نہ وہ ایسے غیر مقبول و گمنام رہے کہ ہندوستان میں اُن کی تصانیف اور تذکرے نہ مل سکتے اور ولایت کے کتب خانوں کے بغیر کام نہ چلتا - اسی لیے نوجوان مولف نے اپنی ولایت کی تحقیقات کو جو اہمیت دی ہے اس پر لاہور کے ایک طالب علم نے اُن کا مذاق اڑایا اور لکھا ہے کہ ہجری سال و ماہ سے عیسوی اور عیسوی سے ہجری تاریخ کا تعین کرنے کے لیے مسٹر محمد اکرام نے 'بوڈلین لائبریری' کی جس جنتری کا حوالہ دیا ہے وہ کوئی بہت نایاب چیز نہیں - ہندوستان میں بھی بہت لوگ اس حسابی طریق سے واقف ہیں مگر "مسٹر اکرام کا تو خیال یہ تھا کہ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری کا نام لوگوں پر .. ہیبت طاری کردے گا* " -

بہرحال' اول تو کتب خانہ انڈیا آفس میں دو ایک بہت کام کی نادر کتابیں نوجوان مولف کو مل گئیں دوسرے ولایت کے قیام کے زمانے میں انہیں اپنی تعلیم کے بعد جو کچھ فرصت ملی اس کا یہ بہترین مصرف تھا کہ وہ غالب کے متعلق تحقیق و تفحّص کرتے رہے - ان کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ غالب کی شاعری کی عظمت اور اس کا تاریخی ارتقا سمجھنے کے لیے مرحوم کے فارسی کلام کا مطالعہ ناگزیر ہے - چنانچہ

* اسلامیہ کالج کا رسالہ فروغ مشرق (سنہ ۱۹۳۷ ع) صفحہ ۶۰ -

فاضل مولف نے اس شاعری کے جو چار دور قائم کیے هیں ان میں سے تیسرا دور تمام تر غالب کے فارسی کلام پر مشتمل ہے - تفصیلی دلائل کو تو اصل کتاب میں مطالعہ کرنا چاهیے لیکن شیخ محمد اکرام صاحب کی ترتیب کا خلاصہ یہ ہے :—

دور اول جس میں سنہ ۱۸۲۱ یعنی شاعر کی پچیس برس کی عمر تک کا کلام ہے۔ لائق مولف نے اسے 'ریختہ' موسوم کیا اور اس کے بھی " رنگ بیدل " اور "بادۂ نیم رس " کے نام سے دو حصے قرار دئے هیں - (همیں اقرار ہے کے بادۂ نیم رس' کے مفہوم تک هماری رسائی نہ هوسکی) یہ پورا دور 'نسخۂ حمیدیہ' کے متن پر مبنی ہے جو ۱۲۳۷ هجری (یعنی ۱۸۲۱ ع) میں قلمبند هوا تھا —

دوسرا دور ' ۲۱ سے ۱۸۳۲ ع تک گیارہ سال کے کلام کا حامل اور " خمخانۂ شباب " کے شاعرانہ نام سے موسوم کیا گیا ہے - اس میں غالب کا وہ اردو کلام درج ہے جو نسخہ حمیدیہ کے متن میں تو موجود نہیں لیکن دیوان غالب کی طبع اول کے وقت ۱۸۴۱ ع میں چھپا تھا - لائق مولف کو مطبوعہ دیوان کا جو نسخہ خان بہادر ابو محمد صاحب سے مستعار ملا ' اگرچہ اس کا سرورق ضائع هوگیا ہے لیکن وہ اسے (سید المطابع کی) طبع اول هی کا نسخہ سمجھتے هیں - یہ وہ منتخب دیوان تھا جس میں دوستوں کے مشورے سے ابتدائی ریختہ کے بہت سے اشعار حذف کردیے گئے تھے - شیخ محمد اکرام صاحب کی یہ تحقیق کہ انتخاب چھپنے سے کئی سال پہلے تکمیل کو پہنچ گیا تھا ' درست ہے لیکن همارے خیال میں اسے ۱۸۳۲ ع کی بجاے ۱۸۳۸ ع تک بڑھا دینا زیادہ قرین صواب هوگا جس سنہ میں نواب ضیاءالدین خاں نے اس اردو دیوان کے لیے تقریظ تحریر کی۔

تیسرا دور "بہار عجم" ۱۸۲۷ سے شروع ہوکر ۱۸۴۷ ع پر ختم ہوتا ہے - گویا دور دوم کے بھی چند سال اس میں داخل کر لیے گئے ہیں - اس میں مرزا صاحب کا فارسی کلام تین فصلوں میں پیش کیا گیا ہے لیکن یہ اردو سے بھی مختصر انتخاب ہے اگرچہ اس میں جملہ اصناف سخن کے نمونے شامل ہیں - آخری دور ۱۸۴۴ سے شروع ہوکر ۱۸۵۵ ع پر منتہی ہوتا ہے مگر اُسی میں بطور ضمیمہ ۱۸۶۷ یعنی زمانۂ رحلت تک کے اشعار شریک ہیں - اس دور کا نام " اردوے معلّی " تجویز کیا ہے گو اس میں آخر زمانے کا فارسی کلام بھی داخل ہے —

فاضل مولف کی علمی تحقیق کی ہم مکرر داد دیتے ہیں اگرچہ ہمیں کسی قدر افسوس ہوا کہ ترتیب و تعیّن زمانی کی اتنی محنت اٹھانے کے بعد بھی انہوں نے صرف انتخاب کردینا کافی سمجھا حالانکہ کم سے کم سارے اردو کلام ہی کو جسے وہ بھی غالب کا کلام سمجھتے ہیں ' اسی ترتیب کے ساتھہ یکجا کردیتے تو یہ بجاے خود نہایت مفید تالیف ہوتی اور لوگوں کو ان کے انتخاب کے متعلق بھی کسی اختلاف کرنے کی گنجائش نہ نکلتی —

آخر میں یہ عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ ایسے ادبی موضوع کے لیے نوجوان مصنف کی دفتری طرز نگارش کچھہ بہت موزوں نہیں نظر آتی - "فرمائشاً" "مفید پڑا" "ہمیں سمجھہ نہیں آتا" اس قسم کے بعض الفاظ اور جملے بھی ذوق سلیم کو ناگوار گزرتے ہیں - کتابت کی جا بجا غلطیاں رہ گئی ہیں اور ان کی درستی کے لیے اب بھی صحت نامہ چھاپ کر کتاب میں لگادیا جائے تو بہتر ہوگا - مگر ان سب اسقام کے باوصف غالب کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے واسطے شیخ محمد اکرام

صاحب کا 'غالب نامہ' بے شبہ نہایت مفید کتاب ہے جس سے شاعر کے ذاتی حالات نیز کلام کے بعض پہلو سمجھنے میں اور سب سے بڑھ کر اس کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنے میں گراں قیمت مدد ملے گی - حجم ۴۴۷ صفحات - قیمت مجلد تین روپے غیر مجلد اڑھائی روپے - مسلم گجرات پریس' سورت یا قومی کتب خانہ - ریلوے روڈ' لاہور سے طلب کی جائے —

(ھ)

نورس

(مصنفہ حامد اللہ صاحب افسر - بھارگو اسکول بک ڈپو امین آباد پارک - لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ) —

یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر ادبی مضامین ہیں - مصنف ہماری زبان کے مشہور شاعر اور مستعد نثر ہیں - سب سے پہلا مضمون لاعلمی پر ہے جو بہت پر لطف ہے - باقی مضامین میں ادبی اور تنقیدی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جو ان طلبہ اور اصحاب کے لیے جو ادب سے ذوق رکھتے ہیں بہت دلچسپ ہوں گے - مصنف نے اپنے خیالات بہت متین اور شگفتہ نثر میں ظاہر کیے ہیں - کتاب قابل مطالعہ ہے —

مرقع سخن جلد اول و جلد دوم

(مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور' صفحات تقریباً چار سو' فی جلد پانچ روپے) -

یہ دونوں کتابیں " سلسلہ ادبیات اردو " میں داخل ہیں - پہلی

جلد جشن سیمین اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تقریب میں شایع ہوئی —

اس جلد میں عہد آصفیہ کے شعرا کا ذکر اور ان کے کلام کا انتخاب ہے - اس عہد کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور پانچ پانچ شعرا کا تذکرہ ہے - یعنے کل پچیس شاعروں کا تذکرہ اور منتخب کلام آگیا ہے - اگرچہ ان شعرا پر لکھنے والے مختلف اصحاب ہیں لیکن تاہم یک رنگی پائی جاتی ہے - ہر شاعر کے حالات کے ساتھ اس کا منتخب کلام اور کلام پر تبصرہ ہے —

دوسری جلد میں بھی دور آصفیہ کے پچاس شعرا کا تذکرہ اور کلام ہے - اور اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلی کی ہے - تصویروں نے جو کثرت سے ہیں کتاب کا حسن بڑھا دیا ہے —

اردو شاعری کا فروغ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے سے شروع ہوا اور روز بروز ترقی پر ہے - اس وقت بھی حیدرآباد میں بہت سے خوشگو شاعر موجود ہیں - ان دونوں جلدوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے —

سیر گولکنڈہ

(مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور - قیمت ۱۵ آنے) -

یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے - اس میں تاریخ اور فسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے -

بڑی بڑی تاریخوں کے پڑھنے سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہے اور نہ وہ لطف اور کیفیت ہے جو اس میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے —

اس میں اس زمانے کے بعض بادشاہوں، شعرا اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے —

انتخاب تہذیب الاخلاق

(نول کشور پریس صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۰ آنے)

نول کشور پریس نے حال میں رسالہ تہذیب الاخلاق کا یہ انتخاب شایع کیا ہے۔ اس میں سر سید، مولوی ذکاءاللہ، سید کرامت علی، مولوی عنایت رسول، اور محمد عنایت اللہ کے قلم سے نو مختلف مضامین ہیں کتابت وطباعت ویسی ہی ہے جیسی درسی کتابوں کی ہوتی ہے یعنی غنیمت ہے —

یہ معلوم نہیں کہ کس جماعت یا مذاق کے طلبا کے لیے انتخاب کیا گیا ہے۔ اگر زیر نظر مضامین تہذیب الاخلاق کی انشا و طرز تحریر کی نمایندگی کی غرض سے لیے گئے ہیں تو یہ غرض اچھی طرح پوری نہیں ہوتی۔ "علوم طبیعہ کی تحقیقات جدید" "حرکت زمین کا معاینہ عینی" "ہربرٹ اسپنسر کی فلسفی" "...... کی نظم میں طوفان کا ذکر" یہ سب عوام کی دلچسپی کے مضامین نہیں ہیں۔ علاوہ بریں، جس مقصد کے تحت یہ مضامین لکھے گئے تھے وہ پورا ہو چکا ہے۔ اس لیے طلبا کے لیے تہذیب الاخلاق سے ایسے مضامین لینے چاہئیں جو سر سید، محسن الملک، ذکاءاللہ،

چراغ علی ' وغیرہ کے طرز تحریر کے اچھے نمونے ہوں اور جو عام موضوعات پر لکھے گئے ہوں - سر سید اور ان کے ادبی رفقا کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے دھندلکے میں مغربی علوم کی روشنی پھیلائی اور شخصی اور ذاتی قدروں کو پوجنے والوں کے سامنے ایک وسیع ذہنی محاذ پیش کیا - اسی نقطۂ نظر سے اُن کے مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے —

بہر حال اس کتاب سے کم از کم یہ تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ تہذیب الاخلاق میں علمی موضوعات پر بھی اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے تھے جو اس زمانہ کی معلومات کے مطابق کہلائے جاسکتے تھے —

(س)

نگارستان ادب حصہ اول و دوم

(مرتبہ حامد اللہ افسر صاحب قیمت ایک روپیہ اور ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ کتاب جناب حامد اللہ ' افسر ' بی - اے نے صوبۂ متحدہ کے ہائی اسکول کلاسوں کے لیے مرتب کی ہے - حصہ اول نثر کے لیے ہے ' اور حصہ دوم نظم کے لیے موضوعات ' اور ایک بڑی حد تک شعرا اور نثّاروں کا انتخاب بورڈ خود کرتا ہے' بیچارے مرتب کا صرف یہ کام ہے کہ مناسب مضامین اور نظمیں جمع کردے اور ضروری حواشی تحریر کردے - بہت سی کتابوں میں یہ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا - حامد اللہ افسر صاحب ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اس لیے ان سے یہ شکایت تو نہیں کی جاسکتی مگر ان کی کتاب میں وہی نقص ہے جو عام طور پر درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے یعنی حصہ نثر کے اکثر مضامین اور

حصہ نظم کے اکثر منظومات ' وہی ہیں جو دوسری تالیفوں میں پائے جاتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ ذراسی ترتیب بدل دینے سے ساری دنیا بدل جاتی ہے - کم از کم ہمارے مولفین و مصنفین تو ایسا ہی سمجھتے ہیں - آخر سر سید نے رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات کے علاوہ بھی تو کچھ لکھا تھا ' اور نذیر احمد مرزا ظاہر دار بیگ کے علاوہ دوسرے کردار پیش کرنے میں بھی کامیاب ہوے ہیں ' اسی طرح " موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ " ' " بزم قدرت " اور خان خاناں کی فیاضی ' کے علاوہ ان کے مصنفین کے یہاں دوسرے ایسے مضامین بھی مل سکتے ہیں جو نمونے اور مثال کے طور پر پیش کیے جاسکیں —

حصۂ نظم میں یہ بات کم ہے اور اس میں اچھی اچھی نظمیں غالباً پہلی دفعہ شامل کی گئی ہیں - شعرا اور نثاروں کے متعلق حواشی اور نوٹ بھی غور سے لکھے گئے ہیں اور ان سے مرتب کے مذاق سلیم کا ثبوت ملتا ہے - طلبا کی رہنمائی کے لیے یہ نوٹ کافی ہوں گے —

(س)

بیاض سخن -

(مولفہ عبدالشکور صاحب شیدا - قیمت دو روپے ملنے کا پتہ نائب محاسب عدالت العالیہ) —

یہ اردو کے شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے جو عبدالشکو صاحب شیدا نے حیدرآباد سے شایع کیا ہے - اس میں علاوہ ابتدا سے دور حاضر تک کے شیدا کے نمونۂ کلام کے ہم قافیہ وہم مضمون اشعار کا بھی نمونہ ملتا ہے - مزید دلچسپی کے لیے ہندی ابیات کا ایک سرسری انتخاب

بھی شامل کر دیا گیا ہے —

آج کل انتخابات کی ایک ہوا چل گئی ہے اور ایسی بہت سی کتابیں بازار میں ملنے لگی ہیں جو سو دو سو صفحوں کی محدود دنیا میں ساری اردو شاعری کا احاطہ کرنے کی دعویدار ہیں - تذکرے ' بیاضیں ' منتخب کلام ' سبھی کے نمونے ملتے ہیں - دراصل یہ سب غمازی کرتے ہیں ہمارے دور کے اُس عام رجحان کی جس کی وجہ سے آج کل کسی کو اپنے محبوب شاعر یا نثر نگار کے شاہکاروں کے مطالعہ کی بھی فرصت نہیں - اسی وجہ سے چند صفحوں میں موتی موتی باتیں بتا دینے کا فن آج کل بہت عام ہوگیا ہے اور اس کا مظاہرہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہو رہا ہے - یہ طرز مفید بھی ہے اور مضر بھی - بہر حال اس کتاب میں مختلف شعرا کے کلام کا نمونہ جو اکثر ایک دو شعر سے زیادہ نہیں' اور چند تمہیدی کلمات ' مل جائیں گے —

انتخاب عام طور پر اچھا ہے ' اس لیے کہ اُس میں کہیں شاہراہ عام سے گریز نہیں کیا گیا - مشہور مشہور اشعار دئے گئے ہیں کتابت و طباعت اچھی ہے —

(س)

" مینؤل خط شکستہ اردو " -

(برائے امتحان ہائی اسکول ممالک متحدہ آگرہ و اودھ)

محترم ہندو بھائیوں کے زبان و دہان اور دست و قلم نے جس طرح مشترکہ زبان اردو یا ہندوستانی کے بناو ' سنوار اور پرچار میں زیادہ حصہ لیا ہے اسی طرح ان کے مطبع " نول کشور " نے اس زبان کی بنیادی

ترقی و اشاعت میں ہندو مسلمان دونوں کا ہاتھ بتایا ہے جس سے کسی کو انکار نہیں اسی مطبع سے ایک مجلد تصنیف مندرجہ عنوان مطبوعہ سنہ ۱۹۳۶ ع صفحہ ۱۵۸ قیمتی ایک روپیہ ۲ آنے نہایت خوش خط و خوش نما بابو کیسری داس سیتھہ سپرنٹنڈنٹ کے زیر اہتمام شایع ہوئی ہے -

اس کتاب میں عربی فارسی کے فن کتابت پر قسم قسم کے خطاطی نمونے اور عجیب و غریب طغرے نہایت قرینہ اور سلیقہ سے جمع کیے گئے ہیں —

اس فن خاص کے نامی گرامی موجد اور ماہر و مشاق کی مفصل فہرست بھی درج ہے ہر ایک خطاطی کا نام معہ اصول و ضابطہ نہایت وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہے ' تعلیمی اصول کے تحت اردو شکستہ خط کی مناسب مشقیں بھی قائم کی گئی ہیں خطوط ' لین دین ' بیوپار اور سرکاری کارروائی کے طرح طرح کے ضروری اور کارآمد نمونے شکستہ خط اردو میں دیے گئے ہیں —

اس کے علاوہ یہ کتاب فن کتابت پر ایک اجمالی تاریخ ہے کتاب کا اصل موضوع کتب ' اردو ' خط شکستہ ہے جس کے مختلف اقسام خط ' سادہ ' خط ' دیوانی ' خط ' محرّت ' خط ' شفیعا آمیز ' وغیرہ بتلاتے ہوے تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کے قواعد و ضوابط بھی درج کردیے ہیں —

معقول دلائل و شواہد سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ اس فن (خط شکستہ) کی ایجاد و مہارت میں ہندو مسلمان دونوں برابری کے حصہ دار ہیں چنانچہ اس خصوص میں شاہ جہانی وزیر اعظم سعد اللہ خاں اور چندر بھان برہمن کو ہم عصر اور ہم سواد بتلایا گیا ہے بلکہ مشاہدہ کے وثوق پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خط شکستہ کی مہارت میں ہندوؤں

کو نسبتاً خاص امتیاز حاصل ہے اس میں بھی برہمنوں اور کایستھوں کا درجہ خاص الخاص ہے —

حسن اتفاق سے یہ ایجاد (خط شکستہ) جو ہندو مسلمان دونوں کی متعدد بنیادی جد و جہد اور عملی اشتراک کا انجام کار ہے دراصل یہ بنیادی اتحاد عہد اکبری کی ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے اسی کی توثیق میں آگے چل کر جو زبانی اتحاد ہوا ہے وہ شاہ جہانی یادگار ہے —

بلحاظ ترتیب "نوشت و خواند" ہندوستان میں مشترکہ زبان "ہندوستانی" سے پہلے مشترکہ کاروباری رسم خط 'ہندوستانی' تیار ہوگیا اس لیے اس مشترکہ خط اور زبان پر یا تو ہندو مسلم "ہندوستانی" یا فقط "ہندوستانی" کا اطلاق ہوگا نہ کہ علحدہ علحدہ ہندوپانی، مسلمان پانی کی طرح ہندو "ہندوستانی" اور مسلم ہندوستانی یا اردو "ہندوستانی" اور ہندی "ہندوستانی" کہا اور سمجھا جائے گا —

ہاں ہندو مسلم قوموں کے دماغی و مادی اشتراک نہ ہونے کی صورت میں خط یا زبان کا مفہوم کسی ایک پانی کی تعریف میں داخل ہوجائے گا -

جس ضرورت کے تحت خط شکستہ کی ایجاد ہوئی ہے ابتداً وہی ضرورت زود نویسی اس کی مختصر نویسی کی باعث ہوئی ہے لیکن جب اس نستعلیقی آرائش نے اس کی تیزی کو مدھم کردیا تو پھر ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ ہر دو خوبیاں 'خوشنویسی' اور 'زود نویسی' اس میں پائی جائیں تو نستعلیقی ضوابط کے ساتھ قلم کے قط کی طرح اس خط کو بھی شکستہ کردیا گیا، اس لیے اس کتاب میں یہ بجا طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ "ہر چند کہ خط شکست کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص خط شکستہ لکھ سکتا ہے مگر یہ رائے غلط ہے - جس وقت تک

کہ قواعد نستعلیق سے کامل واقفیت نہ ہو اس وقت تک شکستہ خط صحیح نہ ہوگا کیونکہ عہد اکبری میں خط نستعلیق اور تعلیق کو ملا کر شکستہ ایجاد کیا گیا ہے" —

دلیل مذکورۂ بالا کی تصدیق خود اس خط شکستہ کی 'نوشت و خواند' کے تجربہ سے بخوبی ہوسکتی ہے کہ جس میں پہلی شکل (نوشت) رواں ہے تو دوسری صورت (خواند) کی دواں ورنہ جو شکستہ خط کہ طبعی ہوتا ہے وہ تیز لکھا جاسکتا ہے مگر خوش نما ہوتا ہے نہ صحیح پڑھا جاتا ہے بلکہ موسیٰ لکھے خدا باچے کا مصداق ہوتا ہے —

اس کا صحیح تجربہ تو عدالتی اجلاسوں کی قلمی تجاویز کی نقل کے وقت ہوتا ہے کہ بیچارے نقل نویس خاصی عمر صرف کرنے پر بھی حرف شناس نہیں ہونے پاتے کیونکہ پہلے حاکم کے طبعی شکستہ خط کی حرف شناسی ابھی قابل اطمینان نہیں ہونے پاتی کہ دوسرا نیا حاکم آپہنچتا ہے - "ہر کہ آمد عمارت نو ساخت" کبھی یہ دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے کہ خود مجوز صاحب بھی اپنے طبعی خط کی حرف شناسی میں ناکام رہے کیونکہ ایسی شکستہ نویسی کسی ضابطہ کی پابند نہیں ہوتی۔

اس لیے مناسب ہوگا کہ مبتذل خط شکستہ اردو زیر تنقید کا امتحان جو ہائی اسکول کے لیے مخصوص ہے وہ ہائی کورٹ کے لیے بھی مشروط کردیا جائے کیونکہ دستور جدید کے تحت آئندہ ہندوستان کی تمام عدالتوں میں ناگری' اردو بھی دونوں رسم خط جاری رہیں گے —

کسی سیاسی مقصد یا اسی زود نویسی کے مد نظر مرہٹہ پیشوائی راج میں بھی بالبودھ کا شکستہ خط "موڑی" (شکستہ) کے نام سے جاری ہوا تھا جو فائز مرام نہ ہوسکا - کیونکہ اردو یا فارسی کی شکستہ نویسی

تو مختصر نویسی کے بعد وجود میں آئی ہے اس کا قلمی ذخیرہ نقش و نگار ہندو مسلم قوموں یا وسط ایشیا کے بچھڑے اور بکھرے ہوے تانڈوں کی متحدہ یکجائی اور اُن کی مشترکہ دستکاری کے مظاہرہ کی ایک ناقابل فراموش عہد اکبری کی یادگار ہے نہ کہ زبردستی کی الحہ اکبر —

اسی کی ایک ادھوری نہ نقل اور زبردستی کی رام رام بالمودھ یا دیونا گری کی موڑی (شکستہ) ہے جو ہندو پانی کی تعریف میں داخل ہو کر 'ہندوستانی' کے مقابل ہندو 'ہندوستانی' شکستہ خط متصور ہوسکتا ہے۔

قاعدہ

تعلیم بالغاں -

(مولفہ ایس - ایم شاہ ولی صاحب پہلی بی - اے آنرز

ہیڈ ماسٹر گکھر (پنجاب)

اس کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "جوانوں اور بوڑھوں کو صرف دو ماہ میں 'اردو پڑھنا سکھا دے" اسی لیے جس اصول پر یہ قاعدہ لکھا گیا ہے وہ اصول ہے 'پڑھو اور پڑھاو' (ص ۳) -

یہ قاعدہ طریقہ تعلیم ترکیبی پر نہیں لکھا گیا جو بچوں کے لیے مخصوص ہے بلکہ عمر اور سمجھ بوجھ کے لحاظ سے طریقہ تعلیم تحلیلی پر لکھا گیا ہے یعنی حرفوں سے الفاظ اور الفاظ سے عبارت تک پہنچنے کے بجاے عبارت سے الفاظ اور الفاظ سے حروف کی شناخت طریق الصوۃ میں کرادی گئی ہے پھر پڑھے ہوے الفاظ کے مختلف اجزا کی ترکیب سے یا جدید سابقہ یا لاحقہ کے ذریعہ مزید نئے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا

ہے اخیر پر تمام آموختہ الفاظ سے مشقی جملے بنائے گئے ہیں —

اس طریقہ تحلیلی کے مد نظر عام استعمالی الفاظ کو بنیاد (مفردات) قرار دیتے ہوے طریق الصوۃ کے ذریعہ تین کہانیوں میں چوبیس اسباق کا سلسلہ قایم کیا گیا ہے اس کے علاوہ (۱۳) صفحوں پر ضروری اور کار وباری روزمرہ کی تحریرات ہیں —

دیباچے سے ظاہر ہے کہ اس کی کامیابی میں جو کچھہ تجربہ ہوا ہے اس کی توسیع پنجاب کے مختلف دیہات میں ہونے والی ہے ' اگر اس تجربے میں کامیابی ہوجائے تو یہ قاعدہ ضرور اس قابل متصور ہوگا کہ اس کا رواج پنجاب کے باہر بھی ہو کیونکہ فی الحال اس سعی و عمل کی سخت ضرورت ہے —

یہ قاعدہ خوش خط ' جلی قلم - تقطیع مناسب - چھپائی صاف ستھری حجم (۵۶) صفحے - قیمت درج نہیں —

چند امور مولف صاحب کی نظر ثانی کے محتاج ہیں :

۱ - حرف کی آواز کے مستقل عنوان کے محاذی اسباق مقررہ کے تحت جن حروف کی شناخت طریق الصوۃ کے ذریعہ کرائی گئی ہے ان کی تعداد (۲۴) سے زیادہ نہیں حالانکہ ما بقی متعدد حروف کا استعمال قاعدہ کے اسباق میں ہوا ہے برخلاف اس کے جن اسباق کے تحت ' شین ' اور ' غین ' (ش ' غ) حروف کی شناخت کرائی گئی ہے وہ اسباق حروف مذکورہ کے استعمال سے بالکل خالی ہیں شناخت کے بعد بھی ان حروف کا باقی اسباق میں بالکل استعمال نہیں - (سین یا شین) کی دوسری آسان لمبی (ـــس) شکل کا بھی قاعدہ میں کہیں استعمال نہیں —

جس سبق کے تحت حرف 'ی' کی آواز کی شناخت میں الفاظ کی فہرست دی گئی ہے اس میں اور سبق متعلقہ میں بصورت لاحقہ صرف یای معروف کے الفاظ میں جیسے دادی' گالی وغیرہ باقی مختلف اشکال کا استعمال نظر انداز ہے اس کی ابتدائی اور درمیانی حرفیت کے مختلف اشکال کی نمایش بھی غیر ضروری سمجھی گئی قریب قریب یہی حال حرف 'واو' کی آواز کی شناخت کا ہے جس میں 'واو' کی حرفیت اور حرفانیت (اعرابیت) کے جداگانہ امتیاز میں کوئی استعمالی تصور نہیں دلایا گیا —

اسی طرح (ۃ) 'ہا' کی حرفیت اور حرفانیت اور اس کی لاحقہ صورت ہونے میں اس کے غیر معمولی تغیر پذیر استعمال کا تصور دلانے کے لیے کوئی تعلیمی سبق قایم کیا گیا ہے نہ کسی سبق میں یا اس کے تحت اس الفاظی فہرست میں جو شناخت آواز کی خاطر التزاماً قایم کی گئی ہے اس کا تصور دلایا گیا ہے حتیٰ کہ قاعدہ کے جملہ اسباق میں چھوٹے سے چھوٹا استعمالی لفظ 'کہہ' اور 'کہ' (امر واحد اور کاف بیانیہ) ... ... اور بمقابلہ ('وہ' اور 'وہ' 'یہ' اور 'یہ' کہیں پایا نہیں جاتا اس طرح اسی قاعدے کے عناصر (حروف مفردہ) کا اجتماع کہیں نظر نہیں آتا - یہی حال حروف ہندی و عربی ('ڑھ' - 'لھ' - 'مھ' - 'نھ' - 'ط' - 'ظ') اور الفاظ کیا ' کیوں - سوامی - خود وغیرہ کا ہے کہ کسی سبق یا اس کے تحت شناخت آواز کی الفاظی فہرست میں ان کا مطلق استعمال ہی نہیں ہوا —

۲ - اس قاعدے کا رسم خط کسی اصول کے تحت قایم نہیں :—

پیار، پیاس وغیرہ الفاظ میں پہلے حرف ساکن کو مکسور لکھا گیا ہے :—

" پیار، پیاس "

الفاظ مندرجۂ ذیل بلا لحاظ امتیاز تلفظ ایک ہی رسم خط میں لکھے گئے ہیں جو سب کے سب اسم ہیں :—

ماؤں، پاؤں، گاؤں، بہاؤ، تائی - ٹیکہ، چھچک ایک لفظ گیا ہے، ہونا کا ماضی = (ہُؤا) یہ علامتوں کے ہجوم میں خواہ مخواہ ہؤا بن گیا ہے - حالانکہ اسی کے ساتھہ اس کی جمع کا لفظ بھی موجود ہے جو اتنا گودڑ نہیں :- (ہوے)

صفحہ ۳۵ پر پان دان کے ساتھہ خاندان کو پان دان کی طرح 'خان دان' لکھا گیا ہے یہ اسی اصول کے تحت کہ "پڑھو اور پڑھاؤ" جس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ قاعدہ "نوشت و خواند" کے پہلے جزو کی تعلیم سے بالکل بری الذمہ ہے یا اس کی تعلیم اس کے مقصد سے خارج ہے لیکن بلحاظ تجربہ اور اصول تعلیم کے ایسی خواندگی اور اس کی تعلیم "نقش بر آب" متصور ہوتی ہے —

سخنوران ایران در عصر حاضر - جلد دوم۔

مولفہ جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب کلکتہ یونیورسٹی

چار پانچ سال پہلے جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب نے جو کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں اس سلسلہ کی پہلی جلد پیش فرماکر ملک کے فارسی دان طبقہ کو مرہون منت کیا تھا - وہ جلد نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی بہت مقبول ہوئی، اور فاضل مولف کو وزارت معارف ایران کی طرف سے " نشان علمی " عطا

ہوا۔ زیر تبصرہ جلد کی اشاعت میں کسی قدر تاخیر ضرور ہوئی ہے، جو یقیناً اُن ارباب ذوق کو شاق ہوئی ہوگی جو اس لاجواب سلسلۂ تالیفات کو جلد از جلد مکمل دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن اس تھوڑی سی تعویق نے اس جلد کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے، اس دوران میں 'ایران' نے "جشن ہزار سالہ فردوسی" ترتیب دیا تھا، اور حکومت ایران کی دعوت پر فاضل مولف نے بھی اس میں شرکت فرمائی تھی۔ اس با موقع سیاحت سے انہیں عصر حاضر کے ایرانی سخنوروں سے ملاقات کرنے، اور ان کے حالات اور ان کا کلام خود انہی سے حاصل کرنے کا جو موقع ملا، اس نے جلد زیر تبصرہ کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جلد اول ۳۳ شعراء کے حالات پر مشتمل تھی۔ جلد زیر تبصرہ میں ۱۵ شعرائے عصر حاضر کے حالات مع ان کے کلام کے نمونوں اور تصویروں کے، موجود ہیں، طباعت اور تہذیب کا معیار بھی پہلی جلد کے مقابلہ میں کچھہ بلند ہی ہے، اور مطبع جامعہ ملیۂ دہلی، اس پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔

جلد اول کی طرح، جلد زیر تبصرہ بھی انگریزی اور فارسی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ فارسی حصہ میں آقائی میرزا محمد علی خان، فروغی، ذکاء الملک سابق وزیر اعظم ایران کا "سر نامہ" اور خود جناب مولف کا "مقدمہ" ہے۔ انگریزی حصہ میں فاضل مولف کے مختصر دیباچہ کے علاوہ، سر تیج بہادر سپرو کا نوشتہ پیش لفظ ہے اور خود قابل مولف کا انگریزی مقدمہ بھی ہے جس میں متذکرہ شعرا کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں، اور آخر میں جدید ایرانی شاعری کے عام رجحانات پر مختصر مگر جامع انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کو انگریزی اور فارسی کے دو حصوں میں منقسم کرنے سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی

ہے - شعرا کے تذکرے فارسی میں ہیں ' اور ایسی پاکیزہ ' جدید فارسی میں کہ خود اہل زبان بھی اس کی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہوگئے ہیں - فارسی حصے کے آخر میں ان اشخاص ' مقامات ' قبائل اور ملل کی ' جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے ' مکمل ہجائی فہرستیں نہایت سلیقہ کے ساتھہ مرتب کر کے شریک کی گئی ہیں - ہندوستان صدیوں تک فارسی تہذیب اور فارسی شاعری کا خوشہ چیں رہا ہے - اس کی طرف سے یہ ارمغان عقیدت جو فاضل مولف نے ایران جدید کو پیش کیا ہے ایک حد تک ان احسانات کا بدلہ ہے —

جلد اول کی طرح اس جلد کی تالیف میں بھی فاضل مولف نے یہ اصول پیش نظر رکھا ہے کہ صرف شعرائے عصر حاضر کے مختصر حالات بیان کر دیے جائیں اور ان کے کلام کے چیدہ نمونے پیش کر دیے جائیں - کلام کی تنقید یا شعرا میں سے ایک کو دوسرے پر تفوق دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے - بقول ان کے : —

> " چوں در ایں کتاب از سخنوران عصر حاضر سخن رانده می شود ' سزاوارتر آں دید که در طرز تالیف آں روش اخیر را بر گزیند و مبحث انتقادی را به دیگراں و اگزارد
>
> ... ...
>
> مابدون اینکه ' اشعار ایں را به آں سنجیم ' و آں را بر ایں ترجیح نهیم ' بهتریں اشعار هر یک را بر گزیده درج کرده ایم " —

زیر تبصرہ جلد میں عصر حاضر کی ایرانی شاعری کے جو نمونے سامنے آتے ہیں ' وہ عام خصوصیات کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں

جیسے جلد اول میں پیش کیے گئے تھے' وہی قدامت اور جدت کی کشمکش' وہی خیالات کی بے چینی' وہی وطنیت' بقول حالی کہیں "پیالے وہی ہیں' لیکن شراب اور ہے" اور کہیں پیالے بھی بدلے جا رہے ہیں نئے اصناف سخن مثلاً تصنیف (Ballad) اور نئی طرز کے مستزاد لکھے جاتے ہیں اگرچہ پرانے اصناف سخن' غزل' قطعہ' رباعی' مثنوی' اب بھی اسی طرح رائج اور مقبول ہیں' لیکن موضوعات سخن بدلے ہوے ہیں' 'پردہ' 'تعدد ازدواج' 'مناظر قدرت' 'آزادی نسواں' 'اتحاد لباس' 'ورزش' 'انتخاب رفیق' 'ثروت طبیعی ایران' 'کشاورزی' 'حمام عمومی' — غرض کہ ایرانی معاشرت کے جملہ مسائل' ایرانی شعر میں بھی زیر بحث آتے ہیں۔ جو حضرات شاعری کو فن لطیف سمجھتے' اور اسے "محض بحیثیت فن لطیف" دیکھنا چاہتے ہیں وہ شاید ایرانی شاعری کی اس افادیت پسندی سے منغض ہوں' لیکن کیا کیا جاے' شاعری بہرحال احوال ملت کا آئینہ ہوتی ہے' اور جس کشمکش سے ملت ایرانی دو چار ہے' اس کا اثر ایرانی شاعری پر بھی پڑنا فطری اور ضروری ہے۔ ایرانی طبائع شعر و شاعری میں ڈوبے ہوے ہیں' اس لیے وہاں ابھی تک "پیشہ ور شعراء" کا طبقہ' مع "پیشہ کی پنچایت" اور "اصطلاحات پیشہ" پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہاں ہر قسم کے لوگ شعر کہتے ہیں' وزراے دولت' اعیان سلطنت' افسران فوج' علماء' ملوک التجار سب ہی صف شعراء میں موجود ہیں —

اکثر و بیشتر حکمت مغرب کے خوشہ چیں ہیں' کچھہ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے سیاسی عقائد کی پاداش میں قید بھی بھگتی ہے زیادہ تر نوجوان ہیں۔ ان سب کی تصویریں دیکھئے تو شبہہ ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی ایرانی

ہیں جن کا تخیل ہمارے ذہنوں میں صدیوں سے موجود ہے؟ دو شاعرہ خواتین کا حال بھی اس کتاب میں موجود ہے، ایک تو " خانم پروین اعتصامی" اور دوسری " فصل بہار خانم جنت " ان کا از سرتاپا انگریزی لباس جدید ایرانی تمدن کے انقلاب کا پتا دیتا ہے - جیسا کہ خود فاضل مولف نے اپنے انگریزی مقدمے میں بیان کیا ہے - جلد اول کی طباعت کے وقت ان میں سے ایک خاتون نے ہزار منت سماجت کے باوجود اپنی تصویر دینے سے انکار کردیا تھا، لیکن ایک سال بعد خود اپنی خوشی سے انھوں نے تصویر بھیج دی، اور اس کے شایع کرنے کی اجازت دی! غرض کہ ایک پوری ملت نیا جنم لے رہی ہے، اور بیداری اور آزادی کی نئی ہوا میں سانس لینے کے لیے بے چین ہے —

پروفیسر براؤن آنجہانی نے تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم میں ایک موقع پر شکایت کی تھی کہ قدماء کے کلام میں ایسے اشارے جن سے ان کے زمانے کے معاشری اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے ڈھونڈے بھی نہیں ملتے، آج کل اس بارے میں کسی کو کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی - عصر حاضر کی ایرانی شاعری احوال ملّی کا آئینہ ہے، اور پوری قوم اس آئینے میں اپنا عکس دیکھتی، اور بناؤ سنگھار کی کوشش کرتی ہے - دورۂ انقلاب کی شاعری جو ناصرالدین شاہ قاچار کے زمانے سے شروع ہوکر تمام مشروطہ تک نظر آتی ہے پھر بھی ایک حد تک وقتی اور عارضی تھی، اس پر سیاسیات کا عنصر بہت غالب تھا، اس لیے وہ جلد جلد کروٹیں بدلتی تھی، لیکن اب دورۂ استقلال ہے - سیاسی بنائیں استوار ہوچکی ہیں، معاشری مسائل حل طلب ہیں - " اس لیے ترانہ ملی" اب "جارحانہ" نہیں ہے - اب اس کی ستانی

" بزن ! بزن !! کی بجائے بساز ! بساز !! پر ٹوٹتی ہیں - بقول مرزا حسین خاں دانش اصفہانی :—

تو آمد انقلاب ابا جشن پہلوی ایمک دو عہد فرخ صوری و معنوی
بر ساز بزم عیش ' کہ نوروز و انقلاب بستند بر جہان کہن زیور نوی
من مژدہ ات ز زندگی جاوداں دہم داری اگر تو پاے دریں رہ کہ میروی

جدید ایرانی شاعری کا وہ حصہ جو تبلیغی اور معاشری ہے اب تک کسی قدر نیم پختہ ہے ' لیکن پختگی کی کوشش بھی نمایاں ہے - مثال کے طور پر "پردہ' کے مسئلہ کو لیجیے ' یہ مسئلہ ایران اور ہندوستان میں ایک حد تک مشترک تھا - ہندوستانی شعراء میں سے بعض نے ترک پردہ کی مذمت توکی ' لیکن کسی شاعر کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کی تائید میں زبان کھولے ' ایران میں مخالف اور موافق دونوں آراء کے نمائندے صف شعراء میں موجود ہیں - جلد زیر تبصرہ میں کم از کم دس شعراء ایسے ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے ' بعض مثلاً " پژمان " ایسے ہیں جو مغربی رو میں بہ گئے ہیں اور پردے کو بیخ و بن سے کھود ڈالنا چاہتے ہیں ' بعض مثلاً مرزا حسین خاں دانش اصفہانی ' پردہ شکنی کی یہ شدت گوارا نہیں کرتے اور اس طرح زبان طعنہ دراز کرتے ہیں :—

اُفتاد پردہ از حرم عصمت زنان امروز مرد و زن ہمہ باہم چریدہ اند
چوں شیر مادہ حملہ بہر رہگزر کنند وقتے اگر بخانہ چو موشاں خزیدہ اند

'دانش خراسانی ' کی پردہ شکنی کی تبلیغ کسب علم و فضل کی تلقین کے ساتھ ہے :—

حب وطن پیشہ کن و مردمی میہن خود دار گرامی ہمی
بہ کار بہ مرداں ہم دوش باش باہنر و فضل ہم آغوش باش

'شاہزادہ محمد ہاشم میرزا افسر' کی نظر اس بارے میں زیادہ حکیمانہ اور حقیقت شناس ہے —

گفتم بونے رخ نکشائی زچہ روے ؟ خوش نیست زسر بروں کن ایں عادت وخوے
گفتا پوشم زچشم بد ' روے نکوے

زن بود گر ایمن زنظر بازیء مرد نے پیچہ برخ داشت' نہ روبند' نہ کرد
گر چارہ تواں چارۂ آں باید کرد !

راقم سطور ہذا کی راے میں جدید ایرانی شاعری کا وہ حصہ جو مناظر قدرت سے متعلق ہے ادب میں ایک پائدار اور جمیل چیز ہے' اور اس وقت بھی باقی رہے گا جب معاشرت کے مختلف فیہ مسائل حل ہوجائیں گے' اور جس قسم کے اشعار اوپر نقل کیے گئے وہ محض تاریخی حیثیت کے ہوجائیں گے - طبع لطیف ایرانی منظر نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی ' جلد اول کے تبصرہ میں "رشید یا سمی" کے بعض اشعار نقل کیے گئے تھے - جلد زیر تبصرہ میں مرزا یحیی خان 'ریحان' میرزا صادق خاں 'سرمد' میرزا لطف علی خاں 'صورتگر' مرزا عبدالحسین خاں 'احمدی' بختیاری کے اشعار یورپی شعراء کی بہترین "نیچرل شاعری" سے کسی طرح کم نہیں ہیں - اُن کا موقلم ہر لحظہ بدلنے والے الوان فطرت کو اس چابکدستی کے ساتھ اشعار میں جذب کرلیتا ہے کہ وہ "گلہاے ہمیشہ بہار" بن جاتے ہیں ' اور 'ورڈزورتھ' کے "ڈیفوڈلس" کی طرح جب کبھی پردہ تخیل پر منعکس ہوتے ہیں

تو تخیل لہرا اُٹھتا ہے ، اور جھومنے والے پھولوں ، اور لچکنے والی ڈالیوں کے تال پر ناچتا ہے : احمدی " افکار یک شب تابستان " میں کہتا ہے :

پروردہ چنیں لطیف و رعنا　　این برگ قشنگ را طبیعت
بنہادہ دریں جمال زیبا　　این جلوہ و ناز را ودیعت
تا آنکہ بخویش گل بہ بالد
ویں بلبل بے نوا بنالد

اے برگ گل از کجا نہانی　　شد با تو نسیم صبح محرم
فاش است میان باغ ، دانی　　این بوسہ کہ دادۂ بہ شبنم!
انکار تو موجب فسوس است
کایں سرخی گونہ جاے بوس است

' سرمد ' کی نظم " آئینہ فلک ' کے دو بند ملاحظہ ہوں :

از نقش اختران　　این سقف لاجورد
سرخ و سفید وزرد　　چوں خیل دختران
هر یک بروے باز
ناز و کرشمہ ساز

پہناور فلک　　چوں بحر بیکران
قرص قمر یکک　　کشتی صفت دران
و آنرا کہ ناخداست؟
این قصہ با خداست -

سرورنگر کی نظم ' دریا ' کی ' روانی ' اور تشبیہات ملاحظہ ہوں :

آنچہ پوشتند دختران ظریف　　ہیچ بر تنش جز پرندے نہ

و آں دو نازندۂ ساعدین لطیف | ہمچشان ناز دست بندے نہ
نہ پزیرفتہ بار پیراہن | شانہ و سینہ بلوریںش
و آں دل افروز چہرۂ روشن | غازہ ہرگز ندادہ آذینش

کشتی دریا میں بہتی ہوئی چلی جارہی ہے ' یہاں تک کہ اب بالکل سکوت کا عالم ہے :

ہرچہ بیش از کنارہ دور اُفتند | وز بشر و آں ہم تگا پوشان
بیرما بیشتر فرو خفتند | جنبش و کوشش و ہیاہوشان

تا بدآں جاکہ آن خموشی را | نشکند جز نواے دل کش آب
موج رقاص پردہ پوشی را | بفگند بر فراز خاک حجاب

کشتی میں سواے شاعر اور اس کے 'دلبر' کے اور کوئی نہیں ہے لیکن عاشقانہ گرمجوشی اور والہانہ اختلاط کی اس منظر میں گنجائش نہیں ہے —

دوش بر دوش ہم نشستہ بر آب | گرم عشقے کہ خالی از ہوس است
دوستی جو' و شادمانی یاب' | فارغ از آنکہ در زمانہ کس است

گیسوان معنبرش از ناز | بار بنہادہ روے شانہ من
کردہ گاہے سوالہاے دراز | از دیار من و ز خانۂ من

کہ چگونہ است کشورے کہ در او | پرورش کردہ سعدی و خیام ؟
بر نبشتہ جہان کشور جو | نام وے را بہ دفتر ایام ؟

نصرت اللہ خان کاسمی 'نصرت' کی نظم ''یک ستارہ'' ملاحظہ ہو یہ 'ناصر خسرو' کے مشہور قصیدے ''اے گنبد گردندۂ بے روزن خضرا'' کے طرز پر ہے - شاعر فراز آسمان پر ایک ستارے کو دیکھتا ہے ' جو کبھی لرزتا ہے ' کبھی طلوع ہوتا ہے ' کبھی غروب ہوتا ہے اس سے سوال کرتا ہے -

آرام نگیری ز چہ در جائگہ خویش | گاہے بہ نشیب اندری و گاہ بہ بالا ؟
دل باختۂ کیستی اے دختر گردوں | کز غم نبود دلت یکے لحظہ شکیبا ؟
گر باختۂ دل بہ فلک بہر چہ ہر شب | بر روے زمین دوختۂ دیدہ جویا ؟
گر باختۂ دل بزمین خود زچہ نآی | از جائگہ خویش یکے بار بدیں جا ؟
یا آں کہ ترا گم شدہ دل دار و ندانی | دلدار ترا ہست کجا مسکن و ماوا ؟
یا دانی و خواہی کہ نداندش دگر کس | تا رہ نبرندش ' کنی ایں کار بعمدا ؟

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیے کہ آج کل کی ایرانی شاعری میں عشقیہ اور تصوفانہ غزل کی گنجائش نہیں ہے - غزل اب بھی ایرانی شعر کا جزو اعظم ہے ' لیکن اس کے خیال کے سانچے بدل گئے ہیں ' تصوف اب بھی ایرانی طبیعت پر غالب ہے لیکن اب اس میں اصطلاحی دقت پسندی کی جگہ سادگی آگئی ہے - 'عبرت' نائینی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں —

چوں نور کہ از مہر جدا ہست و جدا نیست | عالم ہمہ آیات خدا ہست و خدا نیست
ما پرتو حقیم و نہ اوئیم و ہم اوئیم | چوں نور کہ از مہر جدا ہست و جدا نیست
ہر جا نگری جلوہ گہ شاہد غیبی است | او را نتواں گفت کجا ہست و کجا نیست
در آئینہ بینید اگر صورت خود را | آں صورت آئینہ شما ہست و شما نیست
از جانب ما شکوہ و جور از قبل دوست | گر نیک ببینیم خطا ہست و خطا نیست

بے مہری و لطف از طرف یار بہ 'عبرت'
از چیست ندانم کہ روا ہست و روا نیست

جلد اول کے تبصرے میں راقم الحروف نے اس امر پر اظہار افسوس

کہا تھا کہ اکثر ایرانی شعرا کا کلام عرب اور عربی تمدن کی مخالفت میں ڈوبا ہوا ہے' اور ان چیزوں پر علانیہ تبرا بازی ہوتی رہتی ہے' خوشی کی بات ہے کہ اس جلد میں ہمیں کسی شاعر کے کلام میں یہ چیز نہیں ملتی' اور یہ غالباً نتیجہ ہے ان خوشگوار سیاسی تعلقات کا جو رضا شاہ پہلوی کے حسن تدبّر کی بدولت مختلف دول اسلامی کے مابین قائم ہوگئے ہیں - بعض شعرا کے کلام میں "رتشتیت" کی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے' خصوصاً 'پور داؤد' اور 'حسین دانش اصفہانی' کو اس بارے میں نہایت توغّل ہے' لیکن بحیثیت مجموعی اب یہ مذہبی تشکیک شعرائے عصر حاضر کے کلام میں نظر نہیں آتی - بلکہ بعض شعرا مثلاً 'دہقان' اور 'لاہوتی کرمانی' کے کلام میں تو جمال الدین افغانی مرحوم کی "پان اسلامزم" کی جھلک بھی نظر آتی ہے - علی ہذا فارسی زبان کو عربی الفاظ سے "پاک" کرنے کی کوشش جس کا بیڑا "پور داؤد" اٹھائے ہوئے ہیں اب اتنی "جارحانہ" نہیں ہے' زبان کی سلاست اور صفائی کی طرف بے شک توجہ ہے' لیکن نہ اس حد تک کہ صدیوں کے اچھے پچھے عربی الفاظ کو نکال باہر کرکے ان کی جگہ غیر معروف "پہلوی" الفاظ داخل کیے جائیں - اب زیادہ تر توجہ زبان کی سادگی اور عمومیت کی طرف ہے - ایک ادارہ موسوم بہ "فرہنگستان" سرکاری طور پر قائم ہے جو خالص ایرانی لغات کی تدوین کر رہا ہے' ان کوششوں پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا - 'ہادی حائری' نے ایک نظم "خزانیہ" لکھی ہے' اس میں آپ کو نہ عربی الفاظ کی بھر مار ملے گی اور نہ ژند و اوستا کے الفاظ کو خواہ مخواہ رائج کرنے کی کوئی کوشش نظر آئے گی' پوری نظم نہایت سلیس اور شگفتہ فارسی میں ہے' اور اصل

میں بھی سلاست اور شگفتگی آج کل ایران کی لسانی تحریکات کا مقصود ہے ' اور اس پر کسی کو مجال حرف گیری نہیں ہوسکتی —

باز شد پدید در جہاں خزان ' شد تہی ز برگ شاخ گلستاں
نو شگفتہ گل از میان باغ ' پشت پردہ رفت ' کرد رخ نہاں
گشتہ بے نگار سر بسر زمین ' خندہ را شدہ گریہ جانشین
رفت از میاں باد فرودیں ' چیرہ شد بران باد مہرگان
... ...
خواہی ار رسی ' در جہاں بکام ' کن بروں ز سر نام ننگ و نام
بادہ کہن ' نوش کن بجام ' یاد خاک جم ' کشور کیاں
لشکر خزان چونکہ رو نمود رفت نوبہار از میانہ زود
گفت بے درنگ ' ' ہادی ' ایں سرود ' بہر دوستان ' بردار مغان

جب تک خاص طور پر کوشش نہ کی جائے معلوم بھی نہیں ہوتا کے یہ اشعار عربی الفاظ سے خالی ہیں - کاش خالص " کھلی ہوئی " اردو میں بھی ایسی ہی نظمیں زیادہ نظر آئیں —

اخیر میں ہم جدید ایرانی ظرافت کا ایک نمونہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں ' دیکھئے ' قلزم ' نے " دلبر غرب کی " " تھلتی کرمیوں " اور " تجارتی " ناز و ادا اور بدلنے والے فیشن کی تعریف میں بحر فکر سے کیسی کیسی نئی تشبیہیں نکالی ہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی ظرافت ایرانی خمیر میں داخل ہے '

در غرب دیدم دلبرے از دلبر کنگو (*) بتر
در دل ربودن ماہرے ' از دزد شیکاگو (†) بتر

(*) کانگو (افریقہ) - (†) شکاگو (امریکہ) -

یک لحظہ گرم و آتشیں گیرا تر از کوہ وزو (*)
یک بار ہم سرد و خنک از دشت اسکیمو (†) بتر

گہ در تبسم بالبے نارکتر از شوخ حبش
گہ چیں نخوت بر جبیں از لعبت توکیو (‡) بتر

یک وقت با زلف عجب کوتاہ تر از ریش بز
یک روز باموے دراز از دم ہر یابو بتر

گفتم بفرما کیستی' دیوی' پری ای' چیستی؟
کز نسل انساں نیستی اے یار از لولو بتر

فرمود من آزادہ ام' شوخے تمدن زادہ ام
من شرقی اخمونیم از زنگی کج خو بتر

گفتم تمدن زادہ جان' قربانت اے آزادہ جان
نے شرق نے غرب ایں بہ آں' او از تو تو از او بتر

شرقے جہالت پرورد غربے رذالت گسترد
ویں ہر دو نکبت آورد از نکبت جادو بتر

ہم 'سخنوران ایران در عصر حاضر' کی اس وجہ سے اور زیادہ قدر کرتے ہیں کہ ہم اسے جدید ایرانی ادبیات کا اردو ادبیات کے نام ایک تازہ پیام سمجھتے ہیں - ہماری ساری کائنات شعر قدماء ایران کی "قند پارسی" کی "شکر شکن" ہے - ان کے استعاروں سے ہمارا رنگ تغزل مستعار ہے ' ان کی تشبیہات و طرز ادا سے ہماری غزلیں مالا مال ہیں' لیکن

(*) وسووی یس (کوہ آتش فشاں) - (†) قطب شمالی کا باشندہ -
(‡) ٹوکیو ' (جاپان کا دارالخلافہ) -

اب زمانہ بدل گیا ہے ' اور ہماری شاعری کی لے بھی پرانی ہوچکی ہے '
کیا تاریخ اپنا اعادہ نہ کرے گی ' اور کیا اردو شعرا ایک مرتبہ پھر
"ایران جدید" کے نغمہ سنجوں کا تتبع نہ کریں گے ' ضرورت ہے کہ ہم
بھی نوا پیرایان ایران کے ہمنوا ہوکر اپنے نغموں میں ویسی ہی تڑپ '
اور قیود و رسوم سے ویسی ہی بیزاری پیدا کریں - ہماری فکر رسا بھی
اپنی جولانی کے نئے میدان تلاش کرے ' اور انتخاب موضوعات ' اصناف سخن '
تشبیہات ' سادگی بیان غرض کہ ہر جہت میں ویسی ہی جرات
رندانہ پیدا کرے تاکہ ہماری شاعری بھی ہماری قومی خصوصیات کی
حامل ہو ' اور ہماری بیداری کا خود سبب بنے اور پھر خود ہی اس
کا نتیجہ ہو جائے —

ہم فاضل مولف کو اس کتاب کی تالیف و اشاعت پر صمیم قلب
سے مبارک باد دیتے ہیں - ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کا کوئی کتب خانہ '
اور کوئی خوش ذوق کا ذاتی ذخیرۂ کتب ' اس کتاب سے خالی نہ ہوگا —

کتاب کلکتہ میں عبدالحلیم صاحب نمبر ۱۵۷ چاندنی چوک اسٹریٹ
اور بمبئی میں ڈی - بی - تاریور والا ' کتاب محل ' ہارنبی روڈ سے مل
سکتی ہے ' قیمت درج نہیں ہے ' لیکن غالباً بائیس روپیہ ہے ' جو کتاب
کی اہمیت طباعت اور تصاویر کے مدنظر کچھ زیادہ نہیں ہے —

ہمیں اس سلسلہ کی تیسری جلد کا ' جو ایران جدید کے نثر نگاروں
کے حالات پر ہوگی بہت اشتیاق کے ساتھ انتظار رہے گا —

(وہاج الدین)

———

متفرقات

معاشیات کے ابتدائی اصول -

مصنفہ مسٹر پریم چند بی - اے (کھاتب)

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مسٹر پریم چند پروفیسر معاشیات وی - بی کالج ڈیرہ اسمعیل خاں نے اس کتاب میں معاشیات کے ابتدائی اصول بیان کئے ہیں - کتاب کی لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے لیکن افسوس ہے کہ مصنف نے موجودہ معاشی نظام زندگی کی جا و بیجا حمایت کر کے کتاب کا معیار بہت پست کر دیا - کتاب پڑھو تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کالج کا کوئی پروفیسر موجودہ معاشی نظام زندگی پر اپنی بے لاگ رائے ظاہر کر رہا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹاٹا شائر یا احمد آباد کے کارخانوں کا کوئی پبلسٹی آفیسر اپنے کارخانوں اور کارخانہ کے مالکوں کی ثنا خوانی میں مصروف ہے - کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے اس کتاب کی اصل غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ اردو زبان میں معاشیات پر کوئی عام فہم کتاب موجود نہیں "اسی خیال سے میں نے یہ کتاب لکھی ہے - اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں بتائی گئی - بلکہ جو اصول کہ معاشیین نے بیان کیے ہیں ان کو اپنی زبان میں سادہ پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے " - یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسٹر پریم چند کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہوئی ہے - انھوں نے معاشیین کے بتائے ہوئے اصول و اصل اپنی زبان میں اور بہت سادہ اور

عام فہم پیرایہ میں بیان کردیے ہیں - لیکن پوچھنے والا پوچھہ سکتا ہے کہ مصنف نے کن معاشیئین کے بتائے ہوئے اصول بیان کیے ہیں اور کیا ان کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ ان معاشیین کے اصول کی جانچ کرتے اور دیکھتے کہ آیا یہ اصول زندگی کے حقائق پر ٹھیک اترتے ہیں یا نہیں - ان دونوں سوالوں کے جواب میں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مسٹر پریم چند نے ارادی یا غیر ارادی طور پر ان فرائض سے پہلو تہی کی ہے -

علم معاشیات کا جو پہلو مسٹر پریم چند نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ پر مکمل سہی لیکن صرف ایک پہلو ہی ہے - اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں طلبا کو صرف یہی ایک پہلو بتایا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ یہی علم معاشیات کی جان ہے - ممکن ہے کہ ہمارے پروفیسر انگستان کے بعض معاشیین کی تقلید میں خود بھی یہی یقین رکھتے ہوں لیکن اصل حقیقت یہ نہیں ہے ایڈم سمتھ، مالتھس، ریکارڈو اور مارشل ہی وہ چار معاشیین ہیں جن سے کسب فیض کیا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے بعد دریائے ٹیمس کا پانی ساکت اور منجمد ہو گیا - اور بحر اطلانٹک میں جوار بھاٹے آنا بند ہوگئے - مسٹر پریم چند نے بھی انہیں معاشیین کے اصول بیان کیے ہیں اور اپنے دل کو تسکین دے لی ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے —

مسٹر پریم چند نے سب سے زیادہ پروفیسر مارشل سے اکتساب فیض کیا ہے - حتی کہ ابواب کی ترتیب میں بھی انہیں کے قدم کے نشان کی تقلید کی گئی ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ مارشل صاحب کی طرح مسٹر پریم چند نے بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف سے منہہ پھیر کر صرف ان لوگوں کی حمایت کی ہے جن کو موجودہ معاشی نظام سے نفع حاصل

ہوتا ہے - ۲۷۸ صفحوں کی پوری کتاب پڑھ جائیے لیکن آپ کو اس لوٹ کے خلاف ایک لفظ بھی نہ ملے گا جس پر موجودہ معاشی نظام کا ڈھانچہ قائم ہے - معاشیات کے اصول معاشی زندگی کی حقیقتوں سے مرتب کیے جاتے ہیں ۔ معاشی زندگی کی موجودہ حقیقتیں یہ ہیں کہ ساری دنیا میں تھوڑے لوگ دولت مند ہیں اور پچانوے فی صدی مفلس اور محتاج - یہی دولت مند ان مفلسوں کی محنت سے فایدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنی تجوریاں بھرتے ہیں - ساری دنیا میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے - بڑے بڑے سرمایہ دار چاء اور گیہوں کے جہاز خرید کر انہیں جلا دیتے ہیں تاکہ ان چیزوں کا نرخ بڑھے اور نفع کی شرح میں اضافہ ہو - لیکن مسٹر پریم چند کی کتاب میں ان تلخ حقیقتوں کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا —

موجودہ معاشی نظام سرمایہ دارانہ نظام کہلاتا ہے - اس نظام میں تمام دولت اس لیے پیدا کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے - چنانچہ اس معاشی نظام کے اصول بھی اسی نقطۂ نظر سے مرتب ہوتے ہیں - اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان اصولوں کو ناقابل تغیر ثابت کیا جائے - مسٹر پریم چند نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے - اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دولت پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کے جو طریقے اس وقت رائج ہیں وہ بالکل قدرتی اور جائز ہیں لیکن اگر مسٹر پریم چند نے ان اصولوں پر نقادانہ نظر ڈالی ہوتی تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ نہ تو تاریخ ان کی حمایت کرتی ہے اور نہ زندگی کے واقعات ' دولت کی غلط تقسیم سے دنیا میں اس وقت جو تباہیاں آ رہی ہیں اس سے ہر شخص واقف ہے اور جس نے سماجی ارتقا کا تھوڑا بہت

مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام (سرمایہ داری) کی عمر صرف ڈیڑھ سو سال ہے اور وہ زوال پذیر ہے - دنیا کے ۱/۶ حصہ میں جس کی آبادی سولہ کروڑ ہے اس معاشی نظام زندگی کو مسترد کر دیا گیا ہے اور اس وقت دنیا کا کوئی ایسا ملک موجود نہیں جہاں ایک زبردست اقلیت اس معاشی نظام زندگی کو تباہ کرنے کے درپے نہ ہو - ایسی حالت میں ان حقائق سے بے پروا ہو کر موجودہ معاشی نظام کو قدرتی نظام کا رنگ دینا کسی معاشیات کے پروفیسر کے شایان شان نہیں —

اُصولی طور پر یہ بتا دینے کے بعد کہ یہ کتاب موجودہ معاشی نظام زندگی اور اس کے اصولوں کی حمایت میں لکھی گئی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کتاب کے بعض ابواب پر بھی ایک نظر ڈال لیں - اس کتاب میں کل چھہ باب ہیں - پہلا باب "تمہید کے طور پر" لکھایا گیا ہے - اس باب میں بتایا گیا ہے کہ معاشیات کے اصل محرک کیا ہیں - معاشیات سائنس ہے یا آرٹ، دولت کسے کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ —

دولت کے ضمن میں بعض نہایت گمراہ کن باتیں بتائی گئی ہیں - "جب دولت کا لفظ 'عام' زبان میں استعمال کیا جاتا ہے تو لوگ اس سے مراد عالیشان مکانات، ہیرے جواہرات، بہت سا روپیہ، موٹر کاریں، اور گھوڑے گاڑیاں وغیرہ سمجھتے ہیں - گویا لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ دولت امیر آدمیوں کے پاس ہی ہوتی ہے - لیکن معاشیات میں دولت سے مراد صرف یہی چیزیں نہیں ہیں بلکہ "ہر وہ چیز دولت ہے جس کا تبادلہ کسی اور چیز سے ممکن ہو --- دولت صرف امیر آدمیوں کے پاس ہی نہیں بلکہ غریبوں کے پاس بھی ہوتی ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ

امیر کے پاس دولت زیادہ ہوتی ہے اور غریب کے پاس کم'' ۔ (صفحہ ۱۹) ۔ ہنری فورڈ ، راکفلر اور روشچائلڈ نے بھی اپنے مفلس اور فاقہ کش مزدوروں کو قناعت پسندی کی اتنی پُر فریب تلقین نہ کی ہوگی خود مارشل صاحب بھی جو سرمایہ دارانہ معاشیات کے علم بردار ہیں اتنی کھلم کھلا غلط بیانی سے کام نہیں لیتے ۔ دولت کی تعریف اب تک یہی کی جاتی تھی کہ دولت وہ شے ہے جس سے انسان کی خواہشیں اور ضرورتیں پوری ہوتی ہوں ۔ لیکن مسٹر پریم چند نے دولت کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ اُس کا تبادلہ بھی ہوسکے ۔ یعنی اُس معاشی دور میں جس میں کہ تبادلہ کا طریقہ رائج نہ تھا کوئی دولت مند نہ ہوتا تھا ۔ اگر مسٹر پریم چند کو یہ معلوم ہوتا کہ انسان نے رسم تبادلہ کے رائج ہونے سے قبل ہی دولت پیدا کرنی شروع کردی تھی تو شاید وہ دولت کی اتنی مضحکہ خیز تعریف نہ کرتے رہ گیا یہ سوال کہ "غریب" بھی "امیر" ہے یا نہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے آج تک کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہے ۔ ممکن ہے سرحد میں یہ محاورہ رائج ہو — ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ غریبوں کی دولت اُن کی محنت کرنے کی قوت ہوتی ہے جسے وہ کسی سرمایہ دار کے کارخانے میں پیٹ بھر روٹی کے بدلہ صرف کرتے ہیں ۔ اسی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ دولت مندوں کے پاس " عالیشان مکانات ، ہیرے جواہرات ، بہت سا روپیہ ، موٹر کاریں" ہوجاتی ہیں اور اس "دولت مند" مزدور کو جس نے محنت کی دوسرے دن کے لیے روٹی کا سہارا بھی نہیں ہوتا ۔

دوسرے باب کا عنوان صرفِ دولت ہے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ معاشی نظام کو سراہنے والے معاشیین دولت کی پیدائش سے قبل ہی صرفِ دولت پر غور کرنے لگتے ہیں ۔ اس کا راز یہ ہے کہ دولت کو صرف کرنے

لے وہ لوگ نہیں ہوتے جو دولت پیدا کرتے ہیں - دولت مزدور اور
مان پیدا کرتے ہیں اور صرف سرمایہ دار اور ان کے ہوا خواہ کرتے
ں - یہی وجہ ہے کہ وہ پیدائش دولت سے زیادہ صرف دولت کو اہمیت
یتے ہیں - تیسرا باب پیدائش دولت سے متعلق ہے - اس باب کی تیسری
ل میں مصنف نے عاملان پیدائش سے بحث کی ہے - اور بتایا ہے کہ
ملان پیدائش کل چار ہیں - زمین، محنت، سرمایہ اور اہتمام، -
ین سے مستفید ہونے والے زمیندار کہلاتے ہیں - سرمایہ سے مستفید ہونے
لے سرمایہ دار، محنت سے مستفید ہونے والے مزدور اور اہتمام سے
ستفید ہونے والے متوسط طبقہ کے لوگ - مصنف نے یہ ثابت کرنے کی
شش کی ہے کہ یہ تقسیم نہایت معقول ہے اور ان تمام عاملان پیدائش
ان کا پورا حق مل جاتا ہے - کاش ہمارا معاشی نظام اتنا ہی منصف مزاج
وتا جتنا کہ مسٹر پریم چند ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں تفصیلی
حث کی ضرورت نہیں البتہ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ زمیندار
ی حمایت میں نہ کوئی اخلاقی اور مذہبی دلیل دی جاسکتی ہے
ر نہ معاشی اور سیاسی - اُس کی حمایت صرف ایک نامعقول قانون
، ہوتی ہے اور وہ قانون وراثت کا قانون ہے - زمیندار اس وجہ سے
عاوضہ کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس نے محنت کی ہے بلکہ اس وجہ سے
، وہ ایک حادثہ کے بنا پر اپنے باپ کے گھر پیدا ہوگیا ہے - صفحہ ۱۰۷ پر
صنف نے سرمایہ کی ایک عجیب و غریب تعریف کی ہے - فرماتے ہیں
سرمایہ ہم ان چیزوں کو کہتے ہیں جو براہ راست ضروریات کو پورا
رنے کے لیے طلب نہ کی جائیں بلکہ جن کی مدد سے مزید دولت پیدا
ی جائے" اس تعریف کی رو سے تو لکڑہارہ کی کلہاڑی اور چوپار کا

جال بھی سرمایہ ہو جاتے ہیں - کاش لکڑھارہ اور چرمار کو معلوم ہو جائے کہ وہ بھی سرمایہ دار ہے - سر فیروز سٹھنا اور سر کاوس جی جہانگیر کے قبیلہ کا !—

جو کچھہ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مصنف کے سیاسی اور معاشی عقاید صاف معلوم ہوجاتے ہیں - اور ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف نے غیر جانب دارانہ غور و فکر سے مطلق کام نہیں لیا ہے بلکہ تجارتی اور کاروباری مقاصد کو پیش نظر رکھہ کر یہ کتاب لکھی ہے - کسی پروفیسر معاشیات کا اس نقطۂ نظر سے کوئی کتاب لکھنا افسوس ناک بھی ہے اور نقصان دہ بھی - اس قسم کی تصنیفات سے علمی تصنیف و تالیف کا معیار پست ہو جاتا ہے اور اگر یہ تصنیفات کالجوں کے نصاب میں داخل ہوگئیں تو طلباء کے سیاسی اور معاشی عقاید کا حشر معلوم - غرض یہ کتاب اپنی تمام ظاہری خوبیوں کے باوجود معنوی اعتبار سے ایسی نہیں جس پر اُردو زبان کی ترقی چاہنے والے خوش ہو کر مصنف کو مبارک باد دیں- کہیں کہیں زبان کی بھی غلطیاں موجود ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰ ' ۱۳۱) لیکن انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے - کتاب کے آخر میں بارہ صفحوں کی ایک فرہنگ اصطلاحات بھی دی گئی ہے جو بہت جامع اور مفید ہے -

کتاب میں آتھہ تصویریں بھی ہیں جو سب کی سب ہندوستان کی معاشی زندگی سے متعلق ہیں - کتاب مجلد ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی کلکتہ اور مدراس سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں —

(س - ح

اسلامی طب -

(مرتبۂ ابن مظہر قاضی معین الدین رہبر فاروقی صاحب
صفحات ۲۰۹ - ملنے کا پتہ سن برج ہاوس، عابد بلڈنگ
حیدرآباد دکن)

عرب اور اسلامی ممالک، ہند اور دکن کے مسلمان سلاطین و اطبا کے علمی و فنی کارناموں کا یہ مختصر تذکرہ، جناب معین الدین صاحب 'رہبر' فاروقی نے حیدرآباد سے شایع کیا ہے - طب کی ابتدا و ارتقا کی تاریخ صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کی گئی ہے - رہبر صاحب نے اس کتاب کی تیاری میں کافی محنت کی ہے اور جو اشاریہ انہوں نے ابتدا میں درج کیا ہے اور جسے وہ اپنے موضوع کا "نچوڑ" کہتے ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے —

محرک وہی جذبہ ہے جو علامہ شبلی کا تھا - یعنی "طب اسلامی" کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر حاملین فن کے سامنے ان کے بزرگوں کے کارنامے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے - اسی لیے کہیں کہیں اس میں سبق آموزی سے رنگ پیدا ہوگیا ہے لطایف و ظرایف سے کتاب کو دلچسپ بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے - دکن میں طب کی داستان کافی تفصیل سے بیان کی گئی ہے —

(س)

اُردو کے جدید رسالے

ھندوستانی -

(اڈیٹر رشید کمالی صاحب ایم - اے - چندہ سالانہ تین روپے مراد آباد) -

مراد آباد کا ماہوار رسالہ ہے - سر محمد یعقوب کی سرپرستی میں شایع ہوا ہے - ۴۸ صفحے میں ۲۵ مضمون ہیں - جن میں ۸ نظمیں اور غزلیں ہیں دو افسانے، دو تمہیدیں - باقی مضامین سوائے دو ایک کے اس رنگ میں ہیں جسے آج کل ادب لطیف کہتے ہیں - یہ پہلا پرچہ ہے، امید ہے کہ آیندہ یہ اور ترقی کرے گا —

نور -

(اسداللہ خاں صاحب ناظم مدیر - سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ ماہانہ جالندھر سے شایع ہوا ہے - عنوان پر لکھا ہے "علمی، ادبی، اخلاقی، اجتماعی، تفریحی، صنعتی، تجارتی" - لیکن "مذہبی" رہ گیا ہے کیونکہ شروع ہی مذہبی مضمون سے ہوتا ہے اور اس کے بعد بھی کئی خالص مذہبی مضمون ہیں - غرض کہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں - کیا اچھا ہوتا کہ اگر قابل اڈیٹر کسی خاص شعبے کو اپنا موضوع قرار دیتے - ہمارے رسالوں کے لیے یہ امر قابل غور ہے —

مشیرالعلاج -

(اڈیٹر - حکیم و ڈاکٹر سید محمد اکبر علی صادق - ڈنگہ ضلع گجرات)

ماہانہ طبی رسالہ ہے - گجرات پنجاب کے ایک قصبے سے شایع ہوا

ہے۔ اس لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اردو متعدد طبی رسالے شایع ہوتے ہیں اور بعض ان میں سے درحقیقت بہت خوبی کے ساتھہ مرتب کیے جاتے ہیں اور کارآمد مضامین اور سہل مجرب نسخے درج ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ اس پایہ کا نہیں تاہم اس میں بہت سی مفید باتیں پای جاتی ہیں۔

بہارستان —

(اڈیٹر اختر وارثی صاحب۔ سالانہ چندہ چار روپے چار آنہ۔ جالندھر)

اچھا رسالہ ہے۔ زیادہ تر فسانے ہیں، لیکن بعض ادبی مضامین بھی مطالعہ کے قابل ہیں۔ نظمیں بھی پڑھنے کے لایق ہیں۔ قابل اڈیٹر نے قابل انشا پرداز اور شاعر بھی ڈھونڈھ نکالے ہیں —

صنعت و حرفت —

(اڈیٹر پروفیسر جسونت سنگھ۔ سالانہ چندہ دو روپے لاہور)

یہ رسالہ ایک بورڈ کے مشورے سے مرتب ہوتا ہے اور اس بورڈ میں کئی قابل اصحاب شریک ہیں۔ ایسے رسالوں کی ہمارے ملک کو بہت ضرورت ہے۔ مختلف پیشوں اور صنعتوں کے متعلق مفید مضامین شایع کیے گئے ہیں جن کے پڑھنے سے معلومات میں ضرور اضافہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ اس رسالے کی سرپرستی کی جاے گی اور خاص کر مدارس میں خریدا جاے گا —

خاص نمبر

ساقی کا فسانہ نمبر —

۲۹۷ صفحے پر ہے۔ اس میں بعض بڑے اچھے فسانے شایع ہوئے ہیں۔

ساقی بلا شبہ ترقی کر رہا ہے اور اس کی ادبی خدمت قابل ستایش ہے۔ دلی سے اب تک کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا تھا۔ بڑے سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے اور لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس کا یہ نمبر پڑھنے کے قابل ہے —

شاعر کا سالنامہ —

پورے سوا پانسو صفحہ کا ہے۔ اس سالنامے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ہے۔ جو حجم اور گوناگوں مضامین کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس میں ۱۱۲ شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام کا انتخاب اور ایک سو پانچ شاعروں کی تصویریں ہیں۔ اس کی تیاری میں بلاشبہ غیر معمولی محنت کے علاوہ بہت کچھ صرف کرنا پڑا ہوگا۔ علاوہ ان تذکروں کے ۳۷ مضامین مختلف موضوعوں پر ہیں جن میں غزلیں اور افسانے وغیرہ بھی ہیں۔ ہم اس کے قابل اڈیٹر کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں —

سالنامۂ کابل —

حسب معمول بہت ضخیم اور پر از معلومات ہے۔ اب کے تو مجلد شایع کیا گیا ہے۔ اس میں ساٹھ ستر مضامین اور سیکڑوں تصاویر ہیں۔ آرٹ پیپر پر بہت اچھے ٹائپ میں چھپا ہے۔ 'کابل' بڑی خوبیوں کا رسالہ ہے اور اس کے سالنامہ میں افغانستان کے حالات اور معاملات پر مستقل مضامین ہوتے ہیں —

اعتذار

اردو کے اپریل نمبر میں گارساں دتاسی کا جو خطبہ شائع ہوا ہے، اس کے مترجم جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نہیں بلکہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ ہیں چونکہ مضمون پر مترجم صاحب کا نام درج نہ تھا اس لیے پروف ریڈر کو جناب ایڈیٹر صاحب کے اُس نوٹ سے جو اُس مضمون کے شروع میں درج ہے، خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس کے مترجم خود جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ہیں اور انھوں نے دریافت کیے بغیر مترجم کی جگہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا نام لکھ دیا اور اس طرح یہ غلطی ہوگئی، جس زمانے میں یہ مضمون شائع ہوا میں بمبئی میں مقیم تھا بہر حال اس افسوسناک غلطی کا مجھے بہت افسوس ہے، تمام ناظرین سے استدعا ہے کہ وہ اس کی تصحیح فرمالیں، اسی طرح اپریل نمبر میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ سکریٹری انجمن ترقی اردو کا جو خطبۂ صدارت شائع ہوا ہے اُس میں بھی پروف ریڈر صاحب کی کوتاہی سے جابجا اوقاف (Punctuations) کی غلطیاں رہ گئی ہیں، میں ان غلطیوں کے لیے ہر دو اصحاب سے معذرت خواہ ہوں اب ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ آئندہ اس قسم کی غلطیوں کا انشاءاللہ کوئی امکان باقی نہ رہے گا مضمون نگار حضرات کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ وہ از راہ کرم مضمون خوش خط اور کاغذ کے صرف ایک طرف تحریر فرمایا کریں تاکہ کمپوز کرنے اور پروف ریڈنگ میں دقت واقع نہ ہو فقط —

مظفر حسین شمیم
منیجر انجمن ترقی اردو (ہند)
اورنگ آباد دکن

بیادگار سید عظیم

عالی مرتبت نواب سر سید مسعود جنگ بہادر رحمۃ اللہ علیہ

اردو لائبریری دارالاقبال بھوپال

سے

ماہنامۂ مسعود

اپنی صوری و معنوی ضوفشانیوں اور تابانیوں کے ساتھہ ملک کی سنجیدہ اور منظم جماعت کے زیر اہتمام عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ ریز ہوگا۔ ماہنامہ "مسعود" ایک عالی مرتبت محسن ادب کی یادگار ہونے کے باعث اپنے معیار کی رفعت و بلندی میں بھی دوسروں کے لیے قابل رشک ہوگا۔

ایجنٹ حضرات جلد خط و کتابت کریں نیز مشتہرین حضرات بھی ابھی سے اپنے لیے جگہ رزرو کرالیں جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیے —

سید احترام سیکریٹری اردو لائبریری - بھوپال

ہندوستانی موسیقی

ہندوستانی موسیقی پر نایاب کتب اور مخطوطات مطلوب ہیں۔ کتب و مخطوطات کے نام کے ساتھہ ان کی قیمت بھی لکھی جائے۔

خط و کتابت کا پتہ :- رمیش چندر ایم ساناوتی " ساگر ولاس " نمبر ۱۰' اے سانڈھرسٹ برج بمبئی نمبر ۷ —

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ انگریزی (سات روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں چار روپے آٹھ آنے سکۂ انگریزی (پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

VOL. 17 JULY 1937 No. 67

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq B. A. (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad (Deccan).

اُردو

"مسعود نمبر"

بیادگار

نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود مرحوم

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقیٔ اردو نادر منزل - سیف آباد - حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کو لکھنا چاہیے -

المشتہر : انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

نرخ نامۂ اجرت اشتہارات اردو و سائنس

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
پورا کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۸ روپے سکۂ انگریزی	۳۰ روپے سکۂ انگریزی
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ روپے سکۂ انگریزی	۱۵ روپے سکۂ انگریزی
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۴ آنے سکۂ انگریزی	۸ روپے سکۂ انگریزی

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے اُن کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اُن کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد - منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اُس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے -

المشتہر منیجر انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن

انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوا

اردو

مسعود نمبر

جلد ١٧	اکتوبر سنہ ١٩٣٧ ع	حصۂ ٦٨

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ ع



نواب مسعود جنگ بہادر سر سید راس مسعود مرحوم
صدر انجمن ترقیء اردو (ہند)

مسعود مرحوم

از

(جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ)

(۱)

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسمان کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود !
خیال جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیل بے مقصود
رہی نہ آہ ! زمانے کے ہاتھہ سے باقی
وہ یادگار کمالات 'احمد' و 'محمود'
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اُس کی
وہ قافلے کا متاع گراں بہا مسعود !
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بے دردی
فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود !
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

" دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است "

(سعدی)

(۲)

نہ مجھہ سے پوچھہ کہ عمر گریز پا کیا ہے
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے !
ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبت صغریٰ ہے یا فنا ؟ کیا ہے ؟

تہار راہ کو بخشا گیا ہے ذوق جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے!

دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز؟
نہیں تو حضرت انساں کی انتہا کیا ہے؟

جہاں کی روح و رواں لاالہ الاّھو
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟

قصاص خون تمنا کا مانگیے کس سے
گناہ گار ہے کون؟ اور خوں بہا کیا ہے؟

غمیں مشو کہ بہ بند جہاں گرفتاریم طلسمہا شکند آں دلے کہ ما داریم!

(۳)

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات!

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکراں تیرا
ترے فراق میں مضطر ہے موج نیل و فرات!

خودی ہے مردہ تو مانند کاہ پیش نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات!

نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلی تلافیٔ مافات!

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تابہ ثریا تمام لات و منات!

حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہ صفات!

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند!

سر سید راس مسعود

از

(جناب مولوی سید عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا' ایم - ایل - اے

سابق وزیر تعلیم بہار واڑیسہ)

دنیا میں آئے دن طرح طرح کے جاں کاہ واقعات اور حادثات پیش آتے رہتے ہیں احباب اورعزیزوں کی موت سے بھی متعلقین کو صدمۂ عظیم پہنچتا ہے لیکن پیارے سر سید راس مسعود مرحوم کی ناگہانی اور بے وقت موت نے جو جاں گسل چرکا ان کی ضعیف والدہ' ان کے متعلقین اور احباب کو لگایا ہے وہ ناقابل بیان ہے —

سر سید راس مسعود میرے قدیم اور مخصوص دوستوں میں تھے پہلے پہلے میری ملاقات ان سے لندن میں سنہ ۱۹۱۰ ع میں ہوئی - اور بلا کسی ظاہری خاص وجہ کے ہم لوگوں میں ربط و محبت اس درجہ بڑھی کہ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنی پریکٹس کے لیے انہوں نے بہار کی سرزمین کو پسند کیا —

یہ صحیح ہے کہ ولایت کے دوران قیام میں میں نے ان کو یہ صلاح ضرور دی تھی کہ اگر وہ پٹنہ میں وکالت شروع کریں تو یہاں کامیابی اور ترقی کے مواقع زیادہ ہیں —

انگلستان میں خصوصاً لندن اور آکسفورڈ میں وہ بحیثیت طالب علم

بھی نہایت ممتاز تھے وہ کثیرالملاقات نہ تھے مگر ان کی وقعت ملاقاتی اور غیر ملاقاتی سبھوں کے دل میں یکساں تھی - سر سید مرحوم کے پوتے جسٹس سید محمود مرحوم کے بیٹے ہونے کے علاوہ اپنی ذاتی وجاہت اور فطری صلاحیت وصفت کی وجہ سے وہ ہر حلقہ میں ممدوح تھے - ایک مرتبہ دارالعوام کے ایک رکن نے راس مسعود کو چائے پر مدعو کیا ' مسعود نے مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھہ لے لیا اور میرے انکار پر مجھے اس کا یقین دلایا کہ ان کے میزبان نے اپنے ساتھہ ایک اور دوست کو بھی لانے کے لیے انہیں مجاز کیا ہے چنانچہ ہم لوگ ہاؤس آف کامنز کے اس صحن میں جو لب دریا واقع ہے اپنے میزبان کے ساتھہ چائے پی رہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے دوسرے ارکان جو اس صحن میں اپنی اپنی جگہ چائے نوش کر رہے تھے راس مسعود کی طرف بار بار دیکھتے ہیں - کچھہ دیر کے بعد جب بعضوں کو معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو ان سے ملنے کی لوگوں کو خواہش ہوئی - راس مسعود کے قد اور ان کی وجیہ صورت کے اندر کچھہ ایسی جاذبیت اور کشش تھی کہ رفتہ رفتہ بہت سے لوگ ان کے گرد آکر جمع ہوگئے جن میں کچھہ لوگوں سے تو ان کا تعارف ہوا - اور بعضوں نے بغیر تعارف ان سے گفتگو شروع کی اور ان کی ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا —

راس مسعود مرحوم غالباً سنہ ۱۹۱۲ ع کے آخر میں پریکٹس کی غرض سے پٹنہ آئے اور میں جنوری سنہ ۱۹۱۳ میں ولایت سے وطن واپس ہوا - پٹنہ میں جب تک راس مسعود بحیثیت بیرسٹر اور پھر بحیثیت ہڈ ماسٹر پٹنہ کالیجئٹ اسکول مقیم رہے اپنی فرصت کا زیادہ حصہ میرے ساتھہ صرف کرتے تھے - شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو کہ چلد گھنٹے کے لیے

بھی وہ میرے مکان پر مجھ سے اور دوسرے احباب سے ملنے اور ادبی وقومی مسائل میں حصہ لینے کے لیے نہ آتے ہوں - اگر وہ نہ آئے تو کبھی کبھی میں خود ان کے ہاں چلا جاتا تھا - جب انہوں نے بہار کے صیغۂ تعلیم میں ملازمت کی ' تو مدرسین اور طلباء سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار اور دوستانہ رہے - اس کے علاوہ جب تک وہ بہار میں رہے ہر جماعت اور حلقہ میں بلا تفریق ممدوح و مقبول رہے —

ان میں غیرت ' مروت ' شجاعت ' خودداری اور محبت کا جذبہ بدرجۂ اتم تھا خاص دوستوں کے ساتھ اپنے اخلاص اور محبت کا اظہار اکثر وہ اس طرح کیا کرتے تھے کہ جب کسی ایسے دوست سے کچھ دنوں کے بعد ملاقات ہوتی تو اسے گلے لگاکر اس کی پیشانی کو چومتے - ملاقاتی یا غیر ملاقاتی کے ساتھ ان کا اخلاق نہایت پاکیزہ تھا - انگریزوں میں بعض ان کے بڑے گہرے دوست تھے اور دو ایک سے اپنی خودداری اور عزت نفس کی خاطر ان کی لڑائی بھی ہوئی تھی جس میں ہمیشہ یہ کامیاب اور برسر حق ثابت ہوئے —

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ ' کی مردم شناسی ' روشن خیالی اور دوربینی نے راس مسعود جیسی قابل واکمل شخصیت کو حکومت آصفیہ اور اپنی عزیز رعایا کی تعلیمی اور ذہنی ترقی و تربیت کے لیے منتخب کرکے بہار سے دکن کھینچ بلایا تو نہ صرف پٹنہ بلکہ سارے صوبۂ بہار کو ان کی مفارقت پر تکلیف ہوئی - لیکن سید راس مسعود کی ترقی اور اعلیٰ حضرت کی شہرۂ آفاق بیدار مغزی اور حسن انتخاب پر ہر حلقہ میں اظہار مسرت کیا گیا —

سر راس مسعود نے حضور نظام کی حکومت میں جس قابلیت و صلاحیت

کے ساتھہ اپنی خدمات انجام دیں وہ محتاج بیان نہیں - اس کے بعد علی گڑھ آکر مسلم یونیورسٹی کی جو خدمتیں صرف خاندانی تعلقات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس مرکزی تعلیم گاہ سے فطری دلچسپی اور انس کی بنا پر اپنی عقل و دیانت اور اخلاص کی روشنی میں جس طرح کیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں —

اس کے بعد جب ریاست بھوپال نے ان کی خدمات حاصل کیں تو وہاں بھی وہ بہت ممدوح اور مفید ثابت ہوئے مگر افسوس قبل اس کے کہ ان کی کارگذاریوں اور اصلاحات علمی کے مفید نتائج اور اثرات کافی طور پر نمایاں ہوں ظالم موت کے بے پناہ ہاتھوں نے انہیں ہم سے اچانک چھین لیا اور اس بے رحمی سے کہ ان کی بیماری کی خبر تک ان کے اکثر اعزا اور احبا کو نہ ہو سکی —

پیارے مسعود مرحوم سے میری آخری ملاقات گذشتہ اکتوبر میں علی گڑھ میں ہوئی تھی جب میں اردو کانفرنس کے سلسلہ میں وہاں گیا ہوا تھا جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر گیا تو ان کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی - ہم دونوں خوب بغل گیر ہوئے - اور پھر گلے مل کر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے - مگر کون جانتا تھا کہ یہ ملنا ہم لوگوں کا آخری ملنا ہوگا —

چند روز مسعود

از

(جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب ، ممبر کونسل آف اسٹیٹ فار انڈیا)

مسعود اگر باپ یا دادا کی عمر پاتے تو نہ جانے کہاں تک پہنچتے ، مگر انہوں نے وہ منزلیں جو بڑوں نے بڑی عمر میں طے کی تھیں جلد جلد طے کر ڈالیں اور اس چند روزہ دنیا کی آخری منزل کو اچانک جالیا ، ضعیفہ ماں جس کی عمر کا سہارا وہی تھے ماتم کرنے کو رہ گئی ، نو عمر بیوی جس کو بیاہے دیر نہیں ہوئی تھی بیوہ ہوگئی ، ایک ننھی بچی جو ابھی دنیا میں آئی تھی اور باپ کو پہچاننے بھی نہ پائی تھی یتیم ہوگئی - بڑی ہوگی تو سنے گی کہ کس باپ کی بیٹی ہے - دو بیٹے جو پہلی بیوی سے تھے ، باپ کی بہترین نشانیاں ہیں اور اس کی بہت سی صفات کے وارث - ان سب کے رنج و اندوہ میں ان کی ساری قوم اور ملک کا بیشتر حصہ شریک غم ہے ، جابجا ماتمی جلسے ہوئے ، اخباروں میں ملک کے اس سپوت کے غم میں نظم و نثر کے نوحے لکھے گئے - علمی و ادبی حلقوں میں " مسعود " کا نام دیر تک زندہ رہے گا اور ادب و احترام سے لیا جائے گا - مگر قوم جو ایسے قابل فرد کی خدمات سے بے وقت محروم ہوگئی ہے ، اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکے گی —

ع — جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

مرحوم زبان اردو کے دلدادہ اور ادب اردو کے قدرداں تھے - اس لیے ان کے پرانے دوست اور مداح مولوی عبدالحق نے جو اس زمانے میں اردو کو مخالفین کی زد سے بچانے کے لیے سب سے بڑھ کر سینہ سپر ہیں ' رسالۂ اردو کی ایک اشاعت سر راس مسعود کی یاد کے لیے وقف کی ہے اور ان دوستوں سے جو مرحوم کو جانتے تھے ' مضامین طلب کیے ہیں - مجھے بھی کچھ لکھنے کو کہا گیا ہے ' میں نے مرحوم کو چند مرتبہ دیکھا ' مگر ایسے حالات میں اور ایسے وقتوں پر کہ ان چند ملاقاتوں کا گہرا نقش دل پر باقی ہے ' دیکھوں وہ نقش کس حد تک الفاظ میں منتقل ہوسکتا ہے —

میں نے سب سے پہلے مسعود کو ان کے بچپن میں دیکھا - جب ان کے جلیل القدر دادا سر سید مرحوم ان کو گلے سے لگائے ہوئے تھے - جہاں تک یاد پڑتا ہے سنہ ۱۸۹۵ یا سنہ ۱۸۹۶ کی کانفرنس تھی ' سر سید ایک خیمہ میں تھے اور ان کا یہ ہونہار پوتا ان کے ساتھ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا - دادا کے دل میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی جو لگن تھی ' وہ پوتے کو سینہ بہ سینہ پہنچی - اور یہ اس بزرگ کی صحبت کا فیض تھا کہ مسعود کی زندگی کا ہر زمانہ مسعود رہا —

اس کے بعد میں نے سید مسعود کو پھر انگلستان میں دیکھا ' جب ان کا بچپن مبدل بہ شباب ہوچکا تھا ' اور وہ * مسٹر تھیوڈور ماریسن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم پانے کو آئے ' ماریسن صاحب جب علی گڈھ میں پڑھاتے تھے انہیں سر سید سے گہری عقیدت تھی - انہوں نے اپنی

* جنہیں بعد میں سر تھیوڈور ماریسن کا خطاب ملا تھا -

آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سر سید مرحوم پوتے کو کس قدر چاہتے تھے اور اس سے کیسی کیسی امیدیں رکھتے تھے، اس لیے اونہوں نے بہت خوشی سے مسعود کی خبر گیری اپنے ذمے لی اور انہوں نے اور ان کی بیوی نے مسعود کی بہتری کے لیے ایسی کوشش کی جیسی اپنے بیٹے کے لیے کرتے۔ مسعود کی ذات میں مشرقی اور مغربی دونوں تربیتیں جمع تھیں اور کیا انگریز کیا ہندوستانی جو ان سے ملتا تھا مانتا تھا کہ دونوں تہذیبوں کا پورا رنگ مسعود میں ہے —

اسی زمانے میں مجھے آکسفورڈ کی یونیورسٹی کو دیکھنے کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ مسعود وہاں تھے اور طلبہ اور اساتذہ دونوں میں ہردلعزیز تھے۔ انہوں نے نہایت محبت سے وہاں کے بعض کالج مجھے دکھائے اور وہاں کے مشہور کتب خانے میں مجھے لے گئے۔ اس کے نادر قلمی نسخے مجھے دکھاتے تھے اور ایسے خوش ہوتے تھے کہ جیسے کتاب گھر ان کا اپنا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے کالج کے ایک استاد کے ہاں دوپہر کے کھانے کے لیے لے گئے جہاں اور بھی بہت سے علماء تشریف رکھتے تھے، دیر تک بے تکلف علمی صحبت رہی جس کا لطف اب تک یاد ہے —

آکسفورڈ کی پڑھائی سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو کر، مسعود ہندستان آئے۔ گو آنے سے پیشتر بیرسٹری کی سند بھی حاصل کرلی تھی اور اگر چاہتے تو وکالت میں ہزاروں روپے پیدا کرتے یا اپنے باپ جسٹس سید محمود کی طرح جج ہو جاتے، مگر انہوں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے دادا کی تعلیمی خدمات کی شان دیکھی تھی۔ اس لیے تعلیم کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا، اور محکمۂ تعلیم سے تعلق پیدا کیا اور کچھ عرصہ انگریزی حکومت میں کام کرنے کے بعد، اُن کی خدمات حیدر آباد دکن

کے محکمۂ تعلیم نے انگریزی حکومت سے مستعار لے لیں اور وہ تھوڑے عرصے میں وہاں محکمۂ تعلیم کے افسر اعلیٰ ہوگئے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ کی مردم شناس نگاہوں نے ان کا کام اس درجہ پسند کیا کہ انہیں انگریزی ملازمت سے قطع تعلق کرکے حیدرآباد سے مستقل تعلق پیدا کرنا پڑا اور اعلیحضرت نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کے حقوق پنشن جیسے انگریزی ملازمت میں ہوتے، حیدرآباد میں اس سے بہتر ہوں گے، چنانچہ جب وہ علیگڑھ آتے وقت وہاں سے جوانی ہی میں مستعفی ہوئے تو انہیں ایک هزار روپے ماہوار پنشن دی گئی —

حیدرآباد کی عہدہ داری کے زمانہ میں مجھے پھر مسعود کو دیکھنے کا موقع ملا، میں چند روز کے لیے حیدرآباد گیا تھا، مسعود سے ملنے گیا - مولوی عبدالحق همراہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ مسعود جدت اور قدامت کا جامع ہے - خیالات بہت سے نئے، عادات بہت سی پرانی، تعلیم کے طریقوں میں نئی سے نئی تجویزوں کی حمایت کے لیے تیار، سائنس کی جدید ترقیوں کو جلد اپنے طلبہ کے لیے آسان کرنے کا خواہاں مگر اپنی آسائش کے لیے ایک تخت چوبی پر ایک بڑا سا نرم گدا بچھا کر اور اس پر تکیے رکھکر متمکن، اپنے ملنے والوں سے جو اسی نشست کے پاس کرسیوں پر بیٹھے تھے بے تکلف باتیں کررہا تھا، اسی طرح کھانے کی میز پر دیسی کھانے انگریزی سلیقے سے برتائے جاتے تھے اور چھری کانٹا بھی موجود تھا اور شوربا چپاتی بھی - اس صحبت میں دیر تک اور باتوں کے علاوہ اردو کی خوبیوں اور اس کی ترقی کے امکانات پر دلچسپ گفتگو رہی —

پھر کئی سال تک مجھے سید مسعود کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا - لیکن سنہ ۱۹۲۹ ع میں کچھ مہینوں کے لیے میں دهلی میں مقیم تھا

وہاں مسعود یونیورسٹیوں کے ایک جلسے میں شریک ہونے کو آئے' میں نے ایک شام انہیں کھانے پر بلایا - پانچ چھہ اور دوست بھی تھے - میں نے سنا تھا کہ اگر ان کی طبیعت حاضر ہو تو ان کو ایسی دلچسپ حکایتیں اور لطیفے یاد ہیں کہ لوگ ان کے حافظے ' خوبی بیان اور ظرافت کو دیکھہ کر محو حیرت رہ جاتے ہیں - اور یہی ہوا - دو گھنٹے کے قریب وہ پر لطف صحبت رہی کہ جو کوئی شریک دعوت تھا مدتوں یاد کرتا رہا - اس سے دوسرے دن پچھلے پہر ایک بڑی پارٹی چائے کی تھی اس میں بہت سے انگریز بھی تھے اور ہندستانی بھی - میرے ساتھہ ایک انگریز بیٹھا تھا ' اس کی برابر کی میز پر مسعود تھے اور کچھہ اور صاحبان - میرے ساتھی نے مجھہ سے کہا کہ برابر کی میز پر جو ہندستانی بیٹھا ہے ؟ سر راس مسعود ' اس کو جانتے ہو ' میں نے کہا ہاں جانتا ہوں - اس نے کہا دو تین دن ہوئے - یہ شخص ایک کھانے پر میرے قریب بیٹھا تھا ! میں نے اس سے باتیں کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور وہ زیادہ وقت چپ چاپ بیٹھا رہا جیسے بات کرنا نہیں چاہتا ' میں نے کہا کوئی خاص سبب خاموشی کا ہوگا ورنہ کل رات میرے ہاں یہی شخص بلبل کی طرح چہکتا رہا اور سب اس کی گفتگو سے محظوظ ہوئے اصل بات یہ تھی کہ انگریزوں کے بارے میں مسعود کی یہ حالت تھی کہ جہاں اسے کسی شخص سے ذرا بھی غرور کی بو آتی تھی اس سے وہ خود بھی کھنچ جاتا تھا ' کیونکہ اس کی طبیعت بہت خوددار اور آزادی پسند تھی ' لیکن جو اس کو دوست رکھتے تھے انہیں وہ بھی دل سے دوست رکھتا تھا ' اور ان کے حلقوں میں بھی اسے بہت قبولیت حاصل تھی - سر سید احمد خاں مرحوم کے متعلق مولانا ' حالی ' نے ایک جگہ

لکھا ہے کہ اور لوگ انگریزی داں ہوں گے' وہ انگریز داں تھا' یہی صفت مسعود میں تھی - وہ اچھا انگریز داں تھا' بارہا انگریز اس کے ماتحت کام کرتے رہے اور اس کے تعلقات ان سے یگانگت کے رہے - اسے انگریز یا ہندو کسی سے تعصب نہ تھا مگر ہر شخص کے ذاتی خصائل کے لحاظ سے اس کے دل میں درجہ بدرجہ جگہ تھی —

دہلی کی اس ملاقات کو پھر کئی برس گذر گئے تو ان سے پھر لاہور میں ملنا ہوا' جب وہ پنجاب کی ایک تعلیمی مجلس کی دعوت پر وہاں آئے تھے - اس میں انہوں نے ایک نہایت مفید اور کارآمد تقریر کی جو بے حد پسند کی گئی —

اس کے بعد علی گڈھ میں ان سے ملاقات ہوئی - کیا خبر تھی کہ وہ آخری ملاقات ہوگی' وہ اس وقت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور یونیورسٹی کو ان کے دست ہمت نے گرنے سے بچا لیا تھا' اس گھر میں رہتے تھے جہاں بیٹھکر ان کے مرحوم دادا نے کار فرمائی کی تھی - انہوں نے مجھے یونیورسٹی کی کونسل کے ایک ضروری جلسے میں شریک ہونے کو بتاکید بلایا' اور باصرار اپنے ہاں ٹھہرایا - سوئے اتفاق انہی دنوں میں ان کو دردکمر کا سخت دورہ ہوگیا - اس وقت ان کی زبردست قوت ارادہ کا اندازہ ہوا' کونسل کا جلسہ اہم تھا اس میں بہت امور فیصلہ طلب تھے اور ان کی ذاتی موجودگی ضروری تھی - ڈاکٹر نے کہا جلسہ ملتوی کردو' مگر مسعود نے کہا کہ جلسہ ملتوی نہیں ہوگا - ڈاکٹر سے کہا کہ بجلی سے کچھہ گرمی پہنچاکر یہ کوشش کرے کہ درد قابل برداشت ہوجائے اور وہ تھوڑی دیر اٹھہ کر بیٹھہ سکیں اور جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیں - بجلی لگائی گئی - اور اس کے بعد ایک آرام کرسی پر بیٹھکر اور تکیوں سے دکھتی ہوئی کمر کو

سہارا دے کر مسعود نے اپنے فرائض منصبی ادا کیے —

دوسرے دن طبیعت کچھ بہتر ہوگئی - گو ابھی پورا افاقہ نہیں ہوا تھا - اس دن مولوی عبدالحق مع چند اور احباب کے آنے والے تھے- مولوی صاحب کا اردو کی حفاظت کے لیے دکن سے شمالی ہند پر پہلا حملہ تھا اور اس کی تدبیر کے متعلق وہ سر راس مسعود سے مشورہ کرنے آرہے تھے' اسی دن پھر مسعود نے باوجود علالت کے اثرات باقی ہونے کے پوری سرگرمی سے اس مجلس مشورت میں حصہ لیا - میں آیا تو مرحوم نے یہ وعدہ لیا کہ جب کبھی وہ یونیورسٹی کے کام کے لیے مجھے بلائیں تو میں اور کاموں کو چھوڑ کر آؤں اور ان کا ہاتھ بٹاؤں مگر پھر بلاوے کی نوبت نہ آئی' وہ اس کے بعد جلد ہی یونیورسٹی سے رخصت ہوئے اور میں انگلستان کو روانہ ہوا —

سنہ ۱۹۳۴ ع کے شروع کا واقعہ ہے کہ ایک معاملہ پر سید مسعود کی تجویز کو بعض اراکین یونیورسٹی نے کثرت رائے سے مسترد کر دیا' جس شخص کے متعلق وہ تجویز تھی مرحوم کے نزدیک اس کا علی گڈھ میں رہنا یونیورسٹی کے لیے مفید تھا' انہوں نے محسوس کیا کہ ایک جماعت جو بعض وجوہ سے ان کی مخالف تھی' اس کی کوشش اس معاملے کے پس پردہ کام کر رہی ہے - انہوں نے اس طرز سلوک کو اپنے ساتھ ناانصافی سمجھا اور وہ وائس چانسلر کے عہدہ سے مستعفی ہوگئے - میں نے انہیں خط لکھا کہ وہ استعفیٰ واپس لے لیں - بیشمار اور دوستوں نے بھی کوشش کی مگر وہ ایسے دل شکستہ ہوئے کہ باوجودیکہ علی گڈھ سے ان کو دلی اُنس اور اس کے در و دیوار سے الفت تھی' وہ وہاں سے چل پڑے —

اب نہ آؤں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو
(امیر مینائی لکھنوی)

سید مسعود اور ان کے بزرگ دھلی کے رھنے والے تھے مگر انہوں نے علی گڈھ کو اپنا وطن بنالیا تھا ' سر سید مرحوم کا وھیں کالج کی مسجد کے احاطہ میں مزار ھے ' مسعود کی والدہ محترمہ وھیں مقیم تھیں ' مگر ان کے لیے اب وھاں رھنا خوش گوار نہ تھا - خدا خوش رکھے هزھائینس فرمانروائے بھوپال کو کہ انھوں نے اس گوھر علم کو اپنی ریاست کی کلاہ کی زینت بنایا اور بھوپال میں بلاکر وزارت تعلیم کا قلم دان ان کے سپرد کیا —

میرے انگلستان آنے کے بعد مسعود ایک دفعہ کچھہ دنوں کے لیے وھاں آئے مگر اس قدر آزردہ اور دل شکستہ تھے کہ کسی سے نہیں ملے اور بہت کم لوگوں کو معلوم ھوا کہ وہ کہاں ٹھہرے ھیں ' اس سال یہ خبر ملی تھی کہ وہ اگلے برس آئیں گے اور میں مشتاق تھا کہ ان سے پھر ملیں گے اور کھل کر باتیں ھوں گی - مگر مشیت ایزدی کہ وہ چل بسے اور اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو ختم کرکے پھر دادا کے سینے سے لگ کر جا سوئے ھیں - علی گڈھ کی مسجد میں تعلیم کے دونوں بڑے حامی جن کے دل میں مسلمانوں اور ھندستانیوں کو بڑھانے اور خوش حال رکھنے کی تڑپ انہیں ھمیشہ بیقرار رکھتی تھی ' اب آغوش لحد میں لیٹے ھیں اور ان کے مزار زبان حال سے کہہ رھے ھیں —

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

مرثیہ نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود نور اللہ مرقدہ

از

(جناب خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں صاحب ناظر)

آہ مسعود! ترے ہجر میں دل ڈوب گیا — اور مرے دیدۂ گریاں میں اجالا نہ رہا
میرے گلشن کی خرابی کا کچھ احوال نہ پوچھ — جس میں وہ سرو رواں وہ قد بالا نہ رہا
نہ رہا نجد میں کوئی سر و سامان جنوں — اب وہ ناقہ نہ رہا محمل لیلیٰ نہ رہا
ہائے وہ قوم کا محبوب وہ پیارا مسعود — ناظر غمزدہ کا چاہنے والا نہ رہا

دودۂ 'احمد' و 'محمود' کا وہ چشم و چراغ
سیّد قوم کا وہ نازوں کا پالا نہ رہا

سرنگوں آج ہیں ماتم میں ترے سرو و سمن — اپنے گلشن میں پھر اے سرو خراماں آجا
جھومتے تھے ترے ترانوں پہ تھے مرغان چمن — پھر اسی بزم گلستاں میں غزل خواں آجا
تجھ کو روتی ہوئی ساون کی گھٹائیں آئیں — ابر نیساں کی طرح سوئے گلستاں آجا
رخ پُرنور سے کاشانہ منور کر دے — شب تاریک میں اے شمع شبستاں آجا
قدر جوہر کی تو غربت میں بھی ہوتی ہے مگر — تو بدخشاں ہی میں اے لعل بدخشاں آجا
مادر غمزدہ کا گریۂ یعقوب تو دیکھ — 'مصر بھوپال' سے پھر جانب کنعاں آجا

آرہی ہے حرم کعبہ سے آواز خلیل
اے مرے لخت جگر! میں ترے قرباں آجا

آنکھ سعد کے جو گلزار میں کھولی تو نے
چشمِ 'ناظر' نے تجھے اے گلِ خنداں دیکھا

کبھی دادا نے دیا بوسہ جبیں پر تیری
باپ کا لب کبھی رخسار سے چسپاں دیکھا

تیری خوردی ہی میں آثار بزرگی دیکھے
ماتھے پر اخترِ اقبال درخشاں دیکھا

جس ستارے کا ہوا مطلع مشرق سے طلوع
اس کو مغرب کے افق پر بھی درخشاں دیکھا

گو بہت قلزمِ مغرب میں سفینے ڈوبے
گلبج گوہر سے زرافشاں ترا داماں دیکھا

جب مع الخیر وطن میں ہوا تو جلوہ فروز
ہر خریدار نے یوسف بہت ارزاں دیکھا

پھر وہ سلطانِ دکن نیّرِ رخشانِ دکن
شاہ جم جاہ تری دید کا خواہاں دیکھا

علم کے نور سے معمور ہوا ملک دکن
قریہ قریہ میں قلمرو کے چراغاں دیکھا

منصب و جاہ دکن لطف شہنشاہ دکن
آخر اک کاسۂ دریوزہ پہ قرباں دیکھا

رنگ بو قوم کے گلزار کو تو نے بخشی
ابر نیساں کو چمن پر گہر افشاں دیکھا

تیرا مداح ہر استاد معلم پایا
تیرا مشتاق ہر اک طفل دبستاں دیکھا

دلبرانہ ترا انداز تکلم پایا
تیری ہر بات میں اک عشوۂ جاناں دیکھا

ملک شیدا ہوا شہرت کی بلندی کا تری
قوم نے دام محبت رخ رخشاں دیکھا

بچ سکے لوٹ سے جس شوخ کی کعبہ نہ کنشت
ایسا کافر کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا

بزم جاناں میں مگر شور رقیباں سن کر
غیرت عشق سے عاشق کو گریزاں دیکھا

دل میں تھا سیل بلا کا تیرے دھڑکا لیکن
موج طوفاں سے تجھے دست و گریباں دیکھا

ایک ناسور سا تو دل میں لیے پھرتا تھا
مثل گل گرچہ شگفتہ ترا عنواں دیکھا

آخر اس روح سبک سیر کا شوق پرواز
عرش اعظم کی فضاؤں میں پر افشاں دیکھا

شور شیون ہوا ہر کوچہ و برزن سے بلند
اور ہر سینہ کو غم سے ترے بریاں دیکھا

غم سے تھے تفتہ جگر گرچہ ترے نور نظر
تاج 'بھوپال' کو دونوں کا نگہباں دیکھا

الوداع اے مرے سو جان سے پیارے مسعود　　میرے پیارے میرے اللہ کے پیارے مسعود

ہائے کس دل سے چلیں سیر چمن کو ناظر　　جب گلستاں میں نہیں اس گل رعنا کی نمود

اس نے ویران کیے گلزار تمنا کیا کیا　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا ستم چرخ کبود

تجھ کو مرغوب نہ تھی عالم سفلی کی فضا　　اس لیے عالم بالا کو ہوا تیرا صعود

جوشش عشق سے مسعود کی یہ عقدہ کھلا　　کیوں کیا آدم خاکی کو ملائک نے سجود

تو ہوا 'احمد' و 'محمود' کی خلوت کا انیس　　قابل دید ہے مسعود تری بزم شہود

تجھ پہ اے سید پاک اور اب وجد پہ ترے　　تا ابد لاکھوں سلام اور ہزاروں ہوں درود

باغ رضواں میں اب آرام سے سو جا پیارے
تیری میراث پدر ہے یہ مقام مقصود

علیگڈھ میں سر راس مسعود کا کام

از

(جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ' پرنسپل ٹریننگ کالج '
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں سر راس مسعود مرحوم نے جو خدمات انجام دیں ان کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کام کی نوعیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھیں - ہندوستان میں کسی اعلیٰ تعلیم گاہ کا کامیابی کے ساتھ چلانا ایک مشکل مرحلہ ہے لیکن جب وہ ایک قومی درسگاہ ہو تو یہ مشکلات اور ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دل و دماغ کی غیر معمولی خوبیوں اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کی ضرورت ہے - اس کی صدر نشینی کے لیے محض ایک عالم ہونا کافی نہیں کیونکہ جہاں یونیورسٹی کا ایک اہم فرض علمی تحقیق و تفتیش اور علم کی حدود کو وسیع کرنا ہے وہاں اس کے دوسرے مشاغل اور کاروبار بھی ہیں جن کو خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھالنا کامیابی کے لیے لازم ہے - مثلاً ایک طرف طلبہ کی ذہنیت ' ان کی نفسی کیفیات اور کشمکش ' ان کی امنگوں اور آرزوؤں کو سمجھنا ضروری ہے - وہ زندگی کے جس نازک اور پرآشوب دور سے گزر رہے ہیں اس میں محبت اور دل سوزی لیکن اصول کی پختگی

کے ساتھہ ان کی رهنمائی کرنی هے - ان کے دلوں کو تسخیر کرنا هے لیکن اس کے ساتھہ هی ان کے دماغوں کی صحیح هدایت کرنی هے - جس معلم میں یا درسگاہ کے منتظم اعلیٰ میں یہ صلاحیت نہیں هوتی وہ هرگز نوجوانوں کی زندگی اور سیرت پر کوئی اچھا اور دیرپا اثر نہیں ڈال سکتا - دوسری طرف اس کا فرض یہ هے کہ اساتذہ کی جماعت کے ساتھہ خوش گوار تعلقات قائم کرے کیونکہ یونیورسٹی کی علمی اور اخلاقی فضا کی درستی اور صحت کا انحصار بڑی حد تک انہیں کی مستعدی، فرض شناسی اور بلند نظری پر هے - اگر ان میں یہ صفات نہ هوں یا انتظامی جماعت کے ساتھہ ان کے تعلقات کشیدہ هوں اور اس کی وجہ سے ان کی توجہ غیر متعلق امور کی طرف مبذول هوجائے تو درسگاہ کی فضا نہایت آسانی سے مکدر هو جاتی هے - ان تعلقات کو خوش اسلوبی کے ساتھہ نباهنا آسان نہیں کیونکہ هر ایسی جماعت میں مختلف مزاج اور طبیعتوں کے لوگ هوتے هیں جن سے بہترین طریقہ پر کام لینے کے لیے بڑی سمجھہ داری اور معاملہ فہمی درکار هے - اکثر اوقات ایسی حالت میں کامیابی کا آسان راستہ یہ معلوم هوا کرتا هے کہ درسگاہ میں اپنی ایک خاص پارٹی قائم کرلی جائے جو هر طرح اپنا ساتھہ دے اور ان کی جا اور بے جا حمایت سے فائدہ اٹھاکر اس پر پورا تسلط حاصل کرلیا جائے - لیکن ظاهر هے کہ اس طریقۂ عمل سے درسگاہ کی علمی فضا بالکل خراب هو جاتی هے اور لوگ اطمینان اور سکون قلب کے ساتھہ کام نہیں کر سکتے - اس زبردست تحریص کا مقابلہ کرنے اور درسگاہ کے معاملات میں انصاف کرنے کے لیے ایک مضبوط اور بے لاگ کیرکٹر کی ضرورت هے جو شخص اقتدار اور رسوخ کو خوشی کے ساتھہ درسگاہ کے مفاد پر قربان کردے -

علاوہ بریں اساتذہ کی اس جماعت میں مختلف علمی مذاق اور قابلیت کے لوگ ہوتے ہیں جن میں سے بعض خاص خاص علوم و فنون میں مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں - ان کا اعتماد اور احترام حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک اعلیٰ علمی اور ادبی مذاق رکھتا ہو اور ان سے ان ہی کی سر زمین پر سمجھہ داری اور معقولیت کے ساتھہ گفتگو کر سکے - ظاہر ہے کہ کوئی شخص تمام علوم و فنون کا ماہر تو نہیں ہو سکتا لیکن علمی ذوق کی شرط اس کے لیے لازمی ہے - اساتذہ کی جماعت کسی ایسے شخص کا دل سے احترام نہیں کر سکتی جس کو علم اور علمی مسائل اور مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات سے کوئی لگاؤ یا دلچسپی نہ ہو، جو ان ذہنی کاوشوں کی قدر نہ پہچانتا ہو جو اہل علم کے نزدیک انسانی زندگی کی وقیع ترین امتیازی خصوصیت ہیں -

طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ اس کو دو اور قوتوں سے سابقہ پڑتا ہے ایک حکومت اور دوسری قوم ان دونوں کے مطالبات اور اثرات کو یونیورسٹی کے مفاد کے لیے استعمال کرنا ایک بڑا کٹھن کام ہے - حکومت کے ہاتھہ میں روپے کی تھیلی ہے اور روپے کے بغیر تعلیم کا کارخانہ نہیں چل سکتا - اور دنیا کا قاعدہ یہ رہا ہے کہ جس کا کھاؤ اس کا گاؤ! حکومت اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں اس نے ہمیشہ تعلیم اور تعلیم گاہوں کو اپنے اغراض اور مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے - اس لیے درسگاہ کے صدر کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے اور حکومت کے درمیان نہ صرف ایک واسطہ کا بلکہ ایک حد فاصل کا کام بھی دے اور یونیورسٹی کو اس کے بے جا دباؤ اور دست برد سے محفوظ رکھے - یہ عجیب و غریب جنگ بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی کی جنگ ہے کیونکہ بالعموم یونیورسٹیاں حکومت

کی مالی امداد سے بے نیاز ہونے کا حوصلہ یا توفیق یا استطاعت نہیں رکھتیں اس لیے وہ اس سے بگاڑیں کیونکر ؟ لیکن اگر وہ محض حکومت کے نا عاقبت اندیشانہ اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائیں تو ان کی ذہنی آزادی کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور وہ صرف امتحان لینے اور ڈگریاں دینے کی مشین بن کر رہ جاتی ہیں - طلبہ کی سیرت اور قومی زندگی پر کوئی انقلاب آفریں اثر نہیں ڈال سکتیں - دوسری طرف قوم ہے جس کی جانب سے اس کی ہدایت اور امداد کے لیے ایک جماعت مقرر ہوتی ہے جو یونیورسٹی کی پالیسی کی نگراں اور معین کرنے والی ہے - اسے اس مختلف الخیال جماعت کے ساتھہ اشتراک عمل کرنا ہے - اس سے بھی زیادہ اہم یہ چیز ہے کہ تعلیم اور قومی زندگی کا رشتہ قائم رہے اور اس میں قوم کے خیالات اور جذبات اور اس کی روز افزوں اور انقلاب پذیر ضروریات کا خیال رکھا جائے - اس میں اور زیادہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اکثر حکومت کی خواہش اور قومی مصالح میں تصادم پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی رائے عامہ میں اور انتظامی جماعت کی اکثریت میں بنیادی اختلافات رونما ہوتے ہیں اور غریب وائس چانسلر کو جواب دہی نہ صرف ان دونوں قوتوں کے سامنے ہے بلکہ' اگر وہ سچا اور با اصول آدمی ہے' تو اس کو خود اپنے ضمیر کے سامنے بھی اپنے کاموں کی جواب دہی کرنی ہے - اس کا صبر آزما فرض یہ ہے کہ وہ باوجود ان تمام اختلافات کے یونیورسٹی کو خوش اسلوبی کے ساتھہ چلائے اور اسے ہر قسم کے خود غرضانہ حملوں اور اندرونی او بیرونی خطروں سے محفوظ رکھے - اور ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ ممکن ہے باوجود اپنی انتہائی کوشش اور پر خلوص

خدمت کے آخر میں سوائے محرومی اور رسوائی اور نااہلوں کی مخالفت کے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آئے ! - غرض ایشیائی شعرا نے عشق کے کوچے کی جو دشواریاں اور رسوائیاں گنائی ہیں ان سے یہ مرحلہ کم نہیں -

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں !

شاید یہ کہنا صحیح نہ ہو کہ سر راس مسعود مرحوم میں یہ 'تمام' صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں لیکن کوئی انصاف پسند اور واقف کار شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرے گا کہ اب تک علی گڈھ کی عنان ادارت جن حضرات کے ہاتھ میں رہی ہے اُن کے مقابلے میں مرحوم کی ذات میں بہ حیثیت مجموعی وہ صفات زیادہ نمایاں تھیں جو ایک کامیاب وائس چانسلر کے لئے ضروری ہیں اور انہوں نے جن نازک اور پر خطر حالات میں اس درسگاہ کی سرداری اپنے ذمہ لی تھی ان میں کوئی دوسرا شخص ان سے زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا تھا - میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہر لحاظ سے اپنے پیش رووں پر فوقیت رکھتے تھے لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجموعی طور پر دل و دماغ اور سیرت اور شخصیت کی صفات کا جیسا ہم آہنگ اجتماع ان کی ذات میں تھا اس کی دوسری نظیر مشکل سے مل سکتی ہے - ان کے خاص خاص کاموں کا ذکر کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کی وائس چانسلری پر اس نقطۂ نظر سے تبصرہ کروں کہ انہوں نے اُن تمام تعلقات کو کس طرح نبھایا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے —

جن لوگوں کو علی گڈھ کے دور مسعودی کا کچھ بھی تجربہ ہے وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ ان کی بلند نظر اور دلکش شخصیت نے طلبہ کے قلوب کو بالکل مسخر کرلیا تھا - وہ ان کی ستھری اور

لطیف صحبت اور دلچسپ اور شستہ گفتگو سے مستفید ہونے کے لیے اس طرح اُن کے گرد جمع رہتے تھے جس طرح پروانے جوق در جوق اور بے ساختہ شمع کے گرد جمع ہو جاتے ہیں - یہ مثال شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار ہے کیونکہ جن لوگوں کو خوش نصیبی سے ان کی صحبت میں شامل ہونے کا موقع ملا ہے (اور ان کی تعداد شاید ہزاروں سے بھی زیادہ ہو) انہیں اندازہ ہے کہ مرحوم کو گفتگو کے فن میں کیسا غیر معمولی کمال حاصل تھا - وہ جس صحبت میں ہوتے خواہ وہ طلبہ کی ہو یا اساتذہ کی، عمائدین کی ہو یا عوام کی، رندوں کی ہو یا اہل عرفان کی، وہاں اپنی ظرافت، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، خیالات کی جدت، طرزادا کی ندرت اور انسانی تجربات کی غیر معمولی وسعت کی بدولت تمام مجمع پر چھا جاتے تھے - ان کو اردو فارسی انگریزی عربی شعرا کے ہزاروں شاید لاکھوں اشعار حفظ تھے اور وہ انہیں نہایت شوق اور جوش اور برجستگی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے - طلبہ جو کم از کم خیالات اور جذبات کی دنیا میں بلندی اور پاکیزگی اور خلوص کے جویا ہوتے ہیں، جن کی فطرت ادب میں اپنے ذوق جمال کی تسکین چاہتی ہے ان کی صحبت کو ایک ادبی نعمت تصور کرتے تھے - اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے لیے اس صحبت میں شریک ہونا بجائے خود ایک تعلیم تھی - ان کے غیر معمولی اثر کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں واقعاً طلبہ سے ایسی ہی محبت تھی جیسی کسی شفیق باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور اس کا رد عمل یہ تھا کہ وہ بھی انہیں "ہمارا محبوب وائس چانسلر" کہتے اور درحقیقت ایسا ہی سمجھتے تھے - ان کا حافظہ غیر معمولی تھا اور وہ جس شخص سے ایک مرتبہ سرسری طور پر

بھی ملتے تھے اس کا نام، چہرہ اور اتا پتا یاد رکھتے تھے - اس وجہ سے انہیں طلبہ کے ساتھہ ذاتی تعلقات اور مراسم قائم کرنے اور قائم رکھنے میں بہت آسانی ہوتی تھی - وہ اپنی محبت، ہمدردی اور پر خلوص دل چسپی سے ایک ہی ملاقات میں طالب علم کو اپنا بنا لیتے تھے اور اس کو کبھی نہ بھولتے تھے - اسی تعلق خاطر کا طفیل تھا کہ یونیورسٹی کا ہر طالب علم اپنی اپنی جگہ بجا طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے مراسم وائس چانسلر سے خصوصیت کے ہیں - اس کا ایک اثر یہ تھا کہ یہ طلبہ دوسری درسگاہوں کے طلبہ اور پبلک کے سامنے خود اعتمادی کے ساتھہ اور سر بلند کرکے چلتے تھے گویا وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ملک میں ان کے محبوب وائس چانسلر کو جو امتیاز حاصل ہے اس کا کچھہ حصہ ان کے نصیب میں بھی آیا ہے - مگر ان کی یہ ہمدردی محض زبانی اخلاق اور میل جول تک محدود نہ تھی وہ نہ صرف طلبہ کی ہر قسم کی علمی اور اجتماعی تحریکات میں گہری ذاتی دل چسپی لیتے تھے، نہ صرف ان کو روزگار سے لگانے میں اپنی ساری قوت اور اثر صرف کرتے تھے، نہ صرف ان کی ذاتی اور خاندانی مشکلات میں ہر قسم کے مشورہ اور امداد کے لیے حاضر رہتے تھے بلکہ انہوں نے بحیثیت وائس چانسلر کے غریب طلبہ کی جس قدر مالی امداد کی وہ علیگڈھ کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی ہے - وائس چانسلرز فنڈ کے نام سے انہوں نے اپنے وسیع حلقہ احباب سے ہزاروں روپے چندہ کیا اور اسے غریب طلبہ کی امداد پر صرف کیا - اس کا تو لوگوں کو عام طور پر علم ہے لیکن شاید باہر والوں کو یہ معلوم نہیں کہ ذاتی حیثیت سے بھی ان کا دست سخا ہمیشہ مستحق اور نادار طلبہ کی امداد کے لیے کھلا رہتا تھا - اکثر ایسا ہوتا

کہ کسی طالب علم کے پاس امتحان میں شریک ہونے کے لیے فیس نہیں یا گھر جانے کے لیے سفر خرچ نہیں، یا اس کے لباس سے انہیں یہ اندازہ ہوتا کہ اس کی حالت قابل امداد ہے وہ فوراً اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان کی مدد کرتے اور اکثر اس کارخیر کی خبر لینے اور دینے والے کے سوا کسی کو بھی نہ ہوتی تھی - کبھی کبھی اس فیاض اور شریف النفس انسان کی انسانیت کے قصے اس کی زندگی میں سننے میں آجاتے تھے اور بہت سے قصے احسان شناسوں نے ان کے مرنے کے بعد سنائے —

اساتذہ سے ان کے جو تعلقات رہے اس کی تفصیل کے لیے ایک طولانی بحث کی ضرورت ہے جس کا یہاں موقع نہیں لیکن ان کے مخالفوں اور موافقوں دونوں کو اس امر کا اعتراف ہے کہ انہوں نے یونیورسٹی کے تمام معاملات میں بڑی رواداری اور شرافت اور دیانتداری سے کام لیا اور کبھی ذاتیات کو درسگاہ کے مفاد پر غالب نہیں آنے دیا - اختلاف خیال نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے اور یونیورسٹی کے علمی اور انتظامی مسائل میں اکثر ایسے مواقع پیش آئے جب بعض لوگوں نے ان کی رائے سے اختلاف کیا لیکن انہوں نے اس اختلاف کو کبھی ذاتی مخالفت نہیں سمجھا - انہوں نے اس بدعت حسنہ کی بنا ڈالی کہ یونیورسٹی کو چلانے کے لیے اپنی کوئی "پارٹی" نہ بنائیں گے بلکہ ایمانداری کے ساتھ جو رائے ہوگی اس پر عمل کریں گے خواہ اس سے ان کے دوستوں کو شکایت کا موقع ملے یا مخالفوں کو - یہ ضرور تھا کہ بعض لوگوں کے ساتھ ان کے مراسم زیادہ گہرے اور مستحکم تھے اور بعض سے رسمی اور سرکاری میل جول تھا لیکن ان ذاتی تعلقات کا اثر انہوں نے حتی الامکان یونیورسٹی کے معاملات پر نہیں پڑنے دیا - بلکہ ایک حد تک ان کے بعض دوستوں

کو یہ شکایت رہی کہ ہمیں ان کی ذات سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا اور بعض کو یہ گلہ کہ انہوں نے اپنے مخالفین کو نقصان نہیں پہنچایا! میرے نزدیک یہ دونوں شکایتیں سر راس مسعود مرحوم کی اصول پرستی اور اخلاق کی پختگی کا بہترین ثبوت ہیں - اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے یہ رویہ اس وجہ سے اختیار نہیں کیا کہ وہ پارٹی بنانے یا قوت حاصل کرنے کے فن سے ناواقف تھے - جو شخص دس سال تک ایک بڑی ریاست میں ایک پورے محکمہ کا افسر اعلیٰ رہا ہو اور وہاں کی تگ و دو کی فضا میں اپنے لیے ایک نمایاں حیثیت پیدا کر سکتا ہو اس کے لیے علیگڈھ کی مقابلتاً چھوٹی ریاست پر ذاتی اقتدار جمانا کوئی بہت مشکل بات نہ تھی - لیکن وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے علیگڈھ کی وائس چانسلری قبول کرتے وقت اپنے دادا کی روح سے عہد کیا تھا کہ جب تک وہاں رہوں گا ہر قسم کی جماعت بندی سے پرہیز کروں گا - اس عہد کو انہوں نے نہایت خلوص اور پابندی کے ساتھ پورا کیا لیکن جہاں اس سے ان کے اخلاق کی بلندی کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ علیگڈھ میں ان کو جو مشکلات پیش آئیں اور جس حد تک ناکامی ہوئی اس کا سبب بھی یہی اصول تھا - دنیا کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہمیشہ اور فوری طور پر اخلاق اور صداقت اور اصول پرستی کا کامیاب ہونا ضروری نہیں! ... ذاتی میل جول اور ملاقات میں وہ اساتذہ کے ساتھ ہمیشہ نہایت شرافت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور ان کے ہر قسم کے معاملات اور مشکلات میں ان کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے - شاید کبھی ایک بھی موقع ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی کی امداد سے پہلو تہی کی ہو ... سب سے بڑھ کر سکاف

کو ان کی موجودگی سے یہ فائدہ تھا کہ ان کو اپنے روزمرہ کے علمی اور تعلیمی معاملات میں ایک تہذیب یافتہ ' خوش مذاق ' علم دوست وائس چانسلر سے واسطہ پڑتا تھا جس کی طرف سے انہیں یہ اطمینان تھا کہ وہ ان کی ذہنیت اور مذاق کو سمجھہ سکتا ہے اور ان قدروں کی عظمت سے واقف ہے جن کی اشاعت تعلیم اور معلموں کا مقدس فرض ہے —

حکومت میں ان کا بہت کافی رسوخ تھا - یہ بجائے خود کوئی عجیب بات نہیں - ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو ایسا رسوخ حاصل ہے لیکن ان کا خاص کمال یہ تھا کہ انہوں نے بغیر حکومت کے سامنے سر نیاز جھکائے ' بغیر حکام کی بے جا خوشامد کیے ' محض اپنی قابلیت اور شخصیت اور ذاتی وجاہت سے مقامی اور مرکزی حکومت میں اثر پیدا کیا تھا اور وہ ان کی رائے اور مطالبات کو توجہ اور احترام سے سنتی تھی - ان کا تقریباً مذہبی عقیدہ تھا کہ حکومت کو ہرگز یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے اور اسی وجہ سے وہ ہمیشہ یونیورسٹی کی طرف سے حکومت کے سامنے سینہ سپر رہے - لیکن ارباب حکومت کے ساتھہ ان کے ذاتی تعلقات خوش گوار تھے اور انہوں نے اس اثر کو یونیورسٹی کے مفاد کے لیے استعمال کیا - اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر آئے مسٹر میکنزی مرحوم یو - پی کے ڈائرکٹر تعلیمات تھے اور وہ بعض وجوہ سے یونیورسٹی کے بہت مخالف تھے جس کی وجہ سے یونیورسٹی کے حکام کو اپنے کام میں بہت مشکلات پیش آتی تھیں - سر راس مسعود کی شخصیت کا یہ اعجاز تھا کہ ان سے دو تین مرتبہ کی ملاقات ہی میں مسٹر میکنزی گویا ان کے نام کا کلمہ پڑھنے لگے تھے

اور وہ جو کام یونیورسٹی کے مفاد کے لیے ضروری سمجھتے ان سے کرالیتے تھے - اسی طرح انہیں اپنے ابتدائی زمانے میں حکومت ہند کے کئی سربرآوردہ اور مدمغ اراکین سے رسا کشی کرنی پڑی - کبھی اپنی معاملہ فہمی اور خوش اسلوبی سے ' کبھی وکالت اور دلیل کی قوت سے ' کبھی شخصی اثر سے کام لے کر ' کبھی محض اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایک ایک کرکے بہت سے قلعوں کو سر کرلیا اور حکومت ہند میں ان کا بہت وقار اور رسوخ قائم ہوگیا - اس کی وجہ سے طلبہ کو ملازمتوں کے ملنے میں سہولتیں پیدا ہوگئیں اور یونیورسٹی کی حیثیت سرکاری نظر میں بلند ہوگئی - 'لارڈارون' کے عہد حکومت میں ان کا رسوخ بہت بڑھا ہوا تھا - اگر لارڈ ولنگڈن کے زمانے میں ہندوستان کی سیاست کا رخ نہ بدل جاتا اور ناعاقبت اندیش قوتیں اور اثرات حکومت کی پالیسی پر غالب نہ آجاتے تو نہ صرف علی گڈھ کی تاریخ مختلف ہوتی بلکہ شاید ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی بدل جاتی - لیکن کچھ تو اس پالیسی کے بدلنے سے ' کچھ ذاتی منافشات کی بنا پر جن کا یونیورسٹی سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا اور کچھ اس سبب سے کہ حکومت پر آزاد خیال شخص کو ایک حد تک مشتبہ سمجھتی ہے یونیورسٹی کی فضا بھی مکدر ہونے لگی اور ایسے حالات پیدا ہوگئے جن میں سر راس مسعود نے یہ سمجھا کہ وہ یونیورسٹی کی خاطر خواہ خدمت نہ کرسکیں گے - اس لیے وہ ایک متابلتاً غیر اہم قضیے پر اپنے عہدے سے دستبردار ہوگئے - مجھے ذاتی طور پر ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا اور کئی مرتبہ ان سے اس موضوع پر بحث بھی ہوئی میرا خیال تھا کہ ان میں اتنی قوت اور قابلیت ہے کہ وہ سازشوں

اور ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرسکتے ہیں اور قوم کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرکے طے کراسکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ پر کن قوتوں کا تسلط ہونا چاہیے - لیکن وہ اپنی جذباتی طبیعت سے مجبور تھے - مگر بہر حال اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ انہوں نے جو کچھہ کیا وہ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھہ کیا - ان کے سیاسی خیالات معتدل تھے لیکن ان کی شدید خواہش اورآرزو تھی کہ طلبہ میں ذاتی اور قومی خود داری پیدا ہو - وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں ' اپنی تہذیب اور تمدن کے قابل قدر عناصر کا پورا پورا احترام کریں اور کسی بیرونی قوت سے مرعوب نہ ہوں - انہیں غلامانہ ذہنیت سے خاص کرکے نفرت تھی جس کا اظہار وہ اکثر یہ اشعار پڑھ کر کیا کرتے تھے :

دلا نارائی پروانہ تا کے نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز طواف آتشے بیگانہ تا کے

لیکن شاید جو حکومت بر سر اقتدار ہوتی ہے وہ اس قسم کی ذہنی اور نفسیاتی آزادی کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی کیونکہ نہ معلوم کب یہ احساس اور تڑپ جذبات اور خیالات کی دنیا سے منتقل کر عمل کی دنیا میں جا پہنچے!

پبلک کے ساتھہ عمدہ تعلقات قائم رکھنے کا ان میں خاص ملکہ تھا - علیگڈھ اور بیرون علیگڈھ کے ہزاروں آدمی ان سے ملنے آتے اور ان کی دل کش شخصیت کا شکار ہوجاتے - ان کے انتقال کے بعد مجھے بہت سے ایسے لوگ ملے جو ان سے کبھی ایک یا دو بار ہی ملے تھے لیکن آج تک ان کے دل میں اُس صحبت کی یاد اس طرح باقی ہے جس طرح زندگی

کے صرف خاص خاص اور اہم تجربات کی چاشنی باقی رہ جاتی ھے -
اس وجہ سے عام لوگ جن کو یونیورسٹی سے کوئی سرکاری یا دفتری تعلق
نہیں تھا ھمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رھے لیکن بعض اوقات
ان جماعتوں کے ساتھ کام کرنے میں انہیں ضرور مشکلات پیش آئیں جن
کا تعلق یونیورسٹی کے نظم و نسق سے ھے یعنی ممبران کورٹ اور کونسل
وغیرہ - اس کی میرے خیال میں کئی وجوہ تھیں - انہوں نے علیگڈھ
میں آنے سے پہلے ھمیشہ بحیثیت ایک صاحب اختیار حاکم کے کام کیا
تھا - اس لیے انہیں جمہوری اداروں اور جماعتوں کو چلانے کا
کوئی خاص تجربہ نہ تھا - یہاں ھر کام کے لیے کمیٹیاں ھوتیں' رایوں کا
شمار ھوتا' بعض اوقات مختلف الخیال جماعتوں میں کشمکش ھوتی اور
وہ ان چیزوں کے عادی نہ تھے - انہیں اس سے ایک قسم کی الجھن
سی ھوتی تھی خصوصاً ایسی حالت میں جب انہیں یہ اندازہ ھو جائے
کہ اختلاف کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا ھے جو کسی ذاتی غرض
یا مخالفت کی بنا پر ایسا کر رھا ھے - لیکن ان کی انصاف پسندی اور
خوش مزاجی کی وجہ سے یہ کشمکش کوئی ناگوار صورت اختیار نہ
کرتی تھی - معاملات تو اکثر سلجھ جاتے تھے لیکن ان کی حساس طبیعت
پر ان واقعات کا بار رھتا - وہ طبعاً بہت زود حس واقع ھوے تھے اور
رنج اور خوشی' احسان اور ناشکری' دوستی اور دشمنی' شرافت اور
کمینگی غرض ھر قسم کے جذبات اور حرکات سے نہایت شدید حد تک
متاثر ھوتے تھے - ان کے بلند و بالا اور مضبوط جسم میں ایک نہایت
نازک اور احساس مند دل تھا جس کو بہت آسانی سے ٹھیس لگتی تھی -
اس قسم کی طبیعت ایک آرٹسٹ کے لیے نہایت ضروری ھے اور ھر قسم

کے تخلیقی کام میں معین ہوتی ہے - محبت، ہمدردی، رفاقت، تحمل
کی صفات بھی بڑی حد تک اس کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن قومی کام
کرنے والوں کو اس کی وجہ سے مشکلات بھی بہت پیش آتی ہیں - دنیا
میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں - شریف اور احسان شناس اور دوست نواز
بھی اور بد باطن، عیب جو اور ریا کار بھی - قومی کام کرنے والوں
کو ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، جائز اور ناجائز مخالفت کا سامنا
کرنا ہوتا ہے - بیج بوکر اس کو پھلتے پھولتے دیکھنے کا امکان بھی ہوتا
ہے اور یہ اندیشہ بھی کہ شاید اسے چڑیاں چگ جائیں یا دھوپ جھلس
دے یا پارش خراب کردے یا کوئی بے وقوف یا بداندیش اپنی حماقت
یا خبث باطن کی وجہ سے پودے کو اکھیڑ پھینکے - لہذا آرٹسٹ کے سریع الحس
دل کے بجائے قومی کام کے لیے ایسے دل کی ضرورت ہے جو مخالفت کا
نہ صرف مقابلہ کرے بلکہ ضرورت ہو تو اسے بردباری اور صبر کے ساتھ
برداشت کرے یا اس کو نظر انداز کردے اور جب وہ صریحاً بدنیتی
پر مبنی ہو تو اس کو تحقیر کے ساتھ بھلا دے - لیکن بر خلاف اپنے دادا
سر سید احمد خاں کے سر راس مسعود کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی
کہ وہ مخالفت کو بے اعتنائی کے ساتھ برداشت نہیں کرسکتے تھے - وہ اس
کا مقابلہ کرسکتے تھے، بظاہر اس کی تضحیک بھی کرتے تھے لیکن ان کے
دل پر اس کی چوٹ کاری لگتی تھی جس سے ان کی صحت اور مزاج
دونوں متاثر ہوتے تھے - باوجود اپنے وسیع اور گونا گوں تجربے کے ان
میں بچوں کی سی یہ معصومانہ صفت تھی کہ وہ جب کبھی اپنے کسی
جاننے والے کی یا کسی " ذمہ دار آدمی " کی کوئی خفیف یا کمینہ پن
کی حرکت دیکھتے تو انہیں اچانک دھکا سا لگتا تھا جیسے یہ بات ان

کے نزدیک امکان ہی سے خارج تھی - اگر وہ بھی سر سید کی طرح اس معاملہ میں "بے حس" ہوتے تو شاید بعض واقعات جو پیش آے وہ پیش نہ آتے —

میں نے عمداً ان تمام تعلقات کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے کیونکہ میرے خیال میں ان کے تمام انفرادی کاموں سے زیادہ اہم ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر ہے - ایک تعلیمی ادارے میں صدر کی شخصیت کا غیر محسوس اور غیر مرئی اثر افراد کے خیالات اور جذبات اور اس کے تمام شعبوں میں آہستہ آہستہ سورج کی روشنی کی طرح سرایت کر جاتا ہے اور اس کی مخصوص علمی اور اخلاقی فضا ایسے ہی اثرات سے بنتی یا بگڑتی ہے - ان کے خاص خاص کاموں کا ذکر کرنے سے پہلے میں بطور تمہید کے ان کی اس تقریر کے چند جملے نقل کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے علیگڈھ آتے ہی غالباً ۲۱ اکتوبر سنہ ۲۹ ع کو اساتذہ اور طلبہ کے سامنے کی تھی اور جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے بارے میں ان کا نصب العین کتنا بلند تھا - انہیں چند طلبہ کے لیے نوکریوں کی فکر نہ تھی بلکہ قوم کی اخلاقی اور علمی زندگی کی تعمیر نو مد نظر تھی تاکہ ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو ہم چشم اقوام میں سر بلندی حاصل ہو —

"مجھے ہمیشہ ان لوگوں کی تنگ نظری پر افسوس ہوتا ہے جو نوجوانوں کے خوابوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں - وہ نہیں جانتے کہ ہر قسم کی ترقی کے لیے ان خوابوں کی کس درجہ اہمیت ہے - یہ درس گاہ اور اس کے تمام اساتذہ اور طلبہ اور ساز و سامان سب ایک مخلص انسان کے پاکیزہ خواب کا نتیجہ ہیں - یاد رکھو کہ جو قوم خواب

دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے، جو قوم کوئی بلند نصب العین نہیں رکھتی اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کرتی، وہ قوم مردہ ہے یا مردہ ہوجاتی ہے ... میں اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ میری قوم مردہ ہے - میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ہم لوگ جن کے آبا و اجداد سلطنتوں اور تمدنوں کے بنانے والے اور بنی نوع انسان میں امن اور انتظام قائم کرنے والے تھے اپنی قوت فیصلہ کو اس حد تک ضائع کرچکے ہیں کہ موت اور حیات میں تمیز نہیں کرسکتے - اگر میرا اپنی قوم اور تم سب نوجوانوں کے متعلق وہ عقیدہ نہ ہوتا جو ہے، تو میں اس یونیورسٹی کی عنان انتظام کو ہرگز اپنے ہاتھ میں نہ لیتا اور آپ مجھے آج یہاں نہ دیکھتے ... میں آپ کے پاس بے شمار امیدیں لے کر آیا ہوں اور میری پر خلوص آرزو ہے کہ میں جہاں تک ممکن ہو آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں ... یہ زمانہ جد و جہد اور مقابلہ کا ہے اور صرف وہی قوم عزت کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے جو اپنے افراد کی تمام قوتوں کو متحد کرکے کام کرے گی - ہمیں چاہیے کہ اپنی اس یونیورسٹی میں مکمل اتحاد کی ایک زبردست مثال قائم کرکے اسے ملک کے سامنے بطور ایک نمونے کے پیش کریں اور اس چار دیواری کے اندر سے اختلافات اور منافرت کے ان تمام جذبات کو بالکل فنا کردیں جنہوں نے ہماری مادر تعلیمی کو سخت نقصان پہنچایا ہے - نفرت اور عدم روا داری کی بنیادوں پر کوئی پائدار عمارت قائم نہیں ہوسکتی... دوسری طرف یونیورسٹی کا رویہ اپنے تمام طلبہ اور خادموں کے ساتھ ایک منصف مزاج اور فیاض دل ماں کا سا ہونا چاہیے اور اسے سب کے ساتھ بلا لحاظ قوم و نسل و ملت انصاف اور محبت کا سلوک کرنا چاہیے-

اگر خدا نخواستہ ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوے تو ہمیں یہ حق نہ ہوگا کہ ہندوستان کے سپوت فرزندوں میں ہمارا شمار کیا جاے اور اس انجام بد کی ذمہ داری ہم لوگوں پر عاید ہوگی جن کا فرض نو خیز نسلوں کی تربیت ہے - میری آرزو ہے کہ ہم اپنے کو ایک بلند خیال، مہذب اور اعلی تعلیم یافتہ فوج کی شکل میں منظم کریں جسے ہمارا وطن ان تمام خرابیوں کے دور کرنے کے لیے استعمال کرے جن کی وجہ سے دنیا کے سامنے بہ مورد الزام بنا ہوا ہے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب ہم ان تمام قوتوں کو جو خدا نے ہمیں عطا کی ہیں مکمل طریقہ پر تربیت کریں اور ان سے کام لیں - میں چاہتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کے نوجوان دنیا کے بہترین انسان بنیں اور کام میں، کھیل میں، اخلاق میں، راست بازی میں سب سے بہتر کہلائیں - میں نہیں چاہتا کہ کسی ایسی چیز کو اس یونیورسٹی سے نسبت دی جاے جو مقابلتاً دوسرے درجہ کی ہو، اول درجہ کی نہ ہو"۔

انہوں نے اس بلند نصب العین کو سامنے رکھہ کر کام شروع کیا لیکن ابتدا ہی میں انہیں غیر معمولی انتظامی پیچیدگیوں سے واسطہ پڑا - یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ شایع ہوچکی تھی اس کی وجہ سے یونیورسٹی کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا تھا - اس وقار کو دوبارہ حاصل کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایک فوری کام یہ تھا کہ رپورٹ کی مختلف دوررس سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جاے اور اس ضمن میں علاوہ قانونی اور دفتری تبدیلیوں کے سٹاف میں بھی ضروری ردو بدل کیا جاے - سر راس مسعود نے اس ناگوار اور تکلیف دہ فرض کو نہایت مستقل مزاجی لیکن انسانیت اور

شرافت کے ساتھہ انجام دیا اور یہ خیال رکھا کہ حتی الامکان یونیورسٹی کے کسی ملازم کی آئندہ زندگی اس جدید انتظام کی وجہ سے تباہ نہ ہوجاے - اسی سلسلہ میں یونیورسٹی اور انٹرمیڈیٹ کالج کے الحاق کا مسئلہ در پیش تھا اور اس میں یہ زبردست اندیشہ تھا کہ بہت سے اساتذہ محض اسامیوں کی کمی اور دیگر ذیلی تغیرات کی وجہ سے بے کار ہوجائیں گے - لیکن انہوں نے غیر معمولی توجہ ' محنت اور ہمدردی کے ساتھہ اس معاملے کے شخصی اور انسانی پہلو پر غور کیا اور بڑی حد تک اس مصیبت سے لوگوں کو بچا لیا - اس سلسلے میں جو جدید تقررات عمل میں آے ان میں بھی بالعموم کافی احتیاط اور چھان بین سے کام لیا گیا اور اس میں انہوں نے یہ اصول بھی پیش نظر رکھا کہ مسلم یونیورسٹی ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہے جس کی علمی اور تمدنی فضا کے لیے مختلف اقوام کے اساتذہ کا اجتماع ایک عمدہ شگون ہوگا - اس لیے ان کے زمانے میں کئی غیر مسلم اور غیر ملکی استادوں کا تقرر ہوا اور اس میں بھی انہوں نے یہ خیال رکھا کہ غیر ملکی کے معنی صرف انگریز اساتذہ نہ ہوں بلکہ یورپ کے دوسرے ممالک کے نمائندے بھی یونیورسٹی میں رہیں - اس پالیسی کی حمایت میں تعلیمی اور سیاسی دونوں وجوہ پیش کی جاسکتی ہیں —

ان کے عہد کا غالباً سب سے بڑا کارنامہ سائنس کالج کا قیام ہے جس بلند تخیل ' شاندار عمارات اور ساز و سامان اور علمی تحقیقات کی سہولتیں مدت تک ان کی دور اندیشی اور قوت عمل کی شہادت دیتی رہیں گی - اس وقت تک سائنس کی تعلیم کا انتظام بہت غیر مکمل اور عارضی تھا - اس کے لیے مناسب عمارتیں نہ تھیں - ریسرچ کا آغاز نہ

ہوا تھا - سرمائے کی کمی کی وجہ سے اس طرف پوری توجہ نہ ہو سکی تھی - انہوں نے آتے ہی اپنے پیش رو سر شاہ محمد سلیمان کی شروع کردہ تحریک کو دوبارہ اٹھایا اور یونیورسٹی کی عام تنظیم اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے حکومت ہند سے پندرہ لاکھ اور ریاست حیدر آباد سے دس لاکھ کی گراں قدر رقوم وصول کیں - ان کے آنے سے پیشتر ہی سائنس کالج کی سکیم زیر غور تھی اور اس کی عمارتوں کا ایک نقشہ بھی تیار ہوچکا تھا - انہوں نے اس کو دیکھا اور یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ اس قسم کی اصطبل نما عمارتیں ہندوستان کے مسلمانوں کی مرکزی درسگاہ کے شایان شان نہیں - ان کی نگاہ دوربین نے سائنس کالج کے مستقبل کو دیکھا ' اس کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور اہمیت کو محسوس کیا اور فیاضی کے ساتھ روپیہ صرف کرکے ایک ایسا کالج قائم کیا جو اپنے ساز و ساماں اور ریسرچ کی سہولتوں کے اعتبار سے اس ملک کے بہترین اداروں میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے - لیکن وہ محض عمارتوں اور آلات کی فراہمی پر قانع نہیں رہے بلکہ انہوں نے وہاں علمی تحقیقات کا سلسلہ شروع کرایا - سٹاف میں ایسے اساتذہ کا اضافہ کیا جو اس کی نگرانی کرسکیں ' ان کی ہر طرح ہمت افزائی کی ' ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کا اجرا کیا اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بہت سے وظائف منظور کیے تاکہ یونیورسٹی علوم جدیدہ میں تحقیق و اضافہ کرکے اپنا علمی وقار قائم کرے سنہ ۱۹۳۳ ع کی سالانہ رپورٹ تک میں ' جو لازماً ایک خشک اور ضابطہ کی چیز ہوتی ہے ' ان کی بلند نظری جھلکتی ہے —

- " سائنس کالج پر کافی لاگت آئی ہے لیکن کوشش یہ کی

گئی ھے کہ علیگڈھ میں مسلمان طلبہ کی سائنس کی تعلیم کے
لیے بہترین سامان و آلات اور عمدہ سٹاف مہیا کیا جاے اور
ان کے لیے ایک ایسا تعلیمی ماحول مرتب کیا جاے جس سے
بہتر ھندوستان کی کسی دوسری درسگاہ میں نہ ھو - لیکن
در اصل ھماری کامیابی کا واقعی اندازہ اس بات سے ھوگا کہ
ھمارے طلبہ کس جوش اور خلوص سے ان تعلیمی سہولتوں
سے فائدہ اٹھاتے ھیں ... گزشتہ سال میں ھماری ترقی صرف
ایلمٹ اور چونے تک محدود نہیں رھی بلکہ یونیورسٹی کی
زندگی کے اصلی اور مرکزی پہلو میں بھی نمایاں ھوئی ھے یعنی
آرٹ اور سائنس کے شعبوں میں اساتذہ کی علمی تحقیقات میں "

یہ انھیں کے فیض جاری کی برکت ھے کہ گذشتہ پانچ سال میں یونیورسٹی کے متعدد طلبہ نے ڈاکٹری کی ڈگریاں امتیاز کے ساتھہ حاصل کی ھیں اور علم کی حدود کو وسیع کرنے کے مقدس فرض میں حصہ لیا ھے اور یہ سلسلہ برابر جاری ھے اور انشاءاللہ رھے گا - اسی طرح انھوں نے ٹریننگ کالج کی طرف توجہ کی جو اُس وقت تک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر کی عمارت کے ایک حصے میں تھا جہاں جگہ کی قلت ' ساز و سامان اور اساتذہ کی کمی اور موزوں ماحول کے نہ ھونے کی وجہ سے کام کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں - انھیں اس شعبے کی قومی اور اقتصادی اھمیت کا صحیح اندازہ تھا لہذا حکومت سے جو رقم موصول ھوئی تھی اس میں سے ایک لاکھہ روپیہ انھوں نے اس کی عمارت ' سامان و آلات اور لائبریری پر صرف کیا - اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کیا ' ان کے کام میں سہولتیں پیدا کیں اور ان سب باتوں

کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کا شمار ہندوستان کے بہترین ٹریننگ کالجوں میں ہونے لگا - حکومت نے اس کی ڈگری کو تسلیم کیا - اس کے اساتذہ کو حکومت کے مدارس میں جگہ دی اور اس صوبے کے طلبہ کے لیے وظائف منظور کیے - ان سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس کو بالعموم پبلک کا اعتماد حاصل ہوگیا جو ایک قومی درسگاہ کے لیے نہایت ضروری ہے - اگر کالج کے تمام کاموں میں ان کی گہری دل چسپی اور همت افزائی شامل نہ ہوتی تو آج اس کو تعلیمی حلقوں میں وہ قدر و منزلت حاصل نہ ہوتی جو اس وقت ہے —

ان کے زمانے کا ایک اور بڑا کام آفتاب ہال کا قیام ہے جس میں ہونہار اور نادار طلبہ کے لیے خاص سہولتیں رکھی گئی ہیں اور ان کے ماہوار خرچ میں خاص تخفیف کی گئی ہے - یہ ہوسٹل جو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کی یادگار میں بنایا گیا ہے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور اس کے چند مخلص کارکنوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن ان سب کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس امر کا اعتراف ہے کہ ذاتی اور منصبی حیثیت سے سر راس مسعود نے ہمیشہ اس تحریک کی همت افزائی کی اور کبھی اپنی امداد اور مشورے سے دریغ نہ کیا - اگر ان کا رویہ اس کی طرف سے بے اعتنائی کا ہوتا تو شاید یہ وجود ہی میں نہ آتا - اس کے علاوہ انہوں نے طلبہ کی تربیت جسمانی کی اہمیت کا احساس کرکے ایک جمنازیم کی عمارت بنوائی جس کے لیے اپنے ذاتی اثر اور رسوخ سے روپیہ جمع کیا اور طلبہ کی سہولت کے لیے ایک یونیورسٹی مارکٹ تعمیر کیا جو اب امتداد زمانہ سے ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ کا جزو ہوگیا ہے —

تعلیمی تجاویز کے ضمن میں صرف چند امور کا تذکرہ کرنا کافی ہوگا - انہوں نے جغرافیہ کے یتیم شعبے کی از سر نو تنظیم کی - اس کے لیے مناسب سٹاف مہیا کیا ' ایم اے اور ایم - ایس - سی کی کلاسیں کھولیں جو نہایت مقبول ہوئیں اور ان کی وجہ سے اس شعبہ کی ملک بھر میں شہرت ہوگئی - اسی طرح انہوں نے دیہات کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر بی - ٹی - ایچ کی ڈگری کو قائم کیا اور طلبہ کو اس طرف رغبت دلانے کی غرض سے اس کے لیے نہایت معقول وظائف مقرر کیے - انہیں اردو کی اشاعت اور ترقی سے جو شغف تھا اس کا میں اشارۃً ذکر کرچکا ہوں - علاوہ اس زبردست اخلاقی تائید کے جو ان کی ذاتی دلچسپی اور توجہ کی وجہ سے اردو کو حاصل ہوئی انہوں نے یونیورسٹی کے نصاب میں بھی اس کی حیثیت کو بلند کیا - ایف اے میں اس کو اختیاری مضمون بنایا گیا اور اردو میں بی اے آنرز اور ایم اے کی کلاسیں کھولیں اور اسی طرح یونیورسٹی کی پیشانی سے یہ تکلیف دہ الزام دور ہوا کہ جس درسگاہ کو کبھی اردو کی خدمت میں شرف اولیت حاصل تھا وہ اب جنوبی اور مغربی ہند کی درسگاہوں کے مقابلے میں بھی پس ماندہ رہ گئی ہے!

لیکن اس بارے میں ان کے خیالات اپنے معاصرین سے بہت آگے تھے - ان کا عقیدہ تھا کہ کسی ملک میں صحیح اور مفید تعلیم اس وقت تک نہیں پھیل سکتی جب تک تمام علوم وفنون طلبہ کو ان کی زبان میں نہ پڑھائے جائیں - انہیں یہ بات بہت مضحک معلوم ہوتی تھی کہ تعلیم یافتہ لوگ غیروں کی زبان جاننے پر فخر کریں اور اپنی زبان اور ادب کے سرمائے سے ناواقف اور بے پرواہ ہوں - اس ذہنی غلامی

کی وجہ سے ہندوستان کے تمدن کو جو شدید نقصان پہنچا ہے - وہ ہمیشہ کانٹے کی طرح ان کے دل میں کھٹکتا رہتا ہے اور وہ اپنی ذاتی گفتگو میں اور مختلف انجمنوں اور کانفرسوں کے جلسوں میں اس خیال کو بہت قوت اور قابلیت کے ساتھہ پیش کیا کرتے تھے - ان کی خواہش تھی کہ تعلیم کو جو اس قت اوچھی اور بے روح ہے قومی زندگی اور قومی تمدن کی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جاے اور تمام ضروری علوم کو ملک کی زبانوں میں منتقل کیا جاے تاکہ نہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ ان سے مستفید ہو بلکہ عوام کا ذہنی معیار بھی بلند ہو - وہ علی گڈھ یونیورسٹی میں اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے کچھہ تو اس وجہ سے کہ انہیں کافی مدت اور مہلت نہیں ملی اور کچھہ اس سبب سے کہ گرد و پیش کے حالات سازگار نہ تھے لیکن یہ مقصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا - ہندوستان کے مختلف لسانی علاقوں میں علحدہ علحدہ لسانی یونیورسٹیاں قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے انہوں نے ہی پیش کیا تھا - اس وقت یہ بات بہت بعید از قیاس معلوم ہوتی تھی لیکن :

چند باتیں جو کہ ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سنا صاحب کہ ورد اہل عرفاں ہوگئیں !

چونکہ اس اصول کو ان کے تعلیمی خیالات میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کے اس ایڈریس میں سے چند جملوں کا ترجمہ پیش کروں جو انہوں نے گذشتہ سال سینٹ ہاؤس کلکتہ میں دیا تھا :

" جن لوگوں نے ہمارے نظام تعلیم کو مرتب کیا ہے وہ اس ملک

میں ایک ایسے اصول پر عمل کرنے کے مجرم ہوئے ہیں جس کی زبانی تبلیغ بھی وہ اپنے ملک میں نہیں کر سکتے تھے - انہوں نے اس بدیہی بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ ہر شخص اپنی مادری زبان ہی کو سہولت کے ساتھہ سمجھہ سکتا ہے اور اگر کسی کو بغیر وقت ضائع کیے کوئی علم حاصل کرنا ہے تو اس مقصد کے لیے مادری زبان کا استعمال لازم ہے - یہ ایک عبرت ناک واقعہ ہے کہ تمام دنیا میں ایک ہمارا ہی ملک ایسا ہے - جہاں اس واضح حقیقت کی ماہرین تعلیم تک کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے - ہماری تعلیم کیوں واقعیت سے عاری ہے اور ہماری کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ کیوں نہیں نکلتا ؟ میرے خیال میں اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ ہم نے گذشتہ زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ایک غیر زبان کو بنایا ہے اور وہی غلط طریقہ اب بھی رائج ہے - اس صورت حال کا ایک افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا ہے ہمارے ملک میں جو پہلے ہی سے ذات پات کے بند ھنوں میں جکڑا ہوا ہے ایک اور ذات ان لوگوں کی پیدا ہوگئی ہے جو اپنے ملک کی کسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے اور اس سبب سے وہ اپنی معلومات کو اپنے کروڑوں غیر تعلیم یافتہ ہم وطنوں تک نہیں پہنچا سکتے - اس لیے باوجود ان کے قریب رہنے سہنے کے ان کی جہالت میں کمی نہیں آتی ... اس سبب سے ہماری خانگی زندگی کی تمدنی یک جہتی کو بھی کئی طرح نقصان پہنچا ہے ..معاشرتی اور اقتصادی وجوہ سے ہماری عورتیں اپنی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے غیر زبان سیکھنے کے لیے وقت اور فرصت نہیں نکال سکتیں - اس وجہ سے ایک عجیب و غریب صورت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ خواہ ہماری عورتیں اپنی مادری زبان میں کیسی ہی قابل ہوں

ور ذہنی اعتبار سے کیسی ہی بیدار ہوں ہم ان کو در حقیقت تعلیم یافتہ ہی نہیں سمجھتے - انگریزی زبان سے ناواقفیت گویا ہمارے خیال میں تعلیم سے محروم ہونے کے مترادف ہے ! - دنیا میں اور کوئی ایسا بد نصیب ملک نہیں جہاں کسی غیر زبان کے جاننے والے کو جو خود اپنی زبان پر قدرت نہ رکھتا ہو تعلیم یافتہ کہا جائے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس گھر میں میاں اور بیوی کے ذہنی اور تمدنی نقطۂ نظر میں بعد مشرقین ہوگا وہ ہرگز حقیقی مسرت کی آماجگاہ نہیں بن سکتا... قومی تہذیب میں یہ دوئی بلکہ یہ تصادم جو برابر کار فرما رہتا ہے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً ہمارے گھر نہ انگریزی وضع کے ہوتے ہیں نہ ہندوستانی بلکہ دونوں کی خراب خصوصیات کا ایک مکروہ مرکب ہوتے ہیں - ہر بات میں انگریزوں کی تقلید کرنے کی خواہش' جو نظام تعلیم میں انگریزی زبان کی غیر معمولی اور بے جا اہمیت کی وجہ سے اور مستحکم ہوتی ہے' اس طرح بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم اپنے گھر میں ایک کمرے کو اس طرح سجاتے ہیں جو ہمارے ذہن ناقص میں خاص انگریزی اندازہے اور باقی تمام گھرکی طرف سے بالکل بے پرواہ رہتے ہیں - ہمارے نزدیک نمائش حقیقت سے زیادہ اہم ہے اور زندگی ایک مستقل بہروپ ہے جس میں ہم برابر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریز کی نقل اتارنے میں ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جائیں! یہی حقیقت سے دوری ہمارے مدرسوں کی تعلیم پر بھی مسلط ہے - اگر باہر سے کوئی شخص آکر انہیں دیکھے تو اسے ہمارا طریقہ تعلیم نہایت ہی مہمل معلوم ہوگا - مثلاً وہ یہ دیکھے گا کہ ہندوستانی طلبہ اپنے ملک کی تاریخ ایک ایسی زبان میں سیکھ رہے ہیں جو نہ ان کی زبان ہے

نہ استاد کی! کیا کوئی بات اس سے بھی زیادہ مہمل ہوسکتی ہے ؟ جو تعلیم اس قسم کے مصنوعی اور خلاف فطرت ماحول میں حاصل کی جاے وہ ہرگز قوم کے لیے ایک حیات بخش قوت نہیں بن سکتی' -

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا ایک بہت بڑا فرض یہ رہا ہے کہ وہ اس کی مالی حالت کو مستحکم بناے - اس ضمن میں شاید صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کے چند سالہ عہد میں یونیورسٹی کے سرمایہ مستقل کی مقدار تقریباً دو چند ہوگئی اور علاوہ حکومت ہند اور ریاست حیدرآباد سے بیش قرار عطیوں کو وصول کرنے کے انہوں نے ان کی سالانہ گرانٹ کو بڑھا کر بالترتیب تین لاکھ اور ساٹھ ہزار پر پہنچا دیا جس کی وجہ سے ان مدوں سے یونیورسٹی کی مستقل آمدنی دو چند سے زیادہ ہوگئی - ان کی غیر معمولی کامیابی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ سے سنہ ۱۹۳۱ تک یونیورسٹی کو مختلف عطیوں اور چندوں سے تقریباً بارہ لاکھ روپے وصول ہوے لیکن اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۳۰ ع سے سنہ ۱۹۳۳ ع تک کے زمانے میں مرحوم نے تقریباً ۲۷ لاکھ روپے جمع کئے - اس کے علاوہ کلکتہ کے ایک فیاض اور مخیر تاجر سے چھہ ہزار روپے سال کی بیش قرار رقم دینیات کے وظائف کے لیے حاصل کی اور اپنے وسیع حلقہ احباب سے ہزاروں روپے جمع کرکے ہر سال غریب طلبہ کی امداد پر صرف کئے —

سنہ ۱۹۳۳ ع میں امیر افغانستان نادر شاہ مرحوم نے تعلیمی معاملات میں مشورہ کرنے کے لیے سر راس مسعود' سر محمد اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی کو مدعو کیا اور اس انتخاب سے اپنی غیر معمولی بصیرت اور مردم شناسی کا ثبوت دیا - مرحوم اور ان کے نامور رفقاء نے افغانستان کے تعلیم یافتہ

اور روشن خیال حلقوں پر بہت اچھا اثر ڈالا اور خود بھی شاہ مرحوم اور ان کے بیدار مغز بھائیوں اور وزیروں کی قابلیت سے بہت متاثر ہوکر واپس آے - اس موقع پر امور افغانستان نے اپنی خوشنودی اور احسان مندی کے اظہار کے طور پر یونیورسٹی کے لیے از سر نو تین سو ماہوار کی امداد منظور کی ـ

ان کی اس تمام تعلیمی اور انتظامی جد و جہد اور حکومت اور پبلک سے تعلقات پیدا کرنے کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی کی ڈگریوں اور اس کی تعلیم کی قدر و قیمت لوگوں کی نظر میں کہیں زیادہ ہوگئی اور اس درسگاہ سے جو بلند توقعات ایک زمانہ میں وابستہ تھیں ان میں دوبارہ جان پڑ گئی اور یونیورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ امید پیدا ہوگئی کہ اگر فلک نے مہلت دی تو رفتہ رفتہ اس درسگاہ کو قوم کی ذہنی اور تمدنی زندگی میں وہ قیادت حاصل ہوجاے گی جو اس کے قیام کی اصلی غرض ہے - لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور اچانک نہ وہ ساقی رہا نہ بزم میں وہ رونق اور جوش و خروش !

یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت کو بہتر بنانے کے متعلق اور بہت سی تجاویز اُن کے پیش نظر تھیں اور جب کبھی وہ مکروہات سے ذرا فرصت پاتے تو اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کے حلقہ میں بیٹھ کر یونیورسٹی کے اس عظیم الشان تصور اور نصب العین پر گفتگو کیا کرتے تھے جو ان کے خوابوں کی دنیا میں بسا ہوا تھا اور کبھی کبھی :

صد جہاں می روید از کشت خیال ما چو گل یک جہان و آں ہم از خون تمنا ساختی !

کا نوحہ پڑھا کرتے تھے ـ ان کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کا قومی

زندگی سے زیادہ قریبی تعلق ہے - اس کے ذریعہ سے عوام میں علوم و فنون پھیلیں اور ان کا معیار تہذیب و تمدن بلند ہو۔ ان کے ذہن میں ایک ایسی اکیڈمی کا خاکہ تھا جس میں ذہین اور علم دوست لوگ معاش کی فکر سے آزاد ہوکر تصنیف و تالیف کریں اور اس ذریعہ سے نہ صرف اپنے قدیم علوم کا تحفظ کیا جائے اور انہیں موجودہ زمانے کی 'زبان' میں اور اس کے طرز خیال کے مطابق پیش کیا جائے بلکہ مغربی علوم و فنون کو اپنا بنا لیا جائے۔ وہ ترجمہ کی نسبت اس "اپنانے" کی تحریک کو زیادہ اہم سمجھتے تھے - وہ چاہتے تھے کہ ملک کے بڑے بڑے علمی مشاہیر اپنی زندگی کا کچھہ حصہ علی گڈھ میں بسر کریں تاکہ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو ان کے فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملے - وہ اس بات کی شدید آرزو رکھتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مخصوص تمدنی ورثے کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے اور ان کے جو قابل قدر عناصر ہیں ان کو بے تعصبی اور خوش اسلوبی کے ساتھہ ملک کے سامنے پیش کرکے ہندو مسلم اتحاد کی پائدار بنیاد بنایا جائے - اس وجہ سے ان کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ قابل اور سمجھہ دار ہندو طلبہ کو ہندوستان کی اسلامی تہذیب کا مطالعہ کرنے کے لیے وظائف دیے جائیں - ان کے دماغ میں کتابوں کی اشاعت کا ایک خواب تھا کہ اردو کے تمام مستند مصنفین کی اہم تصانیف کا ایک یکساں اڈیشن نفاست' خوش مذاقی اور صحت کے ساتھہ چھاپا جائے تاکہ ظرف مظروف کے شایان شان ہو - ان کی آرزو تھی ... مگر ان آرزؤں کو کہاں تک گناؤں ؟ وہ بہت کچھہ کرگئے' اس سے کہیں زیادہ اور کرنا چاہتے تھے اور اگر عمر مہلت دیتی تو کرتے - لیکن اب تو ان کا

کام اور ان کی نیک نامی رہ گئی ہے یا ان کی یاد اور محبت کی کسک جو ہمیشہ ان کے دوستوں اور قدر دانوں کو بے چین رکھے گی۔

میں نے کئی سال ہوے "تہذیب" اور "انسانیت" کی ایک نہایت دل کش اور مکمل تعریف "حالی" کے "مرثیہ غالب" سے نکالی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں کیسے آ سکتا تھا کہ بہت جلد ایک ایسے محترم دوست کا صدمہ اٹھانا پڑے گا جو اپنی سیرت اور صفات کے اعتبار سے اس تعریف کا بہترین مصداق ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس مضمون کے خاتمہ پر اس مرثیہ میں سے چند اشعار نقل کردوں۔ جن لوگوں کو سر راس مسعود مرحوم سے واسطہ رہا ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ شعر کس قدر برجستگی کے ساتھ ان کی بعض مخصوص صفات کی یاد دلاتے ہیں!

بلبل ہند مر گیا ہیہات جس کی تھی بات بات میں اِک بات
نکتہ دار ، نکتہ سنج ، نکتہ شناس پاک دل ، پاک ذات ، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند ، اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا!

خاکساروں سے خاکساری تھی سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

غزل

از

(جناب سید هاشمی فریدآبادی صاحب)

[سید راس مسعود مرحوم نے ایک بار کمال محبت و قدر افزائی سے فرمایش کی کہ ان کا ایک خیال نظم کر دیا جاے - راقم الحروف نے اس موقع پر ذیل کی غزل تیار کی تھی جو اب مرحوم کی یادگاروں میں شامل ھے - فقط-

راقم سید هاشمی فریدآبادی]

۱ - ھے جمال، بے پایاں - ظرف شوق کا کم ھے
جرأت نظارہ سے آہ محض شبنم ھے

۲ - بحر صاف و ھموارہ زندگی کا تھا طالب :
حاصل طلب لیکن موج ھے، سو پرخم ھے

۳ - چشم مست ساقی کے فیض سے نگاھوں میں
بوند بوند پانی کی بادۂ معظم ھے

۴ - صرف جس قدر کیجے، ھے فزوں سے افزوں تر
عاشقی کا سرمایہ معجزے میں زمزم ھے

۵ - ھاشمی ملے کیونکر ساز اس مغنی سے
جس کا نغمۂ صد رنگ ایک راگ میں ضم ھے

مسعود مرحوم کی زندہ دلی

از

(ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

سر سید مرحوم کے خطوں اور مضمونوں میں خواجہ میر درد کا یہ شعر جا بجا نظر آتا ہے :

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوبت انسانی کا یہ عارف زندہ دلی کو اصل زندگی سمجھتا تھا - کہا جاتا ہے کہ سر سید اور ان کے ساتھیوں میں زندہ دلی کی صفت بدرجۂ کمال موجود تھی اور اسی کی بدولت وہ اس عام افسردگی اور مایوسی سے محفوظ رہے جو ان کے زمانے میں سارے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی - ہمارے قرن میں اس صفت کا جیتا جاگتا نمونہ مسعود مرحوم کی ذات تھی جسے تین مہینے ہوئے موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا —

پستی کے دور کی یہ خصوصیت ہے کہ بلند الفاظ کا مفہوم بھی پست ہو جاتا ہے چنانچہ زندہ دلی کا لفظ ہمارے یہاں بہت سطحی معنی میں استعمال ہونے لگا ہے آج کل عرف عام میں زندہ دل اس

شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں عیش و عشرت کی نئی نئی لہریں اٹھتی ہیں جس کے دماغ کو تفریح اور تفنن کی نئی نئی ترکیبیں سوجھتی ہیں جس کی زندگی کا اصول یہ ہے کہ طرح طرح کی لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے، یار دوستوں کی صحبتوں میں ہنستا ہنساتا رہے، اور فکر و تردد کو پاس نہ پھٹکنے دے - گویا زندہ دلی لاؤ بالی پن، تفریح پسندی یارباشی اور بے فکری کا نام ہے —

مگر حقیقت میں زندہ دلی کا مفہوم، جس کی طرف خواجہ میر درد کے شعر میں اشارہ ہے اس سے کہیں زیادہ بلند ہے - سچ پوچھئے تو یہ لفظ تہذیب و شائستگی کی بنیادی صفات پر حاوی ہے - ذکاوت حس، وسعت ذوق، احساس تناسب یا ظرافت، انس و ہمدردی، اثر آفرینی اور جاذبیت وہ اخلاقی اور ذہنی عناصر ہیں جن کی ترکیب سے حقیقی زندہ دلی وجود میں آتی ہے —

مسعود مرحوم میں زندہ دلی کی یہ صفات کس حد تک موجود تھیں - یہی اس مختصر مضمون میں دکھانا مقصود ہے —

مجھے مرحوم کی زندگی کا صرف آخری دور دیکھنے کا موقع ملا جو علی گڈھ اور بھوپال میں گذرا - پہلی ملاقات ان سے ۲۰ اکتوبر سنہ ۲۹ ع کو دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی جب وہ مولوی عبدالحق صاحب اور مولوی محی الدین صاحب کی رفاقت میں حیدرآباد سے آئے تھے اور مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا جائزہ لینے کے لیے علی گڈھ جا رہے تھے - مولوی عبدالحق صاحب کے اصرار سے میں بھی اس پارٹی کے ساتھ ہو لیا - راس مسعود کی کیفیت اس وقت اس مسافر کی سی تھی جو مدتوں عالم غربت میں زندگی بسر کرنے کے بعد وطن کو واپس

جا رہا ہو - جذبۂ بے اختیار شوق نے ان پر وارفتگی کا عالم طاری کردیا تھا - پچیس تیس سال پہلے کا علی گڈھ ان کی نظروں میں پھر رہا تھا - حافظہ اور تخیل محبت کے فیضان سے مصوری کا کمال دکھا رہا تھا - ایک ایک شخص ایک ایک چیز کا ذکر اس وضاحت سے کر رہے تھے گویا زمانے کے پردے اٹھ گئے ہیں اور ماضی حال بن کر آنکھوں کے سامنے آگیا ہے - پھر نہ معلوم کیونکر گفتگو کا رخ بدل گیا - بادۂ شبینہ کا نشہ کافور ہوگیا ' صہبے حقیقت کا خمار باقی رہ گیا - لیکن اس خمار میں بھی سرخوشی اور سر مستی کا زور شور تھا - ایک جوش و خروش کے عالم میں وہ اپنا اعلیٰ تعلیم کا نصب العین ' مسلم یونیورسٹی کی موجودہ مشکلات اور ان کے حل کرنے کی تدابیر بیان کر رہے تھے - میں سمجھ رہا تھا کہ شاید اس شخص نے عمر بھر تعلیمی مسائل پر غور کیا ہے ' یہی خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں - ان کے سوا کسی اور خیال کی گنجائش ہی نہیں ہے —

مگر بعد کی ملاقاتوں نے اس پہلے تاثر کی اصلاح کردی - معلوم ہوا کہ یہ ماہر تعلیم اور مدبر تعلیم ایک جید ادیب اور نکتہ سنج نقاد بھی ہے ' شعر و سخن کا ' حسن شناس ' آرٹ کا مبصر ' جسمانی تربیت اور ورزشی کھیلوں کا شائق بھی ' قدیم تمدن کے بہترین عناصر کا وکیل بھی ہے ' اصلاح معاشرت اور تجدید تہذیب کا حامی بھی —

ادب اور شاعری میں مرحوم جو پاکیزہ ذوق اور وسیع نظر رکھتے تھے وہ میں نے بہت کم لوگوں میں پائی - اردو ادب میں اہل زبان کی شان سے ' فارسی ' انگریزی ' فرانسیسی ادب میں زبان داں کی

حیثیت سے' اور دوسری زبانوں کے ادب میں ترجموں کے ذریعہ سے انہیں اتنا دخل تھا کہ اختلافات صورت کے حجاب کو دور کرکے وہ اُس روح معنی کا مشاہدہ کرسکتے تھے جو ادب عالم میں جلوہ گر ہے - ان کا معیار تنقید بہت بلند تھا اس لیے کہ ان کی نظر سطحی اور مقامی قدروں پر نہیں بلکہ بنیادی اور عالم گیر قدروں پر رہا کرتی تھی - مطالعے کا شوق اس قدر تھا کہ انتہائی مصروفیت کے زمانے میں بھی اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے - معلوم ہوتا تھا کہ اس روحانی غذا کے بغیر اُن کی زندگی محال ہے - ہندوستان اور یورپ کی تازہ ترین تصانیف برابر پہنچتی رہتی تھیں - احباب کو اچھی کتابیں تحفے کے طور پر دینا ان کا خاص معمول تھا - شاید ہی ان کا کوئی دوست ہو جس کے پاس ان کی محبت کی یہ یادگاریں موجود نہ ہوں —

اردو ' فارسی ' انگریزی کے چوٹی کے شعرا کا منتخب کلام مرحوم کو بہ کثرت یاد تھا اور بڑے شوق سے سنایا کرتے تھے - شعر پڑھتے وقت ان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی - روح کا اہتزاز آنکھوں سے جھلکتا تھا - اثر میں ڈوبی ہوئی آواز سننے والوں کے دل میں اتر کر انہیں مسحور کردیتی تھی - پھر جب شعر کی تفسیر و تنقید پر آتے تھے تو خوش بیانی کا دریا بہا دیتے تھے - نقادی کے باریک نکتے جو دوسروں کے بیان میں خشک علمی مسائل معلوم ہوتے ہیں اُن کی زبان سے دلچسپ لطائف بن کر نکلتے تھے —

آرٹ کے دوسرے شعبوں سے مرحوم کو جو لگاؤ تھا وہ میری دیکھی ہوئی نہیں بلکہ سنی ہوئی بات ہے - ان کا ' بھوپال ' اور ' علی گڈھ ' کا زمانہ جس سے مجھے واقفیت ہے ایسے ماحول میں بسر ہوا جہاں اس

ذوق کی تسکین کا کوئی سامان اور اُس کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا۔ مگر اُن کے پرانے دوستوں سے سنا ہے کہ جیسا ستھرا اور پاکیزہ مذاق ان کا شعر و ادب میں تھا ویسا ہی اور فنون لطیفہ میں بھی تھا خصوصاً موسیقی اُن کی دلچسپی کا خاص موضوع تھی ۔ قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ مغرب و مشرق کے گلشن تہذیب کا یہ گلچیں اپنے دامن میں سبھی رنگ کے پھول رکھتا ہوگا —

قدیم یونانیوں کے یہاں آرٹ اور ادب کے ساتھ جسمانی تربیت بھی تہذیب نفس کا ایک اہم جز سمجھی جاتی تھی اور یورپ میں آج بھی ایک حد تک سمجھی جاتی ہے ۔ لیکن اس "جسمانیت" سے ہم ہندوستانیوں کی "روحانیت" ابھی تک مانوس نہیں ہوئی ہے ۔ بچوں اور نوجوانوں کے لیے تو ورزشی کھیلوں کی ضرورت تھوڑی بہت تسلیم کی جاتی ہے مگر بزرگوں کی شان ان لغویات سے کہیں بالا تر ہے ۔' راس مسعود' ان بزرگوں میں سے نہ تھے ۔ ان کو جو شغف ورزشی کھیلوں سے طالب علمی میں تھا (آکسفورڈ کی تعلیم کے زمانے میں وہ چوٹی کے "اسپورٹس مین" سمجھے جاتے تھے) وہ آخر تک باقی رہا ۔ 'علی گڈھ' آنے سے پہلے انہوں نے اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے خود کھیلنا چھوڑ دیا تھا صرف کبھی کبھی ٹینس میں شریک ہو جایا کرتے تھے ۔ لیکن کھیلوں سے ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جب کبھی یونیورسٹی میں کوئی بڑا میچ ہوتا ہوتا تھا تو سو کام چھوڑ کر دیکھنے کے لیے پہنچ جاتے تھے اور اپنے جوش اور انہماک سے کھیلنے والوں کا دل بڑھاتے تھے ۔ ان کی ہمت افزائی نے علی گڈھ کے کھلاڑیوں کی پرانی روایات کو جو برسوں سے مردہ ہو چکی تھیں دوبارہ زندہ کر دیا —

راس مسعود کی تعلیم و تربیت زیادہ تر 'انگلستان' میں ہوئی اور ان کی عمر کا وہ حصہ جس میں ذہن اور سیرت کی تشکیل ہوتی ہے انگریزوں کی صحبت میں گزرا - لیکن ان کی طبع سلیم نے بیرونی تمدن کا اثر ایک مناسب حد سے زیادہ قبول نہیں کیا - ان کی شخصیت کی تصویر میں مشرق اور مغرب کے رنگ ایک دوسرے میں کھپ گئے تھے مگر زمین خالص مشرقی تھی - مروت، صلۂ رحم، مہماں نوازی، سیر چشمی، وضع داری، رکھ رکھاؤ جو ہندوستان کے مسلمان شرفا کی قدیم صفات ہیں ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں - مغربی تہذیب کے اچھے اور کھرے عناصر کو انہوں نے غیر محسوس طور پر جذب کر لیا تھا لیکن اس کے سطحی پہلو کی تقلید سے جو تکلف اور تصنع ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو جاتا ہے اُس سے ان کا دامن بالکل پاک تھا - انہیں اپنی ہندوستانیت پر فخر تھا اور ہر موقع پر اس کا اظہار کرتے تھے - انگریزوں اور انگریز نما ہندوستانیوں کی صحبت میں "اتیکیٹ" کے رسوم و قیود کو عمداً توڑنے میں انہیں خاص لطف آتا تھا اور ایسے موقعوں پر ان حضرات کی برہمی اور بدحواسی اور مرحوم کو سکون و اطمینان اور اظہار معصومیت دیکھنے کے قابل ہوتا تھا - مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی خرابیوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے - اپنی قوم کے تعصب، تنگ دلی، اور تاریک خیالی کا نکتہ چیں اُن سے بڑھ کر کوئی نہ ہوگا - ہندوستانی خصوصاً مسلمان عورتوں کے حال زار، ان کی جہالت، بے مائگی اور بے بسی پر جس میں اسلام کو بدنام کرنے والے مردوں نے انہیں مبتلا کر رکھا ہے ان کا دل ہمیشہ کُڑھا کرتا تھا اور جب کبھی اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو غم و غصہ سے بے تاب ہو جاتے

تھے - لڑکیوں کی موجودہ تعلیم ' جو انہیں مغربی سوسائٹی کی رنگین تیتریوں کا سستا نمونہ بنا دیتی ہے مرحوم کو بالکل پسند نہ تھی اور اس کی مذمت میں وہ ہندوستان کے قدامت پسندوں کے ہم زبان تھے مگر ان کی صحیح اور مکمل تعلیم و تربیت کی حمایت میں یورپ کے آزاد خیالوں سے بھی دو قدم آگے تھے —

غرض ہنگامۂ زندگی کی کوئی تحریک ' فضاے دھر کی کوئی ہوا ایسی نہ تھی جو ان کے ساز دل کے تاروں کو پوری قوت سے نہ چھیڑتی ہو ' انسانی تمدن کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو ان کے ذہن کو شدت سے متاثر نہ کرتا ہو - یہی ذکاوت احساس اور وسعت ذوق سچی زندہ دلی کی بنیاد ہے —

حساس طبیعت اور وسیع ذوق کو اگر بے روک ٹوک چھوڑ دیا جائے تو انسان کا ذہن ڈانواں ڈول ہوکر رہ جاتا ہے اور اس میں ضبط و توازن باقی نہیں رہتا - اس کی روک احساس تناسب سے ہوتی ہے جسے ظرافت بھی کہتے ہیں - ظرافت اور مسخرے پن میں یہ فرق ہے کہ ظریف ہر غیر متناسب چیز سے ' ہر قسم کے بے تکے پن اور بھونڈے پن سے فوراً کھٹک جاتا ہے اور اس کی ہنسی اڑاتا ہے اور مسخرا جان بوجھہ کر بے تکی اور بھونڈی حرکتیں کرتا ہے اور دوسروں کو اپنے اوپر ہنسواتا ہے - ظرافت کے لیے علاوہ ذہانت کے ذہنی آزادی اور ہمت کی بھی ضرورت ہے یہ ایک خداداد نعمت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے - مسعود مرحوم کو اس نعمت سے بہرۂ وافر عطا ہوا تھا - فضیلت مآبوں کا اظہار قابلیت ' مدعیان زہد و اتقا کی ریاکاری ' جاہ پرستوں کی خود نمائی اور بادفروشی غرض ساز زندگی کا ہر خارج از آہنگ نغمہ ان کی طبع سلیم پر گراں گزرتا تھا اور

وہ اس کی پردہ دری کیے بغیر نہ رہتے تھے - بننے والوں کو بنانے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا اور اس کام کو اس نزاکت اور لطافت سے انجام دیتے تھے کہ اکثر اس غریب کو جو ان کی ستم ظریفی کا نشانہ ہوتا تھا، یہ پتہ ھی نہ چلتا تھا کہ اس پر مشق ستم کی جا رھی ھے - البتہ کبھی کبھی دوسرے شریک بزم، جن کا ظرف ظرافت اس پیمانے پر نہ تھا، بھک اٹھتے تھے اور ان کے قہقہے راز پنہاں کو آشکار کر دیتے تھے - ظریفانہ مبالغے کو مرحوم نے آرٹ کی حد تک پہنچا دیا تھا - ایک معمولی سے واقعے کو اس اھتمام سے بیان کرتے تھے اور شوخی تخیل سے ایسے ایسے جوڑ لگاتے تھے کہ ان کی گفتگو میں مارک ٹوئین کے ناولوں کا لطف آجاتا تھا - ان خوش وقتیوں کی یاد اُن کے دوستوں اور قدردانوں کے دل پر تیر کی طرح لگتی ھے —

مرحوم کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا اور اس میں ھر ملک و قوم اور ھر مذھب و ملت کے لوگ شامل تھے - 'ھندوستان' کے علاوہ 'انگلستان' 'فرانس' 'جرمنی' 'ترکی' اور 'جاپان' میں کثرت سے ایسے لوگ موجود ھیں جو اُن کے سچے دوستوں میں شمار کیے جا سکتے ھیں - جس سے جیسے تعلقات تھے انہیں وہ عمر بھر نبھاتے رھے - اپنے بزرگوں کے دوستوں کو وہ اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور ان کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے - برابر والوں سے بے تکلفانہ خلوص اور چھوٹوں سے مربیانہ شفقت سے پیش آتے تھے - اُن کی دوستی محض یار باشی نہ تھی کہ دو گھڑی مل بیٹھے، اور ھنسے بولے تک محدود ھوتی - اس کی بنیاد انس و ھمدردی کے گہرے جذبات پر قائم تھی - دوست کے رنج و راحت میں دل سے شریک ھوتے تھے، اس کی فلاح کو اپنی فلاح اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھتے تھے - دوستوں ھی پر موقوف نہیں جو کوئی بھی ان

کے پاس چلا آئے اس کی ہمدردی اور مدد میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ غمزدوں کی داستان درد سن کر تڑپ اٹھتے تھے اور ان کے دکھہ کے دور کرنے میں، جہاں تک اُن کی طاقت میں تھا، داہے، درمے، قدمے، قلمے، سخنے سعی کرتے تھے۔ خصوصاً طالب علموں کے لیے اُن کے گھر کا دروازہ اور ان کے دل کا دروازہ ہمیشہ کُھلا رہتا تھا۔ کوئی شمار نہیں ان لوگوں کا جن کی مرحوم نے درماندگی میں دستگیری کی، دردمندی میں چارہ سازی کی، جن کی بگڑی ہوئی زندگی کو اپنی توجہ سے بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کی فیض رسانی کے وسائل محدود تھے۔ ہر شخص کی حاجت روائی ان کے امکان میں نہ تھی۔ لیکن ان کی دل سوزی اور ہمت افزائی کی کوئی حد نہ تھی۔ اگر کوئی باوجود ان کی انتہائی کوشش کے، ان کی عملی امداد سے محروم بھی رہ جائے، تو بھی ان کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا بلکہ امید، عزم اور اعتماد نفس کی دولت سے مالا مال ہوکر —

یہ تقویت اور ہمت افزائی اُس اثر آفرینی کا ایک پہلو ہے جو ان کی زندہ دلی کا سب سے اہم عنصر تھی۔ زندگی کی جو حرارت ان کے سینے میں تھی اس سے افسردہ دلوں کو گرما دیتے تھے، راکھہ کے ڈھیروں میں آگ لگا دیتے تھے۔ جس وقت وہ علی گڈھ میں وائس چانسلر ہوکر آئے مسلم یونیورسٹی ایک شہر خموشاں معلوم ہوتی تھی۔ ان کے آتے ہی درس و تدریس میں، علمی اور ادبی انجمنوں میں، معاشرتی صحبتوں میں، ورزشی کھیلوں میں غرض طلبہ اور اساتذہ کی زندگی کے ہر شعبے میں جان پڑگئی اور ہر طرف ہنگامۂ حیات برپا ہوگیا۔ کمال یہ ہے کہ بھوپال جیسے اُونگھتے ہوئے شہر میں جس کی نیم خوابی اگر کبھی ٹوٹتی بھی

تھی تو اہل شہر کی سطحی اور کھوکھلی سیاسی تحریکوں سے 'مرحوم کے دم سے ذہنی بیداری اور علمی اور ادبی سرگرمی کے آثار نظر آنے لگے تھے —

غرض زندہ دلی کی اکثر صفات جو ایک اثر پذیر اور اثر آفریں شخصیت کے بنانے میں اجزائے ترکیبی کا کام دیتی ہیں' اس کی ذات میں موجود تھیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک صفت جو اس شخصیت کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے' ان میں نہیں تھی یا یوں کہنا چاہئیے کہ باقی نہیں رہی تھی - وہ چیز جو فرد کی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرکے ان کی کامل نشو و نما میں مدد دیتی ہے اور انہیں حیات قومی کے لیے پوری طرح کار آمد بناتی ہے' رجائیت ہے - اور یہ انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے سامنے نہ صرف اپنی انفرادی زندگی کا بلکہ اپنی قوم کی اجتماعی زندگی کا بھی 'ایک مکمل نصب العین موجود ہو اور وہ اس پر دل سے عقیدہ رکھتا ہو - یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اس چیز سے واقعات و حالات نے راس مسعود کو محروم کر دیا تھا - جس زمانے میں مرحوم عملی زندگی میں داخل ہوئے 'مسلمان بے اصولی اور بے عملی کے بڑے خطرناک دور سے گذر رہے تھے جو اب تک ختم نہیں ہوا ہے' سر سید اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم کے مستقبل کا جو نقشہ بنایا تھا اسے زمانے کے انقلاب نے بگاڑ دیا تھا - ان بزرگوں کو امید تھی کہ مسلمانوں کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ سلطنت برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بہترین سے فائدہ اٹھائے گا اور مذہب اسلام کی بنیاد پر ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی کرے گا - مگر نصف صدی کے تجربے نے

اس امید کو ہر طرح غلط ثابت کر دیا - برادران وطن نے تو مغربی تہذیب کے گہرے اور حیات بخش اثرات کو جذب کر لیا اور ان سے متاثر ہوکر قومیت اور آزادی کی تحریک شروع کی جو اوپر سے نیچے تک ہر طبقے میں نفوذ کر گئی ' مگر مسلمان مغربیت کے صرف ظاہری اور سطحی پہلو پر قانع رہے - ان کا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ جمہور مسلمین سے بے تعلق ہوگیا اور اس کی اجتماعی زندگی کا درخت جڑ سے الگ ہوکر خشک ہونے لگا - ادھر سلطنت برطانیہ کا سایۂ عاطفت جو نئی ایشیائی تحریک آزادی کی چڑھتی ہوئی دھوپ کی تاب نہیں لاسکتا تھا - رفتہ رفتہ پیچھے ہٹنے لگا اور اس کا رخ ان کی طرف سے پلٹ گیا -

جہاں تک مجھے معلوم ہے مسعود مرحوم کے پیش نظر ابتدا میں وہی نصف صدی پہلے کا نصب العین تھا - ان کی زندگی کا جو حصہ سرکار برطانیہ اور دولت آصفیہ کی ملازمت میں گزرا اُس میں وہ ہندوستان کی سیاست سے ' جو نیا چولا بدل رہی تھی ' بالکل الگ رہے اور خالص علمی اور تعلیمی مشاغل میں زندگی بسر کرتے رہے - جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر ' علی گڈھ ' آے تو انھیں پہلے پہل اُس سیاسی طوفان سے ' جو بحر مواج کی طرح اُمڈ رہا تھا اور جس سے مسلمانوں کا یہ تعلیمی قلعہ بھی طرح طرح کی پشتہ بندیوں کے باوجود پوری طرح محفوظ نہ تھا سابقہ پڑا - وہ اپنے ساتھہ سر سید کی روایات لےکر آے تھے جن کا اصل اصول یہ تھا کہ اپنی خودداری اور وقار کو قائم رکھتے ہوے حکومت وقت سے اتحاد عمل کیا جاے - لیکن یہاں پہنچ کر ان پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یاران طریقت نے عجز و نیاز

اور تملق کا طریقہ اختیار کر رکھا ھے - انہوں نے اس رنگ کو بدلنا چاہا لیکن اس میں انہیں ایک طرف سرکار اور دوسری طرف سرکار پرستوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا - یہی وہ وقت تھا جب ان کی آنکھوں سے پردے ھٹ گئے اور وہ نصب العین جو اب تک ان کے سامنے تھا محض فریب نظر ثابت ھوا - ان کی رقابتوں ' سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو ' جن میں وہ چاروں طرف سے گھرے ھوئے تھے ' ان کی حساس طبیعت برداشت اور آخر تنگ آکر انہوں نے علی گڈھ کی ھنگامہ خیز زندگی کو خیر باد کہی اور بھوپال کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ھوگئے —

قومی زندگی کے اس مختصر تجربے نے انہیں مسلمانوں کے مستقبل کی طرف سے مایوس کردیا تھا - ان کی فطری رجائیت ماحول کی ناگوار حقیقتوں سے ٹکراکر پاش ھوگئی تھی اور اس کی جگہ گہری قنوطیت نے لے لی تھی —

لیکن ان کی سیرت کا ارتقا ابھی ختم نہیں ھوا تھا - لوگ انہیں برابر قومی زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رھے تھے - وہ بظاھر انکار کرتے تھے لیکن ان کا دل ادھر کھنچ رھا تھا - کون کہہ سکتا ھے کہ اگر وہ ایک بار بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر اپنی کشتی اس دریائے بے پایاں ' اس طوفان موج افزا میں ڈال دیتے ' ایک مدت تک موجوں کے جھکولے کھاتے ' تند و تیز ھواؤں کے تھپیڑے سہتے تو ایک دن ساحل مراد تک نہ پہنچ جاتے —

اک عمر چاھیے کہ گوارا ھو نیش عشق

افسوس یہ عمر انہیں نصیب نہ ھوئی اور ان کا قطرۂ حیات

گوہر یگانہ بننے سے پہلے نہنگ اجل کا طعمہ بن گیا —

کاش زندہ دلی کی یہ تصویر جو میں نے ان صفحات میں پیش کی ہے مکمل ہو جاتی - شاید اسی سے مسلمانوں کی قومی زندگی کا نقشہ بدل جاتا :

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

قطعہ

از

(جناب نواب مفتی ضیاء یار جنگ بہادر
سابق رکن عدالت العالیہ حیدرآباد دکن)

گشت آخر زما جدا مسعود
دیگر آوریم از کجا مسعود
چون نہ بخشد خدائے عصیانش
بود از آل مصطفیٰ مسعود

مرثیہ سر سید راس مسعود مرحوم

از

(جناب جلیل قدوائی صاحب، ایم - اے)

پوچھے نہ کوئی مجھ سے مرا حال خدا را   غم دل پہ ہے ایسا کہ بیاں کا نہیں یارا
کس طرح سے اس غم کا ہو اظہار کہ جس سے   آنکھیں ہیں مری اشک فشاں، دل ہے تو پارا
وہ شمع جو رونق دہ محفل تھی ہوئی گل   ٹوٹا وہ، جو تھا علم کے گردوں کا ستارا
تھی 'سید' و 'محمود' کی باقی جو نشانی   اور قوم کا لے دے کے جو تھا ایک سہارا
نیرنگیء تقدیر نے اس کو بھی نہ چھوڑا   اس کو بھی ہوا کوچ کا دنیا سے اشارا
موجوں کے تلاطم میں ہوا غرق کھویا   کشتی ہے سو ٹوٹی ہوئی اور دور کنارا

"ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی" مسعود   وہ کون تھا؟ وہ قوم کی تھا آنکھ کا تارا
لَو قوم کے بہبود کی تھی اس کے جگر میں   اور قلب میں تھا جذبۂ خدمت کا شرارا
وہ علم و ہنر، فکر و نظر، صدق و صفا کا   دریا تھا کہ ملتا ھی نہ تھا اس کا کنارا
اس کی دم تقریر وہ گرمی، وہ روانی   وہ حرف و حکایات کا بہتا ہوا دھارا
ملنے پہ وہ احباب سے اخلاص و مروت   وہ لطف و محبت وہ تلطف وہ مدارا
کچھ اس سے ابھی اہل وطن فیض اُٹھاتے   اے پیر فلک! یہ نہ ہوا تجھ کو گوارا

اے مادر علمی! ہے تجھے یاد کہ تیری بگڑی ہوئی تقدیر کو تھا کس نے سدھارا؟
قوت تھی نہ ہاتھوں میں نہ قدموں میں سکت تھی کس نے تجھے اس دم تھا دیا آ کے سہارا؟
تھے حوصلے ٹوٹے ہوئے اور پست ارادے تھا کس نے ترے جذبۂ ہمت کو اُبھارا؟
'مسعود' تھا' اسوقت تجھے جس نے سنبھالا مسعود سے تھی تجھ میں پڑی جان دوبارا
پھر شومی قسمت سے جدا تجھ سے ہوا وہ تھا پھر بھی مگر تجھ کو بڑا اس کا سہارا
لے آج ہمیشہ کو جدا ہوگیا تجھ سے اے مادر علمی! وہ ترا راج دلارا

روتے ہیں تری موت پہ سب اپنے پرائے اپنوں کا چہیتا تھا تو غیروں کا تھا پیارا
پنجاب ہو، دکن ہو، کہ علیگڑھ ہو، کہ بھوپال، فریاد کناں غم میں ترے ملک ہے سارا
مرنا ترا مرنا نہیں اے سید عالی! سچ یہ ہے تری موت نے اک قوم کو مارا
جس قوم میں گنتی کے ہوں مردان خرد آگاہ کیونکر وہ کرے موت بھلا تیری گوارا
مرنے سے ترے مفلس و نادار ہوئی قوم دنیا میں نہیں اور کوئی اس کا سہارا

خاموش ہو دل! کس لیے دیوانہ ہوا ہے؟ اس غم کی کہانی کو نہ دے طول خدارا
روتے ہیں سبھی غم میں پر اتنا نہیں روتے جو سر پہ پڑے دھر میں، کرتے ہیں گوارا
جز صبر کے اس غم کا نہیں کوئی مداوا جز ضبط کے کچھ اور نہیں درد کا چارا

بس اب تہ دل سے یہ دعا ہے کہ "خدایا
جنت میں جگہ پائے مسافر یہ ہمارا!"

سر سید راس مسعود

الملخاطب بہ

نواب مسعود جنگ بہادر

از

(مولوی غلام یزدانی صاحب ایم - اے ' او - بی - ای
ناظم آثار قدیمہ مالک محروسہ سرکار عالی)

ہندوستان کے شریف مسلمان گھرانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں سر سید مرحوم اور ان کے لائق فرزند جسٹس محمود اور ہونہار پوتے راس مسعود کی غیر معمولی قابلیت ' ذہانت ' ظرافت ' قومی درد ' اور ایثار کے چرچے نہ رہتے ہوں - سید مرحوم تو سر بیچے مشہور تھے - شاید اس کی ابتدا 'سر' کے خطاب سے شروع ہوئی ہو جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے لیے ایک نئی خصوصیت تھی - عام لوگ تو یہ سمجھتے تھے کہ انگریز سر سید کے دماغ کا امتحان کرنا چاہتے تھے تاکہ معلوم ہو اس کی ساخت میں کیا چیز تھی جس نے ان کو ایسا ذہین اور قابل بنادیا تھا - یہ بھی مشہور تھا کہ انگریز ڈاکٹروں سے یہ تعہد سال بہ سال ہوتا تھا - اور جو رقم وصول ہوتی تھی وہ کالج پر صرف کردی جاتی تھی - اس حکایت کی ابتدا کسی طرح سے ہوئی ہو لیکن اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ لوگوں پر ان کی غیر معمولی قابلیت اور قومی

ایثار کا بے حد اثر تھا - جسٹس محمود کی قانونی قابلیت ' علمی تبحر اور بذلہ سنجی کی بھی بہت سی داستانیں زباں زد عام تھیں - راس مسعود کے سر پر سے ان کے واجب التعظیم دادا اور لایق باپ کا سایہ چھوٹی عمر میں ہی اٹھ گیا لیکن ان دونوں کی پر فیض صحبت کا اثر ان کے ننھے دل اور دماغ پر ضرور ہوا کیونکہ جوان ہونے پر دادا اور باپ کی بہت سی صفات راس مسعود میں موجود تھیں - اور پھر خون کا بھی اثر ہونا لازمی ہے —

میں نے راس مسعود کو پہلی مرتبہ شملہ میں دیکھا - یہ جاکھو پر اپنے دوست رشید کے ساتھ گھوڑا اڑائے چلے جاتے تھے - اس وقت ان کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوگی - لیکن قد چھ فٹ سے زیادہ اونچا تھا - ہاڑ باپ دادا کی طرح چوڑا تھا - اور موٹاپے کے کوئی آثار نہ تھے - آنکھیں بڑی بڑی اور روشن چہرے پر ایک قسم کا بھولپن جو انگلستان کے نوعمر طالب علموں میں اکثر نظر آتا ہے اور ہمارے ملک میں اب عنقا ہو گیا ہے - مجھ پر ان کی صورت کا بڑا اثر ہوا —

دوبارہ ملاقات سنہ ۱۹۱۲ ع میں ہوئی جب یہ حیدرآباد آئے - نظام کلب میں بلیرڈ کھیل رہے تھے وہاں لوگوں کا مجمع تھا اور یہ سب کو ہنسا رہے تھے - برآمدے میں نکلے تو شاید بشیر بیگ مرحوم نے مجھ سے ان کو ملایا - کہنے لگے - بھئی میں تو تم سے ملنے کا خود مشتاق تھا - یہاں آنے سے پہلے کلکتہ میں اتنے لوگوں نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا ہے کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ حیدرآباد جاکر تم سے ضرور ملوں گا - کیا تم بنگال کے رہنے والے ہو - میں نے کہا - بندہ کا وطن تو دہلی ہے - بعد میں تھوڑی دیر گفتگو رہی اور ایسے گھل مل گئے جیسے کوئی برسوں کا یار غار

ہوتا ہے - یہ ان میں خاص وصف تھا کہ ایک ہی ملاقات میں لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیتے تھے - چنانچہ حیدرآباد پہنچتے ہی حیدری صاحب اور گلانسی صاحب ان کے گہرے دوست ہوگئے - اس کشش کی وجہ ان کا خلوص ' ان کی محبت ' اور سب میں زیادہ ذاتی وجاہت تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی —

راس مسعود کو اپنے وقار کا بڑا خیال تھا - چنانچہ جب حیدرآباد آے تو بانکی پور کلب اور ریونشا کالج کٹک کے قصے سناتے تھے - ان قصوں کا حیدرآباد میں یہ اثر ہوا کہ سر اسٹوارٹ فریزر نے جو اس زمانے میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ تھے ان کو فوراً سکندرآباد کلب کی شرکت کی دعوت دی تاکہ انگریزوں کی جانب سے جو بدگمانی پیدا ہوگئی ہے وہ رفع ہوجاے - ایک نئے انگریز سویلین کا قصہ سناتے تھے جو آکسفورڈ میں ان کے ہم جماعت تھے - راس مسعود محبت کے جوش میں صاحب بہادر سے ملنے پہنچے - صاحب بہادر کو ہندوستان میں آے ہوے ابھی ایک دو سال ہی ہوے تھے لیکن ان کو اپنی اعلیٰ خدمت اور ہندوستانیوں کی بیکسی کا احساس پیدا ہوگیا تھا - راس مسعود سے چھوٹتے ہی یہ سوال کیا - ؟ What can I do for you (میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں) - راس مسعود کو یہ جملہ بہت ناگوار گزرا - فرمایا - اے یار عزیز! اس وقت تم میرے وطن میں اجنبی کی حیثیت سے ہو - اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بے تکلف مجھ سے کہو تاکہ میں اس کا انتظام کروں - اس جواب کے بعد صاحب بہادر ٹھیک ہوگئے - راس مسعود سے زیادہ شاید ہی کوئی انگریز قوم کی خصایل اور اطوار کا تعریف کرنے والا بھی ہو - لیکن اگر کسی انگریز سے کوئی فرو گزاشت ہوجاتی

ہی تو یہ ٹوکے اور مضحکہ اڑائے بغیر نہ رہتے تھے - باپ اور دادا کا
سایۂ عاطفت اٹھہ جانے کے بعد راس مسعود کی تعلیم اور تربیت
سر تھیوڈور ماریسن کی نگرانی میں ہوئی - سر تھیوڈور کو ان کے ساتھہ
بے حد محبت تھی اور آخر تک یہ الفت کا رشتہ قایم رہا - تعلیم کی
جہ سے چونکہ شباب کا ابتدائی زمانہ انگلستان میں گزرا اس لیے
اس مسعود کے لنگوٹیے دوست بھی زیادہ تر انگریز ھی تھے - ان کی دوستی کس
طبقے کے لوگوں سے ہوئی اس کا اندازہ فوسٹر (Edward Morogam Forster)
جیسی ہستیوں سے ہو سکتا ہے جو ان کی محبت میں ہندوستان تک پہنچے
ور جن کا مشہور ناول (A passag to India) ان کی سچی دوستی کی
ہمیشہ یادگار رہے گا —

راس مسعود جس وقت حیدرآباد آئے ان کی عمر صرف انتیس
برس کی تھی - نظامت تعلیمات کے عہدہ پر ان سے پہلے نواب عمادالملک
ڈاکٹر سید سراج الحسن اور الما لطیفی جیسے قابل اور ماہر فن مامور
رہ چکے تھے - راس مسعود نے اس خدمت کو کس طرح ادا کیا اس کا
پورا حال تو کوئی ماہر تعلیم لکھے گا لیکن اتنا بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ
ان کے ذاتی شوق اور انہماک نے شاگرد اور استاد دونوں کے دل میں
علم کی ایسی محبت پیدا کردی جو شاید پہلے نہ تھی - علاوہ ازیں ان
کے ذاتی وقار نے اساتذہ کے وقار کو عوام کی نگاہ میں بہت بڑھا دیا -
تعلیم کی سوتیں ان کی کاوش سے ایسی پھیلیں کہ ممالک محروسہ کے
گاؤں گاؤں میں علم کی گنگا بہ گئی - نصاب اور طرز تعلیم میں ملک کے
تمدن اور معاشی حالات کے مد نظر بہت سی اصلاحات عمل میں آئیں -
اسی غرض سے جاپان کا سفر بھی کیا - عثمانیہ یونیورسٹی کی داغ بیل ان

کے آنے سے پہلے پڑ چکی تھی - لیکن انھوں نے اس کی بنیادوں کو اپنے علم اور فضل اور وسیع تخیل سے مضبوط اور مستحکم کردیا - انگریز حکام کو ابتدا میں یونیورسٹی کی کامیابی کے متعلق بہت سے شبہات تھے - گلینسی صاحب * کو حیدرآباد میں اور شارپ † اور میکلگن صاحب ‡ کو شملہ اور دھلی میں قایل کرنا ان کا ھی کام تھا - غریب طالب علم اور نادار استاد ان کو اپنا مربی اور محسن سمجھتے تھے - اور یہ ان کی اس طرح مدد کرتے تھے کہ کسی دوسرے کو مطلق خبر نہ ہوتی تھی تاکہ ان کے احساسات کو صدمہ نہ پہنچے —

علم کی اشاعت کا بے حد شوق تھا - اور اردو زبان سے خاص محبت تھی - بدایوں ' علی گڈھ ' حیدرآباد ' سے جو اساتذہ کے کلام شایع ہوئے ھیں ان سب میں ان کی سعی اور مدد نمایاں ھے - علماء اور ماہرین فن کی انھیں ہمیشہ تلاش رہتی تھی - ان کو بلا بلا کر اپنے پاس رکھتے تھے اور ہمت افزائی کرتے تھے - اور جس طرح سے بن پڑتا تھا ان کی مدد کرتے تھے - طبیعت جوہر شناس تھی اس لیے چھوٹے بڑے کا خیال نہ کرتے تھے - اگر ' اقبال ' کی عظمت ایشیا کا سب میں بڑا شاعر ہونے کی وجہ سے کرتے تھے تو ' عصمت ' بیڈوا کو اس وجہ سے عزیز رکھتے تھے کہ خدا نے اس کو غیر معمولی ظرافت اور قوت مشاہدہ دی ھے - ان کی مجلس میں ہر مشرب اور ہر درجہ کے لوگ ہوتے تھے اور ان کا فیضان سب پر یکساں تھا —

---

* سر ریجینلڈ گلانسی - یہ اس زمانہ میں حیدرآباد کے وزیر مالیات تھے —

† سر ھنری شارپ - یہ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت سرکار ھند کے محکمہ تعلیمات کے شریک معتمد تھے -

‡ سر ایڈ ورڈ میکلگن - یہ اس زمانہ میں سرکار عظمت مدار کے معتمد تعلیمات تھے -

طبیعت بے حد نفاست پسند تھی - اور اس کا اثر کھانے پینے، لباس، ساز و سامان، گفتگو، اور خیالات سب میں عیاں تھا - جن لوگوں کو ان کے ساتھہ رہنے یا ان کی دعوتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے - وہ ان کے دسترخوان کی نفاست اور کھانوں کے انتخاب اور لذت کی داد دے سکتے ہیں - لباس خواہ چوڑی دار پائجامہ اور هندوستانی وضع کی اچکن ہو خواہ انگریزی سوٹ سب بہترین سلے ہوے اور نہایت نفیس کپڑے کے ہوتے تھے - هندوستانی عطر اور مغربی سینٹ (Scent) کا بھی شوق تھا - لیکن ان کے استعمال میں ان کا نفیس ذوق همیشہ نمایاں تھا - عطر قنوج اور لکھنؤ سے آتے تھے اور سینٹ پیرس سے - خانہ داری کے ساز و سامان میں بھی یہ خوش ذوقی عیاں تھی - نفاست طبع کی وجہ سے فنون لطیفہ کی طرف خاص میلان تھا - اچھے کلام کی خواہ نثر ہو خواہ نظم خوب داد دیتے تھے اور اس سے خوب لطف اٹھاتے تھے - هزاروں اشعار اور حکایتیں یاد تھیں - ان کو دهراتے تھے اور دوستوں کو خوش کرتے تھے - حافظہ اس غضب کا پایا تھا کہ جو ایک دفعہ پڑھ لیا یا سن لیا وہ یاد ہوگیا - جس قسم کی مجلس ہو اسی قسم کی گفتگو کے لیے یہ تیار تھے - هال صاحب جو بھوپال میں رزیڈنٹ تھے بیان کرتے تھے کہ خدا نے عجب طلاقت لسانی اور بذلہ سنجی عطا کی تھی کہ جس محفل میں یہ ہوتے تھے سب ان کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے اور کسی دوسرے کو بولنے کی همت نہ ہوتی تھی —

علمی تبحر، خاندانی شرافت، اور ذاتی وجاهت نے ان کو ایسا وقار دیدیا تھا کہ یہ کسی سے نہ جھجکتے تھے - وایسراے ان کو اپنا دوست کہنے پر فخر کرتے تھے - والیان ریاست ان سے ملنے کی آرزو رکھتے تھے -

یہاں تک کہ حضرت اقدس و اعلیٰ کی بھی ان پر خاص نظرالتفات تھی۔ اس عزت و احترام کا باعث ان کا استغنا اور ذاتی فضایل بھی تھے۔ بحیثیت انسان راس مسعود ایک پر محبت اور درد مند دل رکھتے تھے - سنہ ۹۲۴ع میں جب میں بیمار ہوا تو یہ ہر روز خیریت کے لیے آتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جو آلام مجھے تکلیف دے رہے ہیں وہ کسی طرح کم ہو جائیں بعد ازاں جب میری لڑکی ٹائیفایڈ میں مبتلا ہوئی - تب بھی ان کی ہمدردی کا یہی حال رہا - روزانہ دفتر جانے سے قبل خیریت پوچھنے کے لیے آتے تھے اور جب تک وہ اچھی نہ ہوگئی یہ سلسلہ جاری رہا - جس شخص کو دوستوں کے ساتھہ ایسی الفت ہو اس کو اپنی بیوی، بچوں اور ماں سے کس قدر محبت ہوگی - وہ حقیقت میں اُن کے شیدائی تھے - اور جب ابتدا میں حیدرآباد آے تو اپنی بیوی کا ذکر نہایت محبت سے کیا کرتے تھے - لیکن بعد میں بے لطفی ضرور پیدا ہوگئی - جس کی وجہ دونوں کی ضد اور ہٹ کے سوا اور کچھہ سمجھہ میں نہیں آتی - نوبت یہاں تک پہنچی کہ سنہ ۱۹۲۸ ع میں انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی - راس مسعود کی تعلیم اس قسم کی ہوئی تھی کہ وہ رسم و رواج کے قائل نہ تھے پھر بھی اس واقعہ کا ان پر بے حد صدمہ ہوا اور وہ سخت بیمار ہوگئے - میں اس زمانے میں آکسفورڈ میں تھا - مجھے خط لکھا کہ گردوں کے علاج کے لیے فرینکفورٹ آیا ہوا ہوں - بابر* میرے پاس ہے اور ہر طرح تیمارداری کر رہا ہے ہارو وتزاوران کی بیوی بھی صبح و شام آتے ہیں پھر بھی اگر تم آجاؤ تو اچھا ہے - میں جب فرینکفورٹ پہنچا تو دیکھا بے حد نحیف ہوگئے ہیں - ڈاکٹر سے دریافت

* ڈاکٹر بابر میرزا فرزند مولوی عزیز مرزا -

کہا تو معلوم ہوا اصلی مرض میں بہت کمی ہے - ماں کا اور بچوں کی تعلیم کا اس وقت بے حد خیال تھا اپنے بازووں اور پنڈلیوں کو دیکھہ کر کہنے لگے کہ اگر والدہ اس حالت کو دیکھیں تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوگی - اور خدانخواستہ اگر میں مرگیا تو بچوں کی تعلیم کس طرح ہوگی - پھر طلاق کا حال بیان کیا - زبان سے وہ اس فعل کو درست بیان کرتے تھے - لیکن دل پر صدمہ ضرور تھا - ان کے نیک اور پر محبت ہونے کی وجہ سے یہ صدمہ ہمیشہ ان کے دل پر باقی رہا —

راس مسعود مذہب اور نسل ہر قسم کے تعصبات سے پاک تھے - ہندو اور مسلمان، پارسی اور عیسائی سب ان کی نگاہ میں یکساں تھے - وہ نائٹ ہوے ڈاکٹر ہوے لیکن ان امتیازات کی ان کو آرزو نہ تھی - حیدرآباد سے علحدہ ہونے سے پہلے ان کو محکمۂ سیاسیات کی معتمدی بھی پیش کی گئی اور اگر وہ قبول کرلیتے تو اس محکمے کے وزیر بھی ہو جاتے لیکن قوم اور ملک کی خدمت ان کے پیش نظر تھی - جب تک حیدرآباد میں رہے یہی خیال ان کے دل میں موجزن رہا کہ ملک کی اصلاح کا کوئی کام ان سے انجام پا جائے - علیگڈھ بھی یہی آرزو ان کو لے گئی اور بھوپال بھی یہی آرزو لائی - پاک ہے وہ زندگی جس کا نصب العین یہ ہو - اور قابل تقلید ہے وہ زندگی جس کا مطمح نظر ایسا بلند ہو -

سر سید راس مسعود کا مشن

از

(جناب رضاءالدین احمد صاحب، بی - اے، بی ٹی معلم اردو،
کالون تعلقدار کالج لکھنؤ)

تھا وہ اسم بامسمی راس اور مسعود تھا
نور چشم سید و لخت دل محمود تھا

اخباروں میں سر سید راس مسعود کی وفات حسرت آیات کی خبر شایع ہوچکی ہے - قوم کو اس کا صدمہ ہے کہ ہمارا پیشوا نہ رہا - ملک کو اس کا غم ہے کہ ہمارا ہادی چل بسا - علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء اپنے شفیق استاد کی یاد میں اندوہگیں ہیں - جن طلبا کو سر راس کی عنایت سے تعلیم اور ملازمت میں امداد ملی وہ ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ گویا ایک شفقت کے گہوارہ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر لیے گئے - مگر ان سب غموں سے زیادہ ہولناک غم سر راس کی بوڑھی ماں اور جوان بیوہ لیڈی مسعود کا ہے اولاد اور ایسی مایۂ ناز اولاد کس ماں کو عزیز نہیں ہوتی؟ سر سید احمد خاں مرحوم ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو پیغام لائے تھے اس کو اپنے ساتھ وہ نہیں لیتے گئے تھے بلکہ وراثت کے طور پر جسٹس محمود کے لیے چھوڑ گئے تھے - جسٹس محمود نے اس درسگاہ کو ترقی دی جو ان کے والد ماجد کی نادر یادگار

ہے - اور سر راس نے بھی اسی درسگاہ کو معراج کمال تک پہنچانے کی کوشش کی - آپ بھی اپنے باپ اور دادا کی طرح یہی چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیم میں کسی قوم سے پیچھے نہ رہیں اور علوم و فنون مغربی حاصل کر کے حصول معاش کریں - آپ اپنی قوم کی حصول معاش میں بہت مدد کرتے تھے - آپ میں تعصب بالکل نہ تھا - غیر اقوام کو بھی آپ سے فائدہ پہنچتا رہا - میں نے بارہا آپ کو یہ فرماتے سنا کہ تعصب بری چیز ہے - آپ اپنی قوم کی تباہی کے اسباب اکثر بیان فرماتے - آپ کی رائے میں تعصب بھی مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کا ایک سبب تھا - ایک بار بھوپال میں جمعہ کے روز میں ریاض منزل میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا اور حسب معمول شہر کے عام لوگ بھی تھے جو قبل نماز جمعہ ہر جمعہ کو بار یاب ہو سکتے تھے، آپ نے ہماری قوم کی کوتاہ اندیشی پر تبصرہ فرمایا کہ اتفاق اس قدر جاتا رہا ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں سے بیر رکھتے ہیں اور مثال دی کہ مصر میں عرب کا باشندہ مسلمان ہونے کے باوجود غیر سمجھا جاتا ہے - اور یہ سچ ہے کہ سیاسی تفرقوں کی وجہ سے مذہبی اتحاد ہم لوگوں میں نہیں رہا ہے —

تعلیم کی دنیا میں آپ نے ایک اسکول کے ھیڈ ماسٹر کی زندگی اختیار کر کے تعلیم کی وزارت تک ترقی پائی - آپ کی ترقی کے مدارج یہ تھے کہ آپ پٹنہ میں ھیڈ ماسٹر رہے - حیدرآباد میں ناظم تعلیمات رہے - پھر علی گڈھ میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور آخر میں بھوپال میں صیغۂ تعمیرات کے علاوہ صیغۂ تعلیمات کے بھی وزیر رہے - حیدرآباد سے آپ کو نواب مسعود جنگ بہادر کا خطاب ملا اور حکومت برطانیہ

سے "سر" کا خطاب عطا ہوا - پٹنہ میں آپ نے بیرسٹری بھی کی مگر آپ کو مقدمہ بازی سے دلچسپی نہ ہوئی اور جس طریقہ سے اس پیشے میں قابل اعتراض کارروائیاں لوگ کرتے ہیں ان کو آپ نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے - آپ کے پاس قانون کی سب سے بڑی ڈگری ایل ایل - ڈی اور ادب کی سب سے بڑی ڈگری ڈی - لٹ موجود تھی مگر آپ نے زیادہ مدت تک بیرسٹری نہیں کی اور اس مشن کی طرف متوجہ ہوئے جو ان کے جدامجد اپنے ساتھ لائے تھے اور مسلمانوں کی تعلیم کی فکر کرنے لگے - حیدرآباد میں نئے اسکول کھولے - جاپان میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ کے حکم سے جاکر وہاں کی تعلیم کی حالت کا معائنہ کیا اور وہاں کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو اردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گی —

میں نے سب سے پہلے آپ کا لکچر جاپان کے حالات کے بارے میں علی گڈھ میں حامد حال میں سنہ ۳۳ - ۱۹۳۲ ع میں سنا تھا جب میں وہاں ٹریننگ کالج میں تعلیم پاتا تھا اور آپ وہاں وائس چانسلر تھے - اس لکچر میں آپ نے جاپان کی سوسائٹی کا نقشہ کھینچا تھا اور وہاں کے لوگوں کی معاشرت اور تعلیمی حالت بیان فرمائی تھی - اس لکچر کے ساتھ سلائڈ کی تصویریں بھی دکھائی تھیں جو آپ نے جاپان میں کھینچی تھیں - آپ کی تقریر کی دلکشی تو مشہور ہے - اس کے ساتھ جاپانی تصاویر اور دلچسپی کا باعث ہوئیں - اور جاپان کے متعلق آپ کا لکچر بہت کامیاب رہا —

آپ کو فارسی شاعری سے بہت دلچسپی تھی اور فارسی اور اردو کے اشعار بہت سے یاد تھے جو اکثر باتیں کرتے کرتے زبان پر آجاتے - آپ

کا حافظہ بہت اچھا تھا - جس شخص کو ایک بار دیکھ لیتے اس کی شکل ہمیشہ یاد رکھتے - آپ بڑے خلیق ' مہمان نواز اور خوش مزاج تھے - آپ کی گفتگو میں مزاح کا پہلو بھی ہوتا تھا - اور بعض وقت ایسے لطائف و ظرائف بیان فرماتے تھے جن سے بہت سے اخلاقی سبق ملتے تھے —

فنون لطیفہ میں شاعری کے علاوہ آپ کو فن تعمیر سے بھی ذوق تھا آپ نے علی گڈھ کی وائس چانسلری کے زمانہ میں وہاں سائنس کالج اور مسعود مارکٹ بنواکر اپنے ذوق تعمیر کی زندہ تصویریں پیش کیں اور بھوپال میں چوک کی جامع مسجد کی مرمت کرائی - اردو لٹریچر میں آپ کو سب سے زیادہ انیس کا کلام پسند تھا - مثنوی مولانا روم سے آپ کو دلچسپی تھی اور مثنوی شریف کے بعض اشعار آپ کو زبانی یاد تھے - اور ان کو ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے - مسدس حالی آپ کو بہت مرغوب تھا اور اُس کا اکثر حصہ آپ کو حفظ تھا - حالی سینٹینری میں پانی پت جاکر آپ کے ساتھ شرکت کا شرف مجھکو بھی حاصل ہوا تھا - مولانا حالی مرحوم کو جو تعلق سر سید کی وجہ سے علی گڈھ سے تھا اُس کی بنا پر آپ کو اُن کی یادگار حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت سے بھی اُنس تھا اور وہاں کے انتظامی معاملات میں آپ بخوشی دلچسپی لیتے تھے اور ہر طرح کی امداد کو تیار رہتے تھے —

مجھکو اس کا صدمہ ہے کہ آپ کے پرتوِ ظاہری سے دائمی مفارقت ہوگئی یعنی فراق اتنا ہے کہ اب میری آنکھیں آپ کے جسم ظاہری اور حرکات و سکنات کو دیکھنے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئیں - اب میرے کان آپ کی آواز سننے نہ پائیں گے - اب کبھی آپ سے مصافحہ کرنے یا آپ کو سلام کرنے کی نوبت نہ آئے گی - اب کبھی کسی ملنے یا آپ سے

معاملہ میں آپ سے سفارش نہ کرائی جائے گی - یہی میں وہ ظاہری نعمات جن سے میں کہا میری قوم محروم ہوگئی ہے مگر آپ کی باطنی عنایات تو ہمیشہ شامل حال رہیں گی - آپ نے جس زیور تعلیم سے میرے دماغ کو مرصع فرمایا تھا وہ میری روح کا جز واعظم رہے گی - آپ نے جو اخلاقی سبق پڑھائے تھے وہ عملی دنیا میں کام آئیں گے - آپ نے جو اوتباط علی گڈھ سے قائم کرا دیا ہے وہ دل کو تسلی و تشفی دے گا - آپ سے محبت کرنے والے کے لیے علی گڈھ میں آپ کا مزار ہے —

آپ انگلستان اور یورپ میں بحیثیت ایک طالب علم اور سیاح کے بہت رہے تھے اور وہاں کی مختلف سوسائٹیوں اور اُن کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے اور کسی قدر یورپ کی معاشرت بھی اختیار کیے ہوئے تھے - مگر سر محمد اقبال کی طرح آپ مغرب کو پیام مشرق کا جام پلانے کے قائل تھے - آپ کو اس کا علم تھا کہ روحانیت کا مرکز مشرق ہے - تمام انبیا مشرق میں آے اور ان کا پیام ان کے بعد مغرب میں جانے کی ضرورت باقی رہی - حقیقت میں مغرب کا پیٹ مادیت سے بھرا ہوا ہے مگر وہ روحانیت کا بھوکا ہے اور غذاے روحانی اس کو بظاہر مشرق سے مل سکتی ہے - یورپ میں عیسائیت اور اسلام مشرق سے گئے اور ایک مشن کی شکل میں ہمیشہ پیش ہوتے رہے اور ہر دو مذاہب کی تبلیغ کا سلسلہ عہد متوسط سے لے کر اب تک ہوتا رہا - عیسائیت سے تو یورپ عہد قدیم میں روشناس ہو چکا تھا - اسلام چونکہ عہد متوسط میں عرب میں آیا اس لیے اس کی اشاعت بھی اوسی عہد سے شروع ہوئی —

آپ کو اس کا افسوس تھا کہ عربی اور فارسی کی قدر ہندوستان میں گھٹتی جاتی ہے درآنحالیکہ یورپ کی فضاے ادب میں لوگ ہر

دو زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور فارسی لٹریچر میں عمر خیام کے فلسفہ کو اپنا ہم آہنگ قرار دیتے ہیں - ہندوستان سے پرانی کتابوں اور نسخہ جات کے مربی بھی اٹھتے جاتے ہیں مگر یورپ میں اگر کوئی پرانی عربی اور فارسی کی کتاب یا قلمی نسخہ مل جاتا ہے تو بڑی قدر سے رکھا جاتا ہے - ہندوستان ہی سے بہت سے قیمتی نسخہ جات وہاں گئے ہیں اور وقار سے رکھے اور پڑھے جاتے ہیں - ان ادبی جواہر ریزوں کی قدر ہم نے نہ جانی اور حکومت کی طرح ان کو بھی کھو دیا —

سر راس کا عقیدہ تھا کہ ماں باپ کے قدموں کے نیچے جنت ہے اور اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد آپ نے مدت العمر اپنی والدہ صاحبہ کی اطاعت اور فرماں برداری کی اور کبھی ان کے حکم سے سرتابی نہ کی حتیٰ کہ جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تب بھی اگر کسی معاملہ میں آپ کی والدہ صاحبہ آپ کو کوئی حکم دیتیں یا کسی کی سفارش کرتیں تو اوس کی تعمیل بسرو چشم کرتے - بھوپال میں اپنی وزارت کے زمانے میں بھی آپ اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضری کے لیے بھوپال سے علی گڈھ تشریف لایا کرتے تھے —

آپ نوکروں پر سختی کرنے کے قائل نہ تھے - آپ کی رائے تھی کہ نوکروں کے ساتھ سلوک ایسا کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے مطیع و فرماں بردار رہیں - ایک واقعہ بیان فرماتے تھے کہ ایک بار آپ نے ایک نوکر کو اپنے لڑکپن کے زمانہ میں مارا - اس کی اطلاع آپ کے والد ماجد کو ہوئی - وہ بھی نوکروں پر سختی کرنے کے مخالف تھے - انہوں نے آپ کو یہ سزا دی کہ آپ اس نوکر سے سب کے سامنے کشتی لڑیں چنانچہ آپ اُس

سے کشتی لڑے اور ہار گئے۔ نوکر مضبوط تھا، اس نے آپ کو پچھاڑ دیا۔ تب سے آپ کو ایسی تنبیہہ ہوی کہ آپ نے کسی نوکر کو نہ سخت سست کہا اور نہ کسی اور قسم کی بے انصافی اس کے ساتھہ کی۔ معمولی نوکروں کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے اور مسلم یونیورسٹی کے اُستادوں اور طلباء کی تو پوری عزت کرتے تھے - جب حیدرآباد سے مسلم یونیورسٹی میں پہلی بار وائس چانسلر ہوکر علی گڈھ تشریف لائے اور وہاں کے اسٹاف میں تخفیف کا مسئلہ درپیش ہوا تو آپ نے تخفیف میں لانے کا معیار اسٹاف کے ممبروں کے کام کی حالت کو قرار دیا اور اسی بنا پر شہادتیں لے کر اور ثبوت پاکر تخفیف کی - بھوپال میں بھی آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی کام برا کرتا ہے تو مجھہ کو بہت برا معلوم ہوتا ہے - اگر کوئی میری مخالفت کرتا ہے تو میں اس کو نہیں نکالتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں بھی انسان ہوں ممکن ہے غلطی پر ہوں - لیکن اگر کوئی کام خراب کریگا تو نکالدوں گا - اسی اصول پر آپ نے علی گڈھ میں تخفیف کرتے وقت عمل کیا تھا —

اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں آپ نے قاعدہ اور قانون کی ایسی سختی برھائی تھی کہ وہی یونیورسٹی جو مسلمانوں کے ساتھہ رعایت کرنے میں بدنام تھی اب عدل نوشیرواں کا نمونہ ہوگئی - اور اس کی ڈگریاں گورنمنٹ اور پبلک کی نظر میں وقیع ہوگئیں اور غیر اقوام جو مسلم یونیورسٹی کے معیار امتحان پر اعتراضات کرتی تھیں ان کی زبانیں بند ہوگئیں —

آپ "لبرل ایجوکیشن" سے زیادہ "ٹکنیکل ایجوکیشن" کے حامی تھے - لٹریچر سے آپ کو خود بہت دلچسپی تھی مگر سائنس اور عملی

علوم کی تعلیم کو فروغ دینے کی آپ نے بہت کوشش کی - علم طبیعیات و علم کیمیا و علم نباتات و علم حیوانات کی تعلیم کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر تجربات کے لیے "لیبریٹریاں" آپ نے سائنس کالج میں علی گڈھ میں بنوائیں - ٹیچرس ٹریننگ کالج کو امتیاز دیا - اور وہاں کے نظام میں آپ کے زمانۂ انتظام میں بہت ترقی ہوی - اور آپ کے زمانہ میں علی گڈھ کی بی - ٹی کی ڈگری کی وقعت بڑھ گئی —

آپ کو ہندوستان کے پیشۂ ملکی یعنی زراعت سے بھی بہت دلچسپی تھی - آپ نے یوپی گورنمنٹ سے معاہدہ کر کے سرکاری زراعتی فارم علی گڈھ میں اس کام پر لیا کہ وہاں یونیورسٹی کے طلبا زراعت کا کام بھی سیکھیں - اور ٹریننگ کالج کے طلبا کو اس کی اجازت ملی کہ وہ اگر چاہیں تو ایک اسکول کے مضمون کی طرح اس میں بھی ٹریننگ حاصل کریں اور فارم پر جا کر وہاں کاشت کے طریقے سیکھیں - زمین کی حالت اور اقسام کا مشاہدہ کریں اور ہل چلا کر تجربات کریں اور اصول زراعت کی کتابیں پڑھیں - علم زراعت کے بارے میں آپ کی یہ رائے تھی کہ یہ معرفت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے - آپ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ "زراعت کا تعلق عالم روحانیت سے ہے" اکبر بادشاہ کا مقولہ ہے کہ علم مصوری سے معرفت حاصل ہوتی ہے اس طرح کہ ہم ایک تصویر بناتے ہیں مگر اس میں روح نہیں پھونک سکتے اور اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ روح پر ہم کو قدرت نہیں ہے - روح پھونکنا قادر مطلق ہی کے اختیار میں ہے - اسی طرح زراعت پیشہ قوم اپنا تمام سال فصل کو اچھا بنانے میں صرف کرتی ہے اور جتنی محنت اور کاوش ہو سکتی ہے وہ اختیار کرتی ہے مگر حوادث مثلاً ژالہ باری برف باری، بارش کی کثرت، بارش کی کمی، زمین کی خرابی اور کیڑوں کی مضرت رسانی ایسے واقعات

ہیں جن میں کمی بیشی کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے اور خدا کو مان کر اس کی قدرت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ وہ فضا ' پیداوار ' موسم زمین اور آسمان اور سب چیزوں پر قادر ہے اور ہم اس کی قدرت کے کارخانہ میں مجبور ہیں - جس استاد نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ :

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اسی نے یہ سبق پڑھایا ہے کہ - ع : خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است —

آپ کا ذاتی کتب خانہ بہت نفیس تھا - ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں آپ کے پاس رہتی تھیں - اعلیٰ مضامین کے علاوہ کتابوں کی اچھی چھپائی اور اچھی جلد بندی پر بھی آپ کی نظر رہتی تھی - آپ کے پاس کلام مجید کے اعلیٰ نسخے تھے - جہاں کہیں اچھے کلام مجید کے چھپنے کی خبر پاتے اس کا نمونہ ضرور منگاتے اور تحفتاً تقسیم کرتے اور اپنے پاس بھی رکھتے تھے - آپ حافظوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن سے مسلوک ہوتے تھے - آپ کبھی کسی کی دلشکنی نہیں فرماتے تھے - آپ مہمان کی آبرو رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے - آپ حرص اور فریب کو بہت بری نظر سے دیکھتے تھے —

عشق کو آپ جذبات کی فوج کا سردار سمجھتے تھے اور یہ شعر بہت ذوق میں پڑھا کرتے تھے :

دریں میخانہ ہر مینا ز بیم محتسب لرزد   مگر یک شیشۂ عاشق کز و لرزد بہ ہر سنگ است

آپ کی رائے میں عاشق کا دل جذبات انسانی کی کسوٹی ہے اور حسیات کا نچوڑ اسی میں پایا جاتا ہے - آپ فلسفۂ عشق کو پوری طرح سمجھے ہوے تھے اور جب شعرا کے کلام پر تنقید فرماتے تھے تو اندازہ ہوتا

تھا کہ آپ کی رائے نفسیات کے اصول کے تحت میں ہوا کرتی تھی ۔

ادھر آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اُدھر دنیا کی بہت سی محفلیں سونی پڑگئیں - اردو ادب کی بزم سونی ہوگئی ' تعلیم کی بزم سونی ہوگئی اور قوم کی بزم سونی ہوگئی - آپ کی نظر ایسی وسیع تھی کہ ان تینوں بزموں میں اُجالا پھیلا ہوا تھا - اب کہا ہے :

نہ کوئی شمع جلتی ہے نہ پروانے ہیں محفل میں
نہ وہ جادو ہے آنکھوں میں نہ وہ جذبات ہیں دل میں

اب آپ کی قوم کی تسلی اور تشفی اسی سے ہوگی کہ آپ کی مستقل یادگاریں ہمارے واسطے موجب فیض رہیں - آپ کی اخلاقی خوبیاں ' آپ کی تصنیفات ' آپ کی علمی و تعلیمی خدمات آپ کے عالمگیر مشن کی ایسی زندہ تصویریں ہیں جو آپ کی وفات کے بعد بھی جھلکتی جاگتی رہیں گی —

سر سید راس مسعود

از

(جناب مولوی سید محی الدین صاحب بی - اے (علیگ) ،
بیرسٹر ایٹ لا پرنسپل عثمانیہ کالج ، اورنگ آباد دکن)

ڈاکٹر سر سید راس مسعود نواب مسعود جنگ بہادر مرحوم اور میں علی گڑھ اسکول کے جماعت میٹرک میں تعلیم پاتے تھے - سنہ ۱۹۰۵ ع میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ انگلستان گئے - میں چار برس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جب لندن پہنچا وہ اس وقت نیو کالج آکسفورڈ میں تھے - بی - اے - آنرس کی ڈگری لے کر وہ سنہ ۱۹۱۰ ع میں لندن آئے اور وہاں بیرسٹری کے امتحانات دیتے رہے - اس زمانے سے سنہ ۱۹۱۲ ع کے وسط تک جب وہ بیرسٹر ہوکر ہندوستان واپس گئے ان کا میرا ساتھ رہا - جب میں انگلستان سے واپس ہوا اس وقت مرحوم پٹنہ کالیجیٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے - پٹنہ میں بھی میں اور وہ ایک ساتھ رہتے تھے - جب وہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہوکر حیدرآباد آئے میں اس وقت سے میرا اور مرحوم کا تقریباً گیارہ برس تک ساتھ رہا - وہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تھے اور میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر - یہاں سے وظیفہ لینے کے بعد جب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ مقرر ہوئے میں اس وقت میں ان کے ساتھ علیگڑھ گیا اور ایک ہفتہ تک

انہیں کے ساتھ رہا - آخر میں جب مرحوم بھوپال میں وزیر تعلیمات کی خدمت انجام دے رہے تھے اس زمانہ میں بھی ان سے کئی تفصیلی ملاقاتیں رہیں الحاصل تقریباً تیس برس تک میرا اور مرحوم کا ساتھ رہا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے دادا کے پوتے اور بڑے باپ کے بیٹے تھے - سر سید احمد خاں مغفرلہ اور سید محمود مرحوم و مغفور کے متعلق میں سنتا تھا کہ یہ اپنے وقت کے مشاہیر (بڑے لوگ تھے) مگر سر سید مسعود کو میں نے دیکھا اور ان کو اپنے وقت کا ہندوستان میں بہت بڑا آدمی پایا —

تعلیم ہی کے زمانے سے ان میں بڑے ہونے کے آثار پائے جاتے تھے چنانچہ سر تھیوڈ ور ماریسن آنجہانی سابق پرنسپل علیگڑھ کالج و ممبر انڈیا کونسل نے مجھ سے لندن میں فرمایا تھا کہ " مسعود جس زمانے میں نیو کالج آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے اس وقت میں ایک دفعہ آکسفورڈ گیا تھا اور مسعود کے ٹیوٹر سے ان کی تعلیمی حالت دریافت کی تو ٹیوٹر نے مجھ سے کہا کہ " مسعود آکسفورڈ میں اپنے ہم عصر طالب علموں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور وہ انشاءاللہ ہندوستان کے بڑے لوگوں میں ہوں گے " —

مرحوم کا حافظہ غضب کا تھا - یہ حافظہ ان کو اپنے والد ماجد کی طرف سے ودیعت ہوا تھا جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھ لیتے وہ قریب قریب پوری ازبر ہو جاتی تھی - حیدرآباد میں ایک دفعہ مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے مثنوی مولانا روم کو دیکھنا شروع کیا ہے - جس قدر میں نے دیکھا وہ مجھے یاد ہے - میں اس کو یقین نہیں کرسکا بلکہ مجھے کچھ تعجب سا ہوا - میرے اس تعجب پر وہ مثنوی کا پہلا دفتر میرے

ہاتھ میں دیکر زبانی پڑھنے لگے تقریباً سات صفحوں تک وہ برابر پڑھ رہے تھے اور میں کتاب سے مطابقت کرتا ہوا سن رہا تھا - ان تمام اشعار میں وہ صرف ایک جگہ رکے باقی حصہ واقعی ان کو ازبر تھا —

کسی زبان اور اس کے ادب میں کمال حاصل کرنے کا ان کو خاص ملکہ تھا - چنانچہ اردو، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور ان زبانوں کے ادب قدیم و جدید پر انہیں عبور حاصل تھا ان کے علاوہ عربی، لاطینی اور اٹالین بھی جانتے تھے -

فرانسیسی زبان میں اس قدر مہارت تھی کہ میں نے کسی ہندوستانی یا انگریز کو بلحاظ قابلیت ان کا ہمسر نہیں پایا - اخلاق اس قدر وسیع تھے کہ مشرقی اور اسلامی روایات کے وہ پورے حامل تھے ایک دفعہ جو شخص کچھ دیر کے لیے بھی ان سے ملتا وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہوجاتا - ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کسی کی مصیبت کو سن کر وہ اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ گویا وہ مصیبت ان پر گزر رہی ہے اور جو کچھ ان سے ممکن ہوتا رفع مصیبت کے لیے اس کی مدد کرنے میں دریغ نہیں کرتے - یہ سلوک ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ آدمیوں کے ساتھ بھی تھا - اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کا برتاؤ مشفقانہ اور دوستانہ ہوتا تھا - سب سے بڑی خوبی جو میں نے ان میں پائی وہ ان کی انتہائی خودداری تھی اپنے متعلق یا اپنے اغراض کے لیے جہاں تک مجھے علم ہے کبھی کسی سے نہیں کہا - دوسروں کی فلاح و بہبودی کا خیال ہمیشہ پیش نظر تھا —

حیدرآباد میں وہ بارہ برس تک سررشتہ تعلیمات کے ناظم رہے جس کے منجملہ گیارہ سال تک میں نے ان کی ماتحتی میں کام کیا -

میں نے ہمیشہ ان کو سررشتہ کی ترقی ملازمین کی خیر خواہی، طلباء کی ہمدردی اور تعلیم کی اصلاح کی دھن میں مگن پایا - اس گیارہ سال میں مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی بھی اپنی ترقی یا اعلی مدارج حاصل کرنے کا خیال بھی ظاہر ہوا ہو - وہ فرائض کے انجام دینے میں سختی سے پابند تھے - میں نے ان کو مالک اور ملک کا سچا بہی خواہ پایا - کوئی نئی انجمن یا نیا کام جس میں مالک ملک اور اہل ملک کا فائدہ ہو اس میں وہ خوشی سے لبیک کہتے ہوئے شریک ہوتے اور ممکنہ مالی مدد سے دریغ نہیں کرتے تھے —

سررشتہ تعلیمات حیدرآباد میں ابتدائی اور تحتانیہ تعلیم کی وسعت اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں جو ترقی ہوئی ہے اس میں سرسید مسعود مرحوم کا بہت بڑا حصہ ہے ان کے عہد نظامت تعلیمات میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اس کا مختصر ذکر اس موقع پر ضروری ہے -

(۱) ممالک محروسہ سرکارعالی کے ہر بڑے گاؤں میں لڑکوں کے لیے مدرسہ تحتانیہ اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ نسوان شاہی مستقر تعلقہ پر مدرسہ وسطانیہ (مڈل اسکول) مستقر ضلع پر مدرسہ فوقانیہ (ہائی اسکول) کا قیام عمل میں آیا —

(۲) سٹی ہائی اسکول، اورنگ آباد ہائی اسکول اور زنانہ ہائی اسکول نام پلی کو کالج بنایا گیا —

(۳) محبوبیہ گرلز اسکول نے جو ہندوستان میں اس وقت سب سے اچھا مدرسہ فوقانیہ نسوان ہے، مرحوم کے عہد نظامت میں ترقی کے مدارج حاصل کیے —

(۴) عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد کے علاوہ مستقر صوبہ پر مدارس تعلیم المعلمین و معلمات کھولے گئے —

(۵) دارالترجمہ کے قیام اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے - ابتدا میں کچھہ عرصہ تک کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے صدر کی حیثیت سے بھی کارگزار رہے —

(۶) مرحوم یوں تو ہر ملک کی تعلیمی حالت سے واقف تھے لیکن جاپان کی تعلیمی ترقی سے اس قدر متاثر تھے کہ اس راز کے دریافت کرنے کے لیے دو دفعہ جاپان گئے اور وہاں کے حالات سے واقف ہوکر اس قدر دلچسپ اور عمدہ رپورٹ پیش کی جو انگریزی میں شایع ہوئی ہے یہ کتاب اس موضوع پر سب سے عمدہ اور معیاری (اسٹانڈرڈ) تسلیم کی جاتی ہے —

(۷) تحت تانیم اسکیل سررشتۂ تعلیمات کے ملازمین کے اضافۂ تنخواہ کا اسکیل انہیں کے عہد نظامت میں منظور و نافذ ہوا —

(۸) صدر مہتمموں کی جدید اسکیم جس میں سررشتۂ تعلیمات کے عہدہ داروں کے لیے (۵۰۰ تا ۸۰۰) اور (۵۰۰ تا ۱۰۰۰) کی خدمتیں منظور ہوئیں وہ انہیں کی سعی پیہم کا نتیجہ ہے —

(۹) سررشتۂ تعلیمات کا ضابطہ (کوڈ) ترتیب دیا گیا - وسعت تعلیم کے لیے جد و جہد انہیں کے وقت میں شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت تمام ملک علم کی شعاعوں سے منور ہے —

مرحوم نے براعظم یورپ کے بڑے حصے کا سفر کیا - فرانس، جرمنی، آسٹریا اور انگلستان میں رہے اور وہاں کی یونیورسٹیوں اور طریقۂ تعلیم کو دیکھہ کر کافی تجربہ حاصل کیا —

وہ اس خیال کے بہت بڑے موید تھے کہ " ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو " ان کا خیال تھا کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں بھی ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیے اگرچہ وہ اس کو پورا نہیں کرسکے —

ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا - عالم ' فاضل ' پنڈت ' درویش ' مسلم عیسائی ' ہندو ' پارسی ' انگریز ' فرانسیسی ' جرمن ' جاپانی ' سب ان کے دوست تھے اور ہر ملک و مذہب و ملت کے اہل علم سے ان کے خاص مراسم تھے —

ان کا قلب صاف اور دل وسیع تھا کسی قسم کا تعصب نہیں تھا - سب کے ساتھ یکساں حسن سلوک سے پیش آتے تھے - قوم کی ترقی کا بہت خیال تھا - لوگوں کی ترقی سے خوش ہوتے تھے - ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندو اور مسلم مل کر ہندوستان کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں —

اردو زبان کے بہت بڑے حامی اور اردو شعرا کے کلام کے قدرداں تھے - " انتخاب زرین " کے نام سے اردو اشعار کا ایک انتخاب شایع کیا - غالب کا اردو کلام بہت پسند تھا - دیوان غالب اردو کا اچھا اڈیشن سب سے پہلے مرحوم نے شایع کیا - مراثی انیس کے دیدہ زیب اڈیشن آپ کی یادگار ہیں - اردو کی بہترین کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن چھپوانے کا بہت شوق تھا - انجمن ترقی اردو کے صدر تھے - ان کا خیال تھا کہ اردو اور ہندی مشترکہ سعی سے علمی زبان کا درجہ حاصل کرے - چنانچہ اندور میں ہندی یونیورسٹی کے قیام کا جو جلسہ ہوا تھا اس کے یہ رکن تھے —

مرحوم کو کتابوں سے محبت تھی اور کتب بینی کا شوق تھا - رات میں سونے سے پہلے کتب بینی بطور لازمی نظام الاوقات میں شامل تھی —

اردو اور انگریزی میں نہایت عمدہ شستہ اور دلچسپ تقریر کرتے تھے - اورنگ آباد کالج کے یوم کلیہ میں جاپان کے تعلیمی نظم و نسق پر آپ کی تقریر یادگار ہے - انگریزی اردو اور فرانسیسی زبان میں ان کی تحریر نہایت موثر اور بامحاورہ ہوتی تھی' صفحے کے صفحے زبانی بے تکلف لکھواتے تھے - مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جاپان کی تعلیم پر جو کتاب انگریزی میں شایع ہوئی ہے وہ مسلسل منضبط خیالات کے تحت ڈکٹیٹ کرائی گئی ہے —

آخری زمانہ میں مثنوی مولانا روم رح اور امام غزالی رح کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا اور دونوں کی تصانیف سے اس قدر متاثر تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر کلکتہ میں جو لکچر دیا ہے اس میں بھی امام غزالی رح کا ذکر ہے —

عمدہ عمدہ مغلئی اور انگریزی کھانوں کے شوقین تھے - ہمیشہ احباب کو دعوتیں دیتے اور مزے مزے کے کھانے کھلا کر خوش ہوتے - ہندوستانی کھانوں میں خاص کر حیدرآباد' دلّی اور لکھنؤ کے لذیذ ترین کھانوں کے شائق اور ان کے بقا کے حامی تھے' چنانچہ ایک مدرسے کے افتتاح کی اسکیم پیش کی تھی جہاں اس قسم کے کھانوں کے پکانے کی تعلیم دی جائے —

مختصر یہ ہے کہ مرحوم خوش رو' خوش خو' خوش گفتار' خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے - دعا ہے کہ خدا اپنے جوار رحمت میں ان کو خوش رکھے گو وہ ہم سے جدا ہوگئے

ہیں لیکن اپنی خوبیوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے —

مضمون طویل ہوگیا ہے اوصاف ان گنت باقی ہیں مجبوراً میں مولانا حالی مرحوم کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں —

تمہیں کہتا ہے مردہ کون ' تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری نیکیاں زندہ ' تمہاری خوبیاں باقی

ایک وداعی نظم

سید راس مسعود کے ایک ہندوستانی دوست جنہیں حیدرآباد میں ملازمت مل گئی تھی، وہاں کے حالات سے ایسے گھبرائے کہ استعفیٰ دے کر گھر جانے کی تیاری کی۔ اس وقت مرحوم نے طرح طرح کے محبت آمیز حیلے بہانے سے انہیں پرچایا اور نوکری نہ چھوڑنے دی۔ لیکن چند سال بعد جب خود مرحوم کی مدت معہود پوری ہوئی تو کسی کے کہنے سننے کو نہ مانا اور پنشن لے کر حیدرآباد سے ولایت روانہ ہوگئے۔ اس موقع پر ان دوست نے ذیل کی طعن آمیز نظم لکھ کر پیش کی اور خود مرحوم سے داد لی۔ نظم کے آخری بند میں ایک قصے کی طرف اشارہ ہے جسے مسعود ہی نے اپنے احباب کو سنایا تھا۔ ملک چین میں قاعدہ ہے کہ دفن کے بعد قبر کو پانی سے خوب تر کردیتے ہیں۔ ایک بوڑھے شوہر کی جوان بیوی شوہر کی آخری علالت میں بہت روئیں پیٹیں اور قسم کھائی کہ ایسے چاہنے والے خاوند کی یاد میں ہمیشہ بیوہ رہوں گی۔ شوہر، عورتوں کے مزاج سے واقف تھے بہت کچھ رد و قدح کے بعد آخر میں بیوی سے صرف یہ عہد لیا کہ جب تک میری قبر نہ سوکھ جائے تم دوسری شادی نہ کرنا۔ اتفاق سے ان کے مرتے ہی کسی دولت مند جوان کا بیوی کے پاس پیام آگیا۔ اس پر وہ اتنی بے تاب ہوئیں کہ مرنے والے کی قبر پر پہنچیں اور پنکھا جھلنا شروع کیا کہ کسی طرح قبر جلد خشک ہوجائے اور عہد

پورا کرتے ہیں وہ دوسری شادی رچاتے ہیں :

۱ - بہت سودا گراں بازار میں الفت کے ہوتی ہیں
بہت دعوے محبت کے ترے شبنم کے موتی ہیں
دیا کرتا تھا جو درس وفا ، خود پا بہ کشتی ہے
امیدیں دوستداری کی کھڑی ساحل پہ روتی ہیں

۲ - خدا حافظ مرے معمورۂ الفت کے غارت گر
ترے پھرتے ہی میری دید و دانش پھر گئی یکسر
گماں ہوتا ہے مجھ کو رات پر اب صبح صادق کا
مجھے سورج نظر آتا ہے اب ظلمت کا پیغمبر

۳ - ترے میلان نازک میں تھا زور دلربائی بھی
کشش تیری مٹا دیتی تھی رنج نارسائی بھی
مگر غافل تھا دل اس سے کہ ان خوش رنگ رشتوں میں
نہیں قوس قزح سے بڑھ کے تاب دیر پائی بھی

۴ - تلون میں ترے نیرنگ گردوں کے اشارے تھے
اُفق پر مہر تاباں تھا کبھی دھندلے ستارے تھے
غبار گُل مہک تھی ، رنگ تھا کرنوں کا اک چھلنا
وہ بیٹھے آج روتے ہیں جنہیں کل پھول پیارے تھے

۵ - ترے وعدوں پہ بھولی دوستی ایمان لاتی تھی
امید خام گویا جال میں پانی پھنساتی تھی
مگر تو نے وفا اس چمن کی بو سے سیکھی تھی
کہ جو جہل جہل کے پلکھا تیر شوہر کو سکھاتی تھی

(۹)

سر سید راس مسعود مرحوم

از

(نگارش مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)

ایک مرتبہ حیدرآباد میں شام کے وقت میں سید راس مسعود صاحب سے ملنے ان کے مکان پر گیا تو دیکھا کہ بہت افسردہ و کبیدہ بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سررشتۂ تعلیم کی ایک ذیلی کمیٹی نے کسی کتاب پر انعام دینے کی سفارش کی تھی وہ سرکار سے نامنظور ہوئی اور حکم کے الفاظ ایسے تھے جن میں کمیٹی والوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا تھا - مجھے تو وہ عبارت سن کر ہنسی آرہی تھی مگر دیکھا تو مرحوم کی آنکھوں میں فی الواقع آنسو بھر آئے ہیں - حالانکہ وہ اس کمیٹی میں شریک نہ تھے نہ براہ راست حکم کا تعلق ان کی ذات سے تھا لیکن چونکہ سفارش ان کی وساطت سے اوپر گئی تھی اس لیے انہیں اتنا رنج ہوا گویا خود وہ مخاطب ہیں - میں نے انہیں سمجھانے اور بات کو ٹالنے کی کوشش بھی کی مگر وہ کسی طرح شگفتہ نہ ہوئے —

مرحوم کے کمال ذکی الحس ہونے کی یہ ایک مثال ہے جو مجھے اس وقت یاد آئی - یہی ذکاوت ان کے تمام اوصاف طبیعی بلکہ پوری ذہنی اور جسمانی زندگی میں کارفرما نظر آتی ہے - علمائے نفسیات اسے اعصاب کی لطیف و نازک ساخت پر محمول کریں گے - اعصاب کیا ہیں ؟

باریک رگوں کے تار، جو آدمی کے جسم و دماغ میں قدرت نے پھیلا دیے ہیں اور جن کی بناوٹ میں انسان کی سعی و صنعت کو مطلق دخل نہیں، یہ سن کر فلاسفۂ صوفیہ کا وہ نظریہ یاد آتا ہے کہ دنیا پتلیوں کا تماشا ہے اور ان کے تار پردے کے پیچھے بازی گر کے ہاتھ میں ہیں!

"خیال حسن" کو حسن عمل سمجھنا نری شاعری ہے ورنہ مرحوم کا شمار اہل عرفان میں ہوتا۔ ان کا دل اور ان کی نظر ہر چیز میں حسن کو ڈھونڈتی اور چن لیتی تھی اگر چہ ان کے معیار حسن پر مغربی ذوق و تربیت کا بہت اثر تھا۔ وہ جامع مسجد دہلی کے سامنے بھربھونجوں کے بچوں کو ننگا پھرتے دیکھ کر سخت کراہت کرتے تھے لیکن یورپ کی برہنگی بھی ان کے خیال میں حسن مذاق سے عاری نہ تھی۔ ابتدائی یورپی تعلیم و معاشرت نے مرحوم کو جس طرح اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا وہ اہل مشرق کے لیے بصیرت کا سبق ہو سکتا ہے۔ طبعاً مشرقی، ہندوستان کے ایک شریف و قدیم خاندان سے ہونے اور قومی عصبیت رکھنے کے باوجود، سچ یہ ہے کہ مسعود خالص ہندوستانی حلقوں میں اجنبیت سی محسوس کرتے تھے اور غالباً ان کی دلی تمنا یہ تھی کہ ہو سکے تو یورپ کے کسی شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلیں —

'فنون لطیفہ' خصوصاً شاعری کے سچے دلدادہ تھے اور شاید یہی وہ چیز تھی جس میں اپنی مشرقی تعلیم کی کمی کو انہوں نے ولایت سے آنے کے بعد ذاتی شوق اور مطالعے سے پورا کیا تھا۔ حتیٰ کہ آرنلڈ و گوئٹے کے کلام کے پہلو بہ پہلو اب وہ 'شاد' عظیم آبادی کی غزلوں تک کا مزا لینے لگے تھے۔ دس پانچ فارسی شعروں کا انگریزی نظم میں ترجمہ کرنے کے سوا، جہاں تک مجھے معلوم ہے خود کبھی شاعری نہیں کی۔

ممکن ہے اس کا سبب بھی یہی ہو کہ اردو اور اس کی عروض پر قابل اعتماد قدرت حاصل نہ تھی - بخلاف اس کے انگریزی زبان میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور مغربی ادبیات پر ایسی نظر تھی کہ بہت کم ایشیائی لوگوں کو یہ بات میسر آتی ہے لیکن ان کے ذوق سلیم اور نکتہ رس طبیعت سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی کہ مادری اور قومی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں اثر انگیز و ولولہ خیز شعر کہنا محال ہے - ایک مرتبہ احباب نے بہت تقاضا کیا کہ حیدرآباد کی ایک ادبی مجلس کے لیے وہ بھی کچھہ لکھیں - مرحوم اسی زمانے میں جاپان کے سفر سے واپس آے تھے - دوستوں کی خاطر وہیں کے تاثرات پر ایک مختصر نثر شاعرانہ تحریر کی اور اس کا اردو میں بڑے اہتمام سے ترجمہ کرا کے مجلس مذکور میں سنایا - مرحوم کی یہ تصنیفی یادگار محفوظ ہے اور اس مضمون کے آخر میں اسے میں نے نقل کردیا ہے —

کمال ذہانت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کے ساتھہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور تازہ تھا - اس جامعیت کے باوصف ان سے اپنے بزرگ دادا کی طرح کسی علمی کارنامے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی - ان کی عملی قوت' ان کے حوصلوں کی بلندی کا ساتھہ دینے کے قابل نہ تھی اور لگاتار محنت و جاں کاھی کے کسی کام کا بوجھہ اٹھانا' انہیں دشوار تھا - اور جیسا کہ میں نے شروع میں اشارہ کیا' تنقید و مزاحمت سے بھی ان کی حساس طبیعت جلد گھبرا جاتی تھی —

لیکن خاندانی وجاہت یا علمی و ملکی خدمات سے بڑھکر جس چیز نے ایک دنیا کو مرحوم کا گرویدہ بنادیا وہ ان کی صفات ذاتی تھیں جن کی بنا پر یہ کہنا کچھہ مبالغہ نہ ہوگا کہ مرحوم تہذیب و شرافت

کا ایک نادر نمونہ تھے- ان کی مروت و فیاضی' خیر و ہمدردی'
آشنا پرستی و دوست نوازی نے' جہاں کہیں وہ رہے وہاں احباب
اور مداحوں کا گروہ کثیر ان کے گرد جمع کردیا اور ذوق کی نفاست و
خوبی' حسن صورت و جامہ زیبی' خوش گفتاری و بذلہ سنجی نے'
جس کسی سے ملے اسے اپنا فریفتہ بنالیا- حقیقت میں کشش و محبوبیت
کے جتنے عناصر ان کی ذات میں جمع تھے کسی ایک شخص میں کم
دیکھے گئے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کے ذاتی دوستوں اور معتقدوں
کی کثیر و ہمہ گیر تعداد کا صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے —

مرحوم ایک دنیا دار آدمی تھے- اور زندگی میں ہر قسم کے
تلخ و ترش واقعات انہیں پیش آئے- ذاتی قابلیت اور خاندانی اثر
کے باوجود اغراض و مقاصد دنیوی کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کشمکش ضرور
کرنی پڑی لیکن یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ وہ ہمیشہ اور بڑی حد تک
اس اخلاقی کثافت و دنائت سے پاک و بری رہے جو دنیاداری کا لازمہ
ہے- میں اسے انسانی سیرت کی بڑی فضلیت و کامیابی اور مرحوم کی
شریف خصلت کا سب سے درخشاں جوہر سمجھتا ہوں- جیسا کہ استاد
نے اندازؔ دیا ہے:

چو غنچہ گر چہ فروبستگی ست کار جہاں
تو ہمچو باد بہاری گرہ کشا می باش!

"جاپان"

نثر

(از سید راس مسعود مرحوم)

طلوع آفتاب کی سر زمین میری نظر میں ایشیا کا مطلع آرزو ہے۔ اس کی پھولوں سے لدی ہوئی وادیوں میں اور اس کے زمردیں جزیروں کے جھرمٹوں میں، مجھے وہ انشراح صدر ہوا کہ 'ماضی' اور حال و مستقبل ایک نظر آنے لگے۔

آج ایشیا پر یاس کی تیرگی چھائی ہوئی ہے لیکن میرا وجدان تیز اس پردۂ سیاہ کے پار گزر گیا اور میں نے حسن و جمال کی وہ پرعظمت و جلال تصویر دیکھی جس سے انسان کی چشم فانی ہنوز نامحرم ہے۔ شب ماہ میں مقدس 'فجی یاما' کمال دلآرائی کے باوصف وہ شان و خوبی نہیں رکھتا جو میرے منظر تصور میں پیدا ہو گئی تھی۔

ایک مرتبہ جاپان کے ایک جنگل میں کہ عہد گذشتہ کی یادگاروں سے مملو ہے، میرے کانوں میں بزرگان پیشیں کی صدائیں سرسرانے لگیں۔ یہ صدائیں مجھ سے کہتی تھیں: "اے وہ کہ ہماری سر زمین میں ایک عزیز نووارد ہے، اپنے مضطرب دل کو صبر و سکون دے۔ وہ اذیتیں جو آج تیرے حق میں سوہان روح ہیں، بہت دن ہمیں بھی تڑپا چکی

ہیں - فراموش نہ کر کہ صبر مشرق کا بزرگ ورثہ ہے اور صبر و پر خلوص عمل ہی میں وہ طاقت پنہاں ہے جس کے ذریعے تیرے ہم قوم وہ چیز پیدا کریں گے جسے پیدا کرنے کے متمنی ہیں - یہ نسخۂ اکسیر ہمیں تیرے ہم وطن 'بودھ' نے سکھایا تھا وہی ہم تجھے یاد دلاتے ہیں کیونکہ تیری قوم نے بظاہر اسے بھلا دیا ہے - " صدائیں رک گئیں - میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں مغرب کی طرف تکنے لگا جہاں میرا وطن واقع تھا اور جدھر آفتاب کندنی غبار میں آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا ! —

قطعہ تاریخ وفات مسعود جنگ بہادر

حسب فرمائش ڈاکٹر سراج یار جنگ بہادر

نوشتہ جمادی الاول سنہ ۵۶ ھجری

از

(جناب مولوی سید ہاشمی فریدآبادی صاحب)

۱ - دھرِ ستم کیش کا دیکھنا طرزِ ستم
حسن کہ تھا تاجِ سر آج ہے زیرِ قدم

۲ - سچ ہے کہ ہر ہست کا نیستی انجام ہے
کر سکی تاویل عقل دل کی اذیت نہ کم

۳ - ملّتِ غم دیدہ میں موت نے مسعود کی
سید مرحوم کا کر دیا تازہ الم

۴ - دیکھی ہیں موتیں بہت ہے یہ مگر مرگ سخت
جھیلے ہیں غم بارہا ہے یہ مگر شاہ غم

بجھ گیا دل ہاشمی - غیب سے آئی صدا
اب ہے وہ شمع خموش تھا جو چراغ حرم
۱۳۵۶ ھ

سر راس مسعود

از

(جناب میاں بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا - اڈیٹر ہمایوں لاہور)

سر راس مسعود مرحوم کو جس طرح ہزاروں اور جانتے تھے اسی طرح میں بھی جانتا تھا - باوجود اس کے میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا ان سے ایک خاص تعلق تھا اور مجھے یقین ہے کہ سینکڑوں اور اصحاب کو بھی اسی قسم کا احساس ہوگا - یہی مرحوم کی ایک خاص خوبی تھی - دوستوں کا دوست، ان سے محبت رکھنے والا، ان کے کام آنے والا، بے تکلفی کی صحبتوں میں گویا ایک چاند کا ٹکڑا جس کی روشنی ایک ایک دل پر پڑتی تھی، اتنا بڑا آدمی تھا لمبا چوڑا وجیہ جوان لیکن جب پیار کی باتیں کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موتی ہے کہ ہمارے ہی دل کی گہرائی سے نکلا ہے - مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا - اور میں نے علیگڑھ اور دوسرے مقامات میں اُن کی پبلک سر گرمیوں کو قریب سے کبھی نہ دیکھا تھا فقط دور سے اس قوی ہیکل پُر رعب ہستی کی حکمرانی کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا - میرے حصے فقط ان کی دوستداری آئی اور مجھ چھوٹے سے وجود کے لیے اس بڑے آدمی کی یہی اک بات کافی تھی!

آکسفورڈ میں سنہ ۱۹۱۰ ع میں جب میں گیا تو میں نے سنا کہ راس مسعود

یہاں تھے لیکن اب جا چکے ھیں - لیکن پھر بھی ان کے ساتھہ ایک ھی یونیورسٹی کے رکن ھونے کو میں نے محسوس کیا اور اس خیال سے لطف اتھایا —

اس سے پہلے اور انگلستان میں بھی میں نے کبھی ان کو دیکھا نہ تھا - میرا تعلق ان سے اس وقت تک ایک غیر ذاتی سا تعلق تھا - والد مرحوم (جسٹس شاہ دین) بچپن میں مجھے سر سید علیہ‌الرحمة اور سید محمود مغفور کے قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے اور میں پہروں ان سے لطف اتھایا کرتا تھا - ان کو سن کر کچھہ ایسا محسوس کرتا تھا کہ مولانا شبلی کی الفاروق میں جو فضا عکس ریز ھے اس کا ایک ٹکرا تیرہ صدیاں پھاند کر علیگڑہ کی فضا میں جلوہ گر ھوگیا ھے - مجھے خوب یاد ھے کہ برسوں ھوئے ایک شام میری والدہ محترمہ نے مجھے بتایا کہ عمر میں فقط دو دفعہ تمہارے اباجان نے آنسو بہائے ایک جب ان کے بڑے بھائی میاں ظہور الدین صاحب نے وفات پائی کہ انہیں نے ان کو پالا اور پڑھایا اور تربیت دی اور دوسرے جب قوم کے رھنما سر سید اس جہان فانی سے رخصت ھوے کہ وہ قومی کاموں میں حصہ لینے کی وجہ سے سر سید اور سید محمود سے ایک خاص ذاتی تعلق رکھتے تھے -

مجھے قومی کاموں سے بجز کچھہ علمی و ادبی کام کرنے کے بہت کم واسطہ تھا پھر بھی سر راس مسعود سے ملنے سے پہلے ھی مذکورہ بالا حالات کی بنا پر ایسا معلوم ھوتا تھا کہ میں ان کو خوب جانتا ھوں اور مجھے ان کو اچھی طرح جاننا چاھیے —

مجھے یاد نہیں کہ میں پہلی بار کب ان سے ملا لیکن سر سید کے خاندان کی روایات اور مسعود صاحب کے قد و قامت نے مل جل کر

مجھہ پر کچھہ ایسا اثر ڈالا کہ میں اس کو بھول نہیں سکتا - میں سمجھتا ہوں کہ یہی اثر اکثر اور اصحاب پر ہوگا —

جو باتیں ان سے ہوئیں جو قصے وہ سنایا کرتے تھے ان کا چہرہ ان کی آواز وہ غالب اور بہتوں اور شعرا کے اشعار ایک خاص انداز میں پڑھنا ان کے گراموفون کے ریکارڈ اور اور سیکڑوں باتیں ہیں کس کس کا ذکر کیا جائے؟ اس کے لیے ایک مضمون نہیں ایک کتاب درکار ہے - یہ باتیں دل کی دل ہی میں رہیں تو ٹھیک ہے —

سر سید راس مسعود

از

(عبدالحق ' اڈیٹر اُردو)

سنہ ۱۸۹۴ع میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ ہی میں ہوا - اس وقت اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس تھا - ابتدائی نام اس کا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھا ' لیکن سید محمود نے اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ صرف مشرقی تعلیم یا ملّاؤں کی کانفرنس ہے اور کچھہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی مناسبت سے یہ دوسرا نام تجویز کیا اور منظور ہوگیا - اس زمانے کی کانفرنس کا رنگ ہی کچھہ اور تھا - لوگ بڑے شوق اور رغبت سے آآکر شریک ہوتے تھے - یوں تو ہر صوبے کے لوگ ہوتے تھے لیکن پنجاب اور یوپی والے کثرت سے نظر آتے تھے - شوق و رغبت کی وجہ تھی - ایک تو سر سید اس وقت زندہ و سلامت موجود تھے ' ان کی تقریریں اور باتیں سننا تو ایک طرف ان کی زیارت کرلینا ہی بڑی بات تھی - ان کا بھاری بھرکم جثّہ ' پُر رعب چہرہ ' ان کی شان اور ان کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے - جب وہ ہال میں آتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جہاز آرہا ہے - دوسرے مولانا حالی کی دل

ہلا دینے والی نظمیں، مولانا شبلی کے عالمانہ مضامین، مولانا نذیر احمد کی دھلواں دھار اور پر لطف تقریریں روز روز کہاں سننے میں آتی تھیں یہ موقع نصیبوں سے مل جاتا تھا - کبھی کبھی نواب محسن الملک بھی آ نکلتے تھے اور اپنی خوش بیانی سے سب کو رجھا جاتے تھے - مولوی نذیر احمد کا لکچر سر سید آخری دن رکھتے تھے تاکہ لوگ جانے نہ پائیں، اور واقعی اس کے انتظار میں برابر جمے رہتے تھے - ان کے لکچر کے دن سننے والوں کا ایسا ٹھٹھ لگ جاتا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی - سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں بہت سے ذی علم، باوضع اور نامور لوگوں سے ملنے کا موقع مل جاتا، جو یوں برسوں نصیب نہ ہوتا - غرض یہ بڑی پر لطف صحبت ہوتی تھی اور شرفا کا بڑا اچھا مجمع ہوتا تھا -

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اسی سال اور اسی کانفرنس کے اجلاس میں مسعود کی بسم اللہ ہوئی - گویا سر سید نے اسی روز سے اپنے اکلوتے پوتے کو قوم کی نذر کر دیا تھا - اسٹریچی ہال کے صدر میں چبوترے پر خاص خاص لوگ بیٹھے تھے - وہیں مسعود کو لا کر کرسی پر بٹھایا - مسعود کی ایک طرف راجہ جے کشن داس تھے اور دوسری جانب پروفیسر آرنلڈ - چنانچہ سید نے اپنی تقریر میں اسی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ دائیں جانب میرا ڈاڑھی منڈا ہندو دوست ہے جسے سید محمود چچا کہتے ہیں اور بائیں جانب عیسائی مذہب کا انگریز - کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کسی مذہب و ملت سے تعصب نہیں اور میں انہیں بھی ایسا ہی عزیز سمجھتا ہوں جیسے اپنے مسلمان بھائیوں کو - بسم اللہ پڑھانے کے لیے جھنجھانے سے ایک دلیہانوسی مولوی (پھولپوری) بلائے گئے تھے، انہوں نے بسم اللہ پڑھائی - غالباً یہ مولوی اکبر کے خاندان کے تھے - اس کے بعد سر سید نے

مختصر مگر بہت پر لطف اور پر اثر تقریر فرمائی جس میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ میرے خاندان کی یادگار صرف یہ ایک بچہ ہے۔ اگرچہ میں غریب ہوں مگر ایسا گیا گزرا بھی نہیں کہ یہ تقریب ذرا دھوم دھام سے نہ کرتا اور دل کے حوصلے نہ نکالتا۔ لیکن میں برا نمونہ پیش نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے بدلے میں انہوں نے پانسو روپے کالج کے نذر کیے اور ان کے بعض دوستوں نے بھی کالج کو کچھہ کچھہ رقمیں دیں۔ اس تقریب کے وقت کانفرنس کے تمام نمایندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے۔ اور سب ایسے خوش خوش نظر آتے تھے گویا اپنے کسی خاص عزیز کی تقریب میں شریک ہیں۔ سید کی خوشی میں سب کی خوشی تھی۔ تقریب کے خاتمے پر شیرنی تقسیم ہوی۔ ان موتی چور کے لڈوں کا مزہ مجھے اب تک یاد ہے —

ایک روز میں سید محمود کے پاس بیٹھا تھا، مسعود اندر گھر میں سے نکل کے آے تو میں نے کہا کہ یہ اب بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔ کہنے لگے میں اسے خود پڑھاؤں گا اور پھر طریقۂ تعلیم اور اصول تعلیم پر لکچر دینا شروع کردیا۔ محمود تو کیا پڑھاتے، دادا ہی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ایسی ہی ہوئی جیسے مسلمانوں کے پرانے شریف خاندانوں میں ہوا کرتی تھی۔ کالج کے مشہور حافظ بخشا انہیں قرآن پڑھاتے تھے اور تختی پر لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ مگر ان کا خط کبھی اچھا نہ ہوا —

وہ دادا ہی کی آنکھوں کے سامنے رہتے اور وہیں پڑھتے لکھتے تھے۔ ایک سال میں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا۔ ایک دن سید صاحب نے مولوی حمیدالدین مرحوم اور مجھہ سے فرمایا کہ میرے

کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں انہیں کسی وقت آکر ترتیب سے لگا دو۔ سید صاحب کا قاعدہ تھا کہ صبح کام کرنے بیٹھتے تو بارہ ایک بجے تک کام کرتے اور پھر کھانا کھا کے تھوڑی دیر سستانے کے لیے وہیں لیٹ جاتے۔ ایک روز دوپہر کو اُسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کررہے تھے اور سید صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور مسعود اُن کی بغل میں لیٹا تھا۔ اتنے میں سید صاحب نے اپنی بھاری گلجھٹی آواز میں مسعود کو لوری سنانی شروع کی۔ ہمیں ان کے گانے کی آواز سنکر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کرسکے اور چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے۔ وہ مسعود کو بہت عزیز رکھتے تھے' وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھا اور ساری امیدیں اُسی پر تھیں۔ سر سید نے اپنی کوٹھی ہی کے احاطے میں ایک چھوٹا سا مکان بنا دیا تھا جس میں مسعود پڑھتے تھے۔ اس مکان کا نام "مسعود کا مکتب" پڑگیا تھا۔

دادا کے مرنے کے بعد مسعود یتیم سے ہوگئے۔ سید محمود کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی اور مسعود کا ان کے پاس رہنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا گیا۔ آخر کچھ دنوں کے بعد وہ مسٹر ماریسن (سرتھیوڈور) کے ہاں اُٹھ گئے۔ ماریسن اور ان کی بیوی نے ان کو اس طرح پالا پرورش کیا جیسے کوئی اپنے بیٹوں کی پرورش کرتا ہے۔ اور ان کے اخلاق و آداب کی نگرانی اسی طرح کی جیسے مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں ہوتی ہے۔ دونوں میاں بیوی ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے یہ تعلقات آخر دم تک رہے۔ مسعود بھی اپنے تمام معاملات میں سرتھیوڈور سے اسی طرح مشورہ کرتے جیسے کوئی اپنے بزرگوں سے کرتا ہے اور اُن کا بڑا لحاظ کرتے تھے —

سید محمود کی وفات کے بعد دو سو روپیہ ماہانہ جو سر سید کو گورنمنٹ سے بصلۂ خیر خواہی ملتے تھے، محمود بیگم کے نام ہوگئے - یہ بھی سر تھیوڈور ماریسن ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا —

سر تھیوڈور کے چلے جانے کے بعد مسعود کالج میں داخل ہوگئے - میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کالج کی جماعت میں داخل ہوے - تھوڑے ہی دنوں بعد گورنمنٹ نے انہیں ولایت کا تعلیمی وظیفہ دے کر انگلستان بھیج دیا - آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کی سند بھی لی - پانچ سال بعد ہندستان آئے تو پٹنے میں وکالت شروع کی - لیکن وکالت میں اُن کا دل نہ لگا - اور جب انہیں گورنمنٹ نے پٹنہ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری پیش کی تو انہوں نے قبول کرلی - اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہوگئے - سنا ہے کہ وہ اپنے طلبہ اور کالج کے پروفیسروں میں بہت مقبول تھے - اور جب حیدرآباد میں ناظم تعلیمات کا عہدہ خالی ہوا تو اُن کی خدمات گورنمنٹ انگریزی سے حیدرآباد میں مستعار لے لی گئیں - ان کے بلانے میں (سر) اکبر حیدری نے خاص طور پر کوشش کی - یہ ۱۹۱۶ ع کا واقعہ ہے —

نظامت تعلیمات پر فائز ہونے کے کچھ دنوں کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اورنگ آباد کا دورہ کیا - میں اُس زمانے میں صوبۂ اورنگ آباد کا صدر مہتمم تعلیمات تھا - انہوں نے میرے ہاں قیام کیا - اس سے قبل میں نے انہیں سرسری طور سے کئی بار دیکھا تھا، اب حقیقی ملاقات ہوئی —

جس زمانے میں یہ حیدرآباد آئے تو یونیورسٹی قائم ہونے کی ابتدائی تحریک ہو چکی تھی - مسعود اول اول ذرا مذبذب رہے -

کیونکہ اس وقت دیسی زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم دینے کا مسئلہ ایسا تھا جو مشکل سے کسی کے خیال میں آ سکتا تھا - اور اگر خیال میں آئے بھی تو اس کا عمل میں لانا ایک ڈراؤنا خواب معلوم ہوتا تھا - ساری مشکل یہ تھی کہ هندستان کی کوئی زبان اس بار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی - لیکن جب کامل غور اور گفتگو کے بعد انہیں اس امر کا یقین ہوگیا کہ صحیح طریقہ یہی ہے اور تعلیم کا حقیقی منشا صرف اپنی زبان هی کے ذریعہ سے پورا هو سکتا ہے تو انہوں نے پورے انہماک کے ساتھ اس منصوبے کو عمل میں لانے کی تائید کی جسے اس وقت بعض لوگ جنون سے تعبیر کرتے تھے اور اکثر اس جسارت پر حیرت زدہ تھے اور اس جدت بلکہ بدعت کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے - اس کے بعد وہ جب تک حیدرآباد میں رہ جامعۂ عثمانیہ کی کامیابی اور ترقی کے لیے برابر ساعی رہے اور جب تک کسی مستقل پرنسپل کا تقرر نہ ہوا انہوں نے کچھ دنوں تک پرنسپلی کی خدمت بھی انجام دی —

ناظم تعلیمات کی حیثیت سے وہ سب سے زیادہ کامیاب رہے - اس سے قبل یہاں کی تعلیم میں اس سرعت کے ساتھ کبھی ترقی نہیں ہوئی تھی - انہوں نے تعلیم کی اصلاح اور ترقی کے لیے نئی نئی اسکیمیں بنائیں اور اپنے ذاتی اثر اور کوشش سے ان تجویزوں کو عمل میں لانے کے لیے گورمنٹ سے بڑی بڑی رقمیں منظور کرائیں - اور سر ریجنالڈ گلانسی اور سر اکبر حیدری نے (جو یکے بعد دیگرے صدرالمہام فنانس ہوے) ان کو مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کیا - جس وقت نظامت تعلیمات کی خدمت اپنے هاتھ میں لی تو مدارس کی تعداد ۱۲۵۴ اور طلبہ کی تعداد ۹۳۲۸۹ تھی اور جب وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تو مدارس کی

تعداد ۴۱۸۸ اور طلبہ کی تعداد ۲۷۱۸۴۱ تھی - کتنا عظیم الشان فرق ہے - سب سے زیادہ انہوں نے ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کی جو تعلیم کے ہر شعبے کی اصل بنیاد ہے - اُن کے برتاؤ اور ہمدردی اور اخلاق نے عہدہ داران تعلیمات پر ایسا جادو کر رکھا تھا کہ وہ لوگ اشاعت تعلیم کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر کرتے تھے اور اُدھر افسران بالا ان کی اس قدر و قعت اور عظمت کرتے تھے کہ ان کی ہر تجویز بلا تامل منظور کرلیتے تھے -

انہیں اس خدمت پر بارہ سال ہوئے تھے کہ گھبرا کر بھاگنے کی ٹھانی - نظام گورمنٹ سے ان کا معاہدہ تھا کہ دس سال خدمت کرنے کے بعد اگر وہ سبکدوش ہونا چاہیں گے تو گورمنٹ انہیں ایک ہزار روپیہ وظیفہ دے گی - چنانچہ وظیفہ لے کر اپنی صحت کی اصلاح کے لیے ولایت سدھارے - ان کی صحت در حقیقت اچھی نہیں رہی تھی —

حیدرآباد کے زمانۂ ملازمت میں ایک بار وہ رخصت لے کر جاپان اور کوریا کی سیاحت کے لیے گئے اور دوسری بار نظام گورمنٹ نے جاپان کے تعلیمی نظم و نسق کی تحقیق کے لیے بھیجا - وہاں سے آکر جو رپورٹ انہوں نے اس ملک کی تعلیم پر لکھی ہے وہ ان کی اچھی یادگار ہے - جاپان کے مناظر اور جاپان والوں کے بے حد مداح تھے - ان کے ایثار، حب وطن اور جفاکشی کی بے انتہا تعریف کرتے تھے - خود اس کتاب (تعلیمی نظم و نسق جاپان) کے لکھنے والے کا قلم اور دل ان جذبات سے متاثر معلوم ہوتا ہے - جاپان کی اعلیٰ سوسائٹی میں انہوں نے بڑا اچھا اثر پیدا کیا اور بعض سے انہوں نے گہرا دوستانہ پیدا کرلیا تھا —

حیدرآباد سے جب جانے لگے ہیں تو بڑے بڑے منصوبے تھے کہ یہ کروں گا اور وہ کروں گا - جب وہ یہ کہتے تھے تو مجھے سید محمود یاد آجاتے تھے' اُن کے

بھی بڑے بڑے منصوبے تھے ' یہی نہیں بلکہ جو کتابیں وہ لکھنا چاہتے تھے ان کے خاکے تیار رکھے تھے اور ابواب اور فصول کی پوری تفصیل قلمبند تھی ' کچھہ دنوں تو وہ جرمنی وغیرہ میں اپنی صحت کی اصلاح میں مصروف رہے ' اس کے بعد جب اچھے ہوئے تو ان کو دو مختلف مقامات سے دو متضاد خدمتیں پیش ہوئیں - اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ نے انہیں اپنی گورنمنٹ کی پولٹیکل سکرٹری کی خدمت پر لینا چاہا اور اسی اثنا میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی وائس چانسلری تھی جو ان کے لیے حاضر تھی - حیدرآباد کی ملازمت نسبتاً بہت آسان ' بہت پر لطف ' ان کی طبیعت کے عین مطابق ' تنخواہ زیادہ اور آیندہ کی ترقی کی قوی امید - ادھر مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری بڑی مشقت طلب ' تھوڑی اور کٹھن خدمت تھی ' جو اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ بنا دے اور بڑے بڑوں کو ناک چنے چبوا دے - اس میں ہاتھہ ڈالنا بلا مبالغہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھہ ڈالنا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید احمد خاں کی روح نے مسعود کے دل پر القا کیا کہ پھولوں کی سیج کو چھوڑ کر کانٹوں بھری گدی قبول کرلی - ان کا یہ ایثار فی الحقیقت قابل قدر تھا - یہاں بھی سر تھیوڈور ماریسن کی سعی اور ہمدردی کارفرما تھی - اُس کشمکش کے زمانے میں جب کہ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے ہندستان کے کونے کونے میں تلاش ہو رہی تھی ' سر تھیوڈور کا خط میر ولایت حسین صاحب کے نام پہنچا - خط کیا تھا از غیبی گولہ تھا - اس خط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہندستان کے مسلمانوں سے کس قدر گہری ہمدردی تھی اور مسعود کی اُن کے دل میں کیسی کچھہ قدر تھی - انہوں نے

اس میں لکھا تھا کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آپ لوگ اپنی یونیورسٹی کے لیے پرووائس چانسلر کا انتخاب نہ کرسکے اور گورمنٹ سے اس بارے میں مدد چاہی' گویا اپنی ناقابلیت کا اقرار کرلیا اور اپنا اختیار گورمنٹ کو دیدیا۔ ایک انگریز پرووائس چانسلر کے دل میں آپ کی کیا قدر ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ آپ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ میں خود' اور مسٹر بیک اور مسٹر آرنلڈ جن کا نام علی گڑھ میں کام کرنے والوں میں بڑی تعریف کے ساتھہ لیا جاتا ہے' معمولی انگریز تھے مگر سرسید کی صحبت میں کام کے آدمی بن گئے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اول مسعود کو اُس کے دادا کی جگہ بٹھاؤ یعنے وائس چانسلر بناؤ اس کے بعد وہ خود اپنا پرووائس چانسلر تجویز کرلے گا۔ ایک فقرہ اس میں بڑا زبردست تھا۔ وہ یہ کہ اگر حضرت جبرئیل بھی آسمان سے اُتر آئیں تو مسلم یونیورسٹی کو نہیں سنبھال سکتے اور کوئی یہ کام کرسکتا ہے تو وہ مسعود ہے۔ نواب صاحب بھوپال جو اپنی والدہ (یونیورسٹی کی چانسلر) کی قائم مقامی کر رہے تھے۔ اس بارے میں بڑے متفکر اور کوشاں تھے۔ وہ مسٹر لٹل ہیل کو جو گورنمنٹ آف انڈیا میں کمشنر تعلیمات تھے' اس خدمت پر لینا چاہتے تھے۔ ان سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا میں سوچ کر جواب دوں گا۔ چند روز بعد انہوں نے ایک صاحب کو جو اس معاملے میں بہت پیش پیش تھے اور خود بھی یونیورسٹی کی کونسل میں گھسنا چاہتے تھے' لٹل ہیل کے پاس بھیجا کہ جاکر دریافت کریں کہ کیا فیصلہ کیا۔ مجھے بھی ان صاحب کے ساتھہ کردیا کہ اگر انہیں (لٹل ہیل کو) کچھہ عذر ہو

یا کسی قسم کے شبہات ہوں تو میں ان کا اطمینان کردوں - اس سے ایک روز پہلے مسٹر ماریسن کا خط یار لوگوں نے کسی ترکیب سے اُڑا کر شایع کردیا تھا - اس کے پڑھنے کے بعد اس نے صاف کردیا - اب معاملہ کورٹ میں پیش ہوا - کورٹ کا اجلاس شروع ہوا تھا کہ یکایک بیگم صاحبہ بھوپال آ پہنچیں - سب ششدر و حیران رہ گئے کہ یہ کہاں ! - سب کے سب تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے - نواب سر مزمل خاں بہادر (وائس چانسلر) کرسی صدارت چھوڑ کر الگ جا بیٹھے - بیگم صاحبہ نے خود ایک مختصر اور پر اثر تقریر میں مسعود کا نام تجویز کیا اور اس کی تائید کے لیے حاضرین کو ترغیب دی - یہ کہہ کر وہ جس طرح آئی تھیں اُسی طرح یکایک چلی گئیں - کورٹ میں چند تقریروں کے بعد مسعود کا نام بالاتفاق منظور کر لیا گیا —

مسعود سا وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو کبھی نصیب ہوا تھا نہ شاید آئندہ ملے - یہ کم نصیب یونیورسٹی اُس زمانے میں عجیب خلجے میں پڑی ہوئی تھی - اُس کی بدنامی اور رسوائی دور دور تک پہنچ گئی تھی - حاسدوں کو حیلہ ہاتھ آگیا تھا ، انہوں نے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا - مسعود کے آتے ہی رنگ بدل گیا - اُس نے اپنی ذاتی وجاہت اور اثر اور کوشش سے بدنامی کا دھبّا مٹایا ، کھوئے ہوے وقار کو قائم کیا ، بڑھایا اور اوج تک پہنچا دیا - مایوسی کو امید سے بدل دیا - طلبہ اور اساتذہ میں ایک نئی زندگی پیدا کردی - روپیہ اتنا لایا کہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا - سید احمد خاں کو اگر اس کا عشر عشیر بھی ملتا تو انہیں شادیء مرگ ہوجاتی - سائنس کا شعبہ اس کی ایسی یادگار ہے کہ جب

تک یونیورسٹی قائم ہے اُس کی یاد تازہ رہے گی - لیکن ایک کام جو بہت ضروری تھا اور مسعود ہی کو کرنا چاہیے تھا ' وہ رہ گیا اور اُس کی نوبت نہ آئی - یعنی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی اصلاح و ترقی - یہ شعبہ اس وقت جس کس مپرسی کی حالت میں ہے وہ قابل افسوس ہے - اب یہ اُن کے جانشین کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں - اور جس طرح مسعود شعبۂ سائنس بناکر اپنی یادگار چھوڑگئے ہیں یہ شعبۂ اردو کو ایسا وسیع اور مضبوط بنا جائیں جو مسلم یونیورسٹی کی شان کے شایان ہو —

طلبہ میں وہ خاص طور پر مقبول تھے - ایک تو اُن کے ذاتی اخلاق ایسے تھے کہ آدمی ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا ' دوسرے طالب علموں سے انہیں دلی ہمدردی تھی اور طرح طرح سے اُن کی مدد کرتے تھے - کالج کے کسی پرنسپل یا سکرٹری یا یونیورسٹی کے کسی وائس چانسلر کا برتاؤ طلبہ سے ایسا ہمدردانہ نہیں رہا تھا نہ کسی نے طالب علموں کی ایسی دستگیری کی تھی جیسی مسعود نے - علاوہ وائس چانسلر کے فنڈ کے جو انہوں نے طلبہ کی امداد کے لیے قائم کیا تھا جس کے لیے جگہ جگہ سے سر پر سوار ہوکر روپیہ سمیٹ سمیٹ کر لاتے تھے ' وہ اپنی جیب سے بھی نادار طلبہ کو وظیفے دیتے تھے ' سفارشیں کرتے تھے ' نوکریاں دلواتے تھے ' اُن کی مشکلوں میں کام آتے تھے ' جائز معاملات میں ان کی حمایت کرتے تھے ' ان کے وقار کو اپنا وقار اور ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے - نام نمود کی خاطر یا تالئے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ ان کے سچے خیر اندیش اور بہی خواہ تھے - اور طلبہ بھی ان سے ویسی ہی محبت کرتے تھے اور ان کی سعادتمندانہ اطاعت کرتے تھے —

لیکن افسوس کہ وہ مسلم یونیورسٹی میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکے اور نہ رہ سکتے تھے - زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھہ سکتے - وہ بڑھتے ہوے کو گرانا اور اٹھتے ہوے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں - اس میں اُنہیں خوشی ہوتی ہے - کُبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے ہی سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے - اُن کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضا ہے - جس معاملے پر وہ شکستہ خاطر ہوکر مستعفی ہوگئے وہ کوئی بڑا معاملہ نہ تھا لیکن آنے والے طوفان کی خبر دے رہا تھا اگر اس وقت نہ جاتے تو غالباً آئندہ بری طرح جانا پڑتا - وہ اگر چاہتے تو بہت آسانی سے اپنے مخالفوں کو نیچا دکھا سکتے تھے - کورٹ میں اُن کے حامیوں کی بہت زیادہ تعداد تھی اگر ان کا ایک اشارہ بھی پاتے تو اس قدر تعداد میں آجاتے کہ مخالفین کی کچھہ پیش نہ جاتی - لیکن جتھے بندی اور جوڑ توڑ سے انہیں طبعی نفرت تھی ' وہ اس عیب کو مسلم یونیورسٹی سے مٹانا چاہتے تھے ' اس لیے اس حربے سے کام لینا وہ موجب عار سمجھتے تھے - وہ لوگ سوچ سمجھہ کر اور مسلّح ہوکر آے تھے اور یہ نہتّے جا پہنچے - نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں عزت کے ساتھہ پسپا ہونا پڑا - لیکن جن حضرات نے انہیں نکالا وہ بھی اپنی حرکت سے کچھہ خوش نہیں ہوئے ہوں گے - بلکہ میرا خیال ہے کہ انہیں سب سے زیادہ پچھتانا پڑا ہوگا - کیونکہ ان کا یہ منصوبہ کہ مسعود کو نکال کر اپنی کسی کٹ پتلی کو اس جگہ لائیں ' پورا نہ ہوا اور اس طرح انہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی جس کے وہ مستحق تھے —

اس سے ایک یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ مسعود میں مقابلے کی

قوت مطلق نہ تھی - وہ بڑے ذکی الحس تھے - ذرا سی مخالفت میں پریشان ہوجاتے تھے، خاصکر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی تو انہیں بڑا صدمہ ہوتا تھا - اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے - کارزار دنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا - یہاں چر کے بھی سہلے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے - جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے پسپا ہوجانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اسے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے —

علی گڑھ سے جو اُٹھے تو سیدھے یورپ چل دیے - یہ ان کی عادت تھی - جب وہ کسی معاملے سے سخت پریشان ہوتے تو انگلستان کا رخ کر دیتے - حیدر آباد میں بھی یہی ہوا —

یورپ سے واپسی پر نواب صاحب بھوپال نے ازراہ قدردانی انہیں اپنے ہاں ایک اعلیٰ خدمت پر لے لیا - وہاں بھی انہوں نے بہت سے بھلائی کے کام کیے، بہت سے غریبوں کی مدد کی اور بہت سے زخمی دلوں پر مرہم رکھا - میرا قیاس ہے، ممکن ہے غلط ہو، کہ وہاں وہ کچھ زیادہ خوش نہ تھے - البتہ ایک بات سے وہ ضرور خوش تھے - کہتے تھے کہ مجھے خوش قسمتی سے ایک شخص کے ماتحت کام کرنا پڑتا ہے جس سے میں جی کھول کر اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں اور جو اچھی بات اور اچھے کام کی قدر کرتا ہے - آخر یہیں اپنی زندگی کی آخری منزل ختم کردی اور علی گڑھ میں اپنے باپ اور دادا کے پہلو میں جا سوئے —

مرنے والے میں بہت سی خوبیاں تھیں - آدمی کو کچھ تو ورثے میں

باپ دادا سے ملتا ہے، کچھہ تعلیم و تربیت اور ماحول سے اور کچھہ اپنی سعی اور ارادے سے - مسعود کو پہلی دو شقوں سے زیادہ حصہ ملا تھا - وہ باپ کی طرح بلند و بالا، وجیہہ، خوش شکل اور تنو مند تھے - آواز بھی سید محمود سے بہت ملتی تھی خصوصاً جب کبھی وہ گہری اور بلند آواز سے بولتے تھے - ایک بار میں ان کے مکان میں اندر کمرے میں بیٹھا تھا، یہ برآمدے سے گزرے، چونکہ اوپر کا حصہ نظر نہیں آتا تھا صرف ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں مجھے دفعتاً یہ خیال ہوا کہ محمود جا رہے ہیں - حافظہ بھی ان کا ایسا ہی قوی تھا جیسا سید محمود کا - ایک بار بھی کسی کو دیکھہ لیا تو پھر نہیں بھولتے تھے - بعض وقت ان کے غیر معمولی حافظے کو دیکھہ کر حیرت ہوتی تھی - تخمیناً اٹھارہ بیس سال ہوتے ہیں جب میں سر اکبر حیدری لیڈی حیدری اور مسعود میسور کے جنگلوں سے گزر رہے تھے کہ یکبارگی انہوں نے موٹر ٹھہرائی اور ایک شخص کو جو سڑک کی دوسری طرف کھڑا تھا، اشارے سے پاس بلا لیا اور اس کا نام لے کر اس کا مزاج پوچھا اور دوسرے حالات پوچھے - وہ حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے جو اس بے تکلفی سے اس کا نام لے کر احوال پوچھہ رہا ہے - آخر ان سے نہ رہا گیا اور کہا کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں - اس بیچارے نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو کہا تمہیں یاد نہیں ہم تم اسکول کی فلاں جماعت میں ساتھہ پڑھتے تھے - میرا نام یہ ہے - یہ سن کر اسے اور بھی حیرت ہوئی - اور ہم سب نے ان کے حافظے کی بہت داد دی - ایک بار جو پڑھ لیتے یا سن لیتے تو عموماً ان کے حافظے میں نقش ہو جاتا تھا - حالی صد سالہ جوبلی کی ایک صحبت میں انہوں نے اقبال کے شعر سنانے شروع کیے، سر محمد اقبال بھی وہاں موجود تھے،

وہ کہنے لگے کہ ان کو میرے اس قدر شعر یاد ہیں کہ خود مجھے بھی یاد نہیں - آخر زمانے میں مثنوی مولانا روم کا دور رہتا تھا ، شاید یہ بھی اقبال ہی کا اثر تھا - یہی کیفیت سید محمود کی تھی کہ اُن کے حافظے کا خزانہ معلومات سے مالا مال تھا اور حافظ اور خیام کے تو وہ حافظ ہی تھے —

اگرچہ قوی ہیکل اور بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے لیکن زیادہ جفاکشی اور مشقت کے متحمل نہیں تھے - وہ کسی قدر نازک طبع واقع ہوے تھے - لیکن دوسروں سے کام لینا خوب جانتے تھے - یہ سلیقہ میں نے یا تو نواب محسن الملک میں دیکھا یا مسعود میں - اُن کے مددگار یا اہلکار اس طرح خوشی خوشی کام کرتے تھے جیسے کوئی اپنا کام کرتا ہے - کام کرنے والوں کی قدر بھی بہت کرتے تھے اور اُنہیں فائدہ پہنچانےکی تاک میں رہتے تھے - اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے - وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے - دوسروں کے کام نکالنے اور فائدہ پہنچانے میں بڑے دلیر تھے - لڑکر جھگڑکر خوشامد سے چاپلوسی سے غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے - اس طرح انہوں نے سیکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا - اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا - ایک تو اُن کی ذاتی وجاہت ، دوسرے وہ خوش تقریر ایسے تھے کہ جو کہا منوا لیا - اسی وجہ سے اُنہیں حیدرآباد اور علی گڑھ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی —

وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے ، مصیبت زدوں کی داستان سن کر اُن کا دل بھر آتا تھا اور فوراً مدد کے لیے آمادہ ہو جاتے - ایسے متعدد واقعات میرے سامنے پیش آے - خود میں نے اُن سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے کام نکالے - مشکل کے وقت اُن کے دوست انہیں آ گھیرتے تھے وہ

بلا تامل سینہ سپر ہو جاتے تھے - یہاں تک کہ انھوں نے بعض ایسے دوستوں کو مصیبت اور تباھی سے بچایا جو شاید اس کے مستحق نہ تھے - سر محمد اقبال نے ایک موقع پر خوب کہا کہ مسعود نے دماغ باپ کا اور دل دادا کا پایا ھے —

پہلے وہ سر تھیوڈور ماریسن کی نگرانی میں رھے اس کے بعد انگلستان چلے گئے - اس لیے اُن کی اردو فارسی کی تعلیم نہ ہوسکی - جب وہ حیدرآباد آئے تو انھیں یہ کمی محسوس ہوی اور محض اپنی کوشش اور مطالعہ سے ان زبانوں میں خاصی دستگاہ حاصل کرلی - اردو فارسی کے اساتذہ کا کلام بے تکلف پڑھتے تھے اور ان کی داد دیتے تھے اور کثرت سے شعر یاد تھے - یہاں بھی اُن کے حافظے نے اُن کی یاوری کی —

نواب عماد الملک بہادر کے انتقال کے بعد انجمن ترقیِ اردو کے صدر مسعود ھی منتخب ہوے - انجمن سے انھیں بڑا شغف تھا اور اس پر اُن کا بڑا احسان ھے - اس کے لیے انھوں نے جگہ جگہ سے چندے وصول کیے - اپنے لوگوں سے تو خیر انھوں نے رقمیں وصول کی ھی تھیں ' انگریزوں سے بھی چندے لیے اور انھیں لائف ممبر بنایا - اور صرف ھندوستان ھی کے انگریزوں سے نہیں بلکہ جب وہ انگلستان گئے تو وھاں سے بھی روپیہ وصول کرکے لاے - اور سب سے بڑا کمال یہ کیا کہ سیاحت جاپان کے زمانے میں جاپانی جیسی قوم سے جو دنیا بھر کو لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھر رھی ھے ' انجمن کے لیے چندہ لے کر آے - اب کہ انجمن نے وسیع پیمانے پر کام کرنے کا تہیہ کیا ھے اُن سے بڑی بڑی توقعات تھیں - انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد وہ انجمن ھی کے لیے کام کریں گے اور اس کی مالی حالت کو مستحکم کرکے چھوڑیں گے - لیکن افسوس کہ وہ اس سے پہلے ھی چل بسے —

اردو زبان کے بڑے حامی تھے اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے - چنانچہ میر انیس کے مرثیے انھوں نے مولانا طباطبائی سے مرتب کرا کر نظامی پریس بدایوں میں طبع کرائے - خود اردو شعرا کے کلام کا ایک انتخاب "انتخاب زریں" کے نام طبع کرایا —

طبیعت میں نفاست پسندی بہت تھی - صفائی کے دلدادہ تھے - اچھی چیز کو دیکھ کر پھڑک جاتے تھے - بڑی صفائی اور سلیقے سے رہتے تھے - کھانے کے اور خاص کر ہندوستانی کھانے کے بڑے شوقین تھے - خوب کھاتے اور کھلاتے تھے - جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے کھلاتا تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے - اور اس سے بہت برا مانتے تھے کہ لوگ انھیں انگریزی مذاق کا آدمی سمجھتے ہیں —

اُن کا مزاج اور مذاق کچھ ملا جلا تھا ' کچھ ہندی اور کچھ انگریزی - لیکن ان دونوں کو انھوں نے ایسے سلیقے سے ملایا تھا کہ خاص نفاست اور حسن پیدا ہوگیا تھا ۔ وہ کبھی کبھی خالص مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے ' لیکن اکثر وہ ٹھیٹ ہندی تھے اور یار دوستوں سے کھلے ڈلے بے تکلف رہتے تھے - ظرافت ' چھیڑ چھاڑ اور شوخی ان کی طبیعت کا جز تھی - بعض وقت صبح کو ان کے ہاں جائیے تو کیا دیکھئے کہ کرتا پجامہ پہنے یا دلائی اوڑھے پلنگ پر پلوتھی مارے بیٹھے ہیں اور ارد گرد یار دوست کرسیوں پر موجود ہیں اور گپ شپ ہو رہی ہے اور یہ بیچ میں بیٹھے بلبل ہزار داستاں کی طرح چہک رہے ہیں - جہاں بیٹھتے یا پہنچ جاتے تو ساری مجلس پر چھا جاتے اور طرح طرح کے لطیفے اور چٹکلے سناتے تھے اور اس وقت سراپا بہار اور گل و گلزار

معلوم ہوتے تھے - ان باتوں سے لوگ ان کے گرویدہ ہوجاتے - اپنے باپ کی طرح یہ بھی بہت خوش گپ تھے —

بڑے ذہین اور طباع تھے - مطالعہ کا بہت شوق تھا اور بڑا اچھا کتب خانہ جمع کیا تھا - جو کوئی عمدہ کتاب شائع ہوتی فوراً منگاتے اور پڑھتے - جتنا وقت کام سے اور ملنے جلنے سے بچتا وہ سب مطالعہ میں صرف ہوتا - انگریزی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی - فرانسیسی خوب جانتے تھے اور بلا تکلف بولتے تھے - ان کے کتب خانے میں زیادہ انگریزی اور فرانسیسی کتابیں تھیں - اپنے دوستوں کو بھی مطالعہ کی ترغیب دیتے اور بعض اوقات جو کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب چھپتی تو اس کی تعریف کرکے اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دلاتے —

تعصب ان کے مزاج میں نام کو نہ تھا - ہر مذہب و ملت کے لوگ اُن کے دوست تھے اور سب سے یکساں مخلصانہ برتاؤ کرتے تھے اور سب کے کام آتے تھے - حال میں جو ہندی اردو کا قصہ چھڑا تو مجھے انہوں نے خاص طور پر کہا کہ دیکھو اسے فرقہ واری چیز نہ بنانا ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے - بھولے سے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہ کہتے تھے جو کسی فرقے والے کو ناگوار ہو —

جہاں رہے مقبول خاص و عام رہے - اُن کی مقبولیت کا عالم کوئی حیدرآباد میں دیکھتا - جب یہاں سے جانے کی ٹھن گئی تو دنوں پہلے ان کی دعوتوں کے اوقات مقرر ہوگئے تھے ' اس زمانے میں انہیں ایک وقت بھی اپنے گھر کھانا نصیب نہ ہوا اور بہت سے دوست جو ان کی دعوتیں کرنا چاہتے تھے محروم رہ گئے - ٹاؤن ہال میں جب انہیں پبلک کی طرف سے اڈریس دیا گیا تو تمام ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا -

مہا راجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنۃ بہادر صدر اعظم اور نواب ولی الدولہ بہادر اسٹیشن پر ان سے بغلگیر ہوئے - مہا راجہ بہادر نے انہیں پرانی صناعی کے نفیس تحفے دیے - رخصت کے وقت اسٹیشن پر ہجوم کا یہ حال تھا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی اور اندر باہر تمام اسٹیشن بھرا ہوا تھا اور ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھتا چلا جاتا تھا - آدمی جب بر سر اقتدار ہوتا ہے تو خوشامد میں ہزاروں استقبال اور مشایعت کے لیے آموجود ہوتے ہیں - لیکن جب اقتدار و اختیار سے کنارہ کش ہوکر معمولی شخص رہ جائے اور پھر اسے قبول عام حاصل ہو تو سمجھو کہ وہ آدمی ہے - یہ مقبولیت یا تو کسی زمانے میں نواب محسن الملک بہادر کو حاصل ہوئی تھی یا اس زمانے میں نواب مسعود جنگ کو —

افسوس ہماری قوم میں سے ایک ایسا اچھا آدمی اُٹھ گیا - زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی - اس سے ہمیں بہت سے کام لینے تھے - تاہم اس عمر میں بھی اُس نے ایسے کام کیے جو دوسروں سے نہ ہوسکے - گو اس وقت وہ ہم میں نہیں ہے مگر اس کی یاد ہمارے دلوں میں ہے -

پنچھی اُڑ گیا پر ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے —

سید راس مسعود مرحوم

از

(سر ریجینالڈ گلانسی صاحب کے - سی - ایس - آئی '

کے - سی - آئی - ای)

[سر ریجینالڈ گلانسی ' کے - سی - ایس - آئی ' کے - سی - آئی - ای حیدرآباد میں وزیر فنانس تھے اور سر سید راس مسعود مرحوم کے خاص دوستوں میں سے تھے - جس زمانے میں جامعۂ عثمانیہ کی تجویز ہوئی تو انہوں نے اس تحریک سے بڑی ہمدردی ظاہر کی اور اس عظیم الشان کام کے آغاز اور انجام دہی کے لیے وقتاً فوقتاً جو بیش قرار رقموں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس قسم کی تجویزوں کی منظوری کی تائید کی - اسی طرح سررشتۂ تعلیم کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں بھی انہوں نے بڑی امداد کی تھی - مسعود مرحوم ان کے بہت ممنون تھے اور ان کے دل میں سر ریجینالڈ گلانسی کی بڑی عزت اور محبت تھی - اور یہی حال سر ریجینالڈ کا تھا ' جیسا کہ ان کے خط اور مضمون سے ظاہر ہے - سر ریجینالڈ بہت اچھا ادبی اور علمی ذوق رکھتے ہیں - ذیل میں ان کا خط جو انہوں نے مجھے تحریر فرمایا درج کیا جاتا ہے - اڈیٹر]

Terrace- Palace- Hotel **5. 9. 1937**

Engelberg (schweiz)

Wintersport

G. Fassbind, Besitzer.

Dear Mr. Abdul Haq.

Your letter of 25th August has followed me here when we are spending a short holiday. I should be sorry not to oblige you in the matter of Ross-Masood seeing the my great affection I had for him but I have no practice in writing for the press and you must excuse me if what I send you is not quite what you want. Do not consider yourself bound to publish because I have complied with your wishes. Put the enclosed in the waste paper basket if it does not suit you. All I ask is that if you publish-it shall be verbatim I only wish I could do justice to my greatest friend of all my Indian friends. His loss as you say is irreparable and I condole with you most sincerely on the loss in your sphere of work as apart from the personal loss which you must feel deeply too. With Kindestregards and best wishes.

Yours sincerely.

R. R. Glancy

Sir S. Ross Masood was the heir to a great tradition and the education of Indian and particularly of Moslim youth was his life mission. For this task his upbringing at centres, so diverse in outlook and method as Aligarh, Oxford and paris, was an excellent preparation. His interest was in consequence world-wide and perhaps for this reason he was able to achieve far more for education in the short times allotted to him,than the type of scholar whose life is devoted to one subject alone. Dying so young he has yet left his mark on education in India. In the case of the Osmania University the principle may have been carried too far or not carried far enough: but at any rate here for the first time in an Indian University the principle has been established that the proper medium of instruction is a man's own mother-tongue. This in itself is an achievement sufficient to confer distinction on any career, but above and

beyond this was his remarkable services to Aligarh Uuiversity and to Urdu literature. Unfortunately his physical strength was unequal to the strain imposed by the task he set before him, and from his break down at Aligarh he never really recovered. Had he lived longer and retained his health, his influence and character would have been of the greatest value to his country men in the changing conditions of the modern world. Impetuous, generous to a fault, uncompromising he was the soul of honour, a man of indomitable courage and determination, an aristocrat in the true sense of the word. In his younger days he was the best of good company and could hold any audience entranced with his wit and the stories of his adventures. With the decline of his health he became more and more subject to fits of depression and was seldom the confident, joyous Masood of the old days. But his friends will always remember him as he was in his prime, a leader of men.

(ترجمہ)

سر سید راس مسعود بڑے نامی بزرگوں کے جانشین تھے اور ہندوستانی خصوصاً مسلمان طلبہ کی تعلیم ان کی زندگی کا مقصود ہوگیا تھا - خود ان کی تربیت، علی گڑھ، آکسفورڈ اور پیرس کے علمی مرکزوں میں ہوئی جہاں کے اصول عمل اور زاویۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور یہ ان کے مذکورۂ بالا کام کے لیے نہایت عمدہ تیاری تھی - اسی تربیت کی بدولت ان کی دلچسپیاں اس قدر ہمہ گیر ہوگئیں اور شاید یہی سبب تھا کہ اتنی تھوڑی عمر میں جو ان کے حصے میں آئی مرحوم تعلیم کے حق میں اتنا کچھ کام کرگئے کہ وہ ارباب علم کسی طرح انجام نہ دے سکتے تھے جن کی تمام توجہ ایک ہی مضمون سے وابستہ رہی ہو -

اس قدر کم عمری میں مرنے کے باوجود بھی مرحوم نے ہندوستان کی تعلیم پر اپنا نقش ثبت کردیا ہے - جامعۂ عثمانیہ کے معاملے میں ممکن ہے اس اصول سے کام لینے میں افراط کی گئی ہو اور یا پوری

طرح کام نہ لیا گیا ہو - بہر حال یہ پہلا موقع ہے کہ ہندوستان کی ایک یونیورسٹی میں یہ اصول مان لیا گیا کہ آدمی کا مناسب ذریعۂ تعلیم خود اس کی مادری زبان ہے - اس اصول کو یہاں قائم کر دینا بجائے خود ایسا کارنامہ ہے کہ جس نے اسے انجام دیا اس کی خدمات کو ممتاز بنا دینے کے لیے کافی ہے - اس کے علاوہ اور مزید برآں مرحوم کے وہ مشہور کام ہیں جو انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی اور ادبیات اردو کے واسطے کیے - افسوس ہے کہ ان کی جسمانی قوت اس قدر کام کی جو انہوں نے اپنے ذمے لیا تھا برداشت نہ لا سکی اور علی گڑھ میں صحت بگڑنے کے بعد پھر وہ حقیقت میں پوری طرح کبھی تندرست نہ ہوئے - اگر ان کی عمر کچھ اور وفا کرتی اور صحت درست رہتی تو نئی دنیا کے بدلتے حالات میں مرحوم کی وجاہت وکردار اپنے ہم وطنوں کے لیے نہایت بیش بہا چیز ہو سکتی تھی —

اپنی بات پر اڑنے، ضرورت سے زیادہ فیاض اور زود کار ہونے کے باوصف، مرحوم سراپا دیانت، صاحب عزم و استقامت اور صحیح معنی میں خاندانی امارت کا نمونہ تھے - جوانی میں حلقۂ احباب کی رونق ان کے دم سے تھی اور اپنی ظرافت سے نیز عجیب عجیب واقعات زندگی سنا کر وہ ہر قسم کے سامعین کو مبہوت بنا سکتے تھے - جب تندرستی خراب ہوئی تو روز بروز افسردہ دلی کا غلبہ اکثر رہنے لگا اور پھر وہ پہلے سے با حوصلہ اور زندہ دل مسعود شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے - بایں ہمہ مرحوم کے دوست ان کی وہی حالت ہمیشہ یاد رکھیں گے جب کہ مسعود کا عالمِ شباب تھا اور وہ لوگوں کے رہبر و پیش رو تھے —

سید راس مسعود

از

(مسٹر ایڈورڈ مارگن فارسٹر)

[مسٹر ایڈورڈ مارگن فارسٹر' سر سید راس مسعود مرحوم کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے - مسعود مرحوم کو ان سے خاص محبت تھی اور انھیں اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتے تھے ۔ مسٹر فارسٹر کے خط کے ایک ایک لفظ سے (جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے) ان کی محبت اور رنج و الم کا اظہار ہوتا ہے -

مسٹر فارسٹر کا انگلستان کے درجۂ اول کے ناول نویسوں اور ادبی نقادوں میں شمار ہے - ان کے ناول اور ان کی تحریریں انگلستان نیز ان تمام ممالک میں جہاں انگریزی رائج ہے بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں - وہ دو بار ہندستان آچکے ہیں - ان کا ایک ناول ہندستان کے متعلق ہے جس کا نام "A Passage to India" ہے - یہ بہت مقبول ہوا اور بعض نقادوں کی رائے میں رڈیارڈ کپلنگ کی مشہور کتاب "Kim" سے کہیں بہتر ہے —

مسٹر فارسٹر کنگس کالج (کیمبرج) کے سابق فیلو اور ابرڈین کے آنریری ایل ایل - ڈی ہیں - رائل لٹریری سوسائٹی نے انھیں بینسن میڈل عطا کیا - اڈیٹر]

Station Gomshall.

17. 9. 1937.

West Hackhurst

Abinger, Hammer

Dorking

Dear Mr. Abdul Haq.

Your letter of August 25 th reached me after some delay. I was very glad to hear from you and to learn that you propose to issue a special number of *Urdu* in memory of our beloved friend. When I heard of his death I tried to write something for the *Times*, but I could not, I was too much shattered by the news. Now I have written the enclosed for you at your request, and I hope it may be acceptable.

It is written in rather colloquial, idiomatic, English and I hope for that reason the translation in to Urdu will be done by some one who like your self is well acquainted with modern English speech. I did not wish to adopt a formal style in writing about Masood, since he would not have wished it himself. I do not know whether it is the practice of Urdu to append a few facts about its contributors but in case it is I add a few about myself.

The above is my home address and communications had better be addressed to it. I count it a great privilege to contribute to your memorial number and I thank you very warmly for writing to me. It is many years now we met. I hope you keep fairly good health.

With very kind regards and good wishes.

Yours sincerely.

E. M. Forster

Masood had many English friends, but I may claim to be the oldest and most intimate of them. I have known him for thirty years, and we kept in touch the whole time. I have been with him not only in England but have twice visited him in India and have also been his guest in France and Germany. I cannot speak of our affection here it does not seem the time or the place — but I am thankful to pay this tribute to it and to his memory. There never was any one like him and there never will be any one like him. He cannot be judged as ordinary men are judged. My own debt to him is incalculable. He woke me up out of my rather suburban and academic life, showed me new horizons and a new civilisation and helped me towards the understanding of India. Until I met him, India was a vague jumble of rajahs, sahibs, babus, and elephants, and I was not interested in such a jumble : who could be ? He made everything real and exciting as soon as he began to talk, and seventeen years later, when I wrote my novel ' A Passge to India ' I dedicated it to him out of gratitude as well as out of love, for it would never have been written without him.

Masood was essentially an artist. Those who knew him as an official may be surprised at this statement, but though his career was administrative his temperament was aesthetic. He lived by his emotions and instincts' and his standards were those of good taste. "Don't be so damned inartistic" he would say to me if he wanted to criticise my conduct. For logic, and for ethical consistency, he had very little use. He had an artist's recklessness over money; he was fantastically generous, incredibly hospitable, and always happiest when he was giving something away. He was a patron of the arts and a connoisseur; he loved good books, coins and engravings : when he went to Japan he made a collection of coloured prints there, and gave them away to me afterwards. His aesthetic judgements were not always sound, but they were always vehement and came from the very depths of his being. As a young man he had an unbounded admiration for the poetry of Alfred de Musset, and in later life when a play of Tolstoy's was put on in London and took his fancy he went to see it no less than eight times. A narrow professional critic may smile at such enthusiasms, but those of wider

outlook will understand them, and recognise their sincerity and their stimulating effect on others. One might disagree with him but he never left one cold. With his temperament, he naturally felt most at home in the country that has honoured art most, and that country is neither India nor England but France. He loved Paris; he spoke French very well, with a perfect accent.

What did he think of the English ? He handled them splendidly. If they patronised him, he let them have it back, very politely, and I have often been amused at the way in which Englishmen and Englishwomen who had begun by giving themselves airs were obliged to drop them, and to yield to his masterful personality and his charm. There is a story – I do not know whether it is true – that he was once involved in a 'railway-carriage' incident. He was stretched full-length in an empty compartment when a British officer bounced in and said "Come on ! get out of this." Masood looked up quietly and said "D' you want your head knocked off ?"; whereupon the officer exclaimed "I say, I'm awfully sorry, I didn't know you were that sort of person", and they became excellent friends. Whether this story be true or not, it is certainly true that on another occasion he contracted to shave an Australian miner all the way from Bombay to Marseilles for the sum of one guinea, and that he kept the contract. That was how he handled the English. He overwhelmed them by his energy and his unconventionality of address.

That was how he handled them, but what did he think of them ? Leaving aside his English friends, whom he placed in a class apart, what did he feel about the Ruling Race as a whole ? Perhaps his private thoughts are best expressed in a remark which he made to me once, and which has always amused me : "As for your damned countrymen, I pity the poor fellows from the bottom of my heart, and give them all the help I can." He was irritated by the English, he was often bitter about them, but he realised that as individuals, they were awkwardly placed in India, and he extended, half humorously, his sympathy towards them in

their plight. Here I touch his official life, I am not qualified to discuss it. But I always feel that however acid he was about my countrymen, he did not really dislike them, and I attribute this to his early up-bringing; when he was a child at Aligarh, he lived with Sir Theodore and Lady Morison, and his life long friendship with both of them coloured his outlook.

Masood's real work, of course, lay with his own community, in his own country, and those who shared it will doubtless write about him best. I am, in that sense, an outsider. But I knew him very well, from a particular angle, and I have tried to keep to that angle in this inadequate contribution to his memory. When his official career is described, it must not be forgotten that he was spiritually an artist, and I have tried to emphasise this. And when his services to Islam, to India, and to the Urdu language are commemorated, it must not be forgotten that he was loved and indeed adored by men and women who differed from him in creed, in race, and in speech, but were able nevertheless to recognise his genius and the greatness of his heart.

E. M. Forster.

(ترجمہ)

مسعود کے انگریز دوستوں کی کمی نہیں - مگر میں ان کے سب سے قدیم اور بے تکلف دوست ہونے کا دعوی کر سکتا ہوں - میری ان سے تیس برس کی ملاقات تھی اور اس تمام دوران میں ہمارا ارتباط برابر قائم رہا - میں صرف انگلستان ہی میں ان کے ساتھ نہیں رہا بلکہ دو مرتبہ ہندوستان آکر ان سے ملا اور فرانس اور جرمانیہ میں بھی ان کا مہمان رہا - اپنی اور ان کی باہمی محبت کا میں کیا تذکرہ کروں کہ اس کا یہ وقت اور محل نہیں ہے - البتہ ممنون ہوں کہ اس محبت اور ان کی یاد کی عظمت کے اعتراف کا یہ موقع مجھے میسر آیا -

مرحوم کی مثل کوئی شخص نہ تھا اور نہ آیندہ کوئی ان کی مثل ہوگا۔ ھمہ شما کی طرح ان کے متعلق رائے نہیں لگائی جا سکتی - خود مجھہ پر ان کا احسان اندازے سے باھر ہے - میری کچھہ قصباتی اور مکتبی سی زندگی تھی جس سے مرحوم نے مجھے جگا کر نئی نئی دنیاؤں کی سیر کرائی، ایک نئی تہذیب کا مشاھدہ کرایا اور ھندوستان کے سمجھنے میں مدد دی - ان کی ملاقات سے قبل یہ ملک میرے ذھن میں راجہ نوابوں، صاحب لوگوں، بابوؤں اور ھاتھیوں کا ایک دھندلا سا ازدحام تھا اور مجھے اس ازدحام سے کچھہ دلچسپی نہ تھی - ھو بھی کیسے سکتی ہے؟ لیکن جب مسعود نے باتیں کرنی شروع کیں تو آناً فاناً ھر شے میں زندگی اور کشش پیدا ھوگئی - سترہ سال بعد جب میں نے اپنا ناول "ھندوستان کا سفر" تصنیف کیا تو شکر گزاری اور نیز محبت کی بنا پر اسے مسعود کے نام معنون کیا کیونکہ اس مرحوم کے بغیر وہ کبھی تصنیف نہ ھوتا —

مسعود حقیقت میں شاعر تھے - جو لوگ مرحوم سے بہ حیثیت ایک عہدہ دار کے واقف ھیں شاید یہ سن کر انھیں حیرت ھوئی ھو - لیکن گو ان کی زندگی کار فرمائی میں گزری، مزاج حسن پسند ھی رھا - جذبات و وجدان تمام عمر غالب رہے - معیار نیک و بد بھی حسن مذاق کا نمونہ تھا - جب کبھی میری کسی بات پر اعتراض کرنا ھوتا تو وہ کہا کرتے "یہ کیا بیہودہ غیر شاعرانہ حرکت ہے؟" منطق اور مقررہ اصولوں کی پابندی کا ان کے پاس کچھہ کام نہ تھا - روپے پیسے کے معاملے میں شاعروں کی سی ناعاقبت اندیشی ان کا شعار تھا - فیاضی تھی تو ایسی ھی مجذوبانہ اور مہمان نوازی تھی تو ایسی ھی ناقابل یقین - کسی

کو کچھ دیتے وقت نہ پوچھیے کہ ان کی خوشی کا عالم کیا ہوتا تھا - وہ فنون لطیفہ کے مربی اور صاحب نظر نقاد تھے - نفیس کتابوں سکوں اور کتبات سے عشق تھا - جاپان گئے تو رنگین چھاپوں کا پورا ذخیرہ فراہم کرلیا اور کچھ عرصے کے بعد سب میری نذر کر دیا - ان کی پسند گو ہمیشہ صائب نہ ہو' پرجوش ضرور ہوتی تھی اور دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی - نوجوانی میں 'الفریڈ د موسے' کی شاعری سے انتہائی شیفتگی ہوگئی تھی اور بعد میں 'تولس تای' کا ایک کھیل لندن میں دکھایا گیا اور مرحوم کو پسند آیا تو ایک نہ دو پورے آٹھ مرتبہ جاکر اسے دیکھا - ممکن ہے کوتاہ نظر نقاد یہ جوش خروش سن کر مسکرائیں لیکن جن کی نگاہ وسیع ہے وہ اس کی قدر پہچانیں گے اور اس کی صداقت اور دوسروں پر اس کے شدید انگیز اثر کا اعتراف کریں گے - ان سے اختلاف راے ممکن تھا مگر یہ ممکن نہ تھا کہ گفتگو کے بعد کوئی بے کیف رہ جاے - اپنی افتاد طبیعت کے باعث وہ اسی ملک میں زیادہ خوش رہا کرتے تھے جہاں فنون لطیفہ کی سب سے بڑھ کر قدر و منزلت کی گئی ہے اور یہ ملک ہندوستان تھا نہ انگلستان' بلکہ فرانس تھا - پیرس کے ساتھ ان کو محبت تھی اور بے عیب لب و لہجہ میں فرانسیسی بولتے تھے —

انگریزوں کی نسبت مسعود کا کیا خیال تھا؟ انہیں برتنے میں وہ کمال سلیقہ رکھتے تھے - اگر یہ لوگ مرحوم کے ساتھ کچھ شان کی لیتے تو مسعود بھی نہایت اخلاق سے مربیانہ طرز اختیار کرلیتے - میں نے بارہا یہ تماشا دیکھا اور مزہ لیا ہے کہ جن انگریز مردوں یا عورتوں نے شروع میں تمکنت برتی وہ کس طرح بتدریج سیدھے ہوگئے اور مسعود

کی مرعوب کن شخصیت اور قوت تسخیر سے ان کو دبنا پڑا - مجھے ٹھیک علم نہیں مگر میں نے سنا ہے کہ ایک دفعہ مسعود کو بھی ذیل کا ایک قصہ پیش آیا - وہ ایک خالی درجے میں لمبے لمبے پڑے تھے کہ ایک انگریز افسر آکودا اور بولا "چلو چلو یہاں سے باہر جاو" مسعود نے اطمینان سے اس کی صورت دیکھی اور کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا سر اڑا دیا جائے" اس پر وہ گھبرا کے بولا "سچ کہتا ہوں، مجھے بہت افسوس ہے - میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اس قسم کے شخص ہیں - " اور پھر ان میں خوب دوستی ہوگئی - یہ قصہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن یہ لطیفہ بے شبہ سچا ہے کہ ایک اور موقع پر انہوں نے آسٹریلیا کے ایک کان کن سے بمبئی سے مارسیلز تک ایک گنی کے عوض میں ڈاڑھی مونڈنے کا ٹھیکہ لیا اور اس تعہد کو انجام کو پہنچایا - انگریزوں سے ان کے برتاو کا طریقہ یہ تھا - اپنی مستعدی اور بے تکلفانہ مخاطبت سے وہ ان پر بالکل چھا جاتے تھے -

یہ تو برتاو کی صورت ہوئی - لیکن انگریزوں کے متعلق ان کی رائے کیا تھی ؟ اپنے انگریز دوستوں کو تو وہ سب سے الگ ایک خاص درجے میں رکھتے تھے لیکن انہیں چھوڑ کر مجموعی طور پر حکمران قوم کی نسبت ان کا خیال کیا تھا ؟ ایک بار انہوں نے یہ رائے ظاہر کی اور شاید اس میں ان کے دلی خیالات کا بہترین اظہار ہوتا ہے اور یہ مجھے ہمیشہ مزہ دیتی رہی کہ " رہے آپ کے پاجی ہم وطن تو مجھے ان پر دل سے ترس آتا ہے اور ان کی جو کچھ ممکن ہے میں مدد کرتا ہوں " مسعود انگریزوں سے جھلاتے تھے اور اکثر انہیں سخت سست کہتے تھے لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کو سلطنۃً بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور اسی بنا پر وہ نیم مزاحیہ انداز میں

ان سے همدردی کرتے تھے - مگر یہاں مرحوم کی سرکاری زندگی کا ذکر آجاتا ہے اور میں اس پر بحث کرنے کا اهل نہیں هوں - تاهم میں همیشه محسوس کرتا هوں که وہ میرے هم وطنوں سے کتنی هی سرد مہری برتیں ' حقیقت میں ان کو ناپسند نہیں کرتے تھے - اور میں اس کا سبب ان کی ابتدائی تربیت کو قرار دیتا هوں جب که علی گڑھ میں وہ بچپن سے سر تھیوڈور اور لیڈی موری سن کے ساتھہ رهے اور ان دونوں سے مدت العمر کی دوستی نے مرحوم کے دل میں انگریزوں کی طرف سے حسن ظن پیدا کر دیا —

مگر ظاهر هے که مسعود کا اصلی کام وطن میں خود اپنی قوم سے متعلق تھا اور جو لوگ اس میں ان کے شریک تھے بے شبه وہ اس بارے میں بہت خوبی سے تحریر کریں گے - اس لحاظ سے میں ایک بیرونی آدمی هوں لیکن میں نے ایک خاص پہلو سے انهیں بہت اچھی طرح دیکھا اور اس نشلہ خراج تحسین میں اسی پہلو کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی هے - جب ان کی سرکاری زندگی کا نقشه کھینچا جاے تو یه نکته فراموش نه هونا چاهیے که روحانی طور پر وہ شاعر تھے جس کو میں نے خاص طور پر جتایا هے - اور جب ان کی اسلام کی ' هندوستان کی ' اور زبان اردو کی خدمات یاد رکھی جائیں تو یه بات نه بھولنی چاهیے که مسعود کو ایسے لوگ بھی (ذکور و اناث دونوں) چاهتے بلکه اُن کے پرستار تھے جو مذهب ' نسل اور زبان میں مرحوم سے مختلف تھے - بایں همه ان کے قلب کی وسعت اور غیر معمولی ذهانت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے تھے —

سر سید راس مسعود

از

(پروفیسر ای، ای، اسمتھ)

(پروفیسر اسمتھ پہلے ٹوکیو یونیورسٹی میں تھے - سر سید راس مسعود انہیں عثمانیہ یونیورسٹی میں لے کر آئے - پروفیسر موصوف ایک فاضل اور نیک نفس انسان ہیں - شعر بھی کہتے ہیں، آج کل خدمت سے سبکدوش ہو کر اوٹی کمنڈ میں مقیم ہیں اور علمی کام کر رہے ہیں - اڈیٹر)

Very vividly do I remember the day and hour when I met Syed Ross Masood. He was a towering personality to me from the first, by a curious double contrast. For that day I had also had the honour of being introduced to the prince of Wales, who had come on the battleship Renown to visit Japan, and it was in the president's room at the Imperial University in Tokyo that I first became conscious of that slight and slim figure briming over with kindness and good humour. There, too, came the tall and sturdy personage of Masood, alternately stately and genial, courtly and brotherly, dwarfing in physique all around him, the solemn little men of Japan, who resembled him in that strange double personality which enabled them to pass, in a moment, from the utmost gravity to a twinkling radiance of features.

Who could this tall visitant be, I wondered, with his pallor and his dark hair? Was he a legate from Italy or Turkey, or a reincarnation of a provencal troubadour?

He was asking me if I could direct him to the rooms of Professor Takakusu, and I took him there, in the dilapidated taxi he had with him, the most unworthy vehicle of a superman I had ever seen.

Fate happily willed it that I was to see much more of him during the following ten weeks. Most politely he invited me to help him in his investigation of the Educational institutions in Tokyo. Today I cannot understand why, however busily employed in various Government appointments, I could have hesitated for a day in accepting that invitation.

But the sheer charm and the winning amenity of his personality, with its constant reminders of aristocratic English courtesy, very soon drew me to him as to a comrade sent to me for some purpose I did not understand.

Together for nearly three months we roamed Tokyo and the vicinity, visiting every college and higher Educational institute, interviewing the principals, invading the class-rooms, even in ladies' colleges, and setting everybody wondering who this impressive guest might be. And all this time Masood was living in the leading hotel at Yokohama, eighteen miles away, where he dispensed a kind of rich hospitality which contrasted strongly with the frugality of the people I had for fourteen years lived and worked amongst. It often made me think of the Japanese general who lived on food costing only nine sen, or a little over two annas, a day. He might have been the prince of some mysterious region in far-off India, as indeed he was, in another and even more imposing sense.

In those days, only fifteen years ago, – but what momentous years in the history of Haidarabad! – neither I nor any of my Japanese friends knew anything worth mentioning of the realm of the Nizam. But little by little, under the expansive tutelage of our guest, confirmed by the letters and telegrams he showed me, I came to realise, however vaguely, what he was trying to effect in Haidarabad, and who the men and women were who were associated with him in his administrative work.

A good many of both the brighter and the darker moments of his life were related in his inimitable way for my delectation, and often I felt that in him was one to whom some one much more fitted than I should have been playing the Boswell. His lambent humour, his deep earnestness, his convinving

argument and illuminative selection of fact and quotation,—with that impressive suggestion of power and authority yet to be revealed,—formed a combination of qualities and faculties I had never encountered in one man. He was the true cosmopolitan, with yet an ardent sense of pride in his own person and his own people that gave me an entirely new and worthier impression of Indian personality.

Our talk ranged far outside the Education in which both of us were engrossed. In fact he kept from me any intimation of whatever work he was doing in connection with his study of Japanese Education, and it was not until a year afterwards that, in his office where he was installed as Director of Public Instruction to H. E. H. the Nizam's Government, he one day asked me if I would care to listen to the preface he had written to his book on Japanese Education. I said to him: 'But you never told me you were writing a book!' Then, just like himself, he bade me read it aloud.

No, it was on his marvellous store of experience that he drew, for what was ever a most entertainingly dramatic monologue punctuated by persuasive demands for my agreement or rejection. I had no counter I fear, for this abounding gift of himself and his reactions to the generosity life had shown him. But I trust that my constant writings in prose and verse at that time did evince some tributary strains of his exhilarating influence.

Our staidest and even dullest surroundings in Tokyo were always enlightened by his vivid reminiscences of Oxford, Paris or North India. He was, as you all know, an intimidating and yet elfish opponent at tennis, and one day he told me that he never played tennis against a lady, because once one of his returns had accidently hit a girl on the breast. He was likewise a formidable pleader, but he had renounced practice after he discovered that a man whose conviction he had brought about was after all innocent, and had left a wife and young children to mourn his imprisonment.

He was a born raconteur and master of the long bow, and many are *the evenings made happy for us in Haidrabad* when he was launched on his endless flow of learnedly mirthful disquisition. And that voice! Who of us can ever forget its range of modulation, Caruso-like yet deeper than Caruso's, enriched with the characteristics of the five tongues he had so astonishingly mastered. How well I remember one evening at Yokohama! We were dining in the old Grand Hotel when I caught sight of a friend, the Russian violinist Zimbalist, at an adjoining table. I brought him up and introduced him to Masood, and then sat back to enjoy the encounter of two magnetic personalities. At that time Zimbalist was filling the great Imperial Theatre in Tokyo with enthralled Japanese audiences, over three thousand of them, with tickets at high prices, to whom that revelation of Western music was a god-send. Twenty years before I had first heard Zimbalist in the Queen's Hall, London, where, after the playing of Tartini's Trillo di Diablo, the packed audience refused to leave, until all the lights were turned off. Since that night I had never heard or heard of him, and I thought the Great War had claimed him as a victim, until he turned up in Tokyo as the guest of my friend the Marquis Tokugawa. You can imagine my enjoyment of that duel of wit and serious discourse. But of the musician's tale I am not writing here. It was when we took a car after dinner, and in glorious moonlight drove round that beautiful peninsula, past the villa where Dr. Rabindranath Tagore had been interned, and on to the famous beaches the earthquake of 1923 was soon to devastate and strew with corpses. It was Masood's turn, and soon he began to declaim. Urdu, Persian, French, English and Italian poetry flowed from him, as we listened to Leopardi, Shakespeare, Victor Hugo, Hafiz and Ghalib, each in his own tongue, in accents the broadcaster of today would give much to command. We let him go on, as one always did with Masood, for we saw he was as truly inspired as these poets were, as Zimbalist ever was. To this day Masood is remembered and spoken of in Japan by members of the Imperial family, and by poor students alik, as a revelation of India, the country to which Japanese religion and culture in the past was so deeply indebted. If

I may be allowed to speak of my own indebtedness to him, I can only say that but for him my own life would have been greatly the poorer. He brought me from the exclusion of Japan—from a life of the utmost interest, full of both happy and ominous indications of the future of that chosen people — to his own country at the very centre of the growing rivalry of East and West, where instead of the homogeneity achieved through centuries of the sternest discipline, and the awe-inspiring silence and secrecy of a terribly effective adaptation to scientific civilization, the first fruits and the vaster promise of which we are realising today,— where instead of those phases of Japanese life I find myself bewildered in a world of conflicts, a welter of cleavages, yet to be drilled, if Heaven so please, into nationhood and an efficient independence. Internal conflict in Japan is so far under iron control. That stage is, fortunately or not, hardly conceivable in India, with our innumerable differences of insight and outlook. But the process of transition in India, in which I find so many of my own countrymen earnestly playing a helpful part, is one charged with implications affecting both East and West alike, and it is in India that one may witness what are probably the most momentous political efforts of modern times.

The history of Japan has yet to be worthily presented under one masterly survey that will do justice to its participators. The history of India as a self-assertive entity among the world-powers is today just at its beginning, and the ability and nobility of Sir Syed Ross Masood were such as might greatly have helped towards the consolidation and unison that are the most vital needs today. I was once urged to recommend to him the foundation, as its leader, of a separate Muslim party in Indian politics. But I doubt whether that would ever have appealed to him. His interests were so wide and varied, his culture so sympathetic to every manifestation of goodness and beauty, his sense of justice so keen, and his hatred of injustice so pronounced, that he could only have consented to assume the leadership of such a party as a factor not of politics but of national education. Fortunately for India we know that today the influence of this large hearted personality is still working in the efforts of those who had the privilege to come under his exemplary tuition.

ترجمہ

مجھے وہ ساعت اور وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب کہ سر سید راس مسعود سے میری پہلی ملاقات ہوئی - ابتدائی ملاقات ہی میں ایک عجیب تضاد کی وجہ سے وہ میرے لیے ممتاز و یادگار شخصیت بن گئے - اسی دن مجھے شاہزادۂ ویلز کے حضور میں بار یابی کا شرف حاصل ہوا تھا جو جاپان کی سیر کے لیے جنگی جہاز "رینون" سے تشریف لائے تھے' میں نے اس دبلے پتلے شہزادہ کو پہلی دفعہ توکیو کی امپیریل یونیورسٹی میں صدر جامعہ کے کمرے میں دیکھا - شہزادہ کے اخلاق اور شگفتہ مزاجی دلوں کو گرویدہ کر رہی تھی - یہیں میں نے طویل القامت قوی ہیکل مسعود کو بھی دیکھا جن میں کبھی آن بان اور امیرانہ اخلاق کا جلوہ نظر آتا تھا تو کبھی برادرانہ بے تکلفی اور تواضع کا اپنے قد و قامت سے ارد گرد کے ٹھنگنے جاپانیوں میں وہ دیو نظر آتے تھے لیکن دوگونہ اوصاف کے لحاظ سے انکی مشابہت ضرور تھی کی آن واحد میں جاپانیوں کے چہرے بھی انتہائی فکر و سنجیدگی کی حالت سے انتہائی انبساط میں مبدل ہو جاتے ہیں —

مجھے حیرت تھی کہ یہ لمبا تڑنگا شخص جس کے بال سیاہ اور جس کا رنگ زرد تھا کون ہوگا - میں خیال کر رہا تھا کہ یہ کوئی اطالیہ یا ترکی کا سفیر ہے یا شاید قرون وسطیٰ کے کسی شاعر نے دوبارہ جنم لیا ہے —

مسعود مجھ سے پروفیسر 'تکاکسو' کی قیام گاہ کا پتا دریافت کر رہے تھے - میں ان کو پروفیسر موصوف کے ہاں اپنی فوتوت ٹیکسی میں لے گیا جو ایسے جلیل القدر آدمی سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی - یہ محض تقدیر کی یاوری تھی کہ آئندہ دس ہفتے ان کی صحبت میں گذرے -

انہوں نے نہایت اخلاق کے ساتھہ مجھہ سے فرمائش کی کہ توکیو کے تعلیمی اداروں کے حالات معلوم کرنے میں انہیں مدد دوں - ہر چند مجھے مختلف سرکاری مصروفیات تھیں پھر بھی سمجھہ میں نہیں آتا کہ میں کیوں اس دعوت کو قبول کرنے میں ایک دن تک پس و پیش کرتا رہا ' لیکن ان کی جاذب دل میں گھر کرنے والی شخصیت اور وہ اخلاق جن میں بار بار انگریز امرا کے طور نظر آتے تھے ' ان اوصاف نے مجھے بہت جلد گرویدہ بنا لیا اور مجھے وہ ایک فرستادۂ غیب نظر آنے لگے جو کسی نا معلوم مصلحت سے میرے پاس بھیجا گیا ہو —

ہم دونوں تقریباً تین ماہ تک توکیو اور اس کے نواح میں پھرتے رہے اور ہر ایک کالج اور تعلیمی ادارے کا معائنہ کیا ' پرنسپلوں سے ملاقات کی ' جماعتوں میں دورہ کیا ' یہاں تک کہ زنانہ کالج بھی ہم سے نہ چھوٹے - ہر شخص متحیر تھا کہ یہ شان دار مہمان کون ہے —

اس تمام عرصے میں مسعود یوکوھاما کے ایک ممتاز ھوٹل میں توکیو سے اٹھارہ میل پر مقیم تھے جہاں وہ امیرانہ شان سے مہمان داری کرتے تھے - ان کی مہمان نوازی جاپانیوں کی کفایت شعاری کے بالکل برعکس تھی جن کے ساتھہ میں نے چودہ سال گزارے تھے - ان کی شاہ خرچی دیکھہ کر مجھے اکثر اس جاپانی جنرل کا خیال آتا تھا جو صرف نو سین یعنی دو آنے روز سے کچھہ زائد پیسوں میں زندگی بسر کیا کرتا تھا - ہم سمجھتے کہ شاید مسعود دور دراز ھندستان کے کسی پراسرار خطے کے فرماں روا ھیں اور سچ پوچھیے تو ایک دوسرے اور زیادہ پراثر معنے میں وہ تھے بھی ایسے ہی —

ان ایام میں یعنی پندرہ سال پہلے (لیکن یہ پندرہ سال تاریخ

حیدرآباد میں کس قدر اہم ہیں) میں یا میرے جاپانی احباب میں سے کوئی شخص ریاست حیدرآباد کے متعلق ایسی کچھہ واقفیت نہ رکھتا تھا جسے واقفیت کہا جاسکے - مگر رفتہ رفتہ ہمارے مہمان کی نظر کُشا رہ نمائی میں مبہم طور پر ہی سہی' یہ سمجھہ میں آنے لگا کہ وہ حیدرآباد میں کس چیز کے لیے کوشاں ہیں اور کون لوگ اس انتظامی کام میں ان کے شریک حال ہیں - اس کی توثیق ان کے نام کے خطوں اور تاروں سے بھی ہوتی تھی جو انہوں نے مجھے دکھائے —

مجھے ان کے خاص پیرایہ بیان میں ان کی زندگی کے روشن و تاریک وقفے سن کر بہت لطف آتا تھا اور میں اکثر یہ محسوس کرتا کہ کاش ایسے شخص کے لیے کوئی مجھہ سے زیادہ قابل شخص وہ کام انجام دیتا جو 'باسول' نے 'جانسن' کے لیے کیا - ان کی شگفتہ طبعی' مخلصانہ جذبہ' معقول دلائل کے ساتھہ گفتگو اور واقعات و نظائر کا دلپذیر انتخاب اور ان تمام باتوں کے ساتھہ اقتدار 'تحکم کے آثار' یہ تمام اوصاف اور خصائص ایسے تھے جو مجموعی طور پر ایک آدمی میں کبھی میں نے جمع نہیں دیکھے' وہ صحیح معنے میں ساری دنیا کے باشندے تھے ' بر ایں ہم انہیں خود اپنی ذات اور اپنی قوم پر فخر تھا اور ان کے اس فخر کی بناء پر ہندستانی شخصیت مجھے بالکل ایک دوسری ہی اور کہیں زیادہ وقیع چیز نظر آنے لگی —

ہماری گفتگو محض تعلیمات ہی سے متعلق نہیں ہوتی تھی جس میں ہم دونوں منہمک تھے - واقعہ یہ ہے کہ جاپانی تعلیم سے متعلق جو کچھہ وہ کررہے تھے اس کو انہوں نے کبھی مجھہ پر ظاہر نہیں کیا - یہ علم مجھے ایک سال کے بعد ہوا جب کہ ایک دن حیدرآباد میں اپنے دفتر

میں جہاں وہ ناظم تعلیمات تھے انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ جاپانی تعلیم پر جو کتاب میں نے لکھی ہے' اس کا دیباچہ لکھو گے ؟ میں نے کہا آپ نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا - اس پر اپنے خاص پیرایہ میں کہنے لگے اچھا آپ ہی اسے باآواز پڑھیے —

حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا وہ اپنے تجربات کے حیرت انگیز ذخیرے کی بنا پر لکھا تھا - دیباچہ کیا تھا ایک نہایت ہی دلچسپ تمثیلی تقریر اپنے آپ سے مخاطبت کی صورت میں تھی - مسعود مجھ سے بیچ میں پوچھتے جاتے تھے کہ میں ان سے متفق ہوں یا نہیں - زندگی کے فیاضانہ سلوک پر ان کے تاثرات یا ان کی خداداد قابلیت کے مقابلے میں میرے پاس کوئی چیز نہ تھی جو جواباً پیش کرسکتا ' لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں جو کچھ نظم و نثر میں میں نے لکھا اس میں ان کے فرح بخش اثر کی نیاز مندی کا کچھ نہ کچھ پتا چل سکتا ہے —

ٹوکیو کے بعض خشک سے خشک ماحول میں بھی ان کے آکسفورڈ ' پیرس اور شمالی ہندوستان کے قصوں سے ہمیشہ ہمارا وقت اچھا گزرتا تھا - جیسا کہ سب جانتے ہیں وہ ٹینس کے کھیل میں ایک دہشت انگیز اور ساتھ ہی چھلاوے کی طرح چالاک حریف تھے - ایک دن انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ کسی صورت سے ٹینس نہیں کھیلتے کیونکہ ایک دفعہ اتفاقاً ان کی گیند ایک لڑکی کے سینہ میں لگ گئی تھی - اسی طرح وہ ایک زبردست وکیل تھے لیکن انہوں نے وکالت اس لیے ترک کردی تھی کہ ایک بار جس آدمی کو انہوں نے سزا دلوائی وہ دراصل مجرم نہ تھا ' اور بیچارے کی بیوی اور بچے اس کے قید میں جانے

سے مصیبت میں مبتلا ہوگئے تھے -

انہیں واقعات بیان کرنے میں فطری ملکہ حاصل تھا - اور حیدرآباد میں اکثر شام کے اوقات بڑے لطف سے گزرتے تھے جب کہ وہ عالمانہ رنگ کی مزاحیہ گفتگو پر اُتر آتے تھے اور وہ آواز بھی ان کی بھول نہیں سکتی جو اگرچہ 'کیروسو' کی آواز سے ملتی جلتی تھی لیکن 'کیروسو' کی آواز سے زیادہ بھری ہوئی تھی - اس میں ان پانچ زبانوں کی خصوصیات موجود تھیں جن میں مرحوم کو کامل دستگاہ تھی - مجھے 'یوکوھاما' کی وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب کہ ہم 'گرانڈ' ہوٹل میں کھانا کھارہے تھے کہ میری نظر اپنے ایک روسی دوست 'زمبالسٹ' پر پڑی جو برابر کی میز پر بیٹھا ہوا تھا - زمبالسٹ کو سارنگی نوازی میں ید طولیٰ حاصل تھا میں اُسے مسعود کے پاس کھینچ لایا اور تعارف کرا کے ان دونوں جاذب ہستیوں کی ملاقات کا لطف اٹھانے کی غرض سے اپنی جگہ جا بیٹھا - اُس زمانے میں زمبالسٹ نے ٹوکیو کے امپیریل تھیٹر میں جاپانیوں کو اپنے کمال سے مسحور کررکھا تھا اور تھیٹر کا یہ عالم تھا کہ روزانہ تین تین ہزار آدمی ٹوٹے پڑتے تھے' اور ٹکٹ بڑی بڑی قیمت پر فروخت ہو رہے تھے' زمبالسٹ کا مغربی ساز جاپانیوں کے لیے ایک غیر مترقبہ نعمت تھی - میں نے اس کا گانا 'کوئین هال' لندن میں سنا تھا جہاں 'تارتینی' کا ایک گیت سننے کے بعد سامعین جو کھچا کھچ هال میں بھرے ہوئے تھے اس وقت تک برابر ڈٹے بیٹھے رہے جب تک کہ ساری روشنیاں نہ گل کردی گئیں' اس رات کے بعد سے میں نے اس کو پھر کبھی نہیں دیکھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی جنگ عظیم کا شکار ہو گیا ہوگا - ٹوکیو میں وہ میرے دوست' مارکوئس ٹوکوگاوا'

کا مہمان تھا- مسعود اور زمہالت کی ظریفانہ اور سنجیدہ گفتگو کا لطف جو اس شام کو میں نے اٹھایا اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں لیکن مجھے یہاں سارنگی نواز کا قصہ بیان کرنا نہیں ہے - کھانے کے بعد ہم نے ایک موٹر کار کرایہ سے لی اور نکھری ہوئی چاندنی میں اس خوبصورت جزیرہ نما کے اطراف گشت لگایا اور اس مکان کے قریب بھی گزرے جہاں ڈاکٹر رابندر ناتھہ ٹیگور مقیم رہ چکے تھے - پھر اس ساحل کی سیر کی جو تھوڑی مدت بعد سنہ ۱۹۲۳ ع کے زلزلہ میں ویران و تباہ ہو گیا اور جس میں بہت سے آدمی فنا ہوئے —

یہاں مسعود کی باری تھی کہ اپنا راگ الاپیں- چنانچہ انہوں نے بے تامّل اردو' فارسی' فرانسیسی' انگریزی اور ایطالوی اشعار سنانے شروع کیے اور ہم نے لیو پارڈی 'شیکسپیر' وکٹر ھیوگو' حافظ اور غالب کو خود ان کی زبان میں سنا اور اس لب و لہجہ میں سنا جس کے لیے کوئی نشرگاہ بھی آج بڑی سے بڑی اجرت دینے پر تیار ہوجائے گی - ہم خاموش تھے اور مسعود کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا خود ان پر شعرا کی ملہمانہ کیفیت طاری ہے —

مسعود کا ذکر خیر آج بھی جس طرح جاپان کے شاہی خاندان میں ہوتا ہے اسی طرح وہ وہاں کے غریب طلبہ میں یاد کیے جاتے ہیں- وہ ان کی نظر میں اسی ہندوستان کی یادگار ہیں جس کے قدیم جاپانی مذہب اور تہذیب رہین منت ہیں - اگر مجھے اپنی ذاتی ممنونیت بیان کرنے کی اجازت دی جاے تو میں اس کے سوا کیا کہوں کہ اگر وہ مدد نہ کرتے تو میری زندگی بہت بے لطف و بے مایہ رہ جاتی - انہوں نے مجھے جاپان کی دور افتادگی سے نکالا - (گو یہ زندگی کافی دلچسپ

اور اپنے آپ پر ناز کرنے والی جاپانی قوم کے اچھے اور برے آثار کے مشاہدات سے پڑتی) اور اپنے ملک میں لائے جو مشرق اور مغرب کی روز افزوں رقابت کا خاص مرکز بن گیا ہے - یہاں نہ وہ ہم آہنگی جو جاپان میں صدیوں کی سخت ترین تربیت کے بعد حاصل ہوئی ہے نہ اپنے تمدن کو سائنس کی نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے اور مغرب کی کارگر مطابقت پیدا کرنے کی وہ کوشش نظر آئی جو خوف انگیز خموشی اور اخفا کے ساتھ جاپان میں کی جارہی ہے اور جس کے ابتدائی نتائج اور وسیع تر توقعات آج ہماری نظر کے سامنے ہیں - اس کے برعکس ہندوستان میں جدھر دیکھئے انتشار و افتراق پایا جاتا ہے - قومیت اور کامیاب آزادی کے رتبے تک پہنچنے کے لیے ان پراگندہ قوتوں کو بہت کم منظم کرنا باقی ہے - جاپان میں اندرونی کشمکش پر ابھی پورا قابو ہے - خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ہندوستان میں باہمی اختلاف خیال و رائے کی وجہ سے یہ نوبت ابھی تصور میں بھی نہیں آسکتی - لیکن ہندوستان کا دور تغیر جس میں میرے بہت سے ہم وطن خلوص کے ساتھ معاون و شریک ہیں مشرق و مغرب دونوں پر اثر انداز ہونے کا قرینہ رکھتا ہے اور یہیں ہم دور جدید کی شاید اہم ترین سیاسی کوششوں کا معائنہ کرسکتے ہیں - جاپان کی ایسی تاریخ بھی جو اسے بنانے والوں کے کارنامے کی پلبغی خوبی کے ساتھ استادانہ انداز میں یکجا پیش کرسکے ابھی تک تحریر نہیں ہوئی ہے مگر دنیا کی زبردست قوتوں میں ایک مسلمہ وجود کی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ کا ہنوز آغاز ہی ہوا ہے - سر سید راس مسعود میں وہ قابلیت اور ستودہ اوصاف تھے جو اس وقت استحکام اور یک جہتی کے حصول میں جس کی آج ہندوستان کو سخت ضرورت ہے بہت کام

آتے - مجھے ایک دفعہ ترغیب دلائی گئی کہ مرحوم سے ہندوستانی سیاسیات میں اپنی ایک علحدہ مسلم پارٹی قائم کرنے کی تحریک کروں لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ خیال کبھی بھی انہیں پسند آتا - ان کے تعلقات نہایت وسیع اور گونا گوں تھے - ان کا مذاق حسن و خوبی کے ہر مظہر سے موانست رکھتا تھا - ان میں حق و انصاف کا قوی احساس اور ناانصافی سے اس قدر صریحی تنفر تھا کہ وہ ایسی جماعت کے قائد ہونے پر اسی صورت میں راضی ہوتے جب کہ سیاسیات کی بجاے اس سے قومی تعلیم کا منشا حاصل ہوتا - یہ بھی ہندوستان کی خوش نصیبی ہے کہ آج بھی اس وسیع القلب ہستی کا اثر ان لوگوں کی کوششوں میں اپنا کام کررہا ہے جو مرحوم کی بے مثال تعلیم سے بہرہ مند ہوتے تھے —

سر سید راس مسعود

از

(ڈاکٹر کرینکو)

[ڈاکٹر کرینکو یورپ کے مستشرقین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اسلامی علوم میں ان کی مہارت خاص طور سے مشہور ہے - اسلام کے ساتھ ان کو محبت بھی ہے - چنانچہ ہندوستان کے مولویوں کا یہ گمان ہے کہ ڈاکٹر کرینکو مسلمان ہوگئے ہیں - مذہب کا تعلق دل سے ہے خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ رسمی مسلمان ہیں یا حقیقی - اتنی بات ضرور ہے کہ پروفیسر مارگولیوتھ اور سنوک ہر گرونیہ کے خیالات میں جو تعصب اسلام کے متعلق پایا جاتا ہے وہ ڈاکٹر کرینکو کی تحریرات میں مطلق نہیں ہے - نواب عمادالملک مرحوم نے ڈاکٹر کرینکو کو دائرۃالمعارف حیدرآباد کی مطبوعات کی تصحیح اور قلمی نسخوں کی تلاش کے لیے مقرر فرمایا تھا - چنانچہ اس ضمن میں ان کی خدمات لایق ستائش ہیں - سر سید راس مسعود نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں ان کو علیگڈھ کی عربی کی پروفیسری کے لیے بلا لیا تھا - لیکن بیوی کی صحت کی وجہ سے یہ زیادہ وہاں نہ رہ سکے - علیگڈھ سے جاکر بون یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہوگئے - وہاں بھی ان کی بیوی کی طبیعت خراب رہی - اور آج کل کیمبرج میں مقیم ہیں - سر سید راس مسعود سے جو ان کو محبت اور عقیدت تھی اس کا حال خود ان کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے - اڈیٹر]-

5/ De Freville Avenue
Cambridge
1 October 1937

Dear Mr. Abdul Haq,

I have been ill or you would have had my short note on Sir Ross Masood earlier and I hope it will reach you in time for the press.

If you consider some of my remarks should be cut out, I give you permission to do so.

Please let me have a copy of your Journal when published.

To this day I have not had any news from his relation concerning the cause of his death.

With kindest regards

Yours sincerely
F. Krunkow

I could not believe that it was true when a short notice in my daily newspaper brought the sad news that my beloved friend Masood had parted from this life for ever. I had hoped to spend some happy days with him as I had done before and when his duties prevented him from coming to Europe he held out the hope, in a letter, that we should meet in the coming year.

During the days which I was favoured to spend in his company our thoughts and conversation frequently turned to serious question and one of his chief concerns always was the condition and the future of the Muslim Comunity in India. It was always with sadness that he spoke of it and when he gave expressions bordering upon despair I tried to the best of my ability to reassure him that his fears and anxieties were exaggerated. Islam had passed through far greater crises than those of the present day, I argued, and mastered them emerging with renewed vigour and what seemed to be a catastrophy like the Mongolwave of destruction finally led to a greater expansion of Islam in Asia.

When he visited me in spring 1929 to ask me if I should be willing to

join the staff at Aligarh he said that he felt that it was the call of the blood which made him accept the position of Vice-chancellor. He felt that he must continue the work which his illustrious grandfather had commenced with the desire of raising the intellectual standard of Muslims in the East. Masood's sincerity was beyond all doubt and it amounted almost to religious dogma. You could rely implicitly upon his word. Amana, a virtue so dear to early Muslims and alas so often forgotten in these days was a virtue which was his. It was not his fault that so many difficulties arose and the dissensions which followed after I left Aligarh on account of ill health made him very sad and deepened his feeling of despair to which I have referred above. I am not competent to judge the causes nor the justifications of these dissensions, but I can here firmly assert that he was actuated by sincere intentions in all his activities for raising Muslim youth.

Many a time did we dwell upon the lamentable and seemingly unsurmaountable differences between Sunni and Shiah. He himself, scion of a respected Sayyid family and I believe an adherent of the Sunni creed, was yet inclined towards the legitimacy of the succession of Ali. Perhaps it was his European education where dynasties have lasted through centuries by the generally accepted principle of legitimate succession, a custom so seldom achieved in Muslim lands.

The little book which he published after his visit to Japan in its concluding pages reveals how his heart yearned for that unity among his countrymen which had made the far Eastern country an equal with the great powers of the world. There a great nation had arisen while India had become enslaved through the dissension, quarrels and even treachery of her own sons. Muslim India has lost a great son not so easily replaced.

May Allah receive him with his mercy and may my love for his memory never fade.

(ترجمہ)

روز ناموں کے ذریعے میرے محبوب دوست مسعود کے اس دنیا سے دائمی رحلت کرجانے کی مختصر خبر غم کا پیام لائی تو مجھے اس پر یقین نہ آسکا - مجھے امید تھی کہ جس طرح پہلے کچھہ مدت ان کے ساتھہ رہا' آئندہ بھی خوشی کے کچھہ دن ان کی معیت میں گزریں گے اور اس مرتبہ سرکاری کاموں کی وجہ سے وہ یورپ نہیں آسکے تو انہوں نے ایک خط میں یہ توقع دلائی تھی کہ آئندہ سال ضرور ملاقات ہوگی —

مجھے ان کی صحبت میں جو ایام بسر کرنے کی نعمت میسر آئی ان میں ہم اکثر اہم مسائل پر غور و گفتگو کرتے اور ان میں مرحوم کو سب سے بڑھکر جس چیز کی فکر تھی وہ ہندوستان میں مسلم قوم کی موجودہ حالت اور مستقبل کا سوال تھا - وہ اس باب میں جب گفتگو کرتے غم و افسوس کے ساتھہ کرتے اور کبھی کبھی ایسے کلمات کہتے جن سے حسرت و ناامیدی ٹپکتی تھی ایسے موقعوں پر جہاں تک مجھہ سے ہوسکتا انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کرتا اور یقین دلاتا کہ یہ خوف اور پریشانی وہم پر مبنی ہے - اسلام پر اس وقت سے کہیں زیادہ سخت وقت گزرے ہیں - وہ ان مشکلات پر غالب آیا اور آخر میں پہلے سے زیادہ قوی ہوگیا - چنانچہ فتنۂ مغول جو اسلام کے لیے تباہی کا سیلاب بن کر اٹھا تھا ایشیا میں اس کی اشاعت و ترقی پر منتہی ہوا —

سنہ ۱۹۲۹ ع کے موسم بہار میں مسعود یہ دریافت کرنے میرے پاس آئے کہ آیا میں علی گڑھ کی پروفیسری قبول کرنے پر آمادہ ہوں - اس وقت وہ اپنی نسبت کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے یہ میرے خون

کا اقتضا تھا کہ میں نائب امیر جامعہ کا منصب قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ اپنے نامور دادا کے کام کو جاری رکھنا ان کا فرض ہے جسے سید احمد خاں مرحوم نے مشرق میں مسلمانوں کا ذہنی معیار بلند کرنے کی غرض سے شروع کیا تھا - مسعود کے خلوص میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی اور یہ صفت ان میں دین و ایمان کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی - ان کے قول پر کامل اعتماد کرسکتے تھے - امانت کی خوبی جو قرن اول کے مسلمانوں کو بے حد عزیز تھی اور آج کل اکثر فراموش کردی جاتی ہے' مسعود کی خاص خوبی تھی - علی گڑھ سے خرابی صحت کے باعث میرے چلے آنے پر وہاں جو اختلافات برپا ہوے اور دشواریاں پیش آئیں اس میں مسعود کا ہرگز قصور نہ تھا - انہیں ان واقعات سے سخت ملال ہوا اور مایوسی کے وہ جذبات جن کا میں نے اوپر اشارہ کیا زیادہ قوی ہوگئے - لیکن میں اس جگہ وثوق کے ساتھ یقین دلا سکتا ہوں کہ نوجوان مسلمانوں کو ترقی دینے کی تمام کوششوں میں مرحوم کی نیت نیک تھی —

سنی شیعہ کے افسوسناک اور بظاہر لاینحل اختلافات پر بھی ہماری اکثر گفتگو ہوئی - وہ ایک معزز سید خاندان سے تھے جو میں سمجھتا ہوں سنی عقائد کا پیرو تھا تاہم خود مسعود کا رجحان اصولاً حضرت علی (رض) کی جانشینی کی طرف تھا۔ ممکن ہے اس کا سبب مرحوم کی مغربی تعلیم ہو جہاں خاندانی وراثت کا قاعدہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے اور شاہی خاندان صدیوں تک اسی کے مطابق حکمرانی کرتے رہے ہیں مگر اسلامی ممالک میں یہ رسم شاذ و نادر ہی جاری ہوسکی ہے —

جاپان سے واپسی پر مسعود نے جو مختصر کتاب شائع کی اس کے

آخری اوراق میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم کا دل بیقرار تھا کہ ان کے اہل وطن میں بھی وہی اتحاد ہوجاے جس نے مشرق اقصیٰ کے اس ملک کو دنیا کی بڑی سلطنتوں کا ہم پلّہ بنا دیا ہے - وہاں ایک زبردست قوم تیار ہوگئی حالانکہ ہندوستان اپنے باہمی جھگڑوں اور نیز ابناے وطن کی غداری کی بدولت غلامی میں مبتلا ہوگیا ـــ

مسعود کی موت سے اسلامی ہند کا ایک فرزند کبھو جاتا رہا جس کی جگہہ آسانی سے پُر نہ ہوگی - اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہہ دے اور خدا کرے ان کی یاد سے میری شیفتگی میں کبھی فرق نہ آے ـ

سید راس مسعود مرحوم

از

(مسٹر کے - ایم پانیکر)

مسٹر کے - ایم پانی کر جنوبی ہند کے علاقہ کیرالا کے رہنے والے ہیں - اسی نسبت سے آپ نے بعض تالیفات میں اپنا لقب " کیرالا پُترا " استعمال کیا ہے - ان کی اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی جہاں انہوں نے تاریخ کا مضمون لے کر بی - اے آنرس کی ڈگری لی - یہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ کے مضمون میں آنرس میں اول درجہ حاصل کیا انگلستان سے واپسی کے بعد ان کا تقرر تاریخ کی پروفیسری پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوا جہاں وہ قریب تین برس کے رہے اور طلبہ میں اپنے طرز تعلیم کی وجہ سے ہردلعزیز ہوگئے - متعدد کتابیں لکھیں جن کو صاحب‌نظر وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - ہندوستان کی ریاستوں کی تاریخ معاہدات اور طرز حکومت سے شاید ہی آپ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص واقف ہو - موصوف کی عمر کا بیشتر حصہ ایوان روسا (Chamber of Princes) اور دیسی ریاستوں کی خدمت میں گذرا چنانچہ اب پٹیالہ میں فارن سکریٹری ہیں - ایڈیٹر]

5. 10. 37

Lallgarh,
Bikaner,
Rajputana.

Dear Mr. Haq.

I send you a short and most unsatisfactory contribution to your special number. As you will know Masood was one whom I loved like

a brother. To write of one like him is a physical impossibility with me. I could not bring myself to put down in words my feelings on the matter. How can one describe him or speak of him. He had two favourite exclamation in French " Formadable " and " incroyable ". He was incredible: almost a legendary figure in many ways. Those two French expressions alone can describe him: his dynamic personality. Well, he is gone. I feel honoured to pay him this small tribute however inadequate it may be if you consider it unsuitable, you can return it without feeling the least embarrassment.

Yours sincerely.

Pannikar

It is difficult to write satisfactorily in a short article about so versatile a figure as the late Sir Ross Masood. His brilliant personality had so many facets that those who knew him but slightly carried away only a partial or even distorted impression of him.

He recalled to the minds of people coming into contact with him for first time the memory of some forgotten hero of romantic fiction, some legendary character like Cyrano de Bergerac or Edmund de Montesqeu, an exaggerated personality whose magic spell was extraordinary. But that was only one aspect of Masood — the aspect in which he liked to show himself to strangers. The vein of theatricality in him was only superficial and did not in any manner touch the core of the man.

The great quality of Masood was his genius for friendship. It is literally true to say of him that his spiritual and mental sustenance came from his friendships. A genuine and affectionate friend who gave unstintingly of his best to his friends, he was also most exacting towards those whom he admitted within his circle. There was no halfway house for him, of pleasant acquaintances, familiar and friendly when one meets them, but forgotten the next moment. If he was a friend, he remained one. This genius of friendship was untrammeled by any considerations of caste, creed or race. He was truly cosmopolitan in his mind.

Another characteristic of Masood which earned him the admiration of his friends was the range of his culture. A profound student of literature, he was equally at home in the masterpieces of Persian and Urdu poetry, as in English, French and Italian literature. He revelled in Hafiz as in Villon, in Ghalib as in Verlaine. And his reading, whether he was serving in Hyderabad, Aligarh or Bhopal, was always uptodate. I had personally many occasions to know and appreciate his great interest in the development of Indian vernaculars. Almost the first subject we discussed together over 18 years ago was the publication of a series of books relating the history of the more important Indian vernaculars. Almost the last thing we planned together in Bhopal in August last year was the publication of an Anthology of modern Indian verse in English translations. The work is but half done to-day and I doubt very much whether without his inspiring guidance I would be able to complete it in the manner we both desired.

No politician himself, Masood was a patriot in the real sense. It was his deep-rooted conviction that the emancipation of India could come only through a proper system of education — an education which was related to the life of the people and which was *real* in the sense that its values were not distorted through the medium of a foreign tongue. His book on the Educational System of Japan was from this point of view a contribution to Nationalism.

India is poorer by the death of so distinguished, so talented, and so patriotic a son. His dynamic personality was a national asset the full value of which never came to be recognised. We who loved him can only say with the great Sanskrit poet :-

" Though he has been called away, his *Karma* is still with us." Let that *Karma* be our inspiration.

(ترجمہ)

سید راس مسعود جیسی جامع ہستی پر مختصر مضمون لکھنا مشکل سے کافی ہوسکتا ہے - ان کی درخشاں شخصیت کے اتنے پہلو تھے کہ جن لوگوں کی اُن سے سرسری ملاقات ہوتی وہ ان کی نسبت یک رخی بلکہ فاسد رائے قائم کرلیتے تھے - جو لوگ مرحوم سے پہلی دفعہ دو چار ہوتے، تو کسی بھولے بسرے فسانے کے سورما یا 'چیرانو' یا 'اڈمنڈ ڈی مونٹس کیو' جیسا کوئی فرضی آدمی ان کی نظر میں پھر جاتا - یعنی ایک مافوق العادت انسان جسے مسحور کرلینے میں کمال حاصل ہو - لیکن یہ 'مسعود' کا صرف ایک رخ تھا اور انہیں شوق تھا کہ اجنبیوں کے سامنے اسی روپ میں آئیں - مگر بہروپ بھرنے کی یہ اُمنگ بھی درحقیقت سطحی تھی - اس کا ان کی اصلی سیرت سے کچھ تعلق نہ تھا —

ان کا خاص وصف یہ تھا کہ دوستی کا غیر معمولی فطری مادہ رکھتے تھے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے دماغ و روح کی بالیدگی ہی دوستی پر منحصر تھی - وہ جس طرح خود سچے اور دل سے چاہنے والے دوست تھے اور دوستوں سے اپنی کوئی چیز عزیز نہ رکھتے تھے اسی طرح اپنے مخصوص دوستوں سے پوری شدت کے ساتھ ایسے ہی برتاؤ کا مطالبہ کرتے تھے - محض دلگی کی آشنائی کہ ملے تو بڑے تپاک اور بے تکلفی سے اور پیٹھ پھری تو نام بھی یاد نہیں، ایسی ادھوری دوستی کا اُن کے پاس کچھ کام نہ تھا - وہ اگر کسی کے دوست ہوئے تو پھر ہمیشہ دوست رہے - اور اُن کی یہ صفت، مذہب و ملت اور نسل و قوم کے امتیازات سے مبرا تھی - حقیقت میں وہ طبعاً دنیا کے شہری تھے —

ایک اور خصوصیت جس نے احباب کو مسعود کا گرویدہ بنایا،

مرحوم کی وسعت مذاق تھی - ادبیات میں اُن کے تبحر کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اردو فارسی کے بہترین کلام اور اسی کے ساتھ انگریزی، فرانسیسی، اطالوی ادب سے یکساں واقفیت رکھتے جس طرح 'حافظ' و 'غالب' کے اشعار پر وجد آتا اسی طرح ویلون اور وارلین سے کیف اندوز ہوتے - پھر، حیدرآباد کی ملازمت ہو یا علی گڑھ یا بھوپال کی، ہر حال میں تازہ ترین تصانیف کا مطالعہ جاری رہا - ہندوستان کی زبانوں کو ترقی دینے کا مرحوم کو جیسا شوق تھا، اسے ذاتی طور پر جاننے اور اندازہ کرنے کے مجھے کئی موقعے ملے - کچھ اوپر اٹھارہ سال پہلے، شاید سب سے اول ہم نے جس مبحث پر باہم گفتگو کی وہ یہی تھا کہ ملک کی مشہور السنہ کی تاریخ سے متعلق ایک سلسلۂ کتب شائع کیا جائے - اور سال گذشتہ اگست میں اُن سے گویا آخری مشورہ بھی بھوپال میں جس بات کے متعلق ہوا، وہ یہی تھی کہ عہد جدید کے ہندوستانی کلام کا انتخاب انگریزی تراجم کی صورت میں چھپوایا جائے - ابھی تک یہ کام آدھا ہونے پایا ہے اور اب جب کہ مرحوم کی روح پرور رہنمائی باقی نہیں رہی، مجھے شبہ ہے کہ میں اُس شکل میں اسے پورا بھی کرسکوں گا جیسا کہ ہم دونوں کی آرزو تھی —

مسعود سیاسی آدمی نہ تھے لیکن صحیح معنی میں محب وطن تھے انہیں کامل یقین تھا کہ مناسب حال نظام تعلیم ہی کے ذریعے ہندوستان رستگاری حاصل کر سکتا ہے - ایسی تعلیم جو لوگوں کی معاشرت سے لگاؤ رکھتی ہو اور اس معنی میں حقیقی تعلیم ہو کہ غیر زبان کے توسط نے اس کے فوائد کو مسخ نہ کر دیا ہو - اس نظر سے دیکھا جائے تو 'جاپان' کے نظام تعلیم پر مرحوم کی کتاب وطنیت پروری میں ایک حصہ رکھتی ہے —

ایسے نامور ، ایسے جوہر قابل اور ایسے وطن دوست فرزند کی موت سے ہندوستان اور بھی بے مایہ رہ گیا - وہ پُر قوت ذات ایک قومی اثاثہ تھی جس کی صحیح قدر و قیمت کبھی نہ پہچانی گئی - اس کے چاہنے والے اب سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ سنسکرت کے شاعر اعظم کا یہ قول دھرائیں :

" ہر چند اسے بلا لیا گیا ، اس کے "کرم " ہنوز ہمارے ساتھ ہیں - آؤ انہی کرموں سے ہم ہست حاصل کرتے رہیں " —

سر راس مسعود

از

(مسٹر اے کاٹر ماریسن)

[مسٹر کاٹر ماریسن محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے سابق پرنسپل سر تھیوڈور ماریسن کے فرزند ھیں - اڈیٹر]

34, Hornton Street,
London. W. 8.
2nd November, 1937.

Dear Sir,

Many thanks for your nice letter received yesterday morning.

I feel the loss of my old friend Sir Ross Masood very keenly and so I felt that I must accede to your kind request and write something about him. This I have now done, though I fear most inadaquately. I hope it is the sort of thing you want for the special number of the Journal you are issuing at the end of this month.

What a loss Sir Ross Masood will be to India and more especially to his own community, it is such men as he that India needs to-day.

I may add that I should be very pleased to have a copy of the Journal when it has come out, as I have a number of friends in England who knew Masood rather well.

Yours sincerely,

A. cotter Morison

Sir Ross Masood was a great friend of my father and as such I came to know him very well and to look on him as an elder brother.

He had many fine qualities and those which stand out most clearly are his great and enduring friendship for his friends, his wonderful generosity and lastly his high ideals, the pursuit of only that which was highest and noblest in life.

His warm-hearted friendship endeared him to a large circle of friends whereever he went and was a gift to be highly treasured by all who knew him. In fact nothing has too much trouble for him where a friend was concerned.

His generosity was boundless, no one, I think, ever came to him in vain. When he was Vice-Chancellor of Aligarh University he used to keep open house and many people would come and stay with him for weeks on end. He was far the most generous man I have ever met, and his generosity did I feel sure often exceed his means.

But only the highest and noblest in life was good enough for him. In early life he became a lawyer but gave it up as he felt the profession to be too corrupt and that he must pursue a nobler calling. He found a good deal of scope for his ideals as Minister of Education at Hyderabad, where he founded the Osmania University. But his chance came when he was asked to go back to Aligarth, the University founded by his grand-father, as Vice-Chancellor and to reorganise it completely. To this task he bent all his energies, searching Great Britain and Europe for the finest professors and lecturers and raising large sums of money with which to build some of the finest chemical laboratories in India among other extensions and improvements.

When in the right mood he could be a most delightful companion, a brilliant 'Racontour' full of the most excellent stories, in fact the life and soul of the party.

He had a great love of the theatre and cinema and when in London he spent many evening watching the latest plays and seeing the best and newest films.

He will be greatly missed by his many friends and by the Moslem Community in India, where men of his ability and integrity are greatly needed at this critical time in India's history.

(ترجمہ)

سر راس مسعود میرے والد کے بڑے دوست تھے اسی لیے میری اُن سے خوب واقفیت ہوگئی اور میں ان کو مثل اپنے بڑے بھائی کے سمجھنے لگا —

مرحوم میں بہت سی خوبیاں تھیں جن میں خاص طور پر نمایاں اوصاف یہ تھے کہ دوستوں کے ساتھ سچی اور دیرپا دوستی رکھتے تھے حد درجے فیاض اور ایک یہ کہ نہایت بلند خیالات کے آدمی تھے اور صرف اعلیٰ اور شریف ترین مقاصد ہی کے لیے کوشاں رہے - وہ جہاں کہیں گئے ' ان کی پُر تپاک دوستی نے ایک وسیع حلقۂ احباب پیدا کرلیا - یہ وہ خدا داد وصف تھا جس کی ہر شخص جو اُن کو جانتا تھا دل سے قدر و منزلت کرتا تھا - واقعہ یہ ہے کہ دوستوں کے لیے کوئی زحمت و تکلیف ایسی نہ تھی جسے وہ خوشی سے گوارا نہ کرلیتے ہوں —

ان کی فیاضی کی کوئی انتہا نہ تھی - میں سمجھتا ہوں کبھی کوئی شخص ان کے پاس سے خالی نہیں گیا - جن دنوں وہ علی گڑھ میں نائب امیر جامعہ تھے تو اُن کا گھر مہمانوں کے واسطے کھلا رہتا تھا اور بہت سے لوگ ان کے پاس آتے اور ہفتوں ٹھہرے رہتے تھے - جہاں تک میرا علم

و تجربہ ہے ان کے برابر تو کیا ' کچھہ درجہ کم تر فیاض آدمی بھی میری نظر سے نہیں گزرا اور مجھے یقینی معلوم ہوتا ہے کہ انکی فیاضی اکثر اُن کے وسائل آمدنی سے بڑھکر ہوا کرتی تھی —

زندگی کے صرف اعلیٰ اور شریف ترین مقاصد ہی مرحوم کی طبیعت کے مناسب تھے - اول اول انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا لیکن محض اس وجہ سے اُسے ترک کردیا کہ پاک صاف نہ تھا اور ان کی طبیعت پاکیزہ تر مشغلے کی متقاضی تھی - حیدرآباد میں جہاں انہوں نے جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی انہیں بہ حیثیت وزیر تعلیمات اپنے بلند منصوبوں کے مطابق کام کرنے کا خوب موقع ملا لیکن اس سے بھی بہتر موقع اس وقت میسر آیا جب کہ وہ اپنے دادا کی قائم کی ہوئی یونیورسٹی کے نائب امیر جامعہ مقرر ہوکر علی گڈھ آئے کہ اس جامعہ کی از سر نو تنظیم کریں - اس کام میں انہوں نے اپنی پوری قوت صرف کردی اور بہتر سے بہتر پروفیسر و اساتذہ کی تلاش میں ممالک یورپ و برطانیہ کو چھان مارا اور سرمایۂ کثیر اس غرض سے جمع کیا کہ یونیورسٹی میں دیگر اصلاحات و توسیع کے علاوہ علم کیمیا کے ایسے معمل تیار کریں جن کی ہندوستان بھر میں نظیر نہ ملے —

جس وقت مسعود کی طبیعت حاضر ہوتی تو ان سے بہتر کوئی ندیم نہ ہوسکتا تھا - کیونکہ وہ نہایت خوش گفتار قصہ گو تھے اور ایک سے ایک بڑھکر صدہا دلچسپ قصے انہیں یاد تھے - حقیقت میں مرحوم بزم احباب کی روح رواں تھے—

تھیٹر سینما کا بڑا شوق تھا اور لندن میں ہوتے تو اکثر اوقات شام کو

تازہ ترین کھیل اور نئی نئی تصاویر دیکھنے پہنچ جاتے تھے —

مرحوم کی یاد صدھا دوستوں کو ستائیگی - اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کی وفات کا بہت غم ہوگا جہاں تاریخ ہند کے اس نازک دور میں ان جیسی اعلیٰ قابلیت کے بے لوث اشخاص کی سخت احتیاج ہے —

* " ناظم سرشتۂ تعلیمات " ہونا چاہیے - (مترجم)

سر سید راس مسعود

از

(رائٹ آنریبل ایچ - اے - ایل فشر صاحب)

[رائٹ آنریبل ایچ - اے - ایل فشر انگلستان کے نہایت نامور مورخ اور عالم اور مصنف ہیں - منجملہ دیگر تصانیف کے اُن کی تاریخ یورپ اور تاریخ انگلستان و یورپ بہت مستند خیال کی جاتی ہیں - شفیلڈ یونیورسٹی کے آنریری ڈی لٹ اور اڈنبرا ' مانچسٹر ' کیمبرج ' لورپول اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے آنریری ایل ایل - ڈی ہیں - ہندستان میں جو (۱۵ - ۱۹۱۲ ع) پبلک سروز رائل کمیشن قائم ہوا تھا اس کے ممبر تھے - برٹش اکاڈیمی کے پریزیڈنٹ رہ چکے ہیں - برٹش میوزیم کے ٹرسٹی اور بی - بی - سی کے گورنر ہیں - اس کے علاوہ ان کے اور بہت سے کارنامے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں - اڈیٹر]

The warden's Lodgings,
New College,
Oxford.
November Ist. 1937

Dear Sir,

I gladly embrace the opportunity of writing a few words on my old friend Sir Syed Ross Masood, whose untimely death has been a great shock to me. I am very glad to hear that a special number of the Journal Urdu is to be issued in his memory.

Yours very truly.

H. A. L. Fisher.

My friend, Sir Syed Ross Masood, who took his degree from New College in 1907, was a remarkable figure during his undergraduate life. His fine appearance, brilliant conversation, warm sympathies, and eminence on the lawn tennis field brought him a large number of friends and admirers. He was, in fact, one of fhe most popular and successful undergraduate members of the College, and although my memory now goes back over many years I can not recall the name of any young indian who has entered more thoroughly in to the life of Oxford, or has obtained from Oxford more of the best which Oxford has to give. Naturally after my friend returned to India my opportunities of meeting him were few and far between, but his success in many important posts at Aligarh, Hyderabad, and lastly at Bhopal, did not cause me the least surprise, indeed it was exactly what I should have expected of a man of such outstanding vigour, charm and capacity. From time to time we corresponded, and I met him when I was out in India with the Public Service Commission in 1912/13 and 1913/14, and more recently when he came to England and visited us at New College wherr his eldest son is now an under graduate. I used also to hear of him from our common friend, Sir Theodore Morison who was greatly devoted to Masood and regarded him in the light of a son. And from all these scattered impressions I had little difficulty in deriving the conclusion that my friend had not failed, as so many unhappily do, to realise the bright promise of his youth, but that he had steadily grown in intellectual stature and capacity. I can readily appreciate, therefore, how widely and deeply his loss must be felt by a wide circle of friends and admirers in India.

(ترجمہ)

میرے دوست سر سید راس مسعود جنہوں نے ۱۹۰۷ ع میں ' نیو کالج ' (اوکس فورڈ) سے سند فضیلت حاصل کی ' طالب علمی کے زمانے هی

میں ممتاز نظر آتے تھے - ان کے حسن صورت، طلاقت لسانی، پر جوش ہمدردیوں اور ٹینس کے میدان میں زور شور نے بہت سے لوگوں کو ان کا دوست اور گرویدہ بنا دیا تھا اور وہ حقیقت میں کالج کے سب سے مقبول و کامیاب طلبہ میں تھے - اب تو خاصا وسیع زمانہ میرے حافظے میں محفوظ ہے لیکن جہاں تک میں نگہ دوڑاتا ہوں کوئی ایسا ہندوستانی طالب علم مجھے یاد نہیں آتا جو مسعود سے زیادہ آکسفورڈ کی زندگی میں پھر گیا ہو یا جس نے آکسفورڈ کی بہترین تعلیم و تربیت کو اُن سے بڑھ کر تحصیل کیا ہو - اُن کے ہندوستان چلے آنے کے بعد ظاہر ہے کہ ان سے ملنے کا شاذ و نادر ہی موقع میسر آتا تھا لیکن علی گڑھ، حیدرآباد اور آخر میں بھوپال کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ کر جو کامیابیاں انہوں نے حاصل کیں، وہ میرے لیے ذرا بھی قابل تعجب نہ تھیں بلکہ سچ یہ ہے کہ ایسی نمایاں قوت و قابلیت اور ایسی دلکشی والے سے ٹھیک ٹھیک انہی کارناموں کی مجھے توقع ہونی چاہیے تھی - ہم کبھی کبھی مراسلت کرتے تھے اور سنہ ۱۳-۱۹۱۲ اور ۱۴-۱۹۱۳ میں پبلک سروس کمیشن کے ساتھ جب میں ہندوستان گیا تو اُن سے ملاقات ہوئی اور حال میں جب وہ انگلستان آئے تو نیو کالج میں جہاں اب ان کا بڑا بچہ * زیرتعلیم ہے، آکر مجھ سے ملے - اس کے علاوہ مجھے اپنے مشترک دوست سر تھیوڈور موریسن سے، جو مسعود کو اپنے بیٹے کی مثل سمجھتے اور بے حد چاہتے تھے، گہ بہ گہ مرحوم کی خبریں ملتی رہتی تھیں اور ان سب متفرق مشاہدات کو ملا کر یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہ تھا کہ 'مسعود' سے جوانی میں جو خوش آیند

---

* مسعود کے اس بچے کا نام تو اکبر ہے لیکن وہ در اصل چھوٹا بھائی ہے - (مترجم)

توقعات قائم کی گئی تھیں وہ سرا سر پوری ہوئیں۔ میرے دوست ان نوجوانوں میں نہ تھے جو بد نصیبی سے آگے چل کے وہ جاتے ہیں بلکہ وہ اپنی عالی دماغی اور صلاحیت میں برابر ترقی کرتے رہے - اسی لیے میں بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں کہ ان کی موت کا ہندوستان میں ان کے احباب اور مدّاحوں کے وسیع حلقے میں کس قدر عام اور گہرا صدمہ محسوس کیا گیا ہو گا ـــ

افکار و واقعات

از

(اڈیٹر)

دو محسن

۱ - نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے انجمن کو ایک سال کے لیے پچاس روپے ماہانہ عطا فرمانا منظور کیا ہے —

۲ - ساہوکار جمال محمد صاحب نے جو مدراس کے نہایت روشن خیال تاجر اور تعلیم کے بڑے حامی ہیں' گزشتہ ماہ اکتوبر سے پچھتر روپے ماہانہ انجمن کی امداد کے لیے منظور فرمائے ہیں —

ان دونوں بزرگوں نے انجمن کے کاموں اور کوششوں کو دیکھ کر بے طلب محض از راہ قدر دانی یہ امداد عطا فرمائی ہے - میں انجمن کی طرف سے ان دونوں صاحبوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں - مجھے امید ہے کہ وہ تمام اصحاب جو اردو کے بہی خواہ ہیں اس طرف توجہ فرمائیں گے - کیونکہ انجمن نے اب جس پیمانے پر زبان کی اشاعت اور ترقی کا کام شروع کیا ہے اس کے لیے روز بروز مالی امداد کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے - یہی تھوڑی تھوڑی مدد بہت سی ہو جاتی ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اسی قسم کی امداد سے بڑے بڑے

کام تکمیل کو پہنچے ہیں —

ایک سہل طریقہ امداد کا یہ ہو سکتا ہے کہ اردو کے ہمدرد کثرت سے انجمن کے مستقل خریدار رکن بن جائیں - اس کی صورت یہ ہے کہ وہ سالانہ بارہ روپے پیشگی عنایت فرمائیں اور انجمن ان کو سال میں پندرہ روپے کی کتابیں دے گی - اگر تمام ہندستان میں ہمیں دو ہزار بھی ایسے ارکان مل جائیں تو انجمن اردو زبان و ادب کی اشاعت و ترقی میں خاطر خواہ کامیاب ہو سکتی ہے اور اردو زبان کو اعلیٰ رتبے تک پہنچا سکتی ہے - انجمن عام طور پر چندہ طلب نہیں کرتی بلکہ صرف یہ چاہتی ہے کہ صاحب استطاعت اس کی رکنیت قبول کر لیں - اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ ہم کثرت سے کتابیں شایع کر سکیں گے اور اردو ادب کو ہر قسم کے ادب سے مالا مال کرنے کے قابل ہو جائیں گے - اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب ارکان کے پاس انجمن کی مطبوعات کا سلسلہ جاری رہے گا تو وہ خود نیز دیگر اصحاب اس سے مستفید ہوں گے اور قوم میں اچھی کتابوں کے مطالعہ کا شوق بڑھے گا جو زبان کی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے - یہ ایسا آسان طریقہ ہے کہ اگر ہمدردان اردو اس طرف توجہ فرمائیں تو بہت بڑا کام انجام پا سکتا ہے - اردو کی دستگیری کا یہی وقت ہے اگر ہم نے غفلت سے یہ موقع کھو دیا تو آیندہ جو مشکلات آنے والی ہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا —

شمالی ارکاٹ (مدراس) کا دورہ

میں نے اکتوبر کے مہینے میں چند روز شمالی ارکاٹ کے دورے میں صرف کیے تاکہ وہاں کے اسلامی مدارس وغیرہ کا معائنہ کرکے اس امر

کا اندازہ کروں کہ وہاں اردو کی تعلیم نیز اردو زبان کی عام حالت کیسی ہے - مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی کہ شمالی ارکاٹ میں اردو کا عام چرچا ہے - مسلمان تو اکثر اسے قومی اور مادری زبان سمجھ کر پڑھتے اور بولتے ہیں ' لیکن ہندو بھی اسے سمجھتے اور اسلامی مدارس میں پڑھتے لکھتے ہیں - جن مدارس کا میں نے معائنہ کیا ان کی مختصر کیفیت ذیل میں درج کی جاتی ہے —

اس دورے میں میرے ساتھ سید ابو تمیم فرید آبادی اور سید سلطان محی الدین بھیلی سکرٹری - مسلم یوتھ کانفرنس جنوبی ہند بھی تھے - بھیلی صاحب انجمن ترقیء اردو، صوبہ مدراس کے بھی ایک سکرٹری ہیں اور بڑے پرجوش اور قابل نوجوان ہیں - صوبۂ مدراس میں اردو کی اشاعت میں ان سے بہت بڑی مدد ملنے کی توقع ہے —

سب سے پہلے ہم مدراس سے ویلور پہنچے - یہ بہت قدیم مقام ہے - اردو یہاں آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے رائج ہے - دہ مجلس کے مصنف فیاض ولی ویلور کے رہنے والے تھے - یہ کتاب غلطی سے اکثر تذکرہ نویسوں نے ولیء دکن (اورنگ آبادی) سے منسوب کردی تھی - یہاں عربی کے دو بڑے مدرسے ہیں - ایک مدرسۂ لطیفیہ اور دوسرا باقیات الصالحات - مدرسۂ لطیفیہ کے مرحوم بانی نے اس مدرسے کے لیے بڑی شاندار عمارت کی بنیاد ڈالی تھی جو افسوس ہے کہ ان کے انتقال کی وجہ سے ناتمام رہ گئی اور اب شکستہ حال میں ہے - مدرسے کی حالت بھی عمارت ہی سے ملتی جلتی ہے - کسی زمانے میں یہ مدرسہ بہت پر رونق تھا - اب یہ حالت نہیں رہی ؛ صرف ۲۵ طالب علم تعلیم پاتے ہیں - تعلیم نصاب نظامیہ کے مطابق ہوتی ہے لیکن کل تعلیم اردو کے ذریعہ سے ہوتی-

ہے - برخلاف اس کے مدرسۂ باقیات الصالحات کی حالت بہت قابل اطمینان اور قابل قدر ہے - عمارت بھی عالیشان اور وسیع ہے اور اس کے ساتھ طلبہ کے لیے دارالاقامہ بھی ہے - کتب خانہ اور دارالمطالعہ بھی موجود ہے - طلبہ کی تعداد ۲۲۰ ہے - اس مدرسے نے عربی زبان و علوم اور اس کے ساتھ اردو کی اشاعت میں بڑا کام کیا ہے - ابتدائی اور اعلیٰ مدارج کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے لیکن وسطانی جماعتوں کی تعلیم ابھی تامل کے ذریعہ سے دی جاتی ہے - میں نے اس بارے میں مولانا ضیاءالدین صاحب سے جو اس مدرسے کے پرنسپل ہیں ' گفتگو کی - انہوں نے فرمایا کہ ہم رفتہ رفتہ اردو کے رائج کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں - پہلے اعلیٰ مدارج کی تعلیم بھی تامل ہی کے ذریعہ ہوتی تھی لیکن اب ہم نے یہ طریقہ بدل دیا ہے - ابتدائی جماعتوں میں بھی اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے - لیکن چونکہ وسطانی طبقے میں طلبہ مالابار اور دوسرے ایسے مقامات سے آتے ہیں جو اردو نہیں جانتے اس لیے مجبوراً تامل کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہم انہیں اردو الگ پڑھاتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس طبقے کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو ہوجائے گا —

ویلور سے ہم وشارم گئے - یہ مقام ویلور سے چند میل پر ہے - چونکہ وہاں پہنچتے پہنچتے شب ہوگئی تھی اس لیے مدرسہ کا معائنہ نہ کرسکے مگر بعض مدرسین سے ملاقات ہوئی - یہ امدادی مدرسہ اسلامیہ ہے اور مڈل اسکول تک تعلیم ہوتی ہے - اردو لازمی ہے اور اردو کے علاوہ تامل اور انگریزی زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں —

ویلور واپس آکر دوسرے روز پرنام بٹ پہنچے - یہاں کا مدرسۂ اسلامیہ جس میں مڈل سکول تک تعلیم ہوتی ہے بہت اچھی حالت میں

ہے - طلبہ کی تعداد ۳۶۰ ہے - تامل اور انگریزی کے ساتھہ اردو بھی لازم ہے اور طلبہ اردو خوب لکھتے پڑھتے ھیں - کتابی تعلیم کے ساتھہ پتا کتکا بھی سکھایا جاتا ہے —

پرنام پہت سے ہم عمر آباد گئے - عمر آباد کوئی خاصی بستی نہیں بلکہ اسے "یونیورسٹی تاون" کہنا چاھیے - عمر سیٹھہ مرحوم نے اس مقام پر اپنے خرچ سے ایک مدرسہ جامعہ دارالسلام کے نام سے قائم کیا جہاں عربی کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے اور عربی کے ساتھہ انگریزی اور اردو بھی پڑھائی جاتی ہے - ذریعۂ تعلیم اردو ہے - اسی مدرسے کی وجہ سے یہاں تھوڑی سی آبادی بھی ہوگئی ہے - ورنہ اصل آبادی جامعہ کے مدرسوں اور طلبہ کی ہے - تعداد طلبہ ۱۵۰ ہے - یہاں کے مدرسوں اور طلبہ نے اردو اکیڈیمی بھی قائم کی ہے اور ایک ماہانہ رسالہ "مصحف" بھی جاری کیا ہے - یہاں کے طلبہ کے اردو مضامین دیکھہ کر اور اردو گفتگو سن کر بہت خوشی ہوئی - میری موجودگی میں بصدارت مولانا فضل اللہ صدر جامعہ اردو اکیڈیمی کا ایک جلسہ ہوا - تلاوت قرآن کے بعد اس کا افتتاح ایک ہندو کم عمر لڑکی نے سورۂ فاتحہ کا اردو منظوم ترجمہ پڑھ کر کیا اور اس کے بعد ایک کم عمر اچھوت لڑکے نے اردو نظم سنائی - یہاں ایک امدادی مدرسہ مدرسۂ مقصدیہ بھی ہے جہاں مڈل تک تعلیم ہوتی ہے - طلبہ کی تعداد ۲۵۰ ہے - تامل اور انگریزی کے ساتھہ اردو لازم ہے - اس میں گرد و نواح کے ہندو طلبہ بھی تعلیم پاتے ھیں جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے اور سب اردو پڑھتے ھیں -

عمر آباد سے ہم آمبور پہنچے - یہاں ایک مڈل اسکول مظہرالعلوم کے نام سے قایم ہے - پر رونق مدرسہ ہے - تقریباً دو سو طالب علم زیر تعلیم

ہیں۔ اردو لازم ہے۔ اس کے علاوہ تامل، انگریزی عربی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں کے منشی عبدالکریم صاحب ساغر اردو کے بہت پر جوش حامی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف دیہات متعدد مدرسے اپنی کوشش سے جاری کیے ہیں —

آمبور کا معائنہ کر کے ہم واپس عمر آباد آگئے۔ رات کو وہاں قیام کر کے دوسرے روز روانہ ہوکر وانم باڑی پہنچے۔ وانم باڑی شمالی ارکاٹ میں اسلامی تعلیم اور اردو کا بڑا مرکز ہے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب میں صوبۂ مدراس کی ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوا تھا اور یہ جلسہ یہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اردو کی اہمیت اور ضرورت پر تقریر کی تھی، اُس وقت کے بعض بزرگ اب تک موجود تھے۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا کہ آپ نے بیس برس پہلے جو کہا تھا اس کی ہم نے حرف بحرف تعمیل کی ہے۔ اب اردو ہماری مادری زبان ہوگئی ہے۔ تامل ہم نے چھوڑ دی۔ ہمارے گھروں میں عورتیں بچے سب اردو بولتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ یہاں دو جلسے ہوئے ایک جامع مسجد میں اور دوسرا شام کو ہائی اسکول میں۔ یہاں ایک تو انٹرمیڈیٹ کالج ہے۔ ایک عربی مدرسہ معدن العلوم اور ایک اسلامیہ ہائی اسکول۔ عربی مدرسے میں نظامیہ نصاب کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں ۱۵ طالب علم ہیں جن میں چار لنکا کے ہیں۔ ہائی اسکول یہاں کا بہت کامیاب مدرسہ ہے۔ اس میں ۶۵۰ طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ جن میں تقریباً ۲۰۰ ہندو طالب علم ہیں اور وہ سب بھی اردو پڑھتے ہیں —

وانم باڑی سے روانہ ہوکر ہم شب کو ترپتور پہنچے۔ جامع مسجد

میں سب لوگ منتظر تھے جہاں کچھہ دیر بعد ایک جلسہ ہوا - صبح کو مدرسوں کا معائنہ کیا گیا - یہاں دو مدرسے میں ایک مدرسہ عثمانیہ جس میں پانچ جماعتوں تک تعلیم ہوتی ہے - تعداد طلبہ ۱۷۵ ہے - اردو لازم ہے - اس مدرسے کو نظام گورنمنٹ سے امداد ملتی ہے - ایک دوسرا مدرسہ فتح مبین ہے جس میں ۱۳۸ لڑکے پڑھتے ہیں - اردو لازم ہے - حالت قابل اطمینان نہیں معلوم ہوتی —

تریچور سے روانہ ہوکر ہم تھوڑی دیر کے لیے سنگھم میں ٹھہرے - یہاں کے مدرسے میں ساٹھہ ستر طالب علم پڑھتے ہیں مسلمان لڑکے لڑکیاں ساتھہ پڑھتی ہیں - اردو سب کے لیے لازم ہے - کسی قسم کی کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی —

رستے میں تھوڑی دیر کے لیے ترو ونا لے میں ٹھہرے - یہاں تھوڑا عرصہ ہوا انجمن کی طرف سے ایک شبینہ مدرسہ قائم کیا گیا ہے - اردو لازم ہے - ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے - ۳۸ طالب علم ہیں جن میں چار ہندو ہیں —

تیسرے پہر ہم تنڈی ونم پہنچے - یہاں اسلامیہ مدرسہ دیکھہ کر بے حد خوشی ہوئی - اس میں آٹھہ جماعتیں اور ۴۲۶ طالب علم ہیں - جن میں دوسو ہندو طالب علم ہیں اور وہ سب اردو پڑھتے ہیں - مدرسے کا مکان ایک ہندو ہمدرد نے نذر کیا ہے - صدر مدرس بھی ایک قابل ہندو ہیں جو بڑی ہمدردی سے کام کرتے ہیں - اس مدرسے کے متعلق ایک یتیم خانہ اور دارالاقامہ بھی ہے - بوائے اسکاوٹس بھی ہے جو ہم نے کسی دوسرے مدرسے میں نہیں دیکھا - کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی - کارکنان مدرسہ کی سعی اور محنت نہایت قابل تحسین ہے - ہمارے

پہنچنے پر کم عمر ہندو لڑکے لڑکیوں نے جب مولوی حالی کی یہ نعتیہ نظم پڑھ کر سنائی :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو میں کہہ نہیں کہہ سکتا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے کیا سماں بندھ گیا تھا۔اس مدرسے کے کارکنوں نے انجمن سے امداد کی درخواست کی ہے اور انجمن ضرور ان کی درخواست پر غور کرے گی —

علاقۂ نیلگری کے مدرسے

انجمن کے مدرسے جو میں نے دورہ کرکے نیلگری کے علاقے میں قائم کیے تھے وہ بخوبی چل رہے ہیں - ان مدرسوں کو انجمن کی شاخ نیلگری اردو سوسائٹی کی نگرانی میں دیدیا گیا ہے - سوسائٹی کے صدر محمد سردارخاں صاحب ایم - اے ' بی ٹی اور اس کے سکرٹری مولوی رشید احمد صاحب ایم - اے ' ایم - او - ایل بڑے شوق اور محنت سے وقتاً فوقتاً ان کا معائنہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی اصلاح اور ترقی میں کوشاں ہیں - ہر مہینے کی رپوٹ وصول ہوتی رہتی ہے - یہاں ان مدرسوں کا سرسری سا ذکر کیا جاتا ہے —

۱ — اوٹی کمنڈ ' مدرسہ شبینہ - تعداد طلبہ ۲۹ - ان کے علاوہ پانچ سے چھے بجے تک چار ہندو کلارک اردو پڑھتے ہیں —

۲ — ولنگٹن - مدرسہ شبینہ - تعداد طلبہ ۲۲ - اس مدرسے میں زیادہ تر بڑی عمر کے لڑکے پڑھتے ہیں —

۳ — کونور - مدرسہ شبینہ - تعداد طلبہ ۲۰ - اس مدرسے میں ایسے لڑکے

اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں جو دن کو دوسرے مدرسوں میں پڑھتے ہیں جہاں اردو کا انتظام نہیں —

۴ — میٹوپالیم - مدرسہ شبینہ - تعداد طلبہ ۲۰ - کچھ دنوں پہلے مدرسہ کی حالت خراب ہوگئی تھی' اب نئے مدرس کے تقرر سے قابل اطمینان طور پر کام ہو رہا ہے —

۵ — انّور - مدرسہ شبینہ' تعداد ۲۰ - اس مدرسے میں اکثر ایسے لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں جو دن میں اپنے اپنے کاروبار میں لگے رہتے ہیں —

۶ — سرمنگائی - مدرسۂ شبینہ' تعداد طلبہ ۲۹ - جن میں پانچ ہندو بھی اردو پڑھتے ہیں —

۷ — کونگری - مدرسہ شبینہ - تعداد طلبہ ۱۵ - اس مدرسے کی حالت بھی مدرس کی بے پروائی سے خراب ہوگئی تھی - اب جدید انتظام کی وجہ سے روبہ اصلاح ہے —

۸ — کارمڑے - شب و روز کا مدرسہ - تعداد طلبہ ۴۲ - جن میں پندرہ لڑکیاں بھی ہیں - یہ مدرسہ دن کو بھی ہوتا ہے اور رات کو بھی - کیونکہ مسلمان طلبہ کی تعلیم کا یہاں دوسرا انتظام نہیں —

۹ — بکتور - دن کا مدرسہ - تعداد طلبہ ۳۱ - جن میں دس لڑکیاں بھی شریک ہیں - مدرسہ صرف دن کے وقت ہوتا ہے - یہاں مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی دوسرا انتظام نہیں —

ان تمام مدارس میں تقریباً ڈھائی سو لڑکے لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں - اور مقامات سے بھی مدرسے قائم کرنے کی درخواست آرہی ہیں جن پر غور کیا جا رہا ہے —

شاخ انجمن ترقیء اردو صوبۂ مدراس

اس شاخ نے اب تک کوئی کام نہیں کیا تھا - اس لیے میں نے مدراس پہنچ کر اس کی از سر نو تنظیم کی - صدر مولانا محمد علی ایم - اے (کینٹب) انتخاب کیے گئے - مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور جوش اسلامی اور ایثار محتاج بیان نہیں - کالی کٹ میں جو یتیم خانہ موپلا قوم کے لیے انہوں نے قائم کیا ہے وہ اُن کی ہمدردی کا بین ثبوت ہے - سکرتری تین مقرر ہوے - جنرل سکرٹری افضل العلما مولوی عبدالوہاب بخاری صاحب ایم - اے ' بی ٹی - مولوی محمد حسین محوی صاحب (اردو ری سرچ ڈیپارٹمنٹ مدراس یونیورسٹی) اور سید سلطان محی الدین بیملی صاحب بی - اے ' اُن کے مددگار - تینوں صاحب قابل ہمدرد اور اردو کے فدائی ہیں - بیملی صاحب مدراس کے علاقے سے زیادہ واقف اور پرجوش ہیں اور بہ نسبت باقی دو صاحبوں کے انہیں آزادی بھی نصیب ہے - وہ عنقریب تامل ناڈ کے دورے پر جانے والے ہیں - افسوس میں وہاں اب تک نہیں جاسکا - اس علاقے میں کام کی بہت ضرورت ہے - مولوی بشیر احمد سعید صاحب ایم - اے ' ایل ایل بی ایڈوکیٹ بھی ہماری اس انجمن کے خاص رکن ہیں - وہ بہت قابل سلجھےہوئے اور صاحب راے شخص ہیں - ان کو انجمن کے مقاصد سے بڑی ہمدردی ہے اور مجھے امید ہے کہ ان کی شرکت اور ہمدردی سے انجمن کو بہت کامیابی ہوگی - اس انجمن نے شہر مدراس کے بعض ایسے محلوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی تعداد ہے اور ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں مدرسے قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے -

نیز مولانا محمد علی اور مولوی بشیر احمد سعید صاحب صوبہ کے وزیر اعظم اور وزیر تعلیم سے ملاقات کرکے اردو زبان کی تعلیم کے متعلق گفتگو کرنے والے ہیں اور امید ہے کہ اس گفتگو کا نتیجہ ضرور ہماری زبان کے حق میں مفید ہوگا - مولانا کا ارادہ بعض مقامات کے دورے کرنے کا بھی ہے —

صوبۂ بہار اور اردو

انجمن کی شاخ صوبۂ بہار نے یہ ارادہ کیا تھا کہ مدارس میں اردو تعلیم کے متعلق ضروری امور کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے ایک عرضداشت وزیر تعلیم صاحب کی خدمت میں بھیجی جائے - چنانچہ اس امر کے گوش گزار کرنے کے لیے مولوی سید ضمیر الدین احمد صاحب ڈاکٹر سید محمود صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے - ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ عرضداشت بھیجنا بیکار ہے ' میں سب کچھ طے کر چکا ہوں - ایک کمیٹی ان امور پر غور کرنے کے لیے بنادی جائے گی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہوں گے - مولانا ابوالکلام کی شرکت سے یہ امید بندھتی ہے کہ کمیٹی کوی امر ایسا طے نہیں کرے گی جو اردو کے حق میں مضر ہو - لیکن اگر خدا نخواستہ کمیٹی نے کوئی ایسا فیصلہ کیا جس سے ہماری زبان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو پھر ہمیں کوئی دوسرا چارۂ کار اختیار کرنا پڑے گا - مناسب تو یہ تھا کہ مجوزہ کمیٹی میں انجمن کا بھی کوی نمایندہ شریک کرلیا جاتا تاکہ تمام مدارج

اس طرح طے پا جاتے کہ آئندہ کسی قسم کے تنازع کا امکان باقی نہ رہتا۔ فی الحال ہم وزیر صاحب تعلیمات اور مولانا ابوالکلام آزاد کی مصلحت بینی اور دور اندیشی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تمام پہلوؤں پر غور کرکے زبان کے مسئلے کو اس طرح سلجھا دیں گے کہ کسی تنازع کی نوبت نہ آنے پائے گی —

تبصرے

تبصرے

ادب

نغمۂ فردوس -

(مجموعۂ کلام خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر - حجم دوسو صفحے قیمت دو روپے ' مجلد اڑھائی روپے - شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہوری دروازہ لاہور) -

خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب 'ناظر' سابق وزیر کشمیر پنجاب کے دور جدید میں اردو کے سب سے پہلے ممتاز شاعر ہیں جن کی خوش نوائی نے اول اول علی گڈھ کے علمی مرکز میں شہرت کی سند حاصل کی اور سید احمد خاں مرحوم کے حلقۂ ادب خصوصاً مولانا 'حالی' مرحوم سے اکتساب فیض کیا - پنجاب واپس آکر انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں میں اور پھر کشمیر جنت نظیر پہنچ کر احباب کے حلقوں میں شعر گوئی و سخن سرائی کا سلسلہ جاری رہا اور اسی ذخیرہ کا پہلا حصہ اب سامعہ نواز اہل ذوق ہے - جناب چودھری بالقابہم کا ارادہ تھا کہ مجموعۂ کلام کے ساتھ اپنے حالات اور نفس شاعری

پر بھی ایک مقالہ شائع کریں لیکن طوالت کے خیال سے سردست کلام کا صرف پہلا حصہ چھاپلے کا فیصلہ کیا جس کے بعد کلام کا دوسرا حصہ اور پھر تیسری جلد میں شاعری پر تبصرہ اور سوانح حیات طبع کی جائے گی - بہر حال ہمیں مولوی محمد عبداللہ صاحب 'کامل' پروفیسر گورمنٹ کالج لائل پور کا شکرگزار ہونا چاہئے جن کی عقیدت مندانہ کوشش و اهتمام سے یہ کتاب مرتب ہوئی - حکیم محمد چراغ صاحب خوش نویس کی حسن کتابت قابل داد اور برقی مطبع گیلانی ' لاہور کی نفیس طباعت لائق دید ہے جن کی بدولت 'نغمۂ فردوس' اس شان و خوبی سے آئینۂ قرطاس پر صورت نما ہوا کہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے —

دیباچہ و تمہید کے بعد متن کتاب ایک مناجات سے شروع ہوا ہے اور اس کے بعد بھی اسی موحدانہ رنگ کی نظم "پیمان الست" ہے جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں :

هم پرستار خدا ہیں ' هم خدا کے ساتھ ہیں
هر گھڑی هر لحظہ اور هر دم خدا کے ساتھ ہیں
ساز فطرت ہے همارا عشق سے رنگیں نوا
نغمہ هائے دل کے زیر و بم خدا کے ساتھ ہیں

پھر 'جوگی' کی مشہور نظم درج ہے جس کا ترنم کوهستان همالہ سے لیکر وادیء کاویری تک گونج چکا ہے - حال میں جناب چودھری صاحب نے اس دل کش نظم کا ایک تکملہ بھی تحریر کیا ہے جس میں تیس برس کے بعد جوگی سے اپنی دوسری ملاقات کی کیفیت بیان کی ہے - یہ تمام مدت جوگی نے انہی پہاڑوں کی تنہائی میں بسر کردی اور وهیں

ایک تالاب کے کنارے سکونت گزیں پایا گیا - اس کے استھان کا یہ نقشہ دیکھنے کے قابل ہے :

اپنا تو زمانہ بیت گیا سرکاروں میں درباروں میں
پر جوگی میرا شہر رہا پربت کی سونی غاروں میں
ہر قاب کا تھا اک تال یہاں یا چاندی کا تھا تھال یہاں
الماس جڑا تھا زمرد میں یہ تال نہ تھا کہساروں میں
تالاب کے ایک کنارے پر یہ بن کا راجہ بیٹھا تھا
تھی فوج کھڑی دیواروں کی ہر سمت بلند حصاروں میں
یاں سبزہ و گل کا نظارہ تھا اور منظر پیارا پیارا تھا
پھولوں کا تخت اُتارا تھا پریوں نے ان کہساروں میں
یاں باد سحر جب آتی تھی بھیروں کا ٹھاٹ جماتی تھی
تالاب رباب بجاتا تھا لہروں کے تڑپتے تاروں میں
کیا مستِ الست نوائیں تھیں قدرت کے اِن مزماروں کی
ملہار کا روپ تھا چشموں میں سارنگ کا رنگ فواروں میں
جب جوگی جوش وحدت میں 'ہر نام' کی ضرب لگاتا تھا
اک گونج سی چکر کھاتی تھی کہساروں کی دیواروں میں

... ...

مجموعے کی دوسری نظموں میں' حمایت الاسلام کی طرف سے رئیس بہاول پور کا خیر مقدم اور سر سید مرحوم کا مرثیہ خاص طور پر اثر انگیز ہیں - کئی پر لطف نظمیں کشمیر کے درباری موقعوں اور قدرتی مناظر پر تحریر کی گئی ہیں - چند سہرے اور بارہ غزلیں بھی بطور نمونہ اس حصے میں شامل ہیں اور آخر میں اردو اور کچھ فارسی

رباعیات ہیں جن میں سے دو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

۱ - ہم راز حیات فاش کرنے کے نہیں
دم کشف وکرامات کا بھرنے کے نہیں
یہ شک ہے کہ کس شکل میں جینا ہوگا
لیکن ہے یقیں ہمیں کہ مرنے کے نہیں

۲ - بلبل نالہ بہ دل فگارے آموخت
گل خندہ لبی بہ گل عذارے آموخت
بے کارم و در خیال کارے ہردم
عشق تو مرا چہ کار و بارے آموخت

چودھری صاحب کے کلام میں تخیل کی ندرت اور بلندی نہ سہی، پاکیزگی اور نفاست ہر جگہ موجود ہے - وہ کسی خاص حکمت و فلسفۂ زندگی کے معلم نہیں ہیں لیکن ایک خوش فکر و خوش گفتار شاعر ضرور ہیں جس کے بیان کی خصوصیت ترنم و دلکشی ہے اور جو مختلف اصناف سخن پر پوری طرح قادر ہے - باریک بینوں کو محاورۂ زبان کی کہیں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی لیکن یہ اتنی شاذ اور خفیف ہیں کہ مجموعی خوبیوں کے مقابلے میں کچھ لائق لحاظ نہیں - ہمیں امید ہے کہ جدید شاعری کے قدرشناس اس مجموعے کو شوق سے خریدیں گے اور اس کے محاسن سے لطف اندوز ہوں گے —

(ش)

انور -

(مصنفہ فیاض علی صاحب ایڈوکیٹ نیض آباد - صفحات ۷۵۰ مجلد، قیمت دو روپے - آٹھ آنے انڈین پریس الہ آباد)

یہ ناول "شمیم" کے مصنف کا ہے - اور "شمیم" سے بہ لحاظ روداد (پلاٹ) ' زبان و بیان اور تخیل کے کہیں بہتر ہے - اشخاص کے کردار بھی خوب ہیں ' خصوصاً انور کا جو ناول کا ہیرو ہے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے - مکالموں میں شوخی و ظرافت اور خیال آرائی بہت پُر لطف ہے اگرچہ بعض موقعوں پر یہ مکالمے ذرا طویل ہوگئے ہیں - اردو ڈراموں پر جو مکالمہ ہے گو وہ حقیقت پر مبنی ہے مگر آج کل بے لطف معلوم ہوتا ہے ' تیس چالیس برس پہلے لکھا جاتا تو اور لطف دیتا - اس ناول میں مصنف نے سازشوں اور سراغ رسانی میں بھی کمال دکھایا ہے - ناول بہت دلچسپ ہے اور شروع کرنے کے بعد بیچ میں پڑھتے پڑھتے چھوڑنا ناگوار معلوم ہوتا ہے - قابل مصنف کا تخیل ' زبان کی صفائی ' خیالات کی چستی ' شوخی و ظرافت ' نفسیاتی اور جذباتی کیفیت قابل تعریف ہیں - یہ سب کچھ ہے لیکن حقیقت نگاری کم ہے اور افسانے کا رنگ غالب ہے - یعنی چند معمول لوگوں کے عشق و محبت اور چند قسی القلب زر پرستوں کا قصہ ہے - جس ملک اور جس شہر میں یہ سب کچھ واقع ہوا ہے وہاں کی معاشرت اور عام خیالات کا کوئی ذکر نہیں ' حالانکہ یہ زمانہ نئے نئے حالات اور انقلابات سے پُر ہے - باوجود اس کے اردو میں ایسے ناول نہیں ملیں گے اور ہمیں قابل مصنف کی داد دینی پڑتی ہے —

قلعۂ معلی کی جھلکیاں۔

(مصنفہ جناب عرش تیموری - مکتبۂ جہاں نما - اردو بازار،
جامع مسجد - دھلی - قیمت آٹھ آنے)

عرش صاحب تیموری خاندان کی یادگار ھیں - اگرچہ انھوں نے قلعۂ معلی کی وہ شان اور چہل پہل نہیں دیکھی جس کی یاد اب تک اُن کے دل کو گدگدارھی ھے - لیکن انھوں نے اپنے دادا اور دوسرے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں سے جو کچھہ سنا تھا وہ ان اوراق کے سپرد کردیا ھے - یہ نہ کوئی تاریخ ھے نہ قلعۂ معلی کے حالات کا تذکرہ، لیکن تاھم اس میں بعض ایسی باتیں ملیں گی جو نہ تاریخوں میں ھیں نہ تذکروں میں - یہ صرف جھلکیاں ھیں - بعض وقت ایک جھلکی وہ کام کرجاتی ھے جو روز مرہ کی آمد و رفت اور ملاقات سے بھی نہیں ھوسکتا - اس چھوٹے سے روزن میں سے آپ کو بادشاہ بیگمیں اور شہزادے چلتے پھرتے نظر آئیں گے اور ان کے روز مرہ کے اشغال، کھیل کود، تفریحات، رسم و رواج، لڑائی جھگڑوں، سازشوں اور ان کی بے بسی اور کمزوری کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دے گی —

بُرھانِ مآثر۔

یہ کتاب مجلس مخطوطات فارسی حیدرآباد دکن کے سلسلے کی دوسری کتاب ھے - اس سے قبل تغلق نامہ شایع ھوچکا ھے جو بالکل نادرالوجود کیا مفقود ھوچکا تھا - یہ کتاب بھی جو سنہ ۱۰۰۰ ھ کی تالیف

ہے ایک زمانے سے مفقود تھی - چنانچہ مجلس کے معتمد اعزازی مولوی سید ہاشمی صاحب کتاب کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں :—

"ہندوستان میں یہ کتاب ایک مدت سے نادرالوجود ہوگئی ہے اور جہاں تک معلوم ہوسکا صرف ایک نسخہ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے - یہ دو جلدوں میں جلی قلم سے تقریباً پندرہ سو صفحات پر لکھا ہوا ہے' لیکن اول و آخر کے چند اوراق تلف ہوگئے ہیں اور آب زدگی سے بھی بعض عبارتیں پڑھی نہیں جاتیں - تاہم مجلس مخطوطات نے اپنے نسخے کی صحت میں اس سے بہت مدد لی - انگلستان میں اس کتاب کے دو نسخوں کو برٹش میوزیم میں دیکھنے کا موقع ملا' لیکن سب سے بہتر اور کامل تر نسخہ کیمبرج میں موجود ہے" —

غرض ان دو نسخوں سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے - مولف برہان مآثر مورخ فرشتہ کا ہم عصر ہے اور اس نے صرف سلاطین دکن کی تاریخ لکھی ہے - جیسا کہ ہمارے بعض مورخوں کا قاعدہ ہے کہ تاریخ کو اپنی انشا پردازی دکھانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں' اس کتاب کے مولف نے بھی ادبی جولانیاں دکھائی ہیں - تاہم یہ کتاب تاریخی اعتبار سے خاص حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے - کیونکہ ایک تو مورخ خود دکن کا ہے دوسرے اس نے بہمنی سلطنت کی خزاں اور نئی حکومتوں کی بہار اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے —

کتاب جامعہ پریس دہلی میں ٹائپ کے حروف میں بہت خوش نما چھپی ہے —

مجلس مخطوطات اور اس کے قابل سکرٹری ان نادرالوجود کتابوں کی اشاعت کے لیے قابل مبارک باد ہیں —

اُردو کے جدید رسالے

نکہت -

(اڈیٹر محمد عارف علوی صاحب بی-اے سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے - لکھنؤ) -

یہ سولہ صفحے کا بچوں کا ماہانہ رسالہ ہے - جلی قلم سے خوش خط چھپا ہوا ہے - مضامین بچوں کی دلچسپی کے ہیں - کہانیوں اور مضامین کے متعلق تصویریں بھی ہیں - بچوں کے لیے بہت اچھا رسالہ ہے —

رفیق الطلبہ -

(پونا - سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ اینگلو اردو ہائی اسکول پونا کا ششماہی رسالہ ہے جو انگریزی اور اردو حصوں پر مشتمل ہے - اردو حصے کو پڑھ کر خوشی ہوئی - جتلے مضامین، نظمیں یا فسانے ہیں ان سب کی زبان سلیس اور فصیح ہے - اینگلو اردو ہائی اسکول کے طلبہ کی یہ کوشش قابل تحسین ہے -

اردو رسالوں کے خاص نمبر

علی گڑھ میگزین -

اسے دیکھ کر قدیم زمانے کا علی گڑھ میگزین یاد آ گیا - جس میں انگریزی اردو دونوں قسم کے مضامین ہوتے تھے - پروفیسر آرنلڈ اس کے اڈیٹر تھے اور اردو حصے کی ترتیب میں کچھ دنوں میں نے بھی ان کی مدد کی - لیکن اب زمانہ اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ وہ اس کے سامنے بچہ معلوم ہوتا ہے —

یہ میگزین کا تعطیلات نمبر ہے اور بہت خوبی اور لیاقت سے مرتب کیا گیا ہے - مضامین سب عمدہ اور فسانے دلچسپ ہیں —

زکریا فیاضی صاحب ایم - اے (علیگ) نے رجب علی بیگ سرور کے حالات ' تصانیف اور کلام پر اچھا مضمون لکھا ہے اور اس کے لکھنے میں محنت کی ہے - آل احمد سرور صاحب کا مضمون رتن ناتھ سرشار پر اگرچہ مختصر ہے مگر بڑی خوبی اور تحقیق سے لکھا ہے - " ہندستانی زبان اور معاشرت پر انگریزی اثرات " پروفیسر عبدالباسط صاحب کا مضمون بہت پُر لطف ہے - پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے " سفر ماضی و حال " کا ذکر اپنے خاص انداز میں خوب تحریر کیا ہے - جلیل احمد صاحب قدوائی کا مرثیۂ مسعود بہت پر درد ہے —

میگزین دنیا کے موجودہ سیاسی حالات سے بھی بیگانہ نہیں - جاں نثار اختر صاحب کی نظم " میں ان کے گیت گاتا ہوں " اور بغاوت یونان اور سیاسیات یورپ اور انقلابات چین کے مضامین اس کے شاہد ہیں —

آج کل رسالے اس کثرت سے شائع ہو رہے ہیں کہ ان کے لیے اچھے

مضامین کا فراہم کرنا ایک مشکل مسئلہ ہوگیا ہے - لیکن محمد معین الدین صاحب دردائی قابل مبارک باد ہیں کہ باوجود اس مشکل کے انہوں نے ایسے اچھے مضامین بہم پہنچائے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ میں اردو کی ترقی کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے - اگر یہ شوق اسی طرح جاری رہا تو کچھہ تعجب نہیں کہ علی گڑھ پھر ایک بار اردو کا مرکز بن جائے —

یہ میگزین ۲۳۹ صفحوں کا نہایت خوشخط اور اعلیٰ درجے کے کاغذ پر طبع ہوا ہے —

ہمایوں سالگرہ نمبر -

ہمایوں کا یہ نمبر بڑے سلیقے سے مرتب ہوا ہے - نظم و نثر کے دلچسپ مضامین جمع کیے گئے ہیں - شروع میں کلام ہمایوں کا ایک ورق ہے - جوش ، کیفی ، امجد حیدرآبادی ، حامد علی خاں وغیرہ کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں - سات تصویریں بھی ہیں - ہمایوں نے اردو رسالوں میں خاص حیثیت پیدا کرلی ہے اور اس کی ترقی کو دیکھہ کر جی خوش ہوتا ہے —

ادب لطیف (افسانہ نمبر)

دلچسپ عمدہ افسانوں اور اچھی تصویروں کا مجموعہ ۱۶۰ صفحے پر ہے - دو کالموں میں باریک مگر واضح اور خوش خط لکھا ہوا ہے - شروع میں احسان دانش کی نظم مزدور کی موت پر خوب ہے - بہت خوبی سے مرتب ہوا ہے —

اردو

فہرستِ مضامین

سترھویں جلد — سنہ ۱۹۳۷ ع

مقالے

نظم

ادبی معلومات

"مرتبۂ ناخدا"

افکار و واقعات

(از ایڈیٹر)

تبصرے

ادب

خاص نمبر اور سالنامے

اطلاع

انجمن ترقی اردو (ہند) کے ذخیرۂ کتب میں حسب ذیل کتابوں کا حال میں اضافہ ہوا ہے۔ شائقین دفتر انجمن سے یہ کتب طلب فرما سکتے ہیں —

مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی کی تازہ ادبی و علمی کتب

(۱) میری کہانی مکمل - (پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی) - ہر دو حصہ قیمت چار روپے

(۲) میدان عمل - (منشی پریم چند آنجہانی کا شاندار ناول) قیمت دو روپے آٹھ آنے

(جوش ملیح آبادی کی نظمیں)

(۳) فکر و نشاط " " ایک روپیہ آٹھ آنے

(۴) شعلہ و شبنم " " تین روپے

(۵) نقش و نگار " " دو روپے

(۶) تاریخ فلسفۂ اسلام - قیمت دو روپے

(۷) المدینۃ الاسلام - دو روپے

(۸) خطبات خالدہ ادیب خانم - دو روپے

(۹) نغمات - (ل- احمد اکبر آبادی کے مضامین کا مجموعہ) - بارہ آنے

(۱۰) مضامین رشید - (پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ) دو روپے

(۱۱) معاہدۂ عمرانی - (انقلاب فرانس کے بانی روسو کی مشہور آفاق تصنیف سوشل کنٹرکٹ کا ترجمہ) دو روپے

(۱۲) جاپان (ایشیا کے انگلستان یعنی جاپان کے سبق آموز حالات) دو روپے

(۱۳) ہندوستان میں زراعتی مسئلہ چار آنے

(۱۴) [illegible] - دو آنے

(۱۵) [illegible] - ایک روپیہ آٹھ آنے

(۱۶) فکر جوہر - (ہندوستان کے مشہور رہنما مولانا محمد علی کے کلام کا مجموعہ) [illegible]

المشتہر : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(۱۷) مقدمہ التفسیر القرآن کی تاریخ - ۵ آنے

(۱۸) تعلیمات قرآن - دو روپے

(۱۹) یستا لوزی - از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب) ایک روپیہ آٹھ آنے

بچوں کے لیے (مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی)

شہزادی گلنار - چار آنے

ننھی مرغی - دو آنے

بچوں کی کہانیاں - دو آنے

تانیھل خان - دو آنے

کائنات - چار آنے

بیکاری - تین آنے

شہدلا - تین آنے

نیت کا پھل - دو آنے

مرغی آجمز چلی - دو آنے

چھدو - تین آنے

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

سیکسپیر اور لوسی - دو آنے

مکاتیب - ایک روپیہ

ترجمہ سفرنامۂ شاہ ایران - ایک روپیہ آٹھ آنے

افراد کا سفر - چار آنے

مجاہدین مولکھی - ایک روپیہ بارہ آنے

مصاحبین مہاتما گاندھی - دس آنے

دیوان ذوق مرتبہ آزاد - دو روپے

ترک موالات در ممالک غیر - دس آنے

تذکرۂ کاملان رامپور - تین روپے

اتحاد اسلام - چار آنے

وکرم اروسی - ایک روپیہ آٹھ آنے

دختر فرعون

مصر و ایران کے تہذیب و تمدن اور رفعت و عروج کا تذکرہ اس کے مطالعہ سے ایران و مصر کی عظمت رفتہ کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے قیمت حصہ اول دو روپے قیمت حصہ دوم دو روپے

شاہ بک ڈپو پٹنہ عظیم آباد

فکر بلیغ (از شاہ عظیم آبادی مرحوم) ایک روپیہ آٹھ آنے

داستان عجم - (شاہ نامہ فردوسی پر سحر حاصل تبصرہ) - (نواب نصیر حسین

خیالِ عظیم آبادی مرحوم کے قلم سے) ایک روپیہ
یادگارِ عشق- ایک روپیہ چار آنے
مثنوی مادرِ ہند- (از شاد عظیم آبادی مرحوم)
ظہورِ رحمت- (از شاد عظیم آبادی مرحوم)
رموز العروض- (از حمید عظیم آبادی) ۸ آنے

نظام الملک آصفجاہ اول
(بانیء سلطنت آصفیہ کے سبق آموز حالات)
یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ نے انگریزی زبان میں نہایت دلکش انداز میں تحریر فرمائی ہے - قیمت چھہ روپے

انجمن کی بعض زیر طبع تصانیف

کلیاتِ فانی

اُردو کے مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی کے مکمل اردو و فارسی کلام کا مجموعہ، یہ کتاب انجمن کی طرف سے نہایت اہتمام سے دہلی میں طبع ہو رہی ہے —

جگ بیتی

پنڈت برجموہن کیفی دہلوی کی پر اثر اور دلکش مثنوی —

حیاتِ جاوید

مولانا حالی مرحوم کی مشہور تصنیف جو تقریباً نایاب ہو چکی تھی انجمن کی طرف سے بہترین طباعت و کتابت اور نہایت عمدہ کاغذ پر عنقریب شائع کی جائے گی —

نوٹ: اِن تینوں کتب کے لیے شائقین ابھی سے آرڈر بھیج دیں تاکہ چھپتے ہی یہ کتب ان کی خدمت میں ارسال کی جا سکیں —

خطوط شبلی

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے وہ نادر و دلکش خطوط جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام انتہائی اخلاص و محبت سے تحریر فرمائے تھے - اس مجموعہ کے شروع میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے ایک نہایت لطیف و دلکش مقدمہ تحریر فرمایا ہے قیمت ایک روپیہ —

حقیقت اسلام

نواب سرامین جنگ کی مشہور تصنیف نوٹس آن اسلام کا بامحاورہ و سلیس ترجمہ قیمت مجلد ۱۲ آنے —

عروس ادب

مولوی سید ناظرالحسن صاحب ہوش بلگرامی کے ادبی، تاریخی، اخلاقی اور سیاسی مضامین کا قابل قدر مجموعہ قیمت دو روپیے —

پروفیسر منہاج الدین کی تصانیف

نظریۂ اضافیت — اس کتاب میں آئین اسٹائین کا نظریہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے - سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے قیمت غیر مجلد چار روپیے مجلد چار روپیے بارہ آنے —

رہنمائے آسمان — ستاروں کو پہچاننے کے متعلق اردو میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی کتاب موجود نہیں قیمت ایک روپیہ چار آنے —

ریڈیو — اس کتاب میں بے تار پیام رسانی اور اس کے متعلق تمام ضروری مسائل نہایت شرح و بسط سے بتا دیئے گئے ہیں قیمت مجلد تین روپے بارہ آنے -

فاؤست

جرمنی کے الہامی شاعر گوئٹے کے ڈرامے " فاؤسٹ " کا دنیائے ادب و تخیل کا وہ کارنامہ ہے جو ایک صدی سے تمام عالم میں مشہور اور دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، مبسوط محققانہ مقدمے کے ساتھ اسے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، ایم، پی، ایچ، ڈی (برلن) نے ترجمہ کیا ہے۔ قیمت مجلد چار روپے، غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

مقالات حالی حصۂ دوم

اس میں مولانا حالی کی تمام تقریریں اور مشہور نامور کتابوں پر تبصرے اور تقریظیں ہیں۔ اردو ادب کی بے مثل کتاب ہے۔ کاغذ اور چھپائی اعلیٰ درجے کی ہے۔ قیمت مجلد دو روپے غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے ۔

سودا

یہ کتاب نہایت تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ سودا کے متعلق اس سے بہتر اور کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ کاغذ اعلیٰ۔ طباعت دیدہ زیب۔ انجمن کے خوشنما اور خوبصورت ٹائپ میں رنگین بارڈر کے ساتھ خاص اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ صفحات ۳۹۷۔ تقطیع $\frac{1}{2} \times 7 \frac{1}{2}$ ۱۰ ۔ قیمت غیر مجلد ڈھائی روپے کلدار اور مجلد تین روپے کلدار۔

اطلاع

ملک کے دوسرے اشاعت خانوں کی اعلیٰ درجے کی تصانیف کے علاوہ حسب ذیل اداروں کی بلند پایہ اُردو کتب بھی انجمن ترقیٔ اُردو کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہو سکتی ہیں :-

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ - نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں - شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور - دار الاشاعت پنجاب لاہور - قومی کتب خانہ لاہور - دار المصنفین اعظم گڑھ - مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی - مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن - کتابستان الہ آباد - شاد بک ڈپو پٹنہ - ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد - مسلم ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڑھ - ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ -

المشتہر

منیجر انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد دکن

مطبوعات انجمن ترقیء اردو

نام کتاب	مجلد روپے	مجلد آنے	غیر مجلد روپے	غیر مجلد آنے
فلسفۂ تعلیم	۲	۰	۱	۱۲
القول الاظہر	۱	۰	۰	۸
رہنمایان ہند	۲	۰	۱	۸
امرائے ہنود	۳	۸	۳	۰
القمر	۱	۰	۰	۱۰
تاریخ تمدن حصہ اول	۲	۰	۱	۸
تاریخ تمدن حصہ دوم	۲	۰	۱	۸
فلسفۂ جذبات	۲	۸	۲	۰
البیرونی	۲	۰	۱	۸
دریائے لطافت	۳	۰	۲	۸
طبقات الارض	۲	۸	۲	۰
مشاہیر یونان و روما حصہ اول	۴	۰	۳	۰
مشاہیر یونان و روما حصہ دوم	۳	۰	۲	۸
اسباق النحو حصہ اول	۰	۰	۰	۶
اسباق النحو حصہ دوم	۰	۰	۰	۴
علم المعیشت	۵	۸	۵	۰
تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	۳	۰	۲	۸
تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم	۲	۸	۲	۰
تاریخ یونان قدیم	۲	۰	۰	۰
نکات الشعرا	۲	۴	۱	۱۲
وضع اصطلاحات	۳	۱۲	۳	۴
بجلی کے کرشمے	۱	۱۲	۱	۴
تاریخ ملل قدیمہ	۱	۱۲	۰	۰
محاسن کلام غالب	۱	۰	۰	۱۰
قواعد اردو	۲	۸	۲	۰
تذکرۂ شعرائے اردو	۱	۱۴	۱	۶
جاپان اور اسکا تعلیمی نظم ونسق	۳	۰	۲	۸
تاریخ ہند ہاشمی	۰	۰	۱	۱
مثنوی خواب و خیال	۱	۸	۱	۰
کلیات ولی	۵	۰	۴	۰
چمنستان شعراء	۵	۸	۴	۸
ذکر میر	۰	۰	۲	۰

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

ملنے کا پتہ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن

مطبوعات انجمن ترقی اردو

نام کتاب	مجلد روپے	مجلد آنے	غیر مجلد روپے	غیر مجلد آنے
سہ نظم ہاشمی	٠	٠	٠	۴
نظم مشاعرہ	٠	٠	٠	۸
دیوان اثر	۲	٠	۲	۸
مثنوی نکہت	۱	۸	۱	۲
دیوان یقین	۲	٠	۱	۸
باغ و بہار با مقدمہ اردو و حواشی	٠	٠	۲	٠
گوئٹے کا فاؤسٹ	۴	٠	۳	۸
ریاست	۵	٠	۴	۸
تذکرۂ ہندی (از مصحفی)	۲	٠	۱	۱٠
ریاض الفصحا (از مصحفی)	۲	۸	۴	٠
عقد ثریا (از مصحفی)	۱	۲	[illegible]	۱۲
تاریخ ادبیات ایران (ترجمہ از براؤن)	۳	۸	۴	٠
سب رس	۴	٠	۳	۸
ترکوں کی اسلامی خدمات	٠	٠	۱	۸
داستان رانی کیتکی	٠	٠	٠	۴
تذکرۃ الشعرائے گجرات (گردیزی)	۱	۴	٠	۱۳
گلزار ابراہیم	۲	۸	۲	٠
مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر	٠	٠	٠	۸
اردو اور صوفیائے کرام	٠	٠	٠	۸
مرحوم دہلی کالج	٠	٠	۱	۸
حقیقت جاپان	۳	۸	۳	٠
مقالات حالی حصہ اول	۴	٠	۳	۸
کلیات تاباں	۲	۴	۱	۱۲
خطبات گارساں دتاسی	۵	٠	۴	۸
جیمز اور اطلاقیہ (رضائیکی)	٠	٠	٠	۱٠
گل عجائب	۱	۱٠	۱	۲
جنگ نامہ عالم علی خان	٠	٠	٠	۶
ارتقا	۱	۶	۱	٠
قاموس اصطلاحات علمیہ	۶	٠	٠	٠
انتخاب کلام میر	۲	۸	۲	٠

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ چھہ روپے سکۂ انگریزی (سات روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے سکۂ انگریزی (یا ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ عثمانیہ) طلباء کے ساتھہ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں چار روپے آٹھہ آنے سکۂ انگریزی (پانچ روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

VOL. 17 OCTOBER, 1937. No. 68

The Urdu

"MASOOD NUMBER"

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq B. A., (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, (Deccan).